(Reading Room)

خدابخش لائبریری






۵۷ — ۶۲





خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

| | | | |
|---|---|---|---|
| رجسٹریشن نمبر: | ۲۳۴۲۴/۷۷ | قیمت فی شمارہ: | پچیس روپے |
| شمارہ: | ستاون تا ساٹھ | سالانہ: | ۳۰۰ روپے (ہند) |
| قیمت: | ڈیڑھ سو روپے | | ۶۰ ڈالر (ایشیا)، ۱۲۰ ڈالر (دیگر ممالک) |





مصطفیٰ کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)، دہلی میں چھپوا کر خدابخش لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا۔

خدابخش لائبریری
جرنل
پٹنہ

حرفے چند
ع رب

نعت

● نعت بخط جگر مرادآبادی — جگر مرادآبادی

نادر مطبوعات:

● مقدمہ — ڈاکٹر انوار الحسن — ایک - بارہ
● تواریخ نادر العصر — منشی نولکشور — ۱

اردو کدھر:

● کیا اردو کی لڑائی میں مسلمان تنہا ہیں؟ — ڈاکٹر سروپ سنگھ — ۱۷۷

اردو ادب:

● اردو ادب کدھر؟ — ڈاکٹر سید محمد عقیل — ۱۸۳

اردو دانشوری:

● دانشوری کی تعریف اور اردو میں دانشوری کی بازیافت کے امکانات — جناب سید حامد — ۲۰۵
● اردو میں دانشوری کی روایت — ڈاکٹر محمد حسن — ۲۱۱

تازہ دانشوری:

● ایک پل ایسا بھی آجاتا ہے — جناب احمد ندیم قاسمی — ۲۱۵
● تم چپ رہے ہم چپ رہے — جناب مخمور سعیدی — ۲۱۶
● عصر حاضر میں ادب کا کردار — جناب مظفر علی سید — ۲۱۷

دانشور غزلگو:


| | | |
|---|---|---|
| ۔ حسن نعیم | جناب حسن نعیم | ۲۳۵ |
| ۔ اجتبیٰ رضوی | جناب اجتبیٰ رضوی | ۲۵۲ |


اقبال:


| | | |
|---|---|---|
| ۔ خطوط اقبال بخط اقبال | ڈاکٹر محمد اقبال | ۲۶۵ |


ابوالکلام آزاد:


| | | |
|---|---|---|
| ۔ تقدیم اوّل | جناب محمود واجد | ۲۷۱ |
| ۔ تقدیم ثانی | پروفیسر وہاب اشرفی | ۲۷۳ |
| ۔ خطوط آزاد بخط آزاد بنام زکریا بھاگلپوری | ابوالکلام آزاد | ۲۸۰ |
| ۔ زکریا بھاگلپوری کے بارے میں | جناب محمود واجد | ۳۴۱ |
| ۔ کچھ اپنے کچھ مولانا آزاد کے بارے میں | زکریا بھاگلپوری | ۳۴۷ |
| ۔ دارالارشاد (کلکتہ) میں مولانا آزاد کا درس قرآن | زکریا بھاگلپوری | ۳۵۰ |


دریابادی:


| | | |
|---|---|---|
| ۔ عبدالماجد دریابادی کا اپنی تصنیف سے انکار | مرسلہ ڈاکٹر کمال الدین حسین ہمدانی | ۳۷۰ |


ذاکر حسین:


| | | |
|---|---|---|
| ۔ ذاکر صاحب | پروفیسر ظل الرحمٰن خاں | ۳۷۳ |


قاضی عبدالودود


| | | |
|---|---|---|
| ۔ ارمغان بہار (عکس) مع مقدمہ | ڈاکٹر علی حیدر نیر | ۳۹۱ |
| ۔ یادداشتہائے ودود | قاضی عبدالودود | ۴۱۱ |


بازیافت:


| | | |
|---|---|---|
| ۔ راجندر سنگھ بیدی کی اولین تحریر "فرشتہ" | جناب راجندر سنگھ بیدی | ۴۴۱ |

| | | |
|---|---|---|
| **مشرق وسطیٰ کے سفرنامے:** | | |
| ـ سفرنامہ قسطنطنیہ، عراق و ایران | جناب سید حسن عسکری | ۴۴۵ |
| **مسلمان اور سائنس:** | | |
| ـ تاریخ علوم میں مسلمانوں کا مقام | ڈاکٹر فواد سیزگین | ۵۲۶ |
| ـ فلکیات میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام | " " " | ۵۵۱ |
| ـ عربوں کے علم الفلک کا یورپ پر اثر | " " " | ۵۶۹ |
| ـ آثار علویہ کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام | " " " | ۵۸۵ |
| **قرآنیات:** | | |
| ـ ابتدائی دور کے ہندوستانی مسلمان اور قرآن پاک کے تراجم | ڈاکٹر محمد انصار اللہ | ۶۰۵ |
| ـ چینی زبان کے الفاظ قرآن میں | ڈاکٹر مہدی حسن | ۶۱۳ |
| **اے گرفتار ابوبکر و علی:** | | |
| ـ مناقب ابوبکر بزبان علی | مصنف: علامہ زمخشری | ۶۲۱ |
| مناقب علی بزبان ابوبکر | ترجمہ: احتشام الحسن کاندھلوی | |
| **اسلام اور ہندو مت:** | | |
| ـ اسلام اور ہندو مت کی بعض مشترک تعلیمات | مولانا مناظر احسن گیلانی | ۶۵۷ |
| **سکھ مت:** | | |
| ـ گرو گرنتھ صاحب اور اردو | جناب عباد اللہ گیانی | ۶۷۵ |
| **اورنگ زیب:** | | |
| ـ ہند عہد اورنگ زیب میں | جناب مرزا سمیع اللہ بیگ | ۷۳۷ |
| **بابری مسجد، رام جنم بھومی دستاویزات:** | | |
| ـ حدیقۃ الشہدا | جناب مرزا جان | ۸۲۹ |

**تقسیم کی طرف:**


| | | |
|---|---|---|
| ● آخری دہائی کی دستاویزات ـــ خطرِ استقبالیہ | جناب شیخ محمد جان | ۸۶۷ |


**مشرقی کتابخانے:**


| | | |
|---|---|---|
| ● ترکی کا ایک غیر معروف کتبخانہ | پروفیسر احمد آتش | ۸۸۱ |
| ● استنبول کے کتبخانے | ڈاکٹر محمد غوث | ۸۹۷ |
| ● بروسہ کے کتبخانے کے چند فارسی مخطوطات | ڈاکٹر سید نعیم الدین | ۹۱۷ |


**کتابخانۂ خدابخش:**


| | | |
|---|---|---|
| ● خدابخش فہرست مخطوطات فارسی: مراۃ العلوم کے تسامحات | ڈاکٹر افتخار احمد مدنی | ۹۲۳ |


**حصہ انگریزی:**


| | | |
|---|---|---|
| ● حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے عہد میں مذہب اور سیاست | پروفیسر محب الحسن | ۱ ـ ۱۲ |
| ● کشمیر میں اسلام | پروفیسر محب الحسن | ۱۳ ـ ۲۴ |

# حرفِ چند

کسی اچھے قاری نے کبھی کچھ ایسی بات کہی تھی کہ جب کوئی نئی کتاب چھپ کے بازار میں آتی ہے تو میں پڑھنے کے لیے کوئی پرانی کتاب اٹھا لیتا ہوں۔ پوری تو نہیں لیکن کچھ اس سے ملتی جلتی کیفیت ہم لائبریری کے خادموں پر بھی گزرتی رہی ہے اور جی چاہتا ہے کہ پڑھنے والے نئی چیزیں پڑھیں تو کبھی کبھار پرانوں پر بھی نظر ڈالتے چلیں۔ ۱۹۹۱ سے جرنل کو کچھ ایسا ہی موڑ دینے کی کوشش جاری ہے۔

اس احوال کے پس پردہ اصل منشا یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو وہ سب کچھ مل سکے جو انھیں نہیں مل پا رہا ہے، تاکہ اس سے وہ کچھ حاصل کر سکیں جو ابھی تک نہیں کر پائے۔ ایڈیٹر کو اس پرچے کے مشتملات سے بہت کچھ فائدہ ہوا" اس کا جی چاہا کہ وہ اس فائدہ کو صرف اپنے لیے سینت کے نہ رکھ لے۔

—— ہ عریب

# نعت

جگر کی یہ نعت محترمی یونس سلیم صاحب کا تحفہ ہے۔ شاعر نے یہ نعت یونس صاحب کے والد مرحوم یوسف صاحب کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی تھی۔ ہم اس کے موجودہ مالک کے ممنون ہیں کہ انھوں نے یہ نعت اب تک ہمارے لیے اٹھا رکھی تھی۔ غالباً یہ اب تک چھپی نہیں۔ اور عکس تو یقیناً نہیں!

نعت سرور کونین صلعم

ای از لب صادقت شنیده [illegible] خدا [illegible] گزیده

[illegible] تو درجهان نگارے ناديده [illegible] گزیده

ای آنکه [illegible] از خویش بخویشتن رسیده

ای آنکه [illegible] در [illegible] صفات [illegible]

[illegible] بخاص [illegible] رسیده

[illegible] ای از [illegible] [illegible]

ناسوره [illegible] رسیده

ای آنکه ز عشق بی نهایت [illegible]

[illegible] ز عشق [illegible] رسیده

امروز ببین اگر مردان را

کارت ببلا کشیده رسیده

[illegible]

ناظر بخت [illegible] : مکرم محترم جناب [illegible] حیدرآباد [illegible]

نادر مطبوعات

تواریخ نادر العصر

منشی نول کشور

# مقدمہ



ڈاکٹر انوار الحسن

شعبۂ علوم شرقیہ (عربی و فارسی)

لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ



مشرقی علوم وفنون کی دنیا میں منشی نولکشور کی ذات محتاجِ تعارف نہیں کیوں کہ انھوں نے انیسویں صدی کے ہندستان میں اپنی انتھک کوششوں اور بے پناہ خداداد صلاحیتوں سے نہ صرف علوم وفنون کی ایک دیرپا شمع روشن کی بلکہ اس ملک کی صنعتی ترقی کی طرف بھی بنیادی اور تعمیری قدم اٹھایا۔ ان کے مشہورِ عالم نولکشور پریس کی شاخیں نہ صرف ہندستان کے بڑے بڑے شہروں بلکہ لندن میں بھی قائم تھیں۔ لکھنؤ میں ان کا قائم کردہ "اپرانڈیا پیپر مل" شمالی ہندستان میں کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ تھا۔ ان کی صنعتی اور تعمیری صلاحیتیں بڑی ہمہ گیر اور ہمہ جہتی تھیں۔ ان کا دارالتصنیف ہندستان میں اپنی نوعیت کا ایک واحد ادارہ تھا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ کتنی ہی ساہتیہ اکادمیاں مل کر بھی مدتوں میں وہ کام انجام نہیں دے سکتیں جو ان کی دارالتصنیف سے انجام پا چکے۔ عربی، فارسی، سنسکرت، اردو، ہندی اور پنجابی زبانیں اُن کے پریس کی رہینِ منت ہیں۔ انھوں نے ان زبانوں کے قیمتی ادبی سرمایوں کو زمانہ کی دستبرد سے بچاکر لوگوں تک پہنچایا' اور اس طرح اشاعتِ علم کی عظیم خدمت انجام دی۔ لائبریریوں، اسکولوں، کالجوں، مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں کا قیام اور ان کی امداد منشی جی بڑی فیاضی اور دریادلی سے کرتے تھے۔ غریبوں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کی اعانت اور اہلِ علم کی قدردانی، عزت اور ان کے مرتبہ کا احترام کرتے تھے۔

تصنیف وتالیف کا مشغلہ بھی جاری رہا۔ پیشِ نظر کتاب "تواریخ نادرالعصر" اگرچہ ان کی ایک مختصر تالیف ہے لیکن کئی اعتبارات سے اس کی افادیت اور اہمیت مسلّم ہے۔ انھوں نے قدیم ماخذوں اور عینی شہادتوں کی بنیاد پر اودھ کی یہ مختصر تاریخ مرتب کی ہے۔ ابتدا میں پس منظر کے طور پر ہندو مذہب اور ہندستانی باشندوں کے بارے میں بھی مختصر بحث کی گئی ہے۔ ہندستانی مدینات کا ذکر مفید اور معلومات افزا ہے۔ لکھنؤ کی قدیم عمارتوں، سڑکوں، گلیوں، بازاروں کا بیان بہت کچھ عینی شہادتوں پر مبنی ہے اور اس لحاظ سے اسے تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

منشی نولکشور نے ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں نولکشور پریس کی داغ بیل ڈالی تھی اور ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ ہی میں واجد علی شاہ کے عہدِ حکومت میں ہندستان کی پہلی جنگ آزادی لڑی گئی۔ بیگم حضرت محل کا کردار ایک تاریخی حقیقت ہے۔ انگریز حکمرانوں نے واجد علی شاہ کی فوجوں کو شکست دی۔ انھیں تخت وتاج سے محروم کیا۔ مٹیا برج کلکتہ میں لے جاکر بند کردیا اور اودھ کی خوش حال ریاست پر خود قبضہ کرلیا۔ منشی جی موصوف نے لکھنؤ کی تباہی، زبوں حالی اور بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ یہاں کی تاریخی عمارتوں کی مسماری ۱۸۵۷ء کے بعد عرصہ تک جاری رہی اور منشی جی موصوف ان کے چشم دید گواہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کے بیانات میں بڑا وزن اور وقار ہے۔

لکھنؤ کی تاریخی عمارتیں کب اور کہاں اور کتنے سرمایہ سے تعمیر ہوئی تھیں ان کی تفصیل اس کتاب کا سب سے قیمتی حصہ ہے۔ ان دنوں اتر پردیش کی پیداوار کتنی تھی' بازار کا نرخ کیا تھا! اور صوبہ کی اہم تاریخی چیزیں کیا تھیں؟ ان بیانات سے معاصرین کی کتابیں خالی ہیں۔ اس اعتبار سے بھی "نادر العصر" درحقیقت "نادر العصر" ہے جو اگرچہ اس غرض سے نہیں لکھی گئی تھی لیکن اب اس کی اہمیت اور ندرت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۱۰ء میں مولانا عبدالحلیم شرر کی ایک کتاب "گذشتہ لکھنؤ" شائع ہوئی تھی جو لکھنؤ کے بارے میں ان کی بے شمار یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی ہند دہلی نے اس کا TRANSLITERATION ہندی میں شائع کیا ہے۔ اسی طرح بعض اور زبانوں میں گذشتہ لکھنؤ کے ترجمے چھپ چکے ہیں لیکن "نادر العصر" کو اس سلسلہ میں جو اولیت حاصل ہے وہ صرف اسی کا حصہ ہے۔

منشی جی کے طرز تحریر پر اس دور کی چھاپ بہت نمایاں ہے۔ وہ عربی و فارسی الفاظ کے بے تکلف استعمال پر قادر ہی نہیں عادی تھے۔ اس وقت کی اردو نثر میں عام طور پر وہ صفائی' روانی اور سادگی نہیں جو بعد میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کی جدوجہد سے رفتہ رفتہ پیدا ہوئی۔ اسی لیے "نادر العصر" کی عبارتوں میں بھی کھردراپن موجود ہے' اور ۱۸۶۳ء کی تصنیف میں آپ اس سے زیادہ کیا امید کر سکتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ اور صوبہ اودھ کے بارے میں سماجی اور تاریخی بیانات جتنے اچھے' معتبر اور مستند "تاریخ نادر العصر" میں ملتے ہیں اس کی مثال کہیں اور نہیں نظر آتی ہے۔ اس ضرورت کے تحت "نادر العصر" کی پرانی شراب کو نئے پیمانے میں پھر سے پیش کیا جا رہا ہے۔



حضرت امیر حسن نورانی نے اس سلسلے میں جو معتبر و مفید سطور رقم فرمائی ہیں ان کے مطالعہ سے منشی نولکشور کا مرتبہ متعین کرنے میں آسانی ہوگی۔ ان کی تحریر درج ذیل ہے:۔

کسی انسان کی اس سے بڑھ کر خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا نام اور علم و دانش لازم و ملزوم سمجھے جائیں' اور ایک کے ساتھ دوسرے کا خیال غیر ارادی طور پر آجائے۔ ایسا خیال جو مختلف علوم و فنون کی ہزاروں کتابوں کے تصور میں تبدیل ہو کر' دل و دماغ کو روشن کر دے' اور ایک انبساط انگیز کیفیت کا احساس پیدا ہو جائے۔ ایسی ہستیاں شاذ و نادر ہوتی ہیں اور صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ منشی نولکشور ایک ایسی ہی ہستی کا نام ہے' جس کا تعارف کرانا مقصود ہے۔ منشی نولکشور مشرقی علوم و فنون کے محافظ' اور اردو زبان و ادب کے بڑے محسن تھے۔ انھوں نے اسلامی علوم و فنون کی جتنی خدمت کی اتنی انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے کوئی دوسرا نہ کر سکا۔ ان کا مطبع علمی دنیا میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے' اردو صحافت

کا عروج ان کا رہینِ منت ہے۔ انھوں نے اردو زبان وادب کی آبرو بڑھائی اور اس کے خزانے میں اتنا اضافہ کیا کہ وہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملانے کے قابل ہو گئی۔"

تجارتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو انھوں نے طباعت و اشاعت اور ان کی متعلقہ صنعتوں کو اس وقت فروغ دیا جب صنعت وحرفت جمود و تعطل کا شکار تھی۔ کتابوں کی تجارت کو ہندوستان میں پہلی بار انھوں نے بڑے پیمانہ پر جدید اصولوں اور منظم طریقوں سے ترقی کی راہ پر چلایا۔ کتابوں کی تجارت میں درآمد و برآمد کا سلسلہ شروع کیا۔ ایران، افغانستان، چین ترکستان اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں ان کے مطبع کو شہرت حاصل ہوئی۔ یورپ اور امریکہ کے مستشرقین نے ان کی عظیم خدمات کا اعتراف کیا۔ ان کی بدولت ایسی نادر و نایاب کتابیں منظرِ عام پر آئیں جن کی مدد سے علوم وفنون کے سلسلۂ ارتقا کی تاریخی کڑیوں کو مربوط کرنے میں مدد ملی۔ اودھ اخبار کا اجرا ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ فنِ خطاطی کو انھوں نے نئی زندگی بخشی۔ ملک کی صنعتی ترقی میں ان کی خدمات قابلِ قدر ہیں، وہ اپنے عہد کی ایک غیر معمولی شخصیت تھے۔ ان کی سرگرمیوں نے آنے والے زمانہ پر گہرا اثر ڈالا۔

منشی نول کشور جنوری ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے[۱] دس سال کی عمر میں ثانوی تعلیم کے لیے آگرہ کالج میں داخلہ لیا۔ پانچ سال تعلیم حاصل کی، دو سال اخبار سفیر آگرہ میں صحافت کی تربیت حاصل کی۔ سترہ سال کی عمر میں اڈیٹر کوہ نور کی دعوت پر لاہور گئے، اور چار سال اخبار کوہِ نور اور اس کے مطبع میں کام کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد لاہور سے آگرہ واپس آئے۔ اور ۱۸۵۸ء کے آغاز میں لکھنؤ پہنچے اور مطبع قائم کیا[۲] ۲۶ نومبر ۱۸۵۸ء کو اودھ اخبار جاری کیا۔ اس وقت وہ اکیس[۲۱] برس کے ہو چکے تھے۔ ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر انسٹھ سال تھی۔ ان کو صرف ۳۷ سال کام کرنے کا موقع ملا، یہ زمانہ مسلسل جہدِ عمل کا زمانہ تھا۔

۳۷ سال کی مختصر مدت میں منشی نول کشور نے اودھ اخبار کو ۴ صفحات سے ترقی دے کر ۲۴ صفحات تک پہنچایا اور خاص نمبر ۴۸ صفحات پر شائع ہوتے تھے، اردو کے بلند پایہ ادیب و انشاپرداز اودھ اخبار سے وابستہ تھے اور بہت سے اہلِ ذوق اس ادارے میں زیرِ تربیت تھے جو مستقبل میں نامور ہوئے۔

مطبع کو انھوں نے اتنی ترقی دی کہ سارے ایشیا میں اس کا کوئی مقابل نہ تھا۔ ۳۷ سال میں عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو کی چار ہزار سے کچھ زیادہ کتابیں شائع کیں، بعض کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔ ان کی زندگی میں صرف مطبع کے اندر بارہ سو آدمی کام کرتے تھے۔ تین سو مشین میں تین سو ہینڈ پریس چلاتے تھے۔ کانپور کے مطبع میں

دوسو آدمی کام کرتے تھے۔ بیس ہزار روپیہ کا کاغذ ہر ماہ صرف ہوتا تھا مطبع کا سالانہ ڈاک خرچ پچاس ہزار روپیہ تھا۔ ملازمین کی تنخواہ پندرہ ہزار ماہوار تھی۔ اس کے علاوہ بیواؤں، یتیموں اور غریب طالب علموں کی امداد کے لیے کئی سو روپیہ ماہوار دیتے تھے۔ جب منشی نولکشور کی وفات ہوئی اس وقت ان کی جائداد کی قیمت ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ تھی[1] اور جب کام شروع کیا تھا اس وقت سرمایہ کی کمی کے باعث صرف ایک ہینڈ پریس پر کام شروع کیا تھا۔ وہ اپنے ریٹائر ہونے والے ملازمین کو پنشن دیتے تھے یہ طریقہ ان کے وارثوں نے بھی باقی رکھا۔ وہ عالموں، پنڈتوں اور سب ہی دانشوروں کا احترام کرتے تھے۔ سنسکرت کی تعلیم کے لیے لکھنؤ میں ایک پاٹھ شالہ قائم کیا تھا دارالعلوم دیوبند کے علمائے نے ان کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے ان کی علمی خدمات اور امداد کتب کا شکریہ ادا کیا ہے۔ مدرسۃ العلوم (محمڈن کالج علی گڑھ) کو انھوں نے گرانقدر عطیات اور کتابیں تحفہ میں دیں۔ مطبع نولکشور کے سب سے بڑے عالم و مترجم طویل عرصہ تک مطبع میں کام کرنے کے بعد اپنے تجربات اور مہارت علوم اسلامیہ کے باعث مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے اور اس کے کچھ عرصہ بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درس حدیث کے مسند پر فائز ہوئے اور دارالعلوم کے مہتمم مقرر ہوئے۔ منشی نولکشور نے مشرقی تہذیب کو مغربی تہذیب کی یلغار سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور بڑے پرآشوب دور میں مشرقی علوم کے اثاثہ کی حفاظت کی۔ اگر وہ اس طرف توجہ نہ کرتے تو ہمارا قیمتی سرمایہ ضائع ہوجاتا۔ ان کی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی میں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر کیا گیا۔ ان کی سرگرمیوں کا اثر قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ اتحاد و اتفاق کے لیے بہت خوشگوار ثابت ہوا۔

منشی نولکشور کو بجا طور پر مشرقی علوم و فنون کا محسن اعظم کہا جاتا ہے۔ اگر انھوں نے ہر علم و فن کی غیر مطبوعہ کتابیں نہ شائع کی ہوتیں تو یقیناً مختلف علوم کی تعلیم و ترویج میں دشواری پیش آتی ترقی تعلیم میں تیز رفتاری اور بیداری پیدا ہونا بہت مشکل تھا۔ انھوں نے ایک طرف مذہبی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر ہر معیار کی مذہبی کتابیں طبع کرائیں، ان میں وہ سب ہی مذاہب و مسالک شامل ہیں، جن کے پیرو ہندوستان میں آباد ہیں، خاص طور پر ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں سنسکرت زبان میں تھیں۔ ان کے قدیم مستند مخطوطے حاصل کر کے طبع کرائے اس کے بعد ان کے ہندی میں ترجمے کرائے جن میں مہابھارت، رامائن، اپنشد، وید وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی اشاعت کے ساتھ سنسکرت کے ان فارسی ترجموں کی طرف توجہ

---

[1] اودھ ریویو بابت ماہ فروری ۱۸۹۵ء تاریخ ادب اردو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ۔

کی جو بیشتر مغلیہ دور کے فضلاء نے کیے تھے۔ فیضی کا ترجمہ مہابھارت بہت مشہور ہے۔ اس کے اٹھارہ حصے ہیں جن کو مطبع نے نہایت اہتمام سے شائع کیا۔ اس کے ساتھ رامائن کے متعدد فارسی تراجم طبع ہوئے جن میں رامائن مسیحی، رامائن امر پرکاشی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ منشی نولکشور نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، انھوں نے ہندو مذہب کی کئی سو چھوٹی بڑی کتابوں کے اردو زبان میں ترجمے شائع کیے کیوں کہ اس زمانہ میں اردو ہی ایک ایسی زبان تھی جو سارے ملک میں رائج تھی، خاص طور پر شمالی ہندوستان کے باشندوں کی اکثریت اسی زبان کو ذریعہ اظہار خیال بنائے ہوئے تھی، بول چال کی زبان بھی اردو تھی۔

مسلمانوں کا مستند مذہبی لٹریچر زیادہ تر عربی میں اور کچھ فارسی زبان میں تھا۔ منشی نولکشور نے پہلے عربی زبان میں مطبوعہ کتب کے نسخے حاصل کیے اور اس کے بعد غیر مطبوعہ مخطوطات تلاش کیے، اور ان کو ماہرین فن کے سپرد کیا تاکہ اگر کوئی کمی بیشی یا خامی ہو تو درست کر دیں۔ اس طرح ہر کتاب صحت کی کرا کے شائع کی بلکہ اکثر کتابوں پر مفید حواشی کا اضافہ کرایا۔ ان عربی کتب کے فارسی ترجمے بھی طبع کرائے۔ یہ ترجمے، ایران اور ہندوستان میں بہت عرصہ قبل ہو چکے تھے مگر طباعت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ان کے مسودات مختلف کتب خانوں اور عالموں کے پاس محفوظ تھے ان سے ضمناً یا عاریتاً حاصل کر کے طبع کرائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ تمام مستند کتابوں کو اپنے شعبۂ تصنیف و ترجمے کے دانشوروں کے ذریعہ اردو زبان میں منتقل کرایا۔ اس کے لیے بہت بڑا سرمایہ صرف کیا۔ حدیث، تفسیر، اور فقہ کی شاید ہی کوئی مستند کتاب ہو جس کا ترجمہ اردو میں شائع نہ کیا ہو بعض مشہور کتابوں کی شرحیں بھی لکھوائیں۔ اس کے علاوہ اسلامیات پر کئی اچھی کتابیں خود مرتب کرائیں۔ ان میں سب سے بڑی اور اہم کتاب "تفسیر مواہب الرحمٰن" ہے۔ جو قرآن شریف کی اردو زبان میں سب سے بڑی تفسیر ہے اور ۳۰ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اتنی بڑی تفسیر عربی اور فارسی زبانوں میں بھی شاذ و نادر نظر آئے گی، اس کے علاوہ اسلامی علوم کے ہر شعبۂ فن کی صدہا کتابیں شائع کیں۔ جو پہلے عوام و خواص کی دسترس سے باہر تھیں۔

منشی نولکشور نے علامہ فیضی کی مشہور عالم بے نقط تفسیر قرآن، شائع کی جس کا نام سواطع الالہام ہے۔ اس کا مستند نسخہ ان کو کلکتہ کے کسی تاجر نوادرات سے حاصل ہوا تھا۔ اسی طرح عربی زبان میں تاریخ کی مستند کتاب طبری کا فارسی زبان میں ترجمہ کئی سو سال پہلے ایران کے سامانی حکمرانوں کے زمانہ میں ہوا تھا۔ اس کی مستند قلمی نقلیں مختلف کتب خانوں میں موجود تھیں۔ لیکن اس کو پہلی بار منشی نولکشور نے اپنے مطبع سے شائع کیا، اس میں ان کو شرف اولیت حاصل ہے۔ منشی نولکشور نے سب سے زیادہ توجہ اردو زبان اور اسلامی کتابوں کی طباعت و اشاعت پر صرف کی۔

انھوں نے عربی، فارسی اور اردو میں تمام اسلامی علوم وفنون کی نادر و نایاب کتابیں بکثرت شائع کیں۔ ان کی بدولت مدارس اور مکاتب کی رونق میں اضافہ ہوا۔ نصابی کتابوں کی کثرت نے تحصیل علم کا شوق رکھنے والے طلبا کے عزم و ہمت میں اضافہ کیا۔ مصنف "اردو کے ہندو ادیب" نے لکھا ہے کہ:

ہندوستانی مسلمان اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرسکتے اور نہ اس گراں بہا احسان سے کبھی عہدہ برآ ہوسکتے ہیں کہ اسلامی درسیات اور اردو ادبیات اور دیگر مذہبی علوم وفنون کی ترویج و اشاعت میں منشی نولکشور سی آئی اے کی جو درخشاں خدمات مسلّم ہیں وہ بحیثیت مجموعی کوئی مسلمان (انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے) سرانجام نہ دے سکا۔[1]

منشی نولکشور اسلامی تہذیب وثقافت سے بہت متاثر تھے۔ اور ان کے دل میں اس کے لیے نہایت محبت و عقیدت کا جذبہ کارفرما تھا۔ شاید اسی لیے انھوں نے اپنے مطبع کو اسلامی علوم کا عظیم مرکز بنادیا تھا جہاں تفسیر، حدیث اور فقہ میں مہارت رکھنے والے علما بیٹھ کر کتابوں کی صحت، ترجمہ اور حاشیہ نویسی کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اور جہاں سے تفسیر مواہب الرحمٰن، صحاح ستہ، فتح الباری، فتاویٰ عالمگیری، فتح القدیر، ہدایہ اور احیاء العلوم جیسی بلند پایہ کتابیں شائع ہوئیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

سب سے آخر میں لکھنؤ کے اس مطبع کا نام لیا جاتا ہے جس کی زندگی اب اسّی برس کے قریب پہنچ گئی ہے۔ اس سے میری مراد نولکشور کا مشہور پریس ہے۔ یہ غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی علوم وفنون کی جتنی ضخیم اور اکثر کتابیں اس مطبع نے شائع کیں ان کا مقابلہ ہندوستان کیا مشرق کا کوئی مطبع نہیں کرسکتا۔ ہماری زبان کی اکثر ادبی اور علمی کتابیں اسی مطبع سے چھپ کر نکلیں۔ شعرا کے دواوین، مثنویاں، قصائد، قصے، افسانے اور داستانیں اور درس کی عام کتابیں سب اس کی کوششوں کی ممنونِ منّت ہیں۔[2]

اسلامی علوم پر مطبع نولکشور نے عربی، فارسی اور اردو میں جو کتابیں شائع کی ہیں ان کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ اس کی شائع کی ہوئی کتابوں کے باعث اسلامی ممالک میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ عربی اور فارسی کی کتابیں چین، ترکستان، افغانستان، ایران، عراق، حجاز اور مصر وشام میں بکثرت منگوائی گئیں۔ ان ممالک کے کتب خانوں میں نولکشوری مطبوعات موجود ہیں اور ان ممالک کا تعلیم یافتہ طبقہ منشی نولکشور اور ان کے مطبع سے واقف ہے۔

فارسی زبان کے ممتاز محقق ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے لکھا ہے کہ:

---

[1] اردو کے ہندو ادیب از ناظر کاکوروی صفحہ ۱۸۴ مطبوعہ انوار بک ڈپو لکھنؤ۔ [2] نقوش سلیمانی طبع اول صفحہ ۷۷، ۱۹۳۹ء

یونیورسٹی، اسکول اور کالج کے طلبا کو شاید منشی نولکشور جی کی خدمات کا پورا اندازہ نہ ہوگا۔ مگر جن لوگوں نے درس نظامی حاصل کیا ہے اور عربی مدارس میں تعلیم پائی ہے ان کو پورا احساس ہوگا کہ نحو، صرف، منطق فلسفہ، فقہ، اصول، ادب، ہیئت، لغت، عروض جیسے سبھی علوم کی بے شمار کتابیں مطبع نولکشور نے شائع کرکے استادوں اور شاگردوں، دونوں کی مشکلوں کو حل کر دیا۔[1]

پروفیسر موصوف نے اپنے مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

دنیا کے جس ادارے یا یونیورسٹی میں مشرقی علوم کا چلن ہوگا وہاں مطبع نولکشور کی مطبوعات بھی ضرور ہوں گی۔ مجھے ایران، افغانستان، ترکی جیسے ممالک کے کتب خانے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور مجھے اندازہ ہے کہ اس مطبع کی کتابیں کس اہتمام سے محفوظ رکھی جاتی ہیں۔۔۔۔۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عربی، فارسی اور اردو میں جتنی کتابیں نولکشور پریس سے شائع ہوئی ہیں، اتنی غالباً کسی ملک میں شائع نہ ہوتی ہوں گی۔۔۔۔ اس پریس سے اس وقت فارسی کی کتابیں شائع ہو رہی تھیں، جبکہ خود فارسی بولنے والے ملکوں میں شاید پریس کا رواج بھی نہ تھا۔[2]

منشی نولکشور نے ہندی، سنسکرت، گورمکھی اور مرہٹی زبان کی کتابیں بھی شائع کیں۔ ہندو مذہب کی سب ہی اہم کتابوں کو نہایت اہتمام سے شائع کیا جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں درج کی جاچکی ہے۔ وہ سب ہی مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ قرآن مجید کی طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں وہ طہارت کا اتنا خیال رکھتے تھے قرآن کے چھپیدہ پتھروں کو یا تو دریا کے کنارے دھلواتے تھے یا ان کے دھوئے ہوئے پانی کو ایک پاک حوض میں جمع کرکے دریا میں ڈلوادیتے تھے طباعت کا کام مسلمان کارکن انجام دیتے اور ان کے لیے پاک اور باوضو ہونا ضروری تھا۔ کاغذ رکھنے کی جگہ عرق بید مشک اور گلاب کا چھڑکاؤ کراتے تھے۔ ان کے اس احترام و اہتمام سے لکھنؤ کے عوام و خواص سب ہی واقف تھے۔ آج بھی قدیم علمی گھرانوں میں یہ روایت مشہور ہے۔ راقم الحروف نے دو معتبر سن رسیدہ ملازمین مطبع کی زبان سے سنا ہے۔ مؤلف اردو کے ہندو ادیب' ناظر کاکوروی نے بھی لکھا ہے اسی طرح وہ عالموں کا بے حد احترام کرتے تھے۔

منشی نولکشور نے سکھوں کی سب سے بڑی اور مقدس کتاب گرنتھ صاحب اور جنم ساکھی بھی طبع کرائیں۔ اسی طرح توریت انجیل (عہد نامہ قدیم و جدید) کے اردو ترجمے طبع کرائے۔ لیکن ان کتابوں کی بازار میں مانگ کم تھی اس لیے

---

[1] ماہنامہ "نیا دور" نولکشور نمبر بابت ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۸۰ء صفحہ ۹۸۔ [2] مرزا لطیف بیگ مہتمم دفتری خانہ مطبع نولکشور متوفی ۱۹۶۴ء بعمر ۹۰ سال اور منشی شیو پرشاد محرر مطبع متوفی ۱۹۵۸ء بعمر ۹۵ سال اس کے راوی ہیں۔

ان کی اشاعت محدود رہی۔ قومی یک جہتی کے لیے اس وقت عوامی اداروں کے علاوہ حکومت نے بڑے پیمانہ پر جو تحریکیں چلائی ہیں ان پر لاکھوں روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ لیکن منشی نولکشور نے تن تنہا اس سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ سب پر بھاری ہیں۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے مختلف طریقوں سے کوشش کی۔ دونوں مذاہب سے ایک دوسرے کو واقف کرانے کے لیے، دونوں کی مذہبی کتابیں ان کی پسندیدہ زبانوں میں طبع کرائیں۔ کاروبار کے سلسلہ میں دونوں مذاہب کے کارکن شانہ سے شانہ ملاکر کام کرتے تھے کبھی کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ وہ علماء اور صوفیا کا بے حد احترام کرتے تھے۔ بقول ناظر کاکوروی مرحوم:

چند ممتاز ہندو بزرگوں کی زبانِ مبارک سے یہ بھی سنا ہے کہ جو احترام بزرگانِ دین کا منشی نولکشور کرتے تھے وہ بہت سے مسلمان بھی نہیں کر سکتے تھے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ کلام پاک کی اشاعت میں منشی نولکشور کی خدمات آبندہ درخشاں ہیں۔[1]

اودھ اخبار کے ذریعہ انھوں نے ملک و قوم کی بہت خدمت کی۔ ہندو مسلم اتحاد اور یک جہتی کے لیے جو تحریک ہوتی تھی اودھ اخبار اس کی خوب تشہیر کرتا تھا۔ دونوں قوموں کے تہواروں کے موقع پر خاص نمبر شائع ہوتے تھے۔ مضامین اور نظمیں لکھنے والے ادیب و شاعر ہندو بھی ہوتے اور مسلمان بھی۔ اس اخبار کے اڈیٹر ہندو بھی رہے اور مسلمان بھی۔ سب سے زیادہ مشہور و مقبول اڈیٹر رتن ناتھ سرشار تھے جن کے زورِ قلم کا نتیجہ فسانۂ آزاد کی صورت میں ہمارے پاس ہے۔ اس ضخیم فسانہ کو اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ اودھ اخبار نے اردو زبان و ادب اور صنفِ صحافت کی جو خدمت کی اسے کسی دور میں بھلایا نہیں جا سکتا ہے۔

منشی نولکشور نے پہلی بار مضامین کا معاوضہ دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اخبار کے نامہ نگار اور نمائندے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں متعین کیے، اس میں بھی ان کو اوّلیت کا شرف حاصل تھا۔ انھوں نے خدمتِ خلق اور احیاء علوم، طباعت و اشاعت وغیرہ کے جو منصوبے بنائے تھے ان کو اپنی زندگی میں تکمیل تک پہنچایا۔ وہ کاروباری آداب سے بھی خوب واقف تھے، اور ملک کی تہذیبی اور ثقافتی ضروریات پر گہری نظر رکھتے تھے۔

ان کی دلچسپیاں کاروباری زندگی تک محدود نہ تھیں وہ علم دوست و عالم شناس تھے۔ صاحبِ کمال فنکاروں کے بڑے قدرداں تھے ان کے مطبع میں ہر علم و فن کے ماہرین کا اجتماع تھا۔ سب کے ساتھ ان کا برتاؤ اچھا تھا۔ سب کو فکرِ معاش سے آزاد رکھ کر ان کی خدمات سے استفادہ کرتے تھے۔ انھوں نے سماجی خدمات نہایت خلوص سے انجام دیں۔ ان کی کوشش سے لکھنؤ میں جلسۂ تہذیب کا قیام عمل میں آیا تھا جو ہندو مسلم اتحاد کا مرکز بن گیا۔ اس انجمن

---

[1] اردو کے ہندو ادیب حاشیہ صفحہ ۱۸۴۔ مطبوعہ انوار بک ڈپو لکھنؤ۔

کے جلسوں میں وہ تقریریں کرتے تھے، اور حق بات کہنے میں حکومت کی خفگی کو بھی نظر انداز کر دیتے تھے۔ اس کا اندازہ اودھ اخبار میں ان کی شائع شدہ تقاریر و تبصروں سے ہوتا ہے۔ حکومت یو پی کے حکام خاص طور پر ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ ملک کے متعدد والیانِ ریاست اس بات کے خواہش مند ہوئے کہ ان کو وزارت اعلیٰ کی کرسی تفویض کر دیں لیکن انھوں نے اپنے لیے خدمت ملک و قوم کا جو منصوبہ بنایا اور جس پر عمل پیرا تھے اس کو کسی قیمت پر چھوڑنا گوارہ نہ تھا۔ مہاراجہ جے پور کی پیش کش کا ذکر ان کے سوانح نگاروں نے کیا ہے۔

علمی و ادبی حلقوں میں بھی ان کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ مرزا غالب سے ان کے تعلقات کا حال علیحدہ عنوان سے کیا جا چکا ہے۔ غالب ان کو کس نظر سے دیکھتے تھے اس کے لیے ایک خط کا اقتباس پیش نظر ہے جو غالب نے مردان علی خاں رعنا کے نام لکھا تھا کہ:

"منشی نولکشور صاحب یہاں آئے تھے۔ مجھ سے ملے، بہت خوبصورت، اور خوش سیرت، سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں۔ تمہارے وہ مداح اور میں ان کا ثنا خواں۔"

لکھنؤ کے علماء، اہلِ دانش اور شعراء سے بھی ان کے مراسم تھے۔ اور ادبی محفلوں اور مشاعروں میں ذوق و شوق سے شرکت کرتے تھے۔ میر انیس کی مجالس میں خاص طور پر شریک ہوتے تھے۔ خود مطبع میں انھوں نے مشاعرے کی محفلیں منعقد کرائیں۔ ان کے مشاعروں میں نواب مظفر علی خاں اسیر "سابق وزیر دربار اودھ" بھی شریک ہوتے تھے۔ لکھنؤ اور اودھ کے دوسرے نوابین اور رؤسا سے خوشگوار مراسم قائم تھے۔ اور ان میں سے بعض کی مدد سے نادر و کمیاب کتابوں کے مخطوطات حاصل کرتے تھے۔ علماء فرنگی محل سے بھی روابط قائم تھے، مذہبی کتابوں کی طباعت کے سلسلہ میں ان کے مشوروں سے استفادہ کرتے۔ بعض علماء ان کے مطبع سے بھی وابستہ رہے۔ مولانا فخر الدین فرنگی محلی سے خاص دوستانہ رسم و راہ تھی۔ انھوں نے امام غزالی کی مشہور تصنیف کیمیائے سعادت کا ترجمہ اردو میں کیا تھا، جس کا دیباچہ خود منشی نولکشور نے تحریر کیا تھا۔

منشی نولکشور چاہتے تھے کہ علوم و فنون کے بیش بہا ذخیروں اور قدیم تہذیبی یادگاروں کو زندہ رکھا جائے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں سرکاری اور نجی کتب خانوں کو جو نقصان پہنچا تھا اس کو انھوں نے خود دیکھا تھا۔ وہ انتزاع سلطنت اودھ، اور شاہی خاندانوں کے مصائب سے بہت متاثر تھے۔ جب مطبع کا کاروبار شروع کیا تو ان کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ مختلف ذرائع سے نادر و کمیاب مخطوطات تلاش کر کے ان کی اشاعت کا انتظام کریں، خاص طور پر ان مذہبی، اخلاقی اور تاریخی غیر مطبوعہ کتابوں پر زیادہ توجہ کی، جن کی اس زمانہ میں ضرورت تھی۔ اسی کے ساتھ مدارس و مکاتب کے نصاب میں شامل ہونے والی کتابوں کی کمیابی

سے طلبا پریشاں رہتے تھے عام طور پر کسی ایک استاد یا طالب علم کے پاس کوئی قلمی نسخہ ہوتا تو دوسرے حسب ضرورت اس کی نقل کر لیتے تھے۔ جس میں بہت وقت صرف ہوتا تھا۔ منشی نولکشور نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے قدیم مخطوطات اور مسودات حاصل کرنے کے لیے جد و جہد شروع کی اس سلسلہ میں ان کو شاہانِ اودھ کے پس ماندگان اور بعض علمائے کرام کے ذریعہ بہت سے مسودات ملے جن کو انھوں نے خرید لیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر جہاں کسی اہم مخطوطے کا پتہ چلا اس کے حصول کے لیے اپنا کوئی نمائندہ بھیج کر اس کو خرید لیا۔ بعض اہلِ علم نے ان کو عام فائدے کے خیال سے بلا معاوضہ اپنے مخطوطات دے دیے۔ مؤلف جیون چرتر نے لکھا ہے کہ:

"اس سمے (وقت) چھاپہ خانہ کم ہونے سے پرانی کتابیں ہر علم و فن کی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی تھیں۔ آپ نے ان کا کھوج کرنا شروع کیا اور بڑے بڑے امرا متوسلان خاندان شاہی کے کتاب خانوں اور جہاں سے مل سکیں ہزاروں روپیہ خرچ کر کے بہم پہنچائیں..... تن، من، دھن لگا کر اپنے مطبع میں چھپوائیں جن کے ناموں کی فہرست ایک بڑی کتاب ہے۔"[1]

منشی نولکشور کی اس جد و جہد کی بدولت نادر و نایاب مسودے ضائع ہونے سے محفوظ رہے اور طبع ہو کر اہلِ ذوق اور تشنگانِ علوم کو آسانی سے دستیاب ہوئے۔ منشی نولکشور کے فراہم کیے ہوئے بیشتر مخطوطات ان کی زندگی میں شائع ہو گئے تھے اور کچھ ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔ ان میں سے بعض طباعت و اشاعت سے محروم رہے اور مطبع کے محافظ خانہ کی زینت بن گئے۔[2]

وہ اودھ اخبار کے بانی اور مدیر اعلیٰ تھے۔ اردو زبان کا یہ پہلا اخبار تھا جس نے صحافت کے معیار کو بلند کیا۔ حق گوئی اور بے باکی اس کی اہم خصوصیت تھی۔ خطرہ مول لے کر منشی نولکشور حکومت کے غلط کاموں پر تنقید کرتے تھے۔ اودھ اخبار کے صفحات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ انھوں نے ہر شعبہ کے لیے کام کے اوقات مقرر کر لیے تھے۔ اسی وقت اس کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ کتب خانے اور مطبع کی کارگزاری دیکھنے کے بعد "اودھ اخبار" کے لیے کافی وقت صرف کرتے۔ ان کے علاوہ اپنی دیہاتی اور شہری جائداد کے معاملات بھی دیکھنا ضروری خیال کرتے تھے "کام زیادہ اور آرام کم" یہ ان کا معمول تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں تقریباً پچیس فنون کی چار ہزار کتابیں طبع کرا کے شائع کیں۔

●●

---

[1] جیون چرتر منشی نولکشور صفحہ ۵، مطبوعہ نولکشور پریس۔ و اودھ ریویو، ماہ فروری ۱۸۹۵ء۔ و تاریخ ادب اردو۔

[2] جیون چرتر صفحہ ۱۱ و ۱۲، مطبوعہ نولکشور پریس ۱۹۰۳ء؛ تاریخ صفحات اردو۔ از امداد صابری جلد دوم

# تحفۂ کرنیل ایبٹ

TOHFAH COLONEL ABBOTT.

یعنی واسطے یادگار نامی جناب کرنیل ساڈرس الکس ایبٹ صاحب بہادر کمشنر لکھنؤ کے

منشی نول کشور پروپرائیٹر مطبع نے مختصر کیفیات ہند و تواریخ اودہ تا عہد واجد علی شاہ مسمی بہ

باعداد عیسوی ۱۸۶۳ ع

# تواریخ نادر العصر

مع حالات تعمیرات شاہی و نقشہ خاص شہر لکھنؤ مرتبہ کرنیل صاحب ممدوح الیہ جس سے محلے محلے کے حدود اور بعد مسافت

شہروں اور عمارات کا باہم دریافت ہو بعجلت تمام واسطے پیشکش صاحب ممدوح الیہ کے تالیف و ترتیب کیا

مقام لکھنؤ میں

کارگزاران مطبع منشی نول کشور مؤلف نسخۂ ہذا کے اہتمام سے چھپا

۱۸۶۳ء

# فہرست مطالب تواریخ نادر العصر

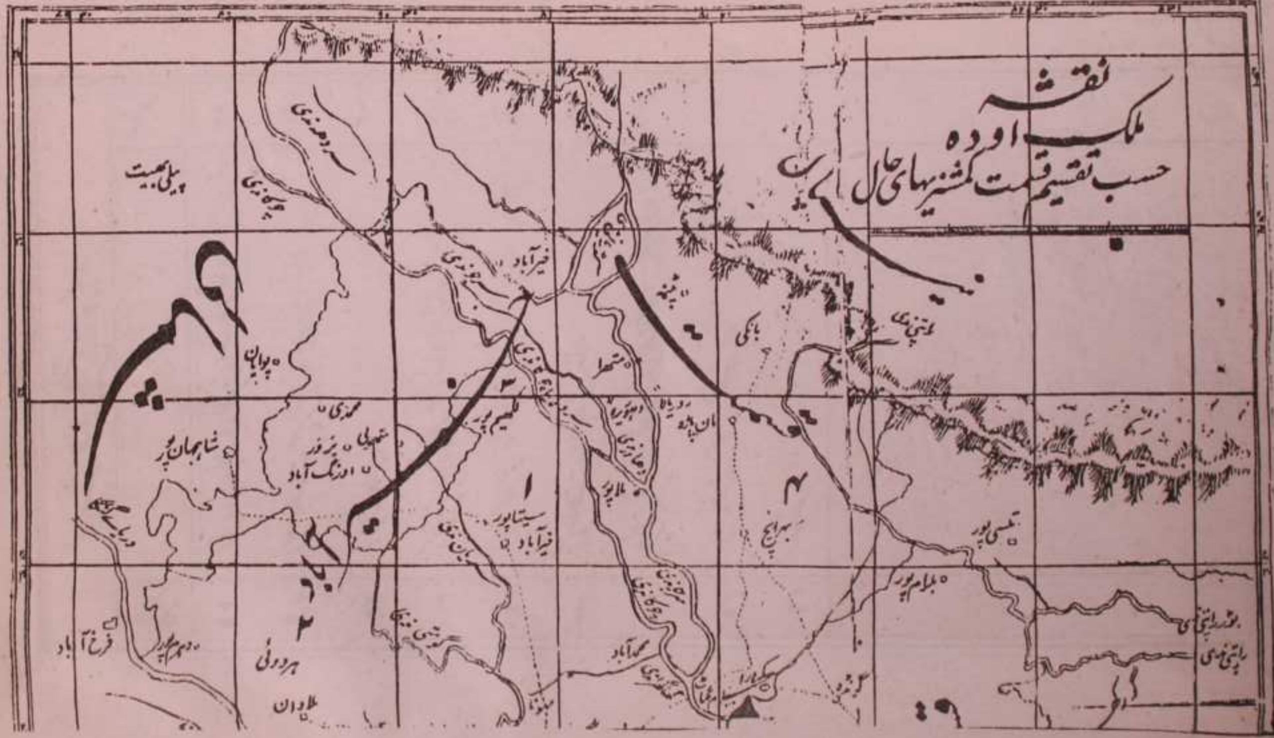

| نمبر شمار | مضمون | صفحہ |
|---|---|---|
| ۱ | ذکر حالات کرنیل صاحب ... | ۳ |
| ۲ | کرنیل صاحب کا ولایت جانا ... | ۹ |
| ۳ | شکریہ روساو عمائد شہر | ۱۰ |
| ۴ | جواب شکریہ از جانب کمشنر صاحب ... | ۱۲ |
| ۵ | مضامین تمہید شکریہ و اوصاف صاحب موصوف | ۱۵ |
| ۶ | قصائد و اشعار ... | ۱۶ |
| ۷ | ابتدا | ۱ |
| ۸ | ہندوستان کے راجاؤنکا سلسلہ ... | " |
| ۹ | علم کا بیان | ۴ |
| ۱۰ | ہنود مذہب کا طریق ... | " |
| ۱۱ | ہند کا حال | ۶ |
| ۱۲ | ہند کے باشندونکا ذکر ... | " |
| ۱۳ | جدول معدنیات ہند ... | ۷ |
| ۱۴ | بادشاہان اسلام ... | ۱۰ |
| ۱۵ | تسلط سرکار کمپنی و مختصر حالات ہند اوسی زمانہ کا | ۱۹ |

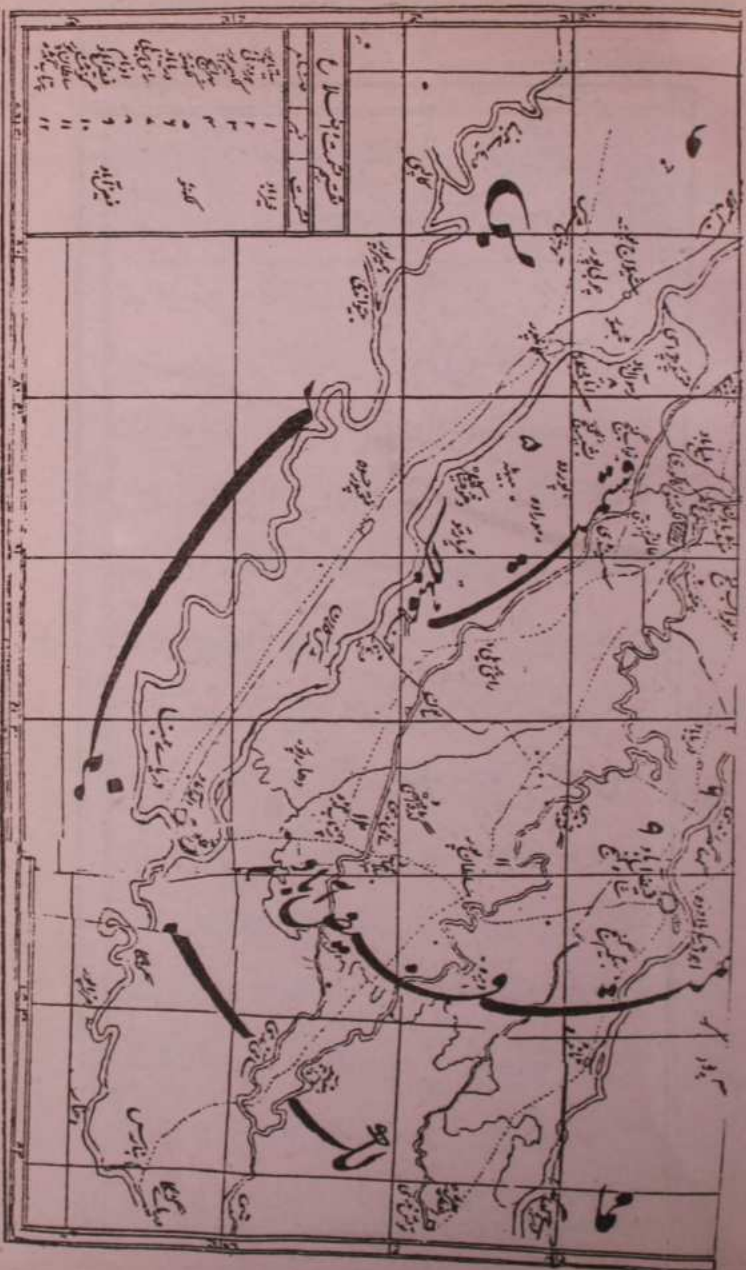
# فہرست مطالب تواریخ نادر العصر

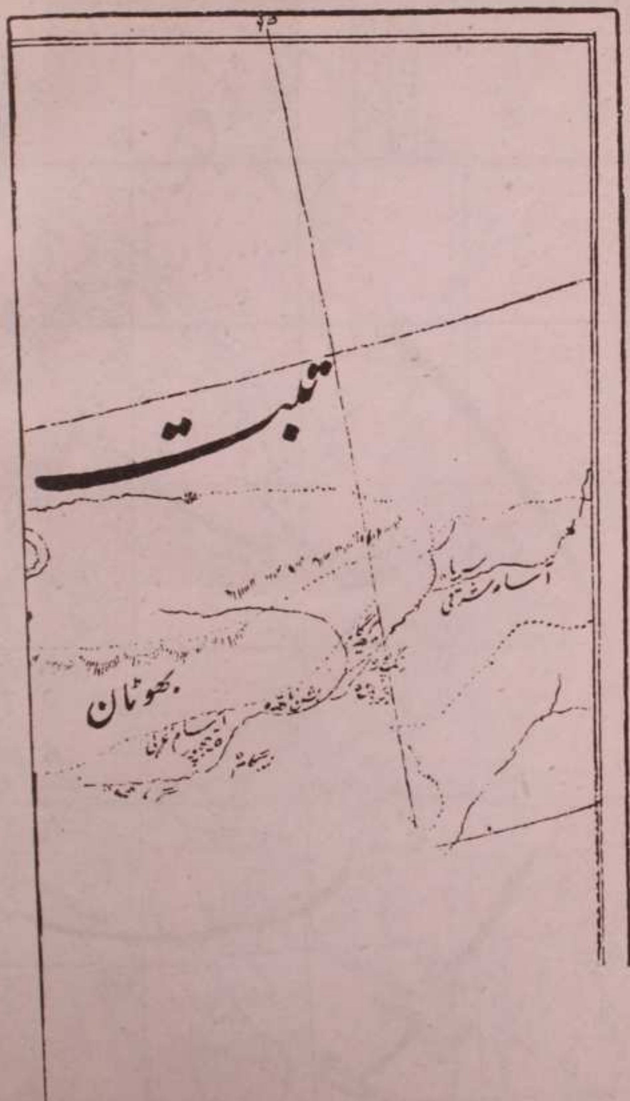

| نمبر شمار | مضمون | صفحہ |
|---|---|---|
| ۱۶ | غدر کا حال | ۲۷ |
| ۱۷ | ذکر عہد دولت ملکۂ معظمہ | ۲۸ |
| ۱۸ | رونق تازہ | ۲۹ |
| ۱۹ | جدول ریاست ہاے ہندوستانی | ۳۰ |
| ۲۰ | جغرافیۂ اودہ | ۳۴ |
| ۲۱ | اودہ کا بیان مع اسماے اضلاع | ۳۶ |
| ۲۲ | ریاست اودہ حال نواب سعادت خان برہان الملک | ۵۲ |
| ۲۳ | حال نواب صفدر جنگ | ۵۴ |
| | جنگ میر قاسم خان با انگریزان | ۵۷ |
| ۲۴ | ذکر نواب شجاع الدولہ | ۶۱ |
| | ریاست ہاے بندیل کھنڈ کی شورشین | ۶۳ |
| | وقایع احمد خان بنگش | ۶۴ |
| ۲۵ | ذکر نواب آصف الدولہ | ۶۶ |
| ۲۶ | ذکر مرزا وزیر علیخان | ۷۳ |
| ۲۷ | ذکر نواب سعادت علیخان | ۷۵ |

# فہرست مطالب تواریخ نادر العصر


| نمبر شمار | مضمون | صفحہ |
| --- | --- | --- |
| ۲۸ | ذکر نواب غازی الدین حیدر بادشاہ ... | ۸۳ |
| ۲۹ | ذکر سلطنت نصیر الدین حیدر بادشاہ ... | ۹۱ |
| ۳۰ | ذکر منّا جان ... | ۱۰۳ |
| ۳۱ | ذکر نصیر الدولہ محمد علی شاہ بادشاہ ... | ۱۰۷ |
| ۳۲ | ذکر امجد علی شاہ بادشاہ ... | ۱۱۱ |
| ۳۳ | ذکر سلطنت واجد علی شاہ ... | ۱۲۰ |
| ۳۴ | تذکرۂ تعمیرات لکھنؤ و کوائف تعمیرات موجودہ ... | ۱۳۰ |
| ۳۵ | ذکر باشندگان لکھنؤ ... | ۱۶۸ |
| ۳۶ | خاتمہ .. | ۱۷۴ |


نقشه
ملك اوده
حسب تقسيم قسمت كمشنريهاى حال
شاهجهان پور
پيلى بهيت
سيتاپور
بهرايچ
بلرامپور
هردوئى
فرخ آباد
اورنگ آباد
١
٢
٣
٤





تبت
بھوٹان

## هو المستعان

این نامه که خامه کرد بنیاد
توقیع قبول روزیش باد

راقم الحروف ہیچمیرز نول کشور جامع اوراق ناظرین اولی الابصار کی
خدمت مین گزارش کرتا ہی کہ جب غدر ۱۸۵۷ء کے بعد یہ ہیچمدان
ملک پنجاب سے شہر اکبرآباد مین پوہنچا بعد چندے یعنی اخیر ۱۸۵۷ء
لکھنؤ کا اتفاق ہوا یہان جناب فیضماب کرنیل ایبٹ صاحب بہادر کی
ملازمت کیمیا خاصیت سے جو ہوشیارپور متعلقہ پنجاب کی ڈپٹی کمشنری
سے عہدہ جلیلۂ کمشنری وسپرنٹنڈنٹی قسمت لکھنؤ متعلقہ صوبہ اودہ پر تشریف
لائے تھے ساعت سعید مین عزت وامتیاز حاصل کی بسکہ پنجاب مین
مطبع متعلقہ راقم کا حسن اہتمام قدر دانی حکام سے مشہور تھا فرط عنایت
جناب صاحب ممدوح سے باوجود کم بضاعتی کے اسباب وآلات
کلکتے سے یہان لایا اوسوقت سے آج تک باوجود نشیب وفراز زمانہ
خاص خاوندی جناب محتشم الیہ کے سبب سے یوماً فیوماً ترقی رہی بلکہ
موقع احتمال ضرر مین برعکس فائدے حاصل ہوئے اب کہ ۱۸۶۳ء مین
صاحب محتشم الیہ پانچ برس کے بعد آسایش روحانی وصحت بدنی کے
لیے پندرہ مہینے کی رخصت لیکر عازم ولایت ہونے لگے صاحب

موصوف کے احباب کیا صاحبان ذی رتبہ کیا روسا و عمائد شہر کو جدائی اونکی بہت شاق گذری اس تقریب مین سپاس نامے پڑھے گئے و عوتین ہوئین لہذا بقول آنکہ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست حقیر نے بھی موقع مناسب سمجھکر ہفتے عشرے کے اندر یہ عجالہ تالیفات قدیمہ سے انتخاب کر کے اور کچھ اپنی یادداشت سے بڑھاکر اس بضاعت مزجات کو بہ پیشکش خدام عالیمقام کیا کہ تا تشریف آوری بطور یادگار تحفۂ بازوی روزگار رہے اور اس نام نامی سے مجکو اور میرے مطبع کو تبرک حاصل ہو ؏ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ چنانچہ قبل اظہار مطلب اولا حالات تشریف آوری صاحب محتشم الیہ کے ہندوستان مین اور کارگزاریہای عظیمہ بعد اسکے ذکر سپاس نامونکا جو روسا و عمائد نے جس عنوان کے ساتھہ پیش کیے بگذارش حقیقت حال اور اخیر مین قصائد و قطعات جو صاحب ممدوح کی مدح مین اس مطبع کے متوسلون نے موزون کیے ہین لکھے اگرچہ یہ ہدیۂ مختصر اتحاف کے قابل نتھا لیکن

کند ہر کس بقدر خویشتن منت گذاریہا
زیاران تحفۂ دیگر ز مظہر جان نثاریہا

---

کرنیل ایس ای ایبٹ صاحب بہادر کمشنر لکھنؤ



## LIEUT.-COLL. S. A. ABBOTT,

COMMISSIONER, LUCKNOW DIVISION.

*Health, long life and prosperity may attend his retirement now and ever.*

# حال ابتداے آمد جناب کرنیل ایس ای ایبٹ صاحب بہادر کا ہندوستان مین

۱۸۲۸ع مین کرنیل صاحب موصوف بعہدۂ انسائین ولایت سی داخل کلکتہ ہوے دوسری سال اسی عہدی پر مقرر ہو کر ہمراہ ۲۴ رجمنٹ ہندوستانی نیمچ کو بھیجی گئی چند روز کی بعد وہانسی تبدیل ہو کر ۱۵ رجمنٹ ہندوستانی مین مقرر ہوے اور اسی فوج کی ساتھ ۱۸۳۴ و ۱۸۳۵ع مین شیخاوالی کی لڑائی مین موجود رہی جب ہمبر لاھی گڑھی فتح کی گئی اوسوقت صاحب موصوف چند کمپنی کی افسر تھی بعد اس لڑائی کی صاحب ممدوح رسالی مین پہلی رجمنٹ کی مترجم ہوی ۱۸۳۶ع مین ماتحت کرنیل سر ہنری لارنس صاحب مرحوم کہ اوسوقت مین کپتان تھے محکمۂ پیمایش کے اسسٹنٹ مقرر ہوی چنانچہ اسیوقت سی تا وفات کرنیل لارنس صاحب دونون صاحبون مین دوستی چلی آئی صاحب موصوف نے جنکو عہدہ لفٹنٹ کا ملا ضلع گورکھپور والہ آباد کی پیمایش کی ۱۸۳۰ع مین بندوبست کا محکمہ اونکی متعلق ہوا اور اونھون نے ضلع کانپور وجونپور وکسیقدر ضلع بنارس وضلع جالون واقع بندیل کھنڈ کو پیمایش کیا اور جب ۱۸۴۲ع مین تخفیف مصارف کے سبب سے گورنمنٹ نے کل پیمایش کی محکمی کی تخفیف کی صاحب موصوف نے اوسوقت مین عہدۂ کپتان پایا تھا افسر کمسریٹ باختیار مجسٹریٹی ہمراہ کمپ گورنر جنرل جو واسطی ملنے اوس فوج کی جو کابل سی لوٹی آتی تھی فیروزپور کو جاتا تھا مقرر

ہوئے ۱۸۴۳ء مین جب کمپ ٹوٹا صاحب موصوف بعہدہ اڈیکانگ
یعنی مصاحب لارڈ الین براصاحب گورنر جنرل کی مقرر ہوکی ہمراہ محتشم الیہ
کلکتے کو گئے ماہ اکتوبر سنہ مذکور مین صاحب موصوف ماتحت کرنیل
رچمنڈ صاحب بہادر سنی لی اجنٹ گورنر جنرل اضلاع غربی و شمالی کے
اسسٹنٹ مقرر ہوی اور ماہ جون ۱۸۴۴ء تک ضلع لدھیانا وفیروزپور
اونکی تعلق رہا اس ۱۸۴۴ء مین ادن سپاہی پلٹن نی جو سندہ کو جاتی
تھی بغاوت کی اور خوف اس بات کا ہوا کہ سکھونکا ارادہ حملہ کرنیکا
ہی دہنے کنارے دریاے ستلج کے ایک فوج خالصہ کی جاکر مقیم ہوئی
مگر چونکہ رات کیوقت اونکی سردار مارے گئے وہ لوگ لاہور کو ارادہ
بغاوت سی پھری ہوے واپس آئے چند روز بعد صاحب موصوف کو حکم
پیمایش و بندوبست ضلع کیتھل کا ہوا مگر اختتام اسکا ہو نہ سکا بوجہ
حملۂ ثانی سکھون کے کہ جو ماہ دسمبر ۱۸۴۵ء مین ہوا اوسوقت براڈفٹ
صاحب نے خاص چٹھی لکھکر صاحب موصوف کو طلب کیا کہ آکے
انصرام رسد فوج جو جمع ہورہی تھی کرین صاحب بہادر سب انتظام
اسکا کرکے پچاس کوس گھوڑے پر سوار ہو جناب گورنر جنرل بہادر
سے انبالے مین جا ملے اوسوقت خبر پہونچی کہ سکھونکی فوج دریاے
ستلج کے پار اوتر آئی ہے تب صاحب موصوف کو حکم ہوا کہ کسولی

پہاڑ پر جاکے فوراً ۲۹ رجمنٹ اور ایک نمبر فیوزیلیرس پلٹن لے آوین
اوسیوقت بہ تعمیل حکم صاحب موصوف گھوڑے پر سوار ہو ہر شام
کسولی پہاڑ پر جو ۴۵ میل تھا پہونچے اور دوسری صبح فوج کو
ہمراہ لیکر روانہ ہوے اور تھوڑے عرصے مین کمپ گورنر جنرل
مین داخل ہوے اس بروقت مدد فوج سے ہارڈنگ صاحب بہادر
نے دشمن کا مقابلہ مقام فیروز پور مین کیا اور میجر براڈفٹ صاحب
و صاحب موصوف بھی لڑائی پر مصروف رہے مگر ایڈیکانگ یعنی
مصاحب گورنر جنرل کہلایا کیے تبکی اور فیروزپور کی لڑائی مین
منجملہ ۱۳ افسر ۵ مصاحب گورنر جنرل کے جو لارڈ ہارڈنگ صاحب کے
ہمرکاب تھے کام آئے اور میجر براڈفٹ صاحب بھی اونمین سے
ایک مصاحب تھے جو مارے گئے اور ۵ مصاحب گھایل ہوے کہ منجملہ
اونکے صاحب موصوف بھی ایک زخم رسیدہ تھے یعنی صاحب موصوف
کو ایک گولی بائین ہاتہ سے ہوکر نکل گئی اور ایک کاندھے کی ہڈی سے پیٹ کی
پسلی مین جا گڑی چھہ ہفتے تک صاحب موصوف اس درد و تکلیف
مین فیروزپور مین مقیم رہے جب صحت ہوئی تب حکم ملا کہ دیہات مین جاکر
تدبیر رسد کی کرین اس کارگزاری کی تعریف کی رپورٹ ولایت مین
ہوئی اور تب کپتان صاحب بہادر کو عہدہ بریوٹ میجر کا ملا صاحب موصوف کو لارڈ ہارڈنگ

گورنر جنرل نے ایک تمغہ اور لقب انریری ایڈیکانگ یعنی
انریری مصاحب کا عطا فرمایا اور وہ لقب آج تک سب صاحبان
گورنر نے جو بعد لارڈ ہارڈنگ مقرر ہوئے برقرار رکھا۔
اب بعد انصرام بندوبست ضلع کتھیل ولڈوا میجر صاحب ۱۸۴۷ء
مین ضلع انبالہ مین مقرر ہوئے جب سکھون کی دوسری لڑائی
ہوئی صاحب موصوف اسی ضلع مین مقرر تھے وہ بھی وقت
نہایت آزمایش و بیدار مغزی و بہادری کا تھا کہ ۱۸۴۹ء مین ہوشیارپور
کے عہدہ صاحب ضلع کیواسطے مقرر ہوئے اور اس ضلع مین عرصہ تک رہے
صاحب موصوف نے کمال رفاہ و آسایش رسانی خلائق سے
نئے انتظام انگریزی کو اوسی ضلع مین بٹھایا یہ صاحب ہی کا کام تھا
اور وہان سے تھوڑے دنون کے بعد بوجہ ناسازی مزاج
پندرہ مہینے کی رخصت لیکر ولایت کو تشریف لیگئے ماہ فروری
۱۸۵۵ء مین مراجعت فرمائی ۱۸۵۷ء مین بلوہ ہوا چنانچہ ۱۸۵۷ء
و ۱۸۵۸ء کی بابت صاحب ممدوح کی مفصل کارگزاریان پنجاب کی رپورٹ
مین مندرج ہین اوس ایام غدر کا انتظام ایسا عمدہ کیا کہ نہ آسایش
رعایا مین خلل آیا نہ دست تصرف باغیان سے اوس ضلع کو ضرر پہنچا
کمال بیدار مغزی و بہادرانہ طریق سے ضلع ہوشیارپور کا انتظام

بر قرار رکھا کہ آنزوے ستلج کے سب ضلعون مین آتش فساد
و نائرہ بلوہ مشتعل تھی اور گرد و پیش مین غدر کے نتیجے یعنے
لوٹ مار جوبن خرابے سے حشر بپا تھا مگر صاحب موصوف کے
انتظام و اخلاق و غریب پروری سے جون تک نہ مری کرنیل
سر ہنری لارنس صاحب بہادر چونکہ چیف کمشنر اودہ تھے
میجر ایبٹ صاحب بہادر کو قائم مقام کمشنر لکھنؤ فرما کر تار برقیۂ
خبر بھیجی تھی لیکن تار کو باغیون نے متصل شہر دہلی ہنگامۂ غدر
مین کاٹ ڈالا تھا اس سبب سے خبر نہ پونہچی جبکہ ۱۸۵۸ء مین
سر رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر چیف کمشنر ہوے اوسی
عہدۂ کمشنری لکھنؤ پر مستقل فرمایا اور ماہ اپریل مین لکھنؤ
تشریف لائے اب لکھنؤ مین تشریف لائے ہوے پورے
پانچ برس ہوے اور اسی جگہ عہدہ کرنیلی کا حاصل کیا
اُس زمانہ پر آشوب غدر مین اس عہدے پر لکھنؤ مین رونق افروز
ہوے تھے کہ شہر اوجاڑ پڑا تھا اکثر مقامات پر آدمیونکی
لاشون کی بو سے دماغ سڑتا تھا خلق اللہ رمیدہ تھی
آپ ڈر سے کانپتے تھے نواح مین باغیون کی لوٹ مار
غدر سے حشر برپا تھا اور آواز توپ و تفنگ سے افسران انگریزی

شب و روز مستعد بجنگ رہتے تھے چنانچہ خاص تدابیر صاحب موصوف نے اس قسمت کی قسمت کو بیدار کیا رفاہ پسندی اور آرام دہی سے رعایا کو تسکین دی اور آبادی مین توجہ فرمائی غرض عدل و رحم صاحب موصوف کا بیان کی حد سے باہر ہے نئے خوف وخطر اپنے وطن کو آئے خانہ آباد و دولت روز افزون سے آبادی شہر ہوئی شہر کی لوٹ اور ڈاکہ اور چوریون کا انسداد کیا گیا غرض پانچ برس رفاہ و آسودگی خلائق مین ایسی توجہ کی کہ آج کے دن صاحب موصوف کے محامد اوصاف کو یاد کرکے فرط جدائی کا قلق سہا نہین جاتا۔

غرض ابتدا سے آمد ہندوستان مین اس ۱۸۶۳ء تک ۴۳ برس ہندوستان مین رہے خدا آسائش روحانی وجسمانی نصیب کرے اب سن شریف صاحب محتشم الیہ کا ۵۲ برس کا ہے۔ اس بیان سے جانا چاہیے کہ صاحب محتشم الیہ نے کیسی کیسی دشواریان سہین ابتدائے آمد ہندوستان سے اہم کامون کی انجام دہی یادگار اس ۴۳ برس مین جس جس مقام پر رہے رفاہ خلائق وکار سرکاری کو اپنی آسائش پر مقدم سمجھے اور خصوص اس پانچ برس کی گشتری مین ۱۰ لاکھ آدمیونکو الطاف و رحم دلی و انصاف صاحب معدوح یادگار رہیگا فقط

# کرنیل ایبٹ صاحب بہادر کمشنر لکھنؤ کا رخصت پر ولایت کو تشریف لیجانا

ای خرم از فروغ رخت لالہ زار عمر  بازآ کہ رفت بی گل روئیت بہار عمر

مارچ کی ۲۴ تاریخ سہ شنبہ کو ۳ بجے چتر منزل مین تقریب ادای سپاس (جناب معلی القاب کرنیل ساندرس الکسس ایبٹ صاحب بہادر کمشنر قسمت لکھنؤ) کے مجلس شاہزادون نوابون امیرون و ساہوکارون اور نامی گرامی رئیسون اور صاحبان جلیل القدر کی منعقد ہوئی مگر چونکہ انعقاد مین عجلت ہوئی اسلیے ہزارون امرا اور روسا کو عدم صحت تحقیق روز کے سبب سے خبر نہ پونہچی کمال حسرت ہی پر بھی سب صاحب قریب ایکہزار کے تشریف فرما تھے مکان کی عالیشانی اور فضا اور سامان کے بیان کی یہان گنجایش نہین ہے عقیدت و ارادت جناب محتشم الیہ سے شہر کے جملہ روسا و عمائد و عوام الناس کا دل بکمال تمناشا کر تھا صاحب محتشم الیہ آسایش دہی و رفاہ رسانی و فراغ بخشی و عدالت نوشیروانی کا متنفس مداح تھا چنانچہ آرزومندون نے ذریعہ اس حصول ملازمت ادای شکریہ کا نواب محسن الدولہ بہادر کی تحریک سے پاکر اپنی اپنی تمنا پر کامیابی حاصل کی اور جلسہ عام مین سپاسنامہ مندرجہ ذیل پڑہا گیا

# نقل سپاس نامہ از جانب شہزادگان ورؤسا و عمائد شہر لکھنؤ

سپاس نامہ بخدمت کرنیل سانڈرس الکسس ایبٹ صاحب بہادر کمشنر قسمت لکھنؤ و انرری ایڈیکان جناب مستطاب معلی القاب نواب گورنر جنرل بہادر ویسرائے کشور ہند خلد اللہ ملکہ از طرف جملہ شاہزادگان و عزیزان خاندان شاہی ورئیسان و مہاجنان وغیرہ ساکنان شہر لکھنؤ خاص کے نواب محسن الدولہ بہادر نے پیش کیا ٭

چونکہ بعد فتح لکھنؤ و دفع باغیان و تسلط سرکار دولتمدار گورنمنٹ انگلشیہ در روز اجلاس فرمائی آپ کے عہدۂ کمشنری لکھنؤ پر جو جو اخلاق و محبت و قدر دانی و شرافت پروری و عدل گستری نسبت ہم لوگون کے آپ کی جانب سے ظہور مین آئین ادائے شکریہ مین اوسکے ہم لوگون کی زبان قاصر ہے آپ کی بیدار مغزی و معاملہ فہمی کی نسبت تعریف و توصیف کرنے کی کیا حاجت انفصال مقدمات سے ظاہر ہے آپ کے انصاف و عدل سے کوئی شخص شاکی کسیطرحکی حق تلفی کا نہین ہے بلکہ واضح ہے بعد ایام غدر کے اس شہر تباہ و برباد کو اپنی عنایت سے اور ہم لوگونکی قدر دانی و دلجوئی سے از سر نو آباد کیا ہر فرد بشر آپ کی محبت و اخلاق سے راضی

وشاکر ہے آپ کے عہد معدلت مہد مین ہر طرح کا چین وآرام رہا اس عمدۂ جلیلہ کا بخوبی بندوبست وانتظام رہا جاید اد باشندگان شہر کو آپ نے ترقی دی ضبطی سے بچایا مظلوموں کو ظالموں کے پنجے سے چھوڑایا حق سے باطل کو جدا کیا عدل گستری ورعایا پروری سے ہر کہ و مہ کو مطمئن و دلشاد کیا جس سے ہم سب آپ سے بدل راضی وممنون وشاکر ہین ہم لوگون کو آپ کی مفارقت سے بوجہ تشریف بری ولایت کے بتقریب رخصت کے جو کچہہ رنج و ملال ہے زبان قلم تحریر مین اوسکے لال ہے لیکن کچہہ اختیار نہین بجز اسکے کہ حق سبحانہ وتعالے ہمیشہ آپ کو اسپے حفظ وامان مین رکہے وبخیر وعافیت تمام منزل مقصود کو پونہچاوے اور جلد آپ کی ملاقات مسرت آیات بترقی جاہ وحشم پہر ہم لوگون کو مسرت اندوز کرے ترصد کہ تا زمان مفارقت بدستور مشمول حال شفقت ومحبت وعنایت وعاطفت بہ نسبت ہم لوگون کے مرعی ومبذول رہے فقط مرقومہ ۳ ماہ مارچ ۱۸۶۳ء روز سہ شنبہ

اوسکو سماعت فرما کر جناب معلی القاب صاحب عزیز الیہ نے موافق رسم مستمرہ ایستادہ ہوکر جواب سپاسنامہ مین فصاحت وبلاغت سے جواہر زبان گوہرفشان کرکے آویزہ گوش ہوش اہل دربار فرمایا وہ بہی درج گوہر بار ہے بسکہ ہجوم خلائق حضار جلسہ بہ اونکے سننے کی تمنا میں رہی اسواسطے حسب الایما صاحب محتشم الیہ مرمیر اہتمام مطبع نے باواز بلند سنایا

## جواب سپاسنامہ از جانب کرنیل سانڈرس الکسیسٹاٹ صاحب بہادر کمشنر لکھنؤ مخاطب بنواب محسن الدولہ بہادر و شاہزادگان و امرایان و رئیسان شہر لکھنؤ

ای صاحبو پانچ برس کا عرصہ گذرا کہ راقم حسب الطلب صاحب نیک صفات سر رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر جنکی یاد یقین ہے کہ آپ سب صاحبون کو ہوگی بعہدۂ جلیلۂ کمشنری قسمت لکھنؤ کے پنجاب سے اس جگہہ آیا اسی عرصے مین شہر لکھنؤ باغیان سے صاف ہوا یہ باغیان ایسے نمک حرام تھے کہ سرکار گورنمنٹ سے جسنے سو برس تک انکی پرورش کی برخلاف ہوے اور تمام ملک ہندوستان مین علم بغاوت بلند کیا شہر لکھنؤ مین بکثرت مورچہ بنا کہ بندیان و ویرانگی تھی رعایاے شہر فرار ہو گئی اور شہر بعد فتح فوج سرکاری کے ہاتھ بدمعاشان و ڈکیتان سے غارت ہوتا رہا بلکہ یہ صورت عرصے تک رہی اور بعد وا پسی رعایا بدقت و بمشکل تمام امن و انتظام ہوا الا لوٹ دیر تک موقوف نہوئی اسے صاحبان جو آپ نے بنسبت ہمارے سپاسنامے مین تحریر فرمایا ہے کہ ہاتھ ظالمون سے بچایا اوس سے آپ کی یہی مراد ہے جو بالا لکہا گیا آپ شاہزادگان و امرایان و رعایای شہر لکھنؤ نے جو توصیف محنت راقم انتظام و انصاف گستری مین فرمائی ہے مین نہایت خوش ہوا اور میرا

جو آپ صاحبان فرماتے ہین کہ ہمنے راستی کو باطل سے علیحدہ کیا ہمین ہمارے فہم کی بہت زیادہ توصیف ہوئی یقین ہے آپ صاحبان کو کہ بسبب نہونے رعایا کے استبار کے انصاف گستری مین نقصان عظیم واقع ہے علاج یہ ہے کہ ہر ایک آپ صاحبان مین سے اولاد خاص و عام کو ترغیب تعلم علوم دین و نیک راہی و شوق راست گفتاری مین کوشش و امداد فرماوین اور بڑی امداد یہ ہے کہ آپ صاحبان خود بجاے کارندگان و مختاران کے اپنے امورات و کاروبار مین اپنی اوقات و توجہ مبذول کرین اگر آپ صاحبون مین سے اہالیان کمیٹی صفائی مین نہایت بہتر ہوگا اگر آپ سب صاحبان اسطے فوائد مشترکۂ عام کے توجہ بلیغ فرماوین اور تدابیر نیک واسطے صحت و آسایش و رفاہ کے تجویز کرین کہ یہ امر منتج فوائد عظیم ہوگا و انتظام و انصاف بہی مین بہی آپ کی امداد و کوشش سے فوائد و بہتری ہو سکتی ہے آپ صاحبان اگر واسطے تقرر اسیسری یا جوری وغیرہ کے طلب فرمائے جاتے ہین تو اوسکو تکلیف تصور کرتے ہین ہمارے راے مین یہ تجویز باعث بہتری آپ صاحبان کا ہے کیونکہ اس وسیلے سے آپکو اپنی راے پر اعتماد و بھروسا حاصل ہوگا اور ظاہر ہوگا کہ انتظام عدالت نہ صرف بطور ضابطہ ہے بلکہ واسطے گواہی دینے خاص و عام کو کہ صاحبان مجسٹریٹ و جج بہادر انصاف ورستی فرماتے ہین اور اسلیے کہ آپ اونکو تجویز منصفانہ مین امداد فرماوین کہ

یہ مفید ہر ایک صاحبون و خاص و عام کے ہوگا ہماری نہایت خوشی ہے
کہ آپ صاحبان مین سے جتنے صاحب آنریری مجسٹریٹ مقرر کیئے جاوین
چند عرصہ گذرا کہ یہ امر تجویز ہوا تھا یقین ہے کہ اسواسطے ملتوی رہا کہ اسکا
انتظام پنجاب مین جہان اجرا ہوا امتحان دیکھا جاوے ہمکو یقین ہے
کہ پنجاب مین یہ انتظام بہت مفید ہوا ہوا امید ہے کہ ہمکو موقع مبارکبادی
دینے کا در باب جلد بنے سڑک آہنی کے آپ صاحبون کو ملے کہ اس
سڑک سے شہر لکھنؤ و کانپور و دہلی و کلکتہ ایک ہوجائینگے اور اس سڑک
سے آپ صاحبون کو نہایت فائدہ ہوگا کہ آپ قدر و منزلت زمانہ سمجھینگے
اور دور آرایش سامان مین بکوشش تمام پیش قدمی کرینگے اور پیچھے نرہینگے
ای شاہزادگان و نواب صاحبان و رئیسان لکھنؤ مین شکر دلی ادا کرتا ہون
کہ آپ نے اس طرز شائستہ سے مجھے دعای بہبودی دی اور میری
مراجعت کی آرزو فرمائی یقین رہے آپ صاحبان کو کہ ہمارا دل لکھنؤ مین
ہے اور ہم نہایت رنج سے واسطے گونہ آرام لینے اپنے وطن کے
شہر سے جدائی کرتے ہین الا ہماری آرزو ہے کہ اگر زندہ رہے اور
اس عرصہ پندرہ یا بیس مہینے مین صحت حاصل ہوگئی تو ایک مرتبہ آپ
صاحبان کے پاس مراجعت کرینگے اور اس سپاسنامے مین جو آپ نے
بیانات مہربانی آمیز تحریر فرمائے ہین اسکا ہم بہت شکر ادا کرتے ہین

اور ہماری دعا ہے کہ آپ سب صاحبان تندرست و کامیاب ترقی دولت میں رہین فقط

## ازمولف

صاحب ممدوح کے محامد ذاتی و صفاتی عدل و قابلیت و خلق و حلم و قدردانی
ہرگز محتاج بیان نہین ٭

چلتے چلتے اونکی توجہ مربیانہ اور رفاہ پسندی اور عنایت جو عائد حال
خاص و عام رہی تمہ اونکا اونکے سیاسنامے سے آشکار ہے یعنی جو
امور کہ مفید اور باعث انتظام و بہتری خاص و عام کے ہین اونکی یاد پیرایہ
پند و نصائح مین دلائی جسپر عمل فرمانا منتج آسودگی و بہبود خاص و عام ہے
یہ سب دلسوزی اور توجہ اونکے عہدے سے بڑہکر محض نیکذاتی خلقی کا
موجب ہے سرکار کا کام ایسا کیا کہ انصاف مین نوشیروان پر سبقت لیگئے
رعایا پروری ایسی کہ ماں باپ بہی نکرتے حفظ مراتب وسادہ کہ قیامت تک
اونکو نہ بہولینگے ٭

ملک اودہ کے زہے طالع کہ یہان سب حکام عادل اور رعاپرور
اور نیکنام ہین حسن خلق مین یکتای روزگار ممدوح خاص و عام ہین دیکھو
آسمان پر بہت ستارے منور ہین قدرت خالق سے ہر ایک کے
فائدے مقرر ہین لیکن دن کو آفتاب کا جواب نہین رات کے وقت
ثانی ماہتاب نہین شعاع مہر سے میوون مین پختگی آتی ہی چاندنی اثمار کا

رس بڑھاتی ہی اسیطرح صاحب موصوف اپنے صفات مین انجاب مین
زور بہر وزری کے آفتاب شب امید کے ماہتاب ہین —

العرض بعد رسم سپاس کے صاحب والاشان سوار ہوے اور مجلس
برخاست ہوئی او سوقت کے افسوس اور حسرت کا حال لوگون کے
دل سے پوچھنا چاہیے مگر ہان صاحب ممدوح الوصف کے امید
بازآمد سے البتہ تسکین قلق مہاجرت ہے —

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعان غم مخور کلبۂ احزان شود روزی گلستان غم مخور

۲۵ مارچ کو بتقریب رخصت صاحب ممدوح کی جناب فیضماب نواب
محسن الدولہ بہادر رئیس اعظم لکھنو نے روشنی و آتشبازی کے ساتھ
بڑی دہوم دھام سے دعوت کی سبحان اللہ نواب صاحب کا
کیا کہنا شہر کی ابرو ہین سرکار کے دولتخواہ حکام کے رضا جو ہین —

الحاصل صاحب معتزمی الیہ کی جدائی کا قلق ایک زمانے کو ہے
اور سب دست بدعا ہین کہ مع الخیر والمراد بعد اتمام رخصت کے
پھر اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس خطے کو غیرت ارم
اور رویدار فیض آثار سے منور فرما دین آمین —

بسفر رفتنت مبارکباد بسلامت روی و باز آئی

قطعہ حسب حال عقیدت مؤلف از نتائج طبع سلیم مرزا سیم

ای فلک افسوس کیون کرتا ہی ایسی امتحان — سوچ اتنا او ستمگر تو کہان اور ہم کہان
کونسا احسان کیا تھا جسکی یہ پاداش ہے — اپنے محسن سے جو آئی لفظ رخصت بر زبان
وای قسمت ہم یہ سمجھی تھی یہ جمے رہینگی قدم — ہائی ناکامی یہ کیا سامان نظر آیا یہان
جوش بیتابی یہ کہتا ہی کہ ہو غفلت گزین — جب نہ آئی گل نظر کیا ہی سیر بوستان
آرزو ایما یہ کرتی ہی کہ چلیی ساتھ ساتھ — ورنہ لطف زندگی ہو جائیگا خواب گران
عالم ایجاد مثل گوشہ تاریک ہے — رنج فرقت سی نظر مین دن ہی شام بیکسان
وہ مکان جسمین مری محسن کی ذات پاک تہی — کسطرح دیکھون کہ جوش غم سی اوٹھتا ہی دہوان
یاد آتی ہین ہمین وہ روز آغاز ورود — جبکہ تھا ملک اودہ ممنون احسان خزان
آدمی تھا اب گہر تہا رنج ویران ملک دشت — ہر در و دیوار سی پیدا صدای الامان
داد ہی ہمت کہ آباد کیا کر دلمین جو رحم — کر دیا جرمی ہوئی بستی کو گلزار جنان
ہر غریب عاجز و محتاج پر بخشش ہوئی — بچ گئین جانین ہوا دلشاد خیل بیکسان
ہر اسیر و صاحب عسرت نی پایا اک عروج — خوش ہوی سینون مین دل آئین دعائین بر زبان
غل ہوا صاحب کمشنر کی زیادہ عمر ہو — یعنی وہ کرنیل ایبٹ رونق ہندوستان
مل گئی جاگیر جو جو یان تعلقدار تھا — فیصلہ ہونی لگی برسون کی جھگڑی ہر زمان
تھی جو ظالم اونکو پاداش عمل اپنی ملی — عاجزون کی شکرگزاری کو ہوئی گویا زبان
کثرت سامان راحت ہی تھا یہ وقت یاد — یعنی اکدن اس چمن پر آئی گی باد خزان
دفعتا شہرہ ہوا رخصت طلب صاحب ہوی — سنتی ہی جاتی رہی ہوش و خرد تاب و توان

آئی اشک چشم استقبال امن کے لیے
لب ہوئی اندوہ سی مصروف فریاد و فغان

سر اسیر و دوست آیا پھر استفسار حال
یون کہا صاحب نے تہا کس نی اجی کچہ بیان

اس لیے چندی پر اپنی سیر بنا عزم ہے
جلد آئین گی بشرط خیریت ای مہربان

بسکہ تہا اک مین بہی ہندو اغنایت گہری
دل ہوا مانند بسمل سوز فرقت سی تپان

بی تامل بر زبان آئی یہ اشعار دعا
یا الٰہی تا کہ ہی بنیاد کاخ آسمان

یا الٰہی تا کہ ہی بنیاد ہستی کو بقا
یا الٰہی تا کہ ہی سر پر یہ نیلی سایبان

اقتدار و عزت و اقبال صاحب کا رہے
مدعی ہون زرد رو جس طرح ہو برگ خزان

جلد پہر تشریف لائین تا یہ غم جاتا رہے
ای پہر پابوس کو کو سو نصیب اہل دوستان

لکھنؤ مین دھوم ہو ہر سو مبارکباد کی
ہو سلامی در پہ ہر ہر پیر و طفل و ہر مرد و جوان

مین قصیدہ مدح کا اگر پڑہون با طبع شاد
دیکھون ان آنکھون سی لطف بزم و خیل دوستان

ای قلم بس رنج فرقت سی نہین دلکو قرار
جوش غم کثرت پہ ہی کر اختصار داستان

## ایضاً

دریغا کہ یہ دور لیل و نہار
نہین ایک صورت پہ رکہتا بہار

کبھی کچھ کبھی کچھ کبھی کچھ ہی رنگ
زمانہ نہین قابل اعتبار

اگر چہ کبھی دن کو بلبل کے ہین
تو ہی شکوہ شبنم کی چشم اشکبار

کوئی چشم تر یاد احسان ہی ہے
کسی جا ہی عزم سفر آشکار

غرض تا کجا شکوۂ انقلاب
رقم کر مضامین رخصت بہی چند
وہ محسن کہ جس سے ملین راحتین
وہ سردار جسکی کہ در سے کبھی
غریبون پہ احسان امیرون پہ لطف
اور وہ بعد تاراج اک دشت تھا
وہ مجرم جو مایوس تھی زیست سے
رہا کون باقی وہ صاحب غرض
فدا اون پر اور اونکی الطاف پر
الٰہی رہے عمر و دولت سدا
بڑھی اور بھی اوج اقبال مین
کہانتک بیان لطف و اوصاف ہون
مری پرورش کا جو آیا خیال
وہ احسان کیی جنکی کچہ حد نہین
تمنا تو یہ تھی کہ تا زندگے
رہین یون ہی ممنون احسان سدا
وہ انکھین کہ جنسے دیکھون جو لطف

گذر اس سے امی خامہ کر اختصار
کہ دل مثل سیماب ہے بیقرار
وہ حاکم جو تہا عادل روزگار
نہ محروم اوٹھا کوئی امیدوار
اب ایسا کہان صاحب باوقار
ہوا فیض سے اوسکے پہر نوبہار
قصور اونکے بخشے گیے بار بار
نہین جسکے نخل تمنا مین بار
یہ کرنیل ابلیٹ ہین جو نامدار
یہ جب تک کہ ہے ہستی روزگار
ملی دشمنون کو دل داغدار
زیادہ ہی قید سخن سے شمار
ہوئی صورت مطبع نامدار
کہانتک اوا شکر ہو بار بار
جدائی کسی دم نہو آشکار
مگر حیف ای گردش روزگار
وہ سامان رخصت سی ہین انتظار

وہ دل جسمین لبریز تھا جوش شوق
وہ جان تھی محبت سی جو بیقرار

اونہین یہ نظر آئی شکل سفر
بجز آہ و افسوس کیا اختیار

الٰہی بس اب ہی ہے آرزو
کہ جسدم چلین صاحب باوقار

ترا سایہ فضل اونپر رہے
تجھے سونپتا ہون مری کردگار

بر آئین مرادین جو کچھ دلمین ہین
موافق رہے دور لیل و نہار

بہت جلد تشریف لائین یہان
کہ دل دوستون کی ہون پہر نوبہار

رئیس و امیر آکے پہر تہنیت دین
سنین کو یہ شادی کی غل بار بار

قدم سے ملین آنکھین احباب و دوست
خوشی سی ملین صاحب نامدار

تھہرای قلم ختم مطلب ہوا
دعا لکھہ ہمیشہ رہے اقتدار

## قصیدہ از نتائج طبع شاعر سحر بیان شیرین زبان منشی طوطا رام صاحب شایان

گلستان سی ہوتی ہی رخصت بہار
خزان نکہت گل ہی کہاتی ہی خار

یہ کس شاہد گل کی رخصت ہی آج
کہ بلبل ہی گل کی روش دلفگار

گلون کو ہی کیا ای صبا بیکلی
دل عندلیب آج ہے داغدار

پریشان ہین قمریان باغ مین
رخ سرو سی ہی عیان انتشار

بنا غمکدہ گلشن لکھنؤ
اوتارا عروس چمن نی سنگار

بہت تنگ ہی یوسف گل کا حال
گریبان و دامن مین سب تار تار

مری غنچۂ دل کو تھی بستگی | یہ بولا اوٹھا اک بلبل بیقرار
کہ شایان اوڑا کیون ہی چہرے کا رنگ | ہر اک دل پہ ہین آج صدمی ہزار
بیان کیا کرون حال نیرنگ چرخ | کہ ہی اسکی ہاتھون سی سینہ فگار
چمن کا تہا جو باعث رنگ و بو | ملا جسکی گلگشت سی افتخار
جسی دیکھکر نوعروسان باغ | سماتی نہ جامی مین تھی زینہار
کبھی ہوتیا کو لگایا جو ہاتھ | ملی اوسکو آب در شا ہوار
حنا ہاتھ ملتی ہی اوسکی لیے | ولایت کو ہوتی ہین وہ اب سوار
طبیعت جو ہی اندنون کچھ علیل | اسی سی وہ رخصت کی ہین خواستگار
شفا بخش عالم اونہین دی شفا | عروسانہ صحت رہی ہمکنار
یہ سنکر گل افشانی عندلیب | ہین گویا ہوا اوس سی بی اختیار
تمنا ہی آویزۂ گوش ہو | وہ نام مبارک جو ہی ذی وقار
یہ سنتی ہی بلبل ہوا نغمہ سنج | وہ کرنیل ایبٹ ہین عالی وقار
وہ عازم ہین لندن کی اُنکا ہی عزم | اونہین جلد پھر لائی پروردگار
یہ سنکر کہا مین نی ای مشت پر | تری گلفشانی پہ دل ہی نثار
مجھی بھی یہی فکر لائی یہان | نہین تجھسی بہتر کوئی غمگسار
کھلی جب سی یہ لکھنؤ مین خبر | ان آنکھون تی آنسو کا باندھا ہی تار
زن و مرد ہین ہر طرف مدح خوان | یہ صاحب حقیقت مین ہین نامدار

دیا دوہ ریاض عدالت کو رنگ ‌ ‌ ‌ خلش کر سکا گل سے ہرگز نہ خار
دم عدل عیسائی اہل ہند ‌ ‌ ‌ کسی مین تفاوت نہ تھا زینہار
رقم لوح دل پر ہین ساری علوم ‌ ‌ ‌ ہنر سب طرح کی ہین اونپر نثار
ریاضی کو اونسی بہت رنگ و بو ‌ ‌ ‌ ستارون کا ہی اونگلیون پر شمار
بھلا کیا ہو وصف تکلم بیان ‌ ‌ ‌ نفس رشک موج نسیم بہار
زمین پر ہی پیش نظر سیر چرخ ‌ ‌ ‌ نظر کی ہین سیار و ثابت نگار
شرف اوسنی حاصل ہی ہر علم کو ‌ ‌ ‌ دبیر فلک عقل پر ہی نثار
عجب علم پیمایش اونکو ہی یاد ‌ ‌ ‌ حساب زمین کھیت علم آشکار
بنایا ہی نقشہ یہان کا عجیب ‌ ‌ ‌ کہ آئینہ ہے حال آئینہ وار
کیی ہین قوانین نو اختراع ‌ ‌ ‌ سند ہی ہر اک قول ہی پایدار
سخاوت مین حاتم کا ہی ذکر کیا ‌ ‌ ‌ لحد مین ہی قارون کا سینہ فگار
مروت مین ذفر شجاعت مین فرد ‌ ‌ ‌ ملا اونسی دونون کو ہی اقتدار
دل افواج دشمن کا چو رنگ ہو ‌ ‌ ‌ جو تلوار کھینچین دم کارزار
ہرن انکی شیر فلک آ ہی پیش ‌ ‌ ‌ اگر عزم فرماوین بہر شکار
صفت اونکی گھوڑونکی اب ہو رقم ‌ ‌ ‌ صبا ہر قدم پر ہی جنکی نثار
نہایت ہین شایستہ خوش قدم ‌ ‌ ‌ زمین پر چمکتی ہین وہ برق وار
ہوا سی ہین سرعت مین چالاک تر ‌ ‌ ‌ نہ سایی کو پونہچی پری زینہار

نہین اونکی کبھی ہوا پر ہی تخت — سلیمان کا حاصل ہی عز و وقار

زبان لائق مدح شایان کہان — کرون اونکی تعریف کیا آشکار

خدا اونکو پہر لائی با عز و جاہ — دعا ہی یہی اپنی پروردگار

پہر آباد ہو گلشن لکھنؤ — پہر آئین ولایت سی مثل بہار

قلم دی نہ مضمون فرقت کو طول — مناسب دعا پر ہی اب اختصار

فلک پر ہی جبتک مسیحا کا در — زمین پر مہ و مہر ہین نور بار

یہ جبتک کہ قائم ہی ارض و سما — نمایان ہین دنیا مین لیل و نہار

یہ کرنیل ایبٹ بہادر مدام
رہین زندہ با دولت پایدار

## قطعہ تاریخ

رخصت کرنیل ایبٹ صاحب بہادر
کمشنر لکھنؤ منکلام محمد مردان علیخان
رعنا اہلکار سرکار کپورتھلہ

ہین فخر فرنگ کرنل ایبٹ صاحب — گلگشت وطن کو ہند سے پا برکاب

تھی قسمت لکھنؤ کے فرمان فرما — عدل و کرم و خلق سے وہ عرش جناب

باندھی ہی ہوا عدل نے اونکی ایسی — مقدور نہین توڑ سکی ایک حباب

اینسی ہین وہ سیر چشم چشم بد دور
خاتم کو رہا اونسی سدا چشم حجاب

خلقت مین ہی اونکی اسقدر خلق عمیم
ہراخ غریب ہی ہین لی تا نواب

اب اونکی فراق مین یہ ای مردم چشم
دریا کوزی مین ہی کہ ہی چشم پر آب

دلسوز دلی کی جدائی مین آج
دل آتش دوری سی ہی رنگ سیماب

اسدرجہ مشایعت ہوئی عالم گیر
قدسی بھی چلا آئی پئی حدالباب

جبتک ہی جہانمین رہسہ مدحہ آمین
فرماندہ خلق وہ رہین یا وہاب

رعنا کی دعائیہ ہے تاریخ سفر
بالخیر کہ لکھنؤ مین وہ آئین شتاب

۱۸۶۴



# ابتدای عالم

بقول اہل ہند خدای تعالی نے اول برہما کو ابو البشر پیدا کیا اور کل مخلوق برہما سے عالم ظہور مین آئے اور تمام عالم برہما سے شائع ہوے جن سے بر چار بید ملو ہین تفصیل اوسکی اور کتابون مین بشرح موجود ہی

## ہندوستانکے ہندو راجون کا سلسلہ

اس ملک کی سلطنت ہندو راجاؤن کی ہمیشہ سے سورج بنسی اور چندر بنسی راجاؤن کے خاندان مین رہی لیکن اگلے زمانے کے ہندو راجاؤن کا حال ٹھیک ٹھیک پتہ وار معلوم نہین ہوتا اور اونکے سال سمبت ومدت سلطنت کا کچھ پتہ نہین اور نہ کبھی کسی زمانے مین ہندو راجاؤن مین سے ایک خاندان ایسا رہا کہ کسی زمانے تک اقسام تحریری وکوائف پایا جاے اور ہند مین طوائف الملوکی ابتدا سے معلوم ہوتی ہی یہ بات ضرور مان سکتے ہین کہ ہر ایک راجا چھوٹی چھوٹی

حکومت پر دولت و حشمت ہند سے متمکن و قانع تھا اور کسی نوع کی
محتاجی نتھی — اگرچہ اس ملک کے رہنے والے عموماً ہندو کہلاتے رہے
اور کہلاتے ہین لیکن اختلاف طریقے مذہبی و عقائد سے صدہا مذہب
جدا جدا بن گئے اور انہی وجہ سے بھی ایک فریق نے تعصب سے
دوسرے فریق کے ذکر کو اپنی تصنیفات مین دخل نہ دیا بلکہ خلاف ہی
لکھتے رہے اس سبب سے بھی مغالطہ عظیم واقع ہوتا ہی علاوہ اسکے
بہت کچھ ذخیرے علوم کے ضائع ہو گئے رہا سہا جو کچھ کہین بنا بگڑا ملتا ہی
اوسکے سمجھنے کا علم دشوار اس ہندوستان مین دو بڑے مذہب نے
رواج پایا ایک مذہب برہمنون کا جو اسوقت مین ہندوستان مین ہی
اوسکے اصول پر عموماً عقائد اور پابندی ہی دوسرا بدھ کا ان دونون
مذہب والون مین حد کے مرتبہ تعصب رہا بدھ کے مذہب والون نے
برہمنون کی کتابین خاک مین ملائین اور برہمنون نے بدھ والون کی
پوتھیان غارت کین یہان تک کہ مسلمانون نے دونون کو نیست و نابود
کر دیا مثل چھاپے کے آگے کوئی حکمت ایسی نتھی کہ ایک ایک ہزار ہزار
جلد باقی رہین اب کوئی حال ٹھیک نہین معلوم ہوسکتا مگر مختصر یہ
ہند کا پہلا دار السلطنۃ کونسل دیس یعنی اجودھیا عرف اودھ جہان
راجہ رام چندر اوتار فرمانروا تھے اونکا حال تصریح راماین وغیرہ کتابون سے

مشہور ہی اونکے بعد اب تک ہند مین دو خاندان راجاؤن کے مشہور
اور معتبر ہین اول سورج بنسی دوم چندر بنسی سلسلہ ان دونون کا برہما جی پر
منتہی ہوتا ہی سورج بنسی مین برہما سے ایک طبقے کے ۸۰ راجہ اور دوسرے
طبقے کے ۳۵ راجہ ہوے اور چندر بنسی کا برہما سے مختلف سلسلے کے
۱۳۱ راجہ کا شمار ہی اور دار الحکومتہ ہر ایک کا اپنے اپنے زمانے مین مختلف
مقامات پر رہا راجگان دہلی یعنی اندرپرست ہستناپور کا خاندان راجہ پانڈ
سے ہی جنمین راجہ نامی اول جدشٹر ہوے اونکا کارنامہ مہابھارتہ مین
مشہور و موجود ہی اور زمانہ راجہ جدشٹر کو تخمیناً پانچ ہزار برس گذرے راجۂ
موصوف سے راجہ کھیمن تک ۲۸ پشت حکومت اس خاندان مین رہی
بسرو نام وزیر راجہ کھیمن کو قتل کرکے مالک سلطنت کا بنا ملک اجودھیا
سب اوسکے قبضۂ تصرف مین تھا پس راجہ بسرو سے بکرماجیت تک مختلف
۴۴ راجاؤن نے راج کیا راجہ بکرماجیت فرمانروای ہند تھا تختگاہ اوسکی
اوجین تھی عدل اور نیکنامی اور رعایا پروری اور بخشش مین ضرب المثل
اور سمبت اوسکا آج تک رائج ہی اس راجہ سے راجہ پتھورا تک ۷۴ راجہ
گذرے یہ راجہ پتھورا ہند کا اخیر راجہ تھا عہد راجہ جدشٹر سے زمانہ راجہ پتھورا
تک پانچ ہزار چار سو آٹھ سال مین ایک سی بیس برس راجاؤن نے
حکمرانی کی اور راجہ پتھورا کے بعد علاء الدین غوری ہند پر تسلط ہوا فقط

راجہ رام چندر جی کے بعد راجہ جدشٹر اسی دور کلجگ مین بکرماجیت و بھوج ہندوستان کے راجاؤن مین یادگار ہین

## علم کا بیان

سب مورخون کا اسپر اتفاق ہی کہ تمام علوم پہلے ہند مین موجود تھے اور اونسے اہل یونان و مصر نے اور اونسے اہل یورپ نے حاصل کیے باوجود کثرت حکما کے سکندر بھی ایک حکیم ہند سے لیگیا تھا سب علم نادر اور طرح طرح کی حرفت اور صنعت پران اور بیدون مین بھری ہوئی تھی مگر زبان اونکی شنشکرت مشکل اور دقیق ہی فقط اور اس زمانے مین بھی اکثر علوم کا چرچہ بنارس اور کشمیر و سوای ریاست ہندوستانی مین قدیم سنسکرت کا استعمال ہی مگر تعلیم و معلم باقاعدہ کم

## ہنود کے مذہب کا طریق

مدت دراز سے ایک ایک کا مذہب اور طریق اہل ہند کا چلا آتا ہی اور یہ اوسکے سخت پابند ہین ہندو اگر دوسرا مذہب اختیار کرے ہو سکتا ہی لیکن مذہب ہنود مین نہین آسکتا ہی اور دوسرا مذہب والا ہرگز ہندو نہین ہوتا ہی رسوم و عبادت ہزارون برس سے ایک طرح پر چلی جاتی ہی منجملہ اونکے

کئی باتین قابل ذکر کے ہین ۱ اس مذہب والے ایک شادی کے سوا
دوسری شادی جبتک کہ زوجہ اوسکی زندہ ہو نہین کرتے ہین ۲ کھانا
کسی کے ساتھ غیر برادری کے اور بے نہائے نہین کھاتے شراب اور
گوشت بکری کا کچھ ہندو کھاتے ہین اور کل گوشت کو تمام ہندو نہین کھاتے
۳ سوائے ہندو کے جو اپنے طریق کا ہوتا ہی غیر مذہب والے سے شادی
نہین کرتے ۴ مردے کو آگ مین جلاتے یا دریا مین بہاتے ہین ۵
ایک رشتہ یعنی زنار اکثر اور سر پر چوٹی کل ہندو رکھتے ہین ۶ شوہر کی لاش
کے ساتھ عورت خوشی خوشی ستی یعنی جل جاتی ہی مگر یہ رسم سرکار نے بالکل
موقوف کروادی غرض ایسی ایسی بہت سی خصوصیتین رسمی و مذہبی ہین جنکے
وہ ایک طور پر پابند ہین یہان عام اہل ہنود کا ذکر نہین اونمین بعضے ایسے
بھی ہین جو بے نہائے کھانا کھاتے ہین اور راجہ کئی کئی شادی بھی کرتے
ہین اگرچہ اڑھائی ہزار برس پیشتر ہند مین ایک مذہب بدھ کا تھا
مگر یہ بھی مذہب ہنود سے تھا اور اب اس مذہب بودھ سے چین اور برہما
کا ملک آباد ہی اور خال خال ہندوستان مین بھی ہین لیکن وہ بودھ
نہین سراوگی و جینی بودھ مذہب ہی کے پیرو ہین اور اس مذہب والے
معتقد ۲۴ اوتار کے ہین اس زمانے کے ۱۲ اوتار کے قائل ہین جسمین سے
ایک اوتار کا کلنکی کہ جسکا سنبھل مراداباد مین قرار دیتے ہین ظہور باقی ہی

مدت ناتمام اور دنیا کی عمر کروڑون برس بتاتے ہین اور کسی نبی اور کتاب
آسمانی اور طوفان نوح کے قائل ومقر نہین لیکن چارون بید کتاب آسمانی
ہین فقط پرانے وقت کی رسم وراہ علم وہنر مذہب کی پابندی کے عہد سے
زیادہ تر میان دوآب یعنی گنگا وجمنا کے درمیان ہین شمار ہوسکتے ہین

## ہند کا حال

ہند دنیا کے ملک کا مجموعہ ہی پہاڑ سرد ہین میدان گرم ہی جانور چرند پرند ہند
مین پیدا ہوتے ہین میوے نباتات اور معدنیات طرح طرح کے بکثرت
ہین جنس غلہ ہر قسم کی پیدا ہوتی ہی اور ہر شی بہ نسبت اور ملکون کے ارزان
ہوتی ہی موسم جاڑا گرمی برسات مقرری ہی مگر کوہستان ہین جاڑا اور
برسات بہت اور میدان ہین خصوص دکھن ہین پورب تک گرمی بشدت
امراض وبائی اور فصلی بخار ولرزہ اور ہیضہ برسات مین اور بخار وغیرہ موسم
گرما مین شائع ہوتا ہی مگر طبیب بھی عمدہ ہی اور دوائین ہر قسم کی جابجا
ملکون ہین مہیا ہین سرکار کے دارالشفا بھی موجود فقط اور دریاؤن کی
کثرت اور شادابی سے یہ سرزمین تمام دنیا مین باغ ہمیشہ بہار ہی

## باشندہ

ہند کے باشندے ١٤١ اکرور آرام طلب اور کاہل عیش دوست خود پسند

ہوتے ہین اور اس عادت کے سوا یہ بھی صفت ہی کہ مہمان نواز خلیق صالح
صاحب علم و ہنر دستکار بھی اکثر ہوتے ہین مگر تمام ہندین مدہ دیس
جو بنارس سے دہلی اور ہمالیہ سے اگرہ تک ہی اسلیئے عمدہ مشہور ہی کہ
بہ نسبت اور ملک کے یہان علم و ہنر آدمیت رونق تکلفات زیادہ ہین
عموماً باشندے ہند کے راہ و رسم ملاقات اور احسان سے جلد آشنا
ہوجاتے ہین غربت اور انکسار بھی اونکی طبیعتون مین ہی یہان اون
حرامزادون اور بدذاتون کا ذکر نہیں ہی کہ جنھون نے غدر مین اپنا منہ
کالا کیا ہی یا جو وحشی اور جنگل کے باشندے ہین اور ہند کے ہر خطے اور
ملک کی وضع لباس اور زبان ایسی جدا ہی کہ ایک دوسرے کی بولی اکثر
سمجھ نہیں سکتے

## جدول معدنیات ہند

| نمبر شمار | جنس | تعداد مقام | تفصیل مقامات |
| --- | --- | --- | --- |
| ۱ | آہن مع فولاد | ۲۳ | آشام[۱] اسلام نگر[۲] اودے پور[۳] بیر بھوم[۴] بہار[۵] بندیل کھنڈ[۶] نرمن علاقہ اندور[۷] دکن[۸] سندھ[۹] سلہٹ[۱۰] سکیت منڈی[۱۱] سیام[۱۲] |

| نمبر شمار | جنس | تعداد مقامات | تفصیل مقامات |
|---|---|---|---|
| | | | پھگار کچھ کوٹ کھاری شملہ گوالیر محال باج گزار شرقی منی پور میسور مندراس ناگپور خرد ناگپور کلان نیپال |
| ۲ | ابرک | ۳ | بہار محال باج گزار شرقی ناگپور خرد |
| ۳ | بلور | ۲ | بہار کشمیر |
| ۴ | پھٹکری | ۳ | جی پور کالا باغ کچھ |
| ۵ | جست | ۱ | اودے پور |
| ۶ | رانگ | ۲ | سیام نیپال |
| ۷ | زبرجد | ۲ | نیپال ناگپور خرد |
| ۸ | سیسہ | ۵ | جودھپور سیام مارواڑ ناگپور خرد نیپال |
| ۹ | سرمہ | ۲ | گورنگی جہلم پنجاب ناگپور خرد |
| ۱۰ | شورہ | ۴ | اودے پور پٹیالہ ترہت سارن |
| ۱۱ | طلا | ۹ | آشام اٹک سیام کنک کوہ کماؤن محال باج گزار شرقی ناگپور خرد ناگپور کلان نیپال |
| ۱۲ | عقیق | ۳ | بہار برودہ علاقہ جمو |

| نمبر شمار | جنس | تعداد مقام | تفصیل مقامات |
|---|---|---|---|
| ۱۳ | گوبیڈ منگ | ۶ | بیربھوم رانی گنج بنگالہ کشمیر محال باج گرار شرقی زبدا ناگپور خرد |
| ۱۴ | گندک | ۲ | اودے پور نیپال زمین میں بعض جگہ [illegible] |
| ۱۵ | مس | ۸ | اودے پور جےپور سیام کماؤن کشمیر مندراس نیپال نلور مندراس |
| ۱۶ | مروارید | ۲ | نوگیوان مندراس سورت |
| ۱۷ | موسیائی | | سننے مین آتا ہی کہ بعض لوگون نے دریاے اٹک وجہلم مین خود زمین اور پہاڑ سے نکالی اور مفید پائی |
| ۱۸ | نمک | ۴ | جےپور پنڈدادن خان پنجاب سکیت منڈی کالاباغ |
| ۱۹ | نیلم | ۱ | سیام |
| ۲۰ | ہرتال | ۱ | نیپال |
| ۲۱ | ہیرا | ۶ | بیراگڑہ سیام شاہ اباد بہار کنتور مندراس کرپ ایضاً ناگپور خرد |
| ۲۲ | یشب | ۱ | سیام |
| ۲۳ | یاقوت | ۱ | ایضاً |

# شاہان اسلام

ہند مین اول سکندر بادشاہ آیا پھر سنہ ۱۳ ہجری مین عمر خلیفہ دوم کا سردار سندھ اگر پھر گیا اور بعضی تاریخ سے معلوم ہوتا ہی کہ فتح کر کے چلا گیا سنہ ۹۳ ہجری مین حجاز کا سردار آیا سنہ ۱۰۰۱ء سے محمود غزنوی نے پچیس سال مین ۱۲ مرتبہ ہندوستان پر یورش کیا اکثر شہرون کو تباہ اور تاراج کیا سنہ ۱۰۹۱ء سے قطب الدین غلام شاہ علاء الدین غوری ہند پر تسلط ہوا اوسی سے سلطنت شاہان اسلام کی ہند مین مستقل ہوئی قطب الدین سے ابراہیم لودی تک ۲۸ بادشاہ مختلف ہوے اور ناصر الدین بیسوان بادشاہ تھا اوسکے ایام سلطنت مین سنہ ۱۳۹۸ء مین امیر تیمور دہلی کو فتح اور غارت کر کے صوبہ چھوڑ کر پھر گیا سنہ ۱۵۲۵ء مین بابر شاہ تیمور کے پروتے نے ابراہیم لودی پر فتحیاب ہوکر ہند مین سلطنت کی بنیاد ڈالی فقط مسلمانون کی سلطنت مین یہ خاندان تیموریہ سب سے پچھلا تھا امیر تیمور گورگان صاحب قران ولد امیر طراغان نسل چنگیز خان سے تھے سنہ ۷۳۶ ہجری کو شہر سبز ترکستان مین پیدا ہوے سنہ ۷۷۲ ہجری مین بمقام بلخ تخت پر بیٹھے ۳۵ برس ۱۰ مہینے ۲۵ دن ایران و خراسان و ترکستان و بخارا و روم و شام و تاتار و ہندوستان مین تنہا شہنشاہی کر کے

۷۰ سال کی عمر مین وفات پاکے سمرقند مین دفن ہوے بہادر شاہ ۲۳ پشت مین ۱۲ سال برائے نام تخت نشین رہکر بالزام غدر ۹۹ برس کی عمر مین بمقام جزیرۂ رنگون سرکار برطانیہ کی قید مین زندان ہستی سے نجات پائی عاقل اور خدا شناس کو یہ مقام عبرت کا ہی امیر تیمور سے بہادر شاہ تک ۲۳ پشت مین پورے پانچ سو برس سلطنت رہی ہندو راجاؤن مین جیسا بکرماجیت راجہ باہمہ صفت موصوف و نیکنام ہوا ہی ویسا ہی اس خاندان مین موافق زمانے کے اکبر بادشاہ بھی نہایت نیک و نامی ہوا اس بادشاہ کے فیلخانے مین پانچ ہزار ہاتھی اور اصطبل مین دس ہزار گھوڑے خاصے کے بندھتے تھے اور اوسکا ڈیرہ دوسرا کمخواب کے فرش اور موتی ٹکا ہوا پردون کا سفر کے وقت اڑھائی کوس کے گھیرے مین کھڑا ہوتا تھا ہر سالگرہ کو سونے کا تلادان کرتا اور اوسوقت سونے کا بادام اپنے دربار مین لٹاتا جسپر بھی وہ رعیت کے ساتھ سیدھا سادہ تھا آٹھ پہر مین ایک وقت کھانا کھاتا گوشت سے پرہیز کرتا کسی جاندار کے آزار کا روادار نہین تھا عرف نام کو مسلمان تھا لیکن دل وجان سے وہ آفتاب کی پرستش کرتا تھا اتوار کے روز اوسکی ساری عملداری مین جانور کی جان مارنے کی منادی تھی رعیت اوسکو اسقدر چاہتی تھی کہ لوگ جیتے جی اوسکی درگاہ مین منتین

مانتے اور نذرین چڑھاتے تھے انکی سلطنت مین ایک من بائیس سیر گیہون بکتا تھا اور دو من چودہ سیر جو اس ریاست کا آخر زمانہ بہادر شاہ ابوظفر پر خاتمہ ہوا

## قطعات تاریخ بہادر شاہ از محمد مردان علیخان صاحب نصاب عنا اہلکار سرکار کپورتھلا

مپرس احوال این دنیا که چونست
چه آغازش دگر هم دیگر انجام

کجا اسکندر و جمشید و ضحاک
کجا اسفندیار و رستم و سام

نماز نیک و بد باقیست نامی
تو خواهی نیکنامی شو که بدنام

بچرخ نیلگون رنگ وفا نیست
مگر معکوس و خالی صورت جام

غنیمت دان دو روز عمر نادان
بسر گردد گرت با عیش و آرام

شه تیمور چینگیزی ز ترکان
شنیده ستی که بودش بخت در دام

همه در سایه صیت جلالش
ز چین و هند و فارس روم و شام

هنودان هند و شش بودند و رامش
همه ترسا و گبر و اهل اسلام

بترکستان سمند شاهی او
زده در هفصد و هفتاد و دو گام

ز تیمور ابتدا بر بوظفر ختم
بهند آمد شمار بیست و سه نام

شمار سال عمر سلطنت گشت
ازین رو پنج صد ای نیک فرجام

ز ابراهیم لودی باز چون کرد
ظهیر الدین بابر هند را رام

هزار و پانصد و بیست و شش از سال
چه سال از سال عیسی بود هنگام

غرض سه صد و سی یک سال زین رو
شمار کامرانی گشت ایام

بعهد شاه عالم عهد شاهی — بعهد کمپنی چون کرد انعام
هزار و یکصد و هفتاد و سه بود — نه هجر ها دی هر خاص و هر عام
ز تخت و تاج شاهی ماند تا هم — نشان نام باقی با صد اکرام
مگر چون صد فزود آخر شد آخر — نشان شاهی هم از کمپنی نام
۱۲۷۳
شد از آب جفا کشت غدر سبز — برنگ سبزه بیگانه ناکام
هزار و دو صد و هفتاد و سه بود — که گشته از بغاوت شاه بدنام
پس از یکسال شاه انگلستان — گرفت از کمپنی احکام حکام
هنوز آن شاه و شاهان حکمرانست — که حکمش باد در هر ملک مادام
نگین آمد بهادر شه چو در رزم — برنگون رفت آخر با صد آلام
دلاویزی که شد شوریده و رشور — شده آغاز شورش را چه انجام
گرت وا گوش شنوا چشم بیناست — شنو نظمم ببین احوال ناکام
شده طالع ز مغرب شد مشرق — شد این روز شهی را زود تر شام
مقام ترس و عبرت خوف و بیم است — که آغاز آن شود این باشد انجام
من و تو هر دو را کار از قضا است — دگر خواب و خیال فکر و اوهام
و گر مخروش اهی رعنا که آمد — بگوش از بحر شورم شور کهرام
چه دید بگون شه یکس قضا کرد — بهادر شاه غازی بو ظفر نام
۱۲۷۹

ایضا

| | |
|---|---|
| شاہ بیکس چو رفت از دنیا | بیکسی کرد بر سرش ماتم |
| دید رعنا چو دشت را نجاے | گفت بشتافتہ غزال ارم |
| | ۱۲۷۹ |

ایضاً

| | |
|---|---|
| بہادر شاہ چون سوی ارم رفت | کہ بروی نام شاہی گشت اتمام |
| چنین رعنا رقم زد سال فوتش | بہادر شاہ غازے خلد خدام |
| | ۱۲۷۹ |

ایضاً

| | |
|---|---|
| چون ز دنیا رفت سوی خلد از حکم قضا | یادگار شاہ ترکان چغتا کج کلہ |
| کرد رعنا بہر تاریخ وفاتش این خطاب | بوظفر غازی بہادر شہ بہشت آرامگہ |
| | ۱۲۷۹ |

ایضاً

| | |
|---|---|
| رفت از دہلی سوی رنگون چو شاہ بوظفر | شادمان گشتند بہر دعوتش ارباب خلد |
| رخت بست از ملک مشرق چون سوی خلد برین | گفت رعنا سال فوتش بود مشرق باب خلد |
| | ۱۲۷۹ |

ایضاً

| | |
|---|---|
| رہی بست و سہ سال تک بادشاہی | گرو تھی کہ تھی وہ برات چغتہ |
| ہوا خاتمہ بوظفر پر تو گویا | ہوئی سلطنت سے نجات چغتہ |
| | ۱۸۶۲ع |

ایضاً

| | |
|---|---|
| دار فانی مقام عبرت ہے | کیا کوئی اوس سے آہ دل کو لگائے |
| دیکھ رعنا سرای فانی سے | شاہ بیکس نے رخت باندھا ہے |
| | ۱۲۷۹ |

# جدول حال اورنگ نشینان از عہد تیمور تا بہادر شاہ ظفر

| نام بادشاہ | ولدیت | تاریخ ولادت | محل ولادت | مقام جلوس | تعداد عمر روز جلوس | تاریخ جلوس | مرض الموت | تاریخ وفات | محل دفن | مدت عمر | مدت سلطنت |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| امیر تیمور | ولد امیر طراغائی اولاد چنگیز خان | ۲۵ شعبان ۷۳۶ سہ شنبہ | شہر سبز وار خطہ کش نیز گویند | شہر بلخ | ۳۵ سال ۲۷ یوم | ۲۱ رمضان ۷۷۱ چہارشنبہ | تپ محرقہ ہفت روز یازدہ | ۱۷ شعبان ۸۰۷ شب چہارشنبہ | سمرقند | ۷۱ سال ۱۱ شہر ۲۰ یوم | ۳۵ سال ۱۰ شہر ۲۵ یوم |
| جلال الدین میران شاہ | ابن تیمور | ۱۴ ربیع الآخر ۷۶۵ پنجشنبہ | سمرقند | میان سمرقند آذربائیجان | ۳۸ سال ۱۴ شہر ۳ یوم | ۱۷ شعبان ۸۰۷ | در جنگ مرزا | ۱۴ ذیقعدہ ۸۱۰ | تبریز | ۴۱ سال ۷ شہر ۱ یوم | ۳ سال ۳ شہر ۷ یوم |
| سلطان محمد مرزا | ابن میران شاہ | ۲ ذی حجہ ۸۰۰ | نامعلوم | سمرقند | ۹ سال ۲ شہر ۲۴ یوم | ۲۴ ذیقعدہ ۸۱۰ | عارضہ جسمانی | ۲۰ ذی حجہ ۸۵۵ | خطہ کش | ۵۵ سال | ۴۵ سال ۱ شہر ۵ یوم |
| ابو سعید مرزا سلطان | ابن سلطان محمد مرزا | ۱۳ رجب ۸۳۰ | سمرقند | غزنین | ۲۵ سال | ۲۰ ذی حجہ ۸۵۵ | در جنگ حسن بیگ شہید شد | ۱۲ رجب ۸۷۳ شنبہ | نواح سمرقند | ۴۳ سال | ۱۷ سال ۲ شہر ۱۲ یوم |
| عمر شیخ مرزا | خلف چہارم سلطان ابو سعید | ۳ ذی حجہ ۸۶۰ | سمرقند | ولایت اندجان فرغانہ | ۱۲ سال ۶ شہر ۳ یوم | ۱۲ رجب ۸۷۳ دو شنبہ | از بام افتاد و مرد | ۴ رمضان ۸۹۹ دو شنبہ | سمرقند | ۳۸ سال ۸ شہر ۴ یوم | ۲۶ سال ۱ شہر ۲۲ یوم |

| | | | | | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ظهیر الدین محمد بابر بادشاه | ابن سلطان عمر شیخ مرزا | ٦ محرم ٨٨٨ | ولایت فرغانه | خطاکش | ١١ سال ٨ شهر ١٩ یوم | ٢٥ رمضان ٨٩٠ شنبه | تپ | ٦ جمادی الاولی ٩٣٧ | کابل | ٤٩ سال ٤ شهر | ٣٧ سال ٧ شهر ١١ یوم |
| نصیر الدین محمد همایون | ابن بابر بادشاه جنت آشیانی | ٤ ذوالقعده ٩٠٣ | ارک شهر کابل | اگره | ٢٣ سال ٦ شهر ٤ یوم | ٦ جمادی الاولی ٩٣٧ | از بام افتاد | ١٣ ربیع الاول ٩٦٣ | در مقبره همایون | ٤٩ سال ٤ شهر ٩ یوم | ٢٥ سال ١٠ شهر ٥ یوم |
| ابوالنصر جلال الدین محمد اکبر شاه | ابن محمد همایون | ٥ رجب ٩٤٩ یکشنبه | درسهاامرکوٹ | کلانور | ١٣ سال ٩ شهر ٢٨ یوم | ٢ ربیع الآخر ٩٦٣ جمعه | عارضه جسمانی | ١٢ جمادی الآخر ١٠١٤ | مقبره سکندره | ٦٤ سال ١١ شهر ٧ یوم | ٥١ سال ٢ شهر ٩ یوم |
| نور الدین محمد جهانگیر | ابن محمد اکبر شاه | ٧ ربیع الاول ٩٧٧ چهارشنبه | فتح پور سیکری | اکبر آباد | ٣٧ سال ٢ شهر ٧ یوم | ١٤ جمادی الآخر ١٠١٤ یکشنبه | ضیق النفس | ٢٨ صفر ١٠٣٧ یکشنبه | باغ نورجهان واقع لاهور | ٥٩ سال ١١ شهر ١١ یوم | ٢٢ سال ٨ شهر ١٤ یوم |
| محمد شهاب الدین شاهجهان | ابن جهانگیر بادشاه | سلخ ربیع الاول پنجشنبه | لاهور | لاهور | ٣٧ سال ٢ شهر ٢٢ یوم | ٢٢ جمادی الاولی ١٠٣٧ دوشنبه | درد گرده و تپ محرقه | ٢٦ رجب ١٠٧٦ دوشنبه | اکبر آباد روضه تاج گنج | ٦٧ سال ٤ شهر ٦ یوم | ٣٠ سال ٢ شهر ٤ یوم |
| محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاه | بن شاهجهان | ٢٥ ذیقعده ١٠٢٨ یکشنبه | صوبه گجرات | نواح اکبرآباد | ٣٩ سال ٦ شهر ٥ یوم | غره جمادی الآخر ١٠٦٨ | عارضه جسمانی | ٢٨ ذیقعده ١١١٨ جمعه | مقبره زین الدین شاه در اورنگ آباد | ٩٠ سال ٣ یوم | ٥٠ سال ٥ شهر ٢٦ یوم |

| | | | | | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| اعظم شاه | بن عالمگیر پادشاه | ۱۲ شعبان ۱۰۶۳ | دکن | متصل اورنگ آباد | ۵۵ سال ۳ شهر ۲۶ یوم | ۴ ذیحجه ۱۱۱۸ | در جنگ بهادر شاه در چاچو مرد | ۸ ربیع الاول ۱۱۱۹ | مقبره همایون پادشاه | ۵۵ سال ۷ شهر ۶ یوم | ۳ شهر ۱۰ یوم |
| بهادر شاه شاه عالم خلد منزل | بن عالمگیر پادشاه | سلخ رجب ۱۰۴۳ | دکن | کابل | ۶۵ سال ۶ شهر ۱۰ یوم | ۱۰ محرم ۱۱۱۹ | عارضه جسمانی | ۱۸ محرم ۱۱۲۴ | درگاه خواجه قطب الدین | ۸۰ سال ۲ شهر ۱۸ یوم | ۵ سال ۸ یوم |
| معز الدین جهاندار شاه | بن بهادر شاه | غره شوال ۱۰۷۲ چهارشنبه | دکن | لاهور | ۵۲ سال ۳ شهر ۱۰ یوم | ۱۸ محرم ۱۱۲۴ جمعه | فرخ سیر در قید کشت | ۲۹ محرم ۱۱۲۵ | مقبره همایون پادشاه | ۵۳ سال ۳ شهر ۲۵ یوم | ۱۱ شهر ۵ یوم |
| فرخ سیر پادشاه | پسر عظیم الشان بهادر شاه شهید | غره محرم پنجشنبه ۱۰۹۸ | دکن | نواح اکبرآباد | ۲۶ سال ۱۱ شهر ۲۳ یوم | ۲۳ ذیحجه ۱۱۲۴ جمعه | سید حسین علی خان اسیر کرده کشت | ۹ رجب ۱۱۳۱ | مقبره همایون پادشاه | ۳۳ سال ۳ شهر ۹ یوم | ۳ سال ۳ شهر ۱۹ یوم |
| ابو البرکات شمس الدین | پسر رفیع الشان بن بهادر شاه | ۱۷ رمضان ۱۰۸۳ | دهلی | اکبرآباد | ۴۷ سال ۶ شهر ۲۳ یوم | ۹ ربیع الآخر ۱۱۳۱ | تپ دق | ۹ رجب ۱۱۳۱ | مقبره همایون پادشاه | ۴۷ سال ۱۰ شهر ۳ یوم | ۳ شهر ۹ یوم |
| رفیع الدوله | پسر رفیع الشان بن بهادر شاه | ۲۰ رمضان ۱۰۸۳ | نواح اکبرآباد | اکبرآباد | ۴۷ سال ۲ شهر | ۶ رجب ۱۱۳۱ | علت کوکنار | ۱۷ ذیقعده ۱۱۳۱ | ایضاً | ۴۸ سال ۱ شهر ۲ یوم | ۳ شهر ۲۸ یوم |

| | | | | | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| روشن احمد محمد شاه پادشاه | بن جهاندار شاه ابن بهادر شاه | ۴ ربیع الاول ۱۱۱۴ | غزنین | کهراولی متوجه اکبرآباد بهشت گردید | ۱۷ سال ۷ شهر ۲۴ یوم | ۱۷ ذیقعده ۱۱۳۱ | عارضهٔ جسمانی | ۲۷ ربیع الآخر ۱۱۶۱ | درگاه حضرت نظام الدین | ۴۷ سال ۱ شهر ۴ یوم | ۲۹ سال ۵ شهر ۱ یوم |
| ابوالنصر مجاهد الدین احمد شاه | بن محمد شاه بادشاه | ۱۷ ذی الحجه ۱۱۳۸ | شاهجهان آباد | پانی پت | ۲۲ سال ۴ شهر ۱۳ یوم | غرهٔ جمادی الاولی ۱۱۰۶ | بسبب کشیدن میل در چشم | ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ روز سه شنبه | مقبرهٔ همایون پادشاه | ۲۸ سال ۲۳ یوم | ۶ سال ۲ شهر ۱ یوم |
| محمد عزیز الدین عالمگیر ثانی | بن معزالدین جهاندار شاه | غرهٔ محرم ۱۰۹۹ | صوبهٔ ملتان | دهلی | ۶۸ سال ۷ شهر ۱۰ یوم | ۱۰ شعبان ۱۱۶۰ | از قلعهٔ فیروز آباد افتاد | ۱۸ ربیع الآخر ۱۱۷۳ | ایضاً | ۴۷ سال ۳ شهر ۷ یوم | ۵ سال ۸ شهر ۸ یوم |
| علی گوهر شاه عالم پادشاه | بن عالمگیر ثانی | ۲ جمادی الاولی ۱۱۳۱ | دهلی | کهتولی متصل عظیم آباد | ۴۲ سال ۳ یوم | ۴ جمادی الاولی ۱۱۷۳ | عارضهٔ جسمانی | ۷ رمضان | درگاه خواجه قطب الدین | ۹۰ سال ۴ شهر ۶ یوم | ۴۸ سال ۴ شهر ۳ یوم |
| ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاه | | ۲۸ رجب ۱۱۷۳ | ریان مکن پور | دارالخلافه شاهجهان آباد | ۴۸ سال ۱ شهر ۹ یوم | ۷ رمضان ۱۲۲۱ | اسهال وورم | ۲۷ جمادی الاخری ۱۲۵۳ | ایضاً | ۸۰ سال | ۳۱ سال ۱ شهر ۲۰ یوم |
| ابوالمظفر سراج الدین محمد بهادر شاه | | ۱۱۸۰ | شاهجهان آباد | ایضاً | ۷۳ سال | ۱۲۵۳ | | ۱۲۷۹ | رنگون | ۹۹ سال | ۲۶ سال |

خاتمه بالخیر

# تسلط سر کار کمپنی انگلسیہ کا بیان

زمانۂ اکبر شاہ مین یوروپ سے اس ملک مین پہلے پہل پرتگالی اور
فرانس بطریق سوداگری آتے جاتے تھے انگریزون نے جب
دیکھا کہ پرتگال اور فرانسیس وغیرہ فرنگستانی آدمی ہندوستان مین
جاتے ہین اور یہان کی تجارت سے بڑا فائدہ اوٹھاتے ہین تو پھر
ان آفت کے پرکالون سے کب چپ چاپ رہا جاسکتا تھا ان لوگون
نے بھی اپنے مال کے جہاز روانہ کیے اور ۱۵۹۹ء مین لندن شہر کے اندر
بہت سے انگریزون نے آپس کے ساجھے مین روپیہ اکٹھا کر کے
اس ملک مین سوداگری کرنے کیواسطے ایک کوٹھی مقرر کی اور دوسرے
ہی سال وہان کے بادشاہ سے کئی شرطون پر اس بات کی اپنے نام
سند لکھوالی کہ سواے ہم ساجھیون کے دوسرا کوئی انگریز ہندوستان
مین جاکر سوداگری نہ کرنے پاوے لیکن جب اس ملک مین ان لوگون
نے اپنا عمل اور دخل کرنا شروع کیا تب ۱۸۱۳ء مین انکو تجارت کرنے
کی منا ہی ہوئی بلکہ تجارت کا اون عام ہوگیا روک ٹوک جاتی رہی اور
کمپنی ایک سرکار کہلانے لگی انگریزی زبان مین ساجھیون کو کمپنی
کہتے ہین اسلیے ان ساجھی سوداگرونکا نام بھی ایسٹ انڈیا کمپنی رکھا گیا

جب انگلستان مین یہ کمپنی کھڑی ہوئی تو اوسوقت یہان اکبر بادشاہ تخت
پر تھا ہندوستان مین پہلے پہل انگریزون کی کوٹھیان سنہ ۱۶۱۱ع
مین سورت احمد آباد کھمبھات اور گھوگھے مین جاری ہوئین اور سنہ ۱۶۵۲ع
مین بنگالے کے اندر بلیشور مین اور اوسکے دو برس کے بعد مندراج
مین بھی جاری ہوگئی سنہ ۱۶۶۴ع مین پرتگال کے بادشاہ سے بمبئی کا
ٹاپو لیا گیا اور سنہ ۱۷۰۰ع مین بنگالے کے صوبیدار نے کلکتہ گوبندپور
اور چھوٹانٹی یہ تینون گانو انگریزون کو دیدیے اور کلکتے مین ایک قلعہ
بھی جسکا نام اب فورٹ ولیم ہی بنانے کی اجازت ملی اُس زمانے مین
یہ کلکتہ کل شہر جھونپڑونکا ایک گانو تھا سنہ ۱۷۵۶ع مین بنگالے کے
صوبیدار نواب سراج الدولہ نے اس بات پر کہ انگریزون نے
ہمارے ایک آدمی کو جو ڈھاکے سے کچھ خزانہ لیکر بھاگا تھا پناہ دی
ناخوش ہوکر کلکتہ چھین لیا اور ایک سو چھیالیس انگریز کو جو اوسوقت
وہان موجود تھے ایسی ایک تنگ و تاریک کوٹھری مین جسکی وسعت
بیس فٹ مربع سے زیادہ نہین تھی اور جسکو اب تک یہ لوگ بلیک ہول
یعنی کالی بل پکارتے ہین بند کردیا کہ دوسرے دن اُن مین سے کل
تیئیس ۲۳ جیتے نکلے تب آخر کو یہ خبر سنتے ہی کرنل کلائو صاحب مندراج
سے نو سو گورے اور پندرہ سو تلنگے لیکر کلکتے مین آئے کلکتہ بھی لیا

اور پھر مرشدآباد پر چڑھاو کردیا تب ۱۷۵۷ع کی ۲۳ جون کو مقام پلاسی
کی لڑائی مین سراج الدولہ کی فوج نے جو ستر ہزار ۷۰۰۰۰ سے کم نہین تھی
شکست کھائی نواب بھاگا اور اُسی روز گویا ہندوستان مین انگریزی
عملداری کی نیو جم گئی پھر تھوڑے دن پیچھے ۱۷۶۵ع مین شاہ عالم بادشاہ
نے جو اُسوقت دلی کے تخت پر تھا صوبہ بہار بنگالا اور اُڑیسہ ان تینون
صوبون کی استمراری دیوانی کا پروانہ کمپنی کے نام لکھدیا کہ جس سے دو ۲۰۰۰۰۰۰۰
کرور روپیہ سال کی آمدنی کا ٹھکانا ہوگیا اور وزیر آصف الدولہ نے رہیلون
کی لڑائی مین مدد دینے کیواسطے ۱۷۷۵ع مین بنارس کا علاقہ بالکل انکے
حوالے کیا اُس زمانے مین ہندوستان کی بادشاہت کا عجب حال تھا
آپس کی پھوٹ اور ہمیشہ کی لڑائی جھگڑائی کے باعث تیمور کا خاندان
تحس نحس ہو رہا تھا بادشاہ شطرنج کے مُہرے کیطرح لوگون کے ہاتھ
مین بے کرامات ہو چکا تھا یہان تک کہ ۱۷۳۹ع مین ایران کے بادشاہ
نادرشاہ اور پھر تھوڑے روز بعد احمد شاہ درانی نے جو پہلے نادرشاہ کے
امیرون مین تھا ایسے ایسے سخت حملے اس ملک کے اوپر پے در پے کیے
کہ رہا سہا زور بھی دلی کے بادشاہ کا جاتا رہا سلطنت مین کچھ ذرہ دم نہین
باقی تھا صوبے دارون نے بادشاہ کی اطاعت بالکل چھوڑ دی سلطنت
اپنی سمجھی جنکے باپ دادا نے کبھی چپا بھر زمین پر دخل نہ پایا تھا اُنھے بھی

ہندوستان کی پادشاہت پر دل دوڑایا الغرض ادھر تو دکھن کے
صوبے دار نظام الملک نے حیدرآباد مین اپنی حکومت جمائی اور اُدھر
نواب وزیر نے اودھ کے صوبے کو اپنا ملک سمجھا آگرے تک مرہٹون
نے لوٹ مار مچار کر دھینگا دھینگی سے چوتھ لینا شروع کیا اور سکھون کا
حملہ سرہند تک ہونے لگا بھرتپور کے جاٹ بھی ہیکڑ بنے ہوے تھے
رہیلکھنڈ کے رہیلے جدا خودمختار ہو گئے تھے بادشاہ اگرچہ براے نام دلی
کے قلعے مین پڑا تھا لیکن وہان بھی اُسے کوئی بیٹھا رہنے نہین دیتا تھا
یعنی اُسکی یہ نوبت تھی کہ آج ایک بادشاہ تخت پر بیٹھا کل کسی دوسرے
نے اُسکا سر کاٹ کر سکہ خطبہ اپنے نام جاری کر لیا ابھی تلوار کا لہو نہین
سوکھنے پایا کہ تیسرے نے اُسکو بھی موت کا جامہ پہنایا اور تاج بادشاہی
اپنے سر پر رکھا کبھی بادشاہ مرہٹون کی قید مین پڑ جاتا تھا اور کبھی رہیلون
کے پنجے مین گرفتار رہتا غرض ۱۷۰۷ع تک کہ جب اکبر کے پوتے کا بیٹا
اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ مرا ۱۷۶۰ع تک یعنی شاہ عالم کے روز اول
جلوس تک ترپن ۵۳ برس کے اندر بادشاہ او احمد شاہ چھرا کے چودہ بادشاہ
دلی کی تخت پر بیٹھے اور اگر انمین سے محمد شاہ کی سلطنت کے تیس برس
نکال ڈالو تو صرف تیئیس برس مین تیرہ بادشاہ گذر گئے پس اب سوچنا
چاہیے کہ جہان براے نام تخت اور تاج کے لیے ایسی چھین جھپان اور

نوچ کھسوٹ سے مچے گی وہان کی سلطنت کسطرح قائم رہیگی اسلیے سدا سے یہ
دستور چلا آیا ہی کہ جب خالق رب العالمین دیکھتا ہی کہ اب بادشاہ میرے
بندون کی پرورش اور نگہبانی نہین کرسکتا اور جس کام کے لیے اسکو
مقرر کیا تھا اُسے چھوڑکر عیش وعشرت اور ظلم و بدعت کرنے لگا تب
اوس بداقبال بادشاہ کو دفع کرکے جو کوئی اس کام کی لیاقت رکھتا ہی
اوسکو اپنی قدرت اور طاقت کے زور سے تخت کے اوپر بٹھا دیتا ہی اسمین
کچھ شک نہین کہ جو اس حالت مین انگریز لوگ ہندوستان کو نہ لیتے تو
فرانیس یا فرنگستان کا کوئی دوسرا بادشاہ اس ملک کو اپنے قبضے مین
کرلیتا اور اگر شاید وہ بھی نہ لیتا تو پھر کوئی دوسری قوم سندھ پار سے
آکر اس ہندوستان کی بادشاہ بن جاتی اور اپنے خاندان کی نیو جماتی
تیمور کی اولاد سے بادشاہت نکل چکی تھی خدا کے فضل وکرم سے ہندوستانیون
کے دن اچھے تھے جو انگریز یہان آئے گویا سوکھے ہوے کھیت پھر
لہلہائے الغرض پہلے تو حیدر علی کے بیٹے ٹیپو نے ان انگریزون
کے ساتھ دشمنی پر کمر باندھی اور بیٹھے بٹھائے لڑائی اٹھائی حیدر علی
میسور کے راجا کا نوکر تھا موقع پاکر اُسکا سارا ملک لے بیٹھا ٹیپو کا یہ ارادہ
ہوا کہ انگریزون کو دکھن سے نکال دیوے اور ابھارا اُسکو فرانسیسون نے
تھا کئی برس کی لڑائی مین آخر کو ۱۷۹۹ء مین شری رنگ پٹن کے

حملے کے درمیان وہ انگریزی سپاہیون کے ہاتھ سے مارا گیا اور ملک
اُسکا بہت سا سرکار کے اختیار مین آیا انھین دنون مین سرکار کو مرہٹون
کی طرف سے کھٹکا پیدا ہوا فرانسیسون کو وہ بھی نوکر رکھنے لگے تب لارڈ
ولزلی صاحب نے جو اُسوقت یہان کے گورنر جنرل تھے اُنکے پیشوا
باجی راو سے دوستی کرنا چاہا اُسنے اُسوقت تو دولت راو سیندھیا کے
بہکانے سے نمانا لیکن جب جسونت راو ہلکر نے اُسپر چڑھاو کیا تب سرکار
سے قول و قرار کر لیا اور بندیل کھنڈ کا علاقہ بھی دے دیا یہ سنکر سیندھیا
بگڑا اور اُسنے چاہا کہ ناگپور والے سے ملکر کچھ فساد اُٹھاوے لیکن ادھر تو
لارڈ لیک صاحب نے ڈیک اور لسواری اور دلّی اور اُدھر جنرل ولزلی نے
اسائی اور ارگانو کی لڑائیون مین ہلکر اور سیندھیا کے دانت ایسے کھٹے
کیے کہ آخر کو ۱۸۰۳ء مین ناگپور کے راجا نے تو کٹک کا ضلع اور سیندھیا نے
بالکل انتربید یعنی گنگا اور جمنا کے بیچ کا ملک انگریزون کو دیکے اپنا پیچھا
چھڑایا پھر تو اس نئے ملک کے ہاتھ لگنے سے انگریزون کی عملداری
دلّی تک پہنچ گئی وہان اس زمانے مین شاہ عالم بادشاہ قلعے کے اندر سیندھیا
کی قید مین پڑا تھا لارڈ ولزلی نے اُسکو قید سے چھڑا کر گذارے کیواسطے
ایک لاکھ روپیہ مہینے سے کچھ اوپر اسکی تنخواہ مقرر کردی پھر تھوڑے
روز بعد نیپالیون نے اپنی حد سے قدم باہر نکالا اور بڑھتے بڑھتے وہ

کانگڑے تک پہنچ گئے جب پہاڑ سے اُتر کر ترائی مین انگریزے رعیت کو
تنگ کرنے لگے تو سرکار نے اُنکو بھی نصیحت دینا مناسب سمجھا تب سنہ ۱۸۱۴ء
مین مکون کے قلعے پر اُنکی فوج کو شکست دیکے کالی ندی کے پچھم طرف
کے پہاڑ تو اپنے دخل مین کر لیے اور پورب طرف کے اُنکے پاس رہنے دے
اگرچہ باجی راو نے اپنی مصیبت کے وقت مین انگریزون سے قول قرار
کر لیا تھا لیکن دل مین اُنکے ساتھ دغا کی نرد کھیلا چاہتا تھا یہان تک کہ
اُسنے تاریخ ۶ نومبر سنہ ۱۸۱۸ء کو پونا کے درمیان رزیڈنٹی مین آگ لگا دی
اور انگریزی سپاہی جو تھوڑے سے وہان رہتے تھے اُنکا مقابلہ کیا
اور ادھر سے سیندھیا کا بھی ایک خط نیپال کے راجا کے نام لکھا
پکڑا گیا کہ جس سے اوسکی جانی دشمنی انگریز کے ساتھ ثابت ہو گئی
پنڈارون نے بھی قریب پچیس ہزار سوار کے اکٹھا ہو کر سارے ملک
مین لوٹ مار مچا رکھی تھی بلکہ کے کاردار بھی سرکار کے مخالفون کی
طرفداری کرتے تھے امیر خان ٹونک والا اپنے پٹھانون کے ساتھ
راجپوتانے کو تباہ کر رہا تھا یہان دیکھا چاہیے خدا کی قدرت اور مرضی
کو کہ اگرچہ اُسوقت مین ہر ایک طرف ہل چل پڑ گئی تھی اور سارے
ہندوستان مین فساد کی آگ بھڑکتی چلی تھی مگر لارڈ ہیسٹنگ صاحب
جو اُس زمانے مین گورنر جنرل تھے اُنھون نے اس ہوشیاری کے

ساتھ سبکا بندوبست کرلیا اور اپنی فوج کو چارون طرف اس ڈھب سے
دوڑادیا کہ ادھر تو سیندھیا کو جو کچھ سرکار نے فرمایا سب مان کر راجپوتانے
سے اپنا اختیار بالکل اٹھالینا پڑا اور اُدھر امیر خان نے اپنا توپخانہ
سرکار کے حوالے کردیا باجی راو پیشوا نے بھی سرکاری خزانے سے
آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ پنشن لیکر بٹھور مین گنگا کو سینا اختیار کیا اور ہلکر کی فوج نے
مہیدپور مین شکست کھاکر سرکار کی اطاعت دل وجان سے قبول کی پھر تو
ناگپور کا راجا اپنے قصور کے ڈر کے مارے اپنا ہی ملک چھوڑ کر بھاگ گیا
چنانچہ سرکار نے اُسکا کچھ تھوڑا سا ملک لیکر باقی اسکے وارثون کو دے ڈالا
پنڈارے اسقدر قتل ہوے کہ نام کو بھی باقی نرہے جو کچھ جیتے بچے وہ لوٹ مار
چھوڑ کر کھیتی باری کرنے لگے الغرض سنہ ۱۸۱۹ع مین مرہٹون کی لڑائی بالکل
فتح کے ساتھ ختم ہوگئی اور سب طرف سے امن چین کی راہ کھلی کابل کی لڑائی
کے وقت سندھ کے امیرون نے کراچی اور ٹھٹھا سرکار کو دے ڈالا تھا
اور سندھ ندی کی راہ سے محصول اٹھا لینے کا اقرار کئی باتون کے
ساتھ سرکار سے کیا تھا لیکن دغا کرکے اپنے قول قرار سے پھر گئے تب
سنہ ۱۸۴۳ع مین سرکار نے انکو بھی اُس ملک سے خارج کرکے وہان بالکل اپنا
عمل دخل کرلیا بعد اسکے سنہ ۱۸۴۵ع کے اخیر مین سکھون نے ستلج پار اتر کر
سرکار پر چڑھائی کردی لیکن آخر کو جیسا کیا ویسا پھل پایا پہلے تو سرکار نے

۱۸۴۶ء انکا صرف جالندھر دوآب اور ستلج کے اس پار کا ملک ضبط کر لیا تھا
اور قصور معاف کر کے دلیپ سنگھ کو لاہور کی گدی پر بحال رکھا لیکن پھر بھی
جب یہ لوگ لڑائی بھڑائی سے باز نہین آئے اور بہت عرصے تک لڑتے
رہے تب ۱۸۴۹ء مین سرکار نے بالکل انکا ملک ضبط کر کے اپنی عملداری مین
شامل کر لیا اور دلیپ سنگھ کو پنجاب سے نکالکر گذارے کے لیے دس ہزار روپیہ
مہینا اوسکا مقرر کر دیا اب اس دم اٹک سے گنگ تک بالکل انگریزی عملداری
ہی اور ہمالیہ سے سمندر تک انھین کا ڈنکا جاری ہی بلکہ پورب اور پچھم مین
ہندوستان کی اصلی سرحد سے بھی زیادہ انکی عملداری بڑھتی چلی

## غدر کا حال

سبب برپا ہونے غدر ۱۸۵۷ء کے بہت کچھ صاحبان انگریز بہادر نے لکھے ہین
اور خلاف آن باتفاق انکے اہل ہند نے بھی اسباب اسکے تحریر کیے ہین
غرض تقدیر الہی ہونہار بات تھی جو ہوئی مگر غدر مین تین قسم کے لوگ تھے
۱۔ عام لوگ بانی غدر کے اور باغی سرکاری فوج کے تھے ۲۔ سرداران
باغی مثل شاہ دہلی اور بیگم اودھ اور نانا پیشوا مع لواحقین وغیرہ کے جو
اپنے اسلاف کے ملک و مملکت سے محروم اور اسکے مدعی تھے ۳
بیکار اور نوکری پیشہ اوباش اور وہ لوگ جنکا پیشہ رہزنی تھا فقط

لیکن سرکار کی قدرت اور نیت نے اس مواد فاسد کو جڑ سے ایسا دفع کیا کہ اب ہندوستان مین اسکا اثر باقی نہین ہی

## ذکر عہد دولت ملکۂ معظمہ شہنشاہ انگلند و ہند خلد اللہ ملکہا

سنہ ۱۸۵۸ء مین ملکۂ معظمہ یعنی کوئین وکٹوریا نے اس ملک کا انتظام کمپنی سے لیکر اپنے ایک وزیر کے سپرد کر دیا اور اُنکے مدد کیواسطے بارہ صاحبان جلیل الشان کی ایک کونسل بھی مقرر کر دی اسی وزیر کا لقب سکرٹری اف اسٹیٹ فار انڈیا ہی سارا انتظام وزیر کے اختیار مین ہی وہی صاحبون کو اس ملک کے عہدون پر مقرر کر کے وہان سے بھیجتا ہی اور یہان پر گورنر جنرل کو باتفاق رای کونسل اختیار دے رکھا ہی گورنر جنرل کے تحت مین مندراج و بمبئی کے گورنر اپنی اپنی کونسل سمیت اور آگرہ او پنجاب کے لفٹنٹ گورنر اور بنگالے کے ڈپٹی گورنر اور اودھ اور ناگپور کے چیف کمشنر مقرر ہین اور پھر سواے پنجاب کے چارون گورنرون کے زیر حکم چار چار صدر دیوانی اور صدر نظامت عدالت اور چار بورڈ ریونیو اور اُنکے تابع ہر ایک ضلع مین کمشنر و جج مجسٹریٹ کلکٹر وغیرہ اپنا اپنا کام کرتے ہین پنجاب اور اودھ اور ناگپور میسور مین صدر دیوانی و نظامت کی جگہ جوڈیشل کمشنر اور بورڈ کی جگہ فنیانشل کا تقرر ہی

اور کمشنر کے نیچے اکثر ضلعون مین حاکم ضلع ڈپٹی کمشنر کہلاتے ہین کلکتہ مندراج بمبئی مین انگریزون پر نالشات سننے کے واسطے عدالت سپریم کورٹ مقرر ہی کلکتہ مندراج بمبئی ان تین احاطون کیواسطے کمانڈر انچیف ولایت سے مقرر ہو کر آتے ہین لیکن کلکتہ والا کمانڈر انچیف دونون پر غالب ہی اسوقت ہندوستان مین فوج گورہ اسّی ہزار سے کم نہین ہی فقط

## رونق تازہ

سرکار کے عمل سے جابجا سڑک اور ریل اور تار برقی اور چوکی تھانہ اور ضلعبندی اور آمدورفت بلا مزاحمت اور اجراے کشتی و جہاز و نہر اور انتظام ملک کے ایین اور دارالشفا و مطابع اور اخبار دو زبان اور انگریزی اور مدرسہ اور ڈاک اور معافی محصولات اکثر اشیا سے اب ہند مین رونق اور امن و آسایش بدرجہا زیادہ ہی زراعت کی بھی ترقی ہی مگر یہ کیفیت سرکاری علاقون تک ہی رجواڑون کا حال کم کم بدلا ہی اور اب روز بروز بدلتا جاتا ہی چونکہ اکثر تجارت اہل یورب کے ہاتھ مین ہی اور اشیای ولایتی کے آگے اشیای ہند بیقدر ہو گئین سو لیے اسکے ہند مین نوکری پیشہ بہت لوگ ہین جو اکثر بیکار ہین اسی وجہ سے تمام باشندے ہند کے صورت آسودگی کماحقہ نہین رکھتے مالدار اور امرا لوگ تن پرور اپنی

اور عیاشی کے سبب اپنے دخل و خرچ کا انتظام کم رکھتے ہین اس وجہ سے جلد تباہ ہو جاتے ہین فقط

## جدول ریاستہای ہندوستانی

| نمبر | نام ریاست | وسعت میل مربع | آمدنی سالانہ | کیفیت |
|---|---|---|---|---|
| ۱ | اودیپور | ۱۱۶۰۰ | ۱۲ لکھ ۵۰ ہزار | یہ ریاست قدیم ہے نوشیروان نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دی تھی واقع راجستان |
| ۲ | الور | ۳۵۰۰ | ۱۸ لکھ | والی ریاست جوان سرکار سے اس سال مسند نشینی و اختیار عطا ہوئے واقع راجستان |
| ۳ | اندور | ۸۰۰۰ | ۱۲ لکھ | انتظام اچھا والی ہوشیار |
| ۴ | اجی گڑھ | ۰ | ۳ لکھ ۲۵ ہزار | واقع بندیل کھنڈ |
| ۵ | اڑچھا | ۰ | ۷ لکھ | ایضاً صدر ڈسٹری ہے |
| ۶ | بانسواڑہ | ۱۵۰ | ۲ لکھ | جنوب اودے پور |
| ۷ | بروودہ | ۲۴۰۰۰ | ۷۰ لکھ | ملک زرخیز اور آباد والی عاقل و صاحب اختیار |
| ۸ | بسہر | ۰ | ۱ لکھ | |
| ۹ | بجاور | ۰ | ۱۲ لکھ ۲۵ ہزار | واقع بندیل کھنڈ |
| ۱۰ | بوندی | ۲۲۰۰ | ۱۰ لکھ | شہر لائق دید ہے اور کٹاری یہاں کی مشہور ہے |
| ۱۱ | بہاولپور | ۲۰۰۰۰ | ۲۵ لکھ | انتظام خیریت والی حال بیدار مغز |

| نمبر | نام ریاست | وسعت میل مربع | آمدنی لاکھ | کیفیت |
|---|---|---|---|---|
| ۱۲ | بھوپال | ۷۰۰۰ | ۲۵ لکھ | والیہ بڑی عاقل و ہوشیار انتظام قابل تعریف |
| ۱۳ | بھرت پور | ۲۰۰۰ | ۲۰ لکھ | ملک آباد و والی صغیر سن |
| ۱۴ | بیکانیر | ۱۷۰۰۰ | ۲۰ لکھ | والی مہذب اور لائق و نام آور |
| ۱۵ | پٹیالا | ۵۰۰۰ | ۲۵ لکھ | ملک آباد رعیت آسودہ اہلکار بڑے لائق و والی ہوشیار |
| ۱۶ | پنا | ۰ | ۴ لکھ | ہیرے کی عمدہ کان یہین ہی |
| ۱۷ | پرتاب گڑھ | ۱۵۰۰ | ۲ لکھ | شجر کمیاب آب سراب |
| ۱۸ | تربوانکور | ۵۰۰۰ | ۴ لکھ | ملک سیر حاصل زرریز ہی |
| ۱۹ | ٹونک | ۱۸۰۰ | ۱۰ لکھ | حاکم حال بہت دیندار و متشرع |
| ۲۰ | جودھپور | ۳۵۰۰۰ | ۱۷ لکھ | باشندے یہان کے افیونی اور والی شوقین خوش اوقات انتظام و اہلکار رسمی |
| ۲۱ | جی پور | ۱۵۰۰۰ | ۸۵ لکھ | والی عاقل بیدار مغز اہلکار لائق انتظام غنیمت |
| ۲۲ | جیسلمیر | ۱۲۰۰۰ | ۱ لکھ | شہر اُجاڑ باشندے کم |
| ۲۳ | جیند | ۰۰ | ۵ لکھ | والی مدبر و منتظم اہلکار اچھے |
| ۲۴ | چارکھاری | ۰ | ۴ لکھ | عرف چرکھڑی والی صغیر سن |
| ۲۵ | چھتر پور | ۰ | ۳ لکھ | — |
| ۲۶ | چمبا مع سکیت و منڈی | ۰ | ۵ لکھ | آب و ہوا اصل علی |

| | نام ریاست | وسعت میل مربع | آمدنی سالانہ | کیفیت |
|---|---|---|---|---|
| ۲۷ | دتیا | ۰ | ۱۰ لکھ | واقع بندیل کھنڈ |
| ۲۸ | دھارا | ۱۰۰۰ | ۴ لکھ ۵۰ ہزار | دارالحکومت راجا بھوج و باجی راو پیشوا والی پونا |
| ۲۹ | دھول پور | ۱۶۲۵ | ۷ لکھ | انتظام و اہلکار رسمی والی غافل ولیعہد قابل |
| ۳۰ | دیواس | ۰۰ | ۴ لکھ | محلات قلعہ و مسجد و تالاب و مقبرہ حسین شاہ قابل دید ہے |
| ۳۱ | دونگرپور | ۱۰۰۰ | ۴ لکھ | جھیل پر بند سنگ مرمر قابل دید |
| ۳۲ | ریوان | ۱۰۰۰ | ۲۰ لکھ | انتظام ضعیف اہلکار کم والی عالی منش و جوانمرد |
| ۳۳ | رامپور | ۷۰۰ | ۱۱ لکھ | ملک سیراب سیر حاصل انتظام چست والی قابل صاحب [illegible] |
| ۳۴ | ساونت واڑی | ۱۰۰۰ | ۲ لکھ | ملک کوہ و جنگل و بیہڑ تسلط سرکار کا راجا کو بعد منہائی صرف کے باقی ملتا ہے |
| ۳۵ | سروہی | ۲۰۰۰ | ۱ لکھ | سروہی کی تلوار مشہور ہے |
| ۳۶ | سمتھر | | ۴ لکھ ۲۵ ہزار | واقع بندیل کھنڈ |
| ۳۷ | سکم | ۱۶۰۰ | ۰ | کوہ دارجلنگ مشہور اہل مذہب بدھ آدمی بلاجو |
| ۳۸ | فریدکوٹ | ۰ | ۲ لکھ | قریب فیروزپور پنجاب ہے |
| ۳۹ | قرولی | ۱۹۰۰ | ۵۰۰۰۰ | والی صاحب حوصلہ |
| ۴۰ | کہلوار | ۱۶۰۰ | ۱ لکھ | صدر بلاسپور ہمالہ پنجاب کوہ پر فضا و دلکشا |
| ۴۱ | کپورتھلہ | ۰ | ۱۰ لکھ | ملک آلودہ رعیت شاہ اہلکار خیر خواہ والی آئین تمیز تامل |

| نمبر شمار | نام ریاست | وسعت میل مربع | آمدنی سالانہ | کیفیت |
|---|---|---|---|---|
| ۴۲ | کچھی | ۲۰۰۰ | ۸ لکھ | جنگل وجھیل آب شور برسات عالم آب عجیب عجیب جگہ نما |
| ۴۳ | کشمیر جمو | ۲۵۰۰۰ | ۵۰ لکھ | والی عاقل اہلکار سرکار خیرخواہ ملک آباد جا بجا آباد |
| ۴۴ | کشن گڑھ | ۷۰۰ | ۳ لکھ | |
| ۴۵ | کوٹہ | ۶۵۰۰ | ۳۵ لکھ | ثمرہ اولاد ظالم سنگھ کو جسنے نابالغی راجا مین کام کیا سرکار نے دلا دیا وہ جھالا پاٹن مین ہین |
| ۴۶ | کوچی | ۲۰۰۰ | ۵ لکھ | عرف کوچین اب تحت سرکار ہے شہر اور کوٹھی کے محلات عمدہ |
| ۴۷ | کولاپور | ۳۵۰۰ | ۱۵ لکھ | کوہستان مین لب دریا ہی |
| ۴۸ | گوالیر | ۳۳۰۰۰ | ۸۰ لکھ | علاوہ جاگیرات کے مالوہ نرمدا یا آسودہ ملک آباد جنگل بھی ہی والی مدبر جرار شمس الامرا صاحب اقبال فوج مثل اہلکار لاکھ کی |
| ۴۹ | گڈھوال | ۴۵۰۰ | ۱ لکھ | ملحقہ لب سرو کوہستان |
| ۵۰ | مالیر کوٹلہ | | ۲ لکھ | قدیم خاندان ہی |
| ۵۱ | منی پور | ۷۵۰۰ | ۱ لکھ | باشندہ معتقد دیوی برہنہ وجنگلی کوہ وکثیر تسلط سرکار |
| ۵۲ | میسور | ۲۷۰۰۰ | ۷۰ لکھ | تسلط سرکار |
| ۵۳ | نابھہ | ۵۵۰۰ | ۷ لکھ | والی عاقل یہ راج پنجاب مین ہی |
| ۵۴ | نیپال | ۸۰۰۰۰ | ۳۲ لکھ | سرکار سے عہدنامہ و آشتی ہی |

# اوده

لوار یخهاے ہندو عموماً کتب سنسکرت سے مستنبط ہے کہ قدیمی نام اسکا اوتر کوشل ہے اور ابتداے آبادی منوجی موجد اصول دہرم شاستر سے بتاتی ہین اور دفتر شاہی اور انگریزی مین صوبۂ اوده لکھا جاتا ہے اور قدیم سے اوده یعنی مقام اجودہیا دار الامارۃ و حاکم نشین رہا اور ہندو لوگ مولد و دار السلطنت مہاراجہ رام چندر جی سے خاص اوده اور اوسکے مضافات کو ایک مہاتیرت جانتے ہین عہد سلطنت مہاراجہ رام چندر مین اوده کا دار السلطنت اجودہیا تہا کہ جسکا طول ایک سو اٹہائیس کوس اور عرض چہلیس کوس تہا یہ ملک بسبب کثرت دریا اور ندیون کے ہندوستان کا گویا ایک باغ تہا کثرت آبادی و زراعت و مردم شماری و پیداواری و آمدنی مین ہندوستان کی اور بلاد سے جو اکثر مقابلہ ہوا سب باتون مین صوبۂ اوده کو ترجیح رہی پہاڑ بالکل نہین زمین ہموار اس ملک مین لاجورد کی کان ہے اور یہان کا لاجورد نہایت عمدہ اور صاف ہے ۔

زراعت یہانکی نیشکر چانول افیون تو مشہور ہے باقی ہر قسم کی پیداوار اور پہول پہل افزون اور زائد اب انگریزی زمانے مین نیل روئی افیون کی زراعت کثرت سے ہو چلی ہے قبل تسلط اہل اسلام بطور خود یہانکے لوگ اپنا گذران قناعت سے کرتے تہے انقلاب عملداریون سے

کچھ نکچھ ہل چل ہوتی رہی علی الخصوص اخیر زمانہ تیموریہ مین بہت بڑا نشیب و فراز
ہوا جو تواریخون سے خود معلوم ہوگا اب عہد انگریزی مین ہر ضلع تعلقہ داری
مین ایسا بندوبست ہوگیا ہے کہ سرکار کو اب کسی نوع کا دغدغہ نہین اور
ہمیشہ سے اس ملک مین معافی اور شکلپ بہی بہت سے ہے کہ اوس سے
گذارہ یہانکی خلائق کا ہوتا تہا دعا گو حاکم وقت رہتے تہے اور اپنی قسم
کے کمالات حاصل کرتے تہے اب اکثر معافیان اور جاگیرین ضبط ہوگئین چہات
ہین بڑے دریا و ندیان اس ملک کے یہ شمار کیے گئے ہین گنگا گہاگرا
گومتی راپتی سرجو و چوکا اور بہی بعض ندیان ہین جو بارہون مہینے رواں
رہتی ہین مالگزاری کا بندوبست عہد شاہی مین اور اس زمانے مین
بہی نصفی کا ہے اور اب بندوبست پختہ بہی کئی ضلعون مین ہوگیا تو بہی
قریب قریب ہے بندوبست بحال ہے رعایا اور ملک کی آبادی
اور بہتری ملائم بندوبست کے سبب سے متصور ہے۔ محاصل یہانکی
اگرچہ پختہ ڈیڑہ کرور کا عہد شاہی مین مشہور ہے مگر کبہی ایک کرور بہی داخل
خزانہ نہوا اگر اب جو مالگزاری کا بندوبست سرسری کیا گیا ہے البتہ قریب
ایک کرور ۲ لاکہ ہے سواے لسکنے اور آمدنی ملا کر کل مبلغ یک کرور ۲۰ لاکہ
استقدر ہین اس ملک مین اب سرکاری فوج بہی اکثر ہے اور پولس کے
بندوبست نے جنگی سپاہ کو زیادہ تر امداد اور کام کے دینے کی ضرورت

نہین ہوتی ۔ اس زمانے مین دارالحکومت لکھنؤ کی حدود یہ ہین اوتر
کی طرف نیپال کی ترائی ہے اور دکن گنگا اور راوسیار کانپور کا ضلع جانب
شرق گورکھپور اور جونپور اور غرب فرخ آباد اور شاہجہان پور ۔ اس ملک
مین قبل ۱۸۶۳ء چار کمشنری تھین اب صرف تین کمشنری رہ گئین لکھنؤ
خیرآباد فیض آباد ۔ ان تینون کمشنری کے ضلع ضلع کی مختصر یہہ کیفیت
ہے قسمت لکھنؤ کا پہلا ضلع

## لکھنؤ

یہہ ضلع دارالحکومت اس صوبے کا ہے یہ شہر لب گومتی دکن رویہ
آباد ہے گومتی کی دونون طرف آبادی ہے تخمیناً تین لاکھ آدمی کی
بستی ہے ۲۶ درجہ ۵۱ دقیقے اوتر عرض ۸۰ درجہ ۵۰ دقیقہ پورب طول
مین دارالامارۃ کلکتے سے گوشۂ شمال اور مغرب کی طرف بسا ہوا ہے ۔
اصل نام اسکا لکھشن ناوتی بتلاتے ہین ۔ اور بعضے لوگ ایسا ہی کہتے
ہین کہ زمینداران جہان سوت جی ساٹھہ ہزار منیون یعنی زاہدون کے
ساتھہ جلسے مین پران سناتے تھے اسی مقام پر تھا اصلی نام اسکا لکھشن
ناوتی ہے ۔ اور بعضے لچھمن پور کہتے ہین اصل دونون کی ایک ہی ہے
یعنی مہاراج لچھمن برادر خرد راجہ رام چندر جی نے بسایا شہر لکھنؤ کی دارالحکومت
ہونیکا دعوی ہر چند جلوس نواب آصف الدولہ سے ہے جسکو عرصہ اسی برس کا

ہوا ہے مگر مدت مدید سے یہ شہر از بس معظم اور مشہور شہرہاے اودہ سے
تھا فی زماننا جہان شہر لکھنؤ آباد ہے اوس مقام پر ۴۲ دیہات آباد تھے
جنکے نام اسماے محلات سے جو اونکی جگہہ آباد ہین مفہوم ہوتے ہین
اور ما بقی دیہات کے نام و نشان مفقود ہو گئے ہین اور بجز کتب قدیمہ
اور کسی علامت سے اونکے نام دریافت ہو نہین سکتے ناف شہر لکھنؤ وہ
بلند مقام متصل پل پختہ کے ہے جہان ایک مسجد نامزد شاہ پیر محمد صاحب
موجود ہے اور جسکو بنام لچھمن ٹیلہ مشہور کرتے ہین اس جانب یعنی بجانب
ٹیلہ مذکور کے ایک گانون بنام لچھمن پور آباد تھا اور اوسی گانون کے
نام سے یہ شہر لکھنؤ مشہور ہوا۔ ایک قدیم روایت ہے کہ شہر اجودہیا
جبکہ خاندان راجپوتان سورج بنسی اس شہر مین حکمران تھے ایسا بڑا
وسیع شہر تھا کہ آبادی شہر اجودہیا سے جو اب آباد ہے شہر لکھنؤ تک
بلا فاصلہ آباد تھا۔ یہ روایت اس وجہ سے قرین قیاس ہو سکتی ہے
کہ لچھمن جی جو آباد کنندہ لچھمن پور کے تھے بھائی سری رام چند کے تھے
جنہون نے اجودہیا کو آباد کیا تھا اور یہ دونون بھائی کبھی جدا نہوتے
تھے اس نظر سے ظن غالب ہے کہ دونون نے آبادی اپنے اپنے
شہر کی بھی متصل ایک دوسرے کی ہو غالب ہے کہ آبادی لچھمن پور
کی برہمنون کی تھی اور چند خاندان شیخ جو سنہ ۱۱٦۰ع مین ہمراہ فوج سالار

غازی میان برادر زادۂ محمود غزنوی انکو مغلوب کرکے خود انکے ملک پر
متسلط ہوگئے تھے اوس وقت مین اہل اسلام اس ملک مین آئے تھے
گو اب ہر ایک خاندان اہل اسلام بیان کرتا ہے کہ وہ ہمراہ فوج سپہ سالار کے
یہان آئے ظاہرا انکی آمد اور قیام اس ملک مین بتدریج ہوا ہوا اور غالب
کہ سو برس کے عرصے سے آبادی انکی یہان قرار پائی ہو یہ خاندان شیخ
جو ہمراہ سپہ سالار کے آیا تھا انہون نے ملک مین بڑی عظمت و شان
پیدا کی یہانتک کہ فوج مین سے انکے خاندان کے کئی شخص علاقہ صوبہ داری
پر ممتاز ہوگئے تھے اول اول لوگون نے تجویز تعمیر قلعے کی کری اور یہ
قلعہ استحکام مین بہت مشہور ہوا اور یہ قلعہ اوس مقام پر تعمیر کیا گیا تھا جہان اب
قلعہ مچھی بہون مشہور ہے ۔ اور روایت اسطرح پر مشہور ہے کہ اوسکی تعمیر ایک
اہیر کے ذمے تھی جسکا نام لکہنا تھا اس وجہ سے اوسکو قلعہ لکھنہ کہتے
تھے اور چونکہ یہ خاندان شیخ بہت ذی رتبہ تھا اور کثرت اشخاص اوسمین
تھی اسلیے اوسکے گرد و پیش مین اکثر آبادی ہوگئی اور یہ دونون آبادی
کے نام یعنی بجنور اور لکھنہ کے نام سے مخلوط ہوکر لکھنو ہوگیا اب یہ امر
تحقیقا معلوم نہین ہوتا کہ یہ نام لکھنو اس آبادی کا کب کہا گیا مگر اسمین شک
نہین کہ یہ آبادی قبل از عہد اکبر شاہ بنام لکھنو مشہور تھی شیخان لکھنو ایک قصہ
اثبات بزرگی اس شہر کا بیان کرتے ہین کہ جب ۱۵۴۰؁ء مین ہمایون بادشاہ

واسطے جنگ شیر شاہ بادشاہ جونپور کے جو بعد ازان شہنشاہ دہلی ہو گیا روانہ ہوے
اور اثناے راہ مین بمقام لکھنو چار گھنٹے استراحت فرمائی تھی باوجودیکہ
فوج شکست خوردہ و دل شکستہ تھی اور ایسے وقت مین رعایا بھی فرمانبردار نہین
رہتی مگر تاہم اس عرصے قلیل مین فوج مذکور نے واسطے شہنشاہ کے دس ہزار
روپیہ اور پچاس راس اسپ بہم پہنچاے تھے اس قصے مین ہر چند مبالغہ ہو
مگر یہ بات ظاہر ہے کہ اوس زمانے مین بھی شہر لکھنو آباد و مالدار تھا غرض کہ
زمانہ آصف الدولہ سے تا عہد واجد علی شاہ آبادی بڑھتی گئی بلکہ کسی زمانے
مین آدمیون کا بن مشہور تھا اور عہد سلطنت مین پانچ لاکھ سے زیادہ سکونت
بتاتے ہین اس شہر مین کتنی سڑکین بہت سے کٹرے اور ٹولے اور
محلے آباد ہین جس محلے مین شیخ مینا صاحب کی درگاہ تھی اب وہ محلہ تو مسمار
ہو گیا لیکن درگاہ موجود ہے اکثر لوگ پنجشنبے کو فاتحہ کے واسطے وہان جاتے ہین
سوا اسکے اور بھی زیارت گاہ اہل ہنود و اہل اسلام کی ہین جنکی تفصیل طوالت ہے۔
باغات اس شہر مین اکثر اور میوجات ہر قسم کے نہایت تحفہ انبہ و خربزہ
اور کوسلے مشہور ہین - کوچے یہان کے تنگ اور غلیظ مگر اب صفائی
شہر کے لیے کمیٹی سے تدارک ہوتا جاتا ہے اور اب سڑکین بھی وسیع اور
فراخ نکلی ہین اور نکلتی جاتی ہین اور اب بھی اس ٹوٹی پھوٹی حالت پر شہر کو
کسی بلند مقام سے دیکھا جاے تو جہانتک نظر جاے دیانتک درخت

بلند مینار گنبد اور عالی شان مکانات اور بعض جگہہ چمکتی ہوئی سنہری کلسیان
نظر پڑتی ہین — حسین اباد اور چوک مین ابھی رونق ہوتی ہے — عہد
شاہی مین حجامون تک کے بدن پر دو شالے اور حلال خورون کے
پانون مین ٹاٹ بافی جوتی موجود تھی جسکے گھر مین چوہے پر توا بھی نہ تھا وہ
بھی بازار مین سج بنے پھرتے تھے لفافہ تو اس شہر کا مشہور ہے اور ابھی تک
یہان کے امرا اور رؤسا اور اہل وثائق سے شہر کی شان و شوکت کچھہ
مشتے نمونہ از خروارے باقی ہے — ہر قسم تجارت کی جنس موجود انگریزی
عملداری سے پہلے بادشاہی مکانات کے بڑی طیاریان رہتی تھین
قرینہ اور سجاوٹ دیکھکر انسان کی عقل دنگ ہو جاتی تھی جھاڑ کنول شیشہ
اور دیگر تکلفات کا کیا بیان ہو قصر جمشیدی کی شان و شوکت اوس سے
عیان ہو فرح بخش مبارک منزل اندراسن موتی محل شیش محل حسین اباد
کتب خانے لائق دید تھے اب بھی جو کچھہ مسماری و منہدمی سے محفوظ رہی
جسکا بیان آخر مین زیر کیفیت مکانات کے درج ہوگا قابل دید ہین
محرم یہان کا مشہور عالم ہے امام باڑے ایام محرم مین نور کے تختے نظر
آتے ہین خصوصاً حسین اباد — لوگ لکھنو کے تراش و خراش بول چال
مین اور شہرون کی زبان کو اپنے برابر نہین جانتے بلکہ عموماً اتفاق ہے
کہ جیسا یورپ مین فرنچ ویسا ہی ہند مین لکھنو ہے — میلے بھی بہت کثرت

سے ہوتے ہین متل عیش باغ آٹھونکا میلہ سورج کنڈ نوچندی آیہ باقی حال باشندہ دن کا آخر مین لکہا جایگا اس ضلع مین اگرچہ چھوٹے چھوٹے قصبے بہت ہین مگر کاکوری کرسی ملیح آباد کاکوری کے مسلمان رئیس بڑے نامور خدمات سرکاری پر اکثر جگہہ ممتاز اور عموماً اس قصبے کے لوگ فارسی عربی مین مہارت کمال رکہتے ہین خواح شہر کی زمیداری مین البتہ فائدہ آمدنی ترکاری و سبزی کی بہت زیادہ اور ہر موسم کی چیزین فصل سے آگے اس شہر مین آکر فروخت ہوتی ہین دارالحکومت عمل انگریزی مین بدستور لکھنو ہی قرار پایا صاحب چیف کمشنر بہادر اسی جگہہ پر تشریف رکہتے ہین اس ضلع کے تعلقہ دار بہی اکثر شہر کی نزدیکی کے سبب سے خوش وضع و پرتکلف ہین ——— زمین اس ضلع کی اوسط درجے کی ہے ۔ حضور تحصیل لکھنو کرسی موہن لال گنج ملیح آباد یہ چار تحصیل ہین ۔

## دوسرا ضلع دریاباد

اسکا صدر مقام لکھنؤ سے ۲۰ میل نواب گنج بارہ بنکی مین ہے یہ ایک قصبہ مختصر سا ہے اب ایک سراے پختہ نئی زیر اہتمام اہلکاران سرکاری تعمیر ہوئی ہے آب وہوا اس ضلع کی بہت اچھی زراعت پر فلاحت ہے تعلقدار بھی اس ضلع کے نامی گرامی رعایا خوش اور اکثر تعلقہ دار اہل اسلام سے ہین جنگل کم ندیان اور جھیل سے سارا ضلع سیراب اور مقام سترکھ مین ایک میلہ بھی ہر سال ہوتا ہے اور اب لکھنؤ سے نواب گنج ہوتے ہوسے فیض آباد تک سڑک پختہ طیار ہوگئی ہے اور ایک اسکول بھی زیر اہتمام ضلع کے جاری ہے اور اس ضلع مین تحصیل ہاے مفصلۂ ذیل یہ ہین نواب گنج خصوصاً تحصیل رودلی دریاباد رام نگر +

## تیسرا ضلع راے بریلی

یہ مقام لکھنؤ سے ۴۵ میل جانب مشرق مائل جنوب واقع ہے قصبہ پرانا مکانات کہنہ اور یہ ضلع قبل از تجویز جدید مقام کمشنری بیسواڑہ بھی رہا زمین عموماً اچھی اور ہر طرح کی قابلیت زراعت اور تعلقہ دار بڑے بڑے ہین اور آسودہ اور مرفہ الحال ہین لیکن ہنود خصوص

راجپوت کثرت سے ہین شاہزادہ سہدیو سنگہ خلف سردار شیر سنگہ

مہاراجہ پنجاب کو اس ضلع مین جاگیر عطا ہوئی ہے اسلیے وہ بھی

یہان رہتے ہین اور بعض بعض انگریز جو اس ضلع مین تعلقدار

ہین اونھون نے نیل اور پنبہ کی زراعت مین توجہ کی ہے

رائے بریلی دلمئو مہارا جگنج حیدر گڑھ یہ چار تحصیل ہین +

## چوتھا اونام

لکھنؤ سے ۴۰ میل جنوب اسکے گنگا کے اسکے پار کانپور ہے

صدر مقام اسکا اونام ہے بندوبست پختہ سے رفاہ رعایا برایا

ہوا ہے تعلقہ داری بہت کم ہندو مسلمانکی آبادی ہے برہمن اور

راجپوت زیادہ ہین عموماً اوسط درجہ کی زمین خاص مقام اونام

شیخون کا آباد کیا ہے شاید یہ پرانے خاندان شیخون سے ہین اور

اب بھی اونکے خاندان سے لوگ موجود ہین اس ضلع کا انتظام

بہت اچھا اور رعایا کمال خوش حضور تحصیل اونام نواب گنج

پوروا صفی پور یہ چار تحصیل ہین +

## قسمت خیرآباد

## ضلع ہردوئی

مقام ضلع کا خاص ہردوئی لکھنؤ سے ۶۰ میل ہے یہ ضلع بہت وسیع ہے
حدود غربی ملحق ہین فرخ آباد اور جنوبی حد گنگا سے ملتی ہے اس ضلع
کی زمین متوسط آدمی بھی عموماً اچھے اور بانگر جہان کے چور مشہور
ہین اسی ضلع مین واقع ہے اس ضلع مین اچھے اچھے قصبے
بلکہ بطور شہر آباد ہین سندیلہ بلگرام شاہ آباد گوپامؤ کٹیاری
لیکن ضلع کا دارالحکومتہ بہت خراب موقع پر آباد ہے اہل معاملہ
کو بوجہ نہونے گھرونکے تکلیف ہوتی ہے لیکن اب آباد ہوتا
جاتا ہے جنگل بھی اکثر واقع ہین اور بہت کچھ نیلام بھی ہو گئے
اور اونمین آبادی ہوتی جاتی ہے ہندو و مسلمان دونون مذہب
کے رئیس اعظم تعلقہ دار ہین چودہری حشمت علی رئیس سندیلہ
اور راجہ ہردیو بخش کٹیاری کے بڑے عالی نژاد اور نامور ہین
سوا انکے اَور اَور بھی رئیس تعلقہ دار خصوصاً اہل اسلام سے
زیادہ تر باوضع اور پر تکلف ہین اب اس ضلع مین مدرسہ
حاکم ضلع کے اہتمام سے اجرا ہے اور ترقی پر ہے ہیڈ ماسٹر
اور مدرسون کی لیاقت قابل تعریف ہردوئی حضور تحصیل
شاہ آباد سندیلہ بلگرام یہ چار تحصیل ہین +

## دوسرا سیتاپور

مقام دار الحکومۃ کمشنری و ضلع کا ہے خیرآباد سے جانب شمالی ۵ میل لکھنؤ سے ۶۰ میل ہے حکام کی نیک نیتی سے اس ضلع مین یوماً فیوماً برکت ہے تعلقدار اور رئیس قدیمی سے یہ ضلع گلزار ہے زمین بہت اچھی گنجایشی کئی قصبہ نامی مثل خیرآباد باڑی لسوان رامپور اور ضلع کے صدر مقام سے کچھ فاصلے پر مصرکھ اور اوسکے قریب نمسار مین یہ دونون مقام متبرک اور پرانے ہین اور نمسارن وہ مقام ہے جہان سُوت جی نے پُوران سنایا گومتی اوسکے تلے بہتی ہے اسکے نزدیک ایک حوض برھماورت نام کا ہے اسکا پانی اندر ہی اندر جوش کھاکر ایسا چکر کھاتا ہے کہ آدمی کو مقدور نہین کہ اوسمین غوطہ لگاسکے یہی وہ مقام ہنود کے نزدیک ہے کہ انقلابات زمانہ سے جب بید اور پوتھیان علوم و فنون کی جو ضائع ہوگئین تھین اس مقام پر اونکی از سر نو ایجاد ہوئی اور حضرات رشیت کش پاک باطنون کی رہنمائی سے پھر علوم اور پرانی سنسکرت کی پوتھیون کا ظہور ہوگیا اوسکے قریب ایک سرچشمہ ہے کہ وہ گومتی مین ملتا ہے ایک گز چوڑا اور چار اونگل گہرا ہے جب برہمن پوجا کرتے چانول

انہون کا سامان اوسمین چھوڑتے ہین اوسکا نشان نہین ملتا اور بھی اکثر عقائد مذہبی کی وجہ سے باتین مشہور ہین نمیسارن مصرکھہ کا ہرسال مین جب کوئی پرب ہوا میلہ ہوتاہے اور معمولی میلہ ہرسال بڑی دھوم سے ہوتاہے کئی سال سے حاکم ضلع اور صاحب کمشنر کی عنایت سے خیرآباد کے مقام پر ایک میلہ ہوتاہے اس مین گھوڑے اور مویشی کثرت سے بکنے کو آتے ہین اور یہ قصبہ خیرآباد بہت قدیمی اور اکثر رئیس یہانکے نامور اور سرکاری خدمتون پر مامور ہین مکا خیاط کا امام باڑہ مشہور ہے نیشکر کی زراعت بہت اور کئی مقامون پر کھنڈسال بھی ہے بسوان مین قالین بنائے جاتے ہین اور تماکو بھی اچھا ہوتاہے اور محمود آباد کی ریاست اس ضلع مین بڑی ہے یہ چار تحصیل کے مقام ہین حضور تحصیل سیتاپور بسوان باڑی مصرکھہ ❊

## ضلع کھیم پور

لکھنؤ سے فاصلہ تخمیناً ۶۰ میل سیتاپور کے اوتر ۲۴ میل پر دارالحکومۃ ضلع ہے شمال اور غرب مین بہت بڑی حد ہے اسکی پیلی بھیت اور شاہجہان پور اور بریلی اور مشرق مین بہرایچ

اور دریاباد کا ضلع ہے تعلقدار اور راجہ پورانے پورانے ہین
زمین متوسط جنگل بکثرت اور شکاری جانور اس جنگل مین بہت
اور جانب شمالی ضلع مین بیماری ہمیشہ رہتی ہے اور گوکرن ناتھ
مہادیو کا مقام اس ضلع مین بہت متبرک گنا جاتا ہے دو میلے بھی ایک
سال مین ہوتے ہین اور معتقد صدہا کوس سے آتے ہین
حضور تحصیل لکھیم پور علی گنج محمدی یہ تین تحصیل ہین +

## چوتھا بہرایچ

لکھنؤ سے بفاصلہ ۸۰ میل اوتر کی جانب ہے اس ضلع مین
بڑا علاقہ تعلقہ داری راجہ کپورتھلہ یعنی علاقہ بونڈی و درگاپور
اور بھی بڑے بڑے تعلقدار ہین حدود شمالی اس ضلع کی نیپال سے
ملتی ہوئی ہین یہ ضلع گھاگھرا اور راپتی ندیون کی وجہ سے
بالکل سیراب جنگل کی کثرت منگرنٹ بھی بہت ہے اور پیداوار
سب قسم کی ہے لیکن دھان بکثرت پیدا ہوتا ہے سرجو
اس ضلع کے تلے بہتی ہے سید سالار مسعود غازی کی درگاہ اور
رجب سالار کا مقبرہ اسی جگہ ہے سنتے ہین کہ رجب سالار
تغلق شاہ کو بھائی تھے اور سید سالار مسعود غازی کے حال مین اختلاف
ہے صحیح قول یہ ہے کہ قوم کے سید لیکن سلطان محمود غزنوی سے

بھی قرابت رکھتے تھے اور بعض کا یہ قول ہے کہ پٹھان تھے لیکن شہید ہوئے غرض درگاہ اونکی اہل عالم کی زیارت گاہ ہے سال مین ایک بار بڑا میلا ہوتا ہے دور دور سے لوگ منیدلی کے ہمراہ آتے ہین کتنے ہی تیاج بیوپاری بھی آتے ہین اقوام ارزال لال لال نیزون کے ساتہ ہزارون ڈفالی گاتے بجاتے ساتہ لیکر اپنی اپنی بستیون سے نکلتے ہین غرض جیٹھہ کا پہلا اتوار اس میلے کا دن ہے عقائد مذہبی وجہالت سے معتقدین انواع واقسام کی حرکات سے اس میلے مین شریک ہوتے ہین صدر تحصیل بہرایچ حسام پور نان پارہ یہ تین مقام ہین +

## تیسری کمشنری فیض آباد

### پہلا گونڈہ

دار الحکومۃ ضلع کا ہے لکھنؤ سے فاصلہ ۶۰ میل فیض آباد سے ۲۴ میل شمالی ہے ۔ گھاگھرا کے کنارے کنارے یہ ضلع گورکھپور تک آباد ہے پیداوار ہر قسم روئی ونیل کی زراعت کے لائق زمین بہت ہے مہاراجہ دگبجے سنگہ صاحب بہادر بلرام پور کا تعلقہ اسی ضلع مین اور ایک حصہ تعلقداری مہاراجہ مانسنگہ صاحب بہادر قائم جنگ یعنی علاقہ تلسی پور بھی ہے ۔ جنگل افتادہ بھی ہے

بڑے بڑے تعلقہ سوائے مہاراجہ بلرام پور و مہاراجہ مانسنگہ صاحب
بہادر کے بہت کم ہین آب و ہوا اچھی و مفرح ہے - یہ مقامات
تحصیل ہین حضور تحصیل گونڈہ اوترولہ سعداللہ نگر ترب گنج

## فیض آباد

لکھنؤ سے ۵۰ میل کے فاصلہ پر ضلع کا دار الحکومتہ لب گھاگھرا واقع ہے پرانا شہر دارالامارۃ اودہ مقام بنگلہ کے نام سے ۴ کوس کے فاصلہ پر آباد ہے یہ مقام ہندؤن کے عقائد مین بڑا متبرک ہے دیس دیس کے مذہبی معتقد اس مقام پر آتے ہین کیونکہ مولد و دار الحکومتہ مہاراجہ رام چندجی کا ہے مرتاضون کی اب بھی کثرت ہے ہنومان گڑھی اسی مقام پر ہے اب سرکار سے مذہبی امور مین مراعات ہین ہر سال رام نومی یعنی چیت کی نومی کو بڑا ہی میلا ہوتا ہے مہاراجہ مانسنگہ صاحب بہادر قائم جنگ اور اونکے خاندان سے اکثر مقامات گھاٹ اور دیو استھان یادگار ہے اندنون بھی مہاراجہ صاحب کی اعانت سے اسکول اور ایک مدرسہ آموزش مذہبی فرائض کا جاری ہے جسکا مصارف ہزار روپیہ ماہواری مہاراجہ موصوف نے اپنی ہمت عالی پر لیا ہے فیض آباد کے قریب دو بڑی قبرین ہین طول اونکا سات سات

آٹھ آٹھ گز سے کم نہین عوام اونکو حضرت شیثؑ اور حضرت نوحؑ سے
منسوب کرتے ہین اور ہر پنجشنبہ کو اکثر لوگ وہان جاکر فاتحہ پڑہتے
ہین — اور بعضون کے نزدیک رتن پور مین کبیر جولاہے کی قبر
ہے یہ شخص سلطان سکندر لودی کے عہد مین تھا بنارس کے مقام
مین عقائد منود مین عبادت کرتا رہا فقرا کے نزدیک موحد صاحب
کمال تھا چنانچہ اوسکے طبعزاد اکثر دوہرے اہل مذاق سکے
ورد زبان ہین — شجاع الدولہ کے عہد کی آبادی بہت بتاتے
ہین اور اب لکھنؤ سے اوتر کر صوبہ اودہ مین شہر ہے ملک سیراب
اور ہر قسم کی پیداواری وزراعت ہوتی ہے مہاراجہ مان سنگہ
بہادر کا صدر علاقہ اس ضلع مین ہے اور یہ چار مقامات تحصیل
ہین فیض آباد اکبر پور دوست پور پرتی پور +

## سلطان پور

یہ ضلع شرقی وجنوبی حد فیض آباد سے بفاصلہ ۳۰ میل اور لکھنؤ
سے بہ فاصلۂ ۸۰ میل واقع ہے متوسط کیفیت ضلع ہے
اور اشخاص ورعایا اچھے اور بڑے تعلقدار اس ضلع کے راجہ مادہو سنگہ
صاحب بہادر گڑہ امیٹھی کی ہین زمین بہت اچھی قابلیت ہر قسم
کی گومتی اور کئی ندیان اس ضلع مین ہین اور مقامات تحصیل

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| یہ ہین | حضور تحصیل | سلطان پور | امیٹھی | انھونا موہن گنج |

## پرتاب گڑہ

یہ ضلع لکھنؤ سے بفاصلہ ۱۲ میل واقع ہے ضلع کا دار الحکومتہ بیلا گھاٹ ہے جنوب الہ آباد شرق جونپور حد ہین بلکہ صوبۂ اودہ کی شرقی حد اس ضلع کی حدون پر ختم ہے یہ ضلع سب طرح سے اچھا رعایا آباد تعلقدار شریف و خوش او بندوبست پختہ ہوتا جاتا ہے اور یہ مقامات تحصیل ہین

حضور تحصیل بیلا گھاٹ پٹی بلکہر بہار سلون +



## انتباہ

یہ کیفیت نہایت ہی مختصر ہے دوسری کتاب بر مفصل حالات ملک اودہ مین عنقریب طبع ہونے والی ہے اوس سے مشرح معلوم ہوگا — عہد شاہی مین یہ انتظام اضلاع تھا صرف سرسری طور پر نظامت کبھی چار کبھی پانچ اور اون کے نیچے سے چکلہ دار ہوتے رہے اور مالگذاری کا انتظام تو کبھی تھا اب سرکاری عملداری مین ہر جگہ آبادی و زراعت کی کثرت اور فضل الٰہی سے توالد و تناسل حضرت بنی آدم کی بھی افزایش اللھم زد فزد یوماً فیوماً مزید +

# نواب سعادت خان برہان الملک

صوبہ داران اودہ کی ریاست کا موسس اعلی یہہ نواب ہوا کہتے ہین کہ اصلی نام اس
نواب کا میر محمد امین عرف میان نصیر نیشاپوری زمانہ دولت بہادر شاہ ۱۱۲۰ھ ۱۷۰۸ع شاہجہان آباد
مین آیا اور عہد دولت محمد شاہ ۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ع مین جبکہ دہلی مین ہنگامہ بادشاہی ہوا تہا
تو اوسوقت مین اتفاقات و انقلابات مدت سے مقرب درگاہ بادشاہ ہوگیا بلکہ
خدمتین پسندیدہ اس سے ایسی وقوع مین آئین کہ مترصد عہدہ وزارت کا تہا
چنانچہ اوسوقت مین عملداری اودہ مین ہر مقام پر بے انتظامیان ہو رہین تہین
واسطے انتظام صوبہ اودہ کے مامور ہوکر آئے اور عہدہ سابق بہی بدستور بحال
رہا اس صوبے مین اوسوقت پشتہا پشت سے خاندان شیخ نواب عبدالرحیم خان
جو عہد اکبری مین صوبہ دار تہے زمیدارانہ اس صوبے پر قابض و متصرف تہے
بلکہ اس صوبے کی آمدنی بالکل خورد و برد تہی اور زمانہ کا رنگ دیکہکر در پردہ
سرکش ہو رہے تہے جبکہ نواب برہان الملک اس صوبے مین پہونچا تو لکہنو
مین اگر شہر اور بوجہ سد راہ ہونے شیخ زادون کے کنارہ شہر مین بہی دخل
نہو سکا اور کئی مہینے تک لکہنو کے اکبری دروازے کی جنوبی جانب
خیمہ زن رہا اور کوئی تدبیر موافق حال نہوئی تو عیاری کو کام مین لایا شیخزادون سے
رابطہ اتحاد بڑہایا کہ خیال عداوت یکقلم مخالفون کے دل سے مٹایا بعد چندے

سعادت خان برہان الملک



ایک جشن مین شہزادونکی دعوت کا اذن عام دیا چنانچہ وہ جمعیت کثرت سے ساٹہ ہزار آدمیون کے ساتھ مہمان ہوے یہ موقع اور قابو پاکر کمین گاہ سے معہ افواج سوارون کے حملہ آور ہوا اور ساری جماعت کو مع اونکے سردارون کے اوسی جگہہ ٹھکانے لگایا اور پھر سارے صوبے مین قابض ہوکر انتظام مہمات مین نام آور ہوا - ایک وابت ہے کہ شیخون نے داب حکومت اور سیاست دکھلانیکے واسطے محلہ مین دروازے پر شمشیر برہنہ لگادی تھی کہ جب بادشاہ کا صوبہ دار یا حاکم صوبہ داری اودہ پر مختار و مامور ہوکر آتا تھا تو اپنی دلیری اور شجاعت سے اوسکو تنگ کرتے تھے اور اوس سے اوس تلوار کا سلام لیا کرتے تھے *

* جب برہان الملک کا قبضہ اور تصرف شہر مین کما حقہ ہوا فوراً اوس تلوار کو پھکوا دیا اور بعد اوسکے بے کھٹکے اس صوبے پر مسلط رہا اوس زمانے مین پچاس لاکہ روپیہ محاصل صوبہ تھا اور عہد برہان الملک مین صوبے کی یہہ حدین تھین - دکھن گنگا - شمال دریاے رپتی و ترائی نیپال - شرقی محو عظیم اباد - مغربی شاہ اباد محتہ فرخ اباد سنہ ۱۱۵۱ ہجری مین شاہ جہان اباد دہلی مین بعد ہنگامہ نادر شاہ وفات پائی اور شاہجہان آباد مین

* یہ محلہ میہ مکان لکھنؤ مین شیخزادونکی حکومتگاہ تھی شاید مچھی بھون کے متصل واقع تھا اب نہ نام ہے نہ نشان ——

مین دفن اور راجہ جی سنگہ اسکے زمانے مین کارپرداز تھا **قطعہ تاریخ**

ہوئی جسدم کتاب امجد عمر ادیب مرگ کی ہاتھون سی ابتر دی تاریخ کی جو فکر شایان

ہوا سال اسم ہی سے اوسکی اظہر قلم نے ڈال ملفوظی کے عدد کہی اسم سعادت خان سے باہر

## مرزا محمد مقیم ملقب بلقب نواب صفدر جنگ

باپ اس نواب کا نواب جعفر علی خان داماد وہمشیر زادہ نواب برہان الملک کا تھا نواب برہان الملک کی صوبہ داری نسبت اور صوبہ دارون کے اودہ مین زیادہ استحکام سے رہی اسواسطے اونکے خاندان مین اس صوبے نے زیادہ تر قیام پکڑا اور اپنا نقشہ جما لیا بعد انتقال برہان الملک کے سنہ ۱۱۵۱ ہجری مین نواب صفدر جنگ قائم مقام برہان الملک کے حضور بہادر شاہ شاہنشاہ جہان آباد سے ہوا اور وزارت کا منصب بہی حاصل کیا یہ نواب بڑا ہی دلیر اور صاحب تدبیر تھا اور مقرب بادشاہ دہلی رہا جب احمد خان ابدالی کی شورش ہندوستان مین ہوئی اور مثل نادر شاہ کے ہندوستان مین آکر ایک تہلکہ ڈال دیا تھا ہمراہ لشکر شاہی برفاقت شاہزادہ احمد صفدر جنگ نے وہ داد شجاعت دی کہ اور بہی مقرب درگاہ ہوا اور بعد فتح پانیکے شاہزادہ موصوف معہ صفدر جنگ دہلی کی جانب روانہ ہوا کہ رستے مین خبر وفات محمد شاہ کی معلوم ہوئی یہ خبر افسانہ ہوئی تھی کہ صفدر جنگ نے چتر شاہی احمد شاہ کے سر پر پھرایا مع

نواب منصور علیخان صفدر جنگ



مع ارکین درگاہ جو ہمرکاب شاہزادہ تہے سبہون نے زرین تخت و تاج کی دین
کہ اس جلدو مین عہدۂ وزارت حاصل ہوا لیکن اکثر امرا و ارکین سلطنت کہ جو
پشتہا پشت بسے مقرب درگاہ تہے اس خدمت وزارت صفدر جنگ سے
ناخوش ہوے اور درپی استیصال صفدر جنگ تہے لیکن صفدر جنگ کا
عروج تہا کسی دشمن کی پیش نگئی بلکہ ۱۱۶۱ ہجری مین کمال اولوالعزمی سے
مخالفان دیہا یونکو فریب سے قتل کرا اپنا قبضہ اور دخل کرلیا راجہ نول راے کو
اپنا نائب مقرر کرکے اس جگہہ پر چہوڑکر خود صفدر جنگ روانہ شاہجہان اباد
ہوا چند روز کے بعد پٹہانون نے یورش کی اور راجہ نولراے اوسی
ہنگامے مین کام آئے اور یورش کی خبر پاتے ہی صفدر جنگ نے
باعانت سورج مل جاٹ راجہ بہرتور و مرہٹہ وغیرہ کی جمعیت کثیر کے ساتہہ
پہر مقابلہ پٹہانون کا کیا پٹہانون کے افسر احمد خان و رستم خان برادر
قائم جنگ کے تہے اس ہنگامے مین لاکہون آدمی کا کشت و خون ہوا
اور رستم خان ماراگیا اور صفدر جنگ سلہٹ کو جاکر شاہجہان اباد کو پہر گیا
اور بقیہ فوج سنگل نے جانبر ہوکر روانہ الہ اباد ہوئی پہر اودہ اور فرخ اباد ان
دونون صوبون مین روہیلہ گردی سے روز حشر نمودار تہا سارا ملک تاراج
ہوگیا شہر بنارس بچ گیا وہان کے مہاجنون نے شہر کی حفاظت
اور بچانے کے واسطے دو کرور روپیہ پیشکش کیا کہ روہیلون کی بدانتظامی اور

طمع نفس سے لکھنؤ کا انتظام جاتا رہا اور شیخ معز الدین نے اپنے قبضے اور تصرف مین کر لیا ساکنان لکھنؤ اور نواح اوسکے نے آکر پٹھانون کو تہ تیغ کیا اور علاقجات پر بخوبی مسلط ہو گئے اور صفدر جنگ کو اطلاع دی کہ یہہ وقت ہے کہ روہیلون سے عوض لیجے چنانچہ صفدر جنگ نے باجود بہادو دہار اونکہ جمعیت کثیر اسی ہزار ٹھاٹھ مین تھی اونکی معیت سے احمد خان وغیرہ روہیلون فرخ اباد کے پاس ہار گیا اور کر خوب ہی خبر لی اور مرہٹون نے کہ معاون صفدر جنگ تہے اور واسطے صلح کرا دینے احمد خان روہیلے کے صفدر جنگ سے دونون طرف سے دو کرور روپیے نقد پائے اور زر ملک کو لوٹ گئے اور الہ اباد اور اودہ کے صوبے کا انتظام و تسلط خاطر خواہ کر کے صفدر جنگ شہر شاہجہان اباد کو لوٹ گیا بسکہ ارکین سلطنت و امراے حضوری بادشاہ نے صفدر جنگ کی طرف سے بادشاہ کو آشفتہ کر رکہا تہا صفدر جنگ تنگ ہو کر اپنے ملک مقبوضہ مین چلا آیا اور ۵ برس تک اس صوبہ اودہ مقام فیض اباد دار الحکومت کی سیر کی سنہ ۱۱۶۷ھ مین وفات پائی اور فیض اباد مین لاش اوسکی سپرد زمین ہوئی اور وہان سے شاہجہان اباد مین قریب درگاہ شاہ مردان کربلا کے دفن کی گئی اور استخوان اونکی کربلا بہجوا لی گئی تاریخ نور الہی تاریخ وفات منصور علیخان آہ اے مدت ریاست بیس برس **تنبیہ** صفدر جنگ کے زمانے مین سلطنت اسلام ہند کا زور ہر روز گہٹتا گیا ہر ایک صوبہ دار بجاے خود حاکم و نواب ہو بیٹھا مرہٹون اور جاٹون اور سکہون نے جا بجا شورشین کین تمام ہندوستان پامال بد انتظامی ہو گیا اور ہندیون کا ... خون ہوا

# بیان جنگ میر قاسم خان ناظم بنگالہ با انگریزان

نواب شجاع الدولہ بہادر کو جو سرکوبی سرکشان بندیل کھنڈ و تلنگون سے لگی ہوئی
تہی اس مرتبہ باحسن الوجوہ عمل مین آئی یعنی وہ سرکوب ہوئے نیچے اسوقت ناگاہ
میر قاسم خان ناظم بنگالہ نے کہ انگریز کے ہاتہون سے شکست پائی تہی اونے
نواب شجاع الدولہ بہادر کو اپنا مددگار اسطرح سے بنالیا کہ اگر آپ میری دستگیری
کرین لاکہہ روپیہ کوچ اور پچاس ہزار مقام دونگا اور بعد فتح کے یہہ مستدعی ہون
تہا کہ صوبہ عظیم اباد کہ ۹۰ لاکہہ کی جگہہ ہے مع ایک کرور روپیہ نقد تواضع مین شجاع الدولہ
بہادر تمہارے فرزند کو بخشی دونگا نواب صاحب بہی اس معاملے پر راضی ہوکر مستعد
و شریک حال ہوے حاصل مدعا تو درکنار تمامی سرمایہ و جواہرات نقد و جنس کروڑہا
روپیہ کے نواب صاحب کے تصرف مین آئی اور میر محمد قاسم خان اونکی ہاتہون
سے یہانتک تنگ ہوے کہ حصول مدعا و مال و متاع سے دست بردار ہو
اور بواسطہ فتح علیخان اپنی گلو خلاصی کر کے پریشان روزگار روہیلے کے ملک
مین چلے گئے نواب شجاع الدولہ نے اوسوقت چاہا کہ ملک بنگالہ اپنے قبضہ
تصرف مین آجاوے فوج بہی کثیر ہمرکاب تہی شجاعت نے ہاتہہ پاون لگائے
انگریزون نے بصلاح وقت نواب ممدوح سے پیغام صلح کا دیا کہ غالباً بنیاد
اوپر کشش و فساد کا تہا درمیان سے گیا تمہارے اور ہمارے درمیان خلوص اخوت

کوئی امر کہ مبنی فساد یا عناد کا ہو نہین ہے اسصورت مین مناسب ہے کہ سلسلہ
باہم اتحاد و محبت کا جاری رہے قول و اقرار کی پاسداری رہے دوست و
دشمن جانبین کے طرفین مین دوست و دشمن سمجھے جائین اور صوبہ عظیم آباد
کا جو عالیجاہ نے نامزد صاحبزادہ عالی مرتبت کے کیا ہے اوس سے
ہمکو بھی کسیطرح دریغ و انکار نہین ہے چنانچہ راجہ بینی کہ اسوقت مین کارپرداز و مدار المہام
اس سرکار کا تھا بنظر خیرخواہی طرح مصالحہ و رفع فساد کی ڈالی لیکن نواب سالار جنگ
و مرزا علیخان و میر نعیم خان و غیرہ کہ ہواخواہ نواب شجاع الدولہ بہادر کے تھے
برہم زن اس معاملہ اور مصالحہ کے ہوے نوبت توپ و تفنگ کی آئی اور شعلہ
آتش جدال و قتال آسمان سے گذرا منظور خدا شکست تھی نوابصاحب نے
عین معرکے مین یہ چاہا کہ ہاتھی سے اوتر کے گھوڑے پر سوار ہون ہاتھی کو
فیلبان نے بٹھلا دیا فوج کو بلا تامل یہہ ذہن نشین ہوا کہ نواب ممدوح نے
زخم کاری کھایا قدم میدان سے ہٹایا اور راجہ بینی بہادر دل شکستہ نے بہ پہلے تو
دس بارہ ہزار فوج ہمراہی اپنی سے خوب میدان کارزار گرم کیا مگر اوسوقت
یہہ خیال مین آیا کہ شجاعت یہانتک دکہانا چاہیے کہ وہ اوسوقت خاص مین
کیا کار نمایان کرتے ہین اور شجاعت دکہاتے ہین جنگ سے کنارہ کش
ہوا کہ فوج افغان و غیرہ نے عین وقت پر دغا دے آپ کو بے سردا سمجھکر
بہاگ گے اور اپنے ولی نعمت کا خزانہ بیوارث جانکر خوب لوٹا ع مال حرام بود بجای

حرام رفت داخر کار شکست فاش نصیب نواب ہوئی شجاعت اور تدبیر سب خراب
ہوئی پانچ سوار ہمعنان ستھے کہ روانہ ملک روہیلہ ہوئے اور انگریز مظفر و منصور
لکھنو مین آئے تاریخ اس معاملہ کی مرزا رفیع متخلص بہ سودا نے کیا خوب کہی ہے
کل مغل پوپن ۱۱۷۷ القصہ نواب شجاع الدولہ بہادر ملک روہیلہ مین جو آئے
بسوائے حافظ رحمت خان کے کسیکو غمخوار نہ پایا وہان سے بمشورہ خان مذکور
فرخ آباد مین آئے احمد خان بڑے اعزاز و اکرام سے پیش آیا استقبال کیا
اپنے گہر مین لایا تواضع اور مدارات موافق مزاج اور لائق مرتبہ ظہور مین آئی
اور بصلاح عماد الملک بہادر پینتالیس ہزار مرہٹہ واسطے کمک اور امداد نواب
موصوف حسب الطلب آیا تہا چالیس ہزار کوچ اور بیس ہزار بمقام روپیہ مقرر
تہا المختصر پہر کوڑہ جہان آباد مین انگریزون سے نوبت صف آرائی کی
آئی بعد کشت و خون بسیار انجام کار وہی دن پیش آیا وہ زبردست رہے
یہہ زیر بار شکست ہوئے ناچار نواب ممدوح بصلاح وقت دو انگریزون کو
کہ پہلی لڑائی مین ہاتہہ آگئے تہے اونکو قید سے آزاد کر کے بہت سے گہوڑے
ہاتہی اور جواہر گران بہا اور اشرفیان نقد دیکر احسانمند کیا اور بدرخواست
مصالحہ طرف لشکر مقابل کے روانہ کیا اور آپ بہی چند سوار سمیت جانب
لشکر انگریزی قدم زن ہوئے اونہون نے جو خبر پائی کہ نواب صاحب آپ
لشکر مین آتے ہین باستقبال پیش آئے اور بڑے اعزاز و اکرام سے

اپنے مقام پر لائے بصورت مصالحے کی قرار پائی کہ ایک روپے مین
چھ آنے حاصلات ملک سے داخل خزانہ انگریزی ہوا کرین اور ملک پر اپنے
نوابصاحب بہادر بدستور قابض اور متصرف رہین القصہ نوابصاحب بہادر
راضی وخوشی کشتیان جواہرات وغیرہ بطریق تواضع سرکار انگریزی سے لیکر
داخل لشکر ہوے اپنے قلمرو پر بدستور اختیار حاصل ہوا یہ معاملہ سنہ ۱۱۷۹ ہجری
مین گذرا لیکن اس معرکے مین بہت مال نقد وجنس عماد الملک بہادر کا تلف
اور ضائع ہوا تھا اوسکی عوض مین نواب صاحب بہادر نے گیارہ لاکھ کا
ملک اپنی قلمرو سے جدا کر کے سند اوسکی عماد الملک بہادر کو ارسال کی تھی
اونکی ہمت نے قبول نکیا پھیر دی اور نخوشی خاطر روانہ شاہجہان آباد کو
ہوئے نوابصاحب بہادر باغواے بعض مشیران ناعاقبت اندیش راجہ
بینی بہادر کی طرف سے دل مین ملال رکھنے لگے اور استیصال اوسکا
منظور نظر تھا چنانچہ بعد چندے لکھنؤ مین تشریف لاے اور بہانے سے
اوسکو اپنے ہمراہ لیا اور بصلاح ایلچ خان کارپرداز کہ اوس ریاست مین نہایت
ذی مرتبہ وصاحب اقتدار تھا بلکہ لکھنؤ مین آج تک ایلچ خان کا میدان ومسجد
مشہور ہے سنہ ۱۱۸۱ ہجری مین سلائی اوسکی آنکھون مین پھیری گئی تاریخ ضیاے
چشم واے اور اوسی سن مین شادی آصف الدولہ بہادر یحیی خان عرف مرزا امانی
کی ساتھ شمس النسا بیگم دختر خانخانان خلف قمر الدین خان وزیر محمد شاہ کے

نواب شجاع الدولہ بہادر



ہوئی جو بیس لاکھ روپیہ اس شادی میں صرف ہوا تھا۔

## نواب شجاع الدولہ بہادر

مخاطب جلال الدین محمد شجاع الدولہ بہادر ابو المنصور خان اسد جنگ فدوی احمد شاہ بادشاہ ۱۱۶۷ ہجری میں ۲۶ برس کی عمر میں مسند نشین صوبہ اودہ مقام فیض آباد میں ہوسے مادۂ تاریخ مسند نشینی — رونق مسند ماہ وزارت اسی نواب کے زمانے میں انگریزونکی قدرت واقتدار نے ترقی پائی جوانی عمر ونشہ حکومت کے تقاضے سے ابتدا میں عیاشی وتن پروری میں مشغول تھا اور اسی سبب سے بعض عمائد وارکین کی یہہ مشورت ٹھہری کہ اس نواب کو حکومت سے خارج کرکے نواب محمد قلیخان برادرزادہ صفدر جنگ کو کہ الہ آباد میں مقیم تھا بلاکر مسند حکومت پر نصب کرین نواب بہو بیگم صاحبہ نے کہ اونکا اقتدار بہت تھا اس ارادہ بیجا سے اراکین ریاست کو باز رکہا اور اوسوقت سے نواب شجاع الدولہ نے آئین ریاست داری کو کار فرمایا اور پردہ غفلت کا گوش ہوش سے اوٹھایا اور اسی زمانے میں سلطنت دہلی میں فتور پر فتور برپا ہوتے جاتے تھے ملازمان درگاہ اور اراکین سلطنت نے نالائقی سے سلطنت کو ایک کھیل بنا رکہا تھا جسکا ذرا بھی قابو ہوا بادشاہ کو نچاے پھرے چنانچہ عماد الملک ودیگر وزراے سلطنت وغیرہ نے شاہزادہ علی گوہر شاہ عالم کو عداوت سے

خارج کرنا چاہا اور اس سبب سے شاہزادہ مذکور الہ آباد مین مقیم تہے کہ اس
عرصے مین احمد شاہ درانی بادشاہ دہلی کی امداد کے لیے مرہٹہ بہاؤ راؤ وغیرہ
کے مقابلے کیواسطے پہر ہندوستان مین پہونچا واضح ہو کہ ان مرہٹون نے
بجمعیت کثیر و جم غفیر قریب بیس پچیس لاکہہ کے دہلی کو گہیر لیا تہا اور مرکوز
خاطر تہا کہ دہلی کو فتح کر کے تخت و تاراج کرین کہ احمد شاہ درانی بارادہ کمک
اور امداد شاہ دہلی کے آیا اور حسب ایماے احمد شاہ درانی و بپاس ناموس
اسلام کے شجاع الدولہ و دیگر صوبہ داران شاہی احمد شاہ کے
لشکر مین پہونچے اور باتفاق یکدیگر ان سب نے خوب ہی مرہٹون کا
پانی پت کے مقام پر مقابلہ کیا آخر مرہٹون کی گہس پیٹہ سے کچہ نہو سکا اور جم غفیر
نے راہ فرار لی* اس فتح نمایان سے احمد شاہ درانی و شجاع الدولہ بہادر کی خدمت انجام پسندیدہ
ہوئی بلکہ سلطنت کو کچہ استحکام ہو گیا - بعد اس ہنگامے کے بادشاہ سے
رخصت ہو کر نواب مذکور اپنی دار الریاست صوبہ اودہ مین لوٹ آیا اور رعیت
سے داد گستری و معدلت پروری مین ہمعصران مین مشہور تہا یہ نواب نہایت نیکوکار و
اور دلیر اور شجاعت مین اسم بامسمی تہا رفاہ خلائق مین حتی الوسع کوشش کرتا
اور اس نواب کے عہد مین صوبہ اودہ بالکل خرخشے مخالفون سے پاک
ہو گیا اور ریاست کا استقلال سمجہی گئی اوس زمانے مین اقبال نواب سے

* مرہٹون کی لڑائی اور ہنگامہ کشتی کی کیفیت دیگر سوانح مین مفصل تحریر ہے

اس صوبے کی حد زیادہ بڑھ گئی غرب اٹاوہ و شرق مین مرزاپور اور
الہ آباد کا صوبہ بھی شامل صوبۂ اودھ ہو گیا اس نواب کے عہد ریاست مین
چند لڑائیان و فتوحات تازہ بروی کار آئی جس سے ریاست مین روز بروز
زوال و تنزل ہوتا گیا اور یہی سبب ہوا کہ ریاست جدید تھی جسقدر
محفوظ رہی غنیمت سمجھتے رہے لیکن اسمین شک نہین کہ یہ نواب دلیر و باہمت
اور اوس زمانے کا مدبر سمجھا گیا تھا

## ریاستہای بندیل کھنڈ کی شورشین

اس صوبے کی چھوٹی چھوٹی ریاستین تھین زمانہ کا رنگ دیکھکر ہر ایک
رئیس خودسر ہو گیا سارے صوبے مین غدر ہو گیا اور بعضے بعضے رئیسو نے
خود لشکر نواب شجاع الدولہ سے ہنگامہ کارزار گرم ہوا کہین فتح اور کہین
شکست ہوئی لیکن انتظام قرار واقعی نہو سکا اس لیے راجہ ہمت بہادر گوشائین
کو مع سرداران دیگر اصلاح بغاوت بندیل کھنڈ کے واسطے معین کیا بعد کشت
و خون بسیار نواب کی فوج کو ہزیمت ہوئی اور بہت سے سردار کام مین
آئے اور ہمت بہادر شکست کھا کر اودھ مین لوٹ آیا یہ معرکہ ۱۱۸۶ہجری
مین ہوا اور اس سے کسی قدر اقتدار نواب کا کم ہوتا گیا۔

+ یہ شخص مشہور رئیسون اور ارکان شاہی سے تھا۔

# وقائع احمد خان بنگش فرخ آبادی و نواب شجاع الدولہ

یہ احمد خان وہی روہیلہ ہے جسنے نائب نوالرائے صفدر جنگ کو تیغ
کرکے فرخ آباد مین اپنا عمل و تصرف کر لیا تہا جسکے استیصال کے واسطے
نواب صفدر جنگ نے بمعیت مرہٹون کے بہت سی کوششون کے
بعد کامیابی حاصل کی لیکن برای نام اطاعت قبول کرکے جھگڑا طے ہوا تہا
مگر درحقیقت وہ اپنی ریاست پر قابض تہا۔ زمانہ صفدر جنگ سے تاعہد
شجاع الدولہ رسم و راہ و اتحاد و اخلاص فیمابین سرکارین رہا جبکہ
نواب شجاع الدولہ سے بعضے بعضے سردار اوسکے سرکش ہوگئے تو ایک سردار
مسمّی امراوگر گوشائین نواب سے منحرف ہوا احمد خان بنگش نے اوسی
سردار کو اپنے پاس جگہہ دی یہ بات نواب شجاع الدولہ بہادر کو ناگوار
گذری اونہونے امراوگر کے نکال دینے کو لکھا اوسنے درجواب اسکے
لکہا کہ وہ طلبیدہ نہین آیا اوسکا دینا خلاف مروت و مردت کے ہے
نواب شجاع الدولہ نے لشکرکشی کی اور قنوج مین فوج کا جماو ہوتا گیا اور قریب بقصبہ
کی سپاہ اور دوستون کی جمعیت سے دونون طرف کی جمعیت لاتعد تہی نجابہ
تہے کہ آتش ہنگامہ مشتعل ہوکر نواب نجیب الدولہ* بہادر شجاع الدولہ کے

* یہ شخص وزیر شاہ دہلی تہا۔

لشکر کا ممد و معاون ہوا اور اُس عزیمت جنگ اور حالت بیجا کو اسطرح فرو کر دیا کہ امراو گو فرخ اباد سے آگے بجوا دیا اور جو جو سردار افاغنہ رامپور وغیرہ سے واسطے کمک احمد خان بنگش کی آئی تہی اونکو اپنی اپنی ریاست پر رخصت کرا دیا اور لشکر نواب شجاع الدولہ خیریت سے اپنی دار الریاست اودہ کو پہر آیا ۔ ع رسیدہ بود بلائی ولی بخیر گذشت ایسے ایسے بہت سے ہنگامہ ہوے اور کئی مرتبہ انگریزون سے بہی شکست پائی آخر کو حسب قرارداد حصہ آنے انگریزون کو دیتے تہے اور باقی نوابصاحب کا حصہ تہا اور روہیلون سے بہی ہمیشہ تا خین حیات نوابصاحب کی نوک جہوک ہوتی رہی اور اکثر لڑائیون مین انگریزی سپاہ نے مدد دی چنانچہ حافظ رحمت خان کی لڑائی مشہور ہے ۱۱۸۸ہجری مین انگریزون کی مدد سے فتح پائی اور حافظ رحمت خان کا سر کاٹا گیا اوسی سال مین غازی الدین حیدر تولد ہوے ۔

اس نواب کے عہد حکومت مین سپاہ کا انتظام اچہا نہ تہا اور سردار بہی بعض بعض بیدل ہو گئے مگر ماتحت شاہ دہلی کے سارے صوبو مین مشہور تہا اور ہر ایک ارکین اور سردارون خود سرے میں ملاپ بہی تہا یوم مسند نشینی سے ایسے جہگڑے اور خرخشے رہے کہ ایکدن بہی آسایش نپائی انگریزون کے مددگار ہونے سے اودہ کی ریاست کمزور ہوتا گیا

بلکہ موروثی اور خود اختیاری ہوگئی اور دشمنان اندرونی و بیرونی سے
نجات پائی سپاہ مین اکثر سپہ سالار خواجہ سرا ہوسے کہان شجاعت کلاوند
اور کہان ،فسری خواجہ سرا ذلگی اور اوسی عہد سے عیاشی کی کثرت
اس ریاست اور ارکان مین ہوگئی اخر زمانہ شجاع الدولہ مین اتہار
ہزار سوار یافسری شیخ احسانعلی خان بہیج و خواجہ اسد خان انجسی و یوسفخان
قندہاری آبرل کا اپنی اس صوبے کی جب کسی وقت مین فرخ اباد بہی صوبہ
صوبہ اودہ کے شریک تہا دو کروڑ ستر لاکہہ کی تہی جسمین تراسی لاکہہ روپیہ
بابت جہ آمدنی کے سرکار انگریزی مین جاتا تہا - نواب شجاع الدولہ کے
عہد ریاست تک بیچ محلے کا کرایہ شیخون کو دیا جاتا تہا شاید دو سو روپیہ ماہوار
تہا ۲۴ ذیقعدہ ۱۱۸۸ ہجری مین وفات پائی مدت ریاست ۱۹ سال راجہ
بینی بہادر کار پرداز تہا اور بعدہ یحیی خان —

## مدت ریاست نواب آصف الدولہ بہادر

۲۴ ذیقعدہ ۱۱۸۸ ہجری مین نواب آصف الدولہ فرزند شجاع الدولہ بہادر ہزبر جنگ
مقام فیض آباد مین ۲۷ برس کی عمر مین مسند نشین صوبہ اودہ ہوا قطعہ تاریخ جلوس ہے
گشت از پای آصف الدولہ رونق مسند وزارت ہند - انہی نواب کے عہد
حکومت مین دار الحکومت لکہنو قرار دیا گیا فیاضی اس نواب کی مشہور و

نواب آصف الدولہ بہادر



ومعروف ہے جسکو دے مولی اوسکو دے آصف الدولہ اتبک لوگونکی
زبان پر جاری ہے نواب آصف الدولہ نے حکومت اطمینان کے ساتھہ کی
اور کوئی مخالف اونکا زبردست خلل انداز ریاست نہ تہا لکھنؤ کی آبادی اور فیاضی
وسخاوت زبان زد خلایق ہے عزل و نصب نایبون کا انگریزی کا اقتدار ہونا
بنارس وغیرہ کا ملک صاحبان انگریز کے قبض و تصرف مین آیا - امام باڑہ
رومی دروازہ کی بنا سنہ ۱۱۹۹ ہجری مین دریای گومتی کا پل باندہنا سنہ ۱۲۰۱ھ
مین مرزا وزیر علیخان کی شادی کا ہونا یہ شادی اوس زمانے مین ایسی کی
کہ شاید ہندوستان مین کسی نے نہین کی ہوگی تفصیل اس اجمال کی یہہ ہے
کہ اگرچہ قبل از دار الحکومت ہونیکے لکھنؤ ایک وسط قصبہ تہا لیکن
نواب آصف الدولہ کے عہد حکومت مین ازبس فیاضی و فیض رسانی کا آوازہ
بلند ہوا ہر ملک کے سوداگر عالم فاضل پیشہ ور امیدوار اس شہر مین
کثرت سے آنے جانے لگے جو کہ وہ زمانہ غدر تنزل وانقلاب خاندان
تیموریہ کا تہا روزگار و معاش کی قلت سے ہندوستان مین سراسیمگی چہا گئی
تہی اور ادہر دکہن مین چڑہائی ہنگامہ مرہٹون اور ٹیپو سلطان کا تہا
راجستان مین ہلکر اور نواب ٹونک نے زلزلہ ڈال رکہا تہا پنجاب مین
سکہونکی شورشون سے تعصب مذہبی کا جوش تہا اس گھڑی اودہ مین
کچہ عافیت اور امن تہی ادہر نواب آصف الدولہ کی فیاضی او فیض رسانی

اور شہر کی آبادی اسقدر چڑہی کہ اتنا بڑا شہر ابتک سب ہے کہ ہندوستان مین نظیر
نہین رکہتا ۔ رومی دروازہ و امام باڑہ آصف الدولہ کا بنایا لائق دیکہنے اور تعریف
کے ہی جسکا ذکر خود تذکرہ تعمیرات پر آئیگا ۔ پل ابتک یادگار ہے آصف الدولہ
کے زمانے مین سردار ہمت بہادر گوشائین کے حوالے میان دوآبہ کا ملک تہا
اسکی رانی ابتک بندرابن ضلع متہرا مین موجود ہے ۔ اگرچہ آصف الدولہ کی
مسند نشینی کے ذریعے سے مختار الدولہ نائب تہا اور اس وجہ سے نہ خود نواب صاحب
کی نہ اور دیگر ارکان سلطنت کی وقعت اوسکے فراج مین تہی آخر الامر ارکان سلطنت
باہم سازش کر کے سعادت علیخان کو مسند وزارت پر بٹہانا چاہتے تہے خصوص
بسنت علیخان کا دلی ارادہ یہی تہا کہ سعادت علیخان مسند وزارت پر بیٹہے
لیکن مختار الدولہ کے غرور و تکبر سے ہر ایک سردار ناراض تہا اور بسنت علیخان
کو بدل اوس سے ناراض تہا آخر الامر قابو پا کر بسنت علیخان نے جبکہ لشکر
نواب آصف الدولہ کا اٹاوہ مین تہا مختار الدولہ کا کام تمام کیا اور ارادہ تہا کہ
اوسی دن نواب آصف الدولہ بہادر کا بہی کام تمام کرے لیکن اتفاقاً ہواخواہون کے
خبر دینے سے بچ گئے ۔ نواب آصف الدولہ کہ اوس سے بدگمان تہا اوسکے
قتل کا حکم دیا راجہ نواز سنگہ نے فوراً ہاتہہ صاف کیا اس مقام پر جہان بسنت
خواجہ سرا قتل کیا گیا سعادت علیخان بہی تہا اسلیے اوسسے بہی نواب آصف الدولہ بدگمان ہوے
اس وجہ سے سعادت علیخان عہد نواب ممدوح مین کبہی بنارس اور کبہی آگرہ

اور کبھی کلکتے مین رہتے اور اسی فکر مین رہتے تھے کہ موقع پاکر خود ہی وارث ریاست
ہو بیٹھیے لیکن نواب آصف الدولہ کی زندگی تک کوئی تدبیر مفید نہین ہوئی —
بعد انقلابات زمانہ ایلچخان جبکہ آگرے سے سعادت علیخان کے ساتھ آیا ہوا لکھنؤ مین
پہونچا خلعت نیابت ملا لیکن زندگی نے وفا نکی سات دنکے بعد مر گیا پھر نیابت
کا مشورہ رہا ابو طالبخان لندنی اسمعیل بیگ خان اور مرزا جعفر یہ تین آدمی تجویز
ہوئے تھے لیکن تقدیر کی خوبی حیدر بیگ خان کہ نہایت افلاس زدہ تھا
متوقع نوکری سو پچاس روپے کا رزیڈنٹ صاحب بہادر کی خدمت مین
جایا کرتا تھا اونکی عنایت سے خلعت نائب حاصل ہوا اور خطاب اوسکا
نواب امیر الدولہ بہادر ہوا دیوانی کی خدمت راجہ ٹکیت رای کو مفوض ہوئی
اس شخص کا اقتدار اور نام ابتک مشہور ہے تالاب ٹکیت رای پر اب بھی
ہر سال میلہ ہوتا ہے اور جنرل مارٹین صاحب فرانسیس صاحب عمارت عجیبہ اور
رفیعہ رفیق میجر سلر صاحب کی تھی ایک نیکنامی انکی مشہور ہے عہد آصفی
مین انکا بھی مسکن لکھنؤ مین تھا امیر الدولہ سے بہت موافق تھے عہد و پیمان
معاملہ دوستی و اتحاد نے فیمابین مین استحکام پایا تھا اوسی وجہ سے عزل
و نصب بتر زیڈنٹ کا حسب استدعای امیر الدولہ ظہور مین آتا تھا اون دنون مین
امیر الدولہ کا اقتدار شہرت و کار گذاری چمکی ہوئی تھی اگرچہ راجہ ٹکیت رای دانشمند تھے
لیکن ایک معاملہ خفیف مین دشمنون سے مل گئے اسی وجہ سے طبیعت نواب کی

بہادر کی راجہ ٹکیت راے سے پہر گئی نظروان سے بہی گر گئے خزانہ راجہ مہراج
کو سپرد ہوا اب نواب صاحب ممدوح نے پیش خود یہ تجویز فرمائی کہ راجہ جہاؤلال
کو بجاے امیرالدولہ نائب سرفرازالدولہ کا کیا جاے ہیے لیکن بمقتضای عاقبت اندیشی
مصلحتاً سرفرازالدولہ کو اسبات پر رکہا کہ آپ نیابت راجہ جہاؤلال کہ آدمی چالاک
ہیے قبول نہ فرمائین انجام کو یہہ راجہ کچہہ ہاتہ پاؤن نکالیگا المختصر سرفرازالدولہ
کو یہہ مشورہ پسند آیا بے نائب کے کام کرنا گوارا نتہا رفتہ رفتہ بواسطہ صاحب
رزیڈنٹ کے پہر خلعت دیوانیکا راجہ ٹکیت راے کو سرکار عالی سے دلوایا
چونکہ یہہ امر خلاف طبیعت نواب ممدوح کے تہا بعد ایک مہینے کے پہر معطل
کردیا نواب ممدوح کے دل مین راجہ جہاؤلال کی کمال جگہہ تہی سنہ ۱۲۱۱ ہجری
مین لوگون نے وہ تدبیر نکالی کہ راجہ جہاؤلال کو کسی طرح یہان سے
نکالا جاے ہیے کہ انکا اخراج و عزل باعث ممنونی راجہ ٹکیت راے ہوگا یہانتک
عرق ریزیان اسبات مین کین کہ نواب گورنر جنرل بہادر لکہنؤ مین تشریف لائے
اور جہاؤلال کو آپ سے جدا کرکے عظیم آباد مین بہیجا لیکن اس امر کے ظہور سے
مزاج آصف الدولہ بہادر نہایت برہم اور مکدر ہوا اور یہ بات زبان پر لائے کہ
تغییر لباس کرکے واسطے زیارت کے طرف بلاد عالیہ نجف اشرف کی چلا جاؤنگا
اور زمین و آسمان اپنے مقام سے گو ٹل جائین لیکن عہدہ نیابت کا حسن رضا خان
اور ٹکیت راے کو نہ دونگا آخرکار تجویز نیابت کی بنام الماس علیخان قرار پائی

اوسی زمانے مین گورنر جنرل لکھنو مین تشریف فرما تھے کہ اور منقلا کی چٹھی ملاش فرمائے تھے کہ ایک چٹھی نواب گورنر جنرل مارکوس کارنوالس بہادر کی بمضمون جلد م تفویض عہدہ نیابت الماس علیخان کو نکل آئی اس وجہ سے وہ صورت جو کہ قرار پائی تھی ٹل گئی تفضل حسین خان نے خلعت نیابت پایا نقلاً کرتے ہین کہ امیر الدولہ اس سرکار کا بڑا خیر خواہ تھا اتفاق کلکتہ جانیکا ہوا اہالی گورنمنٹ نے حال سبب برہمی مزاج آصف الدولہ کا استفسار فرمایا امیر الدولہ نے بیان کیا کہ آمدنی کی صورت قلت پر ہے اور خرچ بکثرت تیئس لاکھ روپیہ بابت جمعہ آنکے سرکار کو بھی دینا پڑتا ہے اور جو صاحبان انگریز بہادر نووارد رونق افزاے لکھنو ہوتے ہین اونکی مہمانداری اور تواضع اور روشنی مین لاکھون کا صرف ہوتا ہے اور انگریزی سوداگرون سے مال کا محصول نہین لیا جاتا ہے ہزارونکا اسمین بھی نقصان ہوتا ہے اور سواے اسکے جو سوداگر مال ولایتی لاتے ہین نوابصاحب سے یہہ عرض کرتے ہین کہ یہ اشیاے بے بہا خاص ولایت سے آپہی کیواسطے لائے ہین چارناچار مول لینا پڑتا ہے قیمت بھی اونکی خاطر خواہ دینی پڑتی ہے المختصر جمعہ تین سے دو تہائی معاف ہوے اور انگریزی سوداگرون سے محصول لینے کی اجازت ہوئی اور یہہ بھی حکم رزیڈنٹ کا نافذ ہوا کہ کوئی انگریز بدون واسطے رزیڈنٹ کے ملاقات کو نواب آصف الدولہ کے پاس نہ جایا کرے چنانچہ امیر الدولہ نے اسبات کی

کامیابی کی عوض کلکتے مین ایسی افشانی کی کہ آج تک مشہور ہے آپ جال راجہ جھاؤلال کا سینے کہ انکے جانے سے نواب آصف الدولہ بہادر کو کمال غم و رنج پیدا ہوا یہانتک ضبط کیا کہ بیماریون نے ہجوم کیا اور دوا سے انکار محض کی کہتے ہین کہ راجہ جھاؤلال کے فراق مین ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ ہجری مین جمعے کے دن انتقال کیا اور بہر رات مے گئے اپنے امام بارہ کلان مین کہ تعمیر فرمایا تہا دفن ہوے تاریخ وفات کلام ملا محمد ندیم اصفہانی استاد نواب وزیر علیخان سے یہہ لوح مرقد پر کندہ تہی + گلشن عشرت بتاراج خزان رفت ای ندیم. شاہ ستم اسیر حسرت جینما یاد ار نسیم + لکھنوئی اخفست و آسمان بی آفتاب + شہر لوبان بی مسیح و طور سینائی بی کلیم + وارد آصف عشرتی در صحن آصف باغ خلد - انبیا ہمدم سلیمان ہمنشین آصف ندیم + نقد رحمت در کنار فرد بخشش زیر بغل + عاصیان از جنس غفار بیست اعطای کریم + نقش بند کاف و نون بر تربت آصف نوشت

ہہنا روح و ریحان و جنات نعیم

۱۲۱۲ھ

یہ نواب اہ سال کئی مہینے کی عمر مین دنیا سے گذرے ۲۳ برس کئی مہینے ریاست کی مدت ہوئی جناب مغفور و مبرور کا عدان مقام لقب تہا امیر الدولہ حیدر بیگخان مختار الدولہ وایلچ خان و سرفراز الدولہ حسن رضا خان و تفضل حسین خان نائب رہے مہاراجہ ٹکیت رائے کو عہدہ دیوانی سپرد تہا خطاب راجہ یہہ تہا معتمد الدولہ مشیر الملک مہاراج الدہراج بہادر مہاراجہ ٹکیت رائے

وزیر علیخان



منا جان



بہادر صلابت جنگ یہ نواب شاعر بھی تھے آصف تخلص یہ رباعی یون کہی فکر

دل مین تجھے سو لگی ہے + پر شہر ظاہر یہی کہ اودہر لو لگی ہے + ملنے نہ ملنے کا

تو وہ مختار آپ سے ہے + پر تجھکو چاہیے کہ تک دو لگی رہے +

## مرزا وزیر علیخان بہادر

بعد وفات نواب آصف الدولہ بہادر مرزا وزیر علیخان ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ ہجری کی مین مسند نشین وزارت ہوے خصلتین اور عادتین بُری تھین تفضل حسین خان اور میان تحسین علیخان وغیرہ کار دانون سے صورت بگاڑ کی پیدا ہوئی یہ لوگ اپنی حفظ جان اور آبرو کیواسطے دشمن وزیر علیخان کے بن گئے اودہر نواب سعادت علیخان سے صاحبان صدر نے اقرار فرمایا تھا کہ بعد وفات نواب آصف الدولہ کے سند وزارت تمہارے نام ہوگی اودہر ارکین وزارت مرزا وزیر علیخان کے دشمن ہی تھے درپے تخریب ہوے صورت ابطال فرزندی کی بخوبی نکالی یعنی محضر بمواہیر بہو بیگم و ارکان دولت و افسران فوج وغیرہ اس مضمون کا تیار کروایا کہ مرزا وزیر علیخان فرزند نواب آصف الدولہ بہادر کا نہین ہے آخرکار مستر جان شور صاحب نے حسب قاعدہ اونکو کوٹھی بیبیاپور مین دربار عام کرکے نظربند کیا اور چند روز کے بعد اپنی ذاتی نقد و جنس کے ساتھہ بنارس کو روانہ کیے گئے وہان مطلق العنان رہے تین لاکھہ روپیہ اس سرکار سے اونکے مصارف

کے لئے مقرر ہوا لیکن ذاتی شرارت اور جبلی فتنہ انگیزی سے راجہ علی بہادر
رئیس بندیل کھنڈ اور گوشائین ہمت بہادر اور سرکار سیندھیا وغیرہ سے
نوشتخواند رکھتا تھا اس سے اوسے کلکتے جانیکا حکم ہوا ایک دن کا ذکر ہے
کہ چیری صاحب کہ وہان کا بڑا صاحب تھا اوس سے باتون باتون مین جل گئی جانسے
ہلاک کیا جب تک سپاہ انگریزی اوسکا محاصرہ کرے بھاگا انگریزی فوج نے
اوسکا تعاقب کیا بعد سرگردانی اور پریشانی بسیار والی جیپور کا پناہ گزین ہوا
اوس نے مصلحت وقت اور دبدبے سرکار انگریزی سے مخوف ہوکر حوالے
کردیا وہان سے بحراست سرکار انگریزی کلکتے مین گیا قید مین مر گیا وہین دفن
ہوا اور اوس وقت سے زیادہ تر اقتدار سرکار ہو گیا القصہ مرزا وزیر علیخان
کو کچھ لطف مسند نشینی وزارت کا اس کشمکش مین حاصل نہوا اور نہ رعایا
کو کچھ کیفیت اونکی عدالت اور سخاوت وغیرہ کی کھلی سچ ہے چاکر بیدل
دشمن جان ہوتا ہے اگر ارکین مرزا وزیر علیخان سے نہ پھر جاتے
تو یہ صورت ظہور مین نہ آتی یہ شخص اپنے عہد وزارت مین جواہرات بیجا
لکھو کھا روپیہ کا پیش از گرفتاری کوٹھون سے نکال کر ساتھ لے گیا
تھا کارپردازون نے بہو بیگم سے اس معاملے کا اظہار کیا انہون
نے یہ جواب دیا کہ وہ جو کچھ اسباب نقد و جنس وغیرہ ہمراہ
اپنے یہان سے لے گیا ہے ہمنے اوسکو معاف کیا فقط

نواب سعادت علیخان بہادر



## ریاست نواب سعادت علیخان بہادر

جب یمین الدولہ ناظم الملک نواب سعادت علیخان بہادر مبارز جنگ لکھنؤ سے رونق بخش بنارس ہوئے اور وہان بطرح اقامت کی بموجب حکم آصف الدولہ بہادر کے دائی تین لاکھ روپئے سالیانہ واسطے خرچ کے اس سرکار سے پاتے تھے لیکن سحبان زمان اور ارسطو روزگار تھے اپنی فکر سے ایکدم غافل نہ تھے کلکتے مین جاکر صاحبان کونسل سے دعویدار ریاست آبائی کے ہوئے اونھون نے بھی انکے دعوی کو تسلیم کیا اور امیدوار وقت معلومہ کا رکھا آخر نواب سعادت علیخان نظر بفضل الٰہی کرکے کلکتے سے پھر آئے ایام شماری مین عمر بسر کرتے تھے رفتہ رفتہ اوس دن کی نوبت پونہچی کہ جسکی تمنا مین جیتے تھے یعنی بعد ایک مدت کے خبر وفات آصف الدولہ اور مسند نشینی وزیر علیخان کی مسند وزارت پرسنی نہایت ملال ہوا اوسی بیتابی مین بجرے پر سوار ہوکر پھر کلکتے کو روانہ ہوئے ابھی نواب صاحب راج محل تک پونہچے تھے کہ تحریر تفضل حسین خان کی بنام مولوی بیلن اس مضمون کی پونہچی کہ نواب بہادر یہان تشریف لائین کام دشمن کا تمام ہی یہ سنتے ہی نواب سعادت علیخان اولٹے قدمون راج محل سے پھرے اور ہوا کے مانند کانپور مین پہونچے یہان جس شب کو وزیر علیخان

گرفتار ہوئے اوسکے دوسرے دن صبح کو یکم جنوری ۱۷۹۸ء مطابق
سوم ماہ شعبان ۱۲۱۲ ہجری بسنت کے دن بڑے تجمل و شان سے
نواب سعادت علیخان داخل لکھنؤ ہوئے پہلے دولتخانے مین تشریف
لائے بہو بیگم صاحبہ کو نذر دی پھر مسند وزارت پر بآئین مقرری بٹھائے گئے
تاریخ تشریف آوری بنارس سے لکھنؤ مین اور تاریخ جلوس مسند وزارت کی یہ ہین

## بنارس سے آنا لکھنؤ مین

| | |
|---|---|
| از بلدۂ بنارس باجاہ و کامرانی | در لکھنؤ چو ماہ برج وزارت آمد |
| تاریخ مقدمش را جستم ز پیر دانش | گفتا بگو سعادت با صد سعادت آمد |

۱۲۱۲

## جلوس فرمانا مسند وزارت پر

| | |
|---|---|
| خداوند امین الدولہ در دہر | حکومت را صد وسی سال باشد |
| خرد سال جلوس مسندش گفت | بجاہ و حشمت و اقبال باشد |

صورت تقسیم ملک اودھ کہ انگریزون کو حسب اقرار نواب سعادت علیخان
نے مسند آرا ہونے کے بعد دیا اسطرح ہر

اول تفصیل ملک کہ انگریزون کو تقسیم ہوا

| | | | |
|---|---|---|---|
| فرخ اباد | محالات ریہر | چکلہ کوڑہ و کڑہ اماد | کھیرا گڈہ |
| [illegible] | [illegible] | [illegible] | [illegible] |
| اعظم گڈہ | تنبول | گورکھپور | صوبہ الہ اباد |
| [illegible] | [illegible] | [illegible] | [illegible] |

| | | | |
|---|---|---|---|
| چکلہ بریلی [illegible] [illegible] | باندہ وغیرہ [illegible] [illegible] | بابل سوای تعلقہ اروں [illegible] [illegible] | |

دوسری تفصیل ملک کے بعد تقسیم اس سرکار مین باقی رہا

| | | | |
|---|---|---|---|
| چکلہ گونڈہ [illegible] محال [illegible] | چکلہ بیسوارہ [illegible] محال [illegible] لک | چکلہ بانگرمو [illegible] محال [illegible] لک | چکلہ پچھم راٹھ [illegible] محال [illegible] لک |
| چکلہ جگدیس پور [illegible] محال [illegible] لک | چکلہ خیرآباد [illegible] لک | دیوا سترکھہ [illegible] محال [illegible] لک | دریاباد وغیرہ [illegible] محال [illegible] لک |
| رام نگر [illegible] محال [illegible] لک | چکلہ محمدی [illegible] محال [illegible] لک | چکلہ سلطانپور [illegible] محال [illegible] لک | گوشائین گنج [illegible] محال [illegible] لک |
| سندیلہ مع محال آباد وغیرہ خیرپور [illegible] محال [illegible] لک | مانک پور بہار [illegible] محال [illegible] لک | املاک نواب [illegible] جنگ در شاہجہان آباد [illegible] | املاک بنارس مع جناب عالی [illegible] |
| حضور تحصیل تعلقات [illegible] | | | |

جب اس تقسیم ملک سے نواب صاحب نے فرصت پائی [illegible] برس کا سن مبارک تھا ایک سال کامل ہر ایک شخص کی چال ڈھال دیکھتے رہے کیونکہ بعد معزولی اپنے متقدم کے اہلکاروں کو بڑی قدرت ہو گئی تھی کسی اہلکار وغیرہ سے کسیطرح خبر نہوئے جو جسکا جی چاہتا تھا وہ کرتا تھا

مگر دوست دشمن کا خیال مکنون خاطر عالی تھا زبان پر نہین لاتے تھے
کہ ایسا نہو وزیر علیخان کا سا معاملہ پیش آئے فراست اور دانائی مین ارسطوے
وقت تھے نواب سعادت خان سے واجد علی شاہ تک ایسا بیدار مغز
عالی فہم عقیل کوئی صاحب مسند و تخت نہین ہوا جب سب طرف سے
طبیعت انکی مطمئن ہوئے تفضل حسین خان کو بعہدہ وکالت کلکتہ ٹالا
اور اس انداز سے نمکحراموں کو جنسے دل کھٹکتا تھا آہستہ آہستہ سزا کو
پہونچایا نواب نصیر الدولہ بہادر جو ملقب بہ محمد علی شاہ ہوئے اور نواب
شمس الدولہ بہادر مرشدزادے کام نیابت کا کرتے تھے امیر الدولہ
بشراکت راجہ تکیت رای کار سرکار کو انتظام دیتے تھے اور نواب
سرفراز الدولہ برائے نام شریک ہوتے تھے خطاب ناظم الملک کہ
مہر مین کندہ تھا وہ بموجب حکم حضور پرنور بافتخار الملک مبدل ہوا راے
رتن چند کہ ملازم قدیم تھا صورت انصرام جملہ امور کی اوسکے تعلق تھی
اوسی آدہے ملک سے جو انگریزون کو دیا تھا یہ صورت قرار پائی

| | | | |
|---|---|---|---|
| شاہزادہ ہای دہلی مقیم بنارس کی تنخواہ | حافظ رحمت خان کی اولاد کا سالیانہ | نواب ناصر جنگ اور احمد خان بنگش کی اولاد | معافیداران جاگیرداران و روزینہ داران |
| ۹عہ ۔ | لک | یعہ لک | لک |
| جاگیر نواب شمس الدولہ | جاگیر الماس علیخان | جاگیر تفضل حسین خان | اسیطرح اور اشرف علیخان وغیرہ کی جاگیرین مقرر ہوئین |
| پچھتر ہزار | جب ۔ | سعہ ۔ | |

انکے عہد مین پرچون کی وہ موم تھی ہر کارون کو حکم ناطق تھا کہ وہ روبرو جاکر خبر زبانی عرض کرتے تھے دن رات مین اختیار تھا جب چاہین سوتے جاگتے مین عرض کرین اس زمانے مین ہرکاران اخبار کے بڑے کارخانے تھے رای رتن چند اخبار نویس تھا بلا کا آدمی تھا ارکان دولت کم عزرائیل سے نہین جانتے تھے بظاہر باب ثبوت بند تھا دستخط نواب سعادت علیخان کے مشہور ہین جب نواب نے اپنے عہد وزارت مین عہدا لتین مقرر فرمائین عدل و انصاف نے رونق پائی ایک دن پرچہ کچہری عدالت کا ملاحظۂ عالی مین گذرا دستخط اوسکے یہ ہین کہ فلان صاحب عدالت مثل ماکیان بچہ دارست خود نمیخورد بچگان را میخوراند تمام کاروبار وزارت منحصر پرچہ ہای اخبار پر تھا کیا مجال تھی ہرکارہ یا اخبار نویس کچہ خبر خلاف تحریر کرتا اگر کوئی بات خلاف ظہور مین آتی تھی سزا پاتے تھے عمارات عالی بھی اس شہر مین بہت تعمیر ہوئی ہین کہ باعث آرایش و رونق لکھنؤ اب تک ہین تفصیل اوسکی مکانوں کے ساتھ لکھی جاویگی ایک روایت تازہ یہ ہی کہ نواب سعادت علیخان کو تقسیم کردینا ملک کا نہایت ناگوار و شاق ہوا لیکن کیا کرین فکر اسکی ہر طرح سوہان روح تھی اسی تصور مین تھے بدون زور شمشیر و تدبیر وہ ملک اپنے قبضے مین آئے بہت سی خاک اوڑائی اور عرق ریزیان عمل مین

آئین نیہان تک کے وکیل لندن کو روانہ کیا اور درخواست مستاجری عام قلمرو
سرکار کی مانند سرکار کمپنی انگریز بہادر کے گذرانی اور سوال جواب نے رونق
پائی یعنی بادشاہ لندن نے درخواست نواب ممدوح کی قبول فرمائی سماعی
ہی کہ یہ شرط اوس اقبال مین لگی تھی کہ اٹھارہ کرور روپیہ پیشگی اگر داخل سرکار
فیض آثار ہوگا یہ صورت ظہور مین آئیگی۔ نواب سعادت علیخان نے جو
ان دستخطون کی خبر پائی بہت متفکر ہوے کہ اسقدر زر کثیر خزانے مین
نہین اور اجتماع اوسکا سردست دشوار کمال لیکن مرد صاحب ہمت نہ
تدبیر تھے درپی تدبیر فراہمی زر رہے جسطرح ہو سکا بہزار تدبیر سترہ کرور
روپیہ سترہ برس کی مدت مین جمع کیا تھا فقط ایک کرور کی تدبیر باقی
تھی وہ بھی قریب ممکن تھی مگر طالع سرکار کمپنی کا یاور تھا جس سے تدبیر اور
کوشش نواب کی مراد پر نہ پہونچی گو یہ روایت ہی لیکن یہ نواب بڑا
اولوالعزم اور صاحب ہمت و منتظم تھا دوسری یہ بات مشہور ہے کہ
نواب سعادت علیخان بیماری سرطان مین مبتلا ہوے مصلحتاً تبدیل
مکان کے واسطے ایک کوٹھی جنرل مارٹین صاحب سے مول لیکر دولتخانے
سے اوٹھہ آئے اور شفا پائی نام اوس کوٹھی کا فرح بخش قرار پایا اسطرح
ایک مدت گذری تب اسا زگورنر ولیزلی صاحب کہ نواب سعادت علیخان کے
دوست و مصاحب خاص تھے رخصت لیکر ولایت کو گئے یہ بات

اونکو بدل منظور تھی کہ کوئی ایسی بات مجھسے بہتر ظہور مین آوے کہ مقدمات
نوابصاحب درست ہوجاوین اسی خیال و فکر مین تھے کہ یہ بات تازہ
ہاتہ اگئی کہ لارڈ مونیگ صاحب بہادر بادشاہ وقت یعنی جارج چہارم کا بڑا
رفیق بہی آجکل بوجہ بے زری کے تمام املاک اوسکی بیع ہوگئی ہے
اگر اسوقت مین نواب سعادت علیخان اونکے ساتہ کوئی سلوک غائبانہ
فرماوین خالی مطلب سے نہوگا چنانچہ اس معاملہ سے نواب صاحب کو
آگاہ کیا اونھون نے بہی اونکی تحریر پر عمل کیا تحفہ اور تحائف بے بہا
سے باحسن الوجوہ لارڈ صاحب بہادر سے مسلوک ہوئے کہ اونکو
نواب پر نظر عنایت ہوئی اتفاقاً صاحب ممدوح گورنر کلکتہ کے ہوئے
اور براہ رسم محبت کے نواب سعادت علیخان بہادر کو یہ واسطہ تحریر فرمایا
کہ ہم ہندوستان مین اسی واسطے آئے ہین کہ تمہارے مقدمون کو
بخوبی درست کرین مقام شکر اور خوشی کا ہی نواب ممدوح اس مضمون سے
بہت محظوظ ہوئے سمجھے کہ اب مدعاء دلی بخوبی اگر ہی نشین ہوا لیکن
شدنی سب پر افضل ہی اکثر صحبت خاص مین یہ سخن زبان پر عالم خوشی مین
آجاتے تھے کہ گورنر جنرل بہادر انشاء اللہ قریب تشریف لاتے ہین
حوصلۂ دل بخوبی اونکی عنایت سے نکل جائیگا اور نمک حرامون کو
سزا دیجائیگی کہ بہت یاد کرینگے جن لوگون کو خوف سزا تھا دلون مین

کھسکے کہ اب آفت سر پر آئی نواب ممدوح کے دشمن جان ہو گئے ایکدن نواب صاحب تھوڑے مصاحبون کے ساتھ بسواری تامجان دروازہ دلکشا تک ٹہلنے چلے گئے جا کر دولتخانے مین پھر آئے پہر رات گذرے تک بخوبی عیش و عشرت کا جلسہ گرم رہا ناچ رنگ مین مصروف تھے جواہر علیخان خواجہ سرا یا رمضان علیخان اپنے سالے کے ہاتھ سے گوشت کی یخنی معمولی پی کر پلنگ پر آرام فرمایا ہنوز آنکھ خواب سے آشنا نہوئی تھی کہ یکبارگی چونک اوٹھے تین بار حضرت عباس علمدار کا نام زبان مبارک پر آیا اور ایک بڑے مرزا یعنی غازی الدین حیدر کو بھی پکارا بہ ہمہ صورت حالت غیر تھی وہ یخنی مسموم کام تمام کر گئی اسمین روایتین بہت کچھ ہین مصلحت وقت سے زبان قلم پر نہین آسکتین واللہ اعلم بالصواب ۲۳ ماہ رجب ۱۲۲۹ ہجری مطابق ۱۸۱۴ء کو منگل کے دن پہر رات گئے چراغ حیات کا گل ہوا ۶۳ برس کئی مہینے کی عمر تھی اور مکانمین خلف ارشد اپنے کے دفن ہوئے جنت آرامگاہ اوس دن سے لقب ہوا

## قطعۂ تاریخ وفات جنت آرامگاہ

ناگہان رحلت ازین عالم نمود — زینت افزا شد بفردوس برین

من شنیدم سال تاریخش غریب — آہ شد گنج سعادت در زمین

۱۲۲۹ھ

غازی الدین حیدر بادشاہ



بعد وفات کے کئی برس مین مقبرہ انکا تیار ہوا صاحبان رزیڈنٹ اونکے عہد مین یہ تھے بلیندن صاحب بہادر۔ کرنیل ولیم اسکاٹ صاحب بہادر کرنیل کالنس صاحب بہادر۔ کرنیل جان بیلی صاحب بہادر اور نواب شمس الدولہ نائب اور نواب منصیر الدولہ یعنی محمد علیشاہ دیوان تھے ۳۲ پلٹن اور پانچ ہزار سوار بعد برطرفی ملازم تھے مدت ریاست کی ۱۶ سال ۹ مہینے فقط

## تاریخ وفات راجہ ٹکیت رای

| | |
|---|---|
| راجہ ٹکیت رای سخاپیشہ زمان | چون جان پاک خود بجہان آفرین سپرد |
| رفتم بغور از پی تاریخ سال او | آمد ندا ز غیب کہ فیاض عہد مرد |

۱۲۱۱

## حال ریاست نواب غازی الدین حیدر

جب نواب سعادت علیخان جنت آرامگاہ ہوئے نواب عثمان علیخان نے کرنیل جان بیلی صاحب بہادر کو اس سانحے سے آگاہ کیا اونہون نے حسب ضابطہ شتر سوار بھیجکر مینڈیاؤن سے نپلٹن واسطے بندوبست کے طلب کین اور مرزا جعفر اور مرزا حاجی کو بلایا اور آپ مع ڈاکٹر ڈبلس صاحب اور کپتان نارخن صاحب کو ہمراہ لیکر نوابصاحب کے مکان مین تشریف لائے اور جا بجا پہرے واسطے حفاظت کے مقرر کیے اور حکم دیا کہ کوئی بدون اجازت کے قدیم اندر مکان کے

رکھتے نہ پائے محمد غلام عباس نے یہ خبر نواب غازی الدین حیدر کو پہونچائی
وہ بلباس فاخرہ ولایتی کمر مین لگائے نواب خاص محل کے مکان سے
بارہ دری مین داخل ہوئے آغا میر بھی کسیطرف سے راہ پیدا کر کے
پہونچا کرنیل صاحب بہادر نواب سعادت علیخان کے سرہانے آئے
دوشالہ کہ اوپر پڑا تھا اوٹھایا اور ڈلس صاحب نے واسطے رفع شک
دونون کنپٹیون مین نشتر دیا ایک طرف سے تھوڑا خون اور دوسری
جانب سے اندر کے چربی نکلی یہان کیا تھا باقی طبیعت مطمئن ہوئی
گفتگو رئیس بنانے کے باب مین ہوئی شمس الدولہ کا بھی نام آیا تھا
لیکن غازی الدین حیدر بہادر کا طالع ورپر تھا ۱۴ برس کی عمر مین کرنیل
بیلی صاحب بہادر اونکو کمرہ فرح بخش مین لائے اور مسند وزارت پر
حسب آئین بٹھا کر حکم شلک کا دیا ارکان دولت نے نذرین گذرانین

تاریخ وزارت

وزیر غازی دوران و رستم آفاق
رہی جلوس وزارت منو دبا دل شاد
ندا رسید ز ہاتف بمن کہ تاریخش
بگو سعید تو دائما وزارت باد

مرزا جعفر و مرزا حاجی کا بھی دور ہوا اب آغا میر کی نیابت اس عہد کی مشہور ہے
آغا میر نواب غازی الدین حیدر خان بہادر کے خواصون مین منسلک تھا
رفتہ رفتہ قسمت نے صورت ترقی کی دکھائی کار و بار خانگی متعلق ہوا

طبیعت چالاک تھی رنگ زمانے کا دیکھکر منشی علی نقی خان منشی رزیڈنٹ
بہادر سے رسم اتحاد بڑھائی یہان تک کہ اونکو اپنا پدر خواندہ کیا اس
درمیان مین لارڈ ہیٹنگ صاحب بہادر بھی لکھنؤ مین تشریف لاے
وفات سعادت علیخان سے نہایت ملول تھے اور کمال افسوس
فرماتے تھے اور ایسی مرضی مبارک معلوم ہوئی کہ درستی معاملات کی
حسب خواستہ نواب سعادت علیخان جنت آرامگاہ کی منظور تھی تو قریب
تھا کہ صورت دلخواہ غازی الدین حیدر بہادر کی ظہور مین آئے لیکن آغا میر
نے بطمع نیابت نواب غازی الدین حیدر کو اس وادی مین نہ آنے دیا
بلکہ یہ بات برعکس ذہن نشین کی کہ ایسا نہو کہ یہ ریاست طرف شمس الدولہ کے
منتقل ہوجاے جو حق نمک تھا وہ ادا کیا آیندہ نوابصاحب بہادر کو
اختیار ہی انکو وہ نہ ملا کہ جو نواب سعادت علیخان کو تھا کہان تھا
دام فریب مین آگئے اقرارنامہ جدید پیش کردہ کرنیل بیلی صاحب رزیڈنٹ
دستخط کر دیے دوسرے دن خلعت نیابت آغا میر کو نصیب ہوا اور
معتمد الدولہ خطاب پایا مرزا حاجی کی صحبت برہم ہوئی گھر بیٹھے منتظم الدولہ
حکیم مہدی علیخان منتظم خیرآباد ہوے نو مہینے کے بعد معتمد الدولہ ساتھ
نصیر الدین حیدر کے لارڈ ہیٹنگ صاحب بہادر کی ملاقات کو گیا تھا
اونپر سب حال روشن تھا معتوب ہوا بلکہ بعد معاودت فرخ آباد سے

گرفتاری معتمد الدولہ کی ظہور مین آئی استنے دنون کے بیچ مین مرزا جعفر مر گئے

قطعہ

| | |
|---|---|
| میرزا جعفر کہ دائم از امام جعفر کشش | حب در دل بود این بہر دو عالم ظاہر ست |
| بہر تاریخ وفاتش چون تامل شد مرا | آمد از ہاتف ندا جعفر بنزد جعفر ست ۱۲۳۰ھ |

نواب غازی الدین حیدر خان بہادر نے پھر بنظر مہربانی مرزا حاجی کو بلا کر اپنا مقرب بنایا اور محمد آفرین علیخان خواجہ سرا کا بھی اس زمانے مین ستارہ چمکا بڑا اوہدہ دا میر خدا بخش انکا کار زمرہ تھا اونے کربلا بنائی بہت مشہور ہے۔

قطعہ

| | |
|---|---|
| در ایام غازی دستور ہند | کہ ہم نام حیدر بجود و عطاست |
| زہی رکن اقبال او ناظر ست | جہان آفرین خوان امید ما ست |
| بدربار او سید باوفا | خدا بخش نامش ز فضل خداست |
| بنا کرد چون کربلا کربلا | بچشم جہان خاک او طوطیاست |
| زروی بشارت خرد سال او | بگفتا کہ این نقشہ کربلاست |

القصہ مرزا حاجی اور محمد آفرین علیخان یہ دونون نواب غازی الدین حیدر کے مشیر ہوے کچھ دنون محبت نے رنگ کھایا ہمین سے گذری باہم شیر و شکر تھے یکایک پھر پہ فلک نے کروٹ لی نواب ممدوح نے

معتمد الدولہ کو بھی خلعت نیابت سے سرفراز فرمایا مرزا حاجی اور محمد آفرین علیخان خانہ نشین ہوے بعد کچھ زمانے کے محمد آفرین علیخان مر گئے تاریخ انکی وفات کی زیب قلم ہوتی ہے۔

## قطعہ

| | |
|---|---|
| چون محمد آفرین رحلت ازین عالم نمود | مدفن او شد بخاک آستان شاہ دین |
| چون نمودم فکر بہر سال تاریخ وفات | ہاتفی گفتا کہ ہی ہی کرد رحلت آفرین ۱۲۳۳ھ |

میر خدا بخش کو معتمد الدولہ نے مقید کیا بیچارے نے بڑی مصیبتیں اٹھائیں مرزا حاجی جو معتمد تھے مع گھر بار کانپور کو نکالے گئے۔

## تاریخ

| | |
|---|---|
| میرزا حاجی کہ آن از سالہا در قید بود | ناگہان او را برون از شہر کردہ این فلک |
| سال حال سر کہ جستش چون ز ہاتف خواستم | گفت مرزا حاجی بیچارہ رفتہ یک بیک |

بسکہ مرکوز خاطر سرکار دولتمدار گورنر جنرل کو بھی منظور تھا کہ اودھ کی ریاست آباد و شاد ہو اسواسطے ارکان دولت انگلشیہ نے نواب غازی الدین حیدر کو تاریخ ۱۸ ماہ ذیحجہ ۱۲۳۴ ہجری مطابق ۱۸۱۹ء تخت شاہی پر جلوہ افروز کیا بخطاب شاہ زمن شہرت پائی۔ تاریخ یہ ہے

| | |
|---|---|
| بحمد للہ کہ با اقبال و دانش | بہ تخت شہ جلوس شاہ گردید |
| زمین و آسمان یکسر ہمیشہ ست | زہاہی خرمی تا ماہ گردید |

مبارک باد ای آفاق و عالم — طلوع آفتاب جاہ گردید
ندا آمد بگوشم زود یارب — کہ شاہ امروز شاہنشاہ گردید

اور سکہ اونکا یہ جاری ہوا

سکہ زد بر سیم و زر از فضل رب ذو المنن — غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

اور نواب معتمد الدولہ کا خطاب وزیر اعظم ہوا تاریخ وزارت یہ ہے

چون شاہ زمن صاحب جود و انصاف — شد بر اورنگ مرجع جایش
کرد وزیر اعظمش ضیغم جنگ — کو ہست بشمار فراست فارس
از نصفت شاہ شد قوی ہر مظلوم — وز جود وزیر شد غنی ہر مفلس
ساز و قدم شاہ خزف را یاقوت — وز خاک در وزیر زر گردد مس
تاریخ سعید کرد نانخ تحریر — شاہ اسکندر وزیر ارسطاطالس
۱۲۳۸ھ

حکم اقتدار وزارت بڑھا اپنے پرائے حساد اور اعدا او سمجھنے لگا اکثر اشخاص مخالفان کو کانپور دیہ پہنچایا کہ ایک چھوٹی سی بات یہ ہے کہ بادشاہ بیگم اور ولیعہد کے بیچ مین بڑے بڑے فساد ڈالے میر فضل علی داروغہ اور فیض النساء مغلانی کو سرکار بادشاہ بیگم سے نکلوایا بڑے ظلم و ستم ظہور مین آئے نوبت کشت و خون کی پہونچی تھی کہ صاحب ریذیڈنٹ بہادر واسطے امن کے ہوئے انکو فرخ آباد مین پہونچایا وہان جاکر منتظم الدولہ سے سے رابطہ اتحاد کا پیدا کیا درمیان بادشاہ بیگم اور ولیعہد بہادر کے

وہ آتش افروزیان کین کہ جسکا بجھانا آب تدبیر سے دشوارتر تھا بنا بہان جب
پیدا ہوے دھوبن کے شکم سے قرار دیا پادشاہ کے کئی بھائی ابھی کے
ہاتھ سے غریب الوطن ہوگئے بہت شہر مین نظربند رہے اور یہ بھی بیان
اوسکا ہی کہ معتمد الدولہ لیاقت اور مروت اور اور صفتون مین بے نظیر تھا
مگر ہر کسی کو اپنی اپنی زندگی اسکے وقت مین دوبھر تھی غریبون پر جور فریق
اور اسکے ظلم وستم کرتے تھے وہ کسی کی فریاد نہین سنتا تھا مکانات
رعایا کے بجبر چھین لینا ایک بات تھی اوسنے زمین جبریہ پر بڑے بڑے
وسیع وسیع مکان بنوائے مگر رہنا بھی نصیب نہوا غرض اس نائب کی
بیدار مغزی اور معاملہ فہمی کی تعریف ہی لیکن سلوک اسکا چہ عام وچہ خاص
اچھا تھا اسکے عہد عنایت مین زمانہ اچھا عیش دوست رہا لکھنؤ مین
آبادی ہوتی گئی اور یہ شخص شعرا کا دوست تھا اب اسکے خاندان سے
کانپور مین کئی رئیس موجود اور وثیقہ دار سرکار ہین۔

تفضل حسین کہ بعہدۂ وکالت کلکتے مین تھا متوفی ہوا لیکن معتمد الدولہ
نے پھر عرق ریزی کرکے محمد خلیل الدین خان کو کہ مقبول سرکار تھا
وکیل کروایا تقرر ہوا کہ کرور روپیہ سرکار شاہی کا سرکار کمپنی انگریز بہادر مین بمنافع
فی ہزار پانچ روپیہ داخل کرکے وثیقہ کرالیا جسکا سود دیو سا سے ار ہوا
حسب تفصیل ذیل وثیقہ جاری ہوا۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| نواب مبارک محل | سلطان مریم بیگم | ممتاز محل | سرفراز محل |
| ع ۔ | الحق ۔ | ال ۔ | ال ۔ |
| ملازمان متعلقہ خاص مع اسامیہائے ذی اختیار | خرچ امام باڑہ نجف اشرف | نواب بیگم زوجہ معتمد الدولہ | امین الدولہ بیسر النساء |
| عالو ع | ماہوبہ | ع ۔ | ال ۔ |
| معتمد الدولہ وزیر اعظم | وزیر بیگم و عالیہ بیگم دختران معتمد الدولہ | نامعلوم | ــ |
| ع ۔ | ال ۔ | ع | |

یہ پادشاہ بھی بہت نیک نیت تھا عادل اور نصف ادر سخی کمال تھا نظم و نسق سلطنت تمام تعلق معتمد الدولہ کے تھا جو روپیہ کہ نواب سعادت علیخان جنت آرامگاہ نے خون جگر کھا کھا کر بہزار تدبیرون سے جمع کیا تھا نصف سے بھی زیادہ صرف عمارات شاہی مین درآیا اور ناچ رنگ تماشا مین کوڑیون کیطرح خرچ ہوا یہ کلام سعدی کا سچ ہے ہر کہ آمد عمارت نو ساخت رفت و منزل بدیگرے پرداخت ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ ہجری مطابق ادو اکتوبر ۱۸۲۶ء ۵۶ برس کی عمر مین بعارضہ اسہال خونی محل مین وفات پائی امام باڑہ نجف اشرف مین کہ لب دریا بنوایا تھا دفن ہوئے لقب خلد مکان ہوا

| | |
|---|---|
| تاریخ وفات کی شیخ ناسخ کی یہ ہے | |

| | |
|---|---|
| از وفات جناب شاہ زمن | گوہر عالمی ہلاک شدہ |
| دہر گریدہ بمہر ماہ دو رخ | بہ بہشت آن جناب پاک شدہ |

نصیرالدین حیدر بادشاہ



| | |
|---|---|
| دیدہ ہا شد بہ آتش نمناک | سینہ ہا آہ دردناک شدہ |
| رفت داماں صبر از دو ستم | جیب صبر و شکیب چاک شدہ |
| گشت تاریخ مصرعہ استاد | ای لبا آرزو کہ خاک شدہ |

۱۲۴۳ھ

کرنیل جان بیلی صاحب اسٹریچی صاحب جنرل ریپر صاحب بیٹسن صاحب مارزونٹ ریکٹس صاحب اس عہد میں ریزیڈنٹ رہے معتمد الدولہ نائب سردار قمر الدین احمد خان مرزا حاجی محمد آفرین کارپرداز تھے اسوقت مین سات ہزار سوار اور اکتالیس پلٹن تھیں ملک کی آمدنی ایک کروڑ اسی لاکھ مدت سلطنت قریب ۱۵ برس کے

## بیان ریاست نصیر الدین حیدر بادشاہ

بعد خلد مکان کے ابو النصر قطب الدین سلیمان جاہ نصیر الدین حیدر بادشاہ بہ پچیس برس کے سن میں ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ ہجری دیوالی کے دن شمع افروز کاشانۂ تخت سلطنت ہوئے تاریخ اونکے جلوس کی یہ ہی۔

### قطعہ

| | |
|---|---|
| بر تو ای پادشہ فیض رسان عالم | تخت این مملکت ہند مبارک باشد |
| سال تاریخ جلوس طرب افزا بشنو | جاودان سلطنت ہند مبارک باشد |

۱۲۴۳ھ

اس بادشاہ کے دو سکے جاری ہوئے پہلا سکہ یہ ہے۔

| | |
|---|---|
| بہ مہر مرتبہ شاہ جہان سلیمان جاہ | بہ ہر سکہ شاہی زدہ ز لطف اللہ |

بعد چند روز کے یہ سکہ یون بدلا گیا

| | |
|---|---|
| سکہ زد بر سیم و زر از فضل حق ظل اللہ | نائب مہدی نصیر الدین حیدر بادشاہ |

اب تک اس سلطنت مین معتمد الدولہ وزیر تھے فقیر محمد خان اور سیدو خان
وغیرہ رسالدار مع افسران سوار و پیادہ اس نائب کے مطیع و فرمان بردار تھے
رسالہ فقیر محمد خان مین ایک ہزار آٹھ سو سوار اور رسالہ سیدو خان مین ایک ہزار
سات سو سوار تھے اور افسران پیادہ سوای انکے سبحان علیخان قوم کنبوہ
سا مشیر تھا بڑا صاحب عقل و نیک تدبیر تھا تاج الدین حسین خان کنبوہ عمدۂ
سفارت پر مامور تھا ہر ایک اپنے وقت کا ارسطو تھا لیکن بادشاہ
حرکات معتمد الدولہ سے کھٹکتے تھے اسقدر قدرت بخیال برپا ہونے
فتنہ و فساد فوج کے حاصل نہ تھی کہ معتمد الدولہ پر دفعتہ ہاتھ صاف کرین چونکہ
ذکی و عاقل تھے بھائی آغا بھائی آغا ہر وقت زبان پر جاری تھا
مگر دل مین دشمن خاندان اپنا تصور کرتے تھے ظاہر مین وزیر روز صورتین
ترقی کی ظہور مین آتی تھین ایکدن پچاس ہزار روپیہ نقد یکمشت خزانۂ
سلطانی سے بحکم بادشاہ معتمد الدولہ کو ملا سبحان علیخان نے کہ مرد کنبوہ اور
عاقبت اندیش مشیر اوسکا تھا مزاج مین بہر حال دخل تھا معتمد الدولہ سے
بخیال دور اندیشی یہ بات بیان کی کہ نواب صاحب یہ عنایات شاہی خالی
علت سے نہین کچھ دال مین کالا ہے باعث تباہی کی ہوگی خبر تباہی

آپ دانا ہین وام عیاری سے وہ در ہے گا قریب ہی کہ کوئی گل تازہ کھلے
ایسا نہو کہ ان روپیون کے لینے کے عوض دینے پڑجائین وہ لڑکا
قیامت کا ہی مجکو اوسکا کلام یاد ہی کہ ایکدن کہتا تھا کہ وزیر علیخان سے کچہ
کرتے نہ بن پڑا بہت جلدی گزر گذرا آغا میر نے در جواب اوسکے بکشادہ پیشانی
یہ کہا کہ تم عبارت کا لکھنا خوب جانتے ہو اس مضمون سے خبر نہین ہم
خوب اس مطلب کو پہونچتے ہین بادشاہ کی اگر تدبیر اور چال چل گئی نوبت محاسبہ
حساب کی آوے گی اسکے سنہ باب مین یہ روپیہ صرف کرونگا جہان
کرورونکا محاسبہ میرے ذمہ ہوگا یہ کون سا بگران ہی کہ نہ اوٹھے گا اور
اگر یہ گمان بد تمہارا ظہور مین نہ آیا در اصل بخوشی عنایات سلطانی سے
سرفراز ہوا ہون شیرمادر ہی فکر بے سود سے دل کو پریشان کرنا بیفائدہ
ہی القصہ بادشاہ اور معتمد الدولہ بظاہر شیر و شکر تھے ایکدن بے تکلف
بادشاہ نے وزیر سے قفلیان برف کی طلب فرمائین اس سخاوت مرتبہ نے
پانچ چار حاضر کین مشہور ہی کہ بادشاہ دیجاہ اسکی سرد مہری سے اپنے
دلمین بہت گرم ہوے اور طلب فرمائین ناظرین کیفیت ملاحظہ فرمائین
کہ کیا نشۂ شراب نخوت آنکھون مین جما تھا کہ عوض برف کے یہ حرف
زبان پر آیا کہ اسوقت اور قفلیان تیار نہین ہین واللہ اعلم بالصواب
یہ روایت سنی ہی اب آغا میر کی فراست اور دانائی دیکھیے کہ وہ تدبیر

مناسب نقتہ رفتہ عمل مین لایا کہ رزیڈنٹ لکھنؤ سے لیکر صاحبان صدر تک
وہ رسم اتحاد بڑھایا کہ وہ سب دم اسکی محبت کا بھرنے لگے مین مددگار
تھے بہر صورت مطمئن تھا یہ بات ذہن نشین تھی کہ ہم چاہین آج بادشاہ
بنا دین آخر کار عز و دولت و تدبیر نے یہ دن دکھایا نصیر الدین حیدر
بادشاہ کہان تک ضبط کرتے اسکے عزل کے درپی ہوئے چونکہ
امور خانگی مین مختار تھے رزیڈنٹ بہادر کو اس بات پر آمادہ کر لیا اور انھون نے
یہ فرمایا کہ تم معتمد الدولہ کو ہماری کوٹھی مین بھیجدو ہم گرفتار کر دینگے آپ
اس امر مین مبادرت نہ فرمائین کہ بیٹھے بیٹھے ناحق کو فساد اوٹھے گا
مختصر یہ تجویز جب قرار پائی نصیر الدین حیدر نے معتمد الدولہ کو ایک دن
دوپہر کے وقت خوشی خوشی کوٹھی رزیڈنٹی مین بھیجا کہ تمھین بڑے صاحب نے یاد کیا ہی
چونکہ آمد و رفت جاری تھی اور شدنی درپی گرفتاری تھی راز پنہان سے
آگاہ نتھا دانائی کام نہ آئی بڑی شان و تزک سے کئی ہزار سوار و پیادہ
ہمرکاب تھا کوٹھی رزیڈنٹی مین پہونچا صاحب کلان حسب سر رشتہ برہم
و آئین مقررہ پیش آئے کوٹھی خاص مین جگہ دی نقیر محمد خان وغیرہ حسب قاعدہ
باہر تھے تھوڑی دیر کے بعد کچھ باتین مناسب وقت ادھر ادھر کی کرکے
اوس مقام سے باہر آئے معتمد الدولہ وہان بیٹھا تھا کہ دوسرے دروازے
سے دو انگریز ہو کمین گاہ مین کھڑے تھے کرچ حسب ضابطہ برہنہ

لیے ہوئے مانند عزرائیل کے اوسکے سر پر آپہونچے اور یہ حکم سنایا
کہ آپ بموجب حکم بادشاہ سلیمان جاہ کے قید ہوئے ہتھیار رکھدیجیے
یہ سنتے ہی چہرہ زرد ہوا روح قبض ہوئی بس کیا تھا قید ہوا کہ ایک ساعت
کے بعد صاحب کلان بہادر پھر تشریف لائے اور بہت تشفی اور دلداری
کی کہا کہ نواب صاحب یہ مقام شکر جا نیے اضطراب نہ کیجیے ہمنے آج آپکی
عزت و آبرو بچائی کہ بادشاہ کے پنجہ قید د تھرے چھوڑا کر اپنے پاس
رکھا و گرنہ بادشاہ تمہارا دشمن تھا بہت بری طرح پیش آتا اب جو بات کہ
تمکو منظور ہوا اور بہتر سمجھو وہ کہو کہ وہ صورت عمل مین آئے معتمد الدولہ اوسوقت
آنکھون مین آنسو بھر کے اسطرح بولا کہ خیر جو کچھ ہوا وہ ہوا اب اس بات کا
میزان عدالت سے امیدوار ہون کہ بہ آبرو مین نہ آنے پائے صاحب کلان
بہادر نے بہت اطمینان فرمایا کہ خاطر جمع رکھو ایسا نہو گا اب فیقون کا
حال سنیے جنکو دعوی تھا کہ جہان پسینا نواب صاحب کا گریگا وہان اپنا
خون گرائیں گے ہر ایک باہر اپنے مقامون پر بیٹھے تھے کہ یہ حال او نپر
آشکارا ہوا نہایت وحشت پاچہ ہوے ادہر اودہر بغلین جھانکنے لگے
ساری رفاقت اور بہادری بھول گئے ہراسان اور پریشان اپنی اپنی جان
اور مال کی خیر مناتے تھے یہان تو یہ معاملہ گذرا وہان نصیر الدین حیدر
بادشاہ خوش کہ معتمد الدولہ گرفتار ہو گیا اوسیوقت یہ حکم جاری فرمایا ابھی

متوسلان معتمد الدولہ گرفتار ہون اوسدن شہر مین عجب ہنگامہ برپا تھا
کہ چوبدار سلطانی پھرے لیے ہوے ہر طرف کوچہ و برزن مین تھے
جہان کچہ بھی پتا پاتے تھے کہ یہ شخص آغا میر سے سروکار رکھتا تھا اوسکو
بلاتامل گرفتار کرتے تھے مکان پر چوکی پہرہ بٹھاتے تھے القصہ اوسدن
اس معاملے مین بہت لوگ گرفتار ہوے زیادہ تصریح اسکی بیکار ہے
سارے شہر مین کھلبلی مچ گئی اکثرون کے گھر مین سامان شب عاشور تھا
اب سنیے صاحب کلان بہادر نے معتمد الدولہ کو قید کرکے اجازت دی
کہ سواری فیل اپنے گھر جاے اوس وقت کا عالم کیا بیان کیا جاے دروازہ
بیلی گارد سے آغا میر کے مکان تک ایک ازدحام تھا کچہ افسوس اور کچہ
خوشی صورت قید کی مکان پر یہ تھی کہ ایک کمپنی انگریزی واسطے حفاظت
آبرو کے مامور تھی منڈیاون سے آتی تھی اور ہر ہفتہ مین اوسکی بدلی بھی
ہوا کرتی تھی لیکن قید ہونے کے بعد مہاجن اور بیوپاری وغیرہ کہ جنکا
روپیہ اوسکے ذمے کثیر تھا رات دن دروازہ گھیرے رہتے تھے
اوقات خواب وخور آغا میر کی اونکے ہاتھون سے تنگ تھی یہ معاملہ
کچہ سرکاری نہ تھا صاحب کلان بہادر نے حکم دیا کہ جلد زر قرضہ کہ لازم الادا
ہی ادا کرے اور ایک انگریز بھی مامور تھا کہ اوسنے میر روشن علی کے
ہاتھون سب کا قرضہ ایک کے چار حسب دلخواہ قرضخواہون کے دلوا دے

بعد عرصے کے آغا میر عزت و آبرو ممیت بتصدق صاحب کلان بہادر کے
مع زن و بچہ و مال و اسباب لکھنؤ سے کانپور کو گیا تیس لاکھ روپے بابت
ضمانت اور تنخواہ کے جو خزانہ رزیڈنٹی مین جمع تھے اور وہ جملہ املاک کہ لکھنؤ مین
بنوائی تھی محاسبہ شاہی مین محسوب ہوئی مگر یکوان بُری بات ہوئی راوی بیان
کرتے ہین کہ اسباب امتعہ جواہرات وغیرہ کے سوای چالیس پینتالیس
چھکڑے فقط اشرفی اور روپیون کے یہان سے اپنے ساتھ لیگیا۔
چنانچہ کانپور پہونچتے پہونچتے ایک چھکڑہ اشرفیون کا اعظم علی داروغہ نے
راہ سے گم کیا اور اسیوجہ سے باہم صورت ملال کی پیش آئی خلاصہ
اس تحریر کا یہ ہی کہ باوجود اس خرابی اور بربادی کے آغا میر نے کانپور
جاکر پچیس ہزار روپے کا وثیقہ تازہ سرکار انگریزی سے اپنے نام کا جاری
کروایا وہ آج تک اوسکی اولاد کو ملتا ہے اور رستے مکان میدان جوہی کین مین
تعمیر کروائے اب یہ روایت سنیے کہ جب آغا میر قید ہوا فیض النسا مغلانی
اور میر فضل علی جو فرخ آباد مین نکالے ہوے تھے خفیہ پھر اس شہر مین
آئے اور بواسطہ بادشاہ بیگم کے میر فضل علی نے وزارت پائی اور
اعتماد الدولہ خطاب ہوا منتظم الدولہ اور مرزا حاجی بھی بامید وزارت کانپور
سے شہر لکھنؤ مین آئے تھے لیکن منتظم الدولہ اور اعتماد الدولہ مین موافقت
نہوئی مایوس پھر گئے لیکن مرزا حاجی رفاقت منتظم الدولہ سے کنارہ

کرکے رفیق اعتماد الدولہ کے بنے پر لکھنؤ کا رہنا غنیمت جانتے تھے
اعتماد الدولہ مدار المہام تھے اس درمیان مین رتبہ اقبال الدولہ کپتان کے
بیٹے کا زیادہ ہوا عمدہ جرنیلی کا پایا کاروبار سلطنت مین بھی دخل کامل ہوا
طبیعت بادشاہ کی اعتماد الدولہ کیطرف سے پھر گئی لوگون نے یہ
ذہن نشین کردیا کہ یہ شخص معتمد الدولہ سے درپردہ سازرکھتا ہی موقوف تو
نکیا لیکن ایسا مضیق مین ڈالا کہ وہ خود خانہ نشین ہوا اور تھوڑے عرصے
مین بیمار ہوکر دنیا سے گذرا اور لاش اسکی کربلای خداابخش مین دفن
ہوئی یہ بادشاہ بھی بڑا سیر چشم و دریا دل تھا سخاوت مین بی نظیر ہوا
چار روپیہ کا نوکر تک اس عہد سلطنت مین امیر ہوگیا مہینون تنخواہ نہین
پاتے تھے لیکن سب طرح فارغ البال تھے اپنے محلون کو اس بادشاہ
نے بڑے بڑے مرتبے اور رتبے بخشے یہ وثیقہ اور مشاہرہ مقرر کیا

| سلطان عالیہ دختر ملکہ زمانیان | تاج محل | مخدرہ علیا | نواب ملکہ زمانیان |
|---|---|---|---|
| سمہ | سمہ | سمہ | سمہ |

بادشاہ محل
سمہ لک

اس بادشاہ کے زمانے مین محلات مین قدسیہ محل کا اقتدار
بہت تھا اور اس محل نے بڑی سخاوت کی اور کروڑون روپیہ کا صرف
کیا سارا شہر اب تک اس محل کی سخاوت کا قائل مگر وہ بھی کسی

وجہ سے آخر کو ہیرا کھا کر قضا کر گئیں۔

اس زمانے مین منتظم الدولہ حکیم مہدی علیخان کانپور سے بلا کر عہدہ وزارت پر سرفراز ہوئے تھے نظم و نسق ملک سب اونکے متعلق قدر و منزلت کمال پیش نظر تھی حضور خطاب دیا یہ شخص منتظم اور معاملات مالی مین اپنا ثانی نرکھتا تھا اور اسکی بہت سے لوگ دشمن تھے خصوص قدیمی خائن و بے ایمان اس شخص سے جلتے تھے یہ نائب منتظم اور کفایت شعار تھا خوب ہی انصرام خدمت نیابت کیا اور اسی عہد مین حضرات کنبوہ بھی بڑے معزز و صاحب اقتدار تھے تاج الدین حسین کی لیاقت و مفاسدت مشہور ہی لیکن تاج الدین حسین اسی فکر مین رہتا تھا کہ حکیم مہدیعلیخان منتظم الدولہ کو اس عہدۂ وزارت سے گرا دے چنانچہ پادشاہ بیگم سے ملکر پادشاہ کی خاطر مین حکیم صاحب کیطرف سے شک ڈالا اور آخر کار وہ معتوب و معزول ہوئے جسکی تاریخ معزولی شیخ امام بخش ناسخ سے یہ ہے "

## قطعۂ تاریخ

| | |
|---|---|
| افتاد حکیم از مراتب | تاریخ بطرز نو رقم کن |
| از جای حکیم ہشت بر گیر | سہ مرتبہ نصف نصف کم کن |

مگر عزل اسکا باعث برہمی مزاج صاحب رزیڈنٹ ہوا خلاف رای انکے
یہ بات ظہور مین آئی تھی کچھ کچھ کدورت نے دلمین گھر کیا چونکہ بادشاہ
فہیم اور عقیل کمال تھا بڑہنے نہ دیا لیکن بادشاہ بیگم اور داروغہ حسین علیخان
اور امانی بیگم کی صلاح سے روشن الدولہ محمد حسین خان فرزند نواب
اشرف علیخان نے خلعت وزارت پایا یہ وزیر بھی سخی تھا اکثر عمارات
بھی اپنی وزارت مین تعمیر کرائین اب تک کوٹھی روشن الدولہ کی
معروف بہ قیصر پسند مشہور ہی تاریخ بنیاد یہ ہے
کیا رشک ارم ہے کوٹھی

اسعہد سلطنت مین راجہ درشن سنگہ راجہ بختاور سنگہ بڑے
ذی عزت وذی اختیار رہے تھے جنکی یادگار اسوقت مہاراجہ مانسنگہ
بہادر ہین وعلی ہذا راجہ درشن سنگہ غالب جنگ قوم کوری جسکا بیٹا
راجہ جی لال سنگہ بغاوت کے جرم مین بمقام لکھنو پھانسی دیا گیا
بڑا صاحب اختیار تھا اکثر عمارات شاہی زیر اہتمام راجہ بختاور سنگہ
تعمیر ہوئین نواب سعادت علیخان نے جو روپیہ جمع کیا تھا اور بعد
صرف نمازی الدین حیدر بادشاہ کے باقی رہ گیا وہ مع آمدنی ملک کے
اور خزانون مین جو کچھ روپیہ رکابی علاوہ سب اس بادشاہ نے صرف کیا
سوای سخاوت کے خیرات وبہت اور کرو فر کی بو دماغ مین سمائی تھی

مزاج نہایت برق تھا آخر مین بعض بعض نمک حراموں کی سازش
سے بادشاہ بیگم اور بادشاہ مین ملال ہوا اور نوبت بفساد بھی پونہچی
اسلیے بادشاہ بیگم نے مناجانکو لیکر الماس باغ مین استقامت اختیار کی
تخم عناد کا دلون مین پڑگیا روز بروز ترقی رہی کئی ہزار آدمی جنگاغ
بادشاہ بیگم نے نوکر رکھے نگاہداشت جاری کی اس بات پر بادشاہ نے
اور بھی مناجان کے فرزند ہونے سے انکار محض کیا اور آئندہ الغیب عند اللہ
اشتہار دیا کہ وہ فرزند میرا نہین ہی اور انواع انواع کے معاملے پیش
آئے کہ اوسی زمانے مین بادشاہ نے بھی فرح بخش چتر منزل چھوڑ کر
دلکشا مین رہنا اختیار کیا اسکے بعد بادشاہ نے اپنی عمر عیش و نشاط
مین بسر کی کوئی دشمن اندرونی و بیرونی بر سر عداوت نرہا صاحبان انگریز بھی
اس بادشاہ سے موافق رہے عیاش و شکار دوست بشدت تھا اگرچہ بحد
نازک مزاج تھا لیکن سخی و قدردان تھا اندوختہ سابق کروڑون روپیہ صرف مین
لایا اسکے عہد سلطنت مین خاص صفتین یہ تھین کہ اہل تجارت کو رفاہ ہوا آمدنی
بھی نہین رکی ملک بھی آباد رہا رعب سلطنت واب سیاست بھی بہت تھا اور
اچھے اچھے شعرا اس زمانے مین تھے اپنے مذہب امامیہ کا بہت پابند تھا بلکہ
اونھین کے عہد دولت سے اس مذہب نے لکھنو مین ترقی پکڑی نائب اول انھی حکیم مہدی
ہو کئی مرتبہ عہدہ وزارت سے سرفراز اور معزول ہوا بعد اسکے زمانہ روشن الدولہ کا حال کی

تعریف تھا اسی بادشاہ کے عہد مین کو ٹھی بائین تعمیر ہوئی اور
اچھی اچھی اور عمدہ عمدہ تعمیرات طیار ہوئین اور صاحب رزیڈنٹ سے
دوستی رہی گومتی کے کنارے بکثرت مکانات تعمیر ہوئے
اسوقت مین اکثر اوس سلطنت کے کارپرداز اور دیکھنے والے موجود
مین اور بہت کچھ بالتفصیل ہمکو معلوم ہی لیکن اختصار مین گنجایش تفصیل
نہین آخر مین نمکحرامون نے اس شاہ جم جاہ کے ساتھ دغا کی زہر دلوا دیا اور یہ
بات بھی زبان زد خلائق ہی کہ وہ مینا مہری نے زہر دیا اور بعضے کو یہ عقل رای
لگاتی ہین کہ بعض حرکات اسکی ناپسندیدہ صاحب رزیڈنٹ کو ہوئین اسواسطے اسکے
مار ڈالنے مین مشورہ ہوا العلم عند اللہ - ۴ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ ہجری مطابق ۱۸۳۷ء
جمعہ کے دن ۳۵ برس کے سن مین وفات پائی اپنی کربلا مین کہ اوسپار
دریای گومتی کے تعمیر کی تھی دفن ہوئے خلد منزل لقب مشہور ہے
مدت سلطنت ۱۰ برس ۵ یوم تاریخ وفات یہ ہی

رفت شاہ جہان سلیمان جاہ ۔۔۔ سوی جنت ز بارگاہ اودہ
ہاتفے گفت از سر افسوس ۔۔۔ بارم رفت پادشاہ اودہ
۱۲۵۳ھ

کرنیل جان لو صاحب بہادر رزیڈنٹ تھے معتمد الدولہ اعتماد الدولہ
ضیاء الملک سید فضل علیخان بہادر سیادت جنگ روشن الدولہ نصیر الملک
محمد حسین خان بہادر قائم جنگ رکن رکین خلافت مہمامدار عہد شاہ سلطنت

و شہریاری مقیم جنگ مدار المہام وزیر الملک منتظم الدولہ مہدی علیخان بہادر
جلاوت جنگ اقبال الدولہ بہادر پسر ظفر الدولہ بہادر معظم الملک کپتان
فتح علیخان ہیبت جنگ منشی الملوک فخر الدولہ دبیر الملک مہاراجہ
رتن سنگہ بہادر ہوشیار جنگ متخلص بزخمی ظہیر الدولہ مصلح الملک
غلام یحیی خان مقیم جنگ منیر الدولہ بہادر بعد انکے شرف الدولہ مظفر الملک
محمد ابراہیم خان بہادر مستقیم جنگ بعد انکے رکن رکین خلافت جہاندار
اعتضاد سلطنت شہریاری امیر الامرا مدار المہام وزیر الممالک روفاداریہ سالار
رستم ہند نواب امین الدولہ عمدۃ الملک امداد حسین خان بہادر ذوالفقار جنگ
یہ سب مدار المہام اور کار پرداز سلطنت تھے۔

## بیان حال ریاست رفیع الدین حیدر محمد مہدی مرزا کا فریدون بخت بہادر عرف مناجان

صاحب رزیڈنٹ خبر وفات کی پاتے ہی بارگاہ پادشاہ مین تشریف
لائے بنظر تقدم بالحفظ پہلے ہزار سپاہی مع توپون کے واسطے
حفاظت خزانہ وغیرہ کے مامور کیے اور ممانعت آمد و رفت دوست و
دشمن کی عمل مین آئی بعد اسکے محل مین جہان نصیر الدین حیدر بادشاہ
جان بلب تھے گئے دیکھا کہ حضرت نے حسرت سے آہ سرد کھینچکر
جان بحق تسلیم کی اسوقت ہاتھ کی فصد بھی کھولی گئی مگر اونمین کیا باقی تھا

اب سُنیے جب کرنیل جان لو صاحب بہادر کو یقین کامل ہوا کہ نصیر الدین حیدر
ناگاہ دنیا سے گذر گئے ایک کاغذ دست آویز کا مشتمل اس مضمون سے
کہ جو کچھ نواب گورنر جنرل بہادر ارشاد فرمائینگے ہم عہد نامۂ جدید پر
دستخط کر دینگے پاس نصیر الدولہ کے بھیجا مزین بدستخط منظوری
ہو کر آ گیا ابھی یہ گفتگو کرسی نشین مطلب نہوئی تھی کہ بادشاہ بیگم مع مناجان
کے کہ بفاصلۂ چہار میل بارگاہ سلطانی سے الماس باغ مین تھین باوجود
حکم ممانعت رزیڈنٹ بہادر کے با فوج کثیر بعد گذرنے تین پہر رات کے
دردولت پر آ پہونچین کرنیل جان لو صاحب بہادر کہ مہیا کرنے سامان
جلوس مین سرگرم تھے یہ خبر سنتے ہی سخت متحیر ہوئے اور کپتان جمس پاٹن
کو اجازت دی کہ محافظان دروازہ بیرونی کو حکم محکم دو کہ کوئی یہان بدون
اجازت نہ آنے پائے اور روشن الدولہ بہادر سے تاکید فرمائی کہ تم
سد باب مقابلۂ بادشاہ بیگم کا کرو اور لفٹنٹ پاکسن صاحب کو یہ فرمایا کہ تم جلد جلد
سپاہ انگریزی منڈیانوین سے لاؤ کپتان جمس پاٹن صاحب بہادر حسب الحکم
دروازہ پر آئے اور بگفتگوے ملایم مقابل سے فہمایش کرنے لگے
کہ یہ حرکت تمھاری باعث بربادی مطلب ہوگی یہ کب سنتے تھے جو اسکے
گھوڑون پر سوار تھے بزور فیل دروازہ توڑ کر مکان سلطانی مین اپنے
گھر کی طرح در آئے بلکہ کپتان جمس صاحب اس چپقلش مین مجروح بھی ہوئے مگر

بتیغ زبان وہ بھی کام کرتے رہے گفتگو سے نہ باز آئے کہ دیکھو انجام اس
آغاز کا بہت برا پیش آئیگا بھر کیعث یہ تو گرفتار ہوئے سپاہی پادشاہ بیگم
کے یک قلم شمشیر برہنہ کھینچے ہوئے اور توڑے بندوقوں کے شیر اندرون
حجرے کے پہونچے کرنیل جان لو صاحب کو اپنے قبضے مین کیا اور
نصیر الدولہ اور امجد علیخان اونکا فرزند اور عظیم اللہ خان اور رفیق الدولہ
اور روشن الدولہ وغیرہ ایک مکان مین نظر بند تھے اور یہ لوگ ایوان شاہی مین
ہر جانب پھرتے تھے اور ہتیاروں کو بدلتے تھے قریب دو ہزار آدمی
کے تھے اس شور و غل سے پادشاہ بیگم نے مناجان کو لاکر تخت سلطنت پر
بٹھا دیا اب ہر طرف ناچ رنگ کا ہنگامہ شروع ہو گیا سلامی توپوں کی
حسب قاعدہ ظہور مین آئی اوس جگہ مشعلین بیشمار روشن تھین کشمکش
حد سے زیادہ تھی کرنیل جان لو صاحب بہادر پر ایک یورش کا ہنگامہ
نازل تھا یہ کہتے تھے کہ تم حسب آئین و ضابطہ کے اپنی زبان سے
مناجان کی سلطنت کا اقرار کرو مگر انکی زبان سے کب یہ کلمہ نکلتا تھا
ہرگز نہ کہا خداوند کریم نے اوسوقت صاحب بہادر کے حال پر رحم فرمایا
اور لوگوں نے اکثر حسب الحکم پادشاہ بیگم کے اس گروہ کے پنجہ سے نجات
دلوائی اور سب مقید رہے اب جان لو صاحب بہادر جو اونکے ہاتھوں میں تھے
حاضر ہوئے پادشاہ بیگم سے سوال و جواب شروع ہوا کہنے لگے صاحب بہادر کے

یہ سمجھے کہ اگر سرمو ہمارے کہنے سے انکار کرو گی تو انجام نہایت برا
دیکھو گی اپنے ہاتھون آپ گرفتار غضب ہو یہ باتین تھین کہ فوج
انگریزی طلب فرمودہ صاحب ممدوح کی منڈیانون سے آ پہونچی ہنگامہ حرب
و ضرب گرم ہوا مگنس صاحب کہ سرکار شاہی کا ملازم تھا اسکے رسالے کی
توپین واسطے سلامی مبارکباد کے آئی تھین برعکس مثل آمین توپچیان چھر
لال بارہ دری پر پڑنی شروع ہوئی۔ بہت آدمی پادشاہ بیگم کیطرف کے مجروح
اور مارے گئے اور تین سپاہی انگریزی زخمی ہوئے ظہیر الدولہ
غلام یحیی خان نے کہ اون دنون مین مقید تھے کیا جرات کی کہ اس معرکے
مین کوٹھی فرح بخش کی پشت پر سے لب دریا کود پڑے پاون مین چوٹ آئی
کشتی مین جا چھپے پادشاہ بیگم مع منا جان کہ ۱۴ برس کا سن اسوقت مین تھا
مع امام بخش کارندہ کے گرفتار ہوئین جو ذلت کہ انکے پیش آئی زبان پر
لاتے ہوئے غیرت اور شرم آتی ہی آخر کار ریلی گارڈ مین اگرچہ بحفاظت تمام مقید ہوئین
جسقدر اس پادشاہ نصیر الدین حیدر کے جوان مرنے اور حسرت سے
جان دینے کا بعد افسوس چرچا ہی اوسیقدر منا جان کی بدنصیبی کا اور
پادشاہ بیگم کی کم قسمتی کا بیان زبان خلائق پر ہی یعنی یہ فرزند پادشاہ بیگم کا
بخطاب نجم الدین حیدر محمد مہدی مرزا فریدون بخت بہادر جو خاص شاہزادہ
ہوتا ہی معروف تھا اور حیات پادشاہ کے بے لحاظ مراتب اور بیباکان

محمد علی شاه



رہتا تھا اوبوجہ اس بات کے کہ پادشاہ کو انسے ملال کمال حاصل تھا پادشاہ بیگم

کے ساتھ تھا وہ پرورش کرتی تھین پادشاہ نے طیش مین آکر

مغضوب اور عاق کرکے باجرای اشتہار فرزندی سے خارج کردیا اوسکی

سلطنت کے حق مین یہ وجہ سرکار کو چشم پوشی کی ہوئی یہ انقلاب بہت

بڑا ہوا فقط

## بیان حال ریاست نصیر الدولہ محمد علی بادشاہ

ابو الفتح معین الدین سلطان زمان نوشیروان عادل محمد علی شاہ پادشاہ عم عیتقی

پادشاہ مغفور یعنی فرزند نواب سعادت علیخان جنت آرامگاہ کو صاحب کلان بہادر

نے بعد دستخط کاغذ مذکورہ کے نظر بندی سے نکال کر تشفی تمام اپنے

پاس بٹھایا اور حکم دیا کہ وہ مکان تخت گاہ شاہی جلد صاف و آراستہ ہو

معاً کارپردازان نے لاشیں تو دریا مین پھینکدین اور مجروحون کو وہانسے

دور کرکے ایوان شاہی کو پاک کیا ۶ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ ہجری کو پہر دن

چڑھے صاحب کلان بہادر نے روبرو افسران فوج کے محمد علی شاہ کو

۶۰ برس کے سن مین تخت نشین سلطنت فرمایا اور تاج شاہی حسب آئین

سر پر رکھکر پادشاہ اودھ اپنی زبان سے کہا تو مین مبارکبادی حسب ضابطہ

سرہوئین نذرین گذرین خلعت ہوئے خاص و عام کو طمانیت حاصل ہوئی

تاریخ تخت نشینی یہ ہے

شہ عرش تمکین فلک اقتدار — چو گردید پشت و پناہ اودھ

سروش از سر دولت آواز داد — محمد علی گشتہ شاہ اودھ ١٢٥٣ھ

اور سکہ بھی اس پادشاہ کا تاریخی ہی

بجود و کرم سکہ زد در جہان — محمد علی پادشاہ زمان ١٢٥٣ھ

جس وقت دربار برخاست ہوا محمد علی پادشاہ کرنیل جان لو صاحب بہادر کو
خلوت مین لائے اور فرمایا کہ رہنا پادشاہ بیگم کا شہر لکھنؤ مین مناسب اور زیبا
نہیں ہے کس واسطے کہ یہ عورت بڑی فتنہ انگیز ہی ہر دم اسکی ذات سے
فساد تازہ ایجاد ہوگا صاحب بہادر نے کہنا اونکا قبول کیا ٢١ تاریخ کو
آدھی رات کے وقت بحراست سوار و پیادہ ہای انگریزی کانپور روانہ
ہوئین وہان ایک مکان مین بکمال حفاظت نظر بند ہین اور وہان سے
قلعہ چنار گڈہ مین پونہچین دو ہزار چار سو روپیہ ماہانہ واسطے صرف کے خزانہ پادشاہی سے مقرر ہوا
١٦ محرم سنہ ١٢٦٢ ہجری مطابق سنہ ١٨٤٦ع کو مناجان نے انتقال کیا
وہین دفن ہوئے (زہستی رفت) تاریخ وفات کی ہی دو لڑکی ایک لڑکا
چھوڑ گئے ٣ صفر سنہ ١٢٦٣ ہجری پنجشنبہ کے دن پادشاہ بیگم نے اس
جہان فانی سے کوچ کیا (آن قضا کرد آہ) تاریخ وفات ہی
اس پادشاہ نے خوب سر انجام جزو کل امور سلطنت کا کیا اس وجہ سے کہ
تربیت یافتہ نواب سعادت علیخان کے تھے سن اور کار آزمودہ تھے

برادر پروری اور رفقا نوازی نے رونق بائی انتظام افزائی ملک کا بھی بحسن الوجوہ
ظہور مین آیا آمدنی کا بھی انتظام ہوا زر کثیر اپنے عہد سلطنت مین جمع کیا
اور باوجود ضعف پیری اور کثرت امراض کے ہر جزو کل کار سلطنت کا خود
کرتے تھے اس بادشاہ کے وقت مین صورت برہمی کار سلطنت بہ بدل
بخوش اسلوبی ہوئی لیکن باوجود اس بیدار مغزی کے نمک حرامون نے
وہ کام کیا کہ باہم متفق ہو کر تنخواہ رسالون اور پلٹنون کی دو دو اور تین تین
جگہ وصول کی اوسی رسالہ اور پلٹن کی تنخواہ جمع مخرج سلطانپور مین مندرج اوسی رسالے
پلٹن کی تنخواہ کاغذ خیرآباد مین اور اوسی کی تنخواہ علاقہ گونڈہ بہرایچ مین
اور اوسی کی تنخواہ بخشیگری لکھنؤ مین پڑتی تھی لاکھون کا تغلب ہوتا تھا
سچ ہے جب کارپرداز یہ کام کرین بادشاہ کیا کرے خلاصہ یہ بادشاہ
بہت نیک نیت تھا کسی کام خیر کے انتظام دینی مین بند تھا لاکھون روپے
درگاہ حضرت عباس کی ترمیم مین صرف کیے اور درستی نہر اور روضہ
حضرت حر کی طیاری مین خرچ کیے اور ہزار روپیہ مہینا اون ہندی لوگون
کے واسطے مقرر کیا کہ جو کربلا مین زیارت کو جاتے ہین اور متوسلونکو
بواسطہ صدریہ وثیقہ بطور وظیفہ مقرر کیا

مصاحبان محل نواب ملکہ جہان مخدرات زمانہ — شہزادے اور اونکے محل

سلطان آرا بیگم

ربے اسم [illegible] — ملے اسم [illegible]

شرف الدوله محمد ابراہیم خان —— عظیم اللہ خان ——

۱۱۱ع۵      ۱۱۱ع ب / ۱۰ ا ر زبانی

شہزادیان —— متفرقات ——

الـــــ      ۷ ا سم / نہ ا سم      ـلـعـ

ایضاً نوٹ واسطے امام باڑہ حسین آباد ——

مدعــــ

اور بہت سا زر و زیور اور مکانات اپنے عزیزون کو تقسیم کیے یعنی ہر ایک کو صاحب املاک اور اہل دول کر دیا محتاج دوسرے کا نرکھا کرم پروری انکی مشہور ہی کنبہ ہون سے کمال نفرت تھی روشن الدولہ کو نیابت نصیب نہوئی اسی تمنا مین مر گئے کیا وجہ کہ سبحان علیخان دوست انکے کارپرداز تھے منتظم الدولہ کو فرخ آباد سے بلا کر اپنا وزیر بنایا اور منور الدولہ کو اونکی جرنیلی دی صاحبان صدر انکی روش نیک سے بہت راضی اور مخطوظ تھے ہر خواہش صدر مین مقبول ہوتی تھی عمارت حسین آباد وغیرہ جو کچھ تعمیر کروائی عمدہ یادگار ہی فصل مکان مین مفصل بیان ہوگا مگر موت نے نچھوڑا آپ محرق نے ۶۸ برس کے عمر مین کام تمام کیا ۵ ربیع الثانی ۱۲۵۸ ہجری روز سہ شنبہ کو وقت رات کے انتقال فرمایا اور حسین آباد مین دفن ہوے فردوس منزل کہلاے۔

امجد علی شاہ



کرنیل جان لوصاحب بہادر اور کرنیل کالفیلڈ صاحب بہادر ریذیڈنٹ تھے نائب بے وشن الدولہ اور منتظم الدولہ اور ظہیر الدولہ اور منور الدولہ اور پھر سیدت شرف الدولہ محمد ابراہیم خان اور انکے عہد مین فوج ۳۲ ہزار پیادہ اور تین ہزار سات سو سوار اور ملک کی آمدنی ایک کرور پچاس لاکھ روپے کی تھی تاریخ وفات رفت شاہ اودہ بملک قدس ۱۲۵۸ھ لیکن کبرسنی کی وجہ سے حواس مین خلل تھا سارے کاروبار صاحب ریذیڈنٹ کے مشورے سے طے ہوتے تھے اور انکی سلطنت مین کوئی بات جدید نہین ہوئی۔

## بیان حال ریاست امجد علی بادشاہ

ابو المظفر مصلح الدین ثریا جاہ سلطان عادل خاقان زمان محمد امجد علی بادشاہ ۳۴ برس ۶ مہینے ۲۰ دن کے تھے ۵۔ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ ہجری منگل کے دن تخت نشین ہوئے رسمین معمولی عمل مین آئین تاریخ جلوس کی رحمت الفت اسی بخشی نے کہی۔

شاہ فلک مرتبہ امجد علی — مہر سما شرف انجم سپاہ
داددہ عدل چو نوشیروان — ثانی دارا و سکندر بجاہ
ناصر دین دافع کفر و ظلام — دادرس عالم و ظل الٰہ
پنجم از ماہ ربیع دوم — ساعت فرخندہ بوقت پگاہ

ساختہ بر تخت خلافت جلوس — ازمدد سبط رسالت پناہ
ساختہ الفت پی تاریخ فکر — تا بودش بار دران بارگاہ
مصرعۂ برجستہ ز ہاتف شنید — تاج دہ اورنگ مبارک بشاہ
۱۲۵۸ھ

اور سکہ اس بادشاہ کا یہ جاری تھا

در جہان زد سکۂ شاہی بتائید الہٰ — ظل حق امجد علی شاہ زمن عالم پناہ

یہ بادشاہ بکمال دیندار خداپرست اپنے مذہب کی ترقی بہت مدنظر تھی عدالت کا کام سلطان العلما اور سید العلما کو سونپا اور انکے عہد مین سلطان العلما کا کمال دور دورہ تھا اہل ہنود اور سنت جماعت کے عروج پر حسد کرتے تھے کتنے ہندو مسلمان اور کتنے سُنی شیعہ ہوگئے بازار اس امر کا گرم رہا زر زکوۃ شاہی ہر برس سلطان العلما کو سرکار شاہی سے ملتا تھا وہ اپنی راے پر جسکو چاہتے تھے تقسیم کرتے تھے مخنث یعنی ہیجڑے نکار م نگر مین اور جہان جہان اس شہر مین بستے تھے انکے حکم سے نکالے گئے انکے انتقال کے بعد بیچارے خانمان برباد آباد ہوئے اور مدرسہ شاہی کی بنیاد اور صدر خانی گنج (?) انکی سلطنت مین ہوئی پل آہنی بنوایا شرف الدولہ کہ عہد ولیعہدی مین نظر ولی سے گرے تھے اونکو بعد تین مہینے کے عہدہ وزارت سے موقوف کیا اور امین الدولہ امداد حسین خان کو خلعت نیابت دیا اور بخشیگری کے عہدے پر اکبر علیخان نواب امیر الدولہ

کے بیٹے کو مامور کیا اور دیوانی مشیر الدولہ بہادر کی جلی آتی تھی وہی بدستور
دہی اور سید عنایت علیخان معین الدولہ جو پادشاہ کے ماموں تھے اونکو
ملک کی نظامت اور امور سلطنت کے مشورے کے لیے مقرر کیا بعد وفات
اکبر علیخان قطب الدین حسن خان کو پیشدستی وزارت کی ملی اور بعد انکے
معین الدولہ کو یہ عہدہ نصیب ہوا لیکن امین الدولہ اور معین الدولہ میں صورت
ناموافقت کی ظہور مین آئی لوگون نے بادشاہ کا دل امین الدولہ کی
طرف سے باتون مین پھیر دیا کدورت نے یہ دن دکھایا کہ امین الدولہ
ناچار ہوکر مستعفی ہوے اور گھر بیٹھے مگر معین الدولہ کو عہدۂ وزارت
نصیب ہوا منور الدولہ بہادر کانپور مین تھے بلا آئے خلعت وزارت کا
اونکو دیا گیا کئی مہینے معین الدولہ کاروبار سلطنت مین مصروف رہے
مگر چاہ کندہ را چاہ درپیش یہ بھی بادشاہ کی نظروں سے گرے وہمین
میل آیا یہ بھی گھر بیٹھے اب منور الدولہ تنہا کاروبار سلطنت کا کرتے رہے
چونکہ آرام طلب تھے مختین رات دن کی گوارا نہوئین عہدے سے
معزول ہوئے پھر امین الدولہ بہادر اپنے عہدۂ وزارت پر بدستور
قائم ہوئے نواب حامد علیخان اعتماد الدولہ کے خویش کو سررشتہ
پیشدستی کا ہوا انکے بعد سعید الدولہ علی محمد خان فرزند میر بندہ علی کے
پیشدست ہوئے سعید الدولہ عجب مرد چالاک تھا ایکدن جلسہ بار مین

جملہ وکلای تعلقداران وزمینداران کو طلب کرکے بہت بجوفی اور استمالت بیان کی کہ جس جس کو ضرورت روپئی کی بصیغہ اقتادی وغیرہ درپیش ہووے وہ معروضے اوپنے مہری ودستخطی وچہلکے لکھدین اون مفت خورونکا گیا تھا حسب لیاقت اپنی اکثرون نے درخواستین لکھکر حوالہ کین اس شخص کی مکاریاں دیکھیا چاہیے کہ وہ سب کو اغذ سرکار شاہی مین پیش کرکے زر کثیر حاصل کیا اور اپنے تصرف مین لایا یہ بیچارے سب اوس سے محروم رہے سبحان اللہ کیا گھر عالیشان تھا کہ ہزارون محتاج نواب وزیر بن گئے کوٹیان باری مڈھاری وغیرہ راجہ اور دولہ اور بہادر ہو گئے سچ ہی یہ شہر لکھنو چراغ شبستان ہند کا تھا اور جو سامان امارت یہان اس آخری وقت مین تھا وہ کسی ریاست مین نہو گا ایک یہ حال بھی قابل ذکر ہی کہ ۱۲۶۳ ہجری کو انھین کے عہد سلطنت مین نواب صمصام الدولہ بہادر فرخ آباد کے نواب لکھنو مین واسطے ملاقات بادشاہ ممدوح کے آئے تھے جن باغ عین جو کہ نہایت عمدہ اور باغ پر فضا تھا اوسمین حسب الحکم شاہی فروکش ہوئے بلکہ وہ باغ خاص اسیواسطے مقرر تھا کہ جب رئیس اور امیر جلیل القدر کی خاندان شاہی مین سے کسی شادی ہوتی تھی اوسکو یہ باغ عنایت ہوتا تھا چنانچہ شادی مرزا نصیر الدین حیدر بادشاہ کی اور مرزا عالیجاہ اور مرزا والا جاہ پسران دبیر الدولہ مرزا حیدر نیشاپوری کی بھی اوسمین سرانجام پذیر ہوئی تھی

اکثر اسیطرح عامہ کو عنایت ہوتا تھا اور رئیس تازہ وارد بھی اوسمین اوتارا
جاتا تھا چنانچہ گارن صاحب بہادر سوداگر جاگیردار کوڑیا کاس گنج کے بھی
زمانہ نصیر الدین حیدر مین وارد شہر ہوئے اونکو بھی بسبب اعزاز و اقتدار
کے بذریعہ پرچہ پایم میجر جان لو صاحب بہادر کے یہ باغ عنایت ہوا تھا
اسی باغ مین صاحب موصوف نے لاکھہ روپی صرف کر کے محرم مین
تعزیہ داری بڑی دھوم سے کی تھی وجہ اس تعزیہ داری کی یہ ہی کہ انکی
بی بی مسلمان تھی اوسکو کمال چاہتے تھے لہذا یہ خرچ گوارا کیا تھا
اور وہ بی بی بنت مرزا سلیمان شکوہ بہادر پسر محمد شاہ بادشاہ کی تھی اور
سبب اس بی بی کا انکے پاس آنے کا یہ ہوا کہ مرزا سلیمان شکوہ شاہزادہ جلیل
تھے زمانہ بادشاہ غازی الدین حیدر خلد مکان مین یہان تشریف لائے
تھے بادشاہ نے کمال اونکا اعزاز کیا اور مکان رہنے کو اونکے واسطے
متصل بیلی گارد تا تکیہ جھم سر شرک لب دریا کئی لاکھ روپیہ صرف کر کے
بنوادیا تھا دس ہزار روپیہ ماہواری اور دو ہزار روپیہ میوہ خوری کے لیے
مقرر کر دیا تھا بعد دلجوئی اور خاطر داری کے اپنے فرزند ولیعہد نصیر الدین حیدر
کی شادی کا اونکی لڑکی کے ساتھ پیغام دیا چنانچہ بعد شرائط مرزا سلیمان شکوہ
نے وہ شادی منظور کی چنانچہ بڑی بیٹی سلیمان شکوہ کی عقد نصیر الدین حیدر
مین آئی اس شادی ہونے سے غازی الدین حیدر بادشاہ نے

پچیس لاکھ روپیہ کے نقد و جنس سے اونکے ساتھ سلوک کیا تھا بعد
چند روز کے نواب معتمد الدولہ وزیر بادشاہ نے دوسری بیٹی کے واسطے
اپنے فرزند کے ساتھ پیام شادی کا دیا مرزا سلیمان شکوہ بسبب طمع دولت
کے راضی ہو گئے شادی قرار پا گئی یہ خبر بادشاہ غازی الدین حیدر کو پہونچی
آگ ہو گئے اور دونوں سے اسقدر آزردہ ہوئے کہ جسکی شرح حد سے باہر
ہی یہانتک کہ مرزا سلیمان شکوہ کو اوسی دن شہر سے نکال دیا اور مکان
بھی اونکا کھدوا ڈالا بار بار یہ فرماتے تھے کہ ہم اس شاہزادے کو لالچی
ایسا نجانتے تھے کہ مجکو بیٹی دیکر میرے نوکر کو اپنی بیٹی دیگا
سلیمان شکوہ جو یہانسے نکالے گئے قریب شاہجہان آباد کے پہونچے
اوس زمانے مین اکبر شاہ ثانی کا دور تھا اونھون نے جو یہ حال سنا
حکم دیا کہ ایسے شخص کا یہان آنا مناسب نہین چنانچہ سلیمان شکوہ وہان سے
پھر کر کوڑیا کاس گنج مین آئے طرح اقامت کی ڈالی گارڈن صاحب موصوف
نہایت دولتمند تھے اسکے دام طمع مین آگر شاہزادہ موصوف نے شادی
اوس لڑکی کی اوس صاحب کے ساتھ کر دی اس عرصے مین غازی الدین حیدر
بادشاہ نے قضا کی اور سلیمان شکوہ نے وفات پائی یہان نصیر الدین حیدر
بادشاہ کو بھی اوس بی بی کے یہان آنے کی کمال تمنا تھی بذریعے
رزیڈنٹ بہادر بادشاہ نے اجازت آنے کی دی صاحب موصوف

۱۲۴۲ہجری کو مع اوس بی بی کے لکھنو مین تشریف لائے تھے اور جنگ بہادر
حسن باغ مین اوترے اور تعزیہ داری کی آنحا صل اوس باغ مین صمصام
رونق افروز ہوئے اور دوسرے دن بادشاہ کی ملاقات کو گئے بطریق
تحفہ ایک تھالی جوڑ مع ابخورہ سنگ یشب کے مرصع کار مطلا بہت عمدہ
و بہتر ہے گئے تھے اور اپنے نزدیک وہ سکو نایاب سمجھتے تھے
بادشاہ کو دیا بادشاہ نے بھی بپاس خاطر اونکے بہت خوش اور محظوظ ہو کر
اوسکو قبول کیا اور تعریفین بہت زبان مبارک پر آئین یہان دستور تھا
کہ جس رئیس سے بادشاہ ملاقات کرتے تھے روز اول باہم رسم تحفہ دہی
ادا ہوتے تھے عطردان اور کشتی وغیرہ موافق رسم کے دی جاتی تھین
دوسرے روز سامان دعوت کا ہوتا تھا اسمین خواہ انگریز ہو خواہ ہندوستانی
چنانچہ نواب مسبوق الذکر کی تین دعوتین قرار پائین اور دوسرے ہی
دن سے مقرر ہوئین اور یہان کی شان و شوکت اور انداز دعوت چاہیے
یاد رکھنے کا یہ تھا کہ ایک عالیشان مکان مین کہ وہ سب طرح شیشہ آلات وغیرہ
سے آراستہ ہوتا تھا اوسمین تیس ۳۰ گز کا لانبا اور بارہ گز کا چوڑا میز بچھتا
تھا اور اسکے گرد ایک سو پندرہ کرسی بچھتی تھین اوپر بادشاہ اور اعزہ
بادشاہ اور کارپرداز ممتاز اور رزیڈنٹ بہادر مع صاحبان عالیشان
جلوہ افروز ہوتے تھے قصہ کوتاہ اوسی میز پر روز دعوت اول تمام

برتن مع چنگیر و گلدان و حوض و فوارہ وغیرہ سب سنگ یشب کے مرصع کار
مطلا جواہر نگار چنے اور کھانون کا کیا وصف بیان ہو کہ بادشاہی خاصہ
تھا وہ نواب اور سب حکام عالیشان یہ سامان دیکھکر متحیر تھے دوسرے دن
دوسرے مکان مین سامان ضیافت کا مہیا ہوا اسمین بھی اسیقدر میز پر
جملہ برتن اوسی انداز سے جواہر نگار سنگ یشب کے صورت مین اور طرح کے
لگائے گئے تیسرے دن بھی اسیقدر سامان اوتنی ہی بڑی میز پر سب
برتن باہم مقدار برابر اور روز دون سے نہایت تحفہ عمدہ خوبصورت باریک
کار جواہر نگار سنگ یشب کے مہیا تھے نواب ممدوح یہ سامان دیکھکر
اپنے دلمین سخت محجوب اور شرمندہ ہوتے تھے شان خدا کو یاد فرماتے
تھے حاصل کلام بعد برخاست چاے پانی اور کھانے اور بعد رخصت
نواب ممدوح کے امجد علی شاہ بادشاہ نے مجد الدولہ بہادر مہتمم خزانہ اور
کوشہجات سے بوجہ اس حسن انتظام کے نہایت خوش اور محظوظ ہوے
اور زبان مبارک سے بہت تعریفین کین خلعت گرانبہا سے خلع فرمایا
اوسوقت مجد الدولہ بہادر نے دست بستہ ہوکر عرض کیا کہ غلام اقبال
بادشاہ سے تیس ۳۰ دن تک کا اقرار کرتا ہے کہ اگر حکم ہو تو اسیطرح کے
ہر روز سنگ یشب کے برتن طرح طرح کے صورت مین نئے لگایا کرے
اس عرض و بیان پر دوسرا خلعت اور نئے رتبہ سے کہین زیادہ جلوہ دیے

دیانت و امانت مین عنایت ہوا یہ فضول فیاضی ہمیشہ سے اس سرکار مین
رہی کچہ ہی نہین ہی — اور عوام نے اسکو قدردانی اور واہ واہ سے کہ فقر یہ
گھر لوٹ کہایا کارخانہ خدا ہین کہ اب وہین امجد علی شاہ کے فرزند
واجد علی شاہ بادشاہ کو ایک پشت کے بعد شاید ایک پھول دان بھی
سنگ یشب کا میسر نہو گا مگر ہان اون یشب خانون مین عوض اون ظروف
یشب کے اینٹون کا ڈہیر البتہ نظر آتا ہی اس انقلاب اور زوال پر سخت حیرت کا
مقام ہی فقط — این زمانہ امجد علی شاہ مین وزیر الدولہ مدار الملک مرزا
محمد حیدر علیخان بہادر فیروز جنگ یعنی والد اعلی جاہ وزالاجاہ کا بڑا اقتدار رہا
جو اس عمل انگریزی مین قضا کر گئے مشہور بلقب مرزا حیدر تھے اور انکے
لڑکو بھکا ذکر اوپر آ چکا ہی عمدہ رئیس تھے —

الغرض امجد علی بادشاہ کا حال کیا لکھا جاوے اس بادشاہ کے عہد دولت مین
کوئی جدید بات نہین ہوئی اور مجتہد کا زمانہ رہا اور بخل اس بادشاہ کا
یادگار ہی ۱۲۶۳ ہجری مین ۲۶ ماہ صفر یوم شنبہ پانچ بجے ۴۸ برس
پانچ مہینے ۱۱ دن کے سن مین بعارضہ سرطان آٹھ دن کے درمیان مین
جہان فانی سے گذرے اور میدہ خان رسالدار کی چہاونی مین دفن
ہوئے جنت مکان لقب پایا تاریخ وفات کی منشی مظفر علی اسیر
اوستاد مؤلف سے یہ ہی

| | |
|---|---|
| شاہ عادل نیک خصلت نیک سیر نیک خو | ترک دنیا کرده و لها بامان شد قلق |
| از سروش غیب پرسیدم چو تاریخ وفات | گفت شد امجد علی جنت مکان اصل بحق |

۱۲۶۳ھ

لاکھ روپیہ اونکے مقبرے کی تعمیر اور امام باڑے کے خرچ کے واسطے تجویز کیے اپنے عہد میں نوٹ کے کاغذات تفصیل سے مقرر کیے گئے۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| دفعہ اول نوٹ کے کاغذ | نواب مخدومہ محل ملکہ آفاق شوہر وغیرہ | مرزا جواد علی مرزا بیگ | نواب امین الدولہ |
| [illegible] | [illegible] | [illegible] | [illegible] |
| معین الدولہ | نواب اختر بہو | نواب تاجدار بہو | جھوٹی بیگم |
| [illegible] | [illegible] | [illegible] | [illegible] |
| مہر شمس الدولہ | حسین علی خان | دفعہ دوم نوٹ کے کاغذ وثیقہ | نواب تاج آرا بیگم |
| [illegible] | [illegible] | لاکھ | [illegible] |
| جناب عالیہ | نواب مخدومہ محل | دفعہ سوم نوٹ کے کاغذ جو ڈپٹی صاحب کے عہد میں لیے گئے | نواب سکندر جہاں اور متعلق |
| [illegible] | [illegible] | لکھ | لکھ |

## بیان ریاست واجد علی شاہ

۲۶ صفر ۱۲۶۳ہجری مطابق ۱۸۴۷ء کو اورنگ نشین خلافت ہوئے تاریخ جلوس

| | |
|---|---|
| شہ عدل پرور سلیمان حشم | فریدون رتبہ تخت شاہی نمود |
| زینت ملک بین جمعہ شد لبند | ملک رونق تاج شاہی فزود |

واجد علی شاہ



ابتدای خلافت مین نواب امین الدولہ وزارت پر ممتاز تھے لیکن عہد ولیعہدی سے بادشاہ کا مزاج اونسے درپردہ مکدر تھا اسوجہ سے عہد تخت نشینی سے خیال تھا کہ کسی دوسرے کو خلعت وزارت یا جاوے اس بادشاہ کی عہد حکومت مین کئی باتین ظہور ہوئین جواب تک یاد ہین نواب امین الدولہ کا سانحہ مولوی امیر علی کا شہید ہونا ہنومان گڈھی کا دنگہ اور فساد عیاشی غفلت نالائق اہلکارون کا دخل تعمیر قیصر باغ امین الدولہ کا عزلکہ بہت مشہور ہے کہ بسواری بگھی دردولت پر آتے تھے وقت صبح شیخ فضل علی احمد خان غلام غوث خان وغیرہ پانچ جوان بدمعاش شرک گولہ گنج مین زیر دیوار امام باڑہ نواب ملکہ زمانیان ج وجہ نصیر الدین حیدر بادشاہ بگھی سے نواب کی لپٹ گئے اور اونمین سے دو شخصون نے چالاکی امین الدولہ کو بگھی سے اوتار کر زمین پر گرادیا اور چھری سینہ پر رکھدی اور تین آدمی قرابینین لیے ہوئے اونکے سر پر کھڑے تھے اور یہ کہتے تھے کہ جو کوئی پاس آئیگا ہم نواب کا کام تمام کر دینگے اسوجہ سے کوئی دست اندازی نکر سکتا تھا اس عرصے مین یہ خبر عام ہوئی افسران فوج شاہی مع اراکین موقع واردات پر پہونچے بڑے صاحب بہادر اور چھوٹے صاحب بہادر وغیرہ وہان آئے سوای تالیف قلوب اور طمع زر کے کچھ بن نہ آئی ۷۵ ہزار روپیہ پر

صاحب کلان بہادر نے اونکو رخصتی کیا ذمہ دار ٹھہرے منگوا دیا مگر
اصل مطلب اونکا معلوم نہوا دام طمع مین آ گئے نواب مجروح کو رہا کیا
کہ امین اباد گئے تاریخ اوسکی تدبیر الدولہ منشی مظفر علی اسیر سے یہ ہی
بوقت کینۂ اوباشِ چند با نواب     زمانہ گفت کہ یارب ذوالجلال بخیر
اسیر سال وقوع فساد کرد رقم     رسیدہ بود بلای ولی تمال بخیر
۱۲۶۳ھ
چنانچہ وہ سب روپیہ ہاتھیون پر رکھکر پانچون بدمعاش سوار ہوے اور
صاحب کلان بہادر کے ساتھ بیلی گارد مین گئے بحکمت عملی ہتھیار
اونسے لیے گئے گرفتار ہوئے چہ تھے دن چار بجے کے بعد
اونکو اپنی کوٹھی سے نکال دیا دروازے پر ازدحام تھا اور سپاہی
سرکار شاہی جوق جوق جمع تھے جیسے وہ باہر نکلے گرفتار ہوے
مارے گئے قید خانہ دیکھا اور نواب مجروح کا علاج ڈاکٹر لوکن صاحب
نے اس حسن تدبیر سے فرمایا کہ ۱۴ دن مین غسل صحت کیا دربار شاہی
مین آئے نذر دی خلعت معمولی سے سرفراز ہوے خوش خوش گھر
گئے دوسرے دن چوبدار سلطانی نے زبانی انجم الدولہ کے حکم پہنچایا
کہ آپ عہدے سے معزول ہوے سوار نہو جیے گا اور انتظام اور
کاروبار وزارت پر بدستور عطائے خلعت نواب نقی علیخان چھپا منسٹر
بادشاہ کے مامور ہوئے بعد تین مہینے کے خلعت وزارت پایا

جو کہ یہ بادشاہ نوجوانی مین بادشاہ ہوا اور وائین مقوی کھائین تقاضائے
شباب سے طبیعت مائل عیش ہوئی رفتہ رفتہ صحبت گانے بجانے
اور طوائف اور میراثی کی گرم ہوئی انجام افراط و تفریط عیش و عشرت کا
یہ ہوا کہ سوای محلات ممتاز کے کئی بیگمین اور بیبیان زمرۂ متعہ اور نکاح
مین در آئین اونکے سوا طوائف گانے بجانے کی خدمت پر مامور
تھین وہ بوجہ ایجاد پسندی اور اختراعات شاہی کے بلقب پریان اور
پریون کے نام زد ہوئین ایک عالیشان عمارت بناکے موسوم بقیصر باغ
کی جسمین سب بیگمات بڑے بڑے سامان اور ٹھاٹھ سے بعیش و
عشرت رہتی تھین ہر ایک بیگم کا انوکھا امرز الاخطاب اور لقب ہوش ربا
اور نام دلربا تھا اسیطرح بھڑوے اور میراثی بھی خوشامد اور لگاوٹ سے
دخل اور قرب پیدا کر کے دولہ اور نواب اور بہادر کے خطاب سے
مخاطب ہوے اور انکو کھا روپیہ پیدا کر کے مالامال ہو گئے مگر یہ سب
کمینے اور نالائق تھے چند خواجہ سراؤن نے موافق اصلاح شاہی کے
عروج اور مرتبہ بلند پایا اونمین سے مثل حاجی دیانت الدولہ اور حاجی وزیر الدولہ
کئی خواجہ سرا لایق اور وفادار بامنش تھے اور علاوہ عیش دوستی
اور ایجاد پسندی اور تکلفات کے اس بادشاہ کو کچہ مرض مثل مالیخولیا وغیرہ
بھی تھا معہذا بقول حافظ عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو نفی حکمت مکن از بہر دل عامی چند

چنداں معاف اس بادشاہ کے قابل ذکر کے بھی ہین گو یہ بادشاہ اسقدر
عیاش تھا مگر موافق مذہب شیعہ کے سب عورتین نکاحی اور متاعی تھین
بے اسکے کسی عورت نامحرم سے اس بادشاہ نے مقاربت نہ کی اور
نہ کسی کو جبر سے بیگم بنایا اُس کثرت عیش و عشرت اور عالم جوانی اور
سلطنت پر نماز پنجگانہ مین سے کوئی نماز قضا نہین ہوئی یہ حکم رہا اور
اب بھی ہی کہ اگر صبح ہوتے بھی ہم سوجائین تو بھی زبردستی بے خوف و
خطر اور بے پاس ادب جگا دینا چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہی اور کبھی نماز اور تلاوت قضا
اور ترک نہین ہوتی ہی — این کار از تو آید و مردان چنین کنند —
یہ بادشاہ اسقدر رحم دل اور رقیق القلب ہی کہ باوجود اس قدرت سلطنت
اور زور و زر کے اس سن شباب مین کسی پر طیش اور بیرحمی نہین کی بلکہ
گالی تک بھی زبان پر نہین آئی نہ کسی موافق اور مخالف کو ظلم سے ستایا
نہ کسی کی جان لی — باوجود اس سلطنت اور جاہ و حشمت اور شباب کے
اس بادشاہ مین غرور و نخوت جس سے ہزارون مین بھی کوئی امیر خالی
نہین ہوتا نام کو نہ تھا مصرعہ گر بدولت برسی مست نگردی مردی + جیسے
یہ بڑی صفتین خداداد تھین ویسے ہی غفلت اور عیش کا عیب بھی تھا
مگر یہ اپنی ذات کے واسطے مقابلے بے عیب ذات خدا کی ہے چنانچہ
اب بسبب اعتدال توام جوانی اور سن کے بہ نسبت سابق بہتر بھی ہے اور

وہ باتین خواب و خیال بھی ہوتی جاتی ہین۔ یہ بادشاہ عادل تھا کسی موافق
اور مخالف یا امیر یا بیگانے کی عدل مین رعایت نہین کی یون ہندستانی
سرکار کے اہلکار جو اپنے کام کے مالک اور مختار علیہ ہوتے تھے
اگر اونھون نے کوئی حق تلفی کی تو اونکے نصیب ایک عدل بادشاہ کا
ہو مقدمہ بنا الہامی مکان میر مہدی حسن متخلص شمشیر داروغہ عمارت سلطانی
بمقابلہ اماتی بیگم داروغہ سرکار نواب مخدرۂ عظمیٰ ظہور مین آیا اور بادشاہ نے
عدالت غربائی وہ مثنوی درۃ التاج مین نظم ہی۔ اول سال جب یہ بادشاہ
تخت نشین ہوئے یہ منظور تھا کہ تمام علاقجات قلمرو سلطانی خصوص تحصیل
ہو جائین زمیدار اور تعلقدار اپنے کلا کی معرفت زر آمدنی داخل خزانۂ
سلطانی کیا کرین ناظم اور چکلہ دار موقوف ہو جائین کہ یہ عملا تو ان پر جاکر
زیادہ ستانی اور تنگ طلبی کرتے ہین رعیت تباہ اور نقصان سرکار بھی
ہوتا ہی لیکن اہلکارون نے کہ اونکی حاصلات لاکھون روپے کی جاتی تھی
اس حکم کو جاری نہونے دیا آغاز مین وہ کبس نقرئی تیرون پر بنام مشغلہ سلطانی
ہمراہ رکاب سرکار بادشاہ رہتے تھے مستغیث اپنی عرضداشتین اوسمین
ڈالدیتے تھے اور اوسکو بادشاہ اپنے ہاتھ سے کھولکر حکم لکھتے تھے۔
اور طبیعت بھی نہایت رسا اور چالاک تھی ترتیب فوج بھی با آئین تازہ ہوئی
تھی یعنی قانون رزمیہ زبان فارسی مین موجد طبع عالی تھا تر چھپے اور

بانکے دو رسالے اور اختری اور نادری دو پلٹنین تلنگون کی موجب ہدایت اور تعلیم بادشاہ کے کام کرتی تھین بادشاہ آپ قواعد لیتے تھے اور روش اور بول چال سکھاتے تھے ایکدن نواب علی نقی خان نے عرض کی کہ یہ امر خلاف مزاج صاحب رزیڈنٹ بہادر کے ہی لہذا بادشاہ نے بالکل اس طرف سے کنارہ کیا اور ایک میلہ قیصر باغ مین بپوشاک جوگیانہ بحکم سلطانی تھا ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۶۹ھ ہجری کو ہوتا تھا لہذا چھوٹے بڑے لڑکے بوڑھے امیر غریب جوگیا لباس پہنے ہوے شریک میلہ ہوتے تھے وجہ یہ تھی کہ سفید پوش اندر قیصر باغ کے جانے نہ پاتا تھا انگریز امیر ہوگئے

## تاریخ میلہ

| | |
|---|---|
| بقیصر باغ چون سلطان عالم | نمودہ میلۂ رنگین و نادر |
| پی تاریخ این فرخندہ جلسہ | ندا آمد نشاط افزای خاطر ۱۲۶۹ |

اس میلے کا سامان اور تکلفات اور آرایش قیصر باغ اور چوپ چلے کسیطرح بیان مین نہین آسکتے جسطرح کا بازار وہ کاندار اوسی رنگ کے تھے اور بنیاد اس میلے کی یہ تھی کہ واجدعلیشاہ کی چھٹی کی آرزو پر اونکی مان نے لڑکپن مین جوگیا لباس پہنایا تھا اوسکی سالگرہ اس لباس سے ہوتی تھی پادشاہ نے عہد سلطنت مین میلہ قرار دیا اور اس بادشاہ کا تخلص اختر تھا افسانۂ عشق دریای تعشق بحر الفت اور چند دیوان

اور مثنویات اور رسالہ موسیقی وغیرہ تصنیف اور تالیف بادشاہ کی مطبع سلطانی مین چھپی تھی اور بادشاہ کے پانچ شاہزادے بھی اس طرح ہین

ملکۂ مخدرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ عرف خاص محل سے
ے فرزند

اول مرزا نوشیروان قدر محمد حیدر علی بہادر جو دیوانے مشہور تھے

دوم فلک قدر مرزا جاوید علی بہادر

سوم کیوان قدر مرزا محمد حامد علی بہادر

چہارم ملکہ ملک تاج آسمان نواب معشوقہ محل صاحبہ سے
یک فرزند
فریدون قدر مرزا ہزبر علی بہادر

پنجم نواب حضرت محل صاحبہ سے
یک فرزند
برجیس قدر مرزا محمد رمضان علی بہادر

پہلے مرزا جاوید علی بہادر ولیعہد ہوئے ڈھائی برس کے بعد گئے پھر مرزا محمد حامد علی ولیعہد ہوئے اور مرزا محمد ہزبر علی بہادر جرنیل ہے ان بادشاہ کو نوابصاحب سے کمال محبت تھی اکثر گئو گھاٹ مین نوابصاحب کے مکان پر تشریف لیجاتے تھے اور دو دو دن چار چار دن وہان رہتے اون نوابصاحب کی کتخدا دو بیٹیان تھین ایک بیٹی کی شادی نواب محسن الدولہ بہادر کے فرزند کے ساتہ بڑی دھوم سے ہوئی اور دوسری بیٹی کا

کہ نواب اختر محل صاحبہ خطاب سے بادشاہ کے ساتھ عقد ہوا تب بڑی دھوم
اور رونق تھی روشنی نواب کے مکان تک کہ تخمیناً چار میل کا فاصلہ
ہی دورویہ ٹٹر روشنی کے نصب تھے اسکے پیچھے آتشبازی اور جابجا بڑے بوڑیے یعنی بڑے
بڑے دروازے روشنی کے سڑک پر سرخ کپڑے اور گوٹے پٹھے
سے منڈھے تھے اور عمدہ عمدہ ٹٹیان آرائش ابرک کی برنگ روغن
گلکاریان بنی ہوئی لگین تھین کہ جس سے وہ عالیشان پر تکلف معلوم
ہوتا تھا اور نوابصاحب کے مکان عالیشان مین ہر چہار طرف دریا کے اس پار
اور اس پار کمال روشنی کی دھوم تھی اور آتشبازی ہر قسم کی آرایش سے
زیادہ امیرون کے خیمے خانہ باغ مین جابجا نصب تھے محفل رقص و سرود کشتیون پر
اور خیمون مین گرم تھی بیابان ہرات جلوس شاہانہ قابل دید تھا کہ جسکا شمہ بیان سے
باہر ہے ۔ ۱۸۴۷ء مین عہد سلطنت واجد علی شاہ مین نواب گورنر
جنرل لارڈ ہارڈنگ صاحب بہادر بعد فتح ملک پنجاب جب لکھنؤ مین رونق افروز
ہوئے تو بادشاہ کی ملاقات سے البتہ خوش ہوئے اور ملک کی
بے انتظامی سے شاکی ہو کر بادشاہ سے فرمایا کہ کرنیل جان لوصاحب
سابق رزیڈنٹ نے اس ریاست سے عہد کیا تھا کہ درصورت فتور
و بے انتظامی اہالی سرکار انگلشیہ اس ملک کو قبضہ تصرف مین لاوینگے
اور جو منافع کہ بعد اخراجات بچیگا حوالہ خزانہ شاہی ہوا کریگا لیکن

حکام ولایت کے نزدیک یہ تجویز نا پسندیدہ ہوئی اور اوسکو عرصہ دراز
ہو چکا اب تک سرکار انگریزی کو انواع و اقسام کی مراعات اس ریاست کے
شاید مرعی تھی باوجود اسکے اب تک کچھ بندوبست نہوسکا اسپر بادشاہ
نے عذر کیا کہ اور دو برس کی مہلت چاہیے با اینہمہ یہان تو دن عید
شب شب برات خواب غفلت بدستور رہا دو برس کیا کئی برس
ٹل گئے پھر ولایت سے تحریک ہوئی کرنیل سلیمن صاحب بہادر ریزیڈنٹ
اول نے اس ریاست کا حال مفصل و مشرح تحریر فرمایا چنانچہ حسب تحریک
گورنمنٹ اور ایمای بادشاہ کرنیل سلیمن صاحب بہادر نے دورہ فرما کر ایک
رپورٹ گورنمنٹ کو بھیجی اور اسوقت سے اس بارہ مین متواتر تحریرات
فیمابین گورنر جنرل بہادر اور شاہ اودہ کے رہین چنانچہ اوسی رپورٹ
کے معاینہ سے بے سر و سامانی معلوم ہوئی حکام ولایت کو ایما ہوا
کہ شاہ اودہ اور اوسکے خاندان کے وظائف مقرر ہون اور انتزاع
سلطنت عمل مین آوے چنانچہ کارپردازان گورنمنٹ نے بجا آوری
اس حکم کی کی بعد سلیمن صاحب کے جنرل اوٹرم صاحب ریزیڈنٹ لکھنو
ہوئے اونھین کے زمانے مین مولوی امیر علی صاحب شہید ہوے
اس معرکے کا بہت طول بیان ہے مختصر یہ کہ بیٹھے بٹھائے حمیت
مذہبی سے مولوی صاحب آمادہ استیصال ہنومان گڑھی کے ہوے

اور اکثر اشتعال ملک اور امراء اور اشخاص جزو ضلع اور شہر کے ناعاقبت اندیشون
کی بھی جہالت مذہبی تو مشہور ہی ہے ہر چند اراکین سلطنت شاہی نے بہت کچھ
سمجھایا نہ مانا آخر کار ضلع دریاباد کے مقام ہندوؤن اور مسلمانون کا معرکہ
ہوا کہ جسمین فوج شاہی نے واسطے فرو کرنے اس بلوے کے سعی
موفورہ کی آخر کار جب مولویصاحب نے نہ مانا تو ادہر فوج شاہی نے
قافیہ تنگ کیا اور ادہر ہندو کچھ بتعمیل حکم اور کچھ بمصلحت وقت اگر مذہبی
تعصب سے جو بجمعیت کثیر مجتمع تھے مقابلے مین درانے اور مولویصاحب
اور بہت سے اونکے پیرو اور ہمراہی اس معرکے مین شہید ہوئے
آخر زمانہ بادشاہ مین یہ معرکہ بھی انکی بے انتظامیون پر بڑی
دلیل ہو گیا غرض تقدیر کے لکھے کو امکان نہین ہے ٹلنا آخر الامر
۷ فروری ۱۸۵۶ء حسب الایماء حکام ولایت موجب حکم گورنمنٹ ہند کے
سپاہ جرار گورہ و ہندستانی کانپور سے آکر لکھنو کا محاصرہ کیا اور
جنرل اوٹرم صاحب بہادر نے دولتسرای سلطانی پر جا کر بادشاہ کو
منشاء حکم سے اطلاع دی بادشاہ نے مصلحتاً حکم سرکاری کو تسلیم
کیا اور اسیوقت احکام قلمرو مین جاری کرائے گئے کہ آج کی
تاریخ سے اس ملک پر قبضہ سرکار انگلشیہ ہوا غرض باطاعت شاہی
جملہ اراکین و توابع و راجگان و زمینداران وغیرہ فرمان اطاعت کی تعمیل کی

اس شہر کے رؤسا۔ وامرا بلکہ اکثر اراکین سلطنت اسوقت تک خواب غفلت مین محض بیخبر تھے جبکہ فوج سرکار نے لکھنو کا محاصرہ کیا اگرچہ بادشاہ کو غیریت گورنمنٹ سے اطلاع تھی بلکہ اہلکاران نالایق نے والی ریاست کے دل پہ یہ بات نقش کالحجر کی تھی کہ سلطان عالم ہم خیر خواہون نے ولایت مین سب بندوبست کر لیا ہی گورنر جنرل اور دیگر حکام کیا ہین غرض ہمیشہ سبز باغ تذویر دکھاتے رہے ۔وقت انتزاع سلطنت محلات شاہی مین جو کہرام مچا وہ بیان نہین ہو سکتا شہر مین گھر گھر ماتم تھا سارے شہر مین ہل چل تھی کہ کیا سے کیا ہو گیا عبرت وحسرت کے سوا کیا تھا۔ مادہ تاریخ یہ ہی

مرگ انبوہ بہ از جشن نشاطی دارد

غرہ جمادی الثانی سنہ مذکور کو کہ ابتدای برہان الملک سے ایک ایک سو چالیس برس ہوتے ہین عمل انگریزی اودہ مین ہوا۔ القصہ جملہ اراکین سلطنت کے دلون مین خداوند تعالی نے یہ ولولہ ڈالا کہ رہا سہا جو کچھ باقی ہی اوسکا بھی خاتمہ بالخیر ہو سب اہلکارون نے بادشاہ کو یہ صلاح دی کہ ولایت مین تشریف لیجا کر حضور ملکہ معظمہ سے دادجوئی کیجاوے ہرچند اس امر کے واسطے بادشاہ کے عزیزون اور اراکین سے ولایت جانے کے واسطے

کیا کم تھے لیکن تقدیر کا اتفاق ایسا ہی تھا کہ لکھنؤ کی رونق اور سلطنت کا
نام بھی سمٹ جائے عزیمت مصمم ٹھہر گئی بالآخر مرزا محمد جواد علی بہادر برادر خورد
و مرزا ولیعہد بہادر و جناب عالیہ و محلات وغیرہ بامید استرداد ملک موروثی
بعد وابدید نواب منور الدولہ بہادر روانہ کلکتہ ہوئے مہاراجہ ایشری سنگھ بہادر
رئیس بنارس بگذرانیدن نذر لائقہ اور مہمانداری سے جو شایان عقیدت
اور ریاست کے تھا اُن سے پیش آئے کہ قیامت تک یادگار رہیگا اور
وہاں سے بادشاہ بیگم بعد طے راہ دریا ۴ شوال سنہ [illegible] کو کلکتے مین پہونچکر
کوٹھی راجہ بردوان واقع میٹیا برج مین مقیم ہوئے اور اکثر وابستگان
شاہی مثل انجم الدولہ بہادر و حسام الدولہ و فتح الدولہ محمد رضا برق بتدریج
پہونچے ۲۴ شہر مذکور کو جناب عالیہ متعالیہ اور مرزا سکندر حشمت بہادر اور
مرزا ولیعہد بہادر مع مسیح الدین خان ساکن کاکوری وغیرہ واسطے داد فریاد
و اگذاشت سلطنت کے بسواری جہاز روانہ لندن ہوئے اور بعد طے
منازل راہ دریای شور منزل مقصود پر پہونچے بھی گوہر مقصود ہنوز ہاتھہ
نہ آیا تھا کہ آتش فساد بغاوت فوج باغی سرکاری مشتعل ہوئی اس عرصہ مین
مرزا سکندر حشمت و جناب عالیہ متعالیہ بقضائے الٰہی بحسرت و ناکامی یورپ مین
راہی ملک عدم کے ہوئے۔۔

قطعہ تاریخ

جناب عالیہ رشک مریم و بلقیس — بہم سکندر حشمت بہادر ذیجاہ

چو ارتحال نمودند در سواد فرنگ — دو چند گشت بعالم ظہور حسرت و آہ

دوبارہ مفرعۂ تاریخ سال ہا میخوانم — دوبارہ قلب ہمہ از دو صدمۂ جانکاہ

بعد گذرنے اس سانحے کے اوریک و نیم سال کے مرزا ولیعہد بہادر حسب الطلب بادشاہ
۲۷ صفر ۱۲۷۴ ہجری کو ولایت سے کلکتے کو پھرے بقول حافظ —

تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل — کہ خضر از آب حیوان تشنہ می آرد سکندر را

بیان تفصیل سرگذشت سفر بی اثر کی محمول بشکایت اور خالی از عبرت بھی
لہذا طول لاطائل جانکے قلم انداز کی۔ یہ ہی لکہا کہ ہنوز مشاہرہ شاہ موصوف کو منع اپنے
ملتا ہی جو مقرر ہوا تھا اور کل مال و اسباب و جائداد ضبط سرکار رہی مگر
نیک نیت سر ہنری لارنس صاحب بہادر نے تخمیناً بیس لاکھہ کا جواہرات
منجملہ مال شاہی سے بچا رکھا تھا جو اونکو کلکتے مین دیا اور اوس سے جو
بادشاہ پر قرض تھا ادا ہوا ایک سال پانچ مہینے گیارہ دن لغایۂ آخر
ذیقعدہ ۱۲۷۳ ہجری عملداری انگریزی بخوبی رہی کرنیل اوٹرم صاحب بہادر
چیف کمشنر اور میجر گلبین صاحب بہادر اور کرنیل سر ہنری لارنس صاحب بہادر چیف کمشنر
تھے کہ ناگاہ نمکحرامی ورق فراموشی سے سپاہ سرکاری نے نشان بغاوت
بلند کیا چنانچہ اودہ مین بھی ماہ جون ۱۸۵۷ء مین بغاوت فوج ہوئی
۱۱ ذیقعدہ ۱۲۷۳ ہجری برجیس قدر مرزا محمد رمضان علیخان کو مسند حکومت پر

بہماکر اپنا بادشاہ بنایا اور بدستور سلطنت قائم کی۔ تاریخ یہ ہے

رکن دین کیوان مکان برجیس قدر انجم سپاہ

شرف الدولہ محمد ابراہیم خان نائب تھے اور ممو خان بخطاب علی محمد خان بہادر
داروغہ دیوان عام ہوئے اسطرح سے بہت لوگون کو خدمتین ہوئین ناظم
اور چکلہ دار علاقون پر بدستور مامور ہوئے گورکھپور بھی شامل اس ملک کے
ہو گیا تھا آٹھ نو مہینے فوج سرکار محصور بیلی گارد سے مقابلہ رہا اور دربردہ
باقی رئیس شہر کے سرکار سے موافق رہے جنکے سبب سے جاسوسی اور
دیگر کار ضروری جاری تھے آخر فوج سرکاری کانپور سے آکر بشجاعت اور
استقلال تمام انکو نکال کر کنب عالم باغ مین لے گئی مفصل ذکر اسکا بہت عنقریب
دیگر تالیفات مین لکھا جائیگا مگر یہ سب ثمرہ مردانگی اور حسن انتظام بریگیڈیر جنرل لارنس صاحب
چیف کمشنر کا تھا جنھون نے شجاعت اور وفاداری مین آپ کو سرکار پر
نثار کیا دوسری بار فوج سرکار مع کمک راجہ جنگ بہادر ہر چہار طرف سے
یورش کر کے سرحد لکھنؤ مین پہونچی اور ناکہ ہنڈولا سے حسین گنج
اور حضرت گنج مین کہ نہر سے پورب طرف واقع ہی در آئی اور بعد
عبور دریای گومتی محاصرہ مکان شاہی کا ہوا ۲۷ رجب ۱۲۷۴ ہجری کو
اندر مکان کے در آئی سلخ رجب یا غرہ شعبان سنہ مذکور تمام شہر مین
عمل دخل ہو گیا صاحب عالم نوشیروان قدر بہادر فرزند کلان واجد علیشاہ کی

جو نیوانے مشہور تھے ممدمۂ گولی سے کہ اونکے مکان سکونت
مین برستی تھین مارے گئے اور شرف الدولہ جو نائب تھے درگاہ
حضرت عباس مین نالے کے اوپر مردمان احمد اللہ شاہ کے
ہاتھون سے باشتباہ سازش سرکار مارے گئے

تاریخ دیا کرشن ریحان

| | |
|---|---|
| بے گور و کفن رہی جو لاش اوسکی سر کا | بولا کہ وہ سب شرف ملا مٹی مین |

لکھنو مین عجب ہنگامۂ محشر برپا تھا کہ تمام رعیت امیر غریب پاداش اعمال سے
گھر بار اپنے چھوڑکر بخوف جان یک بینی و دو گوش خوف سرکار سے
بے سامان خانہ بدوش ہوکر جنگل اور بیر و نجات مین چلے گئے وہ
وقت تھا کہ شہزادیون کو سواری ایک ڈولی کی بھی نصیب نہ تھی
اس سبب سے یہ شہر خوب لوٹا گیا اور مرزا برجیس قدر اور حضرت محل صاحبہ
مان اونکی ۹ مہینے ۱۰ دن کی حکومت کرکے لکھنو سے کنارہ کر گئے
پار پہونچے وہان بھی مرزا برجیس قدر کی اس لقب سے برجیس قدر
محمد رمضان علی سکندر جاہ اقبال شاہ خلد اللہ ملکہ کندہ ہوئی و ممو خانکو
عہدۂ وزارت اس خطاب سے ملا ناصر الدولہ نصیر الملک علی محمد خان بہادر
منصور جنگ ناظم و عامل بھی باقی ضلعون پر مقرر ہوگئے مگر تجاہلے اور
مجادلے مین بسر ہوئی انجام کار جمادی الاول ۱۲۷۴ھ ہجری صاحبان

عالیشان بہادر او تر سے مطمئن ہو کر اوس پار گھاگرہ کے پہنچے نو مہینے چند روز یہان بھی مرزا برجیس قدر اور اونکی مان حکومت کر کے نواح ملک نیپال مین جا رہے گئے اور کل ملک پر قرار واقعی بدستور تسلط سرکار ہوا ملک سے جلد آشوب کا رفع ہونا اور آسودگی و اطمینان سے رعایای پریشان کا آباد ہونا یہ سب نتیجہ سرکار کی چشم پوشی و اشتہار شاہی کا تھا ـــ

یہ عجب بات ہی اس محل پر قابل ذکر ہی کہ واجد علیشاہ تو ایسے عیاش اور کاہل و آرام طلب ہون اور اونکی ایک خادمہ حضرت بیگم نام اور دہ سالہ فرزند ایسا بیباک اور جری نکلے جنکی اکہ توپ تلوار سے بھی نہ جھکی اور بدعوی سلطنت سرکار سے مقابلہ اور تخالف کیا اور اب حوالی بھوٹ مین سلامت سنی جاتی ہین اگرچہ بیجا بائی اور رانی جھانسی نے مردانگی مین اور سکندر بیگم والی بھوپال تال نے رسوخ اور انتظام مین اور رانی جندہ مادر والی لاہور نے چالاکی مین اور زینت محل بیگم شاہ باغی دہلی نے و نما دای مین نام نکالا مگر اس بیگم لکھنو نے کہ یہان کے مرد عیاش و آرام طلب ہوتے ہین ایسی باتون کا ظہور مین آنا تعجب ہے آ رہے ــ

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد  حدا پنج انگشت یکسان نکرد

## تعمیرات لکھنؤ

بیا بنگر نقش عمارات شہریاران مین ۔ کہ این سپہر جفا پیشہ چون بہ پست و شکست

اس شہر مین عہد نواب آصف الدولہ بہادر سے ہر ایک کی عہد حکومت و سلطنت مین مکانات عمدہ عمدہ تعمیر ہوتے رہے شہر کے اوتر کی طرف گومتی کے کنارے کنارے کثرت سے مکانات شاہی موجود تھے ہنگامہ و بلوے کے پہلے بعض بعض مکان سرکاری کام مین آگئے پھر ایام غدر مین توپ کی زد مین جو مکانات رہ گئے گولے اور گولیون سے بالکل مسمار اور شکستہ ہو گئے چونکہ بعد انتظام ملک وہ مرمت مین صرف کثیر ہوتا اس سبب سے اکثر مکانات مسمار کیے گئے اون سب کی احوال عبرت مآل بخیال طوالت کتاب قلم انداز کیا گیا۔

ہر کجا افتادہ بینی خشت ویرانہ ۔ ہست فرد دفتر احوال صاحب خانۂ

اب جس قدر تعمیرات مشہور باقی ہین حد شرقی سے بسلسلہ اوس کا شروع ہو کر حد غربی تک تمام کیا جاتا ہے

## کوٹھی بیبیاپور

جسکو نواب آصف الدولہ نے سیرگاہ و شکارگاہ کے طور پر تعمیر کروایا تھا اور وہان جاکر سیر و شکار کیا کرتے تھے مگر جنرل صاحب

ریذیڈنٹ بہادر سابق لکھنؤ سے تبدیل ہوکر روانہ ہوے اور دوسرے
صاحب بجاے اونکے کارفرما ہوے تو دوسرے نواب وزیر کو زراہ تقلیم بہ یو آب زیر
بڑے تزک و شان سے واسطے ملاقات صاحب رزیڈنٹ بہادر
کے تشریف لاے وہ بوقت رخصت صاحب بہادر کو اپنے ساتھ ہاتھی
پر سوار کروا کر کوٹھی رزیڈنٹی مین لیگئے اور اس امر کا تصفیہ ہوا کہ وزیر علی
کو مسند سے برخاست کر کے سعادت علیخان پسر متبنی آصف الدولہ
کو بجاے اونکے مسند نشین کرین اور یہ بات مشہور عام ہے کہ اسی مقام
مین جناب لاٹ صاحب ٹلمین ہوتھ بہادر نے دربار اہالیان دربار شاہی
کا فرمایا تہا اور اسی جلسے مین وزیر علی کو حکم معزولی مسند کا سنایا تھا
اور اسی مقام سے اونکو روانہ شہر بنارس کیا تھا جو جگہہ
اونکے قیام کیواسطے سرکار سے تجویز ہوئی تھی

## کوٹھی دلکشا

اس کوٹھی کو سعادت علیخان نے اپنے سیر و شکار کیواسطے بنوایا تھا
اور جنگل گرد و پیش کو صاف کرا کر ایک چراگاہ مقرر اور اوس مین
جانوران شکاری مثل ہرن وغیرہ چھوڑوا دیے تھے اس کوٹھی مین
اکثر بیگمات بھی سیر کے واسطے آیا کرتی تھین

## ولایتی باغ

اس باغ کو بادشاہ نصیر الدین حیدر نے تیار کیا تھا اور اوسمین اکثر ولایتی درخت لگائے تھے اسی وجہ سے اوسکا نام ولایتی باغ مشہور ہوا واجد علی شاہ نے اوسکی چار دیواری کو وہ بلندی بخشی جو اب موجود ہی کیونکہ اونکے محلات اکثر وہان جاکر سیر کیا کرتے تھے اور اسکے واسطے پردہ کا مکان ضرور تھا

## کوٹھی مارٹین

جسکو کنسٹین ٹیا بھی انگریزی زبان مین کہتے ہین اوسکو جنرل کلاڈ مارٹین صاحب نے تعمیر کیا تھا صاحب نے اوسکی تعمیر شروع کی اور نقشہ نواب آصف الدولہ بہادر کو دکھلایا نواب صاحب نے نقشہ کو پسند فرماکر خواہش اوسکی خرید فرمانے کی ظاہر کی اور دس لاکھ روپے ..اوسکی قیمت قرار پائی مگر نواب صاحب کی مرگ نے اس معاملے کو انجام نہونے دیا اور بعد چند روز کے جنرل مارٹین صاحب بھی فوت ہوگئے اور یہ تعمیر ناتمام تھی مگر صاحب موصوف نے بنظر اسکے کہ کوئی حکمران آیندہ اوسکو ضبط نکرلے یہ حکم دیا تھا کہ اوسکی لاش اسی مکان مین دفن ہو اور جو روپیہ اونسے واسطے ترتیب مدرسہ کے جمع کیا ہی اوسکے سود کی آمدنی سے یہ تعمیر اختتام کو پہونچی بیچ ہنگام مفسدہ کے سپاہ مفسدین نے صاحب کی قبر کھود کر اوسکے استخوان وغیرہ جو باقی تھے اونکو پاش پاش اور پریشان کردیا تھا مگر بعد فرو ہونے مفسدہ کے جمجمہ

استخوان صاحب کے جو دستیاب ہوے دوبارہ قبر مین رکھے گئے

## نہر گنگ

اس نہر کی کہودائی نصیر الدین حیدر کے وقت مین شروع ہوئی تھی اور زر کثیر اوس مین صرف ہوا اور علت غائی اس مطلب سے بہت مفید اور کارآمد تھی راجہ بختاور سنگہ نے یہ امر شاہ اودہ کے گوشگزار اور عرض کیا کہ اس نہر سے پانی گنگا کا لکہنؤ تک آویگا اور اوسکے سبب سے تجارت اور زراعت کو بہت فائدہ ہوگا بلکہ اونکو ترغیب وتحریص دیکر شروع کروادیا تھا مگر چونکہ یہ امر علم سے تعلق رکہتا ہے اور کسی صاحب انجنیر کی صلاح اور مشاورہ اسمین نہ تھا اسلیے یہ امر اختتام کو نہین پونہچا اور اکثر ٹھیکہ داران کو جنہون نے ٹہیکہ کندیہ گی کا لیا تھا متمول کردیا یعنی وہ لوگ روپیہ لیکر بھاگ گئے اور اس نہر کو ناتمام چھوڑا ہنگام بلوہ مفسدین نے اسی نہر کو اپنا اول مورچہ قائم کیا تھا

## تعمیرات عہد نواب سعادت علیخان

تعمیرات مفصلہ ذیل سعادت علیخان نے تعمیر کروائی تھین تاکہ شہر غربی جانب سے ویسا ہی آراستہ ہو جیسا کہ اوسکی بہائی غلاتی نے شرقی جانب کو درست کیا تھا کوٹھی حیات بخش جسمین جناب صاحب کمشنر بہادر

رونق افروز ہین کوٹھی دار الشفا جس مین صاحب سکرتر بہادر
تشریف رکھتے ہین کوٹھی بیگم جس مین توپخانہ اب قائم ہے
کنکر والی کوٹھی جس مین برگیڈیر صاحب قیام فرما ہین کوٹھی نور بخش
جس مین صاحب ڈپٹی کمشنر فروکش ہین بادشاہ منزل جس مقام
پر اب قیصر باغ طیار ہوا ہے چینی بازار اور ٹیڑہی کوٹھی ان مکانات
مین اکثر صاحبزادے رہا کرتے تھے اور جو خالی تھے وہ نواب صاحب
کے سیر وتماشا کیواسطے آراستہ رہا کرتے تھے جس مکان مین اونکے
ولیعہد آتا تھا اوس مین سیر وتماشا کرتے تھے اور ٹیڑھی کوٹھی
واسطے سرانجام امور ملکی کے تیار ہوئی تھی جو کام ملکی ہوتا تھا
وہ وہان درپیش ہوتا تھا ان مکانات مین سے اکثر مکانون کے
نام بلوے مین مشہور ہوگئے یعنی کوٹھی حیات بخش مین میجر بنکس صاحب
جو نہایت دلیر وشجاع تھے جان بحق تسلیم ہوئے اور بیگم کی کوٹھی مین
بہت سے سپاہیان شجاعت شعار نے ہاتھ مفسدین سے
شربت ممات پیا کوٹھی نور بخش کے بالاخانے سے سر ہنری
ہولک صاحب تیسری مورچال مفسدین پر گولہ مارتے تھے اور
راستہ قیصر باغ کا نکالا تھا اور اس کوٹھی پر مفسدین کے گولے
اسقدر لگے تھے کہ اب تک نشان گولونکا اوسکی دیوار پر موجود ہے

اور اس کثرت سے ہے کہ گویا دیوار چھلنی ہوگئی ہے

## سبطین آباد یعنی مقبرۂ امجد علی شاہ چہارم بادشاہ اودھ

جس مین اب گرجا گھر قرار پایا ہے اور جسکو عوام غلطی سے چھوٹا امام باڑہ بھی کہتے ہیں

### مادۂ تاریخ

آرامگاہ ظل اللہ ۱۲۶۴

## سکندر باغ

تعمیر کردۂ واجد علی شاہ جو شاہ ممدوح نے سکندر بیگم کو عطا کیا تھا اور اسی سبب سے بنام سکندر باغ مشہور ہوا اس مین کوئی شی قابل تعریف نہین مگر یہ کہ اس مین ہنگام بلوہ سپہ سالار بہادر افواج سرکاری نے قریب دو ہزار سپاہ مفسدین کو سزا دی تھی اور اونکی لاشین بہتیری اوسی مین دفن ہوئی تھین او بہت اوس آتش مین جری رہین جو شمالی اور مشرقی جانب باغ کی جاتا تھا

## قدم رسول

ایک مذہبی مقام اہل اسلام کا جسکو غازی الدین حیدر نے ایک مقام بلند تیار کرواکر تعمیر کیا تھا اوس مین ایک سنگ پارہ ہے جو عرب سے ایک حاجی لایا تھا اور جس پر نقش قدم پیغمبر کے تھین ہنگام بلوہ سنگ پارہ مذکور گم ہوگیا آیا کوئی اوسکا لیجانی والا معلوم نہوا

# نجف اشرف

جو نام شاہ نجف مشہور ہی اوسکو غازی الدین حیدر نے اپنا مقبرہ بنوایا تھا اور اوسی مین دفن بھی ہوے ہین اس مقام کو یہ نام اسواسطے دیا گیا تھا کہ ایک مقام کو وہ نجف ہی جسپر قبر حضرت علیؑ داماد حضرت محمد پیغمبر کی تعمیر ہی اور مشہور یہ ہی کہ یہ مقبرہ اوسکی نقل بنا ہی اور غازی الدین حیدر نے کچھ روپیہ واسطے مصارف اس مقبرے کے سرکار مین جمع کر دیا تھا جسکے سود سے خرچ اس تعمیر کی مرمت کا اور تنخواہ عملہ مقبرہ کی مثل سید وغیرہ ہوتا ہی اس مقام پر بھی سپہ سالار افواج سرکاری کو بمقابلہ مفسدین بڑی تکلیف اوٹھانی پڑی تھی اور مفسدین نے یہان نہایت سخت مقابلہ کیا تھا اس مقام پر بہنگام جنگ مفسدین سر ولیم پیل صاحب کی بھاری توپین آئی تھین اور وہ گھنٹے تک اونکے گولے اسپر گرتے رہے اور اسی مقام پر جو گنبد ہی پیل صاحب نے کار نمایان کیا تھا یعنی تنہا واسطے تلاش چور راستے کے گئے تھے اور ایک کھڑکی دریافت بھی کی تھی مگر اسی عرصے مین اتوات توپ مار کے صدمے سے دیوار شق ہوگئی تھی اور سپاہ سرکار اوس شق کے راستے سے اس مکان مین داخل ہوگئی تھی ✤

# تاریخ

| | |
|---|---|
| باحسن عقیدت نجف اشرف را | فرمود بنا بہند نواب وزیر |
| تاریخ مبارکش چو جستم از عقل | ہاتف گفتا عجب نجف شد تعمیر |

۱۲۳۲ ہجری

## تعمیرات موتی محل

تعمیر کردۂ سعادت علیخان شمال کی جانب احاطے کے ہی اور موتی محل اسکا اسواسطے نام رکھا گیا تھا کہ اس مین ایک برج بنا تھا جو بشکل موتی کے تھا مگر اب وہ مسمار ہو گیا ہی دوسرے مبارک منزل اور تیسرے شاہ منزل مبارک منزل غازی الدین حیدر نے کنارۂ دریا پر تعمیر کیا تھا اور شاہ منزل جہان اب پل کشتیونکا ہی اور اس منزل سے مبارک منزل بجانب شرق تھا شاہ منزل واسطے لڑائی حیوانات کے تعمیر ہوا تھا چھوٹے جانورونکی لڑائی اندر احاطہ شاہ منزل کے ہوا کرتی تھی اور شیر وغیرہ کی لڑائی بھی اوسی احاطے مین ہوتی تھی اسواسطے مضبوط کٹہرے اور مستحکم مامن تماشا دیکھنے والونکے لیے تعمیر ہوے تھے مگر لڑائی ہاتھی اور گینڈے کی دریا پار رمنہ ان مین حضوری باغ کے سامنے ہوا کرتی تھی کیونکہ ایسے حیوانات کی لڑائی کی سیر کے واسطے فاصلہ بہت ضرور ہی اور شاہ اور دیگر ارکان سلطنت برامدۂ شاہ منزل پر سے دیکھا کرتے تھے

## خورشید منزل

اس تعمیر کو سعادت علیخان نے شروع کیا تھا اور غازی الدین حیدر نے ختم کیا مگر کسی خاص مطلب کیواسطے یہ عمارت نہین بنی تھی اور بعد تسلط ملک اوس مین سکونت ۲۰ رجمنٹ کا قرار پائی تھی۔

## تارا والی کوٹھی

اس تعمیر کو نصیر الدین حیدر نے بہدایت اور سربراہکاری کرنیل ولکوکس صاحب کی جو منجم شاہی تھے تعمیر کروایا تھا اور آلہ نجوم بھی اوس مین نہایت اچھے رکھے گئے تھے ۱۸۴۷ء مین کرنیل صاحب ممدوح مر گئے اور واجد علی شاہ نے عملہ صاحب مرحوم کو برخاست کر دیا اور آلہ نجوم بحفاظت رکھے گئے مگر مفسدے مین گم ہوگئے کہین ہو نکا پتا نہلا اس سے گمان کیا جاتا ہے کہ مفسدین نے اونکو توڑ ڈالا ہوگا مولوی فیض آباد احمد اللہ شاہ نے جنکو ڈنکہ شاہ بھی کہتے تھے اس سبب سے کہ جب وہ سوار ہوتے تھے تو اونکے آگے ڈنکہ بجا کرتا تھا ہنگام بلوہ اس مقام کو قیام گاہ اپنا قرار دیا تھا اور کونسل مفسدین کی اکثر اسی مقام مین جمع ہوا کرتی تھی

## میدان

جو درمیان کوٹھی مذکور اور قیصر باغ کے

واقع ہے اس میدان کی حکایت ازبس حیرت آمیز باقی ہے یعنی اس میدان مین
دو گروہ صاحبان عالیشان کے جنکے ایک گروہ مین تو وہ صاحب
لوگ تھے جو راجہ دہوریرہ نے بھیجے تھے اور وہ لوگ جو ملی گارد سے
بھاگ کر شہر مین گرفتار دام مفسدین ہوے تھے اور اس مین مس
جیکسن صاحبہ اور میم گرین صاحبہ اور میم ردجرز صاحبہ اور کیرو صاحب اور
سلیون صاحب بتاریخ ۲۴ ستمبر ۱۸۵۷ء اور دوسرے گروہ مین قربانیان
احسان مندی و مہمان نوازی راجہ متھولی کی جس مین سر جیکسن صاحب
اور کپتان آرم صاحب اور لفٹننٹ بریز صاحب سرجنٹ مورٹن صاحب
بتاریخ ۱۶ ماہ نومبر ۱۸۵۷ء تھے قصہ بیماری و قید و بیحرمتی و ناامیدی کو ختم
کرکے مفسدون کی بیرحمی سے راہی ملک بقا ہوے اور واسطے
یادگاران امور قبیحہ کے ایک عمارت مقابات واردات پر بنائی
گئی تھی دونون یہ واردات بباعث غصہ سپاہیان مغلوب کے واقع ہوئی
تھین جب اونسے مقابلہ فوج ظفر موج جنرل ہیولوک صاحب اور سپہ سالار
بہادر افواج ہند کی کوئی بات بن نہ پڑی مگر دونون مین ترغیب اور
تائید سرگروہان مفسدین اور رئیسان اودہ کی تھی ایک ان رئیسون مین
سے یعنی راجہ جی لال سنگھ جو ایک بڑا رئیس ملک تھا اور جسکی خاطر داری
درمیان مفسدونکی بہت تھی اور جو ساتھ گروہ اول کے قتلگاہ تک

گیا تھا اور ایک دروازہ قیصر باغ پر جواب منہدم ہو گیا ہی اس مراد
سے چڑھا تھا کہ سیر اس واقعہ قبیحہ کا اچھی طرح دیکھے کہ کیونکر تڑپ
تڑپ کر یہ لوگ جان دیتے ہین اور کارگزاری اپنی سپاہ کی کہ کسطرح
اونپر ہاتھ صاف کرتے ہین دو برس بعد اس واقعہ کے وہ بھی
ذیل عاطفت سرکار مین آیا اور اوسکی سرکشی پر بھی چشم پوشی کی گئی
اور اوسکے دل مین یقین واثق ہو گیا کہ تحسر وتکدر واقعہ معلومہ کا
اب صاحبون کے دل سے دور ہو گیا اور گویا اب وہ اپنی موت
مریگا اور سب سے ملاقات ہو گی مگر انصاف نے مجرم کا پیچھا
نچھوڑا گو بدیر مطلب بر آیا مگر اتفاقاً اور یکایک اوسکے سر پر آپڑی
اور اوس طرف سے آئی جسطرف سے اوسے بالکل اطمینان
حاصل تھا یعنی اوسکے معتمد ملازم اوسکے مخالف ہو گئے اور ثبوت
پر ثبوت اس امر کا بخلاف اوسکے ظاہر ہوتا گیا اور اوسکے سر پر
بوجھ اس گناہ کا بھاری کرتا گیا کہ بتاریخ یکم اکتوبر ۱۸۵۹ء
اوسی مقام پر کہ جہان یہ واقعہ ہوا تھا اس راجہ نے سزاے
پھانسی پائی اور بعد ازان بتاریخ ۱۲ ماہ مذکور بندہ حسین اور فتح علی کو بھی
جو چند صاحبان کو اور مقامات سے گرفتار کر لائی تھی سزاے پھانسی ہوئی

ایک نہایت عمدہ تعمیر عہد واجد علی شاہ کی ہی یہ تعمیر ۱۸۴۸ء مین شروع ہوئی تھی اور ۱۸۵۰ء مین ختم ہوئی اور مع اسباب و سامان آرایش کے اس مین اسی لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا وجہ تسمیہ اس نام کی یہ ہی کہ بادشاہان اودہ اپنی مہر وغیرہ مین لقب قیصر کا لکھا کرتے تھے کیونکہ قیصر خطاب بادشاہ روم کا ہی اور شاہ روم بڑا بزرگ اور نامی بادشاہ اہل اسلام ہی اس تعمیر کے بیان کرنی مین لازم ہی کہ ایک جانب سے بیان شروع ہو اور بہتر یہ ہے کہ دروازہ شمالی اور شرقی سے شروع ہو جو دروازہ روبرو اوس مسجد ان کے واقع ہی جو سامنے تارا والی کوٹھی کے تعمیر کیا گیا ہی اسی دروازے مین سے اور بعد ازان ایک کھڑکی مین سے جواب بند ہے مجرمان گرفتار شدہ اپنے قید خانے مین پونہچاے گئے تھے اس دروازے سے آگے جاکر ایک صحن وسیع روبرو دروازہ جلوخانہ کے ہی اس صحن مین سواری اور جلو شاہی تیار ہوکر آراستہ ہوا کرتی تھی یہانسے آگے جاکر ایک دروازہ ہی اوس پر دہ پڑا تھا اوس سے گذر کر چینی باغ ہے اسکا نام چینی باغ اسواسطے تھا کہ اوس مین اسباب چینی کا باغ کی آرایش کو لیے تھا وہانسے آگے جاکر اور ایک دروازے سے گذر کر حضرت باغ ہی اس باغ کی جانب اسنت

چاندی والی بارہ دری ہی اس بارہ دری مین فرش چاندی یعنی نقرہ کا تھا
اور اوسی جانب خاص مقام اور بادشاہ منزل ہی جس مین خاص کر بادشاہ
رہا کرتی تھی اس بادشاہ منزل کا بیان پیشتر ہو چکا ہی کہ اوسکو سعادت علیخان
نے تعمیر کیا تھا اب واجد علی شاہ نے اوسکو اپنے نقشہ قیصر باغ مین شامل
کر لیا تھا اوس دروازے جس سے گذر کر حضرت باغ کو آتے ہین
نواب علی نقی خان وزیر اس مراد سے رہتا تھا کہ ہمیشہ قریب بادشاہ
کے رہے اور ہر وقت بادشاہ کی حرکات سے خبر لیتا رہے ہی بجانب
جب اس مکان کے تعمیرات جو لکھی ہی یہ تعمیرات عظیم اللہ خان جانم
شاہی نے بنوائی تھین اور بادشاہ کے ہاتھ چار لاکھ روپے کو بیچ
ڈالی تھین ان تعمیرات مین خاص خاص محلات شاہی اور خاص مخلصلعبہ رہتی تھین
اور بیگم مفسدہ بھی انھین تعمیرات مین رہتی تھی اور ایک اصطبل مین
جو متصل ہے قیدیان انگلشیہ کے ہفتے تک مقید تھی یہان سے
آگے بڑھکر ایک درخت ہی جسکے نیچے سنگ مرمر کا فرش کیا گیا ہے
اور اس درخت کے نیچے واجد علی شاہ زرد کپڑے مثل فقیران پہنکر
میلے کے دنون مین بیٹھا کرتے تھے یہانسے آگے بڑھکر لکھی دروازہ
ہی جسکی تعمیر مین لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا اور اوسکے آگے چوک خاص قیصر باغ
کا ہی جسکے گرد جسقدر مکانات ہین سب مین حرم شاہی رہا کرتی تھین

بماہ اگست یہان ایک بڑا میلہ ہوا کرتا تھا اور اوس میں سب شہر والے
بغیر مزاحمت کے بار پاتے تھے اس سے آگے مہتر والی بارہ دری ہے
جس مین اب تماشا گاہ مقرر ہوا ہی اور لکھی دروازہ مغربی سے غرب
کیطرف قیصر پسند ہی جسکے گرد نصف دائرہ ملمع طلا کا بنا ہوا ہی اسکو
روشن الدولہ وزیر نصیر الدین حیدر نے تعمیر کیا تھا اور واجد علی شاہ
نے ضبط کر کے معشوق السلطان اور محل خاص کو عطا کیا تھا یہ دروازہ
بھی اوسی مقام کا ہے جیسا مغربی لکھی دروازہ ہی اور اس تعمیر کے نیچے کے
مکانات مین جنٹلمین انگلشیہ جو دہور ہرے سے آئے تھے مقید تھے
اور یہان سے قتل گاہ کو پہونچائے گئے تھے بجانب راست اس مکان
کے ایک اور جلو خانہ اوسی قسم کا جیسا بجانب مشرق بیان کیا گیا ہی
اسمین سے محلات مین گذر کر اور اوسکے نیچے کی جانب چلکر باہر حد و د
قیصر باغ کے جو روبرو شیر دروازے کے ہی آتے ہین اس شیر دروازہ
کو نیل دروازہ بھی کہتے ہین کیونکہ اسی دروازے مین جنرل نیل صاحب
گراب کے گولے سے جو قیصر باغ کے دروازہ کی توپون سے
آیا تھا جان بحق ہوے تھے

## تاریخ

| | |
|---|---|
| جو قیصر باغ را تعمیر فرمود | دل رضوان بہ جنبش گفت بازک |

بصد جوشش بهارش کلک شمشیر | نوشته سال آن باغ مبارک

## تاریخ نهر سنگین قیصر باغ که خطاب او چشمهٔ حسن بست ۱۲۶۶

حضرت سلطان عالم ابر جود و بحر عدل | ساحل دریای رحمت قلزم حسن صفات

نهر سنگ ابیض از حکمش بنا شد با دو تاب | صورت عین کرم شد چشمهٔ نهر التفات

سال طیاری سروش غیب از شمشیر گفت | چشمهٔ حسن آبروی منبع آب حیات

## تاریخ باره دری سنگین واقع قیصر باغ ۱۲۶۹

چون حضرت سلطان عالم شاه اختر دین پناه | واجد علی شاه زمن خاقان تمم قیصر حشم

فرمود این باره دری سنگین بصد خوبی بنا | از بهر تشریف آوری مقدم شاه امم

از حسن نیت چونکه در چار دهٔ معصوم شد | نظارهٔ عتبات عالیات گردیده هم

آمد چو کس بهر زیارت اندران عنوان دهد | آواز طبتم فادخلوها خالدین هر در قدم

شمشیر چون تاریخ آن پرسید از روح الامین | گفتا مکرر از ادب قیصر ارم بیت الحرم

## تاریخ باره دری نگینه والی واقع حضرت باغ ۱۲۶۹

زینی قصر جمع شد بحضرت باغ تعمیر | از امکان مینماید ناز به خلد برین هند

پی سالش چو جستم کلک شمشیر این رقم کرد | شده باره دری با نگین زرنگین هند

## تاریخ دروازهٔ اول قیصر باغ ۱۲۶۹

ساخت قیصر باغ چون شاه زمان | شد درش رشک در باغ جنان

زد رقم شمشیر بر محراب آن | سال دروازه در باغ جهان

## تاریخ دروازہ دوم

| | |
|---|---|
| در باغ قیصر بلند در رفیع | کہ یا بندازان کیف زبادور ند |
| در نیاب بشمشیر کرد خود فسکر | ندا داد رضوان در باغ ہند |

۱۲۶۶ از ہجری

## مقبرہ سعادت علی خان

درمیان گوشۂ قیصر باغ اور چینی بازار کے دو قبرین ہین ایک تو سعادت علیخان کی جنکو بعد مرگ جنت آرامگاہ کہتے ہین دوسری اونکی بیگم مرشدزادی کی یہ دونوں قبرین ان دونو نکی وفات کے بعد غازی الدین حیدر نے تعمیر کرائی تھین اس سے محبت ملبشری ظاہر ہو اس مقام پر اول ایک مکان تھا جس مین غازی الدین حیدر خود حین حیات رہتے تھے اور ایک بات مشہور ہے کہ جب غازی الدین حیدر تخت پہ بیٹھے تو ظاہر کیا کہ جب مین سعادت علی خان کے تخت اور محل پر قابض ہوا تو مجھے لازم ہی کہ اپنا مکان اون کو دون اسی خیال سے فوراً حکم دیا کہ جس مکان مین وہ رہتے تھے اوسکو مسمار کر کے ایک قبر سعادت علیخان کی تعمیر ہو + +

## مکان چھتر منزل

جسکو نصیر الدین حیدر نے واسطے سکونت محلات حرم کے تعمیر کیا تھا اور جسکے متصل کوٹھی فرحت بخش اپنے رہنے کیواسطے بنوائی تھی

اس مکان کا نام چھتر منزل اسواسطے قرار پایا تھا کہ اوسکے اوپر چھتر طلائی بنے تھے اور نہ اس لحاظ سے یہ نام اوسکو دیا تھا کہ وہ چہار منزلہ ہے جیسے بعض بعض تصور کرتے ہین اس مکان کے ایک جانب کچہری صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی ہو اس مکان کی وہ طرف جو جانب دریا ہے اور جسپر نشان گولہ ہای اتواپ جنرل اوٹرم صاحب کے موجود ہین واسطے دربار عام اور دیگر امور عامہ کے تیار ہوتا ہے

## کوٹھی فرحت بخش

یہ کوٹھی عہد سعادت علیخان سے محل شاہی تھا اور واجد علی شاہ کے اوس عہد تک مقام قیام شاہ رہا جب تک قیصر باغ تیار نہین ہوا تھا اس کوٹھی کی وہ جانب جو لطرف دریا ہے اوسکو جنرل مارٹین صاحب نے تعمیر کرکے نواب وزیر کے ہاتھ فروخت کیا تھا باقی تعمیرات جو اس سے ملحق تھین اور تختگاہ سب سعادت علیخان نے بنوائی تھین ان تعمیرات مین تختگاہ جسکو قصر السلطان کہتے تھے اور اب یہ مکان یادگارانہ مرتبہ جو کہ خالی پڑا ہی وہ صرف واسطے دربار شاہی کے آراستہ ہوا تھا اور جب کبھی نیا بادشاہ جلوس کرتا تھا تو اوسکو صاحب رزیڈنٹ اس محل مین تخت نشین کرتے تھے اور نذر دیتے تھے اس نذر سے مراد یہ تھی کہ سرکار گورنمنٹ نے اس تخت نشینی

کو منظور فرمایا اسی کوٹھی مین بادشاہ بیگم نے مناجان کو تخت پر بٹھانے
کا ارادہ کیا تھا اور جسکا حال مسٹر ولیم سلیمن صاحب نے اپنی تواریخ
اودہ کی دوسری جلد مین تحریر کیا ہی اور اسی کوٹھی مین اوسوقت
مقیمین ہمراہی بادشاہ بیگم سے کرنیل لو صاحب رزیڈنٹ پر ارادہ
جبریہ نذر دلوانے مناجان کا کیا تھا بدین لحاظ کہ اگر نذر گذر جاویگی
تو تخت نشینی مناجان کی صدر گورنمنٹ تک ثابت ہو جاے گی

## کوٹھی رزیڈنسی

یہ کوٹھی بہت مشہور ہی اور اسکا بیان مفصل ضرور ہی جب نواب
آصف الدولہ بہادر دولت خانے مین رہتے تھے جسکا حال
دفعہ ۲۶ مین درج ہی صاحبان رزیڈنٹ بہادر اوسیکے ایک مکان
مین تشریف رکھا کرتے تھے لیکن جب نواب سعادت علی خان نے
کوٹھی فرحت بخش اپنے رہنے کو بنوائی تو اوسکے نزدیک ایک
کوٹھی صاحب رزیڈنٹ کیواسطے بھی تعمیر ہوئی اور اول مین اس
کوٹھی رزیڈنسی مین کوئی پہرہ خنگی نہین رہتا تھا مگر جب کرنیل بیلی صاحب
رزیڈنٹ مقرر ہوے تو اونکے ہمراہ ایک گارد تعینات ہوا تھا
اور ایک مکان بھی دروازہ احاطہ رزیڈنسی کے نزدیک ادسکے انتظام
سعادت علیخان نے بنوا دیا تھا اور یہ دروازہ تمام دنیا مین نام

دروازہ بیلی گارد مشہور ہو گیا اس تعمیر کا نقشہ اور بیان گنس صاحب نے اپنی کتاب مین اور دیگر کتب مین تفصیل بیان کیا ہی اور اب بیان اوسکا اس مختصر مین موجب طوالت ہے

## پل آہنی

یہ پل حسب الحکم بادشاہ غازی الدین حیدر کے ولایت انگلستان سے طلب ہوا تھا مگر قبل آنے پل مذکور کے وہ آپ شنا ور بحر بقا ہوئے اور اونکے لڑکے نصیر الدین حیدر نے بعد تخت نشینی کے سگار صاحب کو جو اونکا ملازم تھا اوسکی درستی کا ٹھیکہ کر دیا صاحب موصوف نے کچھ کوٹھیان واسطے اوسکے برپا کرنے کے ہو برو ہی کوٹھی رزیڈنسی کے جہان ایک چھوٹا سا گھاٹ اور شوالہ اب ری دریا واقع ہی گلائین اور یہ کوٹھیان ابتک نمودار ہین مگر اوس سے اسکی درستی نہو سکی اور اسی سبب سے پل مذکور برپا نہوا تا وقتیکہ امجد علی شاہ بعد محمد علی شاہ کے تخت نشین ہوئے اور اس بادشاہ نے ارادہ کیا اور اپنے عزم کو ختم بھی کیا یعنی یہ پل آہنی قائم ہو گیا

## تاریخ پل آہنی از منشی ظفر علی اسیر

| | |
|---|---|
| ان بادشاہ عادل کز حکم بحکم اد | گردید آہنی پل بر گومتی مودار |

| | |
|---|---|
| چون حکم شاہ بحکم چون عدل شاہ ہوا ۱۲۶۴ | فرمود حکم سلطان تاریخ نظم کردم |

## پل پختہ

نواب آصف الدولہ بہادر نے قریب شنشاہ کے تعمیر کیا تھا

## تاریخ

| | |
|---|---|
| بتدبیر نیک وبعقل رزین | پل نو بنا گشت بر گومتی |
| بگفتا پل استوار ومتین ۱۲۲۶ | چو از نہسم خود سال اوخواستم |

## قلعہ مچھی بھون

یہ قلعہ جسقدر سابق مین تھا جسکا نام اصل مچھی بھون ہے اوس سے زیادہ وسیع ہوگیا ہے سابق مچھی بھون صرف اوسقدر تھا جسقدر برج پختہ سڑک کے جنوب کی جانب موجود ہے اور یہی قلعۂ لکھنو تھا اور بہت مستحکم قلعہ دو سو برس پیشتر مشہور تھا ایک مثل قدیم مشہور ہے کہ جسکے پاس قلعۂ مذکور رہیگا وہی مالک شہر لکھنو ہوگا اس رسالے کے شروع مین جو مختصر حال لکھنو لکھا ہے اوسمین احوال اور نام اس قلعے کا درج ہی اور وہ ٹیلہ جو راستے کے بیچ مین درمیان گھونگھٹ قلعہ کے واقع ہی اور جسکے اوپر مسجد بنی ہوئی ہی وہ لچھمن ٹیلہ مشہور ہی اور اسی جگہہ سابق لچھمن پور آباد تھا عقب مچھی بھون خاص کے بجانب جنوب

ومغرب ایک میدان ہے جس مین توپخانے کا گودام ہی اوس مقام
پر رنگ محل اور پیچ محلہ آباد تھے اور یہ پیچ محلہ نہایت قدیم مکانات
شہر لکھنؤ کے تھے جنکو خاندان شیخان نے جو سابق حاکم اس
جگہ کے تھے تعمیر کیا تھا جب سعادت خان جو مورث اعلے
خاندان شاہی اس ملک کے تھے ۱۷۳۲ء مین صوبہ دار ہو کر یہاں آئے تھے
تو یہ مکانات بکرایہ چار روپے ماہانہ مالکان مکانات سے
لیے تھے اور روپیہ کرایے کا اونکے عہد تک ادا ہوتا گیا مگر اون کے
وارثون نے بباعث تکلف آرای پادشاہان لکھنؤ کے اونکو
مال سرکار تصور کیا اور صفدر جنگ اور شجاع الدولہ نے تو البتہ
اس عمل کو جاری رکھا کہ زر کرایے کا مالکان مکانات مذکورہ کو دیا
مگر زر کرایہ ادا نہین کیا لیکن آصف الدولہ نے یہ عمل بھی ترک کیا
اور مکانات کو بالکل ضبط سرکار کر لیا یہ بات محتاج بیان کی نہین
بلکہ مشہور عام ہی کہ یکم جولائی ۱۸۵۷ء مین جو فوج سرکاری اوس مین
تھی اوسنے کسطرح اس قلعے کو خالی کیا تھا اور کیونکر بیلی گارد
کی جا کر شامل ہوئی تھی اور کس حکمت دور مطلب آرائی سے اس قلعے کو
فوج سرکاری نے بروقت یہان سے نکل جانیکے اُڑا دیا تھا ۔

## بڑا امام باڑہ

یہ عمارت گویا تعمیرات لکھنو مین ازہمہ بہتر و اعظم ہی اور نواب آصف الدولہ
کی سلطنت کے کارہای عظام مین سے عظیم تر یہ مشہور ہی کہ نواب
ممدوح نے بیشمار روپیہ اسکی تعمیر مین صرف کیا ہی اور عوام مین مشہور
ہی کہ اس مین دس لاکھہ روپیہ خرچ ہوا ہی شاید اس مین کچھہ
مبالغہ بھی ہو کیونکہ قول ہندیان ایسے مقام مین ہمیشہ ساتھہ مبالغہ
کے ہوا کرتا ہے کاریگر اس کام کیواسطے بہت دور دور سے طلب
ہوے تھے اور سبکو حکم ہوا تھا کہ اپنی اپنی رای سے نقشجات
واسطے اس مکان کے پیش کرین صرف تاکید یہ تھی کہ کسی عمارت
کی نقل نہو اور یہ مکان ایسا تیار ہو کہ کبھی ایسا پیشتر نہ بنا ہو
اور جتنی تعمیرات مشہورہ ہین سب سے زیادہ خوش قطع اور خوش
اسلوب ہو کفایت اللہ ایک شخص تھا جسکی تدبیر سے یہ تیار ہوا ہے
اور جیسا وہ اب موجود ہے اوس سے ظاہر ہے کہ جو شمہ انتظا
نواب کی بحتین اونمین کمی نہین ہوئی ہی یہ عمارت اوسیقدر مضبوط
ہی جسقدر خوبصورت اور خوش قطع ہی بنیاد اسکی بہت عمیق ہے
اور ساری عمارات مین لکڑی کا کام بالکل نہین ہے اوسکی در
وسعت ۱۶۷ فٹ سے ۵۲ فٹ تک ہی اور نواب آصف الدولہ بہادر
بعد وفات کے اسی مقام مین دفن ہوے ہین ؞

# تاریخ امام بارہ کلان

| | |
|---|---|
| کرد نواب آصف الدولہ | چون بنا جای غم بحسن یقین |
| داد ہاتف خبر ز تاریخش | روضۂ امجد امام دین |

۱۲۲۵

## جامع مسجد

یہ عمارت متصل امام باڑے کے ہے اور لائق تعریف نہیں
یہ مسجد نقل ہے اوس جامع مسجد کی جو شہر دہلی مین ہے

## رومی دروازہ

یہ دروازہ بھی نواب آصف الدولہ کے وقت مین تعمیر ہوا ہے، اور مشہور ہے کہ نقل دروازہ روم کی ہے مگر جو لوگ روم کو دیکھہ آئے ہین وہ بیان کرتے ہین کہ ایسا دروازہ کوئی شہر روم مین نہین ہے غالب ہے کہ نواب کو کسی شخص نے مغالطہ دیا ہو کیونکہ اگر وہ چاہتا کہ نقل دروازہ روم کی بنے تو اس مین شک نہین کہ دو صد نقشہ دروازہ ہای روم دوسرے ہی روز اوسکے سامنے پیش ہوتے یہ دروازہ اور امام باڑہ کلان دونون اوس زمانے مین بنا شروع ہوے تھے کہ جب لکھنو مین قحط سالی تھی اور اسی لحاظ سے یہ عمارات عالی شروع ہوئی تھین کہ جس سے غربا باشندۂ شہر روزینہ پاوین

## دولتخانہ

اس دروازے سے جو غرب کو چلو تو دولتخانہ یا محل قدیم لکھنو بجانب راست رہتا ہی یہ تعمیر یعنی دولتخانہ مشتمل ہے اوپر متعدد مکانات کے جو متصل ایک دوسرے کے ہین مگر اونمین کچھہ ہنر معمار کا صرف نہین ہوا ہی ان مکانات مین نواب آصف الدولہ اور اونکے عملے رہا کرتے تھے جب نواب نے فیض آباد کو چھوڑ کر لکھنو کو اپنا دار القرار ٹھہرایا تھا اور خاص محل نواب کا اوسیکے نام سے مشہور تھا یعنی جس مکانمین وہ آپ رہا کرتے تھے اوسکو آصفی کوٹھی کہا کرتے تھے مگر جب سعادت علی خان بعد اونکے مسند نشین ہوے اور قیام اپنا اونھون نے فرحت بخش مین مقرر کیا تھا تو یہ مکانات خالی رہے اور اسی سبب سے خستہ اور شکستہ ہو گئے

## امام باڑہ حسین آباد

صرف یہ عمارت محمد علی شاہ سوم پادشاہ کے زمانے مین تیار ہوئی تہی اور ہر چند اس مین کچھہ کاریگری صرف نہین ہوئی ہے مگر خوش اسلوبی مین کسی اور عمارت لکھنو سے کم نہین اسکا باغ جو مربع ہی اوسکی خوش وضعی کو اون عمارات نے جو اوسمین بطور نمونہ تاج روضہ کے بنی ہین اور چہوٹی چہوٹی عمارات جو اوسمین ہین اونھون نے

خراب کردیا ہی اس حسین آباد مین بڑی رونق معلوم ہوتی ہی جب اوسمین
شب کو روشنی ہوا کرتی ہی اور جب لکھنو مین سلطنت تھی تو محرم مین
بڑی دھوم ہوا کرتی تھی محمد علی شاہ نے اپنی والدہ و بیٹی کو اوسمین دفن
کیا ہے اور یہ بھی حکم دیا تھا کہ اونکا جنازہ بھی اوسمین دفن ہو اور
زر کثیر واسطے تزاید رونق اس امام باڑے کے نام نہاد
کیا تھا جو داروغہ مہتمم اس امام باڑہ کا قبل از بلوے کے تھا اور
باعث اوسکے عکس کی تصویر اوتھینچنے کے اکثر صاحب لوگون سے
اوسکی ملاقات تھی مگر وہ اس بلوے مین مع مال و جان متفق مفسدین
کے ہوا تھا اور ایک گروہ کا جرنیل ہوگیا تھا اور اوسکی ملاقات
تمامی صاحب لوگون کے کسیطرح باعث اوسکے شامل ہونیکی نہوئی

## تاریخ امام باڑہ

| | |
|---|---|
| جناب محمد علی پادشاہ | پسندیدۂ بارگاہ اِلٰہ |
| بصدق وصفا تعزیہ خانہ ساخت | بلند از سما تعزیہ خانہ ساخت |
| خرد سال جای عزای حسین | بگفتا مزار شہ تشنہ تیر |

١٢٥٣

## تاریخ دروازہ امام باڑہ

| | |
|---|---|
| شاہنشہ زمانہ ہو نوشیروان عصر | فرمانروای عالم امکان بود مدام |
| باب امام باڑہ والا بنا نمود | یارب بود قبول بامام فلک مقام |

ہاتف بگفت مصرعۂ سال آن بنا — باب امام باڑہ سلطان خاص و عام
۱۲۵۳

## تاریخ سبیل

نوشیروان عصر ابو الفتح شاہ ہند — مقبول بارگاہ شہ مشرقین ہے
رکھوائی ہے سبیل تو تاریخ یہ ہوئی — اب یہ سبیل نذر جناب حسین ہے
۱۲۵۴

## تاریخ چاہ

آب این چاہ ز شیرینی خود — شربت قند و نبات پاک ست
راست تر مصرع تاریخ رسید — چشمۂ آب حیات پاک ست
۱۲۵۴

## تاریخ حمام

سلطان جہان خدیو عادل — کسرای زمانہ شاہ عادل
حمام لطیف کرد تعمیر — تاکید نمود بہر تطہیر
تاریخ معید ہست ظاہر — حمام لطیف حوض طاہر
۱۲۵۴

## تاریخ سڑک

خسرو ہند ابو الفتح معین الدین است — رشک شاہان جہان بادشہ ہندستان
چون سڑک ساخت بنا مصرع تاریخ بگفت — ہست این نوع سڑک جادۂ راہ ایمان
۱۲۵۳

## تاریخ ضریح

عرش آئین ہی یہی کہیں عالی مقام ہے — یہ روضۂ حسین علیہ السلام ہے
تاریخ اس ضریح کی مطلوب جب ہوئی — بولے ملک ضریح قبول امام ہے
۱۲۵۴

## تاریخ سرای حسین آباد

| | |
|---|---|
| ابو الفتح منصور شاہ زمانا | محمد علی سایہ حق تعالے |
| رضا گفتہ تاریخ از حکم سلطان | سرائی ابو الفتح شاہ معلے |

## تاریخ رصد حسین آباد ۱۲۵۵

| | |
|---|---|
| چو محمد علی شہ دوران | ساخت در لکھنو رصد تیار |
| مکر دسالش رستم مہندس فکر | این رصد شد بحکم شہ تیار |

## تالاب نہہ کھنڈہ حسین آباد ۱۲۵۴

متصل حسین آباد کی محمد علی شاہ نے ایک بڑا تالاب تیار کیا تہا جو اب سر راہ ہو گیا ہے اور متصل امام باڑے کی تعمیر ایک مسجد کی شروع کی تہی جسکو اونہون نے چاہا تہا کہ جامع مسجد سے بہتر بنے مگر اونکی حیات نے وفا نکی اور قبل اوسکے ختم ہونے کے وہ خود ختم ہو گئے یہ مسجد ناتیار اب تک موجود ہے مگر چونکہ اوس وقت سے اب تک مرمت بھی نہین ہوئی اور اب عرصہ اٹھارہ برس کا ہوا اسواسطے اب وہ بہت خستہ و شکستہ ہو گئی ہے امسال ۱۸۶۳ء مین نماز عید الفطر کی بھی اسی جامع مسجد مین ادا ہوئی پہلے شرف الدولہ غلام رضا خان کی کاظمین مین ہوا کرتی تہی اس بادشاہ نے ایک اور تعمیر شروع کی تہی جسکو نہہ کھنڈہ کہتے ہین اور

اور ارادہ تھا کہ اسکو سات منزل کا بنواکر اوسکے اوپر سے سیر
تمام عمارات شاہی کی جو اوسنے میان شہر پایل بنوائی تھی کیا کرے
مگر یہ تعمیر بھی ناتیار رہگئی اور صرف چار منزل اوسکی پوری ہوئی

## تاریخ جامع مسجد

| | |
|---|---|
| شاہ ہندوستان معین الدین | فخر کسرا و قیصر و فغفور |
| نام نامی حضرت اعلے | بمحمد علی شدہ مشہور |
| مسجدے بی نظیر کرد بنا | بخدا ہست رہبری منظور |
| ہر منارہ عماد گردون شد | پیش گنبد نماند رفعت طور |
| مہتمم گشت اعظم الدولہ | جان نثار حضور شد مامور |
| برق موزون نمود تاریخش | مسجد جامع جدید حضور |
| | ۱۲۵۶ |

## موسی باغ

یہ باغ نواب آصف الدولہ نے تیار کروایا تھا اور جو تعمیرات
اوسمین ہین اونکو سعادت علی خان نے واسطے سیرگاہ
خاص کے بنوایا ہے اونکے وقت مین لڑائی حیوانات کی اوس
مین ہوا کرتی تھی اس نام کی روایت مشہور یہ ہے کہ ایک روز
آصف الدولہ سوار اوسطرف جاتے تھے اور سب ہمراہی پیچھے تھے
کہ وہان ایک چوہا یعنے موش نکلا اور نواب کے گھوڑے کی

تاپ سے وہ مرگیا اوسکے مرنے سے کچھ دلمین اوسکے رنج آیا اور
اِس لیے حکم دیا کہ ایک قبر اوس موش کی اوس مقام پر تیار
ہو اور باغ بھی بنے اور اوسی موش کے نام سے یہ تعمیر مشہور
ہوئی کیونکہ موش کو ہندی مین موسا کہتے ہین مگر ایک اور
روایت بہت قرین قیاس یہ ہے کہ سعادت علی نے یہ تعمیر
باہتمام ایک فرانسیس کے تیار کروائی تھی اور مہتمم کا نام تو بھول گئے
مگر اوسکا اول کا حرف یعنی موسیو یاد رہا جسکی کثرت استعمال سے تخفیف ہوکر رہگیا

## مکانات اراکین شہر

شہر لکھنو مین کوئی تعمیر ایسی نہین جسکی خوش وضعی قابل تعریف کی ہو
یا جو ایسا قدیم ہو جسکا ذکر کرنا واجب آوے

چوک شہر کا نواب آصف الدولہ کے وقت مین تیار ہوا تھا
اور جو دو دروازے اوسکے دونون جانب ہین اونمین سے ایک
دروازہ جو جانب جنوب ہی اوسکو بہت قدیم بتلاتے ہین اوسکا
نام اکبری دروازہ ہی اور مشہور ہے کہ جب اکبر شاہ نیپال پر گئے تھے
شہر لکھنو ہوکر گئے تھے اور جب نیپال فتح کرکے آئے
یہ دروازہ یہان تعمیر کیا تھا مگر اس روایت کی صداقت
کسی کتاب تاریخ سے نہین ہوتی اور غالب ہی کہ غلط ہو کیونکہ

ایک آدمی کے نام کے سبب سے اوسکی تعمیر قرار دینا موجب تامل مگر ایک روایت قرین قیاس ہی کہ کسی صوبہ دار اودہ نے اوسکو بنوایا تھا اور جس بادشاہ کے وقت مین کہ اول صوبہ داری اس علاقی کو قرار پائی تھی اوسکے نام سے اوسنے اس دروازے کو مشہور کیا جو کہ سے اگے بجانب کانپور چلو تو دو عجیب درگاہین ملتی ہین ایک کو کاظمین کہتے ہین جسکو شرف الدولہ نے بنوایا تھا اور مشہور ہی کہ یہ درگاہ نقل مقبرۂ امام موسی کاظم ہے اور دوسری کربلا دیانت الدولہ کی نقل مقبرۂ امام حسین ع کی ہی جو کربلا مین بنی ہے

## تاریخ کاظمین شرف الدولہ

| | |
|---|---|
| مشہد اقدس بنا چون شرف الدولہ کرد | سایۂ لطف قدس شد بفضل شہ خافقین |
| از شرف شمسہ اش گشتہ منور زمین | گنبد گردون ازان یافتہ صد زیب و زین |
| واہ چہ شرف النسا کرد اعانت دران | ہر دو شرف یافتند از قدم اشرفین |
| رابعہ گون داشتم در شرف از بہر شعر | صحت لفظی مگر اعادہ از مختتین |
| نکرہ شہ شبیر شد چون پی تاریخ سال | گفت سروش فلک گو حرم کاظمین |

۱۲۶۹

یہ دونوں درگاہین جب تک اونمین روشنی چراغان نہو کسیطرح لائق تعریف کے معلوم نہین ہوتین اور قابل دیکھنے کے نہین بلکہ اونسے صاف ظاہر ہوتا ہی کہ ایسی بد وضع عمارت بھی انسان بنوایا کرتے ہین

## درگاہ حضرت عباس

ایک اور درگاہ متبرک اہل اسلام مین ہے ایک روایت مشہور ہے کہ سعادت علیخان اسی مقام مین تعزیہ دیکھ کر یکایک چونک اوٹھے اور اوس روز سے وحشت و بدمزاجی جو اون کے مزاج مین سابق تھی اوسکو چھوڑ کر بہت رحم دل اور ضعف دل ہوگئے تھے مگر یہ روایت متعصبی لوگون کی مشہور کی ہوئی معلوم ہوتی ہے

## تاریخ درگاہ حضرت عباس

این گنبد جدید بنائے سعادت ست

## ملکہ زمانیان کا امام باڑہ

یہ امام باڑہ گولہ گنج مین بسبب وسعت اور فراخی کے مشہور ہے یہ گویا ایک شہر ناف شہر مین واقع ہے مگر اوس مین کوئی تعمیر لائق تعریف کے نہین

## وینگفلڈ منزل

یہ عمارت عالیشان تعلقہ دارون کی طرف سے یادگار جناب سر چارلس وینگفیلڈ صاحب بہادر چیف کمشنر اودھ بحسن اہتمام راجہ درگبجی سنگھ صاحب بہادر و مہاراجہ مانسنگھ صاحب بہادر طیار ہوگئی ہے اسکے طیاری مین قریب دو لاکھ روپیہ کے صرف ہوئے

# شہر لکھنؤ کے باشندون کا حال

آدمی را بچشم حال نگر
از خیال پری و دیو بگذر

۱ بڑا خاندان شاہی ہی اگلے نواب اور بادشاہون کی نسل سے اونکے پوتا اور نواسا اور بیگمات وغیرہ بکثرت ہین سبکا علی قدر مراتب وثیقہ ہی عیش وعشرت سے گذران کرتے ہین

۲ شاہ دہلی کی نسل سے اولاد جہاندار شاہ و مرزا سلیم سے بھی یہان چند شاہزادے ہین اسی سرکار سے اونکو وثیقہ و پنشن سے قوت لایموت ملتا ہی

۳ عزیزان برہان الملک سعادتخان سے شاہزادہ ہای نیشاپوری کا بھی عالی خاندان ہی اونکے وثیقے بھی اچھے اچھے ہین سب چین کرتے ہین مگر بعض بیچارون کا وثیقہ غدر کی چپقلش مین بند ہوگیا اوس سے یک لخت فقیر ہو گئے - تمام افسوس ہی و عبرت

اونکے بعد امرای شاہی ہین جنکی نسل بطور واسطہ دار ہی اکثر وثیقہ دار اور صاحب معاش موروث وغیرہ سے خوش گذران ہین اونمین ہندو بھی ہین اور مسلمان بھی تہوا اونکے ہندو مسلمان سوداگر تاجر مہاجن بھی کروڑپتی لکھپتی سے لیکر ہزارپتی تک اکثر ہین اور ساکھ اچھی مگر بہ نسبت عہد شاہی کے روزگار اونکا سست اور معاش واجبی ہی مگر غنیمت

بعد اونکے لوگ روزگار پیشہ یہان جو اسی شہر یا بیرونجات اور اور ملک مین روزگا
کرکے بسر اوقات کرتے ہین

علم کی کثرت ملا فاضل اکثر عربی فارسی کا درس اور علم بیان کا مشہور اور طبیب کثرت
اور یہ شہر علم کی ٹکسال ہر علم و فن کا آدمی یہان ہی اور طبیعت دار و ذکی خوشنویس
بہی ہر خط کے وصل علی حافظ خوش الحان ایک سے ایک اعلی

پہر اہل حرفہ اہل حرفہ ہر قسم کے دستکار صناع موجد بیکدست ہر کام مین
کماکہلاتے ہین اور بہ نسبت اور شہرون کے یہان کے صناع غنیمت اسی طرح
دوکاندار بہی کہ وہ بہی ایک فرقہ ہی یہان بسبب شیعہ مذہب کے مسلمان بقال
اور حلوائی وغیرہ دوکاندار بہی اکثر ہین

اس شہر کا جوتا اور کلاہ زری و کارچوب کامدانی اور خمیرہ تماکو اور زیور مرصع
اور زیور و ظروف طلا و نقرہ و کمہار و نقاش و آتشباز و چکن ساز عمدہ سے عمدہ
مشہور دیار و امصار و دساور ہر دور دور مال جاتا ہی مگر بہ نسبت عہد شاہی کے
یہ سب کام اب کم ہی صرف بہی کم ہی

ہندو مسلمان کے میلے بارہ مہینے اس شہر مین بکثرت اور دہوم سے ہوتے
رہتے ہین مگر بڑی دہوم دہام محرم کے عشرے مین ہوتی ہی غرہ محرم سے
دہم روز تک اور کہین پندرہ دن بہی ہزارون گہر مین روزمرہ مجلس تعزیت رہتی ہی
خیرات ہوتی ہی شیعہ پلنگ پر نہین سوتے شادی کی رسم نہین کرتے زیور خوش پوشاک

نہین پہنتے پان نہین کہاتے لعزیہ داری ہر گہر مین ہوتی ہی امام باڑے بہت سے

اور اونمین آرایش اور روشنی بکثرت اور مرثیہ خوانی سوز راگ اور تحت لفظ

جہان مین بی نظیر کتاب خوانی و ماتم بی انتہا — عیش باغ اور علی گنج اور

سورج گنڈ کا میلہ بہی مشہور ہی

مواجد علیشاہ کے جانے سے ہزارون آدمی اور اکثر امرا اور وزیر و بیگمات بہی

اونکے ساتھ کلکتے چلے گئے اسلیے رونق شہر کی بالکل کم ہی جس سے

کلکتے مین اونکی ایک علحدہ آبادی تکلف اور سامان کی وعجیب خوش

معلوم ہوتی ہی ع صد رہ بجا کہ نشیند صد رست +

مرد یہان کے تماشا بین عیاش تن پرور خوش باش اکثر ہین اسلیے یہان کی

عورت کا چلن بہی کم پسندیدہ ہی کسی زمانے مین لونڈے بازی یہان کی

مشہور ہی کبہی رنڈی بازی کبہی جوا کبہی نشا کبہی چوری مگر اب بہی جس قدر

خیرات اور علم یہان ہی اور جگہ کم ہی — ہزارون اونمین حاجی ہین جو کربلا

اور حج ہو آئے ہین اور ہر سال صد ہا ہزار ہا آدمی کا قافلہ جاتا ہی

موسم یہان کے سب غنیمت مگر برسات مین فضا اور سبزہ زیادہ خوشنما ہوتا ہی

اور ہوا دلچسپ شہر کی آب وہوا ذرا اچہی نہین پانی بہی بہاری ہی جابجا نشیب

فراز و نالہ وغیرہ مگر اب صفائی ہوتی جاتی ہی قرب دریا سے سفید بو سیتی

زیادہ ہی — حضرت گنج و ز امیدان اور بلندی پر ہی اس لیے وہان کی

آب و ہوا و فضا نہایت خوب ہی

ہندو و مسلمان مین بیہان شادی دہوم سے کرتے ہین روشنی آتش بازی تجمل آرایش
ناچ تماشا محفل تکلف اور سامان سے ہوتی ہی برات بہی اپنے اوسقدار سامان سے
دہوم سے لیجاتے ہین لڑکی کی طرف سے مقدور بہر جہیز بہی دیا جاتا ہی اور
اوسکو اپنی نیکنامی جانتے ہین ہندو کی برات سے قبل سوگی نام سامان زینت مع
تخت آرایش وغیرہ اوٹہتا ہی وہ زیادہ تر قابل دید ہی عجیب عجیب کہلونے میوہ
تصاویر مکان وغیرہ ہوبہو اصل جیسے ہوتے ہین

عہد واجد علیشاہ سے پریون کا ناچ اور زاونگے بہار بہی کا رواج ہی ایک اندر اور
دو چار دیو اور دو چار پری بنکر فسانہ حسن و عشق بطور قصہ کے گاتے ہین اور ایک
لطف آمیز کہانی سناتے ہین غرض گذشتہ حال عاشق و معشوق کی صورت کر
دکہاتے ہین یہ اور کسی شہر مین نہین ہی اونکا مجرا دس دس سے صد صد تک ہی
افیون تنباکو کا رواج زیادہ ہی اور رنگین پوشی کا بہی اس لیئے رنگریز ادرجتہ والے
اور تنبولی کی دکان اکثر ہین کوئی بازار اور کوچہ اور محلہ خالی نہین نہ لیک
خاص اس شہر کی ساقن مشہور ہین اور اکثر ہر میلے مین اونکا ایک بازار ہی علیحدہ
ہوتا ہی

ساقن ایک عورت ہی جو بن سجکر دکان حقہ و بنگ و چرس و گانجہ لگاتی ہی گالی
بجاتی بہی ہی تکلف سے دکان کرتی ہی اکثر بازاری بانکے اور افیونی حقہ باز

اونکی دکان پر حقہ انیون وغیرہ کہاتے پیتے ہین اونسکو ایک پیسے سے روپیہ تک دیتے ہین اونمین اگلے پچاس پچاس ہزار لاکہہ لاکہہ تک کی ذی مقدور بہی تہین اب بہی سو پچاس سے پانچ سات ہزار تک کی صاحب مقدور بہت ہین اونکے لباس و زیور اور انداز پر اجنبی آدمی یہی جانے کہ یہ بہی کوئی بیگم صاحب ہین بڑے بڑے عالیشان مکان اور محلات و محلہ و بازار کہدگئے اب بہی جابجا بازار بہت ہین مگر چوک کا بازار زیادہ رونق کا ہی ہر قسم کے دوکاندار جوہری بزاز دوشالہ فروش جفت فروش صراف مہندی والے و داگر نان بائی حلوائی عطر فروش گلفروش سبزہ فروش وغیرہ قسم قسم کے تکلف سے بیٹہتے ہین مگر ۴ بجے سے شام تک خوب گرم بازاری اور رونق و کثرت ہوتی ہی شہر کے امیر غریب بہی اکثر سیر کو آتے ہین یہ بازار عہد اکبر شاہ کا بنا ہوا ہی اسی سے اکبری دروازہ مشہور ہی عہد سرکار مین دو بازار کلان و عریض بننے شروع ہوئے مگر آبادی و عمارت اونکی ابہی ناتمام ہی

تر بازار اکثر اور یون بہی قوم طوائف اکثر رہتی ہین شام کو سج بنکر باہر کمرے پر بیٹہتی ہین اونکے ٹہاٹ اور زیور و پوشاک کا تکلف بیگمات سے کم نہین گانا بجانا بتانا یہان کا ہند مین ضرب المثل ہی کیون نہو جہان اونکے پرنانی نانی انکی بدولت نواب اور روسا ہو گئے اور وہ خود اکثر بیگمات بن گئین اور خود بادشاہ سلامت گاتے بجاتے ہون واقعی الناس علی دین ملوکہم۔

اونکا مجرا معہ رسے عسہ تک ہی سعہ انہین اکثر لکہتی بہی ہین سوا جیسے

بغاگنجیان ہی شمار مرض نحش کی کثرت اور عار کم معاذ الله

شہرون مین مسلمان اکثر ہندو اوسنے کم مگر باہم اتفاق اور سلوک اور رسم

مسلمان مین سنی کم اور شیعہ اکثر انکی تفصیل ضرور نہین اسی قدر بس ہی کہ دونون

مسلمان ہین مگر مثل رومن کیتہلک اور پراٹسٹنٹ کے نزاع لفظی ہی ورنہ

ہندو عورات کی وضع خاص ہوتی ہی مگر مسلمان مرد اور ہندو مرد کی وضع لباس

سب یکسان ہی داڑہی منڈانے کا رسم علی العموم اور داڑہی گہٹنا معیوب ہی

نفاست نزاکت خوشخوری خوشپوشی مکلف مکان اور دہوم شادی فضول خرچی

مین یہ لکہنو ہند مین انگشت نما گویا ہند کا پارس فرانس ہی

بعد دہلی کے اردو ریختہ زبان یہان کی ہند بہر مین فصیح اور صاف و شستہ

و مستند شعر و شاعری کا چرچا بکثرت ہمیشہ جا بجا مشاعرہ اب بہی ہوتا ہی ہر ایک اپنے

شعر ہر شاعر اگر پڑہتا ہی بہت سے شعرا نامی گذرے اب بہی اکثر ہین اور صاحب

دیوان علی ہذا مرثیہ گوئی مین انیس و دبیر ہی مثل مصحفی انشا میر جرات سوز

آتش ناسخ وغیرہ یہین کے شاعر ہین اور اب نثر مین سرور موجود وقت

جناب مولوی ہادی علی اشک تو جامع کمالات صوری و

معنوی نظم نثر فارسی مخصوص اردو زبان ریختہ و محاورہ مین

یکتائے روزگار ہین فقط

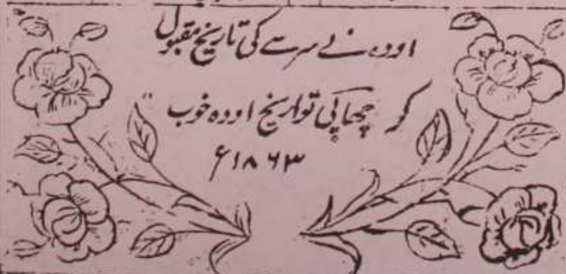
# خاتمہ

شکر و احسان خداوند حقیقی کا کہ عجلۃً یہ چند اوراق منطبع ہوئے
تصحیح و نظر ثانی مؤلف کی نوبت نہین پونہچی اکثر غلطی غلط نامہ سے
رفع ہو سکتی ہی اور اتفاقاً اگر ناظرین با تمکین سہو و خطا کہ لازمۂ بشریت ہے
پاوین معاف فرماوین ع گر ہیچ نقش بشر خالی از خطا نبود
منشی طوطا رام شایان کی توجہ سے بہم رسانی تاریخون اور تلاش مطالب
کے ستایانِ تعریف ہے اور سلاست فکر خداداد اونکی پسندیدۂ
صاحب نظر ہین سامنشی گوبند پرشاد متخلص فضا خوشنویس مطبع نے بدیہی

یہ ایک قطعۂ تاریخ موزون کیا

| | |
|---|---|
| چہپا احوال شاہان اودہ کا | عبارت جسکی ہی دلچسپ و مرغوب |
| جو ہین کرنل ابیٹ صاحب بجا | اونہین نے اونکی ہی تالیف منسوب |
| خدا پہر اونکو لاوے لکہنؤ مین | یہ دن فرقت کے ہون گہڑیونسے محسوب |
| فضا موزون ہوا تاریخ تالیف | کہ ہو اہل سخن کو دل سے محبوب |

اودہ نے سر سے کی تاریخ مقبول
کر چہاپی تواریخ اودہ خوب
۱۸۶۳ع



# اردو کدھر؟

کیا اردو کی لڑائی میں مسلمان تنہا ہیں ؟

———— ڈاکٹر سروپ سنگھ



اردو کی جنگ ایک بڑی جنگ کا حصہ ہے جو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۱ء تک جاری ہے۔ یہ بڑی جنگ ہندستان کو آزاد، باوقار دنیا میں سینہ تان کے سر اٹھا کے چلنے والا دیش بنانے والوں اور ہنوز غلامانہ فضا میں سانس لینے والوں کے درمیان برپا ہے۔ یہ جنگ اس مہان دیش کو سیکولر بنانے والوں اور عہد قدیم یا عہد متوسط کے اندھیروں میں بھٹکنے والوں کے درمیان ہر سطح پر برپا ہے۔ اردو کی لڑائی مذہب کی لڑائی یا فرقہ کی لڑائی نہیں ہے۔ یہ ایک بنیادی سیکولر لڑائی ہے جس کی حقیقت کو ہندستان کے بنیادی شہری اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ یہ آزاد ہندستان کے بنیادی شہریوں اور غلام ہندستان کے وفاداروں کے درمیان ایک لمبی لڑائی ہے۔ ۴۳/۴۴ سال بیت چکے اتنے ہی اور بھی بیت سکتے ہیں۔ ڈرنے کی اور مایوسی کی کوئی وجہ نہیں بس سمجھنا سمجھانا ہے جو بھی ہیں اپنے ہیں نا سمجھ ہیں غیر نہیں ہیں۔ آپ سمجھیں گے کہ اور کتنی بڑی طاقتیں اردو کے ساتھ ہیں سروپ سنگھ اور آنند نرائن ملا یا نارنگ یا رام لعل دو چار نہیں سیکڑوں ہیں اور یہ اردو اردو اس لیے نہیں کرتے کہ آپ کو خوش کرنا ہے بلکہ اس لیے کہ یہ ان کے عقیدے کا ایک جزو ہے ایمان کی ایک کڑی ہے کہ اردو کی لڑائی سیکولر ہندستان کی بقا کی لڑائی ہے —— ادارہ

ڈاکٹر سروپ سنگھ
(گورنر گجرات)

# کیا اردو کی لڑائی میں مسلمان تنہا ہیں؟

کیا ۔ اردو والوں
کو اپنی لڑائی تنہا لڑنا ہو گی؟ جی نہیں ایسا



ڈاکٹر سروپ سنگھ

نہیں ہوگا۔ یہ نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہونا ہی

چاہیے۔ اور اس کے کچھ وجوہ ہیں۔ ایک
تو یہ کہ ہندوستان کے چار کروڑ اردو

بولنے والے مسلمان اور دوسرے اردو کی

حمایت کرنے والے کسی ایک سیاسی پلیٹ فارم پر اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ چاہے آپ کچھ بھی کیوں نہ کریں۔ انھیں ایک جگہ اکٹھا کرنا عقل مندی کی بھی نہیں ہے۔ میں شہاب الدین صاحب کی اس بات سے سولہ آنے متفق ہوں کہ کوئی سیاسی محاذ، جو صرف مسلمانوں تک محدود ہو، مسلمانوں کے اپنے ہی مفاد میں نہیں ہے۔ ہمیں ان سب لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہیے جو ہمارے ساتھ آنے کو تیار ہیں۔ کیوں کہ یہ سوال صرف اردو کا نہیں ہے۔ ملک کے مستقبل کا ہے۔

پنڈت نہرو نے ایک بار کہا تھا:

THE CHOICE BEFORE INDIA IS NOT BETWEEN A SECULAR INDIA AND A HINDU INDIA; IT IS BETWEEN A SECULAR INDIA AND NO INDIA AT ALL.

یہ بات انھیں اس لیے کہنی پڑی کہ انہی دنوں پاکستان بنا تھا اور وہ لوگ جو آج اردو کی مخالفت کر رہے ہیں وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ چونکہ پاکستان ایک اسلامی حکومت ہے، ہندوستان کی حکومت کو ہندو حکومت ہونا چاہیے۔ پنڈت نہرو ہی نہیں بلکہ اس دور کے دوسرے سیاسی رہنما بھی اس بات سے واقف تھے کہ ایسا کرنا ملک کے لیے نہایت خطرناک ہوگا۔ اور تو اور جناح صاحب بھی اس بات سے واقف تھے اور اسی لیے انھوں نے پاکستان کو بھی اسلامی حکومت نہیں بلکہ ایک سیکولر حکومت بنانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ مگر ان کی بہت جلد موت ہو گئی اور پاکستان کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا۔ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ایسے ہندوؤں کی تعداد ہندوستان کی ساری مسلم آبادی سے کہیں زیادہ ہے جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر ہمیں ملک کو ایک ٹھیک راستے پر چلانا ہے تو اقلیتوں کے ساتھ ہر طرح کا انصاف کرنا ہوگا۔ ان کی تہذیبی قدروں کی حفاظت کرنا ہوگی۔ انھیں ایسے موقعے دینے ہوں گے جس سے وہ اپنے بچوں کی تعلیم اپنی زبان میں جس طریقے سے اور جس سطح تک چاہیں کرا سکیں۔ ہم سب کو یہ بھی معلوم ہے کہ بہت سے ہندی لیکھک بھی یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ہندی کی مددگار اگر ملک میں کوئی زبان ہے تو وہ صرف اردو ہے اور اردو کی حفاظت کرنا دراصل ہندی کی ہی حفاظت کرنا ہے۔ اگر ہم ایسے لوگوں کو جو ہمارے ساتھ اس لڑائی میں شریک ہیں بھولتے ہیں تو غلطی کرتے ہیں۔

ملک کے سامنے ایک مسئلہ ہے جس کا حل بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ پنڈت نہرو کے وقت ہی اردو کی تعلیم کا جو پرانا انتظام تھا اس میں کچھ ترمیم کر کے اسے ہی جاری رکھنا چاہیے تھا۔

میں پنجاب میں ایسے اسکول میں پڑھا تھا جہاں پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک حساب اور سائنس کو چھوڑ کر باقی سب مضمون اردو کے ذریعے پڑھائے جاتے تھے۔ کالج میں ان دنوں ذریعۂ تعلیم اردو کی بجائے انگریزی تھا۔ میں نے سنا ہے کہ یوپی میں اسکول میں اردو اور ہندی دونوں زبانیں پڑھانے کا انتظام تھا جو کم سے کم میرے اسکول میں نہیں تھا۔ اس کا مجھے نقصان یہ ہوا کہ مجھے ہندی سیکھنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ اچھی بات یہ ہوتی کہ دونوں زبانیں آٹھویں جماعت تک لازمی قرار دی جاتیں اور ہر طالب علم کو جس زبان میں بھی وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتا، سہولت مل جاتی۔

آزادی کے بعد اردو کی تعلیم سب جگہ کیوں ختم کی گئی۔ کیوں اس وقت کے ملک کے رہنماؤں نے ایسا ہونے دیا۔ اس پر لوگ زیادہ بات چیت نہیں کرتے مگر ظاہر ہے کہ اس سے بہت بڑا نقصان ہوا۔ خاص طور پر یہاں کے مسلمان کو یہ احساس ہونے لگا کہ اب یہ میرا ملک نہیں ہے۔ سمجھدار ہندوؤں کو یہ فیصلہ کرنے میں کافی وقت لگا کہ مسلمانوں کے دل میں ایسا خیال پیدا ہونا نہ صرف ان کے لیے بلکہ ہم سب کے لیے خطرناک ہے۔ کچھ سیاسی پارٹیوں کو بھی یہ احساس ہوا مگر شاید سب کو نہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ الکشن کے وقت سیاسی پارٹیاں صرف ووٹ پر نظر رکھتی ہیں۔ اور کسی قسم کے بڑے فیصلے کرنے سے جھجکتی ہیں۔ خاص طور پر یو پی کے بارے میں میرا ہلکا سا تجربہ ہے۔ میں نے پچھلے دنوں کچھ ایسے سیاسی نیتاؤں سے بات کی جو اردو کا کئی بار ذکر کر چکے تھے۔ ان میں سے کچھ جنتا دل سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے میں کیا دقت ہے۔ جواب ملا کہ ذرا ٹھہریے اپنی حکومت آ جائے تو یہ ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ پھر ایسا کہیے اور ہر جگہ کہیے۔ جواب ملا کہ اس وقت کہنے سے شاید ہندو ووٹر ناراض ہو جائیں۔ میں نے جواب دیا کہ وہ تو الکشن کے بعد بھی ہیں رہیں گے۔ پھر میں کانگریس کے دو نیتاؤں سے ملا۔ میں نے کہا کہ یو پی میں اس بار مسلمان ووٹ لینے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ آپ اردو کو یو پی میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیں۔ انھوں نے کہا کہ ایسا تبھی ہو سکتا ہے کہ یو پی کے کچھ جانے پہچانے مسلمان رہنما جو کانگریس سے تعلق رکھتے ہوں پردھان منتری پر زور ڈالیں۔ پھر میں نے کچھ معزز مسلمانوں سے بات کی۔ ان میں سے ایک نے پتے کی بات کہی۔ وہ یہ کہ ہم اپنے لیے ٹکٹ مانگنے تو جا سکتے ہیں مگر کسی بات پر زور دینا مشکل ہے۔ آخر میں میں نے دو ہندوؤں سے بات کی۔ انھوں نے کہا کہ ہم کہیں گے اور زور سے کہیں گے۔ میں نے مذاق میں کہا کہ ٹکٹ تو خطرے میں نہیں پڑ جائے گا۔ جواب ملا کہ ٹکٹ کا کیا ہوگا اگر ووٹ ہی نہیں ملے۔ فیصلہ ہوا کہ کچھ یو پی کے اردو دوست پردھان منتری سے ملیں اور انھیں اصلی حالت سے واقف کرائیں۔ اگر کچھ پارٹیوں کے لوگ اکٹھا نہ ملنا چاہیں تو الگ الگ ملیں مگر ضرور ملیں۔

اس بات چیت سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہندوستان کا مسلمان اپنی مشکلات اکیلے حل نہیں کر سکتا۔ اسے ہندوؤں سے مدد لینی ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں ہندوؤں کو غیر سمجھنا بند کیجیے۔ وہ ملک کے مستقبل کے بارے میں اتنے ہی پریشان ہیں جتنے آپ۔ اور وہ جانتے ہیں کہ یہ صرف اسی حالت میں صحت مند بن سکتا ہے جب مسلمان اور ہندو ساتھ ساتھ چلیں۔ اسی بات کا ایک پہلو اردو ہے۔ اس بات کو سب مانتے ہیں کہ یہ ہندوستانی زبانوں میں کئی لحاظ سے سب سے زیادہ خوب صورت اور منجھی ہوئی زبان ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ یو پی نہ صرف اردو کا گھر ہے بلکہ اس کا مستقبل بھی شاید یہیں پاکستان سے بھی زیادہ محفوظ رہ سکے۔ شاید کچھ پاکستانی بھی ایسا محسوس کرتے ہوں۔

ایک بات اور میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان ٹھنڈے دل سے سوچ کر اس سوال کا

جواب اپنے آپ کو دیں۔ کیا جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ کو زیادہ نقصان ہندوؤں نے پہنچایا ہے یا خود مسلمانوں نے۔ میری دونوں یونیورسٹیوں سے ہلکی سی واقفیت ہے۔ مجھے لگتا ہے مسلمانوں کے آپس کے جھگڑے انھیں زیادہ نقصان پہنچا رہے ہیں بہ نسبت ہندوؤں کی دشمنی کے۔

اب آخر میں وہی والا سوال۔ رائے کس کو دیں۔ جیسا میں نے اوپر عرض کیا۔ رائے دینے سے پہلے آپ سب سیاسی پارٹیوں سے بات کریں۔ مگر بات ہمت اور حوصلے سے کریں۔ دل سے ڈر اور لالچ نکال کر کریں۔ ہو سکتا ہے کہ یو پی کا معاملہ اس الکشن سے پہلے ہی حل ہو جائے۔ کم سے کم ہماری تو یہی کوشش ہونی چاہیے۔



# اردو ادب

## اردو ادب کدھر؟

پروفیسر سید محمد عقیل



خدابخش لائبریری نے اردو ادب کے سلسلہ میں کچھ مسئلے چھیڑ رکھے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی کہ اردو ادب کدھر جا رہا ہے، کیا رخ ہے، اچھا یا برا، ساکن، صامت، جامد ـــ یا انہاری! اقدامی! کیا ہے، کہاں ہے، کون اسکی اچھائی برائی کے لیے ذمہ دار ہیں، کیا ہو رہا ہے۔

اردو کے سارے پروفیسروں کے علاوہ جانے پہچانے فاضلوں کو اس موضوع پر اظہار حال کے لیے مدعو کیا جاتا رہا ہے۔ پانچ سال میں پانچ صاحبوں نے اس میں شرکت کی۔ اسی سلسلہ کا ڈاکٹر عقیل کا مقالہ پیش خدمت ہے۔

ادارہ

پروفیسر سید محمد عقیل
شعبۂ اردو
الٰہ آباد یونیورسٹی الٰہ آباد

# اردو ادب کدھر؟

کسی بھی ادب کے متعلق ایسا سوال نہ صرف یہ کہ اس کا محاسبہ ہے بلکہ یہ بھی کہ اُس کی ارتقائی صورتیں کیا رہی ہیں، اور اب اس کے لیے جدید امکانات کیا ہیں یا یہ بھی کہ مختلف اصناف میں اُس کا آج کا فیشن کیا ہے اور کن سمتوں میں اُس کی مختلف شاخیں پھیل رہی ہیں۔ اپنے سماجی حالات کس طرح اُس کا چہرہ بدل رہے ہیں، اور ان کا اثر اس کی فکر پر کیا پڑ رہا ہے۔ بیرونی دباؤ اور اندرونی کشمکش، اس پر کس طرح اثر انداز ہو رہی ہے۔ یہ ساری باتیں مل کر کسی ادب کے ارتقا یا تنزل کی سمتیں متعین کرتے ہیں، لیکن ان تعینات کا دائرہ کار، ماضی قریب ہی کو محیط رہتا ہے اسے بہت دور تک پھیلایا نہیں جا سکتا۔ ہم بھی اس مقالے میں تمام باتیں تیس چالیس برس کی مدت ہی کو سامنے رکھ کر کریں گے کہ اسی سے اردو کی نئی سمتوں کا تعین مناسب ہے۔ پھر یہ بھی سمجھتے رہنا چاہئے کہ یہ محاسبہ حتمی اور آخری نہیں ہو سکتا کہ ادب میں حرف آخر، کسی تفہیم کے لیے نہیں کہا جا سکتا اور یہ بھی ایک تفہیم ہی کی کوشش ہے۔

اردو ادب کے ساتھ ایک دلچسپ خیال ہمیشہ سے وابستہ رہا ہے کہ جب بھی ادب کی بات ہوئی۔ اُس کا مفہوم پہلے شعر و شاعری ہی رہا ہے۔ شاید یہ بات اس لیے بھی ہو کہ دنیا کی تمام فکر اور تمام ادبی کاوشوں کی ابتدا شاعری ہی سے ہوئی ہے۔ اسی لیے شاید، جتنے اصول، نظم و ضوابط کے راستے شاعری کے لیے سوچے گئے، کسی اور صنفِ ادب کے لیے نہیں۔ اردو کی شاعری، ادھر تیس چالیس برسوں میں خاصی انقلاب آمیز رہی ہے۔ ہئیت اور فکر، سب میں طرح طرح کے تجربے کیے گئے ہیں۔ ہئیت میں تو تجربوں کا شمار بھی آسان نہیں ہاں فکر میں، خاصا انتشار رہا ہے۔ کبھی فکر کا یک قلم انکار کیا گیا، کبھی فکر، شاعر کے نجی اور انوکھے تجربوں تک محدود ہو گئی اور کبھی اس میں عالمی ذہنی انتشار کو سمونے کی کوشش بھی کی گئی۔ کبھی تنہائی کا مسئلہ، کبھی بیگانگی (ALIENATION) اور کبھی بے راہ روی۔ لیکن کچھ ایسے بھی فکری تجربے جو وقت کی آواز ہیں جن میں تازہ کار مسائل کا دل بھی دھڑکتا نظر آتا ہے۔

جدید نظموں کی تاریخ اردو میں بہت زیادہ پرانی نہیں، زیادہ سے زیادہ سو، سوا سو برس۔ جب موضوعاتی

نظموں نے، شاعری کو غزل کے ماحول سے نکل کر ایک عام رجحان کی صورت اختیار کرنا شروع کیا، لیکن بیسویں صدی مغربی اثرات سے ایک طرح اردو شاعری میں تقریباً نظموں کی صدی بن گئی۔ حالی کی آواز کو اقبال، عظمت اللہ خاں، جوش، اختر شیرانی، سرور اور چکبست نے عملی تعبیر عطا کی اور پھر ترقی پسندوں نے فکری اور اسلوبی، تمام تجربوں میں نظم کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ موضوعاتی نظمیں وقت کی آواز لے کر ایک طرف تمام شعری فضا پر چھا گئیں تو دوسری طرف اسلوب اور سانچوں میں بھی زبردست تبدیلیاں ہوئیں، جن کے پس منظر میں انگریزی نظموں کے وہ ترجمے بھی تھے جن سے اردو کی شعری دنیا محمد حسین آزاد، نظم طباطبائی، عبدالحلیم شرر، مولوی اسماعیل، نادر کاکوروی، اقبال، طالب بنارسی، تلوک چند محروم، ظفر علی خاں اور دوسرے مترجمین نظم انگریزی کے ذریعہ متعارف ہوئی تھی۔ ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ جو دوسری لہر اسلوبیات اور فکری آزادی کی چلی وہ اپنا اسکول، میراجی، دین محمد تاثیر، یوسف ظفر اور ن۔ م۔ راشد کے ساتھ لے کر الگ ہو گئی اور جیسے ہی ترقی پسندوں کی مسائلی اور موضوعاتی شاعری میں ۱۹۵۰ء کے بعد کمی واقع ہوئی۔ میراجی اور راشد کے اسلوبیاتی اور فکری آزادی کے اسکول کے بطن سے نئی شاعری یا جدید شاعری پھوٹی جو تقریباً ۱۹۸۰ء تک اردو شاعری پر حاوی رہی۔ کیسے کیسے فکری اور اسلوبیاتی تجربے اس دور میں کیے گئے؟ اس اسکول نے اپنا فکری سلسلہ فرانس کے زوال پسند شعرا (DECADENT POETS) سے جوڑا۔ بہت سے اپنے نئے نظریات شاعری بنائے جو کچھ اس طرح تھے۔

۱۔ میراجی اور اُن کے قبل کے دوسرے شعرا نے، اردو میں پہلی بار اس بات کا احساس کیا کہ شاعری سلجھانے کے علاوہ الجھانے، متحرک کرنے کے علاوہ سکتے میں ڈال دینے ۔۔۔ کے بھی کام آسکتی ہے۔ نئی شاعری دل سے زیادہ ذہن کو متاثر کرتی ہے ۔۔۔ نئی شاعری جذبات کے الجھاوؤں کو ٹھوس زبان میں ظاہر کرنا چاہتی ہے۔ اور مجرّد جذبات کے اظہار سے گریز کرتی ہے۔ جذباتیت سے گریز، شاعری کے داخلی سفر کی ایک منزل ہے۔

۲۔ نئی شاعری کا عمل، اضطراب انگیزی کا عمل ہے۔ اضطراب انگیزی کے اس عمل میں وہ زبان کی روایتی لطافت اور شیرینی کو نظر انداز کر کے ارادی طور پر ایک درشت اور بے چین اسلوب اختیار کرتا ہے۔ قاری کی طرف نئی شاعری کا رویّہ فدویانہ اور مولویانہ نہیں ہے۔ ۔۔۔ اس کا لب و لہجہ پختہ اور اعلیٰ ادب کی نفی کرتا ہے۔ (شمس الرحمٰن فاروقی ۔۔۔ نئے نام کا مقدمہ)

۳۔ اصل میں جو مسئلہ نئی نظم کے شاعر کو درپیش ہے، وہ فلسفیانہ نوعیت کا ہے اور اس سوال سے پیدا ہوتا ہے کہ میں کون ہوں؟۔ نئی نظم کا شاعر یہ نہیں پوچھتا کہ دنیا کیا ہے؟ معاشرہ ایسا کیوں ہے؟

کائنات کیا ہے؟ وہ صرف اپنے آپ میں دلچسپی رکھتا ہے اور اپنی شناخت چاہتا ہے۔ (جیلانی کامران ۔ نئی نظم کے تقاضے)

۴۔ پرانی تعلیمات کے غیر مشتہر ہو جانے سے جہاں جسم کی مرکزی حیثیت قائم ہوئی ہے، وہیں موت کا خدشہ بڑھ گیا ہے۔ اس صورت حال میں اگر میں یہ کہوں کہ نئی نظم کا شاعر، موت کے خدشے اور تقدیر مرگ کا شاعر ہے تو غلط نہ ہوگا۔

۵۔ نئی نظم کا شاعر، تقدیر مرگ کو ہلاکت جسم کی شکل میں پہچانتا ہے اور ہلاکت جسم کے علاوہ اُس کی نظر میں کوئی دوسری ہلاکت اپنا وجود نہیں رکھتی . . . وہ جواب دیتا ہے کہ "میں فانی ہوں" اور چونکہ میں فانی ہوں اس لیے ہر شے فانی ہے۔ لیکن اشیا کا فانی ہونا، میرے فنا سے بے نیاز ہے۔ میں فنا ہو جاتا ہوں، لیکن کلنڈر نہیں مرتا۔ لہٰذا کلنڈر فانی نہیں ہے، علاوہ ازیں، زمین بھی نہیں مرتی اور نہ قیامت آتی ہے۔ (نئی نظم کے تقاضے۔ از جیلانی کامران)

۶۔ نئی شاعری، مذہبی شعور کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی، اور چونکہ پچھلے پچیس برسوں کی اردو شاعری ایسے شعور کے بغیر ہے۔ (یعنی ترقی پسند شاعری) اس لیے میں نئی شاعری کی ضرورت محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا... اس شاعری میں شاعر، کسی ادارے کی طرف سے لائی ہوئی بشارتوں کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ زندگی بخشنے والے رب تک اپنی فریاد کو پہنچاتا ہے۔

یہ ساری باتیں موضوعی شاعری کی طرف اشارے کرتی ہیں اور ان خیالات کے تحت ۱۹۶۰ء سے لیکر کم و بیش ۱۹۸۰ء تک ان خیالات سے مملو نظموں کا ایک انبار لگا ہوا ہے۔ ان میں کہیں قدیم و جدید کی ملی جلی کیفیتیں شامل ہیں اور کہیں خالص۔ انھیں خیالات کا تاثر ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں شعرا کی ایک کھیپ ہے جو متذکرہ بالا خیالات کے تحت شاعری کرتی رہی ہے۔ جن میں، وحید اختر، خلیل الرحمان اعظمی، باقر مہدی، بلراج کومل، عمیق حنفی، کمار پاشی، عادل منصوری، محمد علوی، قاضی سلیم، بمل کرشن اشک، شمس الرحمان فاروقی، ندا فاضلی، منیر نیازی، وزیر آغا، عباس اطہر، افتخار جالب، سلیم الرحمان، عزیز حامد مدنی، سلیم احمد، شکیب جلالی، احمد شمیم، انور شعور، کشور ناہید، ساقی فاروقی، ناصر شہزاد (اور بہت سے نام ہیں) خاص ہیں۔ ان خیالات کی تائید اور ان سے اختلاف میں بہت سے مضامین، مقالے اور انشائیے لکھے گئے۔ ڈاکٹر شمیم حنفی نے تائید میں "جدیدیت کی فلسفیانہ اساس" لکھ کر، اس مقالے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ راقم الحروف نے اس موضوعی شاعری سے اختلاف کیا اور ایک کتاب "نئی علامت نگاری" پیش کی، جس میں ان تجربوں کا تجزیہ پیش کیا۔ پروفیسر احتشام حسین نے "نئے تیشے نئے کوہکن" کے نام سے ایک اختلافی معرکہ آرا مقالہ لکھا۔ اس دور کی شاعری میں ہیئتوں کے جو تجربے کئے گئے، وہ کوئی خاص نہ تھے کہ سارا زور موضوعی شاعری پر تھا۔ نظم معریٰ، جس کی ابتدا محمد حسین

آزاد نے "جغرافیہ طبعی کی پہیلی" نام کی معرّیٰ نظم سے ۱۸۸۲ء کے قریب کی تھی[1] اور جسے اسمٰعیل میرٹھی اور عبدالحلیم شرر نے فروغ دیا تھا۔ اس کی لہر اس وقت بیٹھ چکی تھی۔ ہاں ترقی پسندوں اور حلقہ ارباب ذوق کے فری ورس کے تجربے، ان کے پاس باقی تھے اور ساتھ ساتھ نظمانے (VERSIFICATION) کی صلاحیت بھی، جو کبھی کبھی ختم بھی ہو جاتی ہے۔۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء تک کی شاعری میں وہی مجاہدانہ زور ہے، جو ۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۰ء تک ترقی پسندوں کے یہاں ملتا ہے۔ یہ کوشش، ترقی پسند شاعری کے مزاج سے الگ راہیں بنانے کی کوشش ہے۔

یہ تو سب ہے مگر اس کے آگے کیا ہے؟ بہت جلد یہ رنگ ماند پڑ گیا، کہ مسائل حیات، صرف تجربوں اور نعروں سے کب تک بہلتے۔ نظم کا نیا شاعر، علامتوں کی بھول بھلیاں سے باہر نکل آیا۔ اُسے حالات ڈس رہے ہیں، زندگی کا ہر لمحہ بدلتا سین، اُس کی سانس روک رہا ہے۔ علامتوں کے بہلاوے، اُس کے دل کی باتوں کو باہر آنے نہیں دیتے تھے۔ اور اُسے جیسے یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ زندگی اور حالات سے بیگانہ ہو کر تو خود میں محبوس ہو کر رہ جائے گا۔ پھر وہ کیا ہے؟ کیوں ہے اور انسانوں سے کیا اُس کا رشتہ ہے؟۔ وہ تو انسانوں کے رشتوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اور اس طرح، آج کا نیا نظم نگار بیگانگی سے جیسے اکتا کر، زندگی کے رشتوں، محسوسات تصور اور تفکیر سے کام لے کر نئی اظہاریت تلاش کر رہے ہیں۔ آج کی نظم کا کوئی بھی RANDOM جائزہ، یہ بات ظاہر کر دے گا

## ایک نظم

تمہاری زلف کے
وہ سائبان کیا ہوئے!
کہ جن کے نیچے بیٹھ کر
یہ سوچتے تھے ہم
کہ کُل جہاں اماں میں ہے۔!
تمام شب تمہاری دسترس میں ہے !! (مہتاب حیدر نقوی)۔

بیٹا، سالوں بعد
ولایت سے لوٹا تھا!
اور بیٹھا یہ سوچ رہا تھا
جو سچ اُس نے اپنے بارے میں پایا ہے
اُن کو کیسے بتلائے گا!
اُن کو کیسے سمجھائے گا !! (افتخار نسیم)

ان کے ساتھ ہی کچھ PRODIGETS بھی اسی کیفیت کی طرف لوٹ رہے ہیں، چنانچہ عادل منصوری،

---

[1] ڈاکٹر حنیف کیفی کا مقالہ "نظم معریٰ اور آزاد نظم" ملاحظہ ہو۔

عمیق حنفی اور عزیز قیسی وغیرہ کے یہاں بھی ایک طرح کی مراجعت دیکھی جاسکتی ہے۔ نئی نظم، خیالات کی وابستگی کے ساتھ ساتھ بہت سے تام جھام جھنجھٹ چنگھاڑ اور حشو و زوائد سے بھی پاک ہوتی جاتی ہے کہ نیا نظم نگار ان تمام صورتوں کو محض بھرتی کی چیز سمجھتا ہے۔ محمد حسن صاحب نے کہیں یہ لکھا ہے کہ نئی نظم سے فکر کا عنصر کم ہوتا جارہا ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ اچھی نظمیں اور اچھے نظم نگار، لفظیات کی تنزئین تو نہیں کرپاتے کیونکہ اُن کے پاس تہذیبی الفاظ اور صحبتوں کی اشاراتی زبان، نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ مگر فکر، اچھی نظموں میں باقی ہے۔ بلکہ تہ در تہ پھیلی ہوئی ہے۔ مگر یہ باتیں نئی نظموں کا UNDER TONE ہیں۔ ہاں ان نظموں کا دائرہ ضرور اکہرا ہے۔ یہ بھی ہے کہ، فوری تاثر اور فوری بیان' نئی نظموں کو یقیناً لیے ہوئے ہے جس کی وجہ فکری تجذیب عام طور پر نہیں ہے۔ فضا آفرینی اور لمحاتیت کا زور لوٹ رہا ہے۔ اور زیر لبی (UNDER TONE) کی کیفیت بڑھتی جاتی ہے۔ نئی نظمیں خواہ ترقی پسند ہوں یا جدید، وضاحتوں سے زیادہ سوچ (MUSES) کی طرف بڑھتی جاتی ہے اور کسی لمحاتی اثر کے تحت، نظم نگار کے اعصاب متاثر ہوتے ہیں تو بھی جوشؔ اور سردار جعفریؔ کی بلند آہنگی (OVER TONE) اس میں نہیں پیدا ہوتی بلکہ نئے نظم نگار کو فیضؔ اور ن۔م۔ راشدؔ کے قریب کہیں دیکھنا چاہیئے۔ پھر نئے نظم نگار میں کائنات سے اپنی ذات کی طرف جھکنے کا مزاج پیدا ہوگیا ہے، جو اُسے جدیدیوں سے ملا ہے۔ مگر یہ سب اس وقت فیشن بن جاتا ہے۔ جب نظم نگار ان صورتوں کو محض اوپر سے اوڑھ لیتا ہے۔ نثری نظم بھی آج کی نظم کا ایک رخ ہے۔ مگر ابھی اسے استقامت حاصل نہیں ہوئی اور نہ یہ طرزِ اظہار ابھی فیشن میں آیا ہے، اس لیے نظم کے اس تجربے پر ابھی کوئی بات کہنا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ نئی نظم میں چند شاعرات کے تجربوں کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اردو نظم نگاری میں یہ ایک نئی ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ ہندوستان میں اردو کی شاعرات ابھی اپنی گھٹی زندگی کی فضا سے باہر نہیں نکلی ہیں۔ کم از کم شاعری کی دنیا میں جبکہ پاکستان میں نئی شاعرات کی ایک کھیپ ہے جس میں فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، کشور ناہید، پروین سید فنا اور بہت سی وہ شاعرات شامل ہیں جو پاکستان سے دوسرے یورپی ممالک کو منتقل ہوگئی ہیں۔ ان میں حمیرہ رحمان، نیر جہاں، وفی بیگ کی عرفانہ عزیز، مانٹریال کی عذرا احمد، اور نیو جرسی کی رشیدہ عیان خاص ہیں، لیکن ان میں سے زیادہ تر ابھی تجربوں کی منزلوں میں ہیں۔ کچھ نشالجیا کے تجربوں میں گھری ہیں، لیکن جو زندگی کے وسیع سمندر سے ہمکنار ہوگئی ہیں۔ ان میں تلخ، ترش و شیریں ہر طرح کے تجربے موجود ہیں۔ اردو نظموں میں فہمیدہ ریاضؔ اور کشور ناہید کے ازدواجی زندگی کے تجربے بالکل نئی صورتیں ہیں۔ ان میں تلخ نوائی بھی ہے۔ محبت کی مٹھاس بھی اور گھر سے نکل کر باہر کی فضا

کا ٹکراؤ اور اشتعال بھی شامل ہے۔

اب غزل کی سمت و رفتار پر بھی کچھ باتیں کی جاتی ہیں۔ غزل جو بیوۂ عالم بھی ہے، رندِ ہزار شیوہ بھی گردن زدنی بھی اور اردو شاعری کی آبرو بھی۔ شاید ہی اردو کا کوئی شاعر ہو جو غزل کی بارگاہ میں پہنچے بغیر، ایوانِ شاعری میں داخل ہوا ہو۔ مجھے غزل کے سلسلے میں بہت زیادہ کچھ اس وقت نہیں کہنا ہے صرف نئی غزل کی چند صورتوں کی طرف اشارے کر سکوں گا کہ میری ایک پوری کتاب "غزل کے نئے جہات" کے نام سے زیرِ طبع ہے۔ تفصیلات اُس کتاب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ پھر اس لکچر کا کینوس بھی اتنا پھیلا ہوا ہے کہ تفصیل کی گنجائش بہت کم ہے۔ نئی غزل، اس وقت آویزش سے دوچار ہے۔ اس میں تجربے کرنے والے تو روزبروز بڑھتے جاتے ہیں۔ موضوعات بھی آج کی نئی زندگی سے برابر آ رہے ہیں۔ اُس کی لفظیات بھی تیزی سے بدل رہی ہے۔ یہاں تک کہ اُس کا پیٹرن بھی بدلنے کی کوشش آزاد غزل کی شکل میں ہو رہی ہے۔ مدراس کے علیم صبا نویدی نے "ردِّ کفر" کے نام سے آزاد غزلوں کا ایک مجموعہ بھی شائع کر دیا ہے، اور ایک انتخاب بھی جس کا نام "قیدِ تحکّم" ہے۔ شاعر بمبئی نے آزاد غزل اور نثری نظم کا ایک نمبر بھی تقریباً چار سو صفحات کا شائع کر دیا ہے، جس میں ہر طرح کے مضامین بھی ہیں اور آزاد غزل کے نمونے بھی۔ گویا غزل میں اظہار کے نئے نئے اسالیب کی کوشش، غزل کا نیا رخ ہے۔ جو لوگ، اس طرزِ غزل میں کوشاں ہیں۔ انھوں نے ابھی تک اچھے تجربے تو پیش نہیں کیے لیکن شکایتوں کے دفتر ضرور کھول دیے ہیں کہ اس طرزِ غزل کو روایت پرست اور مقلدانہ ذہن کے لوگ قبول نہیں کر رہے ہیں۔

مگر نئی غزل ہر طرح کے تجربوں سے دوچار ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی مقبولیت کا دائرہ، نظم سے زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اس میڈیا میں بھی غزل کی مقبولیت بڑھی ہے۔ نئے غزل گو کی اپنی زندگی، روایتی شاعر کی زندگی سے الگ ہے، اور وہ اپنی اس زندگی کو ہر طرح سے غزل میں داخل کر رہا ہے، اور اس "ہر طرح" میں اظہار کا طریقہ نئے معاملات نئی ترکیبیں جو کبھی کبھی ہندی شاعری سے بھی اور زندگی کے نئے برتاؤ سے آ رہی ہیں۔ سب کچھ شامل ہیں۔ پھر خود تغزل، کا تصوّر اب نئی غزل میں بدل رہا ہے۔ غزل صحیح معنوں میں "تنگنا" سے باہر نکلی ہے۔ اس نے وہ تمام تجربے چھوڑنے کی کوشش کی ہے جو جاگیردارانہ سماج سے اس نے رکھ رکھاؤ، وصل و ہجر کے محتاط انداز اور بیان کے اشاری طریقوں سے سیکھے تھے۔ آج کی زندگی میں انتظار کی وہ فرصت کہاں جو غالب کو تصوّرِ جاناں کیلئے ملی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل، اب ہر شخص کے نجی اور جذباتی تجربوں کا اظہار بننے کی کوشش میں ہے۔ اب وہ صرف PRIVILEGED CLASS ہی کا تجربہ نہیں رہ گئی۔ اسی لیے اس میں عمومیت پہلے

کی بہ نسبت زیادہ آتی جاتی ہے۔ پہلے بھی عام لوگ غزلیں کہتے تھے، مگر ہمیشہ وہ CEHOSEN FEW کے معیار اور پسند و ناپسند کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔ گویا، الفاظ اور فکر تو اُن کی ہوتی تھی مگر پسند و ناپسند کا فیصلہ اور معیار بندی، عام غزل گو نے، خواص پر چھوڑ دیا تھا۔ نئی غزل، اس پابندی سے باہر نکل آئی ہے۔ شاید اُس کا معیار عوامی پسند اور اُس کے اپنے نجی فیصلے بن گئے ہیں۔ اس سے ایک خرابی بھی آئی ہے کہ نئی غزل کا شاعر، معیار اور زبان کی سند، محاوروں اور الفاظ کی معنویت، سب کو چھوڑ رہا ہے۔ صرف اپنے علم اور اپنی لاعلمی کو درست مان کر چل رہا ہے۔ شاعری کے اسکول بہر حال، معیار مہیا کرتے تھے جواب کہاں رہ گئے۔ اس طرح غزل، اپنی مقبولیت تو بڑھا رہی ہے۔ مگر اس کا معیار مجروح اور مشکوک ہو رہا ہے۔ پھر تجربے، ہر طرح کی زندگی، سماج اور سرزمین سے ہو رہے ہیں۔ یہ شاعری میں ایک طرح کی توسیع کی صورت ہے۔ مگر اس میں ایک خرابی بھی ہے کہ غزل کی عام تفہیم (COMMON UNDER STANDING) باقی نہیں رہے گی۔ الفاظ، اشارے، علامتیں اور اظہاریت کی جو عام تفہیم تھی جو تمام اردو دنیا میں سمجھ لی جاتی تھی۔ مقامی لفظیات بے حد انفرادی رویے اور مقامی زندگی کے تجربے، غزل سے یہ عام تفہیم چھین رہے ہیں۔ جس سے غزل کی تفہیم کی UNIVERSALITY چھن رہی ہے۔ اب تو یہ ہو کے ہی رہے گا کیونکہ اردو کا جو غزل گو، نیوجرسی، ناروے، ورجینیا، پاکستان اور لندن میں زندگی اور اس کی صورتوں کا تجربہ کر رہا ہے، اس میں، دہلی، بنارس اور لکھنؤ کی تہذیبی صورتوں اور تنگ گلیوں کا رنگ کیونکر پیدا ہوگا۔ پھر ایک منظم زندگی میں غیر منظم زندگی کے تجربات اور کیفیات کس طرح پیدا ہو سکیں گی۔ ذرا کچھ مثالیں دیکھیں:۔

کس قیامت خیز چپ کا زہر سناٹے میں ہے　　میں جو چیخا ہوں تو سارا شہر سناٹے میں ہے　　(افتخار عارف)

سفر ہے ختم مگر بے گھری نہ جائے گی　　ہمارے گھر سے یہ بےگھری نہ جائے گی　　(شاہین کینیڈا)

شہر ناپرساں میں کچھ اپنا پتہ ملتا نہیں　　بام و در روشن ہیں، لیکن راستہ ملتا نہیں　　(احسن عابدی)

صبر کی تیغ بھی نہ پگھلے، ہے یہی ڈر لوگو　　ہے سوا نیزہ جو سورج مرے سر پر لوگو　　(رشیدہ عیاں)

پھر اپنے ملک میں بھی نئے ڈھنگ سے بات کہنے کی لپک، الفاظ کی نئی تہیں اور معنوی جہتیں، روایتی تفہیم اور الفاظ کے روایتی معنوں سے الگ ہو کر، نئی صورتیں بنا رہی ہیں۔ یہ صورت بڑھتی ہی جائے گی۔ غزل سے اسی لیے جاگیردارانہ دور کی تہذیب، اصول اور رکھ رکھاؤ سب کٹتے جاتے ہیں۔ ہندی سے اچھی مزاولت، الفاظ کی نہ صرف نئی سطحیں اور سچویشنز پیدا کر رہی ہے بلکہ، تشبیہات اور استعارات میں بھی کلاسکی روایت

سے الگ ہٹ کر اپنی دنیا بنا رہی ہے۔ اکیسویں صدی میں غزل کی شکل، اپنی کلاسکی اور تہذیبی شکل سے شاید بالکل الگ ہو جائے گی۔ کم از کم موجودہ صورتِ حال کو دیکھ کر قرائن یہی نظر آتے ہیں۔

شاعری کے دوسری اصناف میں تقریباً سناٹا ہے۔ مثنوی اور قصیدہ جو دو بڑے اصناف تھے، وہ اپنا فن اور اپنی افادیت کھو چکے ہیں۔ مثنوی کی جگہ تو بہت کچھ نظموں نے لے لیا ہے۔ سردار جعفری اور کیفی نے "جمہور" اور "خانہ جنگی" کے نام سے، مثنوی کی روایتی موضوع کو بدل کر، ملک کی سیاسی صورتِ حال پر ۴۸-۱۹۴۷ء میں دو مثنویاں لکھیں، جن میں سارے لوازم تو مثنویوں کے نہ تھے، مگر اسلوب مثنوی کا تھا اور مثنوی ہی کہہ کر یہ مثنویاں پیش بھی کی گئیں۔ تبدیلی یہ تھی کہ ان کا موضوع کوئی کہانی نہ تھی۔ ہاں اگر بدلتے ہوئے ہندوستان کے واقعات اور ملک کے سیاسی حالات کو اگر عوام کی کہانی مان لیا جائے تو، یہ مثنویاں ایک نیا رنگ لے کر آئی تھیں مگر کسی شاعر نے، ان کا اتباع نہ کیا۔ خود ان شعراء نے بھی، ان تخلیقات کے بعد، کچھ اور تجربے، مثنویوں کے سانچے میں نہیں کیے، اگرچہ بیانیہ کا یہ انداز، ہندوستان کا ایک نیا ساگا (SAGA) لکھنے کے لیے اچھی خاصی مدد کر سکتا تھا اور یہ موضوع بھی نیا تھا۔ تاہم مثنوی پر زوال آگیا۔ قصیدے کے لیے بھی یہی صورت ہوئی، جن حالات میں قصیدے لکھے جاتے تھے، وہ حالات شخصی حکومت کے ساتھ ختم ہو گئے۔ سردار جعفری نے ایک سیاسی قصیدہ لکھنے کی کوشش کی تھی جس میں ممدوح عوام تھے مگر وہ چل نہ سکا۔ یہاں تک کہ فروری ۱۹۵۷ء کے ماہنامہ "آجکل" میں شائع شدہ یہ قصیدہ، خود سردار جعفری کے کسی مجموعے میں غالباً شامل نہیں ہوا۔ قصیدہ جس INSENTIVE کے تحت لکھا جاتا تھا، وہ INSENTIVE ہی باقی نہ رہ گیا۔ نہ وہ تہذیبی ڈھانچہ معاشرہ کا ہے۔ ہاں صنفِ مرثیہ میں یقیناً کچھ تجربے کیے گئے ہیں اور ایک پوری کھیپ مرثیہ نگاری کی ہندوستان میں کم مگر پاکستان میں آگئی ہے، جو جدید مرثیے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس جدید مرثیے کی ابتدا تو جوش نے "حسین اور انقلاب" لکھ کر کی تھی، مگر اب نئے لکھنے والوں نے اس میں خاصہ تنوع، الفاظ اور اظہاریت کے طریقوں میں پیدا کیا ہے۔ اب مرثیوں میں قدیم اجزائے مرثیہ کا التزام نہیں ہے بلکہ، اب جدید مرثیے کو نظم اور مرثیہ کے بیچ کی کوئی چیز سمجھنا چاہیے، جس کے چہرے میں بھی اور درمیان میں بھی سیاسی اور سماجی صورتِ حال پر تنقید بھی ملتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ واقعات کربلا کی کہیں وضاحت اور کہیں اشاریت فوق فطری صورتیں ختم کر کے نیا مرثیہ گو عموماً، واقعہ کربلا کے دور رس اثرات اور نئی زندگی کے امکانات اسوۂ حسینی سے روشن کرنا چاہتا ہے، جو بیسویں صدی کی تعقل پسندی کا نتیجہ ہے۔

کر دیا تو نے یہ ثابت اے دلاور آدمی　　زندگی کیا، موت سے لیتا ہے ٹکر آدمی
توڑ سکتا ہے رگِ گردن سے خنجر آدمی　　لشکروں کو روند سکتے ہیں بہتر آدمی

ہاں خود اپنے خون میں کشتی جو کھے سکتا نہیں
وہ حسینؑ ابن علیؑ کا نام لے سکتا نہیں
(جوشؔ)

فیضؔ کا مرثیہ "امام" اور "آج بازار میں پابہ جولاں چلو" اور امیر قاسمی کا مجموعہ "شہرِ نینوا" اردو مرثیے کی تاریخ میں ایک بہت نیا تجربہ ہے، صفدر حسین، یاور عباس، ان کے علاوہ رئیس احمد کا مرثیہ "داستان حرم لفظ اور مفہوم کا ملاپ" از رئیس فروغ، "امام عالی" از کشور ناہید "جبر کی ریگ ہر سمت اڑتی پھرتی تھی" از عارف عبدالمتین "سلام تجھ پہ مسلح بغاوتوں کے امام" از فارغ بخاری "غم لازوال" از مخدوم منور۔ سب جدید مرثیے کی طرف نیا قدم ہیں۔ ان معنوں میں کہ روایتی مرثیہ سے ان میں ہر طرح کی تبدیلی آئی ہے۔ یہ مرثیے انسان کو جبر کے خلاف اقدام کے لیے تیار کرتے ہیں اور مقصد شہادت کربلا کو انسانیت کی تعمیر، اور اس کے عزم وہمت کو استوار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان میں آزادیِ فکر کی تلاش ہے۔ یہ تمام جدید مرثیے، فن اور مقصدیت دونوں میں قدیم مرثیوں سے ایک قدم آگے ہیں۔ اگرچہ کینوس بیانیہ مرثیوں سے چھوٹا ہے۔ مگر ان میں تاثیریت ابھارنے کی بے پایاں کوشش نظر آتی ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو روایتی اور جدید مرثیوں کے بیچ کا تجربہ بھی کر رہے ہیں ایسے مرثیہ نگاروں میں صفدر حسین، یاور عباس، رئیس امروہوی، زیبا لکھنوی، راغب مرادآبادی، اطہر حسین جونپوری خاص ہیں۔ نئے مرثیے عقلیت کی طرف تیزی سے جا رہے ہیں۔ جو آج کے سائنسی دور کا نتیجہ ہے ان میں سے شور وزاری ختم ہو چکے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان میں وہ طوالت بھی نہیں رہی جو کلاسیکی دور کے مرثیوں میں تھی کہ آج واقعہ کربلا کی عظمت کردار سامنے رہتی ہے، جرأت و مردانگی سے حالات کا مقابلہ کرنا اور ثبات قدم کے ساتھ حقیقتوں اور سچائیوں پر قائم رہنا ہی انسان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ گویا آج مرثیے، انسان کی عظمت کو ان راستوں سے بھی اجاگر کرنا چاہتے ہیں، جو راستے انسانی سماج کے درمیان سے بنے ہیں اور جن پر آج کا انسان چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اب نثر پر باتیں کی جاتی ہیں۔ جن میں آج کے افسانے، ناول اور تنقید کو خاص طور پر مطالعے کے لیے چُنا گیا ہے۔

افسانہ پورے ہندوستانی ادب کا ایک اہم جزو ہمیشہ سے رہا ہے۔ پورے مشرق میں کہانی سے جو دلچسپی رہی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ پنچ تنتر، ہتوپدیش اور جاتک کہانیاں ہماری اس دلچسپی کی مثالیں

ہیں۔ جہاں سے لے کر آج بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی تک کہانیوں کا ایک لامتناہی اور زریں سلسلہ ہے اور شاید بیسویں صدی میں پریم چند سے ترقی پسندوں تک کا دور ابھی تک کی اردو کہانیوں کا سب سے شاندار دور ہے۔ اس کے بعد جدید فکر سے متاثر کہانیاں ہیں جن میں علامتوں، تجریدی اور لایعنی کہانیوں کی بھرمار ہے۔ جن کے اہم ستون، انتظار حسین، خالدہ حسین، انور سجاد، احمد ہمیش، بلراج مینرا اور سریندر پرکاش ہیں باقی تقریباً تمام نئے افسانہ نگار ان افسانہ نگار کے متبعین ہیں۔ انھیں کے متوازی اترقی پسندوں کی بھی دوسری کھیپ چلتی رہی ہے۔ جن میں اقبال متین، اقبال مجید، عابد سہیل، کلام حیدری، غیاث احمد گدی، رتن سنگھ، ستیش بترا، رام لعل اور دوسرے لکھنے والے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے درمیان سے اپنا راستہ نکالا ہے۔ ایسے لکھنے والوں میں سلام بن رزاق، انور خاں، انور قمر، ساجد رشید، حسین الحق، احمد یوسف، علی امام، کنور سین، انور پرکار اور علی محمد نون ہیں۔ سرحد پار بھی بہت سے نئے افسانہ نگار ادھر آٹھویں دہائی میں سامنے آئے ہیں جن میں آغا سہیل (اگرچہ یہ پرانے افسانہ نگار ہیں) مرزا حامد بیگ، کوثر جمال، زاہدہ حنا، سائرہ ہاشمی، اختر جمال، شہزاد منظر، رشید امجد، تقی حسن خسرو، نجم الحسن رضوی، سمیع آہوجہ، غلام حسین نقوی، مشتاق قمر، محمد منشا یاد، مستفر حسین تارڑ، منیر احمد شیخ، مسعود اشعر، وغیرہ۔ ان میں سے کچھ ایسے ہوشیار بھی ہیں جو کہانی کی 'پسند و ناپسند' کی سوئی پر نظر رکھتے ہیں۔ اور جس طرف اس کا جھکاؤ دیکھتے ہیں، اُسی طرح کے افسانے لکھنے لگتے ہیں۔ انھیں نہ افسانے کے موضوع سے دلچسپی ہے نہ زندگی کے مسائل سے نہ فن افسانہ نگاری سے بلکہ وہ یہ دیکھا کرتے ہیں کہ کدھر تالی زیادہ دیر سے بج رہی ہے، اُسی طرح کا مال سپلائی کرو۔ یہ بات آج کی کہانی کے سلسلے میں لکھ دینا، اس لئے ضروری ہے کہ اس صورت حال نے آج کی کہانی، خصوصاً، اردو کہانی کو بہت نقصان پہنچایا ہے کہ اب جنیوین اور جعلی کہانی کار کا امتیاز کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ خیر یہ بات تو جملۂ معترضہ کے طور پر لکھ دی گئی۔

آٹھویں دہائی سے پہلے کی کہانی، علامتی کہانی رہی۔ اس وقت کہانی کاروں کو یہی معلوم ہوتا تھا کہ علامتی کہانی ہی، اب اردو کہانی کی توسیع ہو سکتی ہے اور اسی کے ساتھ تجرید، کا رنگ بھی جڑ گیا۔ ہندوستان میں علامتی کہانی، انتظار حسین، خالدہ اصغر (حسین) اور انور سجاد کی قیادت میں وارد ہوئی، جس کا سب سے پہلے بلراج مینرا نے خیر مقدم کیا۔ کمپوزیشن "کے نام سے انشائیہ نما افسانے لکھے، بعد کو احمد ہمیش نے "مکھی" نام کا علامتی افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع کیا اور پھر علامتی افسانوں کی ایک لہر ہندوستان کی اردو افسانوی دنیا میں پھیل گئی علامتی شاعری کی طرح علامتی افسانوں نے بھی، اردو ادب کی فضا کو کافی مکدر کیا۔ ایک صورت تو یہ پیدا ہوئی کہ

ہر مبتدی، الٹی سیدھی کہانیاں لکھنے لگا جس کا نہ سر تھا نہ پیر۔ یہ کام بہت آسان بھی تھا اس لئے کہ جو جیا ہو لکھو، کسی مواخذے کا ڈر نہیں، کیونکہ اگر کہانی سمجھ میں نہیں آتی تو ملزم قاری ہے، لکھنے والے کا کوئی قصور نہیں۔ لایعنی کہانیوں کی پہلے تو بڑی تعریف کی گئی اور ساری لعن طعن قاری کے حصے میں آئی۔ پھر جب نئی کہانی کے ناقدین نے یہ محسوس کیا کہ قاری نا سمجھ نہیں جتنا کہ ناقدین سمجھ رہے ہیں تو یہ کہا جانے لگا کہ لایعنیت ABSURDITY بھی ایک حسن ہے۔ اس کے تجربے مغرب میں بھی ہو رہے ہیں۔ علامتی کہانی تو ترقی پسندوں نے بھی لکھی ہے، اور "غالیچہ" و "مردہ سمندر" اس کی مثال میں پیش کئے جانے لگے۔ مگر قاری اس بہلاوے میں نہیں آیا۔ پھر یہ تھیوری پیش کی گئی کہ ادب کا کوئی سچا قاری ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اگر قاری کی سمجھ میں کہانی نہیں آرہی ہے تو قصور اُس کا ہے۔ اُسے خود کو UP TO THE MARK لانا چاہیئے۔ مگر قاری بھی ہوشیار ہے۔ اُس نے علامتی کہانی کو طاق پر رکھنا شروع کیا تو علامتی اور لایعنی کہانیاں صابن کے پھین کی طرح بیٹھنے لگیں۔ منیرا اور کمتی والے احمد ہمیش کہانیوں کے سین سے بالکل غائب ہو گئے۔ پاکستان میں بھی خالدہ اصغر (حسین)، انور سجاد اور مرزا حامد بیگ کا چراغ بجھنے لگا۔ پھر ایک اور بھرّا دیا گیا کہ علامتی افسانہ نگار سب بائیں بازو کے سیاسی لوگ ہیں۔ ہندوستان میں بلراج مینرا نے دعوی کیا کہ وہ C.P.M سے وابستہ ہیں، اور اُدھر بھی دعویٰ انور سجاد نے پاکستان میں کیا (یہ ساری افواہیں سرگوشیوں میں پھیلائی جاتی تھیں) مگر قاری نے علامتی کہانیوں کو طاق پر رکھنے کا عمل بند نہیں کیا کہ وہ کہانی سے پہلی شرط، تفہیم اور دوسری کہانی پن کی چاہتا تھا۔ پھر ناقدین نے بحث شروع کی کہ کہانی پن ہے کیا؟ "افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ" "افسانے کی حمایت میں" جیسے مضامین اور کتابیں لکھی جانے لگیں۔ یہ سوال اٹھایا گیا کہ :

"اگر کسی افسانے میں کہانی پن ہو تو کیا وہ افسانہ دلچسپ ہو جاتا ہے؟۔ اگر اس سوال کا جواب "ہاں" ہے تو کہانی پن اور دلچسپی ایک ہی شے کے دو نام ٹھہرتے ہیں . . . اگر اس سوال کا جواب "نہیں" میں ہے تو یہ کہنا ممکن ہو جاتا ہے کہ افسانہ کہانی پن کے باوجود غیر دلچسپ ہو سکتا ہے۔ اس کی دوسری شکل یہ بھی ہے کہ افسانہ غیر دلچسپ بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی دلچسپ ہونا افسانے کی شرط نہیں ہے۔ اس کی تیسری شکل یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر دلچسپ چیز افسانہ ہو۔" (شمس الرحمٰن فاروقی ـــ افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ)

یہاں قاری بھی یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ یہ سوال کس سے کیا جا رہا ہے، اور کس کی تفہیم معرض بحث میں ہے؟ جب قاری کوئی صاحب ذوق ہو ہی نہیں سکتا اور تفہیم یا ترسیل کی ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ ایک تخلیق وجود میں ہے۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے تو پھر اُوپر کے سوالوں کی ضرورت کیا ہے؟ جہاں تک "دلچسپ" اور "غیر دلچسپ" کی بات ہے۔ اس میں بھی تازہ

پھر نمودار ہوتا ہے۔ کس کے لئے کہانی دلچسپ ہے؟ اُن کے لیے جو "بیسوی دنیا" پڑھتے ہیں؟ "شمع" پڑھتے ہیں؟۔ "بیسویں صدی" کے افسانے پڑھتے ہیں؟ اُن کے لیے جو "آستانہ" "مستانہ جوگی" یا سیکس میگزین پڑھتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان کی دلچسپی اور "نقوش" "فنون" اور عصری ادب کے قارئین کی دلچسپیوں میں فرق ہوگا" تو پھر "دلچسپ" اور "غیر دلچسپ" کا معیار قائم کرتے وقت قارئین کی صفیں بھی بنانی پڑیں گی۔ خیر یہ بحث خاصی طوالت چاہتی ہے، مگر اس سے یہ ضرور ہوا کہ قاری نے جب علامتی کہانیوں کو REJECT کرنا شروع کیا تو کہانی کار، قاری سے کٹ گیا۔ اور کہانیاں صرف سیمناروں میں ایک دوسرے کو سناتے اور مزاج المومنین کے لیے صرف لمبی لمبی بحثوں کی چیز ہو کر رہ گئی کچھ جدید رسالوں میں کہانیاں چھپ تو جاتیں مگر انھیں پڑھنے والے نہ تھے۔ سیمناروں میں یہ بحثیں مدتوں چلا رکھیں کہ "کہانی مجھے لکھتی ہے"۔ جدید اردو افسانے کا ڈائیلما' نیا افسانہ اور روایت سے انحراف' "کہانی مجھے نہیں لکھتی" اور معلوم نہیں کیا کیا۔ ان تمام کسرتوں سے ایک بات ضرور اُبھری کہ اگر حالات ناساز گار ہوں تو علامتی کہانی اچھی بن سکتی ہے بشرطیکہ قاری' ان حالات کی طرف اشاروں کو سمجھ سکے۔ اس میں کچھ اچھی علامتی کہانیاں بھی وجود میں آئیں، ہندوستان میں اقبال مجید کی کہانی "دو بھیگے ہوئے لوگ"، بلراج مینرا کی کہانی "وہ"۔ سریندر پرکاش کی کہانی "بجوکا" سلام بن رزاق کی کہانی "کالے ناگ کے پجاری" انور خاں کی کہانی "کوؤں سے ڈھکا آسماں" عابد سہیل کی کہانی "سوا نیزے پر سورج" رتن سنگھ کی کہانی "ڈری ڈری ہوا" وغیرہ۔ مگر پاکستان میں چند بہت ہی اچھی کہانیاں لکھی گئیں۔ ان میں انور سجاد کا افسانہ "کونپل" خالدہ اصغر کی کہانی "سواری اور ہزار پایہ" زاہدہ حنا کی کہانی "تتلیاں ڈھونڈھنے والی" اور بھی ایسی کہانیاں ہوں گی جن کا مجھے علم نہیں ہے۔ اسی لسٹ میں کچھ خوف کی کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں جن کا میں تذکرہ نہیں کر رہا ہوں۔ "مقتل" والے مینرا' "کمیں گاہ" والے شفیق اور "کہ" والے شوکت حیات مجھے معاف فرمائیں کہ میرے اعصاب کمزور ہیں۔

تفہیم اور کسی کیفیت اور دلچسپی سے عاری کہانیوں کو جب زیرک اور صاحب ذوق قاری نے REJECT کرنا شروع کر دیا تو افسانہ نگار بھی خاصہ پریشان ہوا۔ چند نقادوں اور سیمناروں کے بل بوتے پر وہ کب تک جیتا رہتا کہ اس کا رشتہ عوام سے کٹ گیا۔ یہ سوال بھی اس کے دل میں پیدا ہوئے کہ وہ کس کے لیے کہانیاں لکھتا ہے؟۔ اگر قاری اور عوام میں' ان کہانیوں کی جڑیں نہیں، اگر ان کہانیوں کا مسالہ، عوامی مسائل اور روز آنا کی زندگی سے وابستہ نہیں ہے تو یہ کہانیاں صرف نقادوں کے عجیب و غریب تجربوں کے لئے تو وہ نہیں لکھ رہا ہے اور نہ لیبارٹریوں کی بوتلوں میں بند کرنے کے لیے یہ کہانیاں ہیں' تو پھر ان کا مصرف

کیا ہوگا؟ اور یہ سوچ کر افسانہ نگار پھر تفہیم، معنویت اور عوامی مسائل کی طرف پلٹنے لگا کہ انھیں کی بدولت وہ قاری کی دنیا میں داخل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اردو کی نوبہ نو کہانی، اپنے کہانی پن، اپنی دلچسپی اور اپنے سماجی و سیاسی مسائل کو پھر واپس لا رہی ہے۔ آج کی کہانی بہت پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی ہے کہ کہیں پھر وہ کسی مکڑ جال میں گرفتار نہ ہو جائے۔ ادب میں اگر زندگی کے مسئلے نہ رہے تو پھر اس میں کیا ہوگا۔ پھر مسئلے ہیں کہ ابھرتے ہی چلے آتے ہیں۔ المیاتی بھی، دیرپا بھی اور تہذیبی شکست و ریخت کے بھی مسئلے۔ ایسے مسئلے بھی جن سے ملک ہی نہیں، بلکہ بین الاقوامی انسان کے مسئلے بھی وابستہ ہیں جن کی طرف بھی کہانی کار کو متوجہ ہونا چاہیے۔ ہاں اپنے بیان کے طریقوں کو وہ جس طرح چاہے استعمال کرے لیکن اُسے اپنے قاری کی فہم اور دلچسپیوں کے نزدیک ہی رہنا چاہیے۔ آج استعارہ، ملفی، گمشدہ کلمات (مرزا حامد بیگ)، "پہچان" (خالدہ اصغر)، کمپوزیشن اور دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم، سب ماٹ پار ہو چکے ہیں۔ "اب قیدی سانس لیتا ہے" (زاہدہ حنا)، "ماس اور مٹی" (محمد منشا)، "کوبڑے" (تقی حسن خسرو)، "دشمن دار آدمی" (احمد داؤد)، "مُخبر" (اسلام بن رزاق)، "نئے مکان کی دیمک" (علی امام)، "ریت گھڑی" (ساجد رشید) "تئیس گھنٹے کا شہر" (احمد یوسف)، "فصیل" (تسکین زیدی) اور اِن جیسے افسانوں کا مزاج بنا رہا ہے، ان سے زیادہ تر افسانے قاری اور اُس کے مسائل سے قریب ہیں۔ ایک لہر جو مزید نئے افسانہ نگاروں میں آ رہی ہے۔ وہ یہ کہ وہ چند افسانے لکھے اور ناقدین اُسے دنیائے افسانہ کا "ایک اہم ایک معتبر نام" قرار دیں۔ یہ جذبہ کچھ اچھا جذبہ نہیں ہے۔ یہیں تک بات نہیں ہے۔ کچھ بے صبر افسانہ نگار ایسے بھی ہیں، جو چند افسانے لکھنے کے بعد اپنے نمبر تک نکلوا چکے ہیں۔ میں اس موقع پر کوئی ناصح مشفق نہیں بننا چاہتا، مگر سوچیے کہ پریم چند کے بعد کہانیوں کا گراف کتنا اونچا ہوا ہے؟ نمبر نکلوانے والوں، اور اردو کہانیوں کے نقادوں کو بُرا بھلا کہنے والوں کی کتنی کہانیاں ہیں جو دلوں کو چھوتی ہیں؟ کیا پریم چند کی زندگی میں ان کا کوئی نمبر نکلا۔ یا پریم چند کے دور کے نقادوں نے ان کی زندگی میں کتنے مضامین ان پر لکھے؟ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند کے بعد کرشن چندر، بیدی، عصمت، احمد ندیم قاسمی اور قرۃ العین حیدر نے کہانی کے گراف کو کچھ اونچا کیا ہے، لیکن ترقی پسندوں کے بعد کہانی علامتوں میں ایسی کھوئی کہ کہانی کا گراف سوائے نیچے گرنے کے قطعی اونچا نہیں اٹھا۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو میں کہوں گا کہ ادھر جن کہانیوں نے متوجہ کیا ہے، ان میں انور سجاد کی "کونپل"، حنا کی کہانی "تتلیاں ڈھونڈنے والی" رتن سنگھ کی کہانی "ڈری ڈری ہوا" ہے۔ ان میں بالکل نئے تجربے ہیں۔ اور ان میں زندہ رہنے کی صلاحیت معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً زاہدہ حنا کی کہانی ایک بار پڑھنے کے بعد مدتوں آپ کو HAUNT کرتی رہے گی۔ یقیناً میرا محاسبہ بہتوں

کو پسند نہیں آئے گا، مگر مجھے بہر حال اپنے محاسبے کا حق ہے۔

ناول کی دنیا، ۱۹۵۰ء کے بعد سے، افسانوں سے بہتر ہوئی ہے۔ ادھر نئے پرانے لکھنے والوں نے ناول کے فن اور اس کی پیشکش کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ ترقی پسندوں کے ساتھ، اردو ناول خالص رومان سے باہر نکل آیا تھا۔ ننگی حقیقتوں کے قریب ناول کو لانے میں ترقی پسندوں کی کوششیں "لندن کی ایک رات" سے شروع ہوئیں اور "ٹیڑھی لکیر" "معصومہ"، "دل کی دنیا" (عصمت چغتائی)، "طوفان کی کلیاں"، "باون پتے" اور "ایک عورت ہزار دیوانے" (کرشن چندر)۔ "تلاش بہاراں" (جمیلہ ہاشمی)۔ "آگ کا دریا"، "سفینۂ غم دل" (قرۃ العین حیدر)۔ "اداس نسلیں" (عبداللہ حسین)، "خدا کی بستی" (شوکت صدیقی) "راہ عمل" اور "اپنی اپنی صلیب" (صالحہ عابد حسین)، "آنگن اور زمین" (خدیجہ مستور) سے ہوتے ہوئے ناول کی دنیا اب ایک نئے منطقے میں داخل ہو گئی ہے۔ ادھر ناول میں کچھ علامتی رنگ بھی نمایاں کرنے کی کوشش، جوگیندر پال اور انور سجاد نے کی۔ جوگیندر پال کا ناولٹ بیانات اور نادید۔ انور سجاد کا ناول "خوشیوں کا باغ" کی تفہیم آسان نہیں، علامتوں کے پردے خاصے دبیز ہیں۔ پھر بھی ناول یا افسانے میں، اگر تخلیق کار اپنے ساتھ بیانیہ کو لئے رہے، خواہ کسی شکل میں ہو تو، قاری، تخلیق کار کے ساتھ چل سکتا ہے، چاہے تخلیق کار علامتوں کے ساتھ ہی کیوں نہ چلتا ہو لیکن اگر اس نے بیانیہ کا ساتھ چھوڑ کر خالص علامتوں اور احساس کے فکری اشاروں یا مصوری کی ذہنی صورتوں کو الفاظ کے ذریعہ یہ سمجھ کر کوشش کرنا شروع کیا کہ الفاظ، مصور کے رنگ اور لکیروں کا بدل ہیں تو بیانیہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اظہاریت بھی باقی نہیں رہ پاتی۔ ادب اور خصوصاً کہانی یا ناول بہر حال کسی واقعے سے ہی متعلق ہوتے ہیں اور واقعے میں بیان، ایک لازمی سی شے ہے۔ انور سجاد کے دونوں ناول "خوشیوں کا باغ" اور "جنم روپ" بیانیہ سے تقریباً عاری ہیں۔ ان دونوں میں شعری اور مصورانہ، اختصار، اشاریت اور تہ داریاں اپنے عروج پر ہیں۔ یہ کہنا کہ احتجاج کو پرزور طور پر واضح کرنے کے لیے، یہ طرز اختیار کیا گیا ہے۔ ایک طرح کا بہکاوا ہے کہ احتجاج، اگر دیکھنے اور سننے والوں پر واضح نہیں ہوتا تو اس کی اہمیت کیا ہو سکتی ہے۔

ادھر اردو ناول میں تھیم کی نئی تلاش ہوئی ہے۔ پرانے اور کچھ نئے ناول نگاروں نے، رومان اور انقلاب سے ہٹ کر بھی زندگی کے کچھ نئے روپ تلاش کئے ہیں۔ بانو قدسیہ نے ایک نئے موضوع پر ایک اچھا ناول "راجہ گدھ" کچھ سال قبل پیش کیا ہے۔ موضوع، ان معنوں میں نیا ہو جاتا ہے کہ مصنفہ نے ہیرو کے ایک خاص رجحان کو -POINTED- بنانے کی کوشش کی ہے اور انھیں صورتوں سے متاثر ہو کر گدھ، کا علامتی نام دیا ہے کہ گدھ کو ہمیشہ مردار

ہی کھانے کو ملتا ہے۔ وہ خود شکار نہیں کرسکتا۔ 'راجہ گدھ' کے ہیرو کو بھی ہر مرتبہ معاشقے میں یہی مسئلہ پیش آتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ ایک منزل پر پہنچ کر شادی کے لیے تیار ہوتا ہے تو وہاں پر کچھ یہی حادثہ اُسے پیش آتا ہے۔ موضوع کے اس انوکھے پن کے ساتھ بانو قدسیہ نے جو حالات اور سیاسی و سماجی صورتوں کو لپیٹ دیا ہے۔ وہ پاکستانی زندگی کے مطالعے میں بڑی مدد دیتی ہیں اور اس طرح یہ ناول اپنی افادیت باقی رکھتا ہے۔ شوکت صدیقی نے بھی 'جانگلوس' میں ایک نئے موضوع کو اپنایا ہے، جس میں رحیم داد اور لالی کے گرد ناول گھومتا ہے۔ یہ جیل سے فرار مجرم، ہر طرح کی بدعنوانیاں سماج میں پھیلاتے پھرتے ہیں اور ان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ ہر طرح کا فائدہ اُٹھاتے ہیں، اور آزاد ہیں۔ دراصل کہانی کی دلچسپی یہ ہے کہ آج کی سیاسی فضا میں مجرم مزے کر رہے ہیں۔ سوسائٹی اُن کی معاشی ترقی دیکھ کر، انھیں صورتوں کو خوشحالی کی کنجی سمجھتی ہے اور اس خیال کے تحت جو سماج وجود میں آئے گا، اُس کے اعمال و افکار کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، اور یہ صورت، دونوں ملکوں یعنی پاکستان اور ہندوستان میں تیزی سے اُبھر رہی ہے۔ بے کرداری ہی سب سے بڑا کردار اور بے ایمانی ہی سب سے بڑا ایمان ہے، اور یہ صورت صرف ذرائع معاش کے لیے ہی نہیں بلکہ بڑھتے بڑھتے ادب کی دنیا میں بھی مختلف طریقوں سے داخل ہو گئی ہے۔

انتظار حسین نے اپنے نئے ناول "تذکرہ" میں اپنے بازیافت والے اسٹائل سے ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ اگرچہ یہ موضوع بھی بازیافت کی ایک طرح سے توسیع ہے مگر بہرحال یہ ایک نیا مسئلہ ضرور ہے جو ہندوستان میں ختم ہو چکا ہے۔ مگر پاکستان میں روز بروز شدت پکڑتا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ ہے مہاجرین کے بسنے بسانے کا جس میں روز بروز پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں، اور جس کے باعث چالیس پچاس برس بعد بھی، یہ اکھڑے ہوئے لوگ، آج بھی اکھڑے اکھڑے پھر رہے ہیں۔ اس ناول میں اسلامی طرز پر سزائیں دینے کے جو نقشے انھوں نے پیش کیے ہیں، خصوصاً چوراہے پر پھانسی دینے کا طریقہ وہ آج کی پاکستانی سماجی زندگی پر طنز بھی ہے اور بیسویں صدی کی مہذب زندگی کے لیے عبرت انگیز بھی۔ بعض باتیں جو انتظار حسین کے ساتھ بدخوابی DELIRIUM کی طرح، اُن کی ہر تحریر میں لگی ہوتی ہیں۔ وہ اس ناول میں بھی موجود ہیں۔ یعنی بلا سبب اور بے موقع ترقی پسندوں اور اشتراکیوں پر دولتیاں جھاڑنا جس سے، ناول کی رواں دواں سنجیدگی مجروح ہو جاتی ہے، اور اس کا مصرف سوائے مخالفت برائے مخالفت کے اور کچھ نہیں رہ جاتا۔

اسی تھیم کو ذرا دوسرے ڈھنگ سے دیوان بریندر سنگھ 'ظفر پیامی' نے اپنے حالیہ ناول "فرار" میں

لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ظفر پیامی کے ناول "فرار" کی فضا بھی انتظار حسین کے ناول سے زیادہ وسیع ہے اور موضوع کا میدانِ عمل بھی بڑا ہے اور ان کے نتیجے بھی بہتر ہیں۔ یہ ناول بھی ڈھاکہ سے ہندوستان اور پھر پاکستان جانے والے چند مہاجرین اور ہندوستان میں ان کے ہندو مسلم دوستوں اور واقف کاروں کو اس طرح لپیٹ لیتا ہے کہ حکومت الگ ہو جاتی ہے اور انسانی اخوت اور دوستیاں الگ اور یہی اس کا ایجابی (POSITIVE) رخ ہے کہ انسانی محبتیں اور لگاؤ سیاست کے بندھنوں اور فرقہ پرستیوں کے زہر کو نہیں مانتے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے دو ہم جماعت دوست افتخار حسین ہاشمی اور آفتاب چودھری اس ناول کے اصل کردار ہیں جو صحیح طور پر ایک مشترکہ تہذیب میں بندھ کر ایسے وقت میں بھی اپنی محبتوں کو نہیں بھولتے۔ جب پاکستانی فوجیں ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال چکی ہیں اور افتخار ہاشمی کس طرح اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان فرار ہو جانا چاہتے ہیں مگر ناول کا فیصلہ نوجوان لیڈی ڈاکٹر سحر ہاشمی کا فیصلہ ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کی نئی نسل کا فیصلہ ہے جو کسی مزید فرار یا ہجرت کیلئے تیار نہیں بلکہ اپنے حقوق اور فرائض سب کا فیصلہ اسی سرزمین پر رہ کر کرنا چاہتے ہیں کہ یہ سرزمین سب کی مشترکہ میراث ہے۔ اس کے تمام مسئلے ہندوستان کی نئی نسل کے مسئلے ہیں۔ ناول کا یہ بالکل نیا ٹریٹ منٹ ہے۔ یہ ٹریٹ منٹ حکومت کی سیاسی قومی یکجہتی کے نعرے سے الگ چیز ہے جس میں ظفر پیامی نے نئی بنتی ہوئی سوسائٹی کے خد و خال اور ان کے نئے مسائل کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو ناول کی دنیا میں یہ ایک نیا قدم ہے جس کے انداز دوسرے ہیں۔ ظفر پیامی چونکہ خود ایک صحافی بھی ہیں۔ اس لئے ناول میں صحافیانہ اور سیاسی مسئلے بہت زیادہ دخیل ہو گئے ہیں۔ بہر حال اردو کے نئے ناول کے لیے ابھی بہت سے میدان باقی ہیں۔ کاش پریم چند کی طرح کوئی آج کے دیہات کو اپنا موضوع بنا کر آزادی کے بعد کے دیہاتوں کو پیش کر سکتا کہ ابھی یہ ایک بڑا اور دلچسپ تھیم ہے جو اردو کے ناول نگاروں کی توجہ کا محتاج ہے۔ میری معلومات کے مطابق ہندی اور اردو، دونوں زبانوں میں اب تک ہندوستان کے نئے دیہاتوں اور ان کے نئے مسائل کو نہیں چھوا گیا۔ ابھی تک لوگ ہندوستان کے دیہاتوں کو پریم چند ہی کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ ادب کے کسی مسئلے کے مستقبل پر کوئی رائے زنی مشکل ہوتی ہے۔ مگر اندازہ یہی ہے کہ اردو ناول اور افسانے، سب شہری مزاج رکھتے ہیں اور شہروں کے مسئلے، آئندہ بھی اردو ناول کے مسئلے بنیں گے کیونکہ مغربی ادب کا بھی یہی ماڈل ہمارے سامنے ہے۔ ہارڈی اور اس کا اسکول اب انگریزی ادب سے بھی غائب ہو چکا ہے اور کم از کم اردو ہندی کے ادیبوں کے سامنے ہر وقت مغربی ادب، ادبی تحریکات اور تجربے ہی رہتے ہیں۔ اردو میں ناول

کو آنچلک بھی بنانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ پاکستان کے کچھ افسانوں اور ناولوں میں یہ کوشش ملتی ہے مگر ہندوستان کے اردو ناول ابھی تک آنچلک نہیں ہو پائے ہیں۔

اب آج کی تنقید پر کچھ باتیں کی جاتی ہیں۔ ترقی پسندوں نے اردو تنقید کو ایک نیا رخ دیا تھا اور وہ یہ کہ ادب کی صرف خوبیاں اور خرابیاں یا فنی نکات سقم اور محاسن سے آگے بڑھ کر ادب کا تجزیہ اس طرح کیا جائے کہ کسی تخلیق کے وجود میں آنے کے محرکات کیا ہوتے ہیں۔ کیا صرف تجزیوں کے فنی اور جمالیاتی احساس کے اظہار کے لیے ادب وجود میں آتا ہے یا ادیب کے گرد و پیش کے بیرونی حالات اُسے ایک خاص وقت میں خاص طرح کی ترجمانی کے لیے مجبور کرتے ہیں اور یہ بیرونی حالات ادیب کے اپنے سماجی اور سیاسی حالات ہی ہوتے ہیں جو اُس کے ذہن کو ایک خاص طور پر سوچنے کے لیے مجبور کرتے ہیں اور یہ کہ عوامی زندگی کے درمیان ہی سے زندگی کے مسائل آتے ہیں اور وہی مسئلے ایک بڑے گھیرے میں کسی ملک و قوم کا مسئلہ بنتے ہیں۔ بیسویں صدی کے سماجی اور سیاسی حالات نے پریم چند کو اپنے ناولوں اور افسانوں کے لیے مسالہ فراہم کیا۔ اس مسالے، ان حالات اور سوسائٹی کی اُن خاص صورتوں کے بغیر پریم چند اور ان کے تخلیقات کا وجود ممکن نہ تھا۔ پھر ترقی پسندوں نے سماجی حقیقت نگاری کے اظہار پر سب سے زیادہ زور دیا۔ مجنوں گورکھپوری کی "ادب اور زندگی" سے لے کر آج تک کے ترقی پسند نقادوں کا تنقید ادب کے لیے سب سے بڑا پیمانہ یہی سماجی حقیقت نگاری رہا ہے سماجی حقیقت نگاری، زندگی کی حقیقتوں کی سماجی تجذیب کے اظہار کا نام ہے، جس کے گہرے نشانات تخلیق کار کی فکر پر پڑے ہیں۔ فن کے پرکھنے میں، اس تجزیہ اور اس کے طریقوں کو ترقی پسند نقادوں نے اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ یہ طریق کار، فن کار کے جمالیاتی تجربوں کا بھی جائزہ لیتا رہا ہے اور دوسری صورتوں کا بھی مگر اسے کسی جامد فارم کے طور پر ترقی پسند نقادوں نے اسے استعمال نہیں کیا۔ نہ کسی ہئیت یا تکنیک کے طریقے پر جیسا کہ اکثر ترقی پسند تنقید پر اعتراضات کئے جاتے رہے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہوتا رہا ہے کہ تنقید میں اس صورت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا۔ بقیہ صورتیں بہت کچھ تشنہ رہ گئیں۔ لیکن نئی ترقی پسند تنقید اب دوسری صورتوں کی طرف متوجہ تھے۔ ادھر دو سال پہلے مارکسی جمالیات پر اصغر علی انجنیر کی ایک اہم کتاب 'مارکسی جمالیات' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس سے قبل بھی پروفیسر ممتاز حسین نے "نئی حقیقت نگاریاں" اور نئی جمالیات پر اپنی کتاب "ادبی گوشے" اور "ادبی مسائل" میں اٹھائی تھی۔ راقم الحروف، کے بھی کئی مضامین، مارکسی جمالیات پر شائع ہوئے ہیں۔ پروفیسر محمد حسن کی کتاب ادبی سماجیات، میں بھی تنقید کے جمالیاتی اور لسانیاتی

پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ پھر یہ کہ صرف جمالیات ہی ادب اور تنقید کا سب کچھ تو نہیں۔ ادھر جو نئی تنقید نئی شاعری کے سلسلے میں آئی ہے۔ اُس میں جمالیات اور ادب پر اس طرح بحث کی گئی ہے کہ جیسے اگر نقاد ادب کے جمالیاتی پہلو پر کچھ نہیں لکھتا تو وہ نقاد ہی نہیں پھر ادب کی ہئیتی صورتوں کو ہی اصل تنقید سمجھ لیا گیا ہے۔ اور یہی سمجھانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ اس میں بہت سے چھٹ بھیئوں کو بھی مزہ ملا۔ وہ جو نہ سماجی حقیقت نگاری کو سمجھتے تھے اور نہ جمالیات کا درک رکھتے تھے، وہ بھی نئی صف میں شامل ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو کی نئی تنقید، اب ہئیتوں سے بھی الگ ہو کر متنی تنقید (TEXTUAL CRITICISM) کی طرف متوجہ ہو رہی ہے۔ متن ہی کو سامنے رکھ کر تخلیق کار کی تخلیقات کا جائزہ لیا جانا چاہئے۔ اور اس پر بیرونی اثرات، وقت کا فیشن یا چلن، یہ سب فروعی باتیں ہیں۔ اس سلسلے کی باقاعدہ کتاب شمس الحق عثمانی کی کتاب "بیدی نامہ" ہے جس میں صرف کہانیوں اور ناولوں کے متن پر ہی ساری تنقید کا انحصار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ متن کی اہمیت ہے کہ وہی فن کار کا اصل کارنامہ ہے، مگر تنقید تو یہ سوال کر سکتی ہے اور اسے کرنا بھی چاہئے کہ اس متن کے وجود میں آنے کے اسباب و علل کیا رہے ہوں گے۔ آخر اس طرح کی پیشکش کا مذاق اور مسالہ، کن صورتوں اور کن حالات میں آیا ہوگا۔ کوئی تخلیق اپنے سماجی اور تاریخی گھیرے سے باہر اپنا وجود نہیں رکھتی۔ یہ بنیادی بات مان کر جب تک تنقید نگار نہیں چلے گا۔ صرف فروعات سے بحث کسی تخلیق کا صحیح جائزہ نہ ہوگا۔ لسانیات کے مطالعے سے تنقید میں فی زمانہ ایک نیا رخ اسلوبیاتی تنقید کا بھی پیدا ہوا ہے۔ تخلیق کے موضوع اور مسالے کو چھوڑ کر، تنقید نگار، اُس کے پیش کرنے کے سانچوں اور اسٹائل صوتی نظام، آہنگ وغیرہ پر بحث کرتا ہے، جو ہئیتی تنقید ہی کا ایک حصہ ہے۔ اب اس میں بھی تنقید نگار جب آہنگ اور صوتی نظام کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے، حروف گننے لگتا ہے۔ اور اُن حروف کی موسیقیت ہی کو صرف، فن کار کی عمدہ تخلیق کا بنیاد بتانے لگتا ہے تو یہ انتہا پسندی کی دوسری مثال ہے کہ شاعر نے حروف کا التزام کر کے غزل تخلیق نہیں کی تھی۔ یہیں سے تنقید میں ایک دوسری شاخ ساختیاتی تنقید (STRUCTURAL CRITICISM) کی بھی پھوٹتی ہے۔ اس میں وہ نقاد بھی کسی حد تک شامل ہو جاتے ہیں جو عملی تنقید کے قائل ہیں۔ اگرچہ ساختیاتی تنقید، ہئیتی تنقید ہی کے زمرے میں آتی ہے، مگر اس کا سایہ عملی تنقید پر بھی ہے۔ عملی تنقید میں اگرچہ مسالہ خاص طور پر بحث میں آتا ہے۔ پھر بہت سے نفسیاتی مسئلے بھی مگر تخلیق کی بناوٹ اور بناوٹ بھی زیر بحث آتی ہے۔ عملی تنقید، اردو میں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ کلیم الدین احمد نے اس طرز کو باقاعدہ شروع کیا۔ راقم الحروف نے بھی کچھ کام اسی سلسلے میں کیا ہے۔

تنقید کے نئے رخ میں تحقیق کے طریق کار کو بھی کچھ جگہ مل رہی ہے۔ یہ صورت غالباً ان درسی مقالوں سے

پیدا ہوئی ہے۔ جو یونیورسٹیوں میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ ان میں نہ اصول تنقید کی باتیں ہیں نہ نظریات تنقید کی بلکہ، تخلیق کے حسن و قبح پر ہلکی پھلکی بحثیں۔ فنی اور فکری محاسبے کے سلسلے میں کی جاتی ہیں۔ مگر ان تحقیقی مقالوں کی تنقید اور ان کے نقاطِ نظر پر زیادہ بھروسہ کرنا مناسب نہیں، ان میں سے توتے ہی جملے اِدھر اُدھر سے لفظاً لفظاً نقل کر لئے جاتے ہیں، جس کا پتہ بعد کو چلتا ہے۔ کچھ مقالہ نگار تو ایسے دیدہ دلیر ہیں کہ انھیں بعد کو اسی طرح شائع کر کے اردو کی اکیڈمیوں سے انعامات بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ صورت حال اسی ناگفتہ بہ ہے کہ یونیورسٹی کا استاد نقاد، بالکل جعلی، نقاد ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے شعرا، دوسروں کی غزلیں مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھ دیا کرتے تھے اب یونیورسٹی کے اساتذہ اور اردو کے نقاد، دوسروں کی تنقیدی کوششوں کو مقالے کی شکل میں اپنے نام سے پیش کر کے ڈگریاں حاصل کرتے ہیں۔ یونیورسٹی کے استادوں کی تنقید اور ان کی ڈگریاں اب قطعی قابلِ اعتبار نہیں تنقید کی دنیا میں یہ ایک پُر دغل اور جعلی سکہ ہیں۔ اچھی تنقید اور اچھی تخلیقات اب مدرسوں اور یونیورسٹیوں سے باہر لکھی جا رہی ہیں اور تدریسی اداروں سے باہر رہ کر ہی اب اردو میں نئے تنقیدی تجربوں کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ اقبالؔ نے مدرسہ اور خانقاہ دونوں کے لیے کہا تھا کہ ؎

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک  نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

مجھے خانقاہ کا تو کوئی تجربہ نہیں، مگر میں مدرسے کے لیے آج یہ شعر ضرور پڑھ سکتا ہوں۔ کوئی چاہے تو میری ایسی سوچ کا بھی تنقیدی تجزیہ کر سکتا ہے۔

●●

# مطبوعات خدابخش لائبریری، پٹنہ

۱۔ خدابخش: خدابخش لائبریری کے بانی کی ایک مختصر مگر جامع سوانح
از سعید و ناقوس کو، از صلاح الدین خدابخش (انگریزی) 10-00

۲۔ منصوری کا تاج محل: خدابخش لائبریری میں محفوظ علبیہ کے ایک نادر مخطوطہ "تاریخ خاندان تیموریہ" کا تعارف اور مخطوطہ کی ۱۲ رنگین تصاویر۔ (انگریزی) 15-00

۳۔ مجموعۂ مقالات پروفیسر سید حسن عسکری: پہلی جلد، گنج ارشدی "شرف الدین یحییٰ منیری" نیز چند عربی اور فارسی پر مضامین (انگریزی) 10-00

۴۔ تدوین متن کے مسائل: خدابخش سیمینار کے مقالات اور مباحثے (اردو) 15-00

۵۔ پنڈت موتی لال نہرو کا خطبۂ صدارت: انڈین نیشنل کانگریس کی یوپی کی پہلی صوبائی کانفرنس (۱۹۰۷ء) میں: ایک اہم دستاویز (اردو) 10-00

۶۔ فرہنگ آصفیہ: مولوی سید احمد دہلوی پر تبصرہ عظیم محقق قاضی عبدالودود کے قلم سے (اردو) 10-00

۷۔ بہار اردو لغت جلد اول: فرہنگ، از یوسف الدین احمد بلخی (م ۱۹۶۱ء) بہار میں عام طور پر بولے جانے والے الفاظ اور محاورات کی ایک اہم لغت (اردو) 15-00

۸۔ امیر خسرو بحیثیت مورخ — از پروفیسر حسن عسکری (انگریزی) 25-00

۹۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل: از سید حامد 30-00

۱۰۔ تہذیب اسلامی: جنوبی ایشیائی علاقائی سیمینار: روداد و مقالات 50-00

۱۱۔ رقعات رشید صدیقی: از ڈاکٹر مسعود حسین 30-00

۱۲۔ قومی یکجہتی کی روایت: از بی۔ این۔ پانڈے 5-00

۱۳۔ مولانا آزاد کی یاد میں: (ہندی) 15-00

۱۴۔ سجاد حیدر یلدرم: از ویرگن ترکمان 10-00

۱۵۔ آثار آزاد: خطوط آزاد بنام ذکور مظہر آبادی: از رفیعت اللہ خالدی 30-00

۱۶۔ ہندوستانی مسلمان: عصری دستاویزات کے آئینہ میں 50-00

■ ترتیب و تدوین

۱۷۔ مجمع النفائس: از سراج الدین علی خان آرزو (م ۱۱۶۹ھ): بارہویں صدی ہجری کے فارسی شعرا کا ایک اہم تذکرہ (فارسی) 10-00

۱۸۔ باغ معانی: از نقش علی (م ۱۱۰۳ھ): بارہویں صدی ہجری کے فارسی شعرا کا دوسرا اہم تذکرہ (فارسی) 10-00

۱۹۔ مثنوی تصویر محبت: از میر شمس الدین فقیر (م ۱۱۸۳ھ): عظیم آباد کی ایک داستان محبت جو میر کی شعلۂ عشق کا ماخذ ہے (فارسی) 10-00

۲۰۔ صحف ابراہیم: از علی ابراہیم خان خلیل (م ۱۲۰۳ھ): بارہویں صدی ہجری کے شعرائے فارسی کا تیسرا اہم تذکرہ (فارسی) 10-00

۲۱۔ شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان: از مرزا جان طپش (م ۱۲۲۹ھ): شاہ عالم کے عہد کی محاورات اردو کی لغت 10-00

۲۲۔ تاریخ ہائے پیدائش و وفات معاصران: قطعات عبرت (از شمس العلماء محمد حسرت عظیم آبادی م ۱۳۰۳ھ) فارسی 10-00

۲۳۔ کنز التواریخ: شاہ علی عظیم آبادی (م ۱۳۰۲ھ) کے قطعات تاریخی (فارسی) 10-00

۲۴۔ تذکرہ کاملان رامپور: مرتبہ حافظ احمد علی خاں شوق (م ۱۹۲۲ء) (عکسی اشاعت) امیر مینائی کی "انتخاب یادگار" کے بعد رامپور کے مشاہیر اور روہیلوں کی تہذیبی تاریخ کا اہم ماخذ، تقریباً ۱۳۵ مشاہیر رامپور کا تذکرہ تصحیح و اضافے کے ساتھ (اردو) 30-00

■ رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت

۲۵۔ جلد اول: ادیب الٰہ آباد: نوبت رائے نظر کے ماہنامہ "ادیب" کے مکمل فائل (۱۹۱۰–۱۹۱۳ء) سے ادبی، علمی، تہذیبی، لسانی اور سیاسی مضامین کا انتخاب 50-00

۲۶۔ جلد دوم: العصر لکھنؤ: پیارے لال شاکر کے ماہنامہ "العصر" لکھنؤ (۱۹۱۳–۱۹۱۶ء) کے تمام دستیاب شماروں کا انتخاب جس میں ادبی، علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ فلسفہ، سائنس اور صنعت و حرفت پر بھی مضامین شامل ہیں۔ ۳۰ مشاہیر کی نادر عکسی تصاویر کے ساتھ۔ 50-00

۲۷۔ جلد سوم: صبح امید لکھنؤ: برج نرائن چکبست کے ماہنامہ "صبح امید" لکھنؤ (۱۹۱۹–۱۹۲۰ء) کے مکمل فائل سے ادبی، علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ تحریک آزادی کی معاصر شہادتیں اور انقلاب روس کے ہندوستان پر اثرات سے متعلق معاصر تجزیے 50-00

۲۸۔ ۱۹۳۶ء میں قاضی عبدالودود کا معیار: قاضی عبدالودود کے مشہور اردو ماہنامہ "معیار" پٹنہ (۱۹۳۶ء) کے مکمل فائل کی عکسی اشاعت: ایک طویل تجزیاتی اشاریے کے اضافے کے ساتھ 50-00

۲۹۔ جدید غزل گو: ۱۹۳۱ء کی ایک دستاویز، نیاز فتحپوری کے ماہنامہ "نگار" ۱۹۳۲ء کے خاص نمبر کی عکسی اشاعت، ملک کے غزل گو شعرا کا خود انتخاب کردہ کلام، خودنوشت سوانح، شعرا کی اس عہد کی تصاویر اور خودنوشت تحریریں۔ 35-00

۳۰۔ خوشتر گرامی دہلوی کا رسالہ "زبان" (۱۹۲۸–۱۹۳۶ء) مکمل عکسی اشاعت تفصیلی اشاریے کے اضافے کے ساتھ، اسلامی تاریخ، ہند، تنقید، زبان و ادبیات، اردو مجلے، اہم مقالات، نادر عکس، ایسے مکاتیب نیز تصاویر مشاہیر 50-00

■ خدابخش سلسلۂ خطبات

۳۱۔ عہد سلطنت (۱۲۰۶–۱۵۲۶ء) کے صوفی ادب پر ایک طائرانہ نظر: از ڈاکٹر بروس لارنس، امریکہ (انگریزی) 10-00

۳۲۔ عہد نبوی کی تقویم کی تشکیل نو: از ڈاکٹر ہاشم میر علی (انگریزی) 10-00

۳۳۔ صوفیہ کے مکتوبات و ملفوظات: سماجی سیاسی تاریخ کا ایک اہم ماخذ: پروفیسر سید حسن عسکری (انگریزی) 10-00

۳۴۔ اسلام کی چودہ صدیاں مکمل ہونے کی تقریب میں: ہندو مسلم مسئلہ اور اسلام و عصر جدید کے بارے میں چند خیالات از بدر الدین طیب جی۔ (انگریزی) 10-00

۳۵۔ فارسی ادبیات میں ہندوستان کا حصہ: جدید تحقیقات کی روشنی میں: از ڈاکٹر امیر حسن عابدی (انگریزی) 10-00

۳۶۔ فکر اسلامی: بدلتی دنیا میں: از پروفیسر سید وحید الدین (انگریزی) 10-00

۳۷۔ مشرق وسطیٰ: (شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ): از پروفیسر علی اصغر آصف فیضی۔ (انگریزی) 10-00 10-00

۳۸۔ اسلامک اسٹڈیز: از ڈاکٹر ظہیر صدیقی۔ (انگریزی) 10-00

۳۹۔ علیگڑھ تحریک: از سید حامد 5-00

۴۰۔ اسلام اور ہندوستان: از بی۔ این۔ پانڈے۔ 10-00

۴۱۔ اورنگ زیب ایک نیا مطالعہ: از ڈاکٹر اوم پرکاش (ہندی) 15-00

# اردو دانشوری

سیّد حامد
ڈاکٹر محمد حسن



خدا بخش نے ایک مسئلہ اور بھی چھیڑا — اردو دانشوری آزادی کے بعد! بہت اچھے مفکروں نے اس موضوع کا حق ادا کیا، اور ہر طرح: کسی نے کہا۔ کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے؟ کسی نے کہا دانشوری یعنی چہ؟ کسی نے کہا چیل کے گھونسلے میں ماتس کہاں۔

کسی نے کہا:

ہم کہاں کے دانا ہیں کس ہنر میں یکتا ہیں　　　　بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

مگر بعضوں نے کہا: نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہاتھ پیر توڑ کے بیٹھ جائیں۔ ہم جو ہیں وہ ہیں۔

اور جو بھی ہیں کچھ تو ہیں، اور بہتوں سے آگے ہیں!

یہ مباحث آپ کے سامنے آتے رہیں گے۔

ادارہ ●————

سید حامد
ہمدرد نگر، نئی دہلی

# دانشوری کی تعریف
## اور
## اردو میں دانشوری کی بازیابی کے امکانات

آگے بڑھنے سے پہلے اچھا ہو کہ دانشوری کے معانی، مفاہیم اور مضمرات سے بحث کر لی جائے۔

وہی لوگ دانشور ہیں جنھوں نے زندگی کی گتھیوں کو حل کرنے کی لگاتار کوشش کی ہے، جنھوں نے عالم کے بدلتے ہوئے حالات سے خود کو باخبر رکھا ہے۔ جن کے مطالعہ کو ان کے مشاہدہ اور تجربے سے غذا ملی ہے۔ جن کا علم نرا کتابی علم نہیں ہے۔ جن کے علم نے انھیں رائے قائم کرنے، حکم لگانے اور فیصلہ کرنے کا شعور دیا ہے؛ جن کا مطالعہ وسیع ہے اور ملک کی ایک سے زائد زبانوں کے علاوہ جن میں مغرب کی ایک زبان بالخصوص انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی زبان پر دسترس حاصل ہے (کہ سمٹتی، پیچیدہ تر ہوتی ہوئی اور نت نئے مسائل سے لبریز دنیا سے باخبر ہونے اور رہنے کے لیے مشرق اور مغرب دونوں سے براہ راست آگاہی ضروری ہے) جو مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی عادت ڈال چکے ہیں۔ جنھوں نے اپنے ذہنوں کو اوہام رسوم، موروثی خیالات اور تعصبات سے آزاد کر رکھا ہے۔ جن کا مقصد حقیقت کو پالینا ہے اور جس میں اس بات کی جرأت ہے کہ سچائی سے خواہ وہ کتنی ہی تلخ ہو۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں اور اسے برملا بغیر آنکھ جھپکائے بیان کر سکیں —

دانشور تلاش حق اور اعلان حق میں کسی مصلحت یا کسی رُو رعایت کو داخل نہیں ہونے دیتا۔ اس کا ذہن سرجن کے نشتر کی طرح ہوتا ہے جس کی دھار میں بلا کی کاٹ ہوتی ہے۔ اس کے گرد نہ دھواں بھٹکنے پاتا ہے نہ دھندلکا — وہاں سورج کی شعاعیں اسی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ افروز ہوتی ہیں۔ وہ حقیقت کی جستجو میں کسی نظام فکر کو دخل نہیں ہونے دیتا نہ ان حقائق کو چھپانے یا دبانے کی کوشش کرتا ہے جن کا اظہار اس کے محبوب نظامِ فکر کو مشتبہ بنا رہا ہو۔ اس کا آلہ عقل ہے، وہ عقل جس کے ساتھ سوجھ بوجھ چلتی ہے، وہ عقل نہیں جو باریک بینی اور موشگافی سے دل بہلاتی ہے۔ دانش کا مصدر دانستن ہے جس کے معنی ہیں جاننا یعنی کسی امر کی تہ تک پہنچ جانا۔ دانشور کبھی سطحی نہیں ہوتا اور نہ وہ سُرعت ذہن پر ناز کرتا ہے۔ سُرعت فہم کے بغیر بھی انسان دانشور ہو سکتا۔

دانش اور ذہانت میں بڑا فرق ہے۔ یہ لازم نہیں کہ ہر ذہین آدمی اُمور پر گرفت رکھتا ہو یا اس سے اصابت رائے منسوب کی ہی جائے ــــ دانش ذہانت کی بہ نسبت ادراک سے زیادہ قریب ہے لیکن دانش کے عمل میں ادراک کے عمل سے زیادہ جامعیت ہے۔ دانشور کے یہاں اشتراک مقاصد غیر ممنوعہ ہے۔ دانشور اصلاً موحد ہوتا ہے۔ اس کا واحد مقصد سچائی کو ڈھونڈھ نکالنا ہے۔ وحدتِ مقصد پر وہ کسی مفاد کسی مصلحت کو اثر انداز نہیں ہونے دیتا۔

دانش میں چاہے یہ مفہوم بہت واضح نہ ہو لیکن دانشور کی نگاہ ہمیشہ حال کے علاوہ مضمرات امکانات مستقبل اور متوقع یا ممکن نتائج پر ہوتی ہے اور وہ ایسے اقدام سے انحراف کرتا اور کراتا ہے جو بظاہر بہت اچھا ہو لیکن جس میں امکان نتائج کے خراب نکلنے کا چھپا ہوا ہو۔ دانشوری کا ایک عنصر دُور اندیشی ہوتا ہے۔

دانشوری چھوٹی چھوٹی وفاداریوں، وابستگیوں اور تنگ نظریوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ اس کا اُفق عالم اور انسانیت کا احاطہ کرتا ہے۔ آپ کسی ایسے شخص کو دانشور نہیں کہہ سکتے، شہر، ریاست یا وطن جس کی حدِ نظر ہو یا اس شخص کو جو سیاست کے دریا کا شناور ہو۔

دانش ایک حد تک تجریدی پہلو لیے ہوئے ہوتی ہے لیکن حکایت تجرید کو اتنا نہ بڑھانا چاہیے کہ دانش کی غیر معمولی عملی افادیت کو ٹھیس پہنچے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ دانش کا عقل کی موشگافی یا تخیل کی بے مقصد بلند پروازی سے کوئی تعلق نہیں۔ دانش کے پیر سدا زمین پر ہوتے ہیں۔ اس کے قدم سوجھ بوجھ اور اعتماد کے ساتھ پڑتے ہیں اس کی نگاہ سُرنگ کے اندھیرے کو چیرتی ہوئی دوسرے سرے کی روشنی سے جا ملتی ہے۔

دانش کے ایوان میں نہ تیز رفتاری بار پاتی ہے، نہ گھبراہٹ، نہ فلسفیانہ بے نیازی، دانش کے ناخن موہوم لکیریں نہیں کھینچتے گتھیوں کو سلجھاتے ہیں۔ دانشور دراصل وہی ہے جو گتھیوں کو سلجھا سکے۔

دانشور کی انگلیاں انسانی فطرت کی نبض پر ہوتی ہیں۔ وہ انسان کے ارتقا اور زندگی کے نشیب و فراز سے باخبر ہوتا ہے۔ تاریخ پر اس کی نظر گہری ہوتی ہے تاریخیں یاد کرنے کے لیے نہیں بلکہ تحریکوں کے مد و جزر اور قوموں کے عروج و زوال سے آگاہ ہونے کے لیے کسی ایک مضمون میں غیر معمولی امتیاز بھی آپ کو دانشوری کے حدود میں داخل نہیں کر سکتا۔ دانشوری کا طرۂ امتیاز آزاد اندازِ فکر اور مربوط نظامِ فکر ہے۔

اُردو زبان میں دانشور کی اصطلاح کو غیر معمولی وسعت اور تعمیم کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اگر یہ عمل روا نہ رکھا جاتا تو ہمارے دانشوروں کی تعداد آٹھ دس سے آگے نہ بڑھتی۔ اس وقت ہم وائس چانسلروں، پروفیسروں، ریڈروں، وکیلوں، ڈاکٹروں کو چھوٹتے ہی دانشوری سے متصف کر دیتے ہیں۔ ہم نے اس اصطلاح کو بے دردی

کے ساتھ ارزاں کر دیا ہے۔ دراصل دانشور کے لیے مفکر ہونا ضروری ہے ہر چند کہ بڑا مفکر ان بلندیوں کو چھو لیتا ہے جہاں تک دانشور کی رسائی نہیں ہوتی۔

دانشور اور مفکر میں ایک فرق یہ ہے کہ دانشوری میں عملی اطلاق اور دیے ہوئے حالات میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت کے پہلو اور سوجھ بوجھ کی عقدہ کشائی آجاتی ہے۔ مفکر اپنے پَر پرواز کے لیے کوئی بندھن قبول نہیں کرتا۔ دانشوری میں ارضیت شامل ہے۔ مفکر کو اس کے برعکس فلک شگافی کی دُھن ہوتی ہے۔ مفکر جس نظامِ فکر کی تخلیق کرتا ہے یا جس کا وہ دلدادہ ہوتا ہے اس میں مابعد الطبیعت اور تجریدیت کی ادائیں ہوتی ہیں۔ دانشور دانش کو ارض کے قریب اور سما سے دُور رکھتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ آپ کسی اصطلاح کا ترجمہ کریں یا کسی مفہوم کو لفظ تراشی کے ذریعہ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کریں، یا کسی ترقی یافتہ زبان کے الفاظ کے مترادفات کسی ترقی پذیر زبان میں یا کسی ترقی یافتہ زبان میں ہی ڈھالیں تو آپ مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتے کہ منفعت یاب زبان نو تراشیدہ لفظ کو ان ہی مفاہیم کا اسیر رکھے گا جنھیں آپ نے اس میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ زبان سے زیادہ خودسر اور غیور کوئی دوسرا وجود شاید عالمِ آب و گِل میں نہ ہو۔ اردو والوں نے شروع میں غالباً INTELLECTUAL کے مفہوم کیلیے دانشور کی اصطلاح ڈھالی۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بلکہ پلک جھپکاتے ہی نقل اصل سے آگے بڑھ گئی۔ INTELLECTUAL میں نہ وہ وزن ہے نہ وہ مرتبہ جو دانشور کو حاصل ہو گیا۔ INTELLECT کا ترجمہ کیجیے تو دانش کے مقابلہ میں وہ عقل اور فراست کے زیادہ قریب ہوگا۔ دانش کا مفہوم WISDOM سے ادا ہوتا ہے۔ ور غالباً ورزیدن سے نکلا ہے۔ دانشور وہ شخص ہے جس نے دانش کو دانستہ اس کے سارے مضمرات اور تمام پابندیوں پر غور کرنے کے بعد اختیار کیا ہے۔ جس طرح پیشہ ور کسی پیشہ کو اختیار کرنے والے کو کہتے ہیں اور سخنور مشقِ سخن کو اپنانے والے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح دانشور وہ شخص ہوا جس نے دانش کو اختیار کر لیا ہے اسے اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے، جس نے دانش کے تقاضوں اس کی شرطوں اور اس کے قیود کو برضا و رغبت قبول کر لیا ہے۔

اصطلاح وضع یا ترکیب یا ساخت کے لحاظ سے دانشور کا رتبہ انگریزی کے INTELLECTUAL سے بمراتب اونچا ہے۔ دانش سے آپ وہ مفہوم جدا ہی نہیں کر سکتے جو اسے INTELLECT سے اوپر لے جاتا ہے۔ لیکن اس وزنی اور گرانقدر اصطلاح کو ہم نے بے دردی اور ناقدری کے ساتھ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص سرِ بازار سو روپے کے نوٹ کو پانچ روپے کے نوٹ کے عوض استعمال کرنا شروع کر دے تو سو روپے کے نوٹ کی قدر و قیمت

میں کوئی کمی نہیں ہوگی البتہ آپ اس شخص کی سلامتی ہوش وحواس کے متعلق جو رائے قائم کریں گے وہ شاید سائنس پر مبنی نہ ہو۔ ہم نے ہر خاص وعام کو دانشور کہنا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ دانشور سوائے سوچی سمجھی نپی تلی بات کے کبھی کچھ نہیں کہتا۔ اس کی فکر محتاط ہوتی ہے اور زبان پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھاتی ہے۔ اس کے ساتھ توازن اور ضبط منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً کل اردو کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے میری زبان سے جوش بیان میں یہ بات نکل گئی کہ اردو والے اردو کے لیے رتی بھر بھی کام نہیں کر رہے ہیں۔ اس بات میں تندی تھی بے احتیاطی تھی اور مبالغہ تھا۔ ایسا سخن کسی دانشور کی زبان سے نہیں نکل سکتا۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ جہاں تک باضابطہ تعلیمی نظام سے الگ جتن کر کے بچوں کو گھر پر اُردو پڑھانے کا تعلق ہے اردو والوں نے غفلت برتی ہے۔ لیکن میرے الفاظ سے اس خواہش کی تکمیل نہیں ہوئی لہٰذا اگر میرے لیے محض اس بنا پر کہ میرا تعلق ایک بڑے تعلیمی ادارے سے رہا ہے دانشور کا لفظ استعمال کر دیا جائے تو وہ اس لفظ یا اصطلاح کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ ہم نے دراصل دانشور کے لفظ کو بہت ارزاں کر دیا ہے۔

دانشور کے لیے ایک شئے اور درکار ہے' جس کے بغیر کوئی فکر پیشہ انسان دانشور نہیں بن سکتا۔ یہ شئے ذہانت ہے۔ ہمارے یہاں اس شئے کی بہت کمی ہے اسی لیے فی زمانہ ہم ایسے دانشوروں کو ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔ ہمارے یہاں جذبات کے کاروبار کے علاوہ مروتوں رعایتوں' طرفداریوں' گروہ بندیوں کا چلن ہے۔ ہمارے زیرک' ذکی اور باخبر اشخاص میں سے کم ایسے ہیں جو یہ سکہ ہائے رائج الوقت اپنی جیب میں نہ رکھتے ہوں۔ ان پر ایک اضافہ مکتب فکر یا آئیڈیالوجی کا ہو گیا ہے۔ آئیڈیالوجی اکثر دیانت' اصابت' معروضیت اور انصاف کا خون کر دیتی ہے۔ دانشور ان چھوٹی باتوں' ان سازشوں اور گروہ بندیوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ وہ شخص جس کا مزاج سازشی اور جنبہ دارانہ ہوتا ہے آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہے' دانشور نہیں بن سکتا۔ دانشوری کے لیے کڑے سیَم اور انضباط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو ادب میں دانشوری روایت کو برقرار رکھنے میں زبان کے محققین سے مدد ملی ہے۔

## کُشادگی اور تعمیر نو:

اُردو نے گذشتہ دس سالوں میں دانشوری کے کوئی آثار اور شواہد پیش نہیں کیے ہیں۔ فضا بھی ناسازگار رہی۔ (۱) اُردو پڑھنے والوں کی تعداد گھٹتی رہی اور زبان کی بقا مشتبہ ہونے لگی۔ دل زندہ نے اُردو میں غور وفکر کرنے والوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دل بجھتے ہیں تو دانشوری کا دیا ٹمٹمانے لگتا ہے۔ (۲) فرقہ وارانہ فسادات اور تناؤ اور بدگمانی کی فضا نے اہل اُردو کو اس یکسوئی سے محروم کر دیا جو تخلیقی اور فکری مساعی کے لیے ضروری ہے (۳) فرقہ دارانہ تناؤ اور بے اطمینانی کے دور میں کوتاہ اندیش اور قیادت طلب اشخاص ملت کو بھڑکانے کا کام کرتے ہیں۔ جذبات سے جس

وقت کھیلا جاتا ہے تو عقل و دانش کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ (۴) زبان مرجھانے لگے تو اس زبان میں لکھنے والوں کی آزادیٔ فکر ختم ہو جاتی ہے۔ (۵) ملک کی عام فضا دیانت اور راست گوئی اور جرأت فکر کو راس نہیں آ رہی ہے۔ اہل قلم حکومت یا اس کے اداروں کے حلقہ بگوش نہیں تو رہین منت ضرور ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پرواز میں کوتاہی آنا لکھی سو آئی۔

ایسا لگتا ہے کہ دانشوری کے سوتے مذکورہ بالا وجوہ سے ہمارے یہاں خشک ہو گئے ہیں۔ نو بنو اٹھتے بھی ہیں جب بنیادیں وسیع ہوں۔ اُردو پڑھنے والوں کی تعداد بڑھائے بغیر دانشوری کی روایت کی بازیابی ممکن نہیں اور اس سے زیادہ اہم ضرورت ہے مزاجوں کو بدلنا' انھیں سطح بینی' ارزاں جذباتیت' رعایت' مروت' عصبیت اور جانبداری سے بچانا۔ عقل کا ہمسفر اگر ضمیر ہو تو دانشوری کا مرحلہ سر نہیں ہوتا۔ دانشور دشواریوں' مصیبتوں اور پیچیدگیوں سے نہیں گھبراتا' ان کا مقابلہ وہ فلسفیانہ بے نیازی کے ساتھ کرتا ہے۔ اُسے خوشی اور غم کی بے ثباتی کا ادراک ظواہر اور حوادث سے بغایت متاثر نہیں ہونے دیتا۔ لیکن بظاہر بے نیاز انسان اپنے ماحول اور اپنی انسانی برادری سے ہرگز بے تعلق نہیں ہوتا۔ دانشور لکیر کا فقیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا مقصود ہوتا ہے اصلاح اور پیش رفت اور تعلیم اور تہذیب' وہ امور کی تشریح اور تجزیہ کرتا ہے۔ اسے عوامی ڈگر پر چلانا ممکن ہی نہیں۔ چونکہ ہر نظام کہن سالگی کی بنا پر تجدید کا طالب ہوتا ہے' اس لیے وہ لوگ جو کسی نظام کے تحت خوب پنپتے ہوتے ہیں' دانشور کو تکلیف دہ اور اس کے نقطۂ نظر کو پُر خطر سمجھتے ہیں۔ چونکہ اس کا کام ایک نئے نظام' ایک نئے انداز فکر' ایک نئی دنیا کو وجود میں لانا ہے' اس لیے دانشور عام روش سے انحراف ضرور کرتا ہے۔ یہ انحراف خواہ فروعات سے ہو خواہ اصول سے' خواہ یہ ترمیم اور تصحیح کی شکل اختیار کرے' خواہ بغاوت کا علم بلند کر دے۔ یہ انحراف نظریات سے بھی ہو سکتا ہے اور طریق کار اور فیصلوں سے بھی۔ دانشور اپنی فکر کو آزاد رکھتا ہے اور دوسروں کو آزادیٔ فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی بات پُر مغز اور فکر انگیز ہوتی ہے۔ اس سے سرسری گزر جانا ممکن نہیں۔ وہ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ناانصافی کے خلاف چاہے اس سے اپنے متاثر ہوں چاہے پرائے احتجاج کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی دانشور میں یہ سب اوصاف جمع ہوں جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ میرا مقصد تو ان خصوصیات کو گنانا تھا جو ہم کسی دانشور سے منسوب کرتے ہیں۔ ان اوصاف میں دیانت' معروضیت' دوراندیشی' عملی بصیرت' عواقب و نتائج کا ادراک' بے غرضی' آزادی اظہار' حق گوئی' ہمدردی' جرأت' اور خواہشِ اصلاح شامل ہیں۔

●●

# بیانِ ملکیت "سہ ماہی خدابخش لائبریری جرنل" اور دیگر تفصیلات
## مطابق فارم نمبر ۴، قاعدہ نمبر ۸

۱۔ مقامِ اشاعت : خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۴

۲۔ وقفۂ اشاعت : سہ ماہی

۳،۴۔ پرنٹر و پبلشر کا نام : مصطفیٰ کمال ہاشمی

قومیت : ہندستانی

پتا : اسسٹنٹ لائبریرین، خدابخش لائبریری پٹنہ

۵۔ ایڈیٹر کا نام : عابد رضا بیدار

قومیت : ہندستانی

پتا : ڈائرکٹر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۴

۶۔ ملکیت : خدابخش لائبریری، پٹنہ ۴

میں مصطفیٰ کمال ہاشمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے ساتھ درست ہیں

دستخط پبلشر : مصطفیٰ کمال ہاشمی

یکم فروری ۱۹۹۱ء

ڈاکٹر محمد حسن
پروفیسر جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی

# اردو میں دانشوری کی روایت

(تیسری اردو ریسرچ کانگریس، پٹنہ ۲۲-۲۴ جنوری ۱۹۸۹ء میں پیش کیا گیا)

عقیدۂ محض کے دائرے سے الگ ہوکر اور متعین شدہ نتائج سے قطع نظر کرکے حواس کے ذریعے حاصل ہونے والے مشاہدات اور تجربات کو منطقی استدلال اور سائنسی ربط و ترتیب کے ساتھ کسی نتیجے تک پہنچنا اور اس کے ذریعے زندگی کو بہتر بنانے کی جد و جہد میں شرکت سے دانشوری پیدا ہوتی ہے۔

اس موضوع پر ایک طویل بحث ہو سکتی ہے کہ آزادی کے بعد اردو میں بالخصوص دانش دشمن رجحانات کی بڑی پرکھ عام کی گئی ہے عقل پر عشق و وجدان بلکہ عقیدے کو ترجیح دی گئی ہے پاکستان کی یہ ضرورت تھی ہندوستانی مسلمان کی مجبوری اور پاکستان کے اردو ادب میں دانش دشمنی کی اس روایت کا اثر ہندوستان کے اردو ادب پر بھی پڑا۔

تین قسم کی "دانش وری" اس دور میں پنپتی ہے ایک وہ جسے دانش دشمنی کی روایت کہا جا سکتا ہے۔ دوسری دانشوری تھی ہندوستانی مسلمان کے فکری احیا کی کوشش جو دانش نہیں عقیدے کے زیر سایہ ہوئی۔ اس طرز کی ایک اور دانش وری کی روایت تھی اصغر علی انجینیر کی تحریروں کی جسے نیا علم کلام کہا جا سکتا ہے اس میں مذہب اور عقیدے کی اس طرح توجیہ کی گئی تھی کہ دقیانوسیت کے بجائے روشن خیالی اور سوشلزم کے لیے گنجائش نکالی جا سکے۔ تیسری روایت تھی انقلاب کی روایت جس کا رشتہ عقیدے سے زیادہ دانش سے ملتا تھا جس کا عکس عصری ادب کے صفحات پر نظر آئے گا۔

ہندوستان میں اردو کا چلن کم ہو گیا رسالوں کی پہنچ اور کتابوں کی رسائی محدود ہو گئی پبلشر کم بلکہ معدوم مکتب فروش کم بلکہ مفقود۔ ایسے میں اگر کوئی لکھنا بھی چاہے تو کیونکر لکھے اور چھاپے گا کون؟ اس صورت حال سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے:

وہ یہ ہے کہ ایک اچھا پبلشنگ ہاؤس ہو اور اس کے گرد لکھنے والوں کا ایک گروہ ہو جو اسی مقصد سے کام کرے جدید ترین نظریات، علوم اور تحریکات سے اردو والوں کو واقف کرائے گا اس اشاعت گھر کے کم سے کم چار بک شاپ ہوں اور ایک بلیٹن نما رسالہ۔ گجراتی میں ایک صاحب نے یہ اہتمام کیا تھا کہ ہر جدید ترین موضوع پر مستند کتابوں کی تلخیص دنیا بھر کی زبانوں سے گجراتی زبان کے ۱۰۰ صفحات میں کر کے الگ الگ کتابچوں کی شکل میں چھاپنا شروع کی تھی اور ہر کتابچے کی قیمت پانچ روپے ہوتی تھی اور اس سلسلے میں نیوکلر فزکس سے لے کر کرکٹ تک پر کتابچے شامل تھے اس قسم کا کام اردو میں بآسانی کیا جا سکتا ہے اب بھی اردو لکھنے والوں میں سائنس میں ڈاکٹر عبید صدیقی اور ڈاکٹر رئیس احمد سماجی علوم میں پروفیسر علی محمد خسرو امتیاز احمد، رشید الدین خاں جیسے اہل قلم موجود ہیں اور خود ہمارے ادیبوں میں بھی علمی موضوعات پر لکھنے والوں کی کمی نہیں ضرورت ہے انتظام کی۔ اور یہ انتظام کیا جا سکتا ہے اور اسکا آغاز اردو کانگریس ہی سے ہونا چاہیے یقین مانیے یہ خسارے کا سودا نہیں ہے۔



رہی اردو اکادمیوں کی بات۔ یقیناً حکومت پانچ کروڑ روپیہ اکادمیوں پر خرچ کر رہی ہے یہ بھی درست ہے کہ ان اکادمیوں سے کچھ فائدے بھی ہوئے ہیں کتابیں زیادہ چھپنے لگی ہیں اردو ادیبوں کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی ہے پرانی کتابوں کے نئے اڈیشن بھی چھپے ہیں مگر اردو دنیا کی ان سے صرف ایک ہی آس لگی ہوئی ہے اور وہ پوری نہیں ہوئی ہے، وہ ہے اردو کی تعلیم کا انتظام اور جب تک یہ نہیں ہوتا اُردو کا مستقبل محفوظ نہیں اور اکادمیاں شک وشبہ کی نظر سے دیکھی جاتی رہیں گی۔

حکومت نے ان اکادمیوں کے آئین میں بہت سے حقوق دے رکھے ہیں نہیں دیا ہے تو یہی حق نہیں دیا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اکادمیوں کے آئین میں مناسب تبدیلی کی جائے اور ان اکادمیوں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنے طور پر ماڈل اسکول کھول سکیں اور اپنے ذیلی دفاتر صوبے کے مختلف شہروں میں قائم کر سکیں اور وہاں بھی اس قسم کے اردو ماڈل اسکول قائم کر سکیں بعض اکادمیوں کے پاس اتنی گرانٹ ہے کہ وہ آج بھی یہ کام کر سکتی ہیں اور یہ ہو تو اس مقصد کے لیے خصوصی گرانٹ دی جائے اس کے ساتھ جن اسکولوں یا کالجوں میں اکادمی مناسب سمجھے اپنی طرف سے اردو ٹیچر مقرر کر سکے یہ اس وقت تک جب تک انھیں باقاعدہ اردو ٹیچر نہ مل جائیں۔ اکادمی کے ماڈل اسکول اردو میڈیم کے بھی ہوں گے اور اختیاری اُردو کے بھی اور ان میں دیگر مضامین بھی پڑھائے جائیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ نصاب اور اُردو اساتذہ کی تربیت کا کام بھی اکادمیوں کے سپرد ہو۔ جب تک اردو تعلیم میں اکادمیوں کی کارگزاری قابل اطمینان نہیں ہوتی اس وقت تک اکادمیوں پر اردو دنیا کا اعتماد بحال نہیں ہو سکتا۔

●●

# تازہ دانشوری

- ایک پل ایسا بھی آجاتا ہے ــــــ احمد ندیم قاسمی
- تم چپ رہے ہم چپ رہے ــــــ مخمور سعیدی
- عصر حاضر میں ادب کا کردار ــــــ مظفر علی سید



دانشوری پر بحث چلی

تو،

پھر یہ بھی سوال اٹھا کر

دانشوری کچھ ہے

تو

کیا ہے

نمونوں میں ہر سال کی "دانشوری" کے نمونے

ریسرچ کانگریس کے ہر جلسے میں پیش کیے جاتے تھے۔

آخری سال کے نمونے پیش خدمت ہیں:

احمد ندیم قاسمی

# ایک پل ایسا بھی آجاتا ہے

زخم پر زخم دیے جاتے ہو
نہ جھجکتے ہو نہ شرماتے ہو
زخم دینا بھی، نہ پچھتانا بھی
وار پر وار کیے جانا بھی
آمریت کی سند ہوتی ہے
تم کو معلوم نہیں ہے شاید
زخم کھانے کی بھی حد ہوتی ہے

ایک پل ایسا بھی آجاتا ہے
زخم دیتا ہوا جلاد کا ہاتھ
اُٹھ کے نیچے نہیں آپاتا ہے
ایک مفلوج کے بازو کی طرح
حشر تک کے لیے تھم جاتا ہے
آنے والی کئی نسلوں کے لیے
ایک عبرت کی علامت بن کر
صفحۂ وقت پہ جم جاتا ہے

مخمورسعیدی

# تم چپ رہے ہم چپ رہے

جب حکم اک صادر ہوا، تم چپ رہے ہم چپ رہے
وہ وقت کچھ کہنے کا تھا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

اب اپنی اپنی قسمتوں پر بیٹھ کر سوچا کریں
وہ فیصلہ لکھتا رہا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

تقریر اس کی آگ تھی، شعلے فضا میں بھر گئے
اور شہر سارا جل گیا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

لٹنے لگی تھیں بستیاں، سوئے ہوئے تھے پاسباں
چاروں طرف اک شور تھا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

قاتل بھی وہ مکار بھی، ٹوکا اسے اک بار بھی
وہ جھوٹ بولا برملا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

سر پھوڑتی پاگل ہوا کہتی تھی کوئی ماجرا
روتی رہی گھایل فضا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

منظر بھرے بازار کا، گرنا در و دیوار کا
گھر گھر قیامت تھی بپا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

لفظوں کے سوداگر اٹھے، جھولی بھری، چلتے بنے
سودا ہمارا ہو گیا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

مقتول، حرفِ التجا، سنتا تو کیا سنتا خدا
کاٹے گئے دستِ دعا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

اے وائے بے جرم و خطا قتلِ عمد مخمورؔ کا
بستی کے لوگوں نے کیا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

مظفر علی سیّد

# عصرِ حاضر میں ادب کا کردار

سلام و تحیات کے ساتھ ، میرے لیے واجب ہے کہ حلقۂ اربابِ ذوق کی سبکدوش ہونے والی انتظامیہ کا شکریہ ادا کروں جس نے ، اپنی ذمے داری کی تکمیل کے طور پر منعقدہ سالانہ اجلاس کی صدارت کا فریضہ میرے سر ڈال کر مجھے یہ موقع عنایت کیا کہ آپ سب سے مخاطب ہو سکوں ۔

یقیناً یہ اعزاز کسی بھی قلم کار کے لیے باعثِ افتخار ہوتا لیکن میرے لیے قدرے حیرانی کا مقام بھی ہے ۔ اس لیے کہ اپنی حیاتِ قلم کا غالب حصہ ، در بدری کی حالت میں ، حلقے سے باہر ہی گزرا ہے ۔

تاہم بلاشبہ حلقے سے میرا رابطہ ، آزادی کے فوراً بعد ، ابتدائے شباب کے معاشقے کی طرح زور و شور سے شروع ہوا تھا ۔ لیکن تین ساڑھے تین برس کے بعد ، اس معاملے یا مجادلے میں بقول قائم چاند پوری ، یہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی :

نے مجھ پہ وہ بہار رہی ، اور نہ یاں وہ دل
کہنے کو ، نیک و بد کے ، اک الزام رہ گیا

پھر بھی تقریباً چار دہائیوں کے بعد سوچتا ہوں تو یہ الزام بھی اتنا برا نہیں لگتا ۔ بلکہ اس ابتدائی رابطے کے دوران اس گمراہ نے ، مرحوم قیوم نظر کے الفاظ میں ، حلقے سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہی ہو گا ۔ عین ممکن ہے کہ معاملاتِ ادب میں بحث و گفتگو کے آداب اور اپنے ردِ عمل کو دل میں دبائے رکھنے کی بجائے ، دلیل و برہان کے ساتھ سب کے سامنے پیش کرنے کی تربیت یہیں سے حاصل ہوئی ہو ، اور کسی حد تک وہ اندازِ نظر بھی جو ذرا دیر سے پیدا ہوا کہ جن سے لگاؤ نہیں ، ان سے لاگ بھی کیوں ہو ؟ اور جن سے لگاؤ

---

۱ ۔ خطبۂ صدارت ، حلقۂ اربابِ ذوق سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۰ جولائی ۱۹۹۰ع ۔

ہے ، اُن سے لاگ بھی کیوں نہ ہو ؟ جدلیاتی مطابقت کا یہ نکتہ ہاتھ لگا تو بقول حفیظ ہوشیار پوری :

پھر یہ ہنگامہ عمر بھر ہی رہا

چنانچہ اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کی متغیر صورتِ حال میں تہذیبی اداروں کو مستحکم کرنے کی اشد ضرورت ہے ، خصوصاً اُن اداروں کو جو اپنی ایک تاریخ رکھتے ہیں اور جن کا وجود ایک جمہوری بنیاد پر طے شدہ آئین کی صورت میں برقرار ہے ۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی آزاد ادبی حیثیت اس امر کی متقاضی ہے کہ ہر مکتبِ فکر کے اہلِ قلم ، پہلے کی طرح اس کے ساتھ اپنے تعاون کو مضبوط بنائیں ، روحِ تغیر کو اپنے اندر جذب کریں اور مل جل کر بلند آواز میں تہذیبی مسائل پر سوچ بچار کریں ۔

ان میں سے ایک مسئلہ آج کا موضوعِ گفتگو ہے ، یعنی عصرِ حاضر میں ادب کا کردار کیا ہو ؟ عام طور پر اس کا تعین ایسے لوگ کرتے ہیں جنھیں ادب کے ماضی ، حال یا مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ۔ اُن کے جماعتی سیاسی مفادات ، البتہ ، ادب کو ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنے کی طرف راغب ہوتے ہیں ۔ قوت حاصل ہو جائے تو اس سلسلے میں ترغیب و تحریص سے لے کر تہدید و تعزیر تک کسی بھی وسیلۂ دست اندازی کو برتنے میں دریغ نہیں کیا جاتا ۔ ظاہراً ہم ایک جمہوری دور سے گزر رہے ہیں ، لیکن جمہوریت کی روایت ہمارے معاشرے میں ابھی اتنی محکم نہیں ہونے پائی کہ تحریر کی آزادی ، حرص و ہوا اور خوف و خطر کے بغیر نبھائی جا سکے ۔ اصل میں جمہوری دور میں ادب کو ایک دُہری مصیبت درپیش ہوتی ہے ، ایک تو اس دور میں جلسوں جلوسوں کا اتنا شور ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور دے بھی جائے تو لگتا ہے سیاست ، سوقیانہ پن کی شکار ہو چکی ۔ اس بازاری سطح کے ہنگامے میں ادب کی شمولیت شرم کا مقام ہو گی ۔ دوسری طرف اس مخلوقِ خدا کو جو سوقیانہ پن کی طرف زور و زر کے ساتھ کھنچتی چلی جا رہی ہے ، کس طرح ادب اور تہذیب کی طرف مائل کیا جائے ؟

حال ہی میں اس دوسرے مسئلے پر محترم جمیل جالبی صاحب نے ایک ذاتی مکتوب میں اپنی تشویش کا یوں اظہار کیا ہے :

"لگتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں ادب کی مؤثریت درجۂ صفر تک

پہنچ چکی ہے - ہمارے زمانے میں اگر کوئی ادب پڑھتا بھی ہے تو وقت گزاری یا دل بہلاوے کے طور پر - ایسے میں ادیب کی درد ناک آواز جو اس کے تہہِ دل سے نکلتی ہے کیسے اپنا کام کر سکتی ہے ؟ پرانے زمانے میں کہتے تھے "از دل خیزد ، بر دل ریزد" - دل سے اٹھنے والی آوازوں میں تو کوئی کمی نہیں مگر اب یہ آوازیں کسی دوسرے دل پر نازل ہونے سے پہلے فضا میں تحلیل ہو جاتی ہیں - کتابیں اور رسالے لائبریوں کی زینت بن جاتے ہیں ، اور ان کے مندرجات کو پڑھنے والا معدوم ہوتا جاتا ہے - شاید کچھ لکھنے والے تھوڑا بہت پڑھتے بھی ہوں مگر ان کی تعداد میں جس رفتار سے اضافہ ہوتا جاتا ہے اور تحریر کے معیار میں جو کمی آتی جاتی ہے ، اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو ملکی آبادی کا غالب حصہ خواندگی کی نعمت سے محروم ہے اور جو خواندہ ہو بھی چکے ہیں ، وہ بھی یا تو انگریزی پڑھتے ہیں یا بہت کمال کریں تو کوئی مقبول عام قسم کا اردو روزنامہ - سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کے - جو ایک دو فیصدی خواندہ لوگ بچ جاتے ہیں وہ جلدی سے ادیب بن جانا چاہتے ہیں - یعنی صاحبِ تصنیف - سوچیے تو اب میر و سودا کو ، غالب و اقبال کو ، راشد اور فیض کو ، منٹو اور بیدی کو ، عسکری اور غلام عباس کو کون پڑھے گا اور پڑھے گا تو ان سے کیا حاصل کرے گا ؟ کیا اس صورتِ حال میں ہمارا ادب نشو و نما پا سکتا ہے اور کیا ہم اپنے تہذیبی معیار سے غافل ہو کر کوئی نیا کمال پیدا کر سکتے ہیں ؟ اور کر بھی لیں تو کون ہے جو اس سے بہرہ ور ہو ؟"

اس اقتباس میں جو قدرے طویل ہو گیا ، بہت سے سوالات اٹھائے گئے ہیں جن میں سے چند ایک کا تعلق ہمارے موضوع گفتگو کے ساتھ بھی ہے مثلاً موجودہ دور میں ادب کا اشیائے صرف کی طرح استعمال اور ادب کی آواز کا کارگر نہ ہونا - دونوں کا تعلق پڑھنے کی مقدار سے نہیں ، پڑھنے کے معیار سے ہے - خالی خولی پڑھنے یا پڑھے جانے کے بارے میں ہمیں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں - الم غلم کتابیں پڑھتے رہنا بھی ایک قسم کی لت ہے جو ایک بار کسی اچھے بھلے ادیب کو لگ جائے تو پھر وہ ادب کے کام کا نہیں رہتا - اس لیے کہ ادب ، معیار اور امتیاز اور تہذیبی شعور کا متقاضی ہے - ان پڑھ

معاشرے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ معاشرتی ردِ عمل کے طور پر اس میں چند ایک خود گزیں لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو ہر قسم کی کتاب کو ، چاہے کسی معیار کی ہو ، خود فراموشی کے ایک وسیلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں ، اور منشیات کے عادی لوگوں کی طرح ہر قسم کے کام کے لیے ، بشمولِ تحریر ، مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں ۔

عسکری صاحب نے کبھی لکھا تھا کہ پڑھنا ایک سماجی فعل ہے ۔ ان بیچاروں کو کیا خبر تھی کہ ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا جب ناخواندہ معاشرے کا دباؤ اسے بھی ایک انفرادی لت بنا کر رکھ دے گا جس کا سماج سے کوئی سمبندھ ہو گا تو محض اتنا کہ اب یہ فعل ایک ایسی سطح پر جا پہنچا ہے جسے کم از کم شعوری نہیں کہا جا سکتا ۔

پہلے اسی معاشرے میں ، جس میں خواندگی کی شرح اگرچہ کم تھی لیکن نیم خواندہ ہونا اور اپنے ادب سے غافل ہونا ، ایک تہذیبی کوتاہی کی دلیل سمجھا جاتا تھا ۔ جو لوگ لکھنے کی طرف مائل ہوتے تھے یا دوسرے لفظوں میں تخلیق ادب کو اپنا سروکار سمجھتے تھے وہ اپنے معاشرے سے مخاطب بھی ہوتے تھے اور اپنے معیارِ نظر کے مطابق اس پر کڑی سے کڑی تنقید بھی روا رکھتے تھے ۔ حیرت کی بات ہے کہ جمیل جالبی صاحب نے اپنے خط میں جو کچھ حال ہی میں لکھا ہے تقریباً یہی بات ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد امیر مینائی نے کیسے رچاؤ کے ساتھ کہی تھی :

محفل برخاست ہے ، پتنگے رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر تارے کہیں نام کو رہے ہیں
ہے ان کی نمود بھی کوئی دم وہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں

کہا جا سکتا ہے کہ یہ سماں ، کلاسیکی دانشوری کے غروب کا تھا جب کہ نئی دانشوری کا ظہور علی گڑھ میں ہو رہا تھا ۔ جس سے نہ امیر مینائی کو آشنائی تھی نہ داغ دہلوی کو رغبت ۔ بلکہ لاہور تک میں نئی دانشوری کے مغربی اساتذہ کی صحبت میں بیٹھنے والے محمد حسین آزاد بھی سخت گومگو کے عالم میں تھے کہ دماغ ''نیرنگِ خیال'' کی طرف دوڑتا تھا اور دل ''آب حیات'' کے ظلمات میں اسیر تھا ۔ ادھر اکبر الہ آبادی نے جدید دانشوری کے پردے میں ، ذہنی استعمار کی بازی گری کو کارفرما دیکھ لیا تھا :

جو میری ہستی تھی ، مٹ چکی ہے ، نہ عقل میری نہ جان میری
ارادہ اُن کا دماغ میرا ، خیال اُن کا ، زبان میری

ممکن ہے کسی مہربان کو حیرت ہو کہ موضوع سخن تو عہد حاضر میں ادب کا کردار ہے اور بات ہونے لگی ہے اکبر الہ آبادی پر جو آج سے ٹھیک ایک صدی پہلے اپنی ادبی فعالیت کا تحریری مظاہرہ کر رہے تھے ۔ لیکن انیسویں صدی کے آخر میں ، اکبر نے جو کچھ کہا ، وہ بڑی حد تک بیسویں صدی کے اواخر کی صورتِ حال کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے :

مذہب کی کہوں تو دل لگی میں اُڑ جائے
مطلب کی کہوں تو پالیسی میں آڑ جائے
باقی سرِ قوم میں ابھی ہے کچھ ہوش
غائب ہے کہ یہ بھی اس صدی میں اُڑ جائے

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اکبر کا کلام آج بھی کتنا بر محل ہے ۔ اصل میں ادب کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو یوں تو ایک خاص عہد کی کوکھ سے نکلے اور اس عہد کے افکار و اعمال پر نقد و تبصرے کا حق بھی ادا کرے لیکن اس کی خصوصیت میں کچھ ایسی عمومیت مضمر ہو جو آنے والے زمانوں میں بھی ایک فعال قوت کی طرح اپنا جاودانی تہذیبی کردار ادا کر سکے ۔ اکبر کی شاعری اور ظرافت پر مفصل گفتگو کا یہ موقع نہیں ، تاہم دو ایک نکتے اور بھی ملاحظہ ہوں :

کام کی بات جو کہنی ہے وہ کہہ لو ، اکبر
دم میں چھن جائے گی یہ طاقتِ گویائی بھی

درست ہے کہ طاقتِ گویائی کا ایک دم میں چھن جانا ، جیسا کہ پروفیسر وگ بڑھاتے ہیں ، دنیاوی زندگی کی بے ثباتی کا نقشہ پیش کرتا ہے لیکن جس گہرائی میں جا کر اکبر نے کہنے والے کے عدمِ تحفظ کا احساس دلایا ہے ، وہ محض صوفیانہ تصورِ فنا کی دین نہیں ہو سکتا ۔ اس لیے کہ اس تصور سے "کام کی بات" کا کوئی رابطہ پیدا نہیں ہوتا ۔ اتنا تو شاید مدارس میں بھی بتایا جاتا ہو کہ اکبر کے کلام پر قدغن یا سرکاری پابندی لگائے جانے کا اشارہ ہوا تھا جس کی طرف ایک شعر میں حوالہ بھی موجود ہے :

حکم اکبر کو ہوا ہے کہ کرو ترک سخن
خواجہ حافظ بھی نکالے گئے میخانے سے

شہنشاہی دور میں ، ایران کے ممتاز معاصر شاعر ، احمد شاملو نے مجھ سے کہا تھا کہ ''دولت از شعر وحشت می کند'' یعنی حکومت شاعری سے خوف زدہ ہے ۔ یہ بات ہم بھی اپنے تجربے کی روشنی میں جانتے ہیں کہ فیض و راشد ، منٹو اور عسکری کسی وقت بھی حکومت کے قابو میں نہیں آئے ، بعض اوقات سرکاری ملازمت میں مبتلا ہونے کے باوجود ۔ ان میں سے کسی کو نہ ریڈیو پاکستان اپنا حلقہ بگوش بنا سکا اور نہ بعد میں کوئی رائٹرز گلڈ اپنی گرفت میں لا سکا ۔ یہاں تک کہ ابھی تک اکادمی ادبیات بھی فیض کے سوا ، کسی اور کو بعد از مرگ قدر شناسی نہ دے سکی ۔ لگتا ہے کہ ادب کی دنیا میں ، سرکاری نقطۂ نظر سے ، مرحومین کو بھی غیر محفوظ نہیں سمجھا جاتا ۔

بودلیئر نے ''بدی کے پھول'' کے دیباچے میں کہا تھا کہ ''شاعر کسی پارٹی کا نہیں ہوتا ۔ اس لیے کہ یوں تو وہ ایک عام فانی انسان ہو کر رہ جائے گا ۔'' زندگی کے کسی مرحلے میں ایک آدھ ادیب کو کسی نہ کسی پارٹی سے تھوڑی بہت مشروط ہمدردی ہو سکتی ہے ، لیکن غیر مشروط غلامی ، کسی سیاسی ، نیم سیاسی جماعت کی ہو یا ترقیاتی وسائل کی ، کسی ادیب کے شایانِ شان نہیں ۔ وہ تو پہلے سے ایک ایسے معاشرتی نظام کی اسیری کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہوتا ہے جو اس کے چوگرد محیط ہے ، اور جس میں رہتے ہوئے اس کا دائمی منصب یہ ہے کہ اس معاشرتی قید خانے سے اپنے تخیل کی مدد سے باہر نکلے ، اور باہر کی دنیا کا منظر سب کو دکھاتا رہے ۔ اکبر کے ''نامہ بنام اخبار اودھ پنچ'' کا ایک شعر ہے :

کی سیرِ دو عالم اک نفس میں
پھر دیکھیے تو اسی قفس میں

اقبال نے اپنے آپ کو قافلۂ بہار کا ''طائرِ پیش رس'' کہا ہے جس نے خلوتِ قفس میں رہتے ہوئے اپنا پیغام نشر کر دیا ہو ، کسی قسم کے نشریاتی ترقیاتی وسیلے کے بغیر ۔ تاہم جب مولانا محمد علی جوہر نے انھیں اپنی خلوت سے نکل کر سیاست کے میدانِ عمل میں اترنے کی دعوت دی تو اقبال نے جواب دیا کہ ''بھائی ! میں تو قوال ہوں ، گاتا ہوں کہ آپ کو وجد میں لاؤں ۔ اگر میں بھی وجد میں آ گیا تو پھر قوالی کیسے ہو گی ؟''

ٹھیک ہے کہ اقبال نے تھوڑا بہت رابطہ اہلِ سیاست سے بھی رکھا اور مسلم قومیت کے سلسلے میں بقولِ خود ''فکر و دانش کا فریضہ'' بھی انجام دیا ۔

لیکن یہ ان کے دانشورانہ اور تہذیبی کردار ہی کی ایک توسیع تھی جو شکر خدا ہے ، عملی سیاست میں ہمہ وقت محویت تک نہ پہنچی ۔ جس چیز نے انھیں اس مشغولیت کا شکار ہونے سے باز رکھا وہ ان کا مفکرانہ اور شاعرانہ منصب تھا ، جو پاکستان نہ بھی بنتا تو اس کی حیثیت اپنی جگہ برقرار رہتی ۔ پاکستان بننے کے بعد ہم نے اقبال کو جو کچھ بنا دیا ، اس کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے متحرک وژن کو جامد بنا کے رکھ دیا جائے یعنی ان کے ادبی اور فکری کردار کو معاشرے میں جاری و ساری رہنے سے روک دیا جائے ۔ یوں بھی یہ زمانہ ایسا تھا کہ اہلِ قلم تک کہنے لگے تھے :

مجھ سے میرا قلم چھین لو
میرے ہاتھوں میں تلوار دے دو

اس وقت لکھنے والوں کے سامنے کوئی نہ کوئی محدود یا فوری ہدف تھا ، مثلاً تلنگانہ میں انقلاب کی امید اور اس کے نمونے پر باقی سب جگہ ایک موہوم تمنا ۔ اس پر بھی شاید کسی کو اعتراض نہ ہو ۔ لیکن خود ہی اپنا قلم چھنوانے میں کیا حکمت ہو سکتی ہے ؟ اگر یہ بارِ گراں آپ کے بس کا روگ نہیں تو آرام سے اسے چھوڑ دیجیے ، اور پھر جو بھی جی میں آئے سو کیجیے ۔ یوں لگتا ہے جیسے قلم کاری بھی آپ کے لیے ایک ایسی عادت بن چکی ہے جسے اپنی مرضی سے ترک نہیں کیا جا سکتا ۔ کسی نہ کسی خارجی تشدد کی ضرورت پڑتی ہے ۔

معلوم ہوا کہ ادیب کے لیے ادب محض ایک میکانکی فعل ہو کر رہ جائے تو نہ زندگی کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں نہ تخلیقِ ادب کے ۔ سیاسی و نیم سیاسی جماعتوں کے رہبر یہ بات نہیں جانتے کہ جو ادیب ان کے حلقہ بگوش بن کر رہ جاتے ہیں ، وہ ادب کی دنیا میں ہی اپنا اعتبار زائل نہیں کرتے ، ادبی اظہار پر بھی اپنی گرفت کھو بیٹھتے ہیں ۔ تخلیقی ادب اور تبلیغاتی ادب میں پہلا فرق یہ ہے کہ تخلیقی ادب اپنے تخلیق کار کی رگ رگ میں سمویا ہوتا ہے ، اور تہذیب میں رچا ہوا ، جب کہ تبلیغاتی قسم کی ادب نما تحریریں کسی نہ کسی اوپری دباؤ کے تحت لکھی جاتی ہیں جو لکھنے والے کے کام و ذہن کی آزمائش سے آگے نہیں بڑھنے پاتیں ۔ ایسی تحریریں فرمائشی نہ بھی ہوں جیسا کہ بعض مبلغین کرام دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے خلوص سے لکھا

ہے ، تب بھی یہ کسی نہ کسی فارمولائی ترکیب کے تحت وجود میں آتی ہیں ، اور ان میں زیادہ سے زیادہ ، ادیب کی فراست کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے یا ایک چالاک قسم کی ہنر مندی ان میں تھوڑی بہت ظاہری کشش پیدا کر دیتی ہے جیسے ٹی - وی کے ڈراموں میں ۔

تبلیغاتی تحریروں سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کہ مبلغ محترم اپنی منزل پر پہنچ چکے ہوں اور اب دوسروں کو وہاں تک لے جانا چاہتے ہوں ۔ تبلیغ یا پرچار ، آزادی کا ہو یا استعمار کا ، اس وقت تک کارگر نہیں ہو سکتا جب تک اس میں انسانی تجربے کی ٹامک ٹوئیاں اور شک و شبہ کی ہچکچاہٹیں شامل نہیں ہوتیں ۔ اس لیے ادیب نہ کسی حتمی بات کو قبول کرتا ہے اور نہ یقین کی اس منزل تک پہنچنا چاہتا ہے جس کے بعد راوی چین لکھ دے ۔ جرمنی کے جمالیاتی فلسفی لیسنگ نے لکھا ہے :

''میں تو بس کاغذ پر قلم رکھ کے سوچتا ہوں ، اگر آخر کار میرے خیالات مجھے مطمئن کر دیں تو میں کاغذ کے پرزے کو چاک کر دیتا ہوں ۔ ورنہ اسے چھپنے کو بھیج دیتا ہوں ۔''

سیاست کی دنیا محدود اور ہنگامی مفادات کی دنیا ہے ۔ اس لیے یہاں جو بھی فیصلے ہوتے ہیں ، حتمی اور اٹل ہوتے ہیں کہ جلدی میں یہی کچھ ہو سکتا ہے ۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد پراپیگنڈا ہی پراپیگنڈا ، تبلیغ ہی تبلیغ کی مدد سے فکر و دانش کی کمی پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ جس کے لیے ادیبوں کی ضرورت پڑتی ہے ، اور ادیب بھی کسی نہ کسی بہانے ، قومی اور ملی خدمت سے لے کر عصری شعور کی نمائندگی تک ، اس کارِ خیر میں شامل ہو جاتے ہیں ۔ آپ ۱۴ اگست کے موضوع پر لکھی ہوئی ان گنت نظموں میں سے جو سرکاری رسالوں میں شائع ہوئیں کوئی ایک اٹھا لیجیے تو معلوم ہوگا ہر طرف بہار کا سماں ہے ، اور اب کوئی مسئلہ باقی نہیں رہا ۔ اس کے مقابلے میں فیض کا ''داغ داغ اجالا'' رکھ کر دیکھیے تو فارمولائی ترکیب اور تخلیقی تشکیل کا فرق محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ اسی طرح ۱۹۶۵ء کے جنگی ترانوں کو دیکھیے جن کی آواز جب بھی سنائی دینے لگے تو لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ یا تو کوئی نئی جنگ ہمارے سروں پر مسلط ہونے والی ہے یا کوئی نیا مارشل لاء لگ چکا ہے ۔

درست ہے کہ ایسے ترانے لکھنے والوں نے اور ان سے بھی زیادہ ان کے گانے والوں اور گانے والیوں نے ، کسی نہ کسی سطح پر اپنا ہنگامی فریضہ انجام دیا ہے لیکن اسے ادب کا کردار انجام دینا نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے کہ جنگ یا مارشل لاء کے سلسلے میں ادب کا کردار یہاں تک محدود نہیں کہ اپنی قوم کا حوصلہ بڑھایا جائے یا جو کچھ بھی ہماری مرضی کے بغیر ہو رہا ہے اس پر اطمینان کا اظہار کیا جائے۔ یہ کام تو آپ نے ایک بار انجام دے دیا ، اب بھی راگ کب تک الاپتے رہیں گے ؟ کیوں نہ ایسا شعور پیدا کرنے کی کوشش ہو جو اس قسم کے ہنگامی حالات کو پیدا ہونے سے پہلے روک سکے ؟ ایسا تبھی ہو سکتا ہے کہ ادیب ، یکایک پینک سے بیدار ہو کر کسی وقتی نعرے میں شامل ہونے کی جگہ ، مستقل بیدار رہے اور اجتماعی بیداری کی نشوونما میں حصہ لیتا رہے۔ عصری شعور میں جب تک بین الاقوامی شعور شامل نہیں ہوتا ، قومی حادثات بھی عالمی پس منظر کے بغیر سمجھ میں نہیں آتے اور دونوں میں جب تک تہذیبی اور تاریخی شعور پیوست نہیں ہوتا اس وقت تک صورتِ حال ایک ہی سطح پر نظر آتی ہے۔ محدود سیاسی مفادات کی سطح پر ، جس کی مدد سے ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا ، تبلیغ و تلقین البتہ جاری رکھی جا سکتی ہے۔

آج کل تبلیغ یا پرچار کا یہی انداز ، اے آئی آر کی اردو سروس سے ہندوستان کے بہت سے اردو ادیبوں نے اپنا رکھا ہے۔ اس سلسلے میں اب تک علی سردار جعفری ، اپندر ناتھ اشک ، رام لال ، ڈاکٹر محمد حسن ، انور عظیم ، راہی معصوم رضا اور کئی دوسرے لکھنے والوں کے آپدیش نشر ہو چکے ہیں۔ ان سب کا پیغام یہی ہے — پاکستان کو ، بقول ان کے ، کشمیر کے دہشت گردوں اور مذہبی جنونیوں کی پشت پناہی نہیں کرنی چاہیے۔ پشت پناہی تو خیر ہم کیا کرتے ہیں اور چاہیں بھی تو کتنی کر سکتے ہیں ، لیکن سوال یہ ہے کہ کشمیر میں جن لوگوں نے اپنی آواز کا پرچم بلند کیا ہے وہ جو کچھ بھی ہیں ، اس کا فیصلہ کون کرے ؟ کشمیر کے عوام یا کشمیر کی عدالت ؟ بھارتی سینا یا بھارتی سرکار ؟ کیا اردو کے دس بارہ یا بیس پچاس ادیبوں کی سرکاری آواز کو ادبی ضمیر کی عدالت کا فیصلہ قرار دے کر وادیِ کشمیر میں ہونے والے واقعات کو نظر انداز کر دیا جائے ؟

انتظار حسین صاحب کو گلہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف اردو کے ادیب

کیوں کہہ رہے ہیں ؟ آخر ہندوستان میں اور بہت سی زبانیں اور ان گنت ادیب موجود ہیں ، ان میں سے کسی کی آواز کیوں نہیں سنائی جاتی ؟ اس کا آسان جواب تو یہی ہے کہ اردو سروس کا ہدف تو ہم ہیں اور اسی لیے صرف اردو ادیبوں کی تبلیغات نشر کی جاتی ہیں ۔ لیکن یہ بھی ایک دل خراش حقیقت ہے کہ زیادہ تر اُردو ہی کے ادیب آسانی سے قابو میں لائے جا سکتے ہیں ، ماسوا راجندر سنگھ بیدی اورکنہیا لال کپور کے جو سؤرگ باشی ہوچکے ہیں لیکن جنھوں نے کسی ایسی مہم میں کبھی حصہ نہیں لیا ۔ بلکہ بیدی کے بارے میں تو یہ بھی معلوم ہے کہ شیخ عبداللہ نے انھیں جموں ریڈیو سٹیشن کا ڈائریکٹر مقرر کیا تھا ، جس ملازمت سے انھوں نے بخشی غلام محمد کے زمانے میں استعفیٰ دے دیا ۔ ظاہر ہے کہ اختلاف کا تعلق کشمیر کی تازہ صورتِ حال سے ہو گا جو شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد پیدا ہوئی ۔ لیکن یہ سب باتیں تاریخی ہیں ، ادبی واقعہ یہ ہے کہ راجندر سنگھ بیدی نے ، ست سری اکال کرے آن کی سادھی پر پھول برسا کریں : بعد میں ایک نازک سا افسانہ ''تعطل'' کے عنوان سے لکھا جس میں مولوی فاروق کی تحریک استصواب کو پس منظر بنا کر ، ایک ہندو سیاح کے قتل اور قتل کے بعد ڈل جھیل کے ایک ہاؤس بوٹ میں ایک ملی جلی دعوت کا منظر کھینچا گیا ہے ، جس میں شامل لوگ ''کشمیر کے ماضی و مستقبل کے بارے میں لے دے کر رہے تھے ۔'' مختلف تھیوریاں پیش کرتے ہوئے ''ہر شخص یہ سمجھ رہا تھا کہ کشمیر کی جملہ بیماریوں کا علاج اس کے پاس ہے ۔'' اس ہجوم میں صرف ایک کشمیری تھا ، غلام رضا جو چپ تھا اور جو کوئی بات کرتا ''اس کی طرف خالی خولی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ، ویسے ہی خاموش ویسے ہی جامد ، ویسے ہی ساکت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جی چاہا کہ اٹھوں اور ایک دم چیخ کر کہوں — بولو ۔ ۔ ۔ ۔ رضا ، یا هتز ! بولو ، تم بھی تو کچھ بولو ۔ میں نے اس کا نام ہی لیا تھا کہ اس کی نظروں کی بےرحم ٹکٹکی مجھ پر تھی ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا ۔ اگلے روز میں دلی میں تھا جہاں میری طرف کوئی نہیں دیکھتا ۔''

یہ ایک حساس ادیب کا ردِعمل تھا ۔ اسی لیے آج بھی یہ افسانہ ہم سے بہت کچھ کہتا ہے ، جب کہ مولوی فاروق ہی نہیں ، ان کے جنازے میں شرکت کرنے والے بھی ایک نیا جلیاں والا باغ دیکھ چکے ہیں ۔ یہ کرشن چندر کا رومانی کشمیر نہیں ، اس کی معکوس تصویر ہے اور اُس زمانے کی ہے جب بیدی

کا کہنا تھا ''بولو ، یا ھتز ، تم بھی تو کچھ بولو ۔'' اور اب کہ جس وقت پورا کشمیر بولنے لگا تو اے آئی آر کی اردو سروس یہ پرچار کرتی ہے کہ ان کی نہ سنو ، بھارت سرکار کی آنکھ کے تارے اردو ادیبوں کی بات سنو ۔ ارے بھائی ، اردو سروس کی آواز میں تو اس وقت کوئی وزن پیدا ہو گا جب کشمیر کے ادیبوں کی آزاد تحریریں وہاں سے نشر ہوں گی ۔ یوں تو کشمیر میں اردو ادیبوں کی کمی نہیں لیکن اے آئی آر کے ذریعے ان کی آواز ہم تک پہنچنے نہیں پاتی ، بلکہ ریڈیو پاکستان کے ذریعے بھی نہیں ۔

بیدی کا افسانہ صرف ہندوستان میں لکھا جا سکتا تھا اور اسے صرف بیدی ہی لکھ سکتا تھا ، لیکن اختر الایمان کی ایک ایسی نظم ہے جو کہیں بھی لکھی جا سکتی تھی اور کوئی بھی شاعر ، کم از کم پاکستان میں اسے لکھ سکتا تھا ۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ لکھی صرف اختر الایمان نے اور وہ بھی ہندوستان میں بیٹھ کر ۔ ''سبزۂ بیگانہ'' میں ایک مریض ہے جس کا علاج کسی کے پاس نہیں اس لیے کہ سارے معالج کسی نہ کسی طرف کے جانب دار ہو چکے ہیں :

مریض راتوں کو چلاتا ہے ، مرے اندر
اسیر زخمی پرندہ ہے اک ، نکالو اسے
گلو گرفتہ ہے یہ ، حبس دم ہے ، خائف ہے
ستم رسیدہ ہے ، مظلوم ہے ، بچا لو اسے
مریض چیختا ہے ، درد سے کراہتا ہے
یہ ویتنام کبھی ، ڈومنیکن کبھی کشمیر

اگر یہ زخمی پرندہ صرف ویتنام اور ڈومنیکن کا نام لے کر چیختا تو ممکن ہے اس کے خالق کو لینن انعام نہیں تو پدم شری کا خطاب ہی مل جاتا لیکن وہ تو اپنے وقت کے مقامات آہ و فغاں میں کشمیر کا نام بھی لیتا ہے ، جو ایک انسانی تجربہ جبر کے طور پر اب تک جاری ہے ۔ اختر الایمان کی نظم کوئی آپدیش نہیں دیتی ، صرف نشان دہی کرتی ہے اور تجربے کی نوعیت بتاتی ہے ۔ پھر بھی ان بہت سی تبلیغاتی نظموں سے بہتر ہے جن کی ہمارے یہاں کوئی کمی نہیں ۔ پاکستان کے شاعروں نے نظموں پر نظمیں کشمیر کے بارے میں لکھی ہیں ، اگرچہ ہمارے معروف شعراء اس فہرست میں شامل نہیں ۔ عجیب بات ہے

کہ انھوں نے دنیا کے ہر خطے میں ظلم کے خلاف اٹھنے والی آواز سے آواز ملائی ہے ماسوا کشمیر کے اور اس کے بعد افغانستان کے۔ کشمیر کی تاریخ کے نشیب و فراز تو پھر بھی نزاکتِ احساس کے ساتھ مرحوم احمد شمیم کی نظموں میں موجود ہیں لیکن افغانستان کے بارے میں اردو ادب تقریباً خاموش رہا ہے حالانکہ اب تو ماہنامہ ''سوویٹ لٹریچر'' تک میں ایسے افسانے چھپنے لگے ہیں جن میں مجاہدین کو مجاہدین کہا جاتا ہے، دہشت پسند اور مذہبی جنونی نہیں کہا جاتا بلکہ روسی سپاہیوں کو اپنے فوجی کمانڈروں، اخبار نویسوں اور سیاسی فیصلے کرنے والوں پر تنقید کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے، اور شرمندگی کے ساتھ وطن واپس جاتے ہوئے۔

ممکن ہے ہماری خاموشی کی یہ توجیہہ کی جائے کہ اپنے وطن میں مسائل کی کون سی کمی ہے اور یہ بھی کہا جائے کہ ایسے مسائل پر لکھنے کا نام ادب نہیں۔ چند ایک کو شاید خاموشی کا الزام بھی قبول نہ ہو اور وہ ایسی تحریروں کا حوالہ دیں جو تبلیغاتی انداز میں لکھی گئیں۔ لیکن ایک تو کشمیر کی طرح، افغانستان کی صورتِ حال کو بھی، احوالِ وطن سے جدا نہیں کیا جا سکتا دوسرے ایسے مسائل پر کچھ نہ لکھنے کی پابندی صرف کشمیر اور افغانستان کی حد تک کیوں ہو؟ پھر جو ادیب، ادب کو جملہ عالم کے احوال و عوالم سے پاک رکھنا چاہتے ہیں، ان کی منطق کے مطابق تو اپنے یہاں کی صورتِ حال پر بھی کچھ لکھنے کا جواز نہیں نکلتا۔ سوال یہ نہیں کہ تجرباتِ حیات سے دور رہ کر ادب کی تخلیق ممکن بھی ہے یا نہیں۔ یا فلاں فلاں تجربات پر ہمارے ادیبوں کو لکھنا چاہیے تھا اور انھوں نے نہیں لکھا، للہذا ان پر کوئی فردِ جرم لگانی چاہیے۔ ''چاہیے'' کا لفظ نقدِ ادب کے ممنوعات میں شامل ہے اس لیے کہ یہیں سے ادبی فاشزم کا آغاز ہوتا ہے جو جملہ حکومتوں کی ادبی پالیسی کا نقطۂ اشتراک ہے۔ ہماری دلچسپی اس بات سے ہے کہ ہمارے ادب میں جن تجربات حیات نے کوئی دخل نہیں پایا تو اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کیا ہمارا اجتماعی تصورِ حیات کافی حد تک وسیع نہیں یا ہم اپنے تجرباتِ حیات کو اپنی شخصیت میں جذب نہیں کر پاتے؟ آخر کوئی وجہ تو ہو گی کہ ایک طرف ہمارا ادب زندگی سے بیگانہ ہے اور دوسری طرف ہمارا معاشرہ ادب سے بیگانہ ہے۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں متقابل کیفیات کا آپس میں کچھ ربط ہے۔ کسی

بھی ادیب سے پوچھا جائے کہ عصرِ حاضر میں ادب کس قسم کا کردار انجام دے تو غالب اکثریت کا یک لفظی جواب ہوگا ، کمٹ منٹ ۔ یعنی ہمارے ادب کی کمٹ منٹ اپنے زمانے کے ساتھ ہے ۔ لیکن ہمارا زمانہ کیا ہے اور اس کے ساتھ کمٹ منٹ کیسے ہو سکتی ہے ؟ یہ تو مولانا حالی بھی فرماتے تھے ، چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی ۔ گویا مرغِ باد نما بن جاؤ ۔ یہ تو کوئی کردار نہ ہوا ۔ اس لیے کہ نہ تو اس میں کوئی عمل ہے نہ کسی طرح کا ڈرامائی تصادم ۔ موسم کا ایک میکانکی کھیل ہے جو ادب سے زیادہ محکمہ موسمیات سے تعلق رکھتا ہے ۔ درست ہے کہ طوق و دار کا بھی ایک موسم ہوتا ہے اور صوتِ ہزار کا بھی لیکن ادیب کے لیے یہ دونوں موسم الگ الگ نہیں ہوتے ، تھوڑے بہت مختلف ضرور ہوتے ہیں مگر پھر بھی یکجا ہو سکتے ہیں ۔ اسی طرح کمٹ منٹ کا مضمون ہے کہ زمانے کے ساتھ بھی ہے اور زمانے کے برعکس بھی ۔ عصرِ حاضر کے شعور سے پیوست بھی ہے اور عصرِ حاضر کے شعور سے متصادم بھی ۔

ہمارا زمانہ نئے علوم و فنون کا بھی ہے اور نئی بربریت کا بھی ، تکنیکی تعمیر کا بھی ہے اور برقیاتی جارحیت کا بھی ، تسخیرِ کواکب کا بھی ہے اور جنگ کواکب کا بھی ، تعلیم و تربیت کا بھی ہے اور سوقیانہ مذاق کا بھی ، عوامی جمہوریت کا بھی ہے اور تہذیبی فاشیت کا بھی ۔ ایک طرح کے امکان سے دوسری طرح کا امکان اس انداز کے ساتھ باہم پیوست ہے کہ دونوں کو جدا کر کے دیکھنا بھی محال ہے ۔ ایسے میں ادب کا کردار یک رخا نہیں ہو سکتا ۔ یوں بھی کسی ڈرامائی کردار کا تصور کیجیے : ہیملٹ یا گلیلیو ۔ اب جو بھی ادا کار اس کردار کو ادا کرے گا ، اسے ایک تو شخصیاتی چیلنج درپیش ہو گا اور ایک تشکیلاتی ، یعنی وہ کسی نہ کسی طرح اپنی شخصیت کا مکمل اظہار بھی کرے اور کسی نہ کسی طرح ایک مجموعی تشکیل میں شامل بھی رہے ۔

اسی طرح عصر حاضر میں ادب کا کردار بھی ایک دُہرا کردار ہے کہ عصری شعور کی نمائندگی بھی کرے اور عصری شعور کے مقابلے میں اپنی تہذیبی تشکیل سے بھی غافل نہ ہونے پائے ۔ ظاہر ہے کہ قیامت کا مضمون ہے ، اور کس کا حوصلہ ہے کہ تخلیقی فن کار کے سوا دونوں برابر کی قوتوں کو متوازن رکھ سکے ؟ بظاہر حد بشر سے باہر کی بات معلوم ہوتی ہے لیکن تاریخ انسانیت

میں ادب کے کردار کی انجام دہی کبھی آسان نہیں رہی ۔ سہل پسندوں نے سہولت کے راستے بھی نکالے ہیں اور مقبول عام ادیبوں میں یہ قدر مشترک پائی جاتی ہے کہ وہ یا تو دہرے کردار کو اِکہرا بنا کر اپنے لیے اور اپنے معاشرے کے لیے آسانیاں پیدا کر لیتے ہیں ، یا پھر دہرے کردار کو بیک وقت ادا کرنے کی بجائے باری باری ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یعنی تھوڑی دیر کے لیے یہ انداز دیکھ لیجیے اور تھوڑی دیر کے لیے یہ بھی

"مادام بواری" میں ایک جگہ فلوبیئر نے ادب کی دو رخی کو زبان و بیان کا المیہ بنا کر پیش کیا ہے :

"زبان ایک تڑخی ہوئی دیگچی کی طرح ہے جس پر ہم ایسی دھنیں بجاتے ہیں جنھیں سن کر بھالو ناچنے لگیں ، جب کہ ہم ہر لحظہ ستاروں کا دل موم کرنے کو ترستے ہیں ۔"

ستاروں کا دل کیسے موم ہو ، یعنی انسان کی تقدیر کیوں کر بدلے ؟ اور بھالو ناچ وہ چیز ہے جسے قبول عام کہتے ہیں ۔ تڑخی ہوئی دیگچی ہمارے وسائل اظہار کی موجودہ صورت ہے جس پر کوئی دھن بج سکتی ہے تو نہایت آسان اور مسخ شدہ ۔ ادب کا کردار یہ ہے کہ وہ تڑخی ہوئی دیگچی کو ٹھونکتا رہے اور انسانی تقدیر کو بدلنے کی آرزو سے بھی دست بردار نہ ہو ۔

جمہوریت کا المیہ بھی یہی ہے کہ مقامی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ہر جگہ بھالو ناچ کا منظر دکھائی دیتا ہے اور قومیت کی تشکیل کے لیے آرزو بھی کی جاتی ہے ۔ لیکن یہ دہرا کھیل بے حد خطرناک ہے اور اس کے باوجود نہایت ضروری ۔ مشکل کے وقت ادب سے بھی تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ اجتماعی عدمِ تحفظ کی فضا میں تحفظ کا احساس پیدا کرے ۔ ادب کی اپنی مصیبت یہ ہے کہ اس کی بھی آرزو تو یہی ہے لیکن وہ یہ فریضہ ، تاریخ اور تہذیب کو درمیان میں لانے بغیر انجام نہیں دے سکتا ۔ ہر دور کا ادب ایک نئی کلاسیک تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ لیکن کوئی بھی نئی کلاسیک ، نئی بھی ہو اور کلاسیک بھی ہو ، یہ کام بہت مشکل ہے ، کیونکہ کلاسیک کہتے ہی اس ادب کو ہیں جو ہر دور میں نیا معلوم ہو ۔

خاتمۂ کلام کے طور پر میر کے آخری دیوان سے ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

رہے ہے غش و درد ، دو دو پہر تک
سر زخم پہنچا ہے شاید جگر تک
ہوئے ہیں حواس اور ہوش و خرد ، گم
خبر کچھ تو آئی ہے اس بے خبر تک
قیامت ہے مشتاق لوگوں کی کثرت
پہنچنا ہے مشکل ہمیں اس کے در تک
کہاں تک اسے سر سے مارا کروں میں
نہ پہنچا مرا ہاتھ اس کی کمر تک
بہار آئی ، پر ایک پتی بھی گل کی
نہ آئی اسیرانِ بے بال و پر تک
بہت میر پھر ہم جہاں میں رہیں گے
اگر رہ گئے آج شب کی سحر تک

اس غزل کو آج کی صورتِ حال میں ، پورے ارتکاز کے ساتھ ، بار بار پڑھنے کے بعد ، یہ محسوس ہو گا کہ انسانیت اور ادب کا مستقبل بڑی حد تک باہم مربوط ہے ، اور ادب انتہائے کمال کو چھو کر بھی ایک مشروط پیش گوئی سے زیادہ کیا کر سکتا ہے ؟ لیکن یہ پیش گوئی کتنی بڑی ہے اور شرط کتنی چھوٹی :

اگر رہ گئے آج شب کی سحر تک

---

شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سندھ (نیو کیمپس جام شورو)

کا

شعبہ جاتی تحقیقی مجلہ

# تحقیق

۴۷۶ صفحات پر مشتمل ۱۹۹۰ء میں اس کا چوتھا شمارہ نکلا ہے

## چوتھے شمارہ کے مشتملات

• حالاتِ زندگی (عفت بانو) • پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں (ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق) • مشاہیر کے خطوط بنام ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں (حبیب الرحمٰن خاں شروانی، سید سلیمان ندوی، قاری ضیاء الدین احمد، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، محمود شیرانی، ضیاء احمد بدایونی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولوی عبدالحق، احسن مارہروی، راشد برہانپوری، نیر محمد حسن، ڈاکٹر مختار الدین احمد)

عکسِ تحریریں:- • ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخِ ادبِ اردو پر مقالہ (ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، بخطِ خود) • اسٹڈیز ان لٹریچر کا دیباچہ (بخطِ خود)

علمی کاموں کا جائزہ:- • ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کا مقالہ تحقیق "سید حسن غزنوی" (ڈاکٹر نجم الاسلام) • ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کی انگریزی تصانیف (ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی) • ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کی چند اہم تصانیف (ڈاکٹر نجم الاسلام) • ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، زبان دانی و لغت شناسی کی ایک مثال (ڈاکٹر فرمان فتحپوری)

جام شورو کے مخطوطات (قسط دوم) • فہرست مخطوطات ذخیرہ حکیم شمس الدین احمد حیدرآبادی و دفاترِ دیگر۔ (محمد شفیع بروہی)

مقالات:- • سفینۂ نزہتہ المجالس (ڈاکٹر نذیر احمد) • خاندانِ جیہانی (ڈاکٹر نذیر احمد) • سندھ کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی (ڈاکٹر نجم الاسلام) • اردو میں تحقیقی اصول و طریق کار سے متعلق توضیحی سرمایہ (مسز رابعہ اقبال) • پاکستانی خواتین اور اردو تحقیق (مسز رابعہ اقبال) • ایلیٹ اور سر سید احمد خاں (ڈاکٹر معین الدین عقیل) • ادونام (ڈاکٹر سہیل بخاری) • دفترِ امیر اللغات (سید جاوید اقبال)

اخذ و استفادہ:- • ملفوظاتی ادب کے لیے ایک منہاجِ تحقیق (ڈاکٹر ریاض الاسلام)

## دانشور غزلگو

• حسن نعیم
• مجتبیٰ رضوی



تازہ ترین دانشوری سے قطع نظر،
(اور تازہ سے مطلب تھا تازہ ترین!)،
اردو غزل کے مہد نو نے بھی کتنے بڑے دانشور غزلگو دیے ہیں! انھیں بھی خدا بخش نے جمع کرنا شروع کیا۔ ان غزلگویوں کی خدمت میں درخواست کر کے ان سے انکا احوال اپنے خط میں ایک غزل، تصویر اور اپنا کیا ہوا انتخاب مانگا، انہوں نے ممنون کیا۔ مگر کچھ نے جانے نیں بہت جلد کر دی یا ہم ہی نے تاخیر کر دی۔ قصور کے اعتراف میں جانے والوں کو سب سے پہلے آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

———— ادارہ

○

## حسن نعیم (وفات : ۲۲ر فروری ۱۹۹۱ء)

میرے دادا سید شاہ غلام قاسم راجگیر کی درگاہ پیر امام الدین کے سجادہ نشین ہونے کے باوجود (یہ درگاہ مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیری کے نسبی سلسلے کی تھی) اس دور کے سیاسی حالات کے پیش نظر مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشی بقا کے لیے مغربی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے، یہاں تک کہ خود بھی انگریزی میں تھوڑی بہت استعداد حاصل کر لی تھی اور بعد میں اپنی سجادگی اپنے چھوٹے بھائی سید شاہ محمد یوسف کے حوالے کر کے کسی شعبے میں وقف رجسٹرار ہو گئے تھے۔

انھوں نے اپنے دو بیٹوں کو بغرض تعلیم لندن بھیجا، میرے والد سید محمد نعیم اور سنجھلے چچا سید عبد السمیع یکے بعد دیگرے بیرسٹر ہو کر لوٹے، میرے والد شہر بھاگلپور میں پریکٹس کرنے لگے اور سنجھلے ابا پٹنہ ہی میں شادی کر کے بس گئے۔ اپنی کارگزاریوں کے باعث دونوں اپنے علاقے کے عمائدین میں شمار ہونے لگے۔ دونوں ہی قومی اور ملی مسائل میں دلچسپی لیتے تھے۔ میرے والد غالباً ۲۶ء کے اواخر میں پٹنہ منتقل ہو گئے تھے۔ جہاں میں ۶ جنوری ۲۷ء میں پیدا ہوا اور میرا نام سید حسن رکھا گیا۔

ایک طویل علالت کے بعد ستمبر[1] ۲۸ء میں والد صاحب کا کم عمری ہی میں انتقال ہو گیا اور پھر پریشانیوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہوا، میری والدہ شیخ پورہ (ضلع مونگیر) چلی گئیں جہاں میری دادی کا آبائی مکان تھا اس کے علاوہ کچھ وہاں اور کچھ گیا ضلع میں ان کی جایداد بھی تھی جس سے گزر بسر ہونے لگی۔ میں سات آٹھ سال کی عمر تک شیخ پورہ ہی میں رہا اور ابتدائی تعلیم وہیں پائی مجھ سے تینوں بڑے بھائی پٹنہ میں زیر تعلیم تھے اور جسٹس سید نورالہدیٰ کے یہاں رہتے تھے جو رشتے میں ہم لوگوں کے نانا ہوتے تھے۔ جج صاحب کے انتقال کے بعد والدہ خود پٹنہ آ کر رہنے لگیں اور ہم سب ساتھ رہنے لگے۔

۳۸ء میں میرا اور میرے سنجھلے بھائی سید علی کا نام رام موہن رائے سمنری پٹنہ میں لکھوا دیا گیا اسکول میں داخلے کے وقت ہم دونوں نے اپنے اپنے ناموں کے ساتھ 'نعیم' جوڑ لیا (بہت دن بعد منجھلے بھائی سید حمد نے بھی یہی کیا البتہ بڑے بھائی تاعمر سید احمد ہی رہے لیکن اپنے بچوں کے نام کے ساتھ 'نعیم' کا اضافہ کر دیا)

---

1 میرے سنجھلے بھائی صاحب کہتے ہیں کہ میرے والد کا انتقال ستمبر میں نہیں نومبر ۱۹۲۸ء میں ہوا تھا۔

مشکل سے تین برسوں تک ہم سب بھائی والدہ کے ساتھ قدرے سکون سے رہے، پھر اگست ۳۹ء میں والدہ صاحبہ کا اچانک انتقال ہوگیا اور ہم سب یوں بکھرے کہ کبھی اکٹھے رہنا نصیب نہ ہوسکا۔

میں ۴۰ء میں اپنی چھوٹی پھوپھی بیگم یوسف حسین کے ساتھ رہنے کے لیے 'محلہ ٹیڑھی گھاٹ پٹنہ سیٹی' چلا گیا اور وہاں ۴۱ء میں میرا داخلہ محمڈن اینگلو عربک اسکول میں ہوگیا۔ وہیں سے ۴۳ء میں میٹرک پاس کرکے پہلے پٹنہ سائنس کالج پھر ایک سال بعد بی۔ این۔ کالج پٹنہ میں داخل ہوا جہاں سے ۴۵ء میں آئی ایس سی پاس کیا۔

ٹیڑھی گھاٹ کے قیام کے دوران ہی مجھے اُردو شاعری سے گہرا لگاؤ پیدا ہوا۔ یہ محلہ دراصل صرف تین قلعہ نما مکانوں پر مشتمل گنگا کے کنارے آباد تھا جس میں ایک ہی خاندان کے افراد مقیم تھے۔ اس خاندان کے سربراہ اس وقت نواب ابراہیم حسین صاحب تھے جو میرے نئے اسکول کے سکریٹری ہونے کے علاوہ 'انجمن ترقی اُردو لائبریری پٹنہ سیٹی' کے بانی بھی تھے۔ ان کی شادی بھی میرے والد کی پھوپھی زاد بہن سے ہوئی تھی۔ خود انھیں تو شاعری سے معمولی دلچسپی تھی لیکن ان کے صاحبزادے سید اکبر حسین کو (جو بعد میں جسٹس اکبر حسین بنے) شاعری کا نہ صرف شوق تھا بلکہ خود بھی صاف ستھری غزلیں لکھ لیا کرتے تھے۔ چھوٹی پھوپھی کے دونوں لڑکوں، سید اصغر حسین اور سید احمد حسین کا مذاقِ سخن بھی اعلا تھا اور اساتذہ کے بہت سارے اشعار یاد تھے۔

وہاں اکثر طرحی اور غیر طرحی نشستیں منعقد ہوتیں جن میں عظیم آباد کے برگزیدہ شعرا بھی شرکت کرتے ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کی غزلوں کی اس زمانے تک دھوم باقی تھی، وہ اکثر وہاں قیام فرماتے بلکہ اپنا مجموعہ 'جلوۂ داغ' وہیں رہ کر ترتیب دیا۔ ان کے علاوہ عظیم آباد کے نامی گرامی شعرا میں بسمل عظیم آبادی (سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے)، بدر عظیم آبادی، محمود علی خاں صبا (شاگرد شاد) وغیرہ اکثر تشریف لایا کرتے۔ ممتاز احمد بسمل جو داناپور کے ایک خوش گو شاعر تھے اور زمانہ طالب علمی میں علی گڑھ میگزین کے مدیر رہ چکے تھے وہاں میرے جانے سے پہلے مستقلاً رہا کرتے تھے۔ انھوں نے مولانا احسن مارہروی سے تلمذ حاصل کیا۔ سید شاہ رضی احمد (مجموعہ: کشت خیال) تو خیر سے گھر کے داماد تھے اور وہیں قیام پذیر تھے۔

غرض ٹیڑھی گھاٹ کا شعری ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ میرا شاعری سے بچ نکلنا محال تھا، ویسے بڑے بھائی سید احمد بھی نوجوانی میں شعر کہا کرتے تھے، تپش ان کا تخلص تھا اور نہایت دل کش ترنم میں شعر پڑھا کرتے تھے۔ انھوں نے پروفیسر عبدالمنان بیدل اور ضمیر الدین عرش گیاوی (مصنف: حیات مومن) سے مشورۂ سخن بھی کیا تھا۔

غرض پانچ چھ برسوں کے قیام کے بعد جب ۴۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچا تو میرے پاس دس بارہ

پابند اور آزاد نظموں کے علاوہ پانچ سات مکمل اور نامکمل غزلیں بھی تھیں۔ لیکن ان کی موجودگی کا علم صرف چند احباب کو تھا۔

علی گڑھ شروع ہی سے اُردو شعر و ادب کا مرکز رہا ہے، چنانچہ میرے زمانے میں بھی مستند اور مشہور لوگوں کے علاوہ تازہ فکر اور نوخیز ادیبوں، شاعروں اور ناقدوں کا ایک قافلہ موجود تھا، یہی لوگ بعد میں عصری ادب کے ستونوں میں شمار ہوئے۔ ان دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے باقاعدگی سے ہوا کرتے تھے جس میں اکثر میں بھی شریک ہوتا تھا، ہنگامی جلسوں کی بھی کمی نہ تھی، ایک ایسے ہی جلسے میں میں نے اپنی ایک نظم "تشنہ لبی" پڑھنے کی جسارت کی، جس میں جاں نثار اختر اور معین احسن جذبی بھی شریک تھے، خلاف توقع اس کی بہت معمولی نکتہ چینی ہوئی، بلکہ اس نظم کو ڈاکٹر مختار الدین احمد نے یونیورسٹی میگزین کے سالنامہ ۴۸ء میں شامل کر لیا، یہ میری پہلی تخلیق تھی جو شائع ہوئی۔

علیگڑھ کے دوران قیام میں نے تازہ کچھ نہیں لکھا، صرف قدیم و جدید ادب کا مطالعہ کرتا رہا اور ادبی بحثوں میں حصہ لیتا رہا، باقی وقت ٹیبل ٹینس کھیلنے اور اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی سرگرمیوں میں صرف ہوا۔

ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی اسوقت بی۔اے کے طالب علم تھے لیکن بطور شاعر اور نقاد ادب میں متعارف ہو چکے تھے، انھوں نے ایک بار رائے دی کہ میں غزلوں کی طرف خصوصی توجہ دوں اس لیے کہ ان کا اسلوب و مواد انھیں کچھ نیا نیا سا لگا، ان کی یہ بات میرے دل کو لگ گئی۔ باقر مہدی اور شہاب جعفری سے بھی ان ہی دنوں کی ملاقات ہے اور تب سے آج تک تبادلۂ خیال ہو رہا ہے۔ ۴۸ء میں علیگڑھ سے بی۔ایس۔سی کرنے کے بعد جب واپس پٹنہ لوٹا تو دوبارہ چند غزلیں کہیں جو وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں مقبول ہوئیں لیکن میرے ذہن میں کچھ تخلیقی مسائل بار بار سر اٹھاتے تھے اور مجھے اپنے کلام سے بدگمان کرتے تھے، بات یہ ہے کہ اچانک جو تبدیلیاں ہمارے سماج، مزاج اور اخلاقی اقدار میں ۴۷ء کے بعد آئی تھیں انھیں ہم محسوس تو کرتے تھے لیکن ان کا اظہار مروجہ غزلوں کے اسالیب اور لہجوں میں بے جان اور غیر حقیقی سا لگتا تھا، عصری صداقتوں سے غزل کو ہم آہنگ کرنے کیلیے ایک ایسی تخلیقی زبان کی ضرورت تھی جس میں الفاظ، استعارات، پیکر اور علائم جیتے جاگتے نظر آئیں، یہ کوئی آسان مرحلہ نہ تھا، اسکے لیے غزل کی کل روایات کا تجزیاتی مطالعہ ناگزیر تھا کہ انحراف بھی اس عظیم روایت کا ہی حصہ نظر آئے۔

اس بار میرا قیام اپنے خالو رفیع الدین بلخی ایڈوکیٹ کے دولت کدے پر ہوا، وہ نہایت ذی علم خوش اخلاق اور شگفتہ مزاج انسان تھے، وہ بیدل و غالب کے پرستاروں میں تھے اور ان دنوں غالب کے فکر و فن سے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کر رہے تھے، ان کے گھر میں اکثر شام کے وقت شہر کے ممتاز دانشوروں شاعروں اور سیاسی شخصیتوں کا مجمع لگتا تھا اور گھنٹوں گرما گرم بحثیں ہوا کرتی تھیں، علامہ جمیل مظہری ان کے

گہرے دوستوں میں تھے اور ان دنوں وہیں قیام فرماتے تھے' وہیں جناب فصیح الدین بلخی سے شرف نیاز حاصل ہوا' وہ ایک درویش صفت مورخ اور محقق تھے تاریخ مگدھ کے مصنف کی حیثیت سے تو وہ مشہور تھے۔ لیکن ان کے تنقیدی کتابچے "انشاد نشاد" کی خبر صرف صاحبان نظر کو تھی۔ ان سے گفتگو کرنے پر مجھے محسوس ہوا کہ ان کی نگاہ اُردو شاعری کے کلاسیکی سرمایہ' خاص کر غزلیہ شاعری اور اس کے رموز و نکات پر گہری اور معروضی ہے چنانچہ ۴۹ء میں سات آٹھ مہینوں تک ان کے خزانۂ علم سے فیض یاب ہوتا رہا اس وقت تک کی بیشتر شاعری کو رد کرتے ہوئے گویا ۱۹۵۰ء سے میں نے نئے شعری سفر کا آغاز کیا تب سے مسلسل لکھ رہا ہوں۔

۱۹۵۰ء میں میری شادی حشمت آرا بیگم سے ہوئی جنھوں نے شاہدہ یوسف کے نام سے کئی اچھے افسانے لکھے ہیں' میری دونوں لڑکیوں میمونہ اور شہیرہ کی شادی ہو چکی ہے دو بیٹے ہیں ارشاد اور اشعر۔ ان میں سے ایک برسرِ روزگار ہے اور دوسرا ایم۔ اے کر چکا ہے۔

۵۲ء میں پرویز شاہدی جو میرے خلیرے بھائی بھی تھے مجھے اپنے ساتھ کلکتے لے گئے جہاں لگ بھگ ایک سال تک سی۔ ایم۔ او اسکول میں سائنس ٹیچر رہا۔ پرویز شاہدی ہی اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور مظہر امام بھی ان دنوں اس اسکول میں اُردو کے استاد تھے۔

جون ۵۳ء میں کلکتے کو چھوڑ کر قسمت آزمائی کی خاطر دلی آگیا۔ اتفاق سے اس وقت ڈاکٹر سید محمود جو مجھ سے اچھی طرح واقف تھے ہسٹری آف فریڈم موومنٹ بورڈ کے چیرمین تھے' وہ مجھ پر مہربان ہوئے اور مجھے اپنا سکریٹری منتخب کر لیا۔ ۵۴ء میں جب وہ وزارت خارجہ میں وزیر مملکت ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ بطور پرائیویٹ سکریٹری وہیں منتقل ہو گیا اور ۱۹۷۰ء تک اسی وزارت سے منسلک رہا۔

دلی میں نہ صرف میری ادبی نشو و نما ہوئی بلکہ میری زندگی کے بہترین ایام وہیں بسر ہوئے' دلّی ہی دراصل وہ شہر ہے جس کی تہذیبی روایت سے آج کی غزل بھی سب سے زیادہ متاثر ہے۔

۱۹۵۵ء میں ایفرو ایشیائی کانفرنس منعقدہ بنڈونگ (انڈونیشیا) میں بطور ڈیلی گیٹ شریک ہوا اور پھر ۵۶ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو سعودی عرب تشریف لے گئے تو دوروں کے علاوہ میں بھی ساتھ گیا۔ میرا تبادلہ دو بار ہندستان سے باہر ہوا پہلے ساڑھے تین برسوں کے لیے (۵۸ء تا وسط ۶۱ء) جدہ میں ہندستان کا نائب قنصل رہا اور پھر کوئی چار برسوں تک (۶۴ء سے ۶۸ء تک) نیو یارک میں انڈین مشن برائے اقوام متحدہ میں بطور اتاشی کام کیا' اس کے علاوہ ایشیا' افریقہ' یورپ اور امریکہ کے کوئی پندرہ بیس ممالک کی سیر و سیاحت کے دوران وہاں کی طرز زندگی اور تہذیبی اقدار کو سمجھنے کا موقع ملا' اس خیال کے تحت کہ کسی ادبی ادارے سے منسلک

ہوکر باقی زندگی صرف علمی اور ادبی کام کروں وزارت خارجہ سے مستعفی ہوکر ۱۹۷۰ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے بطور ڈائرکٹر وابستہ ہوگیا، میں نے ہی اس ادارے کا باضابطہ دفتر قائم کیا، اس کے عمارات کی تکمیل کروائی اور اس کی ادبی سرگرمیاں شروع کروائیں لیکن مجلس عاملہ کے ایک ممبر کی مستقل رخنہ اندازی سے تنگ آکر جولائی ۷۳ء میں اس سے علاحدہ ہوگیا۔ اس کے بعد مختلف ذرائع سے کسب معاش کرتا رہا ہوں اور اپنی شاعرانہ شخصیت کے تحفظ کی خاطر بڑی آزمائشوں سے گذرا ہوں۔

میری غزلوں کا پہلا مجموعہ اشعار ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا، اس کے بعد ۸۰ء میں ہندی رسم الخط میں دوسرا مجموعہ غزل نامہ شائع ہوا، تیسرا مجموعہ جس میں تقریباً ڈیڑھ سو منتخب غزلیں ہیں 'دلستاں' کے نام سے ترتیب پاچکا ہے انشاء اللہ آئندہ دو تین مہینوں میں شائع ہوجائے گا۔

پابند اور آزاد نظموں کے علاوہ میں نے آٹھ نو مختصر مثنویاں بھی بطور تجربہ لکھی ہیں، جو سب کی سب شائع ہوچکی ہیں انھیں ایک مجموعہ کی شکل میں ترتیب دینا باقی ہے، غزل چونکہ میری زندگی کا محور اور MOTIVE FORCE ہے، ادھر تین برسوں سے بمبئی میں مقیم ہوں اور نیشنل غزل سنٹر کے نام سے ایک بڑا ادارہ قائم کرنے میں منہمک ہوں، اس ادارے کے ذریعہ غزل کے سرمائے کو سلسلہ وار دوسری ہندستانی زبانوں میں منتقل کرنے اور غزل گائیکی کو صحیح خطوط پر رواج دینے کا کام کیا جائے گا، چھوٹے پیمانے پر یہ کام شروع ہوچکا ہے۔

## انتخاب کلام

دانشوروں کے قحط میں سید حسن نعیم ——— بیدل کی باؤلی پہ لگا میں سبیل کیا

———

وہ لوٹ آئے تو اس کی بھی کچھ انا رکھیو
فصیل قلب کا دروازہ تم کھلا رکھیو

نظر کی آنچ سے کھلتے ہیں پھول وحشت کے
کھلیں یہ پھول تو دامن کو مت بچا رکھیو

دیار فن میں جہاں منزلیں بھی فرضی ہیں
تمام عمر بھٹکنے کا حوصلہ رکھیو

وہ اک غزال ہے کب تک پہاڑ پھلانگے گا
کنار آب حسن خیمۂ وفا رکھیو

———

کچھ اصولوں کا نشہ تھا، کچھ مقدس خواب تھے
ہر زمانے میں شہادت کے یہی اسباب تھے

میں عدو کی جستجو میں تھا کہ اک پتھر لگا
مڑ کے دیکھا تو سناں تانے ہوئے احباب تھے

———

سانس لیتے ہیں ہزاروں، جینے والے چند ہیں
سب دریچے آرزو کے بند دلوں پر بند ہیں

———

"جاں کا خطرہ ہے کسی نے گر مجھے سچا کہا"
فوج سلطاں چار سو تھی جس نے جو سمجھا کہا

جس کو جانا ہمنوا، وہ کھو گیا بازار میں
بن گیا اک واہمہ جس شخص کو اپنا کہا

ایک دنیا دیکھ کر لوٹا تو اب حیران ہوں
کس بنا پر میں نے اب تک قصۂ دنیا کہا

وقت ہی ناقدرے ایسا جس کو سب معلوم ہے
حرف کے پردے میں کس نے کیا کہا کیسا کہا

میں پشیماں ہوں کہ اپنی سست فہمی سے نعیم
کیسے کیسے مسخروں کو قبلہ و کعبہ کہا

---

سُن اس طرح کہ شور بھی نغمہ سنائی دے
اتنی نہ آنکھ کھول کہ دنیا دکھائی دے

دیکھا نہیں ہو جس نے ترے دل کا آئنہ
کیا قیمتِ نگاہ شبِ رونمائی دے

گھیرے ہیں آفتاب کہ مایوسیوں میں آس
جینے کی ہو سبیل تو سب کچھ سجھائی دے

لپٹی ہے سب کے پانو سے زنجیرِ غم نعیم
کس میں ہے اتنا زور کہ غم سے رہائی دے

---

مرے کلام میں سب حرف یوں شگفتہ ہیں
شگفتِ گل بھی نیا واقعہ لگا سب کو

نعیم ایک فقیری بھی ہے ورثے میں
اسے بھی مانگتی دنیا تو بخشتا سب کو

---

کیوں، ذرا سی بات پر چھوڑی وہ بزمِ دوستاں
اب ہجومِ آشنا میں عمر بھر تنہا رہو

ڈھونڈتا ہوں میں پریشاں ہو کے اس درویش کو
جس نے دی تھی یہ دعا "بیٹا سدا زندہ رہو"

---

ایک چادر ہے، خوشی کی، ایک گٹھری غم کی ہے
سر پہ دونوں کو اٹھا کر یا تری بن جائیے

لمحہ لمحہ کون دیتا ہے صدا مجھ کو نعیم
"کیجیے کچھ کام ایسا اک صدی بن جائیے"

---

نقوشِ پا جو سنوارے گا، اک نظر دے گا
مگر جو راہ نکالے گا رہگزر دے گا

خبر نہ تھی کہ وہ اس درجہ مہرباں ہے نعیم
مجھی کو آ کے مرے عیب کی خبر دے گا

---

بسر ہوئی یوں کہ ہر اک درد حادثہ نہ لگے
گزر بھی جائے کوئی غم تو واقعہ نہ لگے

---

اب تو میں ہوں خانقہ میں اور یہ ویراں صفیں
ہا و ہو کا دم کہاں ہے سینۂ دم ساز میں

کھو گیا تو آج بھی پانو کی زنجیر ہے
ورنہ ہر شے گردِ پا تھی دشت کے آغاز میں

---

یوں نہ غمگیں ہو کہ آخر میں بھی تیری آس ہوں
جب سے لوٹا ہوں سفر سے دیکھ تیرے پاس ہوں

---

لے گئے ہم سائے سب اینٹیں در و دیوار کی
روز پردہ میرے ان کے درمیاں اٹھتا رہا

جب سے قبضہ میرے دفتر پر ہوا اک دوست کا
میری چھت گرتی رہی، اس کا مکاں اٹھتا رہا

---

پڑ رہے سڑکوں سے، گلی سے پتھر
تم سے بچھڑے تو اٹھایا گیا کیا

مجھ کو خط لکھنا تو یہ بھی لکھنا
تم نے کھو کے مجھے پایا کیا کیا

سب نے جاں بیچ کے دیکھیں تو حسن
مال و اسباب کمایا کیا کیا

---

اس سے پہلے کہ دفن ہو جاؤ
وادیٔ فن میں کچھ تو بو جاؤ

میر و بیدل کی پیروی سے نعیم
کچھ تو دنیا میں تم بھی ہو جاؤ

---

کچھ نہ تھا اپنی گرہ میں ان کی خوشبو کے سوا
صحرا صحرا ہم گلوں کی بستیاں لے کر چلے

حسن کا دربار بھی بازارِ دنیا ہے نعیم
اپنے خوابوں کا خزانہ تم کہاں لے کر چلے

---

جاری ہے حکم قتل بلا مہر و دستخط
سر اپنا ہے قلم تو لہو کی رسید ہے

سب سے حسین ملک ہے خوابوں کی سرزمیں
سب سے قدیم شہر، دماغ جدید ہے

قبضے میں جس کے لفظ کا فانوس ہے نعیم
تہ خانۂ خیال کی گویا کلید ہے

---

ایک بھی حرف نہ تھا خوش خبری کا لکھا
نامۂ وقت ملا اور کسی کا لکھا

ایسے کتنے نئے لوگ مکانِ جاں میں
بام و در پر ہے مگر نام اسی کا لکھا

موجۂ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوک قلم
وہ انا تھی کہ کبھی درد نہ جی کا لکھا

کوئی جدت تو کوئی حسن تغزل سمجھا
مرثیہ جب بھی کوئی اپنی صدی کا لکھا

بات شیریں سی لگی فن کے طرفداروں کو
قصہ ہر چند حسن کوہکنی کا لکھا

---

ملا نہ کام کوئی عمر بھر جنوں کے سوا
تمام عیش میسر رہے سکوں کے سوا

لگی وہ آگ کہ دیوار و در بھی جل نکلے
کوئی مقیم نہیں گھر میں اب ستوں کے سوا

پڑی وہ دھوپ کہ سب رنگ پڑ گئے پیلے
بچا نہیں ہے کوئی سرخ میرے خوں کے سوا

ہر ایک فن کی بنا مد و جزر دل ہے نعیم
کہ شعر و نغمہ ہیں کیا، موج اندروں کے سوا

---

کسے بتاؤں کہ وحشت کا فائدہ کیا ہے
ہوا میں پھول کھلانے کا قاعدہ کیا ہے

پیمبروں نے کہا تھا کہ جھوٹ ہارے گا
مگر یہ دیکھیے اپنا مشاہدہ کیا ہے

---

میں نکل جاؤں گا اپنی جستجو میں ایک دن
بزم یاراں میں خیال آرائیاں رہ جائیں گی

---

بہار باغ تمنا ہے آرزو مندی
دگرنہ چشمۂ ویراں ہے دیدۂ تر بھی

اتنی تاثیر تو فریاد کی قسمت ہو نعیم
حاکم وقت بدل جائے جو بہرا ہووے

دیے جلیں کہ بجھیں، آفتاب آئے گا
یقیں کرو نہ کرو، انقلاب آئے گا

شہِ ستم کو اٹھالے گا جو سرِ نیزہ
وہ شہ سوار مرے ہم رکاب آئے گا

نشانِ فتح کسی دن ہوا میں لہراتا
مثالِ خواب، کوئی مردِ خواب آئے گا

---

نہ پست قد ہے، نہ کوئی بلند قامت ہے
نگاہ شعر میں ہر لفظ اک علامت ہے

---

چلا تھا میر کے پیچھے سخن کی وادی میں
اسی کی خاک نوازی مری امامت ہے

---

بہن کے دوست بھی نکلے لباسِ طنز حسن
وہ اپنی آن میں بے قاعدہ ہوا سو ہوا

---

یہی ایک جی میں ہے وہم سا، یہی ایک سر میں جنوں سا ہے
تجھے اس جنم میں نہ پا سکا تو کسی جنم میں نہ پاؤں گا

تو ہزار مجھ سے الگ رہے، میں ہزار تجھ سے جدا رہوں
کبھی درد بن کے جگاؤں گا کبھی نیند بن کے سلاؤں گا

ابھی اپنی خاک میں قید ہوں ابھی تو بھی دامِ ہوا میں ہے
تو گلاب بن کے کھلے گا جب میں صبا کے روپ میں آؤں گا

---

سچ ہے اب عشق کا وہ منصبِ اعلا بھی نہیں
شاہِ شمشاد قداں، افسرِ بالا بھی نہیں

آگ جتنی تھی گئی اشکِ رواں کی صورت
کام کچھ شعلۂ امکاں سے نکالا بھی نہیں

---

وہ دیارِ جستجو کے قافلے کی جان ہے
اس کی آشفتہ سری اس عہد کی پہچان ہے

کس حوالے سے اُسے پہچانیے، الجھن ہے یہ
صوفیوں کی اس میں خو ہے، گل رخوں کی شان ہے

پہلے سچ کی صف میں بھی اک فوج رہتی تھی حسن
اب تو میں ہوں اور شہادت کا قوی امکان ہے

---

سونے میں جو دمک ہے وہی اس کی آبرو
پیتل میں جو چمک ہے، وہی اس کی گند ہے

آتا ہے وقتِ شام سبوچے کی سمت سے
اک ایسا ماہتاب جو بوتل میں بند ہے

غزلوں کا حسن خواب کے لہجے میں گفتگو
دوہوں کا حسن پیار کے لہجے میں پند ہے

میرے لہو کو جس نے جلایا تھا اے نعیم
وہ زہر میرے شعر میں اب جوئے قند ہے

---

وہ علم ہے جو سخن کو وقار دیتا ہے
وہ دردبخش، جو فن کو نکھار دیتا ہے

یہ کون دل میں جلاتا ہے آتشِ اُمید
وبالِ فکر کو سر سے اتار دیتا ہے

میں اس درخت سے کم تر ہوں مرتبہ میں حسن
جو دھوپ سہ کے مسافر کو پیار دیتا ہے

---

کچھ سخن فہم، کچھ سیاسی ہے
اپنا محبوب دلی باسی ہے

میرے شعروں میں بس گئی آخر
اس کی آنکھوں میں جو اداسی ہے

---

ہم گئے جس شجر کے سائے میں — اس کے گرنے کا احتمال ہوا
بس کہ وحشت تھی کارِ دنیا سے — کچھ بھی حاصل نہ حسبِ حال ہوا
جس تعلق پہ فخر تھا مجھ کو — وہ تعلق بھی اک وبال ہوا

دفترِ شعر میں کیا نسل و قبیلہ کی تمیز — نام اونچا ہے بس تازہ خیالوں کا یہاں
تیری تصویر چھپی جب تو مجھے علم ہوا — کتنا مجمع ہے ترے چاہنے والوں کا یہاں

آرزو ممکن ہے، شرحِ آرزو ممکن نہیں — التماسِ اب یک والہانہ گفتگو ممکن نہیں
ہائے ہائے کر رہے ہیں اور کی خاطر صوفیا — خانقہ کی اس فضا میں ہائے ہو ممکن نہیں

چھڑا کے قید سے پریوں کو لاؤں کیسے نجیبؔ — اڑیں پہاڑ تو پہلے، زمیں جلے تو سہی

کچھ وفا کی باس، کچھ بوئے جفا کس میں نہیں — ایک دنیا دیکھ لینے کی ہوا کس میں نہیں
وہ سراسر مہر ہے، اخلاص ہے، تہذیب ہے — کچھ اگر اس میں انا ہے تو انا کس میں نہیں
خوش نصیبی سے ہوا یوں وارثِ سوزِ حسینؑ — ورنہ ماتم کے لیے اک کربلا کس میں نہیں

مجھ میں کیا ہے، مری چادر میں ہیں کتنے موسم — تو بھی مانندِ کفِ خاک، اٹھے تو دیکھے
علم کتنا ہے گراں، روح کی قیمت کیا ہے — کوئی بازار میں ہر روز بکے تو دیکھے

سر پہ رکھ دیتا وہ اک تاج تو مارے جلتے — کم نہیں اس کا کرم، خاک بہ سر رہنے دیا
ایسا دشمن تھا کہ ہر خواب کو پامال کیا — نور سب کھینچ لیا، دیدۂ تر رہنے دیا

کیا مسائل تھے زمانے کے جو دنیا نے حسنؔ — چھین کر ذہنِ رسا، کاسۂ سر رہنے دیا

میرے کام آئی دعائے شب، نہ جوشِ بندگی — حادثے جتنے بھی ہونے تھے وہ آخر ہو گئے

میں سمجھا تھا جسے اک افسرِ دربار دوست — آ کے زنداں میں کھلا وہ شخص کس دفتر میں ہے

اگر اڑان ہو اونچی تو بحرِ اعظم بھی — ہرا بھرا سا جزیرہ دکھائی دیتا ہے
وہ شخص جس کو لطیفے ہیں سینکڑوں ازبر — ہنسے تو اور فسردہ دکھائی دیتا ہے
میں اپنی روح میں اس کو بسا چکا اتنا — اب اس کا حسن بھی پردہ دکھائی دیتا ہے

میں غزل کا حرفِ امکاں، مثنوی کا خواب ہوں — اپنی سب روداد لکھنے کے لیے بیتاب ہوں
میں ببولوں کی طرح پھولا پھلا ہوں دشت میں — ابر آئے یا نہ آئے، میں سدا شاداب ہوں

کیا سمجھ کے مجھ سے الجھے ہیں حسن لیل و نہار ______ آپ اپنا روز و شب ہوں، آپ عالم تاب ہوں

مدت ہوئی غزلوں سے گیا شورِ گلستاں     اب حرفِ غزل نوکِ سناں موجۂ خوں ہے

اشکوں میں کہاں ڈوب گیا غم کا سمندر     لفظوں میں سما کہاں گم وہ مرا سوزِ دروں ہے

مختصر گوئی بھی اک حسن ثنا خوانی ہے ______ کیا ضروری ہے حسن ایک جریدہ لکھوں

دل وہ کشتِ آرزو تھا جس کی پیمائش نہ کی     سیرِ دنیا کے سوا ہم نے کوئی خواہش نہ کی

اس نے جو بھی روپ دھارا اس نے جو بھی دکھا دیا ______ آدمی بننے کی ہم نے اس سے فرمائش نہ کی

یہ ہنر کا بھی ستارا ہے نہایت منحوس ______ ہم کسے غیر بتائیں کسے اپنا سمجھیں

رکھنے کا جو گوہر تھا اسے دل میں رکھ لیا     بکنے کا تھا جو مال، کتابوں کو دے دیا

اپنے لہو کی بوند بنا کر دمِ نشاط ______ اک سوزِ لازوال شرابوں کو دے دیا

موسم سیلاب آیا، ندی نالے بھر گیا     بے وطن سا اک پرندہ اڑ کے واپس گھر گیا

کیسی کالی رات بیتی، کیسا کالا دن چڑھا ______ جو بگولوں سے لڑا تھا، وہ صبا سے ڈر گیا

وحشت سرا سے ذہن میں وہ بھی تھا اجنبی ______ دل میں رہا مقیم تو اپنے مکاں میں تھا

تہذیبِ قتل گاہ نے اتنا سکھا دیا ______ مرنا کہاں کمال ہے، جینا ہے فن کہاں

دل کہ اب ہے جسم کا بے آب سا گوشہ نعیم ______ چاند کا آئینہ خانہ، بادلوں کا گھر بھی تھا

مجھے بھی ابر کسی کوہ پر گنوا دیتا     میں بچ گیا کہ سمندر کا میں خزانہ تھا

پتا چلا یہ ہواؤں کو سر پٹکنے پر ______ میں ریگِ دشت نہ تھا، سنگِ صد زمانہ تھا

کچھ خطوطِ دست میں تھا، کچھ کتابِ نجم میں     جو نہ ہونا تھا وہ اپنے پاس تھا لکھا ہوا

اس کی اپنی طولِ عمری کس قدر بے کیف تھی     وہ مرا تو کن دھنوں میں رات بھر باجا بجا

جب ہوا میں رقص کرتی جا رہی تھی اک پتنگ ______ جانے کس کے دل کا ٹکڑا چھت سے گر کر مر گیا

سُنے گا ہند تو اس سے کہوں گا دردِ وفا     مرے جنوں سے غرض کیا عراق و شام کو اب

عجیب پیار سے اس نے حسن کہا تھا نعیم ______ میں کس طرح سے بھلاؤں گا اپنے نام کو اب

کھڑا ہوا ہوں مثالِ گیاہ طوفاں میں     کوئی درخت نہیں ہوں کہ وہ گرا دے گا

یہی ہجوم جو گھر کو جلانے آیا ہے ______ لگا کے آگ مجھے تمغۂ وفا دے گا

ایک دریا پار کر کے آ گیا ہوں اس کے پاس ____ ایک صحرا کے سوا اب درمیاں کوئی نہیں

شبیہ ماہ لیے آسماں سے اترا ہے    جدھر بھی جاؤں وہی دل نواز چہرہ ہے
جو تم ملو تو یہ دنیا ہے آبشار و چمن    ملو نہ تم تو یہ دنیا سراب و صحرا ہے
نہ گفتگو، نہ عنایت، نہ کوئی رغبتِ جہاں    سرائے دل میں عجب شخص آ کے ٹھہرا ہے
گذر ہی جائے گی آفات کی گھٹا بھی حسنؔ ____ حیات خود ہی گھڑی دو گھڑی کا لہرا ہے

ایک دنیا میں اپنے اندر ہوں    اس قفس کی فضا سے باہر ہوں
حاصلِ صد سفر ہے بے تابی    پہلے دریا تھا، اب سمندر ہوں
خس کی مانند بے نوا، بے بس    ہر ہوائے سبک سے بے گھر ہوں
سر سے پا تک لہو ٹپکتا ہے    آپ اپنی انا کا منظر ہوں
بہرِ عبرت ہے یہ جنم میرا    اگلے وقتوں کا میں پیمبر ہوں
رشکِ عرفی تھا میں حسنؔ آگے ____ اس زمانے میں سب سے کمتر ہوں

شعر کے قالب میں کچھ سوزِ دروں رہ جائے گا ____ جتنا آنکھوں سے بہے گا، اتنا خوں رہ جائے گا

جلتا ہوں بے گناہ میں دنیا کی آگ میں ____ اب کے حیات مانگ تو دنیا سے دوں نہ مانگ

جس نے بھی جانا عشق کو تفریح خوش رہا ____ سنجیدہ ہو کے ہم تو نہایت دکھی رہے

اک کوہ سربلند پہ تنہا کھلا جو پھول ____ سورج سے وہ نہ آنکھ لڑائے تو کیا کرے

کیا خبر تجھ کو ہوا، نقش قدم سے تیرے ____ کتنے قدموں کے نشاں خاک میں مل جاتے ہیں

اپنے ہی رُخ سے بند ہوئے راستے تمام ____ بیدل کی ایک چال سے بے چال ہو گئے
اشعار اپنے پاس تھے کاغذ کے روپ میں    ناشر نے جب چھپوا تو زر و مال ہو گئے

سیر فلک سے خون کی گردش بڑھی تو ہے    تھکنے لگے تھے پانو زمیں پر کھڑے کھڑے
ہم کو بھی اے بگولو! سوئے دشت لے چلو ____ ہم خاک ہو چلے ہیں، گلی میں پڑے پڑے

یہ کائنات ہی اس کی ہے، کوہ و دریا کیا    میں ایک کنج میں دھونی رما کے بیٹھا ہوں
میں جس کی کھوج میں سب کچھ لٹا کے نکلا تھا ____ اسی کو جوشِ جنوں میں گنوا کے بیٹھا ہوں

لڑا، تو لشکرِ سلطاں سے جم کے میداں میں    بلا سے مجلسِ خوباں میں بے وفا ٹھہرا

فرازِ کوہ سے آواز دو تو آؤں بھی — میں ہر مہم میں طلب کی شکستہ پا ٹھہرا
بدل کے بھیس میں آتا رہا ہوں دنیا میں — تمہیں بتاؤ، میں تم سے کہاں جدا ٹھہرا
مری بھی ایک صفت ہے شہابِ ثاقب میں — سیاہ شب میں وہی شعلۂ نوا ٹھہرا
لکھو گے کیسے حسنؔ خود کو صرف تم زیدی — تمہارا سارے شہیدوں سے سلسلہ ٹھہرا

جبرِ شہی کا صرف بغاوت علاج ہے — اپنا ازل سے ایک حسینی مزاج ہے
آگے تو زہر عشق میں سب زہر بجھے گھلے — اب شاعری کی جان رگِ احتجاج ہے
کیا دی ہے لب کشائی کی قیمت اسے بھی دیکھ — اس دفترِ نوا میں سبھی اندراج ہے
اقبالؔ کی نوا سے مشرف ہے گو نعیمؔ — اردو کے سر پہ میرؔ کی غزلوں کا تاج ہے

جو تشنہ کاموں کو ساتھ لے کر تلاشِ آبِ رواں میں نکلا — سمندروں سے سوا ہے گہرا، وہ پربتوں سے کہیں بڑا ہے
ہزار پہلو سے دیکھتا ہے وہ اپنے شیشے میں آدمی کو — جو اس کو تھوڑا بھی جانتا ہے وہ ایک دنیا کو جانتا ہے

غم نہیں مسکن احساس جو ٹھہرا ہے دماغ — دل کے ساغر میں سواخوں کے بھرا ہی کیا تھا
کیا ٹھہرتا کوئی صحرائے تمنا میں حسنؔ — برگِ ماضی کے سوا اس میں دھرا ہی کیا تھا

ہجر، اک یاد کی خوشبو میں ہے بستے رہنا — وصل، اک تازہ گلستاں سے شناسائی ہے

اپنی صفوں میں علم ہے جرأت ہے، وقت ہے — ایسا نہیں کہ سچ کا مقدر شکست ہے
تنکے تمام چن کے بیائیں، اڑی چلیں — ان جھاڑیوں کے بعد سہانا درخت ہے
اپنے جنوں کے دوست ہیں سورج بھی، چاند بھی — مانا حسنؔ نعیمؔ ابھی دھوپ سخت ہے

جہاں پہ ایک بھی ٹیلا نظر نہ آتا تھا — وہاں سے لوگ اٹھا کر پہاڑ لائے ہیں
کٹے ہیں پانو تو ہاتھوں کے بل چلے برسوں — مثالِ موج ترے ہم کنار آئے ہیں

ان سے بچھڑے تو مؤذن کی صدا بھول گئے — جس کو پڑھتے تھے دمِ شب وہ دعا بھول گئے
پتے پتے کی رہی موج صبا سے یاری — پھول کب شاخ سے ہوتا ہے جدا بھول گئے

پانو سے لگ کے کھڑی ہے یہ غریب الوطنی — اس کو سمجھاؤ کہ ہم اپنے وطن آئے ہیں
ہم لہو روئے ہیں برسوں تو کھلی زلف خیال — یوں نہ اس ناگ کو لہرانے کے فن آئے ہیں
نگاہیں دیکھ لیتی ہیں جہاں رہیں درد کے چشمے — وہ چہرہ ڈوب جاتا ہے نعیمؔ آنسو بہانے میں

کرو نہ دفن کہ مقتل کا نام اونچا ہو ______ لٹادو خاک پہ لاشے کو قبلہ رو کر کے

جب تک شعورِ عشق ہے، پاسِ جمال ہے     زندانِ آرزو سے نکلنا محال ہے
ہر لمحہ اضطراب ہے، ہر لحظہ انتشار ______ دل کا وہی ہے حال جو دنیا کا حال ہے

کوئی تنہا نہیں دنیا میں بجز دردِ وفا ______ اس کے ہمدم ترے آنسو، نہ مری کوہ کنی

کوئی جیسے نوکِ سناں سا لیے شب روز سر پہ کھڑا رہا ______ ہے اذیتوں کے شمار میں یہ اذیتوں کا ہراس بھی

اک مغنی کا وہ گھر تھا جس سے اٹھتا ہے دھواں     جس جگہ یہ مدرسہ ہے حسن کا بازار تھا
سر جھکا لینے سے ٹل جاتیں ہزاروں آفتیں ______ سارے ہنگامے کا باعث اپنا ہی کردار تھا

جاگے تمام عمر کہ ہر سو نگاہ تھی     دنیا مرے حبیب کی آرام گاہ تھی
یاروں کو ہر طرح کا تحفظ عزیز تھا ______ ہم نے چنی وہ راہ جو مردوں کی راہ تھی

نہ وہ ملا، نہ کوئی آرزو ہے اب اس کی ______ مری طلب کو بہر حال رائگاں کہیے

ان وفاؤں کے صلے میں کچھ جفا بھی چاہیے     مجھکو جینے کے لیے تازہ ہوا بھی چاہیے
اس جہانِ آرزو میں زندہ رہنے کے لیے ______ آدمی کو مہرباں سا اک خدا بھی چاہیے

خیال و خواب نے افلاک سے قریں رکھا     زمیں کی سمت بھی لوٹے تو بس ہوائیں لیے

______

غزل تھی سب کی نوا، بسکہ نام میرا تھا     یہ مے نوازشِ دوراں تھی، جام میرا تھا
مری ہی ضد نے کیا بادباں کو چاک مگر ______ بھنور سے بچ کے نکلنا بھی کام میرا تھا

شورِ دریا نہ سنو، کتبۂ ساحل کو پڑھو     ہر سخن کا یہ تقاضا ہے مرے دل کو پڑھو
اس خبرگاہ میں اک دفترِ حیرت ہے وہی     قیمتِ علم لگانی ہے تو جاہل کو پڑھو
کتنے اوراق کھلیں منصف و شاہد کے لیے     قتل ثابت ہے مگر صورتِ قاتل کو پڑھو
ایک طرزِ خطِ کوفی میں ہے وہ سب سے جدا ______ آنکھیں روشن ہوں جو اس زہرہ شمائل کو پڑھو

پوچھتی تھی کہ شبِ وصل کا پیغام ملا     سو گئے خواب کی بانہوں میں جو آرام ملا
ڈھونڈتے رہے شب و روز امیدوں کے قدم     کوچۂ زیست میں لے دے کے یہی کام ملا
پا پیادہ تھا مگر راہ میں وہ دھوم مچی     جھک کے تعظیم سے شہزادۂ ایام ملا
ہم نے بیچی نہیں جس روز متاعِ غیرت ______ اک پیالہ بھی نہ مے کا ہمیں اس شام ملا

سارے جہاں کی سیر کا امکان مل گیا ____ بوئے چمن کو راہ میں طوفان مل گیا

روح کا لمبا سفر ہے ایک بھی انساں کا قرب   میں چلا۔ برسوں تو ان تک جسم کا سایہ گیا
گیا بساط خار و خس تھی پھر بھی یوں شب بھر جلے ____ دوش پر بادِ سحر کے دور تک شعلہ گیا

یہ دل کہ قصبۂ گم نام سے مشابہ تھا ____ ترے قدم سے ہے معروف شہر کی مانند

اب تو آجاؤ کہ ہم نے کاٹ لی قیدِ انا   انتظار روشنی میں اپنا دیدہ بھر چلا
کس طرح اب باندھیے گا عشق کے مضموں نعیم ____ یاں وصال یار بھی ہے "اقتصادی مسئلہ"

خواب کی راہ میں آئے نہ درو بام کبھی   اس مسافر نے اٹھایا نہیں آرام کبھی
لے صبا میں بھی تھا آشفتہ سروں میں یکتا ____ پوچھنا دلّی کی گلیوں سے مرا نام کبھی

اٹھائے منت صرصر کہ ناز۔ بادِ نسیم   ہر ایک حال میں صحرا شکار ہے تنہا
چہل پہل ہے بہت یوں تو میکدے میں نعیم ____ میانِ جام و سبو شیشہ دار ہے تنہا

سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں یہ رات ____ نہیں ہے شرط کہ مجھکو شریک خواب بنا

کوئی وجہ غم نہیں ہے کسی بات کا ہے غم بھی   اسی درد گم شدہ سے کبھی رو دیے ہیں ہم بھی
وہی طالب ضیا ہو جو اٹھائے ناز ظلمت ____ وہی بوئے سحر لے جو سنوارے شام غم بھی

شاید کہ مثل مہر کوئی آئے صبح دم ____ شام فراق تم بھی جگر کو لہو کرو

جوئے رواں کے پاس ہے سویا ہوا کوئی   جھولی میں زادِ راہ نہ منزل کی گرد ہے
حیراں ہے برگ سبز جو سائے میں اس کے آج ____ گم صم کھڑا ہوا کوئی صحرا نورد ہے

پیکر ناز پہ جب موج حیا چلتی تھی   قریۂ جاں میں محبت کی ہوا چلتی تھی
ان کے کوچے سے گزرتا تھا اٹھائے ہوئے سر ____ جذبۂ عشق کے ہم راہ انا چلتی تھی

دل میں اترو گے تو اک جوئے وفا پاؤ گے   موج در موج سمندر کا پتا پاؤ گے
میں تو کھو جاؤں گا تنہائی کے جنگل میں کہیں ____ تم بھرے گھر میں کہاں مجھکو بھلا پاؤ گے

جل کے ہم راکھ ہوئے ہیں کہ بنے ہیں کندن   جوہری بن کے کسی شخص نے پرکھا ہی نہیں
گرد شہرت کو بھی دامن سے لپٹنے نہ دیا ____ کوئی احسان زمانے کا اٹھایا ہی نہیں

تونے خزانہ دیکھ کے سر کیوں جھکا لیا ____ رہتا ہے سربلند جہاں شیش ناگ بھی

میرے قدموں کے نشاں راہ سے کچھ دور بھی     تم سے میں اب دور نہیں ہوں، مجھے آواز تو دو

یہی رشتۂ درد کا کم نہیں کہ شکایتوں میں سکوں ملے     صفِ دل براں کا وہ تاج ور، مری گفتگو سے خفا تو ہے

گلِ سایہ بن کے جیا تو ہے کوئی زن کے یورشِ نور میں     کوئی صحنِ شب میں تمام شب، رخِ یار بن کے جلا تو ہے

کوئی دشت مہرباں ہو تو سفر آسان ہے     ورنہ ہر پتھر ہے بھاری، ہر کنواں ویران ہے

مژدۂ صبح بیاں ہے، میری غزلوں کا ظہور     لمسِ معنی، بوسۂ شعلہ رخاں سے کم نہیں

ایک طوفاں ساحلوں سے دور رکھتا ہے مجھے     اس سفر میں تارِ دامن بادباں سے کم نہیں

اک دوسرے کو دیکھ کے حسرت سے رہ گئے     دونوں کے ارد گرد روایت کا جال تھا

ہر سخن سے گرم تر ہے سینۂ مہر و خلوص     بے ہنر لوگوں کو سینے سے لگا کر دیکھیے

دل میں نہ جانے کیا رہا، مثلِ شرارِ جستجو     جوشِ طلب کے وقت بھی، ترکِ طلب کے بعد بھی

تجھکو بتائیں کیا صبا، ہم نے جلایا کیوں چراغ     آمدِ خور کے باوجود، رخصتِ شب کے بعد بھی

سر میں اگر جنوں نہ ہو ملتا نہیں ہے تاجِ فن     فکر و نظر کے باوجود، نام و نسب کے بعد بھی

بامِ خورشید سے اترے کہ نہ اترے کوئی صبح     خیمۂ شب میں بہت دیر سے کہرام تو ہے

اتنا دلِ نعیم کو ویراں نہ کر حجاز     روئے گی موجِ گنگ جو اس تک خبر گئی

یہ کشتیاں، یہ ہوائیں، یہ بادباں سب ہیچ     افق کے پار کوئی اور ہی اتارے گا

کچھ قربتوں میں لطف تو کچھ دوریوں میں ہے     یاروں سے رہ قریب بھی، یاروں سے بھاگ بھی

کہاں میں، ہجرت کے مرحلوں میں اٹھائے پھرتا غمِ مکاں کو
خلا سے رشتہ جڑا تو دیکھا نہ مڑ کے ساحل نہ بادیاں کو
ملا نہ کوئی جو ہم نفس ہو سکوت جنگل میں ہم قدم ہو
کہیں تو لیکن ہے کوئی ایسا جو آس دیتا ہے قلبِ جاں کو

کتنے برسوں میں لہو آنکھ سے ٹپکا شب بھر     قرض تھا مجھ پہ بہت کاسۂ دل داری کا

میں نے الزام کی تردید میں حق گوئی کی     نام اونچا نہ ہوا مجھ سے رواداری کا

کوئی پہاڑ نہیں تھا جو ہم نے سر نہ کیا     ملے وہ خواب کہ آرام عمر بھر نہ کیا

یہ کیوں ہوا کہ سدا اجنبی دلوں میں بسے     اسی کا دل تھا حسن جس میں تم نے گھر نہ کیا

بس یہی فکر کرو جلتی ہے آتشِ فن ______ آتشِ رشک سے محفل میں دھواں ہے تو ہے

نہ میرے خواب کو بکھرا، نہ خدوخال دیا    بہت دیا تو مجھے موقعِ وصال دیا
ملا نہ روح نہ دل کا کوئی حساب مگر    یہ کارِ زیست کسی طور سے سنبھال دیا
مرے عیوب کی تصویر اس طرح کھینچی ______ مرے ہنر کو پس پشت اس نے ڈال دیا

قصیدہ تجھ سے، غزل تجھ سے، مرثیہ تجھ سے    ہر ایک حرف ہوا صاحبِ نوا تجھ سے
زباں کشائیِ غم سے کھلی کتابِ خیال    ورق ورق پہ کھلا برگِ مدعا تجھ سے
زمیں سے پھوٹ پڑا چشمۂ جنوں ساماں    گلوں میں سرد پڑی آتش قبا تجھ سے
کہاں سے زود فراموشیوں کی خو سیکھی    جو دیکھیے تو نہ تھی برق آشنا تجھ سے
پہنچ تو جاتا سرِ خیمۂ وفا آباد ______ مگر ہے سست قدم عمرِ تیز پا تجھ سے

قصبۂ و شہر میں ہے آگ کا طوفاں برپا    کون سی شاخ پہ چڑھ کر یہ نظارا دیکھوں
کوچہ ویراں ہے ستوں سوچ رہا ہے کب سے    کیا دھرا ہے جو مکینوں کا میں رستا دیکھوں
مجھ کو ہر رنگ میں وہ شخص بھلا لگتا تھا ______ اس کو غم دیدہ و خاموش کہ ہنستا دیکھوں

قطرۂ مے سے دبا رات نہ طوفانِ طلب    مجھ پہ کیا بیت گئی رات سنا تو ہوگا
یہ بھی تسلیم کہ تو مجھ سے بچھڑ کے خوش ہے ______ تیرے آنچل کا کوئی تار ہنسا تو ہوگا

میرا محبوب ہے وہ شخص جو چاہے تو نعیم ______ سوکھی ڈالی کو بھی گلشن میں بدل سکتا ہے

پتا نہیں کہ وہ چہرے کا رنگ تھا، کیا تھا    ہو بچھڑ کے جینے کا ڈھنگ تھا، کیا تھا
نکل پڑی ہے مری روح کیوں برہنہ پا    لباسِ عشق بہت دل پہ تنگ تھا، کیا تھا
پڑی ہے خاک پہ اک لاش تو چلو دیکھیں    یہ اپنے ملک کا باسی ملنگ تھا، کیا تھا
نعیم کتنے چمن اور کھل اٹھے دل میں ______ وصالِ یار ہی خوشبو تھا، رنگ تھا، کیا تھا

مکتوبِ یار ہوتا تو حرف حرف پڑھتے    تحریرِ وقت پڑھ لی، ہم نے اِدھر اُدھر سے
جیسے ہی شام آئی، جوڑا بطوں کا اترا ______ جس پیڑ کے تلے تھا، اک شخص دوپہر سے

کیسے بتائیں کہ غم کے صحرا کو خلدِ دانش بنایا کیسے ______ کہاں سے آبِ رواں کو موڑا کہاں سے بادِ بہار لائے

ڈھونڈو تو صرف آنچ ہے، شعلہ کہیں نہیں    جلتا ہے دل کہ غم کا سراپا کہیں نہیں

شاعر کا ہے وہ خواب، رسولوں کی آرزو
تم جس کو ڈھونڈتے ہو، وہ دنیا کہیں نہیں

سامان صد چمن تھا اٹھائے ہوئے نسیم
وہ کاروانِ ابر جو اترا کہیں نہیں

میں کس ورق کو چھپاؤں، دکھاؤں کون سا باب
کسی حبیب نے مانگی ہے زندگی کی کتاب

گیا تھا دشت سے اٹھ کر سمندروں کی طرف
وہاں بھی تشنہ نصیبی، وہاں بھی مرگ سراب

رکھیے بچا کے اپنا دفینہ حسن نعیم
غم کو لٹائیے نہ زر و مال کی طرح

اب خدا جانے تجھے بھی ہے تعلق کہ نہیں
لوگ لیتے ہیں مرا نام ترے نام کے بعد

دشت پیمائی ہے میری عہد حاضر کا جنوں
بن چکے ہیں مجھ سے پہلے میرے قدموں کے نشاں

کتنے اشکوں کے دیے جلتے رہے، بجھتے رہے
یوں بظاہر چین سے میں رات بھر سوتا رہا

سچ تو یہ ہے کہ ابھی دل کو سکوں ہے لیکن
اپنے آوارہ خیالات سے جی ڈرتا ہے

اتنا رویا ہوں غم یار ذرا سا ہنس کر
مسکراتے ہوئے لمحات سے جی ڈرتا ہے

جو بھی کہنا ہے کہو صاف شکایت ہی سہی
ان اشارات و کنایات سے جی ڈرتا ہے

وہاں یقین کہ خود ہی کہیں گے حرف جنوں
یہاں یہ فکر فضا سازگار ہو تو کہیں

●●

# اجتبیٰ رضوی (وفات: ۲۶ر فروری ۱۹۹۱ء)

نام :۔ سید اجتبیٰ حسین رضوی، تخلص :۔ رضوی (ابتدائی تخلص شاعری میں مجتبیٰ)، والد کا نام : سید اظہر حسین

وطن :۔ چھپرہ، ولادت :۔ ۱۹۰۸ء چھپرہ، ابتدائی تعلیم :۔ گھر پر ہوئی۔

اصولی تعلیم :۔ ۱۹۲۳ء :۔ راجپوت ہائی اسکول چھپرہ، ۱۹۲۵ء میٹریکولیشن، ۱۹۲۷ء آئی اے ۱۹۲۹ء بی۔ اے (ٹی این بی کالج، موجودہ لنگٹ سنگھ کالج، مظفرپور)، ۱۹۳۸ء :۔ ایم اے (فارسی)، پٹنہ یونیورسٹی

زندگی کے اہم واقعات :۔ ۱۹۲۶ء :۔ بڑے بھائی سید مجتبیٰ حسن کا ارتحال (دریائے [illegible] میں ڈوب کر)، ۱۹۳۰ء :۔ والد ماجد کا انتقال، ۳۰۔۱۹۲۹ء ضلع اسکول چھپرہ میں عارضی ملازمت، ۳۱۔۱۹۳۰ء :۔ مدرسہ سلیمانیہ میں عارضی ملازمت، ۱۹۳۱ء :۔ شادی، ۱۹۳۳ء :۔ لڑکی کی ولادت، ۱۹۳۵ء :۔ لڑکے کی ولادت، ۱۸ر ستمبر ۱۹۳۶ء :۔ اہلیہ کا انتقال، ۱۹۳۷ء :۔ قیام کلکتہ۔ صحافت۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحبتوں میں شرکت معریات کے مطالعے میں، ۳۹۔۱۹۳۸ء :۔ راجندر کالج میں لکچرر (تقرری) اور تھیوسوفیکل سوسائٹی میں شمولیت ۱۹۴۴ء (اواخر) :۔ ترک دنیا۔ گیا کی پہاڑی کے کسی غار میں طویل مراقبہ یا اعتکاف، ۱۹۴۵ء (اوائل) اعتکاف سے واپسی، ۱۹۵۴ء :۔ "شعلۂ ندا" کی اشاعت، ۱۹۵۷ء :۔ لڑکی کی شادی، ۱۹۶۰ء :۔ ملت کالج کی پرنسپلی، ۱۹۶۵ء :۔ کالج کی عظیم الشان عمارت کی تیاری اور اس میں کالج کا منتقل ہونا، ۷۲۔۱۹۷۱ء :۔ حج و زیارت ۷۳۔۱۹۷۲ء :۔ ۱۹۳۴ء کے زلزلے سے مجروح شدہ ذاتی مسجد کی تعمیر جدید، ۱۹۷۵ء :۔ ال۔ان متھلا یونیورسٹی میں پرو وائس چانسلر، ۱۹۷۷ء :۔ یونیورسٹی کے عہدے سے سبکدوشی۔

مشاغل :۔ مطالعہ، تصویر کشی، باغبانی، تدریس۔ شوق :۔ فلسفہ، معریات، روحانیات، مذہبیات، والہیات، ادب (شاعری)، فن تعمیر، موسیقی۔ موجودہ قیام اور مشغلہ :۔ اپنے لڑکے مرتضیٰ اظہر رضوی، ریڈر و صدر شعبۂ مابعد الطبعیات و منطق و فلسفہ۔ ملت کالج کے ساتھ دربھنگہ میں قیام اور ان کی ذہنی و فکری تربیت، پوتوں کی ناز برداری۔

## انتخابِ کلام

جہاں میں حاجت روا محبت تو حسن اک نقشِ مدعا ہے
مصورِ عشق رنگ بھر دے تو حسن ہے حسن ورنہ کیا ہے

حاصلِ سعیِ موجِ رنگ دیکھیے لالہ زار میں
گل ہی سے آگ لگ چلی پیرہنِ بہار میں

مدعیانِ ہوش و خرد سب دھارے پر بہتے ہی گئے　　آپ کا جب دیوانہ آیا وقت کا دھارا موڑ چلا

---

آگ سے کھیلی آگ میں ڈالے آگ ہے سو سب آگ میں تپائے　　ہم نے نہ کی تھی شوخ لگا ہی آپ نے کیوں عالم کو جلایا

---

ہم پہ شریعت ہم پہ طریقت ہم پہ حدودِ فکر و نظر　　آپ چلے تو گلشن گلشن صحرا صحرا آپ ہوئے

---

جل نہیں سکتا جو پروانہ بزم سے ٹل ہی جاتا ہے　　رشتۂ شمع تو جلتے جلتے آخر جل ہی جاتا ہے

---

قیس کے بعد تو خاک اڑنے لگی تھی [illegible]　　مجھ سے ویران نہ دیکھا گیا ویرانے کو

---

سرِ شوریدہ کو بالیں تو مل جائے　　بلا سے بتکدے کا آستاں ہے

---

ایک دن زندوں نے مسجد میں نماز آکے پڑھی　　دوسرے دن اسے میخانہ بنا کر چھوڑا

---

فردوس کا وہ گوشہ ہی سہی، ساقی کا جگر گوشہ ہی سہی　　لیکن نہ بھرا ساغر جس سے اس مینا کو مینا نہ کہو

---

مانا کہ سلیقہ جینے کا آتا بھی نہ ہو نادانوں کو　　یہ دشتِ جنوں آباد تو ہے، اللہ رکھے دیوانوں کو

---

سب پہ طاری ہولِ قیامت اور خوشی دیوانوں کو　　یا رب اس نے حال تو پوچھا ہم سے پریشاں حالوں کا

---

سمیٹ لیتے بیک سجدہ کائناتِ شہود　　بقدرِ حسرتِ دل وسعتِ جبیں نہ ہوئی

---

چکائے قرض اپنا مجھ سے لے قدرت کے سوداگر　　کہ اس سینے میں اک دل باقی ہے، اس گردن پہ سر باقی

---

بازار میں آکر ناداں دل منظر کے کھلونوں پر مچلا　　اور پیرِ خرد کو کاندھے پر انبارِ نظر ڈھونا ہی پڑا

ہم تخمِ محبت جنت سے سینے میں چُرا کر لے آئے　　اس ریت میں کیا اُگتا وہ بھلا! ہاں لائے تھے بونا ہی پڑا

---

خدا پرستی کا بیج بو کر خودی کا دل میں فروغ دیکھو　　یہیں سے چھوٹے خدا اُگے ہیں، بڑی خطرناک یہ زمیں ہے

فغاں کہ یہ رسمِ جبہہ سائی نہیں بہ مقدارِ ذوقِ سجدہ　　وہ کاش دل تک اتر کے رہتا جو داغ آسودۂ جبیں ہے

---

جس راہ میں پیچ و خم نہیں ہے　　اس راہ میں کیوں حرم نہیں ہے

سجدہ ہے کرشمۂ تصور　　مت کہہ کہ خدا صنم نہیں ہے

---

طلب کی ذلت و بیچارگی، معاذ اللہ　　مری خودی کا تشنج ہے یہ دعا کیا ہے

ہم اٹھ کھڑے ہوئے دنیا سے جھاڑ کر دامن　　کہ ان بجھے ہوئے ذرات میں دھرا کیا ہے

---

روا ہے کیا تری دنیا میں، ناروا کیا ہے　　مجھے بتا کہ "یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے"

یہ اتحادِ طبیعت یہ اختلافِ مزاج　　یہ طرفہ کاریِ رفتارِ ارتقا کیا ہے

حیات جس کو کہیں اک جنونِ گرم روی　　یہ کیوں ہے، اس کی غرض اس کا مدعا کیا ہے

اس دل کا تحیر تھا آئینہ اس سر کا تصور تھا موقلم  تمثال پہ نقطے لگا کئے تصویر بدلتی چلی گئی
اک حد میں شریعت کہی گئی اک حد میں طریقت کہی گئی  انسان جو چلتا چلا گیا رفتار بدلتی چلی گئی

---

قدم سے دور جبیں رہنِ سنگِ در ہو گی  فغاں کہ بیکسیٔ سجدہ مشتہر ہو گی
طوافِ پردہ گہِ آرزوئے نامشہود  بہت ہوئی تو یہی قسمتِ نظر ہو گی

---

جہاں ہے سرسبز کشتِ ارماں اجاڑ صحرا وہاں رہے گا  ادھر کو جو بہہ رہی تھیں نہریں اب ان کے رخ موڑے جا رہے ہیں
یہ رسمِ میخانہ کیا ہے آخر کوئی تو پیرِ مغاں سے پوچھے  جو گل بنائے گئے تھے کوزے وہ آج کیوں توڑے جا رہے ہیں

---

تکمیلِ زندگی کو جنوں کا ہے انتظار  اب تک خرد حریفِ مشیت نہ ہو سکی
قطرے کے دل کی ہوک پہ قلزم نہیں بڑا  میری امید اس کی مشیت نہ ہو سکی

---

بساطِ بزمِ مے سے کم نہیں ہے کوئے دلداری  سنبھل کر پاؤں رکھیے ہر قدم اک آبگینہ ہے
ابھی تو دل کے ٹکڑے جمع کرنے سے نہیں فرصت  گریباں کی ہزاروں دھجیاں ہیں جن کو سینا ہے

---

حریمِ جلوہ کچھ اپنی خبر ہے؟  نظر کا رخ کدھر تھا اب کدھر ہے؟
کلی کا مسکرانا دیکھ لے دیر  بہت گہرا یہ طنزِ مختصر ہے

---

اب سب کی زباں سے سن لیجے خلوت کا بیاں جلوت کا بیاں  اُف کیا کیا راز نہ فاش کیے آغوشِ جنوں کے پالوں نے
اس دل کو راہِ محبت میں جس جس نے پایا لوٹ لیا  اک تم ہی نہیں سب نے یہ کیا خاروں نے گلوں نے لالوں نے

---

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سارا طلسمِ ہست و بود  اک جنونِ ادعا ہے مدعا کوئی نہیں
دیدۂ بیدار نے توڑا طلسمِ آرزو  جلوہ گاہِ ناز میں میرے سوا کوئی نہیں

---

مجبور نگاہیں تکتی ہیں قدرت کے تماشے ہوتے ہیں  بنتا ہے کوئی مٹتا ہے کوئی دس ہنستے ہیں سو روتے ہیں
ہر سمت سے خطرہ ہے دل کو مانگے نہ کوئی چھینے نہ کوئی  مفت ایک پرانی پونجی کو ہم رستے رستے ڈھوتے ہیں

---

ہے اک انتشار سکوں میں بھی سر و پا کا ہوش جنوں میں بھی  کہیں بارِ منتِ سنگ ہے کہیں دامِ لذتِ خار ہے
جسے ڈھونڈتے ہو وہ میہماں کہیں اور اٹھ کے چلا گیا  جو سرائے کہنہ میں رہ گیا ہے وہ کہنگی کا غبار ہے
یہ نقوشِ رنگ جو دل میں ہیں گل و لالہ ان کو سمجھ نہ تو  جو بہار تھی وہ گزر گئی جو رہا وہ داغِ بہار ہے
ہے کشادہ وسعتِ دو جہاں مگر اے مکانِ لامکاں  جو یہی احاطۂ جستجو ہے تو جستجو کا فشار ہے
بہمہ جمود و فتادگی ہے تمام دشت میں کھلبلی  دلِ رہ نوردِ جرس میں آشنا یہ بتا تو کس کی پکار ہے

تمہاری گر جستجو نہ کرتے تو ہم جہاں تھے وہیں پہ تم تھے
ہم اپنی منزل سے بڑھ گئے ہیں برا ہو اس ذوقِ جستجو کا

طلب کے صحرا کا ذرہ ذرہ ہے خندہ زن سعیِ رائگاں پر
سلا دے اب اے نسیمِ غفلت کہ تھک گیا پاؤں جستجو کا

مری محبت کی انتہا تھی مرے تخیل کی بت تراشی
بکھر گئی آرزو کی پونجی طلسم ٹوٹا جو رنگ و بو کا

---

ڈھونڈ لیتے تجھے ہم ہمتِ مرداں کی قسم
قید ہیں وسعتِ محدودِ بیاباں کی قسم

سرحدِ ظن میں مت جا کہ ہیں طوفانِ شکوک
حد میں رہ مجھ کو چراغِ تہِ داماں کی قسم

آج اگر بچ گئی رضوی تو یہ کل ٹوٹے گی
مہرِ خم کیا ہے؟ لبِ توبۂ رنداں کی قسم

---

احساس کا یہ نغمہ اب چھیڑو تو نالہ پیدا ہوتا ہے
موجود ہیں وہ سب تار جو تھے بس ایک نہیں ہے ٹوٹ گیا

ہم روتے ہیں اپنے پیاروں کو اور فطرت ہم سے کہتی ہے
اب اور کھلونوں سے کھیلو جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا

ہاں سن کہ تجھے تھی ہم سے غرض محتاجِ نظر تھا حسن ترا
رکھی رہی شانِ استغنا آخر کو یہ بھانڈا پھوٹ گیا

---

دل ہے اور خود نگری ذوقِ دعا جس کو کہیں
بے خودی چاہیے ہم کو کہ خدا جس کو کہیں

ہے ترے کیسۂ پندار میں ایسی کوئی چیز؟
دل کی بے تابِ محبت کا صلہ جس کو کہیں

تم سے رضوی کئی منزل ہے زمانہ پیچھے
راہرو اس کو کہو راہنما جس کو کہیں

---

ادھر بھی تھی نظر ہی جب تو بھلا ارمانِ تماشا کیا کرتے
ذرے کے جگر تک جا نہ سکے ہم ہمتِ صحرا کیا کرتے

رات اس نے نقاب الٹی جو ذرا سب بندِ تعین ٹوٹ گئے
وہ وہ نہ رہا ہم ہم نہ رہے اے شوق تماشا کیا کرتے

تم نے ہی چمن کو لوٹ لیا تم نے ہی نشیمن پھونک دیا
ہم شکر کی ہمت کر نہ سکے شرما گئے شکوہ کیا کرتے

---

جلووں سے نہ آنکھ جھپکتی ہے جلووں کو نہ آنکھ ترستی ہے
ہم نے وہ پیالہ پی ہی لیا جس میں نہ خمار نہ مستی ہے

کچھ لمحے ہیں جن لمحوں میں احساس اسے چھو لیتا ہے
عالم سے ادھر جو عالم ہے ہستی سے ادھر جو ہستی ہے

ہے رونے کی حالت کندن کی جتنا ہی تپے گا نکھرے گا
غم ایک کسوٹی ہے جس پر یہ فطرت ہم کو کستی ہے

---

چھیڑا ہی کیوں ہوائے رہِ کوئے یار نے
اندھیر کر دیا مری وحشت غبار نے

افسردگی بھی حسن ہے تابندگی بھی حسن
ہم کو خزاں نے تم کو سنوارا بہار نے

اس دل کو شوقِ دید میں تڑپا کے کر دیا
کیا استوار وعدۂ نا استوار نے

جلوے کی بھیک دے کے وہ ہنسنے لگے تھے خود
دامن پکڑ لیا نگہِ اعتبار نے

گیسو غبارِ راہِ تمنا سے اٹ نہ جائیں
صحرا میں آپ نکلے ہیں ہم کو پکارنے

دونوں جہاں کی ساری پونجی بار ہوئی جن ناقوں پر    مرد گدا کے ہاتھ میں کیونکر ان ناقوں کی مہاریں آئیں
تیرے فقیر کو رستا چلتے عزت و ذلت میں الجھانے    مندر سے پوجائیں دوڑیں مسجد سے پھٹکاریں آئیں
گوشۂ عرش کا بوسہ لینے دہر سے اُٹھ کر ساری باریں    کافر کی فریادیں آئیں غازی کی للکاریں آئیں

نامہرباں بنے تھے، مگر مہرباں رہے    چھپ چھپ کے خود وہ رہنے لگے ہم جہاں رہے
میرا دلِ گرفتہ علائق ہے اک سوال    یعنی جو پھول شاخ سے ٹوٹے کہاں رہے
اف! یہ درازدستیٔ ارمانِ مشتِ خاک    محمل میں گرد پڑتی ہے لیلیٰ کہاں رہے

ہائے اس کالبدِ خاک سے پیوندِ حیات    کس طرح ملتی ہے، کس طرح جدا ہوتی ہے
کوئی اُس راہروِ غربت کی خبر لا دیتا    آہ جو دل سے نکلتی ہے وہ کیا ہوتی ہے
اک عجب عالمِ آئینہ ہے سیمائے شہود    کہ جہاں ایک نظر لاکھ ادا ہوتی ہے

دریائے بے کنار کا ساحل بنا دیا    اب جستجو کو شوق کے قابل بنا دیا
صحرائے جستجو میں فریبِ نگاہ نے    اپنے غبارِ شوق کو محمل بنا دیا
جو وسعتیں سما نہ سکیں کائنات میں    ان کو سمو سمو کے مرا دل بنا دیا

اسی امید پہ تھی لغزشِ رنداں ساقی    تھام لے گا کوئی گرتے ہوئے بازو اپنا
تند و سرشور و تنک طبع یہ فطرت جس سے    ان کو ارماں کہ نکالیں کوئی پہلو اپنا
ہم تو آشفتہ سری سے نہ سنورنے پائے    آپ سے کیوں نہ سنوارا گیا گیسو اپنا

سب اپنی آنکھ کا آنسو کسی کو سونپ کر آئی    نگاہِ واپسیں اک زندگی کا قرض بھر آئی
تجلی نے کیا شرمندہ اُس کو اہلِ ہمت سے    حقیقت کیوں جھکی اتنی کہ تا حدِ نظر آئی
یہ کیسا ماجرا ہے ہر مصورِ نقشِ حیرت ہے    تری تصویر جب کھینچی مری تصویر اتر آئی

سکوتِ منظر کے زیرِ دامن بہت سے طوفان پل رہے ہیں    حباب ہے آرزوئے ساحل ہوا چلی اور حباب ٹوٹا
ادائے تعمیر کہہ رہی ہے جفائے تخریب کا فسانہ    بہت سے تارے چھٹک کے نکلے کہیں کوئی آفتاب ٹوٹا
ہم اور میخانے کی امانت وہاں پہنچ جائے دل سلامت    خدا نہ کردہ جو اپنے ہاتھوں یہ شیشۂ لاجواب ٹوٹا
نظر نہیں ہے تو کون دیکھے حجاب کیسا نقاب کیسی    ادھر کھلی اپنی چشمِ بینا ادھر طلسمِ نقاب ٹوٹا
کسی کی رعنائیوں کو برہم کیا مری شوخیٔ نظر نے    تجلیاں تلملا کے نکلیں جلال آیا حجاب ٹوٹا

زباں سے دل کا فسانہ ادا کیا نہ گیا ۔۔۔ یہ ترجماں تو بنی تھی مگر بنا نہ گیا
ہم ان کے وعدۂ فردا کو لیکے بیٹھے ہیں ۔۔۔ کہ جن سے آج کا وعدہ وفا کیا نہ گیا
دمِ اخیر وہ دینے لگے حیات دگر ۔۔۔ پھر ایک عمر کا احسان اٹھایا نہ گیا

---

زندگی نغمۂ بیداریِ احساس بھی ہے ۔۔۔ اور وہ لوری بھی ہے جو دل کو سلا دیتی ہے
کارواں فکر کا ہے منزلِ آخر پہ تو کیا ۔۔۔ زندگی منزلِ اول سے صدا دیتی ہے
بات بگڑے کہ بنے یہ مری بے تابیٔ شوق ۔۔۔ تیری آواز سے آواز ملا دیتی ہے

---

نمودِ بیکری صحرا میں ہے صرف اک نشاں میرا ۔۔۔ غبارِ کارواں ہوں دور نکلا کارواں میرا
رسائیٔ مرگِ شوق، افتادگی ننگِ تن آسانی ۔۔۔ بلا کی کشمکش ہے اور غبارِ ناتواں میرا
مجھے گھبرا کے دوشِ ہستیٔ جاوید پر پھینکا ۔۔۔ کوئی دم بھی نہ اٹھا موت سے بارِ گراں میرا
چمن سے اک طرف ہوں نخلِ بے برگِ تمنا پر ۔۔۔ ارے او برق آ رہ گم کردہ یہ ہے آشیاں میرا

---

چرانے کو چرا لایا میں جلوے روئے روشن سے ۔۔۔ مگر اب بجلیاں لپٹی ہوئی ہیں دل کے دامن سے
تنوع کچھ تو ہوا بلبلِ کم ذوق، ماتم کیا ۔۔۔ اگر تعمیرِ صحرا ہو گئی تخریبِ گلشن سے
مجھے کچھ تجربے ہر رنگ کے جھولی میں رکھ چلنا ۔۔۔ مسافر ہوں غرض کیا ہے مجھے صحرا و گلشن سے
مذاقِ جذبِ باطن گم ہے اب تزئینِ ظاہر میں ۔۔۔ یہ طفلِ دشتِ ایمن گھٹ گیا تہذیبِ گلشن سے

---

بخشی ہیں اس خودی کو پئے امتحانِ ظرف ۔۔۔ پروردگاریاں مرے پروردگار نے
کب سے کیا ہے باندھ کے احرامِ بے خودی ۔۔۔ میرا طواف گردشِ لیل و نہار نے
ہمت پہ میری پیار سے اُمڈا ہے قلب بحر ۔۔۔ دھوئے ہیں پاؤں گریۂ ابرِ بہار نے
صحنِ مجاز میں بہ ہزاراں ہزار ناز ۔۔۔ کھیلی ہے مجھ سے آنکھ مچولی بہار نے
چندیں ہزار عالمِ آشفتگی بہ دوش ۔۔۔ اترا ہے ناز خود مرے گیسو سنوارنے
اس جام دل کو اپنی ہتھیلی پہ لے کے خود ۔۔۔ چھلکا دیا ہے ساقیٔ کوثر نثار نے
رشکِ دوئی سے وسعتِ آغوش کر کے تنگ ۔۔۔ بھینچا ہے مجھ کو وحدتِ کثرت شکار نے
میں کافرِ مجاز پرست حق آشنا ۔۔۔ سمجھا کہاں کہاں سے صدا دی ہے یار نے
دیوانہ وار کفر کو ایماں کئے ہوئے ۔۔۔ دوڑا تو ساتھ چھوڑ دیا اعتبار نے

کچھ بات تو کرتا چل اے مانجھی تو ہی اک سہارا ہے — اب کتنی دور کنارا ہے؟ اب کتنی دور کنارا ہے؟
وہ کون ہے جس کو ظلم تمہارا پیار سے اپنے پیارا ہے — یہ عاشق اپنے شوق کے ہیں سب عاشق کون تمہارا ہے
جب تک نہ حریم ناز سے تم درویش کی کٹیا میں اترو — ہم تم کو پکارے جائیں گے جب ہم نے تم کو پکارا ہے
ہے شام جھما جھم تاروں سے ، ہے صبح جھکا جھک کرنوں سے — یہ کس نے بال سنوارے ہیں؟ یہ کس نے روپ نکھارا ہے

---

برباد یہاں ناموس نظر اے دیدۂ بینا کون کرے — اقرار تماشا کون کرے ، انکار تماشا کون کرے
ہم کو نہ ہو گریہ دربدری تو خدمتِ صحرا کون کرے — بکھرے نہ کرن تو ذرّوں کو سورج کا شناسا کون کرے
پردیسی جلووں کی خاطر یہ آگ کا سودا کون کرے — جو نشتِ خسِ صحرا نے کیا ، ہی سے وہ سا کھا کون کرے
اس حرص و ہوس کے میلے میں ہم جنسِ محبت لائے ہیں — سب سستے مال کے گاہک ہیں یہ مہنگا سودا کون کرے

---

خرد کی تیرگی میں آپ کا جلوہ بس ایسا تھا — کہ آدھی رات کو جیسے یکایک صبح ہو جائے
یونہی تاریخِ فطرت میں ہیں تحریکاتِ روحانی — کہ مستِ خواب کوئی چونک کر پھر جیسے سو جائے
وہی ریگ درشتِ دہر میں لالے اگاتا ہے — جو دل کے خون سے سینچے زمیں اور جان بو جائے
ادھر رکتا ہے خامہ کاتبِ تقدیر کا چل کر — ادھر یہ اپنا تیور ہے کہ جو ہونا ہے ہو جائے

---

حسن کو دی گئی سحیا عشق کو آن دی گئی — تم سے نہ دل لیا گیا ہم سے تو جان دی گئی
دشت نے الحذر کہا موجِ ہوا نے الحفیظ — بخشش قہر الاماں! خاک کو جان دی گئی
پچھلے پہر مزار پر آ کے نقاب الٹ گئے — چادرِ نرمِ ماہتاب قبر پہ تان دی گئی
وعدہ دید روزِ حشر سنتے ہیں تو نے کر لیا — تجھ سے بھلا غرورِ ناز کیسے زبان دی گئی

---

تماشا آسماں تک ہے ، تصور آستاں تک ہے — مگر شوقِ دلِ بے تاب کیا جانے کہاں تک ہے
دلِ نازاں کی گرمی سینۂ ہندوستاں تک ہے — کہاں بھڑکے تھے شعلے اور بے تابی کہاں تک ہے
سنا ہے کاروانِ آرزو اب آستاں تک ہے — ہوائے شوق! میری خاکِ سرگرداں کہاں تک ہے؟
بھرے گا کون رنگِ خونِ دل نقشِ حقیقت میں — تمہاری داستاں بھی بس ہماری داستاں تک ہے
انڈیلے جائے مینا گداز جلوہ اے ساقی — کہ ضبطِ تندیِ صہبا اسی رطلِ گراں تک ہے
صلہ بے تابیوں کا مل گیا میں نے یہ خود دیکھا — کہ میرے دل کی دھڑکن اس دلِ نامہرباں تک ہے
تماشا اور تحیر میں کوئی نسبت نہیں رضوی — کہ وہ ہے آستاں تک یہ خدا جانے کہاں تک ہے

ہر مذہب بے روح جسد ہے جذبے کی قلاشی ہے — راکھ کے تودے پوجتے ہیں، یہ کعبہ ہے وہ کاشی ہے
شرع کی قیل و قال سنی، افسانہ وجد و حال سنا — ذہن کی وہ عیاشی ہے اور روح کی یہ عیاشی ہے
دل مردہ مفلوج ہیں روحیں کون جلے اور کون جلائے — اس ٹھنڈے ماحول میں بھی شوق کی اخگر پاشی ہے
صانع قدرت تیرے قلم کا کیا کہنا لیکن یہ بتا — نقش بنانا نقش مٹانا یہ کیسی نقاشی ہے

---

اور پھر کون سی اب ہوگی ملاقات کی رات — بھیگی بھیگی یہ گنہگار سی برسات کی رات
گھومتے کٹتا ہے کوچے میں ترے دن کا دن — بیٹھے کٹ جاتی ہے چوکھٹ پہ تری رات کی رات
یوں ہیں برہم تری گھنگھور گھٹا سی زلفیں — جیسے بکھری ہوئی بپھری ہوئی ظلمات کی رات
ایسی آباد تری بزم ہے اے جانِ نشاط — جیسے کعبہ کی سحر جیسی خرابات کی رات

---

نہیں سہی مرے نالوں میں کچھ اثر نہ سہی — نظر کچھ آپ کی بے چین ہے ادھر نہ سہی
ہم الجھنوں میں پڑے عقل تار سلا کر — وہ عیش بے خبری خوب تھا خبر نہ سہی
ادا فروشیِ بازار طور اور حضور! — خبر یہی تو ہے مشہور معتبر نہ سہی
فدا ہو تاب بشارت مری بصیرت پر — نظر نے چن تو لیا طاقتِ نظر نہ سہی

---

کعبہ نہیں ہوا کہ کلیسا نہیں ہوا — دل آپ کے طفیل میں کیا کیا نہیں ہوا
اف وہ قمار خانۂ روزِ ازل کی دھوم — جیتے ہیں وہاں، مگر اچھا نہیں ہوا
اس کی شگفتگی کو نئی فصل چاہئے — دل ہے وہ فتنہ جو ابھی برپا نہیں ہوا
تحلیل ہو گیا نگہِ آفتاب میں — وہ ذرہ حقیر جو صحرا نہیں ہوا

---

خار کچھ پھول سے کم اے چمن ایجاد نہیں — کہ خلش دل کے لیے لطف ہے بیداد نہیں
نغمہ و نالہ باندازۂ تاثیر اے دل — ہے ابھی خام وہ آہنگ جو فریاد نہیں
آپ کا گھر جسے انسان کا دل کہتے ہیں — کون کہتا ہے کہ آباد ہے، آباد نہیں
ہم کو کہتے ہیں جو آلودۂ لذت طلبی — کیا وہ آلودۂ صد لذت ایجاد نہیں
گھونگھٹ الٹو کہ تمہیں پوج کے کافر ہو جائے — دلِ بدبخت جو ایمان سے بھی شاد نہیں
پیچ در پیچ ہے زنجیر نظام صحرا — ایک ذرہ بھی یہاں ذرۂ آزاد نہیں
فارغِ کشمکشِ سود و زیاں ہوں رضوی — عاشقی کیا ہے اگر گنج خداداد نہیں

دلوں کو آ کے دیکھ لو یقیں نہیں گماں ہو تم
لبِ فسانہ ساز پر برائے داستاں ہو تم

غبار بن کے آرزو رواں دواں ہے کو بہ کو
کہیں سے کچھ صدا تو دو کہاں ہو تم کہاں ہو تم

رہِ درازِ زندگی میں رہرووں کی خیر ہو
کہ ناقہ بد قدم ہے اور شریر سارباں ہو تم

جبیں نے کھینچ تو لیا تمہیں ضمیرِ سنگ سے
ہجومِ سجدہ کی قسم مگر ابھی نہاں ہو تم

زبانِ گل و گیاہ کی ہے شکوہ سنج بے دلی
یہی تمہارا باغ ہے اسی کے باغباں ہو تم

---

نکل چلی بن کے اک بگولا ہجومِ گردِ بیاں سے آگے
جو گرد تھی کارواں سے پیچھے وہ بڑھ گئی کارواں سے آگے

ٹھہر ٹھہر شوقِ لاابالی چلا کہاں آستاں سے آگے
یہیں ہے اک محشرِ تماشا نہ جانے کیا ہو یہاں سے آگے

نمودِ بے اختیارِ ہستی خود اپنی قسمت سے بے خبر ہے
کہ منزلِ کارواں ہے اب تک تخیلِ کارواں سے آگے

پکارتی رہ گئی حقیقت پڑا رہا جستجو کا صحرا
ٹھہر گئے ہم خدا کی مسجد بنا کے دیرِ بتاں سے آگے

سکونِ مطلق کہاں کہ ہم نے ٹھہر کے منزل پہ بھی یہ دیکھا
کہ گردِ آشفتگی رواں ہے حریمِ آسودگاں سے آگے

---

جنوں کی کون سی بیتابیاں جہاں میں نہیں
وہ ہوک صوتِ جرس میں ہے جو اذاں میں نہیں

ازل سے دل میں مشیت کے چبھ رہا ہوگا
وہ راز جو ابھی تقدیرِ رازداں میں نہیں

عجب نہیں کہ وہی اک ہو مردِ راہ شناس
ابھی جو رہروِ گم گشتہ کارواں میں نہیں

ہمارے خوف کی خلاقیاں خدا کی پناہ
وہ بجلیاں ہیں نظر میں جو آسماں میں نہیں

لکھا ہوا انہی ذرات کے صحیفوں میں
مرا فسانہ ہے لیکن مری زباں میں نہیں

---

یہ نہ پوچھ مجھ سے کہ کیا ہوا رہِ جستجوئے دراز میں
دلِ پاش پاش کو دیکھ لے جو پڑا ہے کوئے نیاز میں

تری پرستشوں کی بھی چھیڑ سے ترا شکوہ لب پہ نہ آ سکا
کہ بہت رچی ہوئی گونج ہے یہ سکوتِ سینۂ ساز میں

مجھے مل گئی پسِ دشت و در ہمہ گیر و محکم و مستتر
وہ خود آگہی جو تڑپ رہی تھی حریمِ ناز و نیاز میں

مے جلوہ ڈھال بھی ساقیا تجھے فکرِ شیشہ نہیں روا
کہ ہے جانِ شیشہ لگی ہوئی اسی آبِ شیشہ گداز میں

وہ فسانۂ سرِ رہ گذر سرِ حشر مجھ سے نہ پوچھئے
جو گزر گئی سو گزر گئی خم و پیچ راہِ مجاز میں

کوئی انقلاب مگر ہے پھر بہ نصیبِ کوچۂ عاشقاں
کہ میں پڑھ رہا ہوں نئے فسوں تری چشمِ فتنہ طراز میں

جو شہود سے ہے لطیف تر کہیں گم نہ ہو وہ شہود میں
کہ مشاہدوں سے ہے رنگ ابھی نگہِ مشاہدہ باز میں

یہ کرشمے چند جو بچ گئے وہ بنے ہیں فتنۂ آرزو
جو پگھل گئے سو پگھل گئے نگہِ کرشمہ گداز میں

کیوں ہیں طوفاں کی زد میں حرم و دیر و کنشت
ان مزاروں پہ تو مدت سے چراغاں بھی نہیں

کس نے اس انجمنِ شوق کو تاراج کیا
دل گزرگاہِ خیالاتِ پریشاں بھی نہیں

جلوہ آبادِ تصور یہ ادا کاریٔ شوق
اب تو مرہونِ فسوں سازیِ جاناں بھی نہیں

کائنات اپنی ہمیں دے کے بھی فارغ نہیں آپ
ہم تو کچھ مدعیِ وسعتِ داماں بھی نہیں

کب سے میخانے میں رضوی کی نہیں آیا ہے نظر
اس خزاں دوست کو کچھ شرمِ بہاراں بھی نہیں

---

زاہد کی آستین ٹٹول، دیکھ کہاں صنم نہیں
سنگِ سیاہ ناگزیر، ورنہ حرم حرم نہیں

محنتِ شوق و خودسری شیوۂ سعیِ ناتمام
مجھ پہ کرم نہ کر کہ میں گدیہ گرِ کرم نہیں

گم بھی تو ہو کہ جستجو لطفِ حیات بن سکے
اہلِ طلب وہ راہ کیا جس میں کہ پیچ و خم نہیں

وجہِ گناہ و کفر و شر وجہ خرابیٔ نظر
تم کو گماں کہ تم نہیں ہم کو یقیں کہ ہم نہیں

شانۂ فکرِ خردہ گیر! حسن کی یوں رگیں نہ توڑ
تجھ میں مزاج دانیٔ گیسوئے خم بہ خم نہیں

فتنے جگا کے دہر میں آگ لگا کے شہر میں
جا کے الگ کھڑے ہوئے کہنے لگے کہ ہم نہیں

---

حدیں پھیلیں نظر کی پھر بھی کم بینی نہیں جاتی
کہ ہر صورت ابھی اک آنکھ سے دیکھی نہیں جاتی

زمینِ دل بہت کچھ نرم کر دی بے قراری نے
مگر "ہم ہیں" اسی احساس کی سختی نہیں جاتی

حیاتِ جامہ زیب اور تو بہ تو جامے مگر کیا ہے؟
کہ اس برباد ساماں کی تنک رختی نہیں جاتی

مرا ذکرِ وفا لکھ کر مورخ یہ بھی لکھتا ہے
یہ اک رسمِ کہن تھی اب کہیں برتی نہیں جاتی

میں کیا منھ لے کے آؤں آپ کے آئینہ خانے میں
یہ صورت ایسی بگڑی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی

تصور سے بھی آگے جستجو کی راہ جاتی ہے
وہاں کی بات لیکن پھر یہاں لائی نہیں جاتی

---

جبیں پہ اُس در کا پیار بھی ہے، اگرچہ اس گھر کا بار بھی ہے
ادھر کے جھکتے نہیں تقاضے، اُدھر سے پیہم پکار بھی ہے

چڑھا کے پی تھی مئے جوانی غضب تھا شیریں وہ شورہ پانی
اسی کا دو دن سرور بھی تھا، اسی کا اب تک خمار بھی ہے

یہ راہِ دور و دراز مجھ کو دکھاتی لائی یہی تماشا
قدم قدم اجتماع بھی ہے نفس نفس انتشار بھی ہے

ہمارے ان کے بس اک محبت خدائی کیا بندگی کہاں کی
بہت ہی نازک ہے گو یہ رشتہ مگر یہی استوار بھی ہے

وہ سوزنِ فکر جس نے اک دن یہ رختِ تہذیب سی دیا تھا
اسی کی کاوش سے آج دیکھو یہ پیرہن تار تار بھی ہے

نہیں فقط باؤلی نگاہیں، ظہور خود ہے خرامِ مستی
سکونِ محمل نشیں کا دشمن یہ ناقۂ بے مہار بھی ہے

نگار خانے میں مہر و مہ کے بہت بھیانک ہے نقشِ آدم
بلا کا سرکش، ازل کا باغی، مگر یہی شاہکار بھی ہے

دلِ محرم کا دکھ اس چشمِ نامحرم سے پہچانا
یہیں سے بات جب پھوٹی تو اک عالم نے پہچانا

انھیں ہونا تھا رسوا ہو چکے تا حدِّ رسوائی
نہ اُس عالم نے پہچانا نہ اِس عالم نے پہچانا

نگاہِ مہر یکساں سب پہ تھی مبہم سا تیور تھا
یہ ذرے دیکھتے ہی رہ گئے شبنم نے پہچانا

دلِ آدم ہی اک سرچشمۂ رحمت ہے عالم میں
یہ رازِ آسودگی بھولی ہوئی تھی غم نے پہچانا

یہ کبر و ناز اب کیا جب سرِ بازار تم نکلے
مگر ہاں یہ کہو بہتوں نے دیکھا کم نے پہچانا

ملک محوِ تجلی، مطمئن رمزِ تجلی تھا
کہ یہ مٹی کا پتلا اُٹھ کے بولا "ہم نے پہچانا"

تجھے کس کس طرح اے نقطۂ مایوسیِ بینش
دلِ بیتاب کی بیتابیٔ پیہم نے پہچانا

تری غیرت کو آخر کیا ہوا اے نازِ خود بینی
ہے اک غوغا کہ تجھ کو عقلِ نامحرم نے پہچانا

اب اس آئینے سے آئینے روشن ہوتے جاتے ہیں
تمھیں جب دل نے پہچانا تو اک عالم نے پہچانا

---

فغاں جو بیگانۂ طپش ہے وہ روشناسِ اثر بھی ہوگی؟
شجر سے جو شاخ کٹ چکی ہے وہ کیا کبھی بارور بھی ہوگی

ظہورِ کامل نہیں ہے اب تک تری تجلی ہے اور غیرت
وہ پردہ پوشِ چمن رہی ہے وہ پردہ دارِ نظر بھی ہوگی

یہ فطرتِ آرزو ہے اوچھی تم اس پہ کرتے ہو کیا بھروسا
تمہارے جلوے کی جو امیں ہے وہی نظر پردہ در بھی ہوگی

جو نقطۂ نیستی سے باہر نکل چکی وہ نئی تجلی
یقین مانو کہ اک نہ اک دن نصیبِ شمس و قمر بھی ہوگی

حذر کریں مجھ سے اہلِ خلوت کہ میں اب اک شعلۂ نوا ہوں
جو لَوِ چراغِ حرم ہے اب تک وہ مشعلِ رہ گزر بھی ہوگی

یہی مقامات ہیں سفر کے انھیں کوئی کیا بدل سکے گا
جسے پہنچنا ہے ان کے در تک وہ آرزو دربدر بھی ہوگی

یہ وہ رشتۂ سوزِ پاکِ جاناں دلوں کی پونجی بھی بن سکے گا؟
ازل سے جو رائگاں ہے اب تک وہ ضربِ غم کارگر بھی ہوگی

بشر کا یزداں جمال ہونا تجلیٔ لازوال ہونا
بہت ہی دشوار یہ مہم ہے مگر کسی روز سر بھی ہوگی

شعاعیں کچھ نرم و گرم رضوئی ہمارے دل پر ٹپک رہی ہیں
ابھی تو گویا سحر ہوئی ہے چڑھے گا دن، دوپہر بھی ہوگی

---

خرد کو خانۂ دل کا نگہباں کر دیا ہم نے
یہ گھر آباد ہوتا اس کو ویراں کر دیا ہم نے

گھٹے جاتے تھے تم مینائے قلبِ اہلِ خلوت میں
تمھیں جامِ کفِ صحرا نشیناں کر دیا ہم نے

انیسِ خوابگاں تم تھے، جلیسِ خانگاں تم تھے
مگر تم کو نصیبِ کم نصیباں کر دیا ہم نے

حریمِ ناز سے تم کو چرا لانے کے مجرم ہیں
یہ صحرا تھا اسے بھی کوئے جاناں کر دیا ہم نے

زمیں خاکسترِ یک شعلہ و یم آبِ یک گریہ
یہی وہ آب و گل ہے جس کو انساں کر دیا ہم نے

# اقبال

بخط اقبال



اقبال کی تحریریں بعض دوسرے اکابر کی تحریروں کی طرح جب مدوّن کر کے پیش کی جاتی ہیں تو کئی بار دیکھنے میں آیا ہے کہ مجلات میں یا خط واضح نہ ہونے کے سبب یا ۔ پڑھنے میں (پوری طرح) نہ آنے کے باعث کچھ کی کچھ ہو جاتی ہیں ۔ اقبال بخطِ اقبال کی پیشکش کا یہی مقصد ہے کہ ہر اسکالر براہ راست اصل تک پہنچ کے خود دیکھ سکے کیا چیز کیا ہے ۔ پہلی تحریر مشہور محقق اور ہمارے کرم فرما ایرج افشار کا تحفہ ہے ۔ یہ محمود افشار کی کتاب گفتار ادبی جلد دوم [illegible] پر موجود ہے ۔ دوسری تحریر پاکستان کے درجۂ اول کے پرچے طلوع افکار سے ماخوذ ہے اور تیسری کتاب نعمت ۔ آخرالذکر کی اصل خدا بخش میں محفوظ ہے

ادارہ

## دکتر محمد اقبال لاهوری

در سال ۱۳۱۴ هـ ش (۱۹۳۶م) که به بمبئی و (اگره) رفته بودم قصد رفتن به لاهور نیز داشتم کـه دکتر محمد اقبال لاهوری شاعر فارسی زبان هندی را که در آنجا سکونت داشت به بینم، ولی موفق نشدم. بوسیله دکترمحمد اسحاق استادزبان فارسی‌دانشگاه کلکته کتبأ بهم معرفی شده بـودیم. نامـه‌ای به انگلیسی بـمن نوشته، دعوتم کرده وکتاب (پیام مشرق) حاوی اشعار خودرا برای من فرستاده بود. با اظهار تشکر اشعار زیر راگفتم و فرستادم. عین نامه او که بخط خودش میباشد، بواسطه شخصیت مهم ادبی، اجتماعی و سیاسی وی کلیشه میشود. تعجب نکنید که به‌انگلیسی نگاشته با اینکه به‌فارسی شعر میگفته است. نامـه‌های پرفسور اسحاق هم تمام به‌انگلیسی میباشد. عجب‌تر آنکه پرفسور براون انگلیسی با من به‌فارسی مکاتبـه میکرد. یك نامه او هم بـرای ملاحظه خط و انشای‌فارسی وی کلیشه میشود. اسحاق و اقبال، یکی هنـدی و دیگری پاکستانـی، از کشورهـای «استعمارزده» میباشند وبراون از یك‌کشور آزاد. اینست نشانه‌آزادی واسارت.

اندیشه داشتم چو ز هندوستان روم
سوغاتی سفر چه بر دوستان برم
(اقبال) روی کرد و فراز آمد از درم
گلهای نوظهور که زی بوستان برم.
نغمه‌سرا شوند همه بلبلان پارس
زین نغز چامه‌ها که ز هندوستان برم.

## ترجمه نامه دکتر محمد اقبال پاکستانی

۲۴ ژانویه ۳۶

### دکتر افشار عزیزم

هم‌اکنون نامه‌ای از آقای اسحاق از کلکته دریافت کردم مشعر براینکه شما برای گردش هندوستان در بمبئی هستید. بـرای صرفه‌جوئی در وقت بجای اینکه توسط ایشان به شما بنـویسم، اجازه میخواهم که مستقیماً این نامه را بنویسم. لازم بـه‌گفتن

نیست که من مسرور از ملاقات شما خواهم بود وقتی که از لاهور میگذرید. خواهشمندم بمن اطلاع دهید کی خواهید آمد. نظر باینکه من بزودی باید به (بهپال) بروم خیلی مایل هستم که تاریخ تقریبی مسافرت شما را به‌لاهور بدانم.

مخلص صمیمی شما محمد اقبال

Dr. Sir Mohd Iqbal, Kt.
M.A., Ph.D., LL.D.
Barrister-at-Law

Lahore

Dated

24th Jan. 1936

My dear Dr. Afschar,

I have just received a letter from M. Ishaque of Calcutta intimating that you are in Bombay on a visit to India. Instead of writing to you through him I take the liberty of doing so direct in order to save time. It is hardly necessary for me to say that I shall be delighted to meet you when you pass through Lahore. Please do let me know when you will be coming. As I shall have to go to Bhopal soon I should like very much to know the approximate date of your visit to Lahore.

Yours sincerely
Muhammad Iqbal

(بشکریه ایرج افشار، تهران)

بیتابی

به بحر رفتم و گفتم به موج بیتابی - همیشه در طلب استی چه مشکلی داری؟
هزار لؤلؤی لالاست در گریبانت - درون سینه چو من گوهر دلی داری؟
تپید و از لب ساحل رمید و هیچ نگفت

به کوه رفتم و پرسیدم این چه بیدردی است - رسد بگوش تو آه و فغان غمزدهٔ؟
اگر به سنگ تو لعلی ز قطرهٔ خون است - یکی در آ به سخن با من ستم زدهٔ
بخود خزید و نفس درکشید و هیچ نگفت

رهی دراز بریدم ز ماه پرسیدم - سفر نصیب! نصیب تو منزلی است که نیست؟
جهان ز پرتو سیمای تو سمن زار است - فروغ داغ تو از جلوهٔ دلی است که نیست؟
سوی ستاره رقیبانه دید و هیچ نگفت

شدم بحضرت یزدان گذشتم از مه و مهر - که در جهان تو یک ذره آشنایم نیست
جهان تهی ز دل و مشت خاک من همه دل - چمن خوش است ولی درخور نوایم نیست
تبسمے بلب او رسید و هیچ نگفت

محمد اقبالؒ

طلوع افکار (نومبر ۱۹۹۰ء) کے شکریہ کے ساتھ

Dr. Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M.A. Ph.D. LL.D.
Barrister-at-Law

Lahore

Dated __________ 193

30th Dec. 1934

My dear Haly Imam,
Here are the five verses. You can select one of the passages.

Yours sincerely
Muhammad Iqbal

(۱)

برون زین گنبد در بسته پیدا کرده‌ام راهے
که از اندیشه برتر می‌پرد آه سحرگاهے
به گلگون [illegible] نگنجد ز نیاز آسمان [illegible]
ز منزل دل نپذیرد گرچه باشد منزل ماهے!

(۲)

دل فرزانه دارم جسم و جان است
نپندارم اجل بر من گران است
چو شمع گر یک جهان گم شد ز چشمم
هنوز اندر ضمیرم صد جهان است!

(۳)

نگردد زندگی خسته از کار جهانگیری
جهانے در گره بستم جهان دیگرے پیش است!

(۴)

[illegible]

(۵)

[illegible]

(۶)

[illegible]

محمد اقبال

شائستہ خاں (کتاب نما نومبر ۱۹۸۹ء) کے شکریہ کے ساتھ

# ابوالکلام آزاد


- تقدیم اول ــــــــ محمود واجد
تقدیم ثانی ــــــــ پروفیسر وہاب اشرفی
- خطوطِ آزاد بخط آزاد بنام زکریا بھاگلپوری
ــــــــ ابوالکلام آزاد
- زکریا بھاگل پوری کے بارے میں
ــــــــ جناب محمود واجد
- کچھ اپنے کچھ مولانا آزاد کے بارے میں
ــــــــ زکریا بھاگلپوری
- دارالارشاد کلکتہ میں مولانا آزاد کا درس قرآن
ــــــــ زکریا بھاگلپوری



اقبال کی طرح آزاد بھی ہماری متاع گراں بہا ہیں۔ آزاد کے یہ خطوط حال ہی میں خدابخش کے ذخیرہ میں اضافہ ہوئے ہیں۔ پہلے ملک زکریا بھاگلپوری صاحب نے محمود واجد صاحب کو دیئے۔ انھوں نے کسی اور کو، کسی اور نے کسی اور کو، اور بالآخر وہاب اشرفی صاحب نے بکمال عنایت خدابخش کو! محمود واجد صاحب اور وہاب اشرفی صاحب نے ان خطوط اور مکتوب نگار کا سیر حاصل تعلف کرایا ہے۔ محمود صاحب نے مزید ایک تحفہ زکریا بھاگلپوری کے مرتبہ درس قرآن کے نوٹس بھی عنایت کیے ہیں جو ترجمان القرآن کے نقش اول کے طور سے دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ یہ خطوط ہمارے کرم فرما ابو سلمان شاہجہاں پوری نے کراچی سے شائع کردیے ہیں۔ اس ترتیب کا ابتدائی مسودہ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۰ء کے عرصہ میں تیار ہوا۔ کئی مراحل سے گزرا۔ اس کے بعض حصے ہندو پاک کے چند ادبی رسائل میں بھی آئے اور اب تیس پینتیس سال بعد مکمل شکل میں شائع ہونے کی نوبت آئی ہے۔ ہمارے ایڈیشن میں کچھ تعارف ناموں میں کمی بیشی کے ساتھ ایک اہم اضافہ یہ کر دیا گیا ہے کہ اصل خط بھی عکسا پیش کر دیے گئے ہیں۔

ـــــــــ ادارہ

# تقدیم اوّل

محمود واجد



یہ خطوط زیادہ تر ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۴ء کے درمیانی وقفہ کے ہیں۔ چند خطوط اس کے بعد کے ہیں مگر ان کی حیثیت ویسی تاریخی نہیں جیسی اس محدود وقت کی جسے میں نے ان خطوط کی مدد سے متعین کیا ہے۔ تاریخ کے ساتھ سال سبھی خطوط میں درج نہیں۔ اس لیے سلسلہ وار ان کی ترتیب ممکن نہ تھی مگر لفافہ پر ڈاک کی مہر سے کہیں کہیں تاریخیں ملیں اور کہیں ایک آدھ تفصیل اور اس سلسلہ کو ۲؍۱۰ مثلاً ۱۹۲۴ء کے سپرنٹنڈنٹ کے دستخط سنہ کی تاریخ وغیرہ۔ لیجیے جو کچھ ہے حاضر ہے۔

مسٹر صاحب کے قول کے مطابق خطوط کا ایک ذخیرہ مسٹر احمد محمد نور سابق وزیر حکومت بہار مطالعہ کے لیے لے گئے مگر واپس نہیں کیا۔

# تقدیم ثانی

پروفیسر وہاب اشرفی
شعبۂ اردو
رانچی یونیورسٹی، رانچی



اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد کے ان مکاتیب کا مطالعہ مقصود ہے، ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ یہ وہ خطوط ہیں جو مولانا آزاد نے رانچی سے اپنی نظربندی کے زمانے میں مولوی محمد ابراہیم زکریا متوطن بھاگلپور کے نام لکھے ہیں یہ تعداد میں ۲۴ ہیں۔ ۱۹ خطوط ملفوف بھیجے گئے ہیں اور ۵ پوسٹ کارڈ ہیں۔ ان خطوط کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ ان سے مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گہری روشنی پڑتی ہے ان کی دردمندی اور دلسوزی، غریب پروری کا نکتہ سنجی، علمی و دینی شغف اور اس معاملے میں کچھ کر گذرنے کی حکمت عملی تدبر اور متعینہ فکر، یہ سارے امور رانچی اور اس کے نواح سے متعلق مولانا کی مختلف علمی و دینی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے سے سامنے آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولوی محمد ذکریا کو مولانا آزاد بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کی علمی حیثیت سے آگاہ تھے۔ ان کی تنگ دستی سے ملول اور ان کی خدمت کرنے اور ان سے خدمت لینے کے باب میں خاصے متفکر تھے۔ مولانا مولوی زکریا کے نام ایک خط میں چھوٹا ناگپور خصوصاً رانچی کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"... چھوٹا ناگپور ڈویژن ایک وسیع خطہ ہے لیکن علم و ہدایت سے یکسر محروم، چونکہ ایک گوشے میں واقع ہے۔ اس لیے علما کی آمد و رفت بھی کمتر ہوئی اور جہل و افلاس نے اور زیادہ حالت خراب کر دی اب ادھر دو سال کے میرے قیام سے حالات متغیر ہوئے ہیں اور اللہ نے جس قدر توفیق دی دعوت و تبلیغ کا فرض ادا کرتا رہا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ... غیر مترقبہ زندگی پیدا ہو گئی اور لوگوں نے اپنی حالت کو محسوس کیا، اب شدید ضرورت یہاں اس کی ہے کہ ایک عالم صالح مستقل طور پر قیام کرے اور جو تبدیلی ہوئی ہے وہ آئندہ ضائع نہ جائے۔ اگر ایک شخص نے یہاں قیام کیا تو پورے خطے کی دینی پیشوائی و ریاست اسی کے ہاتھ میں رہے گی اور باطمینان مسلمانوں کے ایک گروہ عظیم کی ہدایت و ارشاد میں مشغول رہے گا۔ دوسرے مقامات میں علما سو کی کثرت اور دعا جلہ فساد و جہل کی مقاومت سے ہدایت و اصلاح کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے اور کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا، یہاں

یہ بات بالکل نہیں ہے اور ابتدا سے بنیاد صالح پڑ چکی ہے اور اب جتنی عمارت بنائی جائے اور جیسی بنائی جائے بن سکتی ہے۔

"پس ہدایت و دعوت کے عمومی پہلو سے تو ایک گروہ عظیم اتباع و اعتقاد کے لیے موجود ہے بلا شرکت غیرے"۔

واضح رہے کہ مولانا آزاد کی نظر مولوی محمد ذکریا پر بھی چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "آپ کمر ہمت چست باندھیں اور عزم راسخ کرکے اسی زندگی کے لیے طیار ہو جائیں آپ کے لیے بہترین موقع حاصل ہے"۔ بہر طور اہالیان رانچی اور نواح کی تعلیم غرض و غایت کے تحت مولانا نے ۱۵ اگست ۱۹۱۷ء کو انجمن اسلامیہ رانچی کی بنیاد ڈالی اور اس جد و جہد میں البلاغ پریس کی تمام رقم صرف کردی۔ مولانا نے اسی انجمن کے ذریعہ بہت کچھ کرنا چاہا تھا۔ ایک مثالی مدرسے کا قیام وقت کی ضرورت تھی ان کے پیش نظر ایک غیر معمولی نصاب کا خاکہ بھی تھا مولانا کیا سوچ رہے تھے دیکھیے:

"اب رہی دوسری چیز یعنی مشغلۂ درس و تدریس تو اس کا حال یہ ہے کہ جب انجمن اسلامیہ کی یہاں بنیاد ڈالی اور مدرسے کا خیال ہوا تو سوچا کہ اپنی قوت چھوٹے چھوٹے مقصدوں پر خرچ کرنا بہتر نہیں۔ آج عرصہ سے اصلاح نصاب کا مسئلہ مصر و ہند میں در پیش ہے اور عملاً طے نہیں ہوتا۔ اگر یہاں ایک کالج قائم ہو جائے اور اولین تجربہ پیش نظر نصاب اصلاح یافتہ کا کیا جائے تو یہ ایک عظیم الشان کام ہوگا"۔

مولانا آزاد سے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے اصلاح نصاب کے سلسلے میں ڈائرکٹر تعلیم بنگال نے رجوع کیا تھا۔ مولانا نے ایک جامع نصاب مرتب کیا تھا اس کی تفصیل وہ یوں درج کرتے ہیں:

"مدرسہ کا نصاب جونیر اور سینیر دو درجوں میں منقسم اور پوری مدت تعلیم چودہ سال ہے۔ پہلا درجہ آٹھ سال کا ہے۔ اس میں صرف و نحو عربی بالکل ختم، ادب شروع، فارسی مکمل ختم، حساب و ہندسہ ختم، ترجمۃ القرآن کامل، تاریخ ہند، تاریخ اسلام ۔۔۔ اور انگریزی ادب ہے۔ دوسرا درجہ چھ سال کا ہے اور تکمیل ادب مع تاریخ و اسلوب قدما، علوم القرآن، علوم حدیث، فقہ حنفی، فقہ جامع، اصول، توحید، علم اسرار الدین، علم اخلاق، تاریخ اسلام، تاریخ علوم عربیہ، تاریخ مذاہب طوائف اسلامیہ، معقولات قدیم ۔۔۔ اور انگریزی علم ادب ہے۔ اس کے بعد درجہ تکمیل کے دو سال کسی ایک فن یا صرف انگریزی میں"۔

مولانا اس نصاب کو صرف رانچی یا کلکتے کے مدرسے میں رائج نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کے سامنے پورا ہندستان اور مسلمان معاشرہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ایسا نصاب مرتب ہو کر تمام علاقے میں مقبول ہو جائے۔ وہ اس کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتے ہیں: "اب چونکہ یہ مدرسہ مسئلہ اصلاح تعلیم اسلامی پر مبنی ہے اس لیے صرف رانچی کا مقامی مسئلہ نہیں بلکہ تمام ہندوستان کا مسئلہ ہے"۔ افسوس اس کا ہے کہ مولانا کی قائم کردہ انجمن اور مدرسہ اسلامیہ زندہ تو ہیں

لیکن آب و تاب سے خالی ان کے نام پر انجمن ہی کی عمارت میں ایک کالج بھی ہے لیکن بے روح۔ مولانا کا مرتب کردہ نصاب موصوف کے خط کی زینت ہے اور بس! انجمن کے قیام کے بعد مولانا ایک وسیع پیمانے کی کانفرنس بھی کرنا چاہتے تھے جس کے لیے اشتہارات، دعوت نامے، پوسٹرس بڑی لگن اور محنت کے ساتھ تیار کیے تھے۔ اس ضمن میں ان کی بھاگ دوڑ، محنت اور کاوش کا اندازہ لگائیے۔ زکریا صاحب کو لکھتے ہیں:

"۱۔ جلسہ کے دعوتی خطوط اردو، انگریزی کارڈ، چسپاں کرنے کے پوسٹر رجسٹرڈ بھیجے جاتے ہیں۔ ۲۔ بھاگلپور میں جو لوگ ان چیزوں سے ذوق رکھنے والے ہوں ان کے نام حسب حال یا کارڈ یا خطوط پر لکھ کر بالمشافہ تقسیم کیجیے اور از جانب انجمن ترغیب شرکت جلسہ۔ اور اس امر پر زور دیجیے کہ یہ محض مقامی جلسہ نہیں بلکہ صوبے کا ایک عام تعلیمی اجتماع ہے۔۔۔ پوسٹر شہر کی مساجد و نمایاں مقامات پر چسپاں کرا دیے جائیں، ۳۔ اس کے بعد فوراً بانکی پور جائیے اور مسٹر مظہر الحق اور ڈاکٹر محمود بیرسٹر ایٹ لا سے ملیے۔۔۔ بانکی پور کے علاوہ دیگر مقامات کے نام بھی ان سے دریافت کیجیے۔۔۔ ۴۔ وہاں سے آپ گیا اور آرہ بھی جا سکتے ہیں، نیز مظفر پور اور مونگیر وغیرہ۔۔ مظفر پور میں مولوی ریاض احسن صاحب رئیس شہر ہیں ان سے مدد ملے گی ۵۔ ہر مقام پر گروہ علماء و تعلیم یافتہ دونوں کو دعوت دینی چاہیے۔ علماء پر ظاہر کرنا چاہیے کہ مدرسہ انگریزی و عربی ہے، اور آخری درجہ تعلیم و تکمیل نصاب علوم دینیہ پر مبنی ہے۔۔۔ یہ اجتماع صوبۂ بہار کی تعلیمی اصلاح و ترقی کا اجتماع ہے اور ستم ہے اگر خود اسی صوبے کے علماء و اصحاب رائے اس میں حصہ نہ لیں۔۔۔ اس جلسے میں صوبہ بہار کے وعاظ و مقررین کی خاص ضرورت ہے، یہ جلسہ تین دن تک ہوگا۔۔۔"

گویا اپنی تعلیمی اسکیم کے آغاز سے پہلے مولانا آزاد اپنے موقف کو بہار کے ذی علم حلقوں پر واضح کرنا چاہتے تھے اور ان کی رائے جاننے کے لیے بے تاب تھے: ان کی خواہش تھی کہ خواص ان کے مرتب کردہ نظام نصاب پر تنقید و تبصرہ کریں تاکہ ان کی روشنی میں وہ ایک واضح تعلیمی مشن پورے ہی صوبے میں رائج کر سکیں۔ یہ کانفرنس تو ضرور منعقد ہوئی ہوگی لیکن اس کے نتائج کیا نکلے؟ کچھ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ قدیم اہالیان رانچی متعلقہ کانفرنس کے بارے میں کوئی روشنی نہیں دیتے۔ اس ضمن میں میری تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی ہیں۔ بہر طور یہ تو وہ باتیں ہیں جن کا تعلق مولانا کے اسی خواب سے ہے جو انھوں نے چھوٹا ناگپور کو زیور علم سے آراستہ کرنے کے بارے میں دیکھا تھا، یہ تو سچ ہے کہ ان کا خواب کلی طور پر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا لیکن رانچی میں آج بھی جتنی کچھ ملی سرگرمیاں ہیں دراصل ان کی بنیاد کی عقبی زمین میں مولانا کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔

خیر یہ تو وہ امور ہیں جن کا تعلق چھوٹا ناگپور یا رانچی سے ہے، مولوی زکریا صاحب کے نام دوسرے خطوط میں چند اور بھی پہلو ہیں جو ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ ایک خط میں مولانا نے علما یا ذی علم افراد کے عمومی شغف پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

"... آپ کے لیے بہترین زندگی علمی زندگی ہے اور اس شکل و طرز کی جس کا نمونہ سلف صالح کے حالات میں ملتا ہے۔ علماء اسلام کے حالات پڑھیے، درس و تدریس، وعظ و ارشاد اور تصنیف و تالیف تینوں چیزوں کو بیک وقت کرتے تھے اور اس طرح ایک ہی زندگی بیک وقت تین عظیم الشان خدمت انجام دیتی تھی، عوام کی اصلاح، وعظ و تذکیر سے مستقبل کے لیے طیاری درس و تدریس سے اور علم و مذہب کی خدمت دائمی تصنیف و تالیف سے۔ ابن جوزی مصنف مستنصریہ کے صدر مدرس ہیں اور جامعہ رصافہ کے واعظ، غزالی مدرسہ طوس کے معلم، سو کتابوں کے مصنف اور جامع طوس کے واعظ۔ علماء اسلام کی زندگی کے لیے تو یہ چیز طبیعت ثانیہ ہو گئی تھی۔ ایک شخص آپ کو نہیں ملے گا جو اپنی زندگی میں یہ تینوں مشغلے نہ رکھتا ہو..."

بعض لوگ بعض شہروں یا مقاموں کے بارے میں یہ شکایت کرتے ہیں کہ تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ بنجر ہیں، لائبریریوں اور کتابوں کے فقدان کا رونا بار بار رویا جاتا ہے۔ اس طرح گویا وہ بہانہ جوئی سے کام لے کر تساہل کا شکار ہو جاتے ہیں اور تصنیف و تالیف کی طرف سے منھ موڑ لیتے ہیں۔ مولانا آزاد کے سامنے یہ عذر بے سود ثابت ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"آخری چیز مشغلۂ تصنیف و تالیف ہے اور یہ بہت ضروری بھی ہے، اس کا حال یہ ہے کہ بلحاظ مقام کے بجنور (کذا) اور رانچی اور دیگر مقامات سب یکساں ہیں۔ ہندستان میں اس کے اسباب و سامان کا بطرز یورپ کہاں سامان ہے؟"

حالانکہ یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ علمی و ادبی کاموں کے لیے بعض جگہیں بعض جگہوں پر فوقیت رکھتی ہیں مثلاً یہ کہ اردو، عربی و فارسی کے کسی موضوع پر کچھ لکھنے کے لیے رانچی سے بہتر جگہ عظیم آباد ہوگی، پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ رانچی کے لوگ محض اس بنا پر تصنیف و تالیف سے باز آجائیں گے۔ مولانا کا مقصود یہ ہے کہ تمام تر نامساعد حالات پر قابو پایا جا سکتا ہے، شرط یہ ہے کہ کام کرنے کی لگن ہو ورنہ تن آسانی تو بہانے ڈھونڈھنے پر اصرار کرتی رہتی ہے۔

بہرحال مولوی زکریا کے نام کچھ ایسے بھی خطوط ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بعض نکات معلومات عامہ کے سلسلے میں مولانا سے رجوع کرتے تھے، ایک خط میں جواباً وہ نکتہ وار اس طرح لکھتے ہیں:

۱۔ اکبر کا ان پڑھ ہونا کوئی غلط فہمی نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعہ ہے، کچھ ضروری نہیں کہ اسے تعلیم یافتہ ثابت کیا جائے۔ اس کی فطری ذہانت اور قدرتی استعداد کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ باوجود ان پڑھ ہونے کے ملک داری کی حکمت و سیاست کی سب سے بہتر مثال قائم کر گیا۔"

۲۔ جنوبی اور وسطی امریکہ کے آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایک زمانے میں اس کا تعلق قدیم اغلباً برگموں سے رہ چکا ہے لیکن جہاں تک تاریخی وثائق کا تعلق ہے ... نہیں کہا جا سکتا کہ کولمبس سے پہلے کسی سیاح نے اسے دریافت کیا ہو... دو عرب بھائیوں کی داستان ملاحی بیان کی گئی ہے کہ... امریکہ پہنچ گئے تھے لیکن یہ محض قیاسی ہے۔

۳۔ ریڈ انڈین کا اطلاق امریکہ کی وطنی اقوام پر کیا گیا ہے اور ان کی تاریخ اس وقت تک تاریکی میں ہے۔"

۴۔ مذہب کا مقصود انسان کی روحانی سعادت و نجات اور ایک خالق کائنات کے رشتۂ عبودیت سے تمام افراد انسانی کو باہمدگر متحد کر دینا ہے۔"

ان چار جوابات میں تین کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن چوتھا جواب مذہب کے مقصد سے متعلق ہے۔ مولانا نے چند لفظوں میں مذہب کی غایت سمجھا دی ہے "مذہب افتراق کا نام نہیں ہے" مذہبی افراد کو ٹولیوں میں تقسیم کرنا اس کا مدعا ہے "افراد انسانی کو باہمدگر متحد کرنا اس کا مقصود اعظم ہے" یہ وہ تصور ہے جس نے مولانا کو ہمیشہ مذہبی تنگ نظری اور فرقہ پرستی سے دور رکھا اور نئے ہندستان میں قومی اتحاد کی مشعل کو بلند کرنے میں ان کا جو رول رہا ہے وہ ان کے تصور مقصدِ مذہب پر دال ہے۔

جی تو یہ چاہتا ہے کہ مولانا کے تمام غیر مطبوعہ خطوط کا تعارف کراؤں خصوصاً جن سے مولوی زکریا سے ان کے بے پایاں خلوص کا پتہ ملتا ہے۔ اکثر خطوط میں ان کی دلدہی کی گئی ہے۔ مختلف طریقوں سے ان کی اعانت کا حال معلوم ہوتا ہے خصوصاً ان کی علالت کے دنوں مولانا کی پریشانی' علاج کے لیے پیسے فراہم کرنا۔ لیکن یہاں اس کا موقع نہیں کہ سارے خطوط یا ان کے اقتباس درج کیے جائیں ہاں ایک قدرے تفصیلی خط توجہ طلب ہے کہ اس سے مولوی زکریا کی غیر معمولی نفسی کیفیت کا حال بھی روشن ہوتا ہے اور اسی تعلق سے مولانا آزاد کے دل کے نہاں خانے میں بھی جھانکا جا سکتا ہے یہ مسئلہ زکریا صاحب کے بوڑھاپے کے عشق کا ہے' اس وقت جب کہ ان کی شریک حیات بہ قید حیات ہیں' اولاد کی کثرت ہے اور مفلسی دامن گیر ہے۔ زکریا صاحب بڑی معصومیت اور صفائی سے اپنے ہمدرد اور رازداں مولانا ابوالکلام آزاد سے اپنے دل کی کیفیت ظاہر کرتے ہیں اور عقد ثانی کے بارے میں مشورہ کے طالب ہیں' مولانا کا جواب نہایت دلچسپ' مدلل ہے اور خود ان کی ازدواجی زندگی کا آئینہ ہے اس لیے انتہائی اہم اور قیمتی ہے۔ ملاحظہ ہو مولانا کیا اور کس طرح جواب دیتے ہیں: "پس اصلی و حقیقی اور ایمانی و احسانی راہ تو یہی ہے کہ اللہ سے دل لگایئے... اگر آپ کی جانب سے عزم ہوا تو توفیق الٰہی ضرور مساعد ہوگی اور انشاء اللہ ایک جہاد اکبر کا اجر عنداللہ۔ غور کیجیے متاہل ہیں مجرد نہیں' پھر صاحب اولاد اور حقوق اہل و عیال کی کشاکش سے درماندہ۔ کوئی ضرورت شرعی و اخلاقی ازدواج ثانی کیلیے

باعث نہیں۔ پھر ایک طرف افلاس و معیشت کی بے سر و سامانی دوسری طرف عوارض و معالی امور و عمل کا ولولہ ان حالات میں اگر یہ معاملہ انجام پا گیا تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ بلاشبہ ابتدا میں مسرتِ حصولِ مطلوب کا ہیجان تمام محسوسات پر غالب آجائے گا لیکن بہت تھوڑی دیر کے لیے اس کے بعد تدریجی کشاکش و کشمکش مشکلات و صعوبات کا سلسلہ شروع ہوگا اور جیسا کہ اکثر حالتوں میں ہوا ہے عجب نہیں کہ خود اس معاملے سے دل برداشتہ ہو جائے۔ یہ کشمکش زندگی کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے' ابھی ایک لمحہ کے لیے اس کا احساس نہیں ہو سکتا یہ عام قاعدہ ہے لیکن جب حالت پیش آئے گی تو کوئی علاج سود مند نہ ہوگا۔ سب سے زیادہ یہ کہ پوری امانت داری کے ساتھ خود اس شخص کے مصالح پر غور کرنا چاہیے جس کی محبت میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے' وہ ایک معصوم لڑکی ہے' دنیا اور دنیا کے مصائب سے بے خبر کیا یہ بہتر ہوگا کہ اس کو ایک ایسی زندگی میں لایا جائے جس کے مصائب و مشکلات کا ہم کو ابھی سے علم ہے؟ اور ہم جانتے ہیں کہ عیش و آرام حیات اس کے لیے مہیا نہ کر سکیں گے۔ پھر اپنی بیوی کا خیال کیجیے' جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کو کوئی شکایت نہیں کیا محبت و وفا کا یہی اقتضا ہونا چاہیے کہ بلا وجہ اسکی تمام بقیہ زندگی تلخ کر دی جائے۔

"میری شادی کو دس سال ہو گئے' یقین کیجیے میرے لیے ایک نہیں متعدد وجوہ و بواعث شرعاً و عقلاً ایسے موجود ہیں کہ اگر ان میں سے ایک باعث بھی کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہوتا تو وہ دوسرا نکاح کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتا' بایں ہمہ میں نے ایک صبح و شام کے لیے بھی اس کا قصد نہیں کیا اور نہ کروں گا' پھر ساتھ ہی دوسروں کی جانب سے اس کے بارے میں اس قدر مجبور کن ترغیبات پیش آتی رہیں کہ عزم کا باقی رہنا بہت مشکل تھا تاہم میری رائے میں تزلزل نہ ہوا۔"

صداقتِ حیات بجز قربانی کے اور کچھ نہیں' اگر ہم اپنی خواہشوں کو قربان نہیں کر سکتے تو پھر نہ دنیا میں محبت ہے نہ سچائی اور نہ انسان۔

"آپ کہیں گے دل کسی کے بس میں نہیں؟ ہاں لیکن جو چاہے اس کے بس میں ہے . . . (۲) لیکن اگر ضعفِ عزم ساتھ نہ دے . . . اس کے والدین کو راضی کر کے نکاح کر لیجیے . . . یہ بات پھر بھی ہزار درجہ موجودہ اضطرابِ نفس سے بہتر ہوگی۔"

کیا اب اس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورے کی تحلیل کی جائے؟ ہاں اسی خط کی روشنی میں مولانا کی اپنی زندگی کے بارے میں بہت سارے نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔

●●

(۱)

(۱۹۱۵ء کلکتہ)[1]

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ آپ نے بہر حال اچھا کیا کہ بارکپور کے تعلق سے دست بردار ہو گئے۔ حالات معلومہ کے ساتھ وہاں کا قیام بے سود تھا۔ اب آپ چند دنوں توقف کیجیے کہ میں مطمئن ہو کر اپنے کاموں سے فارغ ہوں اور اس معاملہ کو مجھ پر چھوڑ دیجیے میں بوقت مناسب آپ کو بلالوں گا۔

فقیر ابوالکلام

۲ر شوال

جواب کے لیے جوابی خطوط کی ضرورت نہیں۔ آئندہ اس سے احتراز کیجیے۔

---

۱۔ ڈاک کی مہر سے سن اور جگہ کا تعین کیا گیا (م۔ و)

(۲)

کلکتہ ۱۹۱۵ء

السلام علیکم و فقنا اللہ وایاکم لما یحبہ و یرضاہ

افسوس ہے کہ آپ آئے اور ملاقات نہیں ہوئی جہاں تک فقیر کو یاد ہے اس اثنا میں آپ کے آنے کی بالکل اطلاع نہیں ملی غالباً عدم موجودگی میں آپ آئے ہوں گے۔

دارالارشاد کا افتتاح بوجوہ ابتک معرض تاخیر میں ہے اور نظر بہ حالات غالباً بعد رمضان سلسلۂ درس شروع ہوگے۔

آپ کے متعلق فقیر نے غور کیا ہے چاہتا ہوں کہ کوئی صورت کلکتہ میں قیام کی پیدا ہو لیکن میرا حال یہ ہے کہ ایک فکر و دماغ اور صدہا معاملات سامنے ہیں بہر حال جب طلب صادق اور فکر مستقیم ہے تو امید ہے کہ کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ سر دست تو چندے وہاں قیام ناگزیر ہے تا آنکہ یہاں کوئی صورت قرار پائے۔ فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ

(۳)

عزیزی السلام علیکم

خط پہنچا اللہ تعالیٰ پریشانیوں سے نجات دے اور طمانیۂ خاطر کا سامان مہیا فرمائے۔ جو کچھ میرے امکان میں ہے اس کے لیے کسی یاددہانی کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ جونہی کوئی مناسب موقع ملے گا آپ کو اطلاع دوں گا۔ بالفعل صورت حال ایسی نہیں ہے کہ آپ کو آنے کے لیے لکھوں۔ فقیر ابوالکلام کلکتہ

(۴)

دہلی ۲۶ ۱۲/۳ء

عزیزی خط پہنچا۔ ترجمان القرآن کے لیے مینیجر صاحب کو کہہ دیا ہے۔ غالباً مل گیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فہم و مطالعہ قرآن کی توفیق عطا فرمائے۔ میں ضرور آپ کے لیے کوئی راہ نکالتا بشرطیکہ بحالت موجودہ اس کی صورتیں موجود ہوتیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ بالفعل کوئی ایسا کام میرے ہاتھ میں نہیں۔ اگر آپ کو بلاؤں تو کون سا کام سپرد کروں؟ اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا سامان کر دیا کہ آپ کے لیے موزوں صورت نکل سکی تو یقین رکھیے میری جانب سے کوتاہی نہ ہوگی و السلام علیکم ابوالکلام

(۵)

عزیزی بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی کہ آرڈر کی تعمیل کی گنجائش ہے۔ کتاب اسی لیے چھپی ہے کہ جو خواہشمند

ہوں منگوائیں۔ کتاب مینیجر دفتر ترجمان القرآن ۱۲ دریا گنج دہلی سے مل سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات دور کرے اور بہتر سروسامان فراہم فرمائے۔ والسلام علیکم۔ فقیر ابوالکلام ۵ ۱/۲ ۶ دہلی

(۶)

عزیزی السلام علیکم وصبحکم اللہ بالخیر

کل میں رکشا کے لیے کہنا بھول گیا۔ یا تو خود یا بذریعہ موذن وغیرہ اس کا انتظام کیجیے کہ آج رکشا ٹھیک گیارہ بجے یہاں پہنچ جائے۔ ابوالکلام

(۷)

عزیزی اپنے رقعہ میں جس امر کی نسبت لکھا ہے دراصل اس کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے۔ آج شام کو حاجی رفاقت حسین صاحب سے گفتگو ہوگی۔ انشاء اللہ کل حسب مرضی معاملہ صاف ہو جائے گا۔ حاجی صاحب کا بھی یہ مقصد نہ تھا وہ آپ کی مخلصانہ خدمات انجمن کے پوری طرح معترف اور قدردان ہیں۔ اصل معاملہ سے وہ بے خبر تھے اس لیے ان کو غلط فہمی ہوئی۔ مولوی قاسم صاحب وطن میں تھے۔ ان کا نام رجسٹر میں دیکھ کر وہ اصل حقیقت نہ سمجھ سکے۔ قطع نظر اس کے آپ کا تعلق تو مجھ سے ہے پس آپ کو اس قسم کے امور سے دلگرفتہ نہ ہونا چاہیے۔

افسوس کہ اسوقت مسجد سے آتے ہی میرے سر میں کل کی طرح سخت درد شروع ہو گیا ہے۔ ارادہ کرتا ہوں کہ کھانا نہ کھاؤں اور جلد نماز عشاء سے فارغ ہو کر سو جاؤں۔ آپ کا سبق انشاء اللہ کل بعد نماز جمعہ ہو جائیگا اور پھر شام کو اسطرح آئندہ ناغہ ہونے نہ دوں گا۔

(۸)

باسمہٖ تعالیٰ صدیقی العزیز السلام علیکم

تحریک عید کے لیے ممنون ہوں۔ آپ سے غافل نہیں۔ کئی کوششیں کی ہیں۔ اللہ نتیجہ خیز ثابت کرے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کا میں خود بھی ممبر ہوں اور مجھ کو معلوم ہے کہ وہاں کوئی کام نہیں۔ سہروردی کو لکھنا بے سود ہے۔
فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ رانچی ۸ شوال ۳۴ھ

(۹)

باسمہٖ تعالیٰ عزیزی وصدیقی السلام علیکم

آپ کے لیے ایک صورت نکلی ہے۔ کلکتہ میں اسلامی یتیم خانہ ہے اس میں بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم

کے لیے ۳۰ روپیہ کی ایک جگہ ہے وہ آج کل خالی ہے میں نے سکریٹری کو کہ کر آپ کے لیے گنجائش نکالی ہے اور ۳۰ کی جگہ ۳۵ منظور کرایا ہے۔ مکان بھی رہنے کو مفت ملے گا۔ بقیہ وقت میں اور اشغال جاری رکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ اس جگہ کے لیے انگریزی کی شرط نہیں ہے لیکن مجھ کو ایسا یاد پڑتا ہے کہ آپ نے انگریزی بھی پڑھی ہے چنانچہ میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا منتظمین یتیم خانہ مذہبی اعتقادات میں ناواقف ہیں اور حنفیت کے عاشق، سابق مہتمم کو اس جرم میں نکالا گیا کہ وہ مولود اور قیام کے مخالف تھے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ آپ پکے حنفی اور نقشبندی طریق میں بیعت کردہ ہیں۔ بس ان جزئیات کا خیال رہے۔ آپ فوراً بھاگلپور سے روانہ ہو کر سیدھے کلکتہ پہنچیں اور مرزا احمد علی سکریٹری یتیم خانہ کمیٹی نمبر ۲ اوجیت پور روڈ سے جا کر ملیں اور میرا خط دکھلائیں۔

بحالت موجودہ یہ جگہ غنیمت ہے اسے منظور کر لیجیے اس کے بعد انشاء اللہ عجب نہیں کہ فقیر کا بھی کلکتہ جانا ہو اور تمام امور عمل میں آئیں۔ والامر بیدہ سبحانہ وتعالیٰ فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ رانچی بہار ۲۲ ذیقعدہ ۳۴ھ

(۱۰)

ڈاک بنگلہ۔ رانچی ۷ اپریل ۱۹۱۵ء ۲۸۶

برادرم السلام علیکم

اپنے ارادہ اور قیام سے اطلاع دیجیے۔ ابھی کچھ دنوں رہیے گا یا جانے کا قصد ہے؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت آپ کے شامل حال رہے۔ فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۱۱)

رانچی ۱۹۱۶ء

السلام علیکم

افسوس کہ آج شام کو بھی آپ حضرات سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ شام کو میگوڑ نے کھانے کی دعوت دے دی ہے۔ مجبوراً ادھر جانا ہوگا اس لیے آپ حضرات آج زحمت فرمائیں اور دلشاد کو کھانے کیلیے بھیج دیں انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی۔ ابوالکلام

(۱۲)

باسمہ تعالیٰ عزیزی الاجل السلام علیکم

تاخیر اسلیے ہوئی کہ کلکتہ سے جواب کا انتظار تھا۔ آپ کی علالت کا حال پڑھ کر نہایت قلق ہوا۔ اللہ تعالیٰ افضل و کرم فرمائے اور اس کے سوا چارہ ساز بیکساں کون ہے کہ "یجیب المضطر اذا دعاہ"

میں نے بہت کوشش کی کہ زیادہ عرصہ تک جگہ خالی رہے مگر امیدواروں کا ہجوم شاید عید کے بعد وہ کوئی

انتظام کرلیں۔ بہرحال صحت مقدم ہے اور خدا کے خزانوں میں رزق کی کمی نہیں۔ انشاء اللہ وہ کوئی اور صورت پیدا کردے گا۔ حکیم صاحب کو لکھ دیا ہے نیز دواخانہ کو لکھ دیا کہ دوا آپ کو بھیج دے اور قیمت فقیر سے وصول کرلے۔ موجودہ حالت سے مطلع کیجیے۔ خدا یار و یاور باد!

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ رانچی

(۱۳)

حبی فی اللہ السلام علیکم

خاموشی بلا وجہ نہ تھی چاہتا تھا کہ اس موقعہ پر آپ کی پریشانیوں کے لیے کچھ نہ کچھ باعث تخفیف ہوں۔ بعض اسباب کی بنا پر اس کی امید بھی تھی لیکن سوٗ اتفاق سے اب تک اسباب مطلوبہ فراہم نہ ہوئے۔ وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ

اس بات سے نہایت خوشی ہوئی کہ بحمد اللہ آپ کی طبیعت روبہ افاقہ ہے اللہ تعالیٰ صحت کامل عطا فرمائے۔

میں اس موقع پر آپ کو ضرور رانچی بلا لیتا مگر جب آپ کے تمام مصالح پر غور کرتا ہوں تو سردست توقف اولیٰ و انسب نظر آتا ہے پس بالفعل توقف کیجیے اور منتظر رہیے کہ آئندہ کیا صورت حال پیش آتی ہے؟ شاید بہت جلد اللہ تعالیٰ بہتر صورت پیدا کردے بالفعل آپ کا یہاں آنا چنداں سودمند نہ ہوگا انشاء اللہ وقت مناسب دیکھ کر میں خود آپ کو مطلع کروں گا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کچھ عرصے آپ مونگیر میں قیام کریں؟ اور آپ کے متعلقین اپنے گھر میں رہیں تا آنکہ اللہ تعالیٰ کوئی مناسب صورت پیدا کرے؟

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۱۴)

۱۷-۴-۱۲ (یہ خط جیل سے چیک ہو کر بھیجا گیا ہے)

حبی فی اللہ السلام علیکم

خط پہنچا۔ غلطی سے پڑا رہا اور خیال یہ ہوا کہ جواب لکھ چکا ہوں۔ لیکن آج دیکھنے سے معلوم ہوا کہ غالباً جواب نہیں گیا۔ الحمد للہ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اب آپ بصحت و عافیت ہیں۔

ابوالکلام کان اللہ لہٗ رانچی ۱۸/اپریل ۱۷ء

(۱۵)

(نوٹ: اب طویل اور تفصیلی خطوط کا حصہ ہے ـــــ ان میں ایک آدھ چھوڑ کر سبھی میں تاریخ اور مقام ندارد ہیں۔)

حبی فی اللہ السلام علیکم

خط پہنچا۔ کلکتہ کے اس تعلق کی نسبت میں نے اس لیے رائے دی کہ رانچی میں قیام کی کوئی صورت نہ تھی اور

آپ سے دریافت کیا تو آپ کے وطن و اطراف میں بھی کوئی صورت سامنے نہ آئی۔ مجبوراً خیال کیا کہ بیکاری سے بہر حال کچھ نہ کچھ معاش کی صورت کا ہو جانا بہتر ہے۔ چونکہ آپ نے بھی رضامندی ظاہر کی اسلیے میں نے مسٹر فضل دین کو لکھ دیا۔

باقی رہا ان کا مزاج، تو آپ جانتے ہیں کہ آج کل طبائع کا کیا حال ہے، اور پھر اختلاف طبائع ناگزیر۔ لہذا کسی کی ذاتی حالت و طبیعت سے ہمیں کیا مقصود ہے۔ معاوضہ پر کام کر دینا ہے اور بس۔ معلوم ہے کہ دوستی و محبت کا تعلق نہیں۔

البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ صبح سے لے کر شام تک کی حاضری دفتر میں کیوں ہو؟ کام تو بظاہر کچھ بھی نہیں ہے آپ صاف صاف ان سے کہہ دیں کہ یا تو بلا قید وقت میں کام کر دوں گا یا پھر دس سے چار تک یا پانچ تک کام کروں گا۔ ان امور میں سکوت کسی طرح بہتر نہیں یہ تو معاملہ کی بات ہے ایک لمحہ میں صاف ہو جائے گی اسکو اسقدر اہمیت کیوں دی جائے۔

باقی رہا تنخواہ کا معاملہ تو بلاشبہ کم ہے اور اللہ اس سے زیادہ کا سامان کرے۔ لیکن سامان ہونا چاہیے۔ آپ نے کلکتہ کے میمنوں وغیرہ کی نسبت لکھا ہے میمنوں میں کون ایسا شخص ہے جس کے یہاں اس قسم کی ملازمت کی گنجائش نکل سکتی ہے ان کے یہاں تو غالباً صرف تجارتی کام ہوتا ہے۔ لہذا آپ تجسس میں رہیں اگر کوئی ایسی جگہ نظر آئے تو مجھے لکھیں۔ میں پوری سعی کروں گا۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ یہ تعلق آپ کا شخصاً مسٹر فضل دین سے ہے۔ مجھے اس خاص معاملہ کو کوئی تعلق نہیں یعنی یہ میرے کاموں میں سے نہیں ہے۔ آپ اس خیال سے اس کام کو اپنے لیے ضروری نہ سمجھیں کہ میرا کام ہے۔ میں نے تو بیکاری سمجھ کر اس کو غنیمت سمجھا یہ بات نہیں ہے کہ اس کے ترک کو میں پسند نہ کروں گا۔ آپ دیکھ لیں موافق طبع ہو تو کریں ورنہ بلا تامل ترک کر دیں۔ میں دونوں حالتوں میں خوش ہوں۔ یہ تمام معاملہ خالص امور میرے علاقہ کے دائرہ سے خارج ہیں۔ میرا علاقہ تو صرف اللہ کے راہ میں ہے ہاں اگر دنیوی امور میں کچھ کر سکوں شخصاً تو اس کے لیے بھی طیار ہوں۔ بہر حال میرے پیش نظر کوئی صورت اسوقت نہیں ہے آپکے سامنے ہو تو لکھیے۔ ابوالکلام

(۱۶)

عزیزی و حبی فی اللہ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

ادھر عرصہ سے مبتلائے آلام معنوی و صوری ہوں۔ علائق قلبیہ رسل و رسائل پر موقوف نہیں۔ آپ کی طرف سے نہ کبھی غفلت ہوئی ہے اور نہ اندیشہ ہوگی۔ افسوس کہ اب تک آپ کا زمانۂ ابتلاء و محن ختم نہیں ہوا، اور سلسلۂ ملالات جاری۔ جب بھاگلپور کے علاج سے اتنے عرصہ میں بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو بجز اس کے چارہ نہیں کہ جلد سے جلد سفر دہلی کا تہیہ کیا جائے۔ اس سفر کے لیے بعض ضروریات کی فراہمی ناگزیر ہوا اور جواب میں اسی لیے تاخیر ہوئی کہ ان

کی فکر در پیش تھی۔ انشاء اللہ امید ہے کہ عنقریب سامان ہو جائے گا۔ بعض اسباب سے ادھر یکے بعد دیگرے مجبوریاں پیش آتی رہیں اور بعض تازہ حاجتوں نے دل کی طرح جیب کو بھی خالی رکھا۔

دوسرے خط میں آپ نے اپنے گھر کے طرزِ عمل کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھ کر سخت قلق ہوا، وہذا اشد من ذاک۔ غالباً آپ کے ابتلاء و آزمائش کی تکمیل اس معاملہ پر موقوف تھی۔ جب تک الم جسمانی کے ساتھ الم قلبی مکمل طور پر جمع نہ ہو، صبر کی پوری آزمائش نہیں ہوتی۔ یہ دوسرا معاملہ انسان کے لیے علائق و مؤثرات حیات دنیوی میں آخری ترین الم ہے اور اب یہ بھی آلام جسمانیہ کے ساتھ جمع ہو گیا۔ جب آزمائش یہاں تک پہنچ چکی ہے، تو یہ اس کی علامت ہے کہ اب اختتام کا وقت آگیا اور انشاء اللہ آپ کا اجر صبر بھی آخری درجہ تک پہنچ کر رہے گا۔ کام جتنا سخت ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ مزدوری بھی ملا کرتی ہے۔ گو یہ معاملہ نہایت ہی درد انگیز ہے مگر کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کچھ مزید تبیین و تفصیل کریں؟ قلب انسانی کے لیے مجرد تذکرہ و حکایت آلام میں بھی بہت بڑی تسکین رکھی گئی ہے خصوصاً جبکہ کسی غمگسار کے سامنے ہو۔

ولابد من شکوی الی ذی مروة ۔۔۔ یواسیک او یسلیک او یتوجع

آپ نے اپنے آنے کی نسبت بھی لکھا ہے۔ میں خود کب اس کو پسند کرتا ہوں کہ جتنا بھی آپ مجھ سے دور رہیں لیکن علاج سب پر مقدم ہے اور اس کے لیے دہلی جانا لازم و الزم، بس اسی کا تہیہ کیجیے۔ جس طرح بھی ممکن ہو۔ اور میں بھی انشاء اللہ بخیر و عافیت۔ اوّل حصول اسی کیلیے کوشش کرونگا۔ فاللہ معکم اینما کنتم وحسبنا اللہ ونعم الوکیل ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

ادھر اتفاقاً ایک ضرورت سے بعض کتب طب کی ورق گردانی کا اتفاق ہوا تو گردہ کی بحث نکل آئی۔ ضعف گردہ کے جس قدر آثار و حالات لکھے ہیں وہ سب آپ میں موجود ہیں۔ یہ مرض بجز ضعف گردہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ اور جو شے خارج ہوتی ہے وہ گردہ کی چربی ہے۔ وہاں کے اطباء سے اس کا ذکر کیجیے۔

(۱۷)

حبی فی اللہ السلام علیکم

اللہ تعالیٰ اس عزم کو صادق و کامل فرمائے۔ آپ نے اللہ کی راہ میں مما تحبون کا انفاق کیا ہے۔ یہ عمل عظیم انشاء اللہ ضائع نہ جائیگا۔ باقی رہا انفاق قوت و عمر اللہ کی راہ میں تو اس کے دو مرتبے ہیں۔ پہلا عزم و نیت سے تعلق رکھتا ہے دوسرا عمل سے۔ پہلا چیز ہر وقت و آن مطلوب ہے اور ہر وقت ہمارے اختیار میں ــــ اس میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ رہا عمل کا کام تو اس میں انتظار وقت ناگزیر، شوق طلب کا تقاضہ یہی ہونا چاہیے کہ ایک لمحہ کی تاخیر بھی شاق گزرے۔ لیکن فہم و فکر صائب کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ انتظار کے بغیر چارہ نہیں۔ سر دست آپ کے لیے مسئلہ معیشت بھی ضروری ہے۔ ادائے حقوق اہل و عیال

اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کلکتہ میں ملتے جلتے رہیے۔ سعی و کوشش کیجیے۔ کوئی گنجائش کہیں دوسری جگہ نظر آئے ورنہ بہتر ہے منتظر رہیے۔

(۲) مسٹر فضل دین کے جو حالات لکھے ہیں وہ پیشتر سے معلوم ہیں مگر چارۂ کار کیا؟ باقی رہا تذکرہ تو اصل حقیقت یہ ہے کہ اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ انھوں نے اسے چھاپا ہے اور اس کی تمام خرید و فروخت انھی سے متعلق ہے۔ نفع و نقصان وہ جانیں۔ اگر عقل و دانش سے کام لیتے، اسراف میں نہ پڑتے، اپنی نادان بیوی کی پرستش نہ کرتے، حالت کے مطابق خرچ رکھتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔ حتی الوسع مشورہ و فہمائش میں کمی نہیں کی۔ لیکن افسوس کہ کلکتہ کا قیام غیر ضابطہ طبائع کے لیے موجب ابتلا ہے۔ اب وہ جانیں اور ان کا کام۔ قانوناً پریس پر کوئی ڈگری جاری نہیں ہو سکتی گو زحمت و پریشانی کا موجب ہو سکتی ہے۔ آپ ان کے معاملات کو انھی پر چھوڑ دیں۔ اس بارے میں میری فہمائش بالکل بے اثر ہو چکی ہے۔ میرا کام صرف اتنا ہوا کہ بند رہنے کی جگہ پریس کا مکان کھلا رہا اور کچھ لوگ اس میں رہے۔ اور مجھے کوئی اس سے نفع نہ ہوا اور نہ ہوگا۔ نقصان جس قدر ہو خلاف امید نہیں۔ دنیا کا یہی حال ہے اس کو آپ ہم بدل نہیں سکتے۔

ایک کام ضروری ہے۔ ایک نسخہ تذکرہ درجۂ اول حکیم برہم ایڈیٹر مشرق گورکھپور کے نام رجسٹرڈ بھیج دیجیے۔ انھوں نے شاید مشرق میں اشتہار چھپوایا تھا۔ اجرت اب تک نہیں دی۔ وہ کہتا ہے کہ کم سے کم ایک نسخہ تو بھیجو، وہ بھی نہیں بھیجا جاتا۔ خط پر خط آ رہے ہیں۔ بہرحال آپ بھیج دیں۔ بھیجنے سے پہلے غلط نامہ دیکھ کر قلم سے غلطیاں درست کر دیجیے گا اور غلط نامہ اگر شامل جلد نہیں تو جلد کے اندر رکھ دیا جائے۔ ابوالکلام

(۱۸)

۲۵ر نومبر ۱۹۱۹ء

یہ معلوم کر کے سخت قلق ہوا کہ آپ کی طبیعت پھر خراب ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ لطف فرمائے۔ معلوم نہیں اب کیا حال ہے؟ آپ کو وہاں رکوانے سے مقصود یہ تھا کہ قبل از جلسۂ انجمن مقامات مشہورۂ بہار میں ایک دورہ کیا جائے اور دعوتی خطوط و کارڈ بالمشافہ لوگوں کو دیے جائیں۔ نیز اشتہارات مناسب مقامات پر چسپاں کرائے جائیں لیکن اگر آپ کی طبیعت درست نہیں تو پھر یہ تمام معاملات کیونکر انجام پائیں گے؟

اس صورت میں وہاں بھاگلپور کا کوئی اور مستعد شخص کیا اس کام کے لیے فوراً مل سکتا ہے؟ اگر آپ کے شناسا لوگوں میں کوئی ہو تو تمام مصارف انجمن ادا کرنے کے لیے تیار ہے واجرہ علی اللہ۔ اس کے علاوہ:

بہرحال اس خیال سے کہ وقت کم ہے، خواہ خود آپ انجام دیں خواہ کسی اور ذریعے سے، اصل کام کو لکھ دیا جاتا ہے۔

(۱) جلسہ کے دعوتی خطوط اردو، انگریزی کارڈ، چسپاں کرنے کے پوسٹر رجسٹرڈ بھیجے جاتے ہیں۔

(۲) بھاگلپور میں جو لوگ ان چیزوں سے ذوق رکھنے والے ہوں ان کے نام حسب حال یا کارڈ یا خطوط پر لکھ کر بالمشافہ تقسیم کیجیے اور از جانب انجمن ترغیب شرکت جلسہ۔

اور اس امر پر زور دیجیے کہ یہ محض مقامی جلسہ نہیں بلکہ صوبے کا ایک عام تعلیمی اجتماع ہے۔ اس کا خیال رہے کہ کارڈ کم ہیں اور صرف ان لوگوں کو دیے جائیں جو انگریزیت میں بشدت غرق ہوں ورنہ اردو خطوط۔ بھاگلپور کے لیے دس خطوط رکھے گئے ہیں اور دس پوسٹر۔ لیکن حسب ضرورت زیادہ صرف کر سکتے ہیں۔ پوسٹر شہر کی مساجد و نمایاں مقامات پر چسپاں کرا دیے جائیں۔

(۲) اس کے بعد فوراً بانکی پور جائیے اور مسٹر مظہر الحق اور ڈاکٹر محمود بیرسٹر ایٹ لا سے ملیے۔ ڈاکٹر محمود ایک جونیر بیرسٹر اور مسٹر مظہر الحق کے داماد ہیں۔ ان دونوں صاحبوں سے کہیے کہ صرف اس قدر زحمت دینا مقصود ہے کہ بزرگان بانکی پور کی کوئی فہرست یہاں موجود نہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے نام بتلایے تاکہ ان کو خطوط و کارڈ خاص طور پر دیے جائیں اور شرکت جلسہ کے لیے اصرار کیا جائے اور آپ کی نسبت تو شرکت کا پورا یقین ہے۔ بانکی پور کے علاوہ دیگر مقامات بہار کے نام بھی ان سے دریافت کیجیے اور ان تک پہنچایے۔

اس کے بعد پوسٹر بانکی پور پٹنہ میں بھی مناسب مقامات پر چسپاں کرانا چاہیے اور عام طور پر لوگوں سے ملنے اور دعوت دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۳) وہاں سے آپ گیا اور آرہ بھی جا سکتے ہیں نیز مظفر پور و مونگیر وغیرہ۔ مظفر پور میں مولوی ریاض الحسن صاحب رئیس شہر ہیں ان سے مدد ملے گی اگر یہاں کا ذکر کر دیا جائیگا۔ اس بارے میں بھی ڈاکٹر محمود سے مشورہ کر لینا چاہیے۔

(۴) ہر مقام پر گروہ علماء و تعلیم یافتہ دونوں کو دعوت دینی چاہیے۔ علماء پر ظاہر کرنا چاہیے کہ مدرسہ عربی و انگریزی سے مرکب اور آخری درجہ تعلیم و تکمیل نصاب علوم دینیہ پر مبنی۔

(۵) وقت کم ہے اس لیے تعجیل مطلوب۔ یہ اچھا ہوگا کہ اثناء سفر میں خط و کتابت "بذریعہ پوسٹ ماسٹر" ہو۔ یعنی یہاں سے آپ کے نام کے خطوط وغیرہ ہر شہر کے پوسٹ ماسٹر کے ذریعہ جائیں۔ آپ کو ہر جگہ پوسٹ آفس میں جا کر خود دریافت کر لینا ہوگا اور اپنے نام کی ڈاک لے لینی ہوگی۔

(۶) چونکہ آپ کی علالت کی وجہ سے اشتباہ پیدا ہو گیا اس لیے روپیہ نہیں بھیجا گیا۔ بصورت مستعدی آپ فوراً بلا ادنیٰ تامل سفر شروع کر دیں اور خط میں پتہ لکھیں۔ مصارف کے لیے روپیہ بھیج دیا جائے گا یا مثل سابق آپ مصارف کا پرچہ بھیجتے رہیں گے اور روپیہ جاتا رہے گا۔

(۶) مزید دعوتی خطوط وغیرہ مطلوب ہوں گے تو طلب کر لیجیے گا۔

(۷) جناب مولانا محمد علی صاحب کی عدم شرکت پر کمال افسوس مگر واقعی ان کی معذوری واضح۔ لیکن جن علماء و واعظین جوان کی خدمت میں رہتے ہیں، ان کی شرکت تو نہایت ضروری ہے۔ اگر جناب موصوف امر فرمائیں تو وہ ضرور شریک ہوں گے پس اس کے لیے کوشش کیجیے۔ یہ اجتماع صوبۂ بہار کی تعلیمی اصلاح و ترقی کا اجتماع عام ہے اور ستم ہے اگر خود اس صوبے کے علماء و اصحاب رائے اسمیں حصہ وافر نہ لیں۔

(۸) بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ زبانی بھی ان کو خاصتاً آمادۂ شرکت کیا جا سکتا ہے۔ بلا رسم ابلاغ رقعہ و کارڈ۔

(۹) اس جلسہ میں صوبۂ بہار کے وعاظ و مقررین کی خاصتاً ضرورت ہے۔ جلسہ تین دن ہوگا۔

(۱۰) بانکی پور میں حافظ محب الحق صاحب کا پتہ دریافت کر کے ان سے بھی خاص طور پر ملیے اور کہیے کہ آپ کی شرکت نہایت الزم و امید مزید سعی و تناصر و تعاون۔

(۱۱) ایک شخص مولوی صغیر الدین صاحب ہیں۔ ان سے بذریعہ مسٹر محمد بیرسٹر ایٹ لا محلہ دریاپور پٹنہ ملاقات ہو سکتی ہے۔ یہ وہی شخص ہیں جو رمضان میں یہاں تھے از ہمراہیاں مولوی شرف الدین اور جمعہ کے دن اکثر مسجد آتے تھے۔ ان سے آپ کو بہت مدد ملے گی۔ بلکہ بہتر ہے کہ سب سے پہلے ان ہی سے ملیے اور ان ہی کے مشورے سے لوگوں کے نام حاصل کیجیے۔ اور ان کو دعوت دیجیے اور کہیے کہ انجمن آپ کو اپنا قائم مقام سمجھتی ہے اور امید کرتی ہے کہ خود آپ انجمن کی جانب سے یہاں لوگوں سے ملیں گے اور دعوت دیں گے اور جلسہ میں لائیں گے۔

میرا ذکر کیجیے کہ اس کو اس بارے میں آپ پر خاصتاً اعتماد ہے اس جلسہ میں کلکتہ سے تمام معززین و ممبران کونسل وغیرہ شرکت کے لیے آئیں گے حتیٰ کہ ڈھاکہ سے کیسا قدر افسوس کی بات ہو اگر خود صوبۂ بہار کے لوگ نظر نہ آئیں؟ حالانکہ جو کچھ ہے انہی کے گھر کا کام ہے۔

<u>ضروری</u> خدانخواستہ اگر آپ مجبور ہوں تو فوراً بذریعہ تار مطلع کیا جائے اور رقعہ وغیرہ معاً واپس کر دیے جائیں۔

(۱۹)

حبی فی اللہ السلام علیکم

خط پہنچا، اخلاص احمد صاحب وغیرہ کا تار آیا تھا۔ لیکن چونکہ اس میں پتہ نہ تھا جواب نہ دے سکا۔ بہر حال حالت میں تبدیلی تو ہوتی ہی ہے جب اللہ کو منظور ہوگا ہو رہے گا۔ اس میں کاوش بے سود ہے آپ نے لکھا ہے کہ جب تمہارا جلد کلکتہ آنا مظنون ہے تو پھر مولوی اکرم کے یہاں تعلق کیوں کروں؟ بلاشبہ میرے لیے نہایت خوشی کا موجب ہو اگر براہ راست آپ کے لیے کسی بہتر سامان کا ذریعہ ہو سکوں لیکن یہ چیزیں اصل کار و مقصد

میں دخل نہیں ہیں محض وسیلۂ معیشت ہیں جہاں ہو ایک ہی حکم میں داخل ہے۔ علاوہ بریں بالفرض اگر میں کلکتہ آ بھی گیا تو وہاں آپ کے لیے بالفعل کوئی اچھی صورت ذہن میں نہیں۔ پریس میں کوئی ایسا کام نہیں جس کو آپ کے لیے منتخب کروں نہیں کہا جا سکتا کہ پریس کے کام کی حالت کیا ہوگی۔ موجودہ حالت میں صرف ایک تذکرہ کے لیے فضل دین نے آپ کو بلا لیا چونکہ وہ اپنے طور پر کام کر رہے ہیں اس لیے میں نے دخل نہیں دیا ورنہ تو آپ کے لیے یہ کام کوئی کام تھا نہ دفتر کے لیے واقعی ضرورت تھی۔ برخلاف اس کے مولوی اکرم اخبار روزانہ نکال رہے ہیں کام اور ترقی کا بہت اچھا موقعہ ہے۔ آدمی ہم مشرب اور خوش خیال ہیں۔

بحالت موجودہ آپ کے لیے اس سے بہتر کلکتہ میں اور کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ تنخواہ بھی امید ہے کہ مناسب ہوگی۔ آپ کو ذاتی طور پر اخبار کے کام سے دلچسپی بھی ہے۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر کسی طرح مناسب نہیں کہ اس عمدہ موقعہ کو ہاتھ سے دیں۔ فوراً اختیار کر لیں۔ انشاء اللہ موجب فلاح ہوگا۔ میں اگر کلکتہ چلا بھی گیا جب بھی بحالت موجودہ امید نہیں کہ اخبار وغیرہ کا کوئی کام پریس میں شروع ہو مجھ کو دوسری مشغولیتیں درپیش ہوں گی اور مالی مشکلات کی وجہ سے پریس میں کوئی گنجائش ایسی نہ نکلے گی کہ مختلف قسم کے کام پیش آئیں پس جو صورت سامنے ہے اسے ضائع نہ کیجیے۔ بڑی اچھی بات اس میں یہ ہوگی کہ آپ کا قیام کلکتہ ہی میں رہے گا۔ چونکہ المستشار مؤتمن۔ اس لیے جو اصلیت تھی لکھ دی گئی۔

ابوالکلام رانچی ۲ر جنوری ۳۰ء

(۲۰)

کلکتہ[1] ۲۰ر فروری ۳۰ء

حبی فی اللہ السلام علیکم

آپ کی پریشان حالیوں سے بے خبر نہیں ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ زمانہ بے مہر ہے اور راہ یابِ درد کی جیب خالی ہے۔ بہر حال جونہی کوئی ایسی صورت پیدا ہوئی کہ آپ کیلیے سود مند ہو آپ کو اطلاع دوں گا۔

(۱) اکبر کا اَن پڑھ ہونا کوئی غلط فہمی نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعہ ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ اسے تعلیم یافتہ ثابت کیا جائے۔ اس کی فطری ذہانت اور قدرتی استعداد کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ باوجود اَن پڑھ ہونے کے ملکداری کی حکمت و سیاست کی سب سے بہتر مثال قائم کر گیا۔

(۲) جنوبی اور وسطا امریکہ کے آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایک زمانہ میں اس کا تعلق قدیم براعظموں

---

[1] اس خط کا عکس ماہنامہ "آجکل" دہلی کے "ابوالکلام نمبر" میں آچکا ہے۔

ے رہ چکا ہے لیکن جہاں تک تاریخی وثاقت کا تعلق ہے قطع و جزم کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کولمبس سے پہلے کسی سیاح نے اسے دریافت کیا ہو۔ اندلس کی تاریخ میں دو عرب بھائیوں کی داستان ملاحی بیان کی گئی ہے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دونوں بھائی امریکہ پہنچ گئے تھے لیکن یہ محض ایک قیاس ہے تاریخی حیثیت سے اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) ریڈ انڈین کا اطلاق امریکہ کی وطنی اقوام پر کیا گیا ہے۔ اور ان کی تاریخ اس وقت تک تاریکی میں ہے۔

(۴) مذہب کا مقصود انسان کی روحانی سعادت و نجات اور ایک خالق کائنات کے رشتۂ عبودیت سے تمام افراد انسانی کو باہم دگر متحد کر دینا ہے۔ یہ سوال ایسا نہیں ہے کہ مختصر جواب دیا جا سکے بہت زیادہ تفصیل و بحث کی ضرورت ہے۔

ابوالکلام

(۲۱)

کلکتہ ۔ ۲۰ ۴/۴۶ء

عزیزی آپ کے خطوط مجھے ملتے رہے لیکن میں آپ کو لکھتا تو کیا لکھتا کوئی صورت ایسی موجود نہیں کہ اس پر اعتماد کر سکوں اور آپ کو لکھوں کہ اسے اختیار کر لیجیے کئی ماہ تک پچھلے دنوں آپ کلکتہ میں رہے اور کوشش میں کمی نہیں ہوئی لیکن کوئی صورت نہ نکل سکی۔ اب جو صورت اخبار کی وہاں نکل آئی ہے جیسی کچھ بھی ہو، بہر حال ایک صورت ضرور ہے، جب تک کوئی دوسری صورت نہ نکلے اسے غنیمت تصور کرنا چاہیے اور جاری رکھنا چاہیے۔ کم سے کم بیکاری تو نہیں ہے۔

اگر میں نے دیکھا کہ یہاں کوئی صورت ایسی نکل سکتی ہے جو آپ کے لیے کام دے سکے تو انشاءاللہ تغافل نہیں کروں گا۔ والسلام علیکم ابوالکلام

(۲۲)

سب سے پہلے یہ واضح ہونا چاہیے کہ آپ کی نسبت یہ خیال مجھے کیوں پیدا ہوا۔ زندگی کی کامیابی کے لیے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ایک دائمی مستقل پروگرام تجویز کر لیا جائے اور اپنے اشغال و اعمال کو محض حوادث و وقتاً کے حوالے نہ کر دیا جائے۔ بہت سے لوگ باوجود صلاحیت و قابلیت کے اپنی زندگی سے کوئی بڑا کام مدۃ العمر نہ لے سکے، صرف اس لیے کہ کوئی مستقل نظام عمل ان کے سامنے نہ تھا۔

آپ کے لیے جس قدر میں نے غور کیا اخبار نویسی کی زندگی موزوں نہیں بلکہ ہلاکت وقت و ضیاع قوۃ ہے۔

اخبارات بلاشبہ دعوۃ وتذکیر کا ایک بڑا ذریعہ ہیں۔ لیکن جب تک ایک نہایت ہی نمایاں اور غیر معمولی شکل میں ان سے کام نہ لیا جائے اور نہایت وسیع پیمانے پر اسباب و وسائل مہیا نہ ہوں، مطلوبہ اثر پیدا نہیں کر سکتے اور محنت بکسر رائیگاں جاتی ہے۔ اوّل تو ایسا اہتمام چند در چند وجوہ سے متعذر، ثانیاً بصورت حصول، اس درجہ مشکلات و عوائق حائل کہ ان پر عبور و غلبہ شخص واحد سے ممکن نہیں جب تک جماعت نہ ہو۔

علاوہ بریں اس شغل میں رہ کر صرف سیاسیات کیلیے وقف ہونا پڑتا ہے اور علمی ذوق کو مدۃ العمر کیلیے ترک کر دینا پڑتا ہے۔ آپ کے لیے بہترین زندگی علمی زندگی ہے اور اس شکل و طرز کی جس کا نمونہ سلف صالح کے حالات میں ملتا ہے۔ علماء اسلام کے حالات پڑھیے۔ درس و تدریس، وعظ و ارشاد، اور تصنیف و تالیف تینوں چیزوں کو بیک وقت کرتے تھے اور اس طرح ایک ہی زندگی بیک وقت تین عظیم الشان خدمات انجام دیتی تھی۔ عوام کی اصلاح وعظ و تذکرے سے، مستقبل کے لیے طیاری درس و تدریس سے اور علم و مذہب کی خدمت دائمی تصنیف و تالیف سے، ابن جوزی مصنف ہیں، مستنصریہ کے صدر مدرس ہیں، اور جامع رصافہ کے واعظ، غزالی مدرسہ طوس کے معلم، سو کتابوں کے مصنف اور جامع طوس کے واعظ۔ علماء اسلام کی زندگی کے لیے تو یہ چیز طبیعت ثانیہ ہو گئی تھی، ایک شخص آپ کو نہیں ملے گا جو اپنی زندگی میں یہ تینوں شغلے نہ رکھتا ہو۔ صبح کو درس دیا، بقیہ اوقات میں تصنیف و تالیف، اور مجامع و جوامع میں وعظ و تذکیر کا سلسلہ جاری۔ جب سے یہ چیز مفقود ہو گئی اور ان تینوں اجزاء کو الگ الگ کر دیا گیا، واعظوں کا طبقہ الگ، مصنفین کا الگ اور معلمین کا الگ، اسوقت سے سلسلۂ ہدایت حقیقی و نشو و نمائے علم مفقود و معدوم ہو گیا۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ کمر ہمت چست باندھیں اور عزم راسخ کر کے اس زندگی کے لیے طیار ہو جائیں۔ آپ کے لیے بہترین موقع حاصل ہے۔ چھوٹا ناگپور ڈویژن ایک وسیع خطہ ہے لیکن علم و ہدایت سے یکسر محروم۔ چونکہ ایک گوشہ میں واقع ہے اس لیے علماء کی آمد و رفت بھی کمتر ہوئی، اور جہل و افلاس نے اور زیادہ حالت خراب کر دی۔ اب ادھر دو سال کے میرے قیام سے حالات متغیر ہوئے ہیں اور اللہ نے جس قدر توفیق دی دعوۃ و تبلیغ کا فرض ادا کرتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک غیر مترقبہ زندگی پیدا ہو گئی اور لوگوں نے اپنی حالت کو محسوس کیا۔ اب شدید ضرورت یہاں اس کی ہے کہ ایک عالم صالح مستقل طور پر قیام کرے اور جو تبدیلی ہوئی ہے، وہ آئندہ ضائع نہ جائے۔ اگر ایک شخص نے یہاں قیام کیا تو پورے خطہ کی دینی پیشوائی و امامت اس کے ہاتھ میں رہے گی اور باطمینان مسلمانوں کے ایک گروہ عظیم کی ہدایت و ارشاد میں مشغول رہے گا۔ دوسرے مقامات میں علماء سوء کی کثرت اور دجاجلہ فساد و جہل

کی مقاومت سے اصلاح وہدایت کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے اور کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ یہاں یہ بات بالکل نہیں ہے اور ابتدا سے بنیاد صالح پڑ چکی ہے اور اب جتنی عمارت بنائی جائے اور جیسی بنائی جائے بن سکتی ہے۔

پس ہدایت و دعوت کے عمومی پہلو سے تو ایک گروہ عظیم اتباع و اعتقاد کے لیے موجود ہے بلا شرکت غیرے اب رہی دوسری چیز یعنی مشغلہ درس و تدریس تو اس کا حال یہ ہے کہ جب انجمن اسلامیہ کی یہاں بنیاد ڈالی اور مدرسہ کا خیال ہوا تو سوچا کہ اپنی قوۃ کو چھوٹے چھوٹے مقصدوں پر خرچ کرنا بہتر نہیں۔ آج تیس برس سے اصلاح نصاب کا مسئلہ مصر و ہند میں درپیش ہے اور عملاً طے نہیں ہوتا اگر یہاں ایک کالج قائم ہو جائے اور اولین تجربہ پیش نظر نصاب اصلاح یافتہ کا کیا جائے تو یہ ایک عظیم الشان کام ہوگا۔

اسی اثنا میں مدرسہ عالیہ کے اصلاح نصاب پر ڈائرکٹر تعلیم بنگال کو توجہ ہوئی اور اس کے لیے مجھ کو ایک نصاب جامع مرتب کرنا پڑا اس بات سے مزید تحریک ہوئی اور مدرسہ کو اسی اصول پر قائم کیا گیا۔ مدرسہ کا نصاب جونیر اور سینیر دو درجوں میں منقسم اور پوری مدت تعلیم چودہ سال ہے۔ پہلا درجہ آٹھ سال کا ہے۔ اس میں صرف و نحو عربی بالکل ختم، ادب شروع، فارسی مکمل ختم، حساب و ہندسہ ختم، ترجمۃ القرآن کامل، تاریخ ہند، تاریخ اسلام بالاجمال، اور انگریزی ادب ہے۔ دوسرا درجہ چھ سال کا ہے اور تکمیل ادب برنہج و اسلوب قدما، علوم القرآن، علوم الحدیث، فقہ حنفی، فقہ جامع، اصول، توحید، علم اسرار الدین، علم اخلاق، تاریخ عام، تاریخ اسلام، تاریخ علوم مذہبیہ، تاریخ مذاہب و طوائف اسلامیہ، معقولات قدیم، مسائل العلوم، تطورات اور مصادر کتب اور انگریزی علم و ادب ہے۔
اس کے بعد درجہ تکمیل کے دو سال کسی ایک فن یا صرف انگریزی کا۔

ابھی مدرسہ کی ابتدائی جماعتیں کھول دی ہیں عمارت آخر اپریل تک مکمل ہو جائیگی اور پھر کوشش کی جائیگی کہ تمام جماعتیں شروع ہو جائیں۔ اب چونکہ یہ مدرسہ مسئلہ اصلاح تعلیم اسلامی پر مبنی ہے اس لیے صرف رانچی ہی کا مقامی مسئلہ نہیں بلکہ تمام ہندوستان کا مسئلہ ہے۔ اس کا انتظام ہمیشہ میرے ہاتھ میں رہے گا اور مصارف وغیرہ کی طرف سے پورا اطمینان ہے۔

آخری چیز مشغلہ تصنیف و تالیف ہے اور یہ بہت ضروری ہے اس کا حال یہ ہے کہ بلحاظ مقام کے کلکتہ اور رانچی اور دیگر مقامات سب یکساں ہیں۔ ہندوستان میں اس کے اسباب و سامان کا بطرز یورپ کہاں سامان ہے؟ صورت یہی ہے کہ کوئی ایک مستقل تصنیف پیش نظر رکھ لی جائے اور اس کے مواد و سامان کو فراہم کیا جائے۔ اس کے لیے میں موجود ہوں جب تک رانچی میں ہوں کتب خانہ بھی موجود ہے اور اگر کلکتہ چلا گیا جب بھی کلکتہ رانچی سے قریب نیز مشورہ و مواد کے لیے ہر طرح آمادہ و مستعد۔

یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ کیا چندہ کی فراہمی کے لیے دورہ کرنا پڑے گا؟ تو اس کا کوئی سوال نہیں ہے۔ انجمن کے چندہ کی فراہمی کے جھگڑے سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں اور نہ اس کے لیے دورہ میں تضییع وقت۔ آپ کا قیام تو یہیں رہے گا۔ لفظ وعظ سے مقصود یہ تھا کہ ایسے شخص کی ضرورت ہے جو وعظ و ہدایت کا سلسلہ بھی جاری رکھے اور جمعہ کی امامت و خطابت وغیرہ اس سے متعلق ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری موجودگی میں ایک شخص یہاں آ جائے اور لوگوں کو اس سے شناسا کر دیا جائے۔ اس کی حیثیت یہاں ایک عالم، مفتی، قاضی، امام جمعہ اور ہر طرح مقتدائے شہر کی ہوگی اور تمام شہر صرف اسی کی طرف رجوع کرے گا۔

یہ بات دوسرے مقامات میں بآسانی میسر نہیں آ سکتی۔ چونکہ ابھی عمارت کا کام ختم نہیں ہوا اس لیے مصارف دائمی میں تخفیف پیش نظر ہے اور سر دست انجمن علاوہ مکان و اکل و شرب کے مٹ کے لیے طیار ہے مگر افتتاح عمارت مدرسہ کے بعد یہ رقم قطعاً اللغہ؟ ہو جائیگی۔

بہتر یہ ہے کہ آپ سر دست ایک ماہ کے لیے وقت نکالیں اور رانچی چلے آئیں۔ یہاں چند دنوں رہ کر تمام حالت کا اندازہ ہو جائے گا۔ اگر کسی وجہ سے آپ کی طبیعت نہیں لگی تو آمد و رفت کے مصارف انجمن کے ذمہ ہونگے اور آپ واپس چلے جائیے گا۔

(۲۳)

عزیزی، السلام علیکم

جو حالت اپنی آپ نے لکھی ہے تخصیص و تعیین کے ساتھ تو اس کا علم نہ تھا، لیکن یہ معلوم تھا کہ اس طرح کے حالات میں ضرور آپ مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری ہر حالت کو موجب صلاح و فلاح فرمائے۔ یقین کیجیے کہ دنیا میں انسان کے تمام قوائے و فضائل کے لیے اصلی آزمائش گاہ یہی حالات ہیں۔ تلوار اور آگ میں کوئی آزمائش نہیں۔ سب سے بڑی آزمائش نفس و جذبات ہی کی ہے۔ اگر عزم راسخ اور قوت ایمانی و احسانی سے کام لیا جائے تو اس آزمائش میں کامیابی کچھ مشکل نہیں۔ والذین جاہدوا فینا لنہدینہم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین۔ میں اپنی دعاؤں میں کبھی اس معاملہ کو نہیں بھولوں گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس آزمائش میں کامیابی کی توفیق عطا فرمائے۔

موجودہ حالت میں بجز دو راہوں کے تیسری راہ کوئی نہیں:

(۱) عزم صادق اور ہمت کامل سے کام لیجیے۔ اپنے اندر عزم پیدا کیجیے اور اللہ سے مددگاری طلب کیجیے۔ زندگی چند روزہ ہے اور سارے مطلوبات نفس وہم و خیال سے زیادہ نہیں۔ کب تک اس بند و قید میں گرفتاری رہیگی!

جو دل فاطر السماوات والارض کے عشق کا متحمل ہو سکتا ہے اس کو فانی و مرہمی الفتون میں لگانا انسانیت و حیات کو تباہ کرنا ہے۔ طلب مفرط جس چیز کو بھی ہے انداد و طواغیت میں داخل ہے۔ فلا تجعلوا للّٰہ اندادا وانتم تعلمون اور یحبونہم کحب اللّٰہ والذین آمنوا اشد حبا للّٰہ۔ محبت الٰہی کا دعویٰ ہے تو سب سے زیادہ احب چیز کو اس کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ حتی تنفقوا مما تحبون۔ پس اصلی و حقیقی اور ایمانی و احسانی راہ تو یہی ہے کہ اللہ سے دل لگائیے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب اور ایک مرتبہ پوری قوت و عزم کے ساتھ انی وجہت وجہی للذی فطر السماوات والارض حنیفا اور لا احب الآفلین کی صدا لگا کر اس خیال کو دل سے نکال دیجیے۔ اگر آپ کی جانب سے عزم ہوا تو توفیق الٰہی ضرور مساعد ہوگی اور ان شاء اللہ ایک جہاد اکبر کا اجر عند اللہ ۔ غور کیجیے آپ متاہل ہیں مجرد نہیں۔ پھر صاحب اولاد۔ نیز تنگی اہل و عیال کی کشاکش سے درماندہ۔ کوئی ضرورت شرعی و اخلاقی ازدواج ثانی کے لیے باعث نہیں۔ پھر ایک طرف افلاس و قلت معیشت کی بے سر و سامانی دوسری طرف عوازم و معالی امور و عمل کا ولولہ۔ ان حالات میں اگر یہ معاملہ انجام پایا تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ بلا شبہ ابتدا میں مسرت حصول مطلوب کا ہیجان تمام محسوسات پر غالب آجائے گا۔ لیکن بہت تھوڑی دیر کے لیے۔ اس کے بعد قدرتی کشاکش و کشمکش اور مشکلات و صعوبات کا سلسلہ شروع ہوگا اور جیسا کہ اکثر حالتوں میں ہوا ہے عجب نہیں کہ خود اس معاملے سے دل برداشتہ ہو جائے۔ یہ کشمکش زندگی کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے۔ ابھی ایک لمحے کے لیے اس کا احساس نہیں ہو سکتا۔ یہ عام قاعدہ ہے لیکن جب یہ حالت پیش آئے گی تو کوئی علاج سود مند نہ ہوگا۔ سب سے زیادہ یہ کہ پوری امانت داری کے ساتھ خود اس شخص کے مصالح پر غور کرنا چاہیے جس کی محبت میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ایک معصوم لڑکی ہے۔ دنیا اور دنیا کے مصائب سے بے خبر۔ کیا یہ بہتر ہوگا کہ اس کو ایک ایسی زندگی میں لایا جائے جس کے مصائب و مشکلات کا ہم کو ابھی سے علم ہے؟ اور ہم جانتے ہیں کہ عیش و آرام حیات اس کے لیے مہیا نہ کر سکیں گے۔ پھر اپنی بیوی کا خیال کیجیے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کو ان سے شکایت نہیں۔ کیا محبت و وفا کا یہی اقتضا ہونا چاہیے کہ بلا وجہ اس کی تمام بقیہ زندگی تلخ کر دی جائے ؟

میری شادی کو دس سال ہو گئے۔ یقین کیجیے کہ میرے لیے ایک نہیں متعدد وجوہ و بواعث شرعاً و عقلاً ایسے موجود ہیں کہ اگر ان میں سے ایک باعث بھی کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہوتا تو وہ دوسرا نکاح کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتا۔ بایں ہمہ میں نے ایک صبح و شام کے لیے بھی اس کا قصد نہیں کیا اور نہ کروں گا۔ پھر ساتھ ہی دوسروں کی جانب سے اس بارے میں اس قدر مجبور کن ترغیبات پیش آتی رہیں کہ عزم کا باقی رہنا بہت مشکل تھا تاہم میرے ارادے میں تزلزل نہ ہوا۔ صداقت حیات بجز قربانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اگر ہم اپنی خواہشوں کو قربان نہیں کر سکتے تو پھر زندگی

میں محبت ہے نہ سچائی اور نہ انسان۔ آپ کہیں گے دل کس کے بس میں ہے؟ ہاں لیکن جو چاہے اس کے بس میں ہے۔ دل سے اوپر بھی ایک طاقت ہے۔ اس کو جگا دیجیے سونے نہ دیجیے وہ دل کی لگام جس طرف چاہے گا موڑ دے گی۔

اس بارے میں کثرت سے عواقب و نتائج پر غور و فکر، مغلوبات نفس کی ہیچ مایگی اور بے حاصلی کا تصور، کثرت استغفار و دعا، اور مشغولاتِ دینیہ انشاء اللہ نہایت سودمند ہوں گے۔ اگر ایک دعا بھی پورے اضطراب و التہاب کے ساتھ نکل گئی تو پھر کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا۔ صرف اس حقیقت کی ضرب اگر ایک مرتبہ پوری طرح لگ جائے کہ طلب عشق اور اضطراب قلب و اشک چشم جیسی نعمتیں ایک وہمی و خیالی مطلوب کے لیے کس طرح ضائع جا رہی ہیں، اور اگر یہ سب کچھ اللہ کے لیے ہو جائے تو پھر ہستی و جود فانی کیا کچھ نہیں کر سکتا تو پھر اس آزمائش سے نکل جانے میں ذرا بھر رکاوٹ پیش نہ آئے گی۔

(۲) لیکن اگر ضعفِ عزم ساتھ نہ دے اور اس راہ کی قوت نہ ملے تو پھر دوسرا مشورہ یہ ہے کہ تمام خیالات چھوڑ کر فوراً مجاگل پور چلے جائیے اور جس طرح بھی ممکن ہو اس کے والدین کو راضی کر کے نکاح کر لیجیے۔ اور جس قدر مشکلات و مہالک پیش آئیں گے ان کو گوارا کر لینے کا قطعی فیصلہ کر لیجیے۔ یہ بات پھر بھی ہزار درجہ موجودہ اضطراب نفس سے بہتر ہوگی۔ اقلاً بہت سے انتہائی نقصانات مفقود ہو جائیں گے۔

غرض کہ یا فوراً بلا تاخیر اس خیال کو بالکل دل سے نکال ڈالیے یا فوراً بلا تاخیر جا کر کسی نہ کسی طرح نکاح کر لیجیے۔ تیسری حالت کوئی نہیں۔ اور اگر اختیار کی جائے گی تو سخت مضر ہوگی۔

والعاقبۃ للمتقین

ابوالکلام آزاد

۵۵

INDIA POST CARD

THE ADDRESS ONLY TO BE WRITTEN ON TH

REPLY.

M. E. Zacharias.

Tatarpur,

Bhagalpur City

[illegible]

INDIA

POST CARD

REPLY.

WRITING SPACE ADDRESS ONLY



M. E. Zacharia
Headmaster
Anjuman Tanweerul
Islam
Sadar bazar,
Barrackpur,
Cant.



(۱۴)

عزیزہ والسلام علیکم خط ملا پرسوں خط بھیج چکا ہوں

[illegible] دوبارہ طلب نہ [illegible] خاطر [illegible] کا سامان آپ فراہم

جو کچھ [illegible] آپ کے پاس نہیں ہے [illegible] لیے کسی یاد [illegible]

ضرورت نہیں [illegible] روزانہ پڑھیے جو کچھ سبق [illegible] پڑھ لیا کرو

[illegible] دیکھو [illegible] دو گی [illegible] بالفعل صورت حال ایسی نہیں ہے کہ

[illegible] بھیج کر [illegible] ابوالکلام کلکتہ



POST INDIA CARD

WRITING SPACE

ADDRESS ONLY

دہلی ۱۲/۱۰ ۲۱

عزیزی خط ملا ترجمان القرآن کو یہ
مینجر صاحب کو کہدیا ہے - غالباً مل گیا ہوگا - اللہ تعالیٰ
فہم و مطالعۂ قرآن کی توفیق عطا فرمائے - میں
ضرور آپکے لیے کوئی راہ نکالتا بشرطیکہ کوئی بات
موجودہ وسائل صورتیں موجود ہوتیں - آپ کو معلوم
ہے کہ بالفعل کوئی اب تمام یہ کام بند ہیں -
اگر آپ کو بلاؤں تو کون سا کام سپرد کروں؟
اگر دارالعلوم نے کوئی آپ سے بات کر دیا ہو تو [illegible]
یہ موزوں صورت عمل تک تو تخفیف نہیں
دیکھئے میری جانب سے کوشش رہیگی والسلام
ابوالکلام

INDIA POST CARD

WRITING SPACE

ADDRESS ONLY

عزیزی مولوی محمد ذکریا صاحب
محلہ تاتارپور
بھاگلپور سٹی
Bhagalpore (بہار اڑیسہ)

INDIA

CARD

WRITING SPACE

ADDRESS ONLY

مولوی محمد زکریا صاحب

محلہ تاتار پور

بھاگلپور سٹی

(بہار)

عزیزی        مسعود سلّمکم و حفظکم اللہ بالخیر

کل میں کلکتہ کیلیے روانہ ہو جاؤں گا ۔

یا تو خود یا بذریعۂ موذن وغیرہ اس کا انتظام کیجیے

کہ آج رات ٹھیک گیارہ بجے یہاں ٹیکسی آ جائے

ابوالکلام

عزیزی — اپنے رقعہ میں جس امر کی بابت لکھا ہے، دراصل اسکا تعلق
غلط فہمی سے ہے۔ آج شام کو حاجی رفاقت حسین صاحب سے گفتگو ہوگی ان شاء اللہ
کل حسب مرضی معاملہ صاف ہو جائیگا۔ حاجی صاحب کا بھی یہ مقصد نہ تھا
وہ آپکی مخلصانہ خدمات انجمن کے پوری طرح معترف اور قدردان ہیں۔
دراصل اصل معاملہ سے وہ بے خبر تھے اسلیے انکو غلط فہمی ہوئی۔ مولوی ناظم
صاحب وطن میں تھے انکا نام بل میں دیکھکر وہ اصل حقیقت
نہ سمجھ سکے۔ قطع نظر اسکا انکا تعلق تو مجھ سے ہے بس آپ کو اس قسم کے
امور سے دلگرفتہ نہ ہونا چاہیے

افسوس کہ اسوقت مسجد سے آئے پیر میں کل کی طرح پھر سے
درد شروع ہو گیا ہے ارادہ ہے کہ پھر ہوں کہ کھانا نہ کھاؤں اور
جلد نماز پڑھ کے فارغ ہو کر سو جاؤں۔ اسکا مشورہ ملاقات پر رہا
کل بعد نماز جمعہ ہو جائیگا اور پھر شام کو۔ والسلام

شدہ نامہ ...

باسمہ

سیدی العزیز السلام علیکم

بڑی عید یکم ۔ مقرر ہوں ۔۔۔۔ ایسے فاضل ہیں ۔۔ کہ کوششیں کامیاب

اللہ ۔ نتیجہ خیز ثابت کرے اب شاید ہو سکتی ۔ تا میں خود بھی لکھ رہا ہوں،

اور مجھے معلوم ہے ۔ کہ وہاں کو کام ہیں ۔ سہروردی کو لکھ دیا ہوں،

ابوالکلام آزاد

رانچی ۲۶ شوال

عکس : ایم۔ اے۔ ذکریا ۔۔۔ بھاگلپور
بتوسط : محمود واجد

بارک اللہ

عزیزی و صدیقی السلام علیکم آپکے لیے ایک صورت نکلی ہے

کلکتہ میں اسلامی یتیم خانہ ہے اسمیں بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم کیلیے بیس روپیہ

کی ایک جگہ ہے وہ آجکل خالی ہے میں نے سکریٹری کو لکھکر آپکے لیے گنجائش

نکالی ہے اور بیس کی جگہ پچیس ۲۵ روپیہ منظور کرایا ہے - مکان بھی مفت

کو مفت ملیگا - بقیہ وقت میں آپ اور اشغال جاری رکھ سکتے ہیں -

اگرچہ اس جگہ کیلیے انگریزی کی شرط نہیں ہے لیکن مجکو ایسا یاد پڑتا

ہے کہ آپنے انگریزی بھی پڑھی ہے چنانچہ میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا .

منتظمین یتیم خانہ مذہبی اعتقادات میں ناواقف ہیں اور حضرت

کے عاشق سابق معلم کو اسی جرم میں نکالا گیا کہ وہ مولود اور قیام

کے مخالف تھے - میں نے کہدیا ہے کہ آپ پکے حنفی اور نقشبندی

طریق میں بیعت کردہ ہیں پس ان جزئیات کا خیال رکھیے .

آپ فوراً بنگلور سے روانہ ہوکر سیدھے کلکتہ [illegible] پہنچیں اور

مرزا احمد علی سکریٹری یتیم خانہ کمیٹی نمبر ۳۰ لوویٹ پور روڈ
سے جا کر ملیے اور میرا خط دکھلائیے ۔

بحالت موجودہ یہ بڑا غنیمت ہے اسے منظور کر لیجیے
اس کے بعد ان شاء اللہ عجب نہیں کہ فقیر کا بھی کلکتہ جانا ہو، اور
تمام امور عمل میں آئیں ۔ والامر بیدہ سبحانہ وتعالیٰ،

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ

۲۲ ذیقعدہ ۳۴ھ

رانچی، بہار

۲۸۶

ڈاک بنگلہ - رانچی

۶ - اپریل -

برادرم        السلام علیکم

اپنے ارادہ اور قیام سے اطلاع دیجیے - اگر کچھ دنوں رہنا ہے یا آج کا قصد ہے ؟

اللہ تعالیٰ کی رحمت آپ کے شامل حال رہے -

ابوالکلام

سلام علیکم

افسوس ہے آج شام کو ہی اب جعفری صاحب نے شام کو ...

سے ملاقات نہ ہو سکے گی -

دعوت دی ہے مجبوراً وہیں رہوں گا -

~~[illegible]~~ ایسے آپ بشرات آج

زحمت نہ فرمائیے اور دل دکھانا

کسی وقت ممکن ہو - انشاء اللہ کل ملاقات

ہوگی -

ابوالکلام

پیرس

عزیزی الاجل السلام علیکم

آج تاخیر اسلیے ہوئی کہ کلکتہ سے جواب کا انتظار رہا

آپکی علالت کا حال پڑھکر نہایت قلق ہوا ۔ اللہ تعالیٰ فضل کرے

فرماتا ہے اور اچھا ہوا [illegible] یقین ہے کہ یجیب المضطر اذا دعاہ

میں نے بہت کوشش کی کہ زیادہ عرصہ تک کلکتہ خالی رہے

مگر امیدواروں کا ہجوم ۔ شاید جنید کے بعد وہ کوئی انتظام کریں

بہرحال محبت شعار ہے ۔ اور خدا کے خزانوں میں

رزق کی کمی نہیں ۔ انشاء اللہ وہ کوئی اور صورت پیدا

کر دیگا ۔ بیگم صاحب کو لکھدیا ہے ۔ نیز

دوا خانہ کو لکھدیا کہ دوا آپکو بھیجدے ۔ اور قیمت

مجھ سے وصول کرلے ۔ ہر چیز جو [illegible] ہے بے تکلف لکھئے

خدا آپکو [illegible]

ابوالکلام آزاد

[illegible]

[illegible]

[illegible] 21.4.17

عزیزی السلام علیکم

خط تمہارا ملفوف پڑا رہا اور خیال یہ ہوا کہ جواب لکھ چکا ہوں لیکن آج

دیکھنے سے معلوم ہوا کہ خط کا جواب نہیں گیا -

الحمدللہ اللہ تبارک کا فضل شامل حال ہے۔ یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی

کہ اب آپ بصحت و عافیت ہیں

[illegible]

تاریخ ۱۸-اپریل

[illegible]

[illegible] ہونا چاہیے ۔ بلکہ

آپ نے [illegible] کلکتہ [illegible] مضمون [illegible] ہے [illegible] عنوان

میں کون اک شخص ہے [illegible] حالات کی

گنجائش نکل سکتی ہے ۔ اگر [illegible] تو غالب [illegible] ہو

بعینہٖ آپ [illegible] میں [illegible] اگر ہو [illegible] نظر آئے

تو مجھے لکھیں [illegible] میں پوری [illegible] کروں گا

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ یہ [illegible]

مختصر [illegible] ہے ۔ مجھے [illegible] اس [illegible] کوئی

شک نہیں ۔ یعنی یہ [illegible] میں [illegible]

اس ذخیرے [illegible] اس کام کو [illegible] اپنے لیے ضروری [illegible]

میرا کام ہے ۔ میں نے تو [illegible] سمجھ کر اس کو [illegible]

یہ بات ضروری ہے کہ اس [illegible] کو میں [illegible] نہ کروں گا ۔ اب

دیکھیں [illegible] موافق طبع ہو تو کریں ۔ ورنہ [illegible]

میں دونوں حالتوں میں خوش ہوں ۔ [illegible]

علاوہ [illegible] دائرہ [illegible] خارج ہیں ۔ [illegible]

میں ہیں [illegible] اگر [illegible]

عزیزہ رضی فرزانہ — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ [illegible] اور وعدہ عمرے

[illegible] معنوی و صوری ہو — [illegible] رسائل پر

[illegible] اور نہ انشاء

[illegible] کہ ابتک آپکا [illegible] نہیں [illegible]

علالت [illegible] — جب [illegible] سے اپنے [illegible]

— نتیجہ نہیں نکلا تو [illegible] کہ جلد سے جلد [illegible]

[illegible] جائے — [illegible] ناگزیر ہے اور

جواب [illegible] اسی لیے [illegible] ہوئی کہ انکی [illegible] درپیش تھی —

ان شاء اللہ امید ہے کہ عنقریب [illegible] ہو جائیگا — بعض اسباب سے اُدھر

(یکے بعد دیگرے مجبوریاں پیش آتی رہیں اور بعض تازہ حالات نے

دل کی طرح [illegible] خالی رکھا —

[illegible] آپنے اپنے [illegible] جو لکھا ہے

[illegible] ملتوی ہوا [illegible] خدا [illegible] — خاکسار

[illegible] کی تکمیل اسی [illegible] تھی — جب [illegible]

[illegible] آزمائش [illegible] نہیں ہو

[illegible] آخر [illegible]

[illegible] ہوگی — جب

[illegible] والسلام

وقت آگیا - اور اب واللہ آپکا اجر صبر بھی آخری درجہ

[illegible] انجام خدا سخت ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ

نزدیک [illegible] ہے -

[illegible] درد انگیز ہے مگر کیا ممکن ہے کہ

[illegible] تعزیت و تسلیت و تحمیل کریں؟ قلب انسانی [illegible]

[illegible] اللہ [illegible] بہت بڑی لیکن [illegible] ہے [illegible]

[illegible]

والد [illegible]

[illegible] اور [illegible]

[illegible] بھی لکھا ہے - یہی خود کب انکو

پسند کرتا ہوں کہ جیسا بھی آپ مجھے دور رہیں لیکن

علاج سب پر مقدم ہے اور اس کے لیے [illegible] جانا لازم و لازم

پس اس کا تہیہ کیجیے [illegible] بھی ممکن ہو - اور ہر

بھی ان [illegible] بمجرد حصول و بہ اول حصول اسلیے

[illegible] اپنا [illegible] و حسبنا اللہ و نعم الوکیل ولا حول

ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم [illegible]

[illegible] گردہ [illegible]

[illegible] ضعف گردہ [illegible]

[illegible] گردہ [illegible] ضعف [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] مشتاق [illegible] اللہ [illegible]

[illegible] کہ [illegible] اتفاق [illegible]

[illegible]

[illegible] اتفاق [illegible]

[illegible] دوسرا [illegible]

[illegible] مطلوب ہے اور [illegible] اختیار [illegible]

[illegible] وقت [illegible]

[illegible]

[illegible] وقت [illegible]

[illegible] لیکن [illegible]

[illegible] ایک [illegible]

[illegible] ابتک [illegible] زیادہ [illegible]

[illegible] اصل [illegible] انکو [illegible]

[illegible] گفتگو میں مجھے [illegible]

[illegible] دوسری جگہ نکلتا ہے اور بمجرد علم [illegible]

[illegible] دو [illegible]

[illegible] اصل [illegible]

[illegible]

وہی سے متعلق ہے - نفع نقصان وہ جانیں - اگر عقل و دانش
سے کام لیتے اسراف میں نہ پڑتے رئیس زادوں بیویوں کی پرورش نہ کرتے
حالت کے مطابق خرچ رکھتے تو آج یہ بات نہ ہوتی - حتی الوسع
مشورہ و فہمائش میں کمی نہیں کی ہے لیکن افسوس کہ [illegible] کیا
غیر محتاط خرچ کیے - نوبت ابتلا کی - اب وہ جانیں
اور ان کا کام ہے - [illegible] برسوں پر کوئی تاکید جاری نہیں ہو سکتی
گو زحمت تو برداشت کی روکا بموجب ہو سکتی ہے - آپ ان کا
سعادت کو دنیا پر چھوڑ دیں - اس اثر میں میری فہمائش
ایسی بے اثر دیکھی کہ ہے - میرا سارا وقت اتنا ہوا
کہ نہ پڑھنے کی جگہ برسوں کا کام نکال رکھے اور کچھ
[illegible] دیے - اور مجھ کو ان سے نفع نہ ہوا - اور نہ ہوگا -
نقصان [illegible] ہے یہ خلاف امید نہیں - دنیا کا یہی حال ہے
[illegible] ایسی بدل نہیں سکتے
[illegible] کام ضروری ہے - ایک نسخہ تذکرہ دوبہ اول حکیم مرحوم
[illegible] [illegible] کے نام رجسٹرڈ بھیج دیجیے - انھوں نے شرح یہ
شرح میں [illegible] چھپوایا تھا [illegible] ایک نسخہ تو

[illegible]

[illegible] صحبت نہیں ہوا اگر آپ کی طبیعت بھی [illegible] ہو [illegible]
[illegible] کی حالت ہے؟ آپکو [illegible] مقصود یہ ہے کہ قبل از
[illegible] میں شعائرات [illegible] ایک دوره کیا جائے اور [illegible]
[illegible] کارڈ بانٹے جائیں - لوگوں کو دیئے جائیں - [illegible] اشتہارات شائع
[illegible] پر چسپاں کئے جائیں یہ [illegible] لیکن اگر آپکی طبیعت درست
نہیں تو پھر یہ تمام [illegible] کیونکہ [illegible] یا [illegible]
- [illegible] صورت [illegible] تو [illegible] پر مستعد شخص
[illegible] کام کیلئے [illegible] ہے [illegible] یا شائع ہوا لوگوں میں
[illegible] تو تمام مصارف [illegible] ادا کئے [illegible] واجره
[illegible] اسکے علاوه
بہرحال اسکا [illegible] ہے کہ [illegible] کرے، خواہ خود آپ
خواہ کسی اور ذریعہ سے، اصل کام تو [illegible]
[illegible] ہے -
(۱) جلسہ کے [illegible] انگریزی کارڈ، چسپاں
[illegible]
(۲) [illegible] جو لوگ ان چیزوں سے [illegible] ہوں
[illegible] یا کارڈ یا [illegible] بالمشافہ
تقسیم کیجئے اور [illegible] جلسہ [illegible]
[illegible]
[illegible]

بیشک انکا خیال رہے کہ کارڈ رہ گئے ہیں اور صرف ان لوگوں کو

دیئے جائیں جو انگریزیت میں رنگے ہوئے ہوں وار نہ

اردو خطوط۔ بالمیور کیلیے دس خط روانہ کئے ہیں

لیکن حسب ضرورت زیادہ صرف کر سکتے ہیں۔

اور دس پوسٹر لیتے۔ پوسٹر شہر کا حصہ و ممایان

ہیں۔ انکا خیال نہ کریں اور یہ جائیں۔

(۳) ایک بند مورخہ ہانگل پور جا رہے ہیں۔ اور ڈاکٹر محمود اور

دارالعلوم جنرل سکریٹری شپ ایسے ملے۔ ڈاکٹر محمود ایک

مشہور جنرل سکریٹری ہوں۔ مشہور عالم مجلس کے دانا دشمن۔ ان

دونوں صاحبوں سے ایسے کہ جو بے اعتبار زحمت دینا مقصود ہے

کہ بزرگان بانگلی پور کا کوئی نہیں ایسا تو خود نہیں ہے۔

اس قسم کے لوگوں کے نام دیئے تاکہ انکو خطوط بھیجے جاویں

خاص طور پر دیئے جائیں۔ اور شرکت جلسہ کیلیے اصرار

کیا جاوے۔ اور آپکی نسبت تو شرکت کا پورا یقین ہے۔

بانگلی پور کے علاوہ دیگر مقامات بہار کے نام بھی آپ سے امداد

دیکھیے۔ اور کلکتہ ان تک پہنچا دیجیے۔ اسی طرح مقامات

دیگر بعد پوسٹر بانگلی پور وغیرہ میں بھی بھیجنا۔ اور

بر وقت تقسیم کرنا چاہیے۔ اور عام طور پر لوگوں کو ملنے

دعوت دیجیے۔ کوشش کر کے جاویں۔

(۴) دیکھنا ہے آپ گیا اور زیادہ بحث

... نظفر پور ... مولوی ریاض حسن صاحب

... اسے مدد ملیگی ... ذکر کرنا

... الہ آباد ... محمود ... مشورہ کر لینا چاہیے

... علماء و مختلف ... دونوں

یکجے ... دینی ... چاہیے

اور اخری ... علوم دینیہ پر مبنی۔

(۵) ... اسلئے تحمل مطلوب ہے۔ یہ اچھا ہوگا کہ استاد

... خط و کتابت " بذریعہ پوسٹ ماسٹر ہو۔ یعنی ...

آپکا نام کے خطوط وغیرہ ... شہر

... پوسٹ ماسٹر کے ذریعہ ... انکو ہر جگہ پوسٹ آفس

... اور ... نام کی ڈاک ...

(۷) جو نظم آپکی علالت کی وجہ سے التوا میں پڑا ہوا ہے

... تصور مسعود ... جلد ...

... شروع کیجیے ... خط ... معارف

... آپ ... کا

...

...

٤٦

(٦) مجھ کو خدمت میں رقعہ بھیجا اُن کی شرکت تو نہایت ضروری
اگر حضور بھی موصوف امر فرمائیں تو وہ ضرور شریک ہونگے
بس آپ کو سعی و کوشش کیجئے — یہ انجمن منسوب ہاو ریاست کی

(٧) خدام دینی بھی شرکت کی اطلاع دے چکے ہیں اور شکر ہے کہ اکثر خود
اس صوبہ کے علماء و احباب — ان کی نسبت و دیگر شرکاء کی

(٨) ریاست سے ہوئی — یہ بھی لکھا کہ اکثر حضرات

(٩) اس کی شرکت کا کیا حال ہے — بلکہ رسم اطلاع رقعہ و تار دی

(١٠) اس صوبہ کے بیمار کے وعظ و تقریر کی خاصیت

ضرور شرکت — عدم تکلیف میں ذرا بھی ہوگا —

(١١) بانگی پور میں حافظ حبیب الحق صاحب — قاضی دربار شریف کے پدر

بھی مجھ سے کچھ دن ملے اور کہا کہ آپ کی شرکت نہایت ضروری

ہو — اور علیہ عزیز بھی سعی و تعاون

(١٢) ایک شخص مولوی فخر الدین — انکے متعلق مسٹر محمد شرف اللہ

حیدرآباد — بلکہ ملاقات ہوئی — یہ جس شخص میں جو رفقاء

میں ہیں مجھ کو ان میں اعیان مولوی شرف الدین اور جمعہ کے

دن ایک مسجد آئے مجھ سے ملے آپکو بہت عزیز تھی — بلکہ

میں نے یہ بھی بیان کیا ہے اور آپ کے مسودہ ہو گیا

منظور ہو گیا — اور دعوہ دیجئے اور لکھئے کہ انجمن آپکو اپنا

مسودہ بھیجئے — انجمن کی جانب سے

میرا ذکر کیجیے کہ انکو اس بار ادھر میں بھیجا آپ نے بھی خاص حصہ لیا تھا
اس جلسہ میں کلکتہ سے تمام معززین و ممبران کونسل وغیرہ
شرکت کیلیے آ گئے تھے جس کا ذکر ہے – کس قدر افسوس
کی بات ہو اگر خود صوبہ بہار کے لوگ نظر نہ آئیں؟
حالانکہ جو کچھ ہے انہی کے گھر کا کام ہے –

---

ضروری — خدانخواستہ اگر آپ مجبور ہوں تو فوراً
بذریعہ تار مطلع کیجیے اور رقعہ وغیرہ واپس
کر دیجیے گا

---

سبحان اللہ السلام علیکم خط پہنچا۔ افتخار احمد صاحب وغیرہ کا تار آیا تھا
لیکن چونکہ وہیں تھے نہ تھا جواب نہ دیا گیا۔ بہرحال حالت میں تبدیلی تو ہونی ہی ہے۔ جب
اللہ کو منظور ہوگا ہو رہیگا۔ اس کی کاوش بے سود ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ جب تمہارا جلد کلکتہ آنا یقینی ہے تو پھر بولو اگر
بچے یہاں مشغول ہوں گے کیوں؟ — بلاشبہ بڑے بچے آ جائیں خوشی کا موقع ہو اگر
بڑے ہو رہے ہیں۔ آپ کے لیے گھر بہتر سامان کا ذریعہ ہو سکوں لیکن یہ چیزیں اصل
کار و مقصد میں داخل نہیں ہیں محض وسیلۂ معیشت ہیں۔ جہاں ہو ایمان
جم میں داخل ہے۔ علاوہ بریں بالفرض اگر میں کلکتہ آ بھی گیا تو یہ کہ
بچے بالفعل کوئی اچھی صورت ذہن میں نہیں۔ پریس میں کوئی ایسا کام نہیں
جسکو آپکے لیے منتخب کروں نہیں کہہ سکتا کہ پریس کے کام کی حالت اب ہوگی
موجودہ حالت میں صرف ایک تذکرہ کیجیے۔ مسٹر فضل دین بھی آپکو بلالیں
چونکہ وہ اپنے طور پر کام کر رہے ہیں اسلیے میں بھی دخل نہیں دیتا
ورنہ پہلے تو آپکے لیے یہ کام کوئی کام تھا نہ دقت کیجیے وہ موقع خوش قسمتی
برخلاف اسکے سوسائٹی اخبار روزانہ نکال رہے ہیں۔ کام اور ترقی
کا بہت اچھا موقع ہے۔ آدمی ہم مشرب اور خوش خیال ہیں۔
بحالت موجودہ آپکے لیے اس سے بہتر کلکتہ میں دوسرا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ تنخواہ بھی
امید ہے کہ مناسب ہوگی۔ آپکو ذاتی طور پر اخبار کے کام سے دلچسپی بھی ہے۔

ان تمام وجوہ کی بنا پر کس طرح مناسب نہیں کہ ان شدہ
وقعہ مجھ کو تم سے دیں ہے۔ فوراً سر اختیار کر لیں۔ ان شاء اللہ موجب
نفع عام ہوگا۔

پس اگر کلکتہ جلد پہنچ گئے تو جب کبھی حالات موجودہ
رفع ہو جائیں گے، اخبار وغیرہ کا کوئی کام پریس میں شروع ہو
سکے، دوسری مشغولیتیں درپیش ہو گئیں اور نئی مشکلات کی وجہ سے
ہیچ پوچ ہو گیا کوشش نہیں۔ نہ بیگانگی کا مختلف قسم کے بیجا کام پیش آئیں۔
جہاں تک جلد ہو سکتا ہے، ہو جائے۔ مجھے اطلاع دیجیے۔ رکھیگا۔
بڑی اچھی بات ہو اور میں یہ ہوگی کہ آپ کا قیام کلکتہ میں
بالمشافہ رخصت ہو۔ اسکے جو اسباب تھے تحریر کرونگا۔

ابوالکلام
رانچی ۲۰ دسمبر

(۲۰)

عطیہ: ایم ای - ذکریا جاوید
بتوسط: محمود واحد

کلکتہ
۳۰ - فروری ۳۰ء

جنابِ من! السلام علیکم۔ آپکا پرچہ ان ایام میں ملا ہے جب مجھے فرصت نہیں ہوتی، لیکن مشکل یہ ہے کہ زمانہ بے مہر ہے، اور ارباب درد کی جیب خالی ہے۔ بہرحال جونہی کوئی ایسی صورت پیدا ہوئی کہ آپکا یہ مسودہ شائع ہو، آپکو اطلاع دونگا

(۱) اکبر کا ان پڑھ ہونا کوئی غلط فہمی نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعہ ہے۔ لیکن کچھ ضروری نہیں کہ اسے تعلیم یافتہ ثابت کیا جائے۔ اسکی فطری ذہانت اور قدرتی استعداد کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ باوجود ان پڑھ ہونے کے ملک داری کی حکمت و سیاست کی سب سے بہتر مثال قائم کر گیا۔

(۲) جنوبی اور وسطی امریکہ کے آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایک زمانہ میں تعلق قدیم براعظموں سے رہ چکا ہے، لیکن جہاں تک تاریخی وثائق کا تعلق ہے، قطعیت و جزم کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کولمبس سے پہلے کسی سیاح نے اسے دریافت کیا ہو۔ اندلس کی تاریخ میں دو عرب بھائیوں کی داستان تلاش بیان کی گئی ہے، اور بعض لوگوں کا خیال ہے یہ دونوں بھائی امریکہ پہنچ گئے تھے، لیکن یہ محض ایک قیاس ہے۔ تاریخی حیثیت سے اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا

(۳) ریڈ انڈینز کا اطلاق امریکہ کی وطنی اقوام پر کیا گیا ہے۔ اور انکی تاریخ اس وقت تک تاریکی میں ہے۔

(۴) مذہب کا مقصود انسان کی روحانی سعادت و نجات ہے، اور ایک خالق کائنات کے رشتۂ عبودیت سے تمام افراد انسانی کو باہمدگر متحد کر دینا ہے۔ یہ سوال ایسا نہیں ہے کہ مختصراً جواب دیا جا سکے۔ بحث زیادہ تفصیل و کاوش کی ضرورت ہے

ابوالکلام

کلکتہ
۲۰ جون ۳۹ء

عزیزی، آپ کے خطوط مجھے ملتے رہے لیکن میں
آپ کو لکھتا تو کیا لکھتا۔ کوئی صورت ایسی موجود نہیں کہ اس پر
اعتماد کر سکوں اور آپ کو لکھوں کہ اسے اختیار کر لیجیے۔ آٹھ ماہ
تک مسلسل روزانہ آپ کلکتہ میں رہے اور کوشش میں کمی نہیں کی
لیکن کوئی صورت نہ نکل سکی۔ اب جو صورت اخبار کی وجہ سے
نکل آئی ہے، جیسی کچھ بھی ہو، بہرحال ایک صورت ضرور ہے۔
جب تک کوئی دوسری صورت نہ نکلے، اسے غنیمت تصور کرنا
چاہیے اور جاری رکھنا چاہیے۔ کم از کم بیکاری تو نہیں ہے۔
اگر میں نے دیکھا کہ یہاں کوئی صورت ایسی نکل سکتی ہے جو
آپ کے لیے کارآمد ہو سکے تو ان شاء اللہ غافل نہیں رہوں گا۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

نہ ... سے پہلے یہ واضح ہونا چاہیے۔ ... آیا یہ خیال مجھے کیوں پیدا ہوا

... زندگی کا بیان ... لکھ کر ... یہ چیز یہ ہے

کہ ایک دائمی مشغلہ پروگرام کو نظر انداز کیا جائے اور اپنے اشتغال و اشغال کو محض حوادث

و واقعات کے حوالے نہ کر دیا جائے۔ جس سے ہرگز باوجود صلاحیت و قابلیت کے اپنی زندگی

سے کوئی بڑا کام مثلاً علمی ... نہ لے سکے۔ صرف اس لیے کہ کوئی مشغلہ ان کے عمل کا

سامنے ... نہیں تھا۔

آج سے مقصد محض ... اخبار نویسی کی زندگی موزوں نہیں بلکہ

... وقت و ضیاع قوت ہے۔ ... جیسے ... ایک ...

لیکن جب تک ایک نیا ... اور غیر معمولی مشغلہ اپنے کام نہ ... اور ...

وسیع پیمانے پر اسباب و وسائل پیدا نہ ہوں مطلوبہ اثر پیدا نہیں کیا جا سکتا

اور محنت ... رائگاں نہ جائے ... اول تو اب استحکام چند در چند وجوہ سے

متعذر ہے ... بصورت حصول ... مشکلات و عوائق حائل ہیں

پس مجبور ہوں ... ممکن نہیں جب تک ... بات ہو

~~... ... ...~~

علاوہ ... اس ... صرف سیاسیات کے لیے وقف ہونا پڑتا ہے

اور علمی ذوق کو ... علم کے لیے ترک کر دینا پڑتا ہے۔

~~[illegible]~~

~~[illegible]~~

(اشتغال) آپکے لیے بہترین زندگی علمی زندگی ہے اور اس شغل

و طرز کا مکمل نمونہ سلف صالح کی حالات میں ملتا ہے (علمائے اسلام)

کے حالات پڑھیے۔ درس و تدریس، وعظ و ارشاد، اور تصنیف و تالیف۔

تینوں چیزوں کو بیک وقت کرتے تھے اور اس طرح ایک ہی زندگی بہ یک

وقت تین عظیم الشان خدمات انجام دیتی تھی۔ خواص کی اصلاح

~~[illegible]~~ مستقبل کیلیے تیار کرنا درس و تدریس سے

وعظ و تذکیر سے ~~[illegible]~~ اور علم [illegible] و مذہب کی

~~[illegible]~~ اب تھوڑی ~~[illegible]~~ تصنیف

خدمت دائمی تصنیف و تالیف سے۔ [illegible] اور جامع رصافہ کے

ہیں۔ مستنصریہ کے صدر مدرس ہیں، [illegible] سوتی ہوں کہ تصنیف

واعظ۔ غزالی مدرسہ طوس کے معلم [illegible] علمائے اسلام کی زندگی

اور جامع طوس کے واعظ۔ ~~[illegible]~~

کیلئے تو یہ چیز طبیعتِ ثانیہ ہوگئی تھی ایک لحظہ آپکو مشکل سے

~~[illegible]~~ جو اپنی زندگی میں یہ تینوں مشغلے نہ رکھتا ہو۔

[illegible] صبح کو درس دیا، بقیہ اوقات میں تصنیف و تالیف، اور مجامع
و خواص میں وعظ و تذکیر کا سلسلہ جاری رہا۔ جب یہ چیز مفقود ہو گئی اور ان
تینوں [illegible] اجزاء کو الگ الگ کر دیا گیا۔ واعظوں کا طبقہ
الگ، مصنفین کا الگ، اور معلمین کا الگ، اس وقت
سے [illegible] سلسلۂ ہدایت و تعلیم، و نشو و نمائے علم مفقود و معدوم ہو گیا۔
میں چاہتا ہوں کہ آپ کی تمام ہمت مبذول ہو اور
علم راسخ کر کے اس کی زندگی کیلئے جُدا ہو جائیں۔ آپکے لیے بہترین موقع
حاصل ہے۔ — چھوٹا ناگپور ڈویژن ایک وسیع خطہ ہے
لیکن علم و ہدایت سے یکسر محروم — چونکہ ایک گوشہ میں واقع
ہے اسلیے علماء کی آمد و رفت بھی کمتر ہوئی، اور جہل و افلاس
نے اور زیادہ حالت خراب کر دیا۔ — اب ادھر دو سال کے [illegible]
[illegible] سے حالات متغیر ہو گئے ہیں اور اللہ نے حسب مقدور توفیق دی
وعظ و تبلیغ کا فرض ادا کرتا رہا۔ — نتیجہ یہ نکلا کہ ایک
غیر مترقبہ زندگی پیدا ہو گئی اور لوگوں
نے اپنی حالت کو محسوس کیا۔

۴ اب شدید ضرورت یہاں اسکی ہے کہ ایک عالم صالح مستقل طور پر قیام کرے
اور جو تبدیلی ہوئی ہے وہ انشاء اللہ ضائع نہ جائے۔ اگر ایک شخص
نے یہاں قیام کیا تو ~~[illegible]~~ پورے خطہ کی دینی پیشوائی و رہنمائی
و تعلیم و تربیت میں رہیگی۔ اور یہاں کے مسلمانوں کا ایک گروہ عظیم
ٹھیک کی ہدایت و ارشاد میں مشغول رہیگا۔ دوسرے مقامات میں
علماء سوء کی کثرت اور دجاجلۂ فساد و جہل کی تفاوت سے
اصلاح و ہدایت کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے اور کوئی نظام
قائم نہیں ہو سکتا۔ یہاں یہ بات بالکل نہیں ہے اور ابتدا
بنیاد صالح پڑ چکی ہے۔ اور اب جیسی عمارت بنائی جائے
اور جیسی بنائی جائے بن سکتی ہے۔
پس ہدایت ~~[illegible]~~ و دعوۃ کا ~~[illegible]~~ عمومی پہلو سے
یہ ایک گروہ عظیم اتباع و انتفاع کیلئے موجود ہے بلا
شرکت غیرے۔ اب رہی دوسری ~~[illegible]~~ چیز یعنی مشغلہ
درس و تدریس تو اسکا حال یہ ہے
کہ صاحب انجمن اسلامیہ کی یہاں

نشاندہی اور مدرسہ کا قیام ہوا تو ہم نے اپنی جماعت کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم
کرنا بہتر سمجھا - آج ہمیں پھر سے اصلاح نصاب کا مسئلہ ہندوستان
میں درپیش ہے اور مسئلہ حل نہیں ہوا اگر یہاں ایک کالج قائم ہو جائے
اور اولیں تجربہ پیش نظر نصاب اصلاح یافتہ کا ہی ہو تو یہ
ایک عظیم الشان کام ہوگا

ان اوقات میں مدرسہ کے لیے اصلاح نصاب پر جو ادارہ کر
تعلیم کا گہوارہ ہوں اور اس کے لیے ایک جامع نصاب مرتب
کرنا پڑا اس بات سے مزید ترقی ہوئی اور مدرسہ کو انہی اصول
پر قائم کیا گیا -

مدرسہ کا نصاب جونیئر اور سینیئر دو درجوں میں منقسم
اور پوری مدت تعلیم چودہ سال ہے - ~~یعنی~~ صرف و نحو ادب
~~فارسی~~ پہلا درجہ آٹھ سال کا ہے یعنی صرف و نحو عربی، مکمل فقہ، ادب
شروع، فارسی مکمل فقہ، حساب و ہندسہ فقہ، ترجمۃ القرآن کامل،
تاریخ ہند، تاریخ اسلام اجمالی اور انگریزی ادب ہے - دوسرا درجہ
چھ سال کا ہے اور تکمیل ادب بہ نثر و نظم قدما، علوم القرآن، علوم

6 فقہ حنفی، فقہ جامع، اصول، توحید، مقاصد علم اسرار
الدین، علم اخلاق، تاریخ لسان، تاریخ اسلام، تاریخ علوم
اسلامیہ، تاریخ مذاہب و طوائف اسلامیہ، معقولات
قدیمہ (علم الکلام تصورات اور صورتا تمہ) اور انگریزی علم ادب ہے۔
اسکے بعد درجۂ تکمیل کے دو سال کی ایک فن یا حرف
انگریزی ہیں۔

ابھی مدرسہ کی ابتدائی جماعتیں کھولدی ہیں۔ عمارت
آخر اپریل تک مکمل ہو جائیگی اور پھر کورس کی تکمیل کے تمام جماعتیں
شروع ہو جائیں گی۔

اب چونکہ یہ مدرسہ تشکیل اصلاح تعلیم اسلامی پر مبنی ہے
اسلئے عرف روائی پرچہ شائع تشکیل شرح مکلہ تمام ہندوستان از
ما شئہ ہے دیکھ انتظام ہوشہ ہے تحریف دیکھا اور
مستند رفقہ و مسند کے طرف سے الحنفی ہے

بیچارے ........

اخری چیز مثلاً تصنیف و تالیف ہے اور یہ بہت ضروری ہے ہر ملک
کا یہ حال ہے کہ یہیں کا شاہی کتب خانہ اور رامپور اور دیگر مقامات کے بیسیوں
میں ہندوستان میں انکے اسباب و سامان کا کل ذخیرہ یورپ
کے ہاں سامان ہے! ضرورت یہی ہے کہ کوئی ایک مستقل تصنیف
پیش نظر رکھا جائے اور اسکے مواد و سامان کو فراہم کیا جائے۔ انکا
میں موجود ہو سکتا ہے۔ جب کہ رامپور میں ہوں کتب خانہ میں موجود
ہے۔ اور اس کے متعلق بہت کچھ اب بھی متعلقہ رامپور سے قریب

میسور، بنگلور و حیدرآباد کیلئے اس طرح استفادہ و بشرط -

یہ جو تم نے لکھا ہے کہ ان چندہ کی فراہمی کیلئے دورہ
کرنا پڑے گا؟ تو اس کا کوئی مستقل نہیں ہے الحمد کہ چندہ کی
فراہمی کے جھگڑے سے تو کچھ کوئی واسطہ نہیں اور نہ اسکے لیے دورہ
میں تضیع وقت ہے (اسکا خیال) تو میں رکھا۔ نفقہ و نفقا
سے مقصود یہ تھا کہ ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اجرت و تنخواہ و مدارس
کا سلسلہ بھی جاری رکھے اور جمعہ کی امامت و خطابت وغیرہ انکا متعلق ہو

میں چاہتا ہوں کہ میری موجودگی میں ایک کمیشن بنایا جائے جو اور
بزرگوں کو اس میں شامل کیا جائے - اسکی نشست
باہر ایک عالم، شیعی، حنفی، شافعی، امام مسجد جامع، اور اس
کمیٹی کی تعداد مشترک ہوگی۔ اور تمام شہر صرف اسی
کمیٹی کی طرف رجوع کرینگے۔
آپکا خیر اندیش
یہ باتیں درست ہیں

---

چونکہ ابھی عمارت کا کام ختم نہیں ہوا اسلئے مصارف ذاتی میں
تخفیف پیش نظر ہے۔ اور سیرت انجمن علاوہ کتابوں کے وکیل و شریک کر
سکتے ہیں کیلئے طیار ہے۔ مگر اتمام عمارت کے بعد یہ رقم قطعاً ضعیف
[illegible]

---

مقصد ہے کہ آپ سیرت ایک ماہ کیلئے وقت نکالیں اور دیکھیں۔
... مگر یہاں چند روز بعد تمام وقت کا اندازہ ہو جائیگا۔ اگر کالج
آپکی طبیعت نہیں لگی تو واپس تشریف لے جائیں گے معارف کمیشن کے ذمے ہونگے
اور ... واپس ... جائینگے
ایم-اے-او کالج

۲۳ اپریل — عزیزہ سلمہا اللہ تعالیٰ۔ جو حالت اپنی آپ نے لکھی ہے تفصیل و یقین کے ساتھ تو
ہم کو علم نہ تھا۔ لیکن پہلے معلوم تھا کہ اس قسم کے حالات میں ضرور آپ مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ
ہر ایک حالت کو موجب صلاح و فلاح فرمائے۔ یقین رکھیے کہ دنیا میں انسان کے تمام
قوائے و فضائل کیلئے اصل آزمائش گاہ یہی حالت ہیں۔ تلوار اور آگ میں
کندن ہونے والا شے نہیں۔ سب بڑی آزمائش نفس و جذبات کی ہے۔ اگر عزم راسخ اور
قوت ایمانی و جسمانی سے کام لیا جائے تو اس آزمائش میں کامیاب ہونا کچھ مشکل نہیں۔ والذین جاہدوا
فینا لنہدینہم سبلنا۔ وان اللہ لمع المحسنین۔ میں اپنی دعاؤں میں ہمیشہ اس معاملہ کو نہیں بھولوں گا
اللہ تعالیٰ آپ کو اس آزمائش میں کامیاب کرے۔ کہ توفیق عطا فرمائے۔

«موجودہ حالت میں بجز دو راہوں کے تیسری راہ کوئی نہیں»:

(۱) عزم صادق اور ہمت کامل سے کام لیجیے۔ اپنے اندر عزم پیدا کیجیے اور اپنے تئیں
حدود کا پابند رکھیے۔ زندگی چند روزہ ہے اور سارے تعلقات نفس وہم و خیال سے زیادہ نہیں
رکھتے۔ اس قید و قیود میں گرفتار رہ سکتی؟ جو دل فاطر السموات والارض کے
عشق سے مشتعل ہو چکا ہے۔ اس کو خانہ و دل کے نقشوں میں گم نہ ہونا ازینت و حیثیت
کو رواج کرتا ہے۔ حب دنیا جس چیز کو بھی ہے انداد و خواہشات میں داخل ہے
فلا تجعلوا للہ انداداً وانتم تعلمون۔ اور یحبونہم کحب اللہ۔ والذین آمنوا اشد حبا للہ۔
محبت اپنی تمام وجود پر ہے تو سب سے زیادہ محبت جس چیز کو ہو اس کے لیے چھوڑ دینا چاہیے
حتی تنفقوا مما تحبون۔

پس اہلی و تعلقی اور ایمانی و جسمانی راہ تو یہی ہے کہ اللہ سے دل لگا رہے الا بذکر اللہ
تطمئن القلوب اور ایک مرتبہ پوری قوت و عزم کے ساتھ انی وجہت وجہی للذی فطر السماوات
والارض حنیفا اور لا احب الآفلین کا صدا لگا کر اس خیال کو دل سے نکال دیجیے۔
اگر ادھر کی جانب سے عزم ہوا تو توفیق الٰہی ضرور شامل حال ہوگی۔ اور ان شاء اللہ
ایک جہاد اکبر کا اجر عند اللہ۔ غور کیجیے۔ آپ متاہل ہیں۔ مجرد نہیں۔
بحمد اللہ صاحب اولاد۔ اور حقوق اہل و عیال کی کشش سے دوچار ہیں۔ کوئی ضرورت شرعی و اخلاقی
ازدواج ثانی کیلیے باعث نہیں۔ بجز ایک صرف افلاس و قلت معیشت کی بے سروسامانی
دوسری طرف عوارض و حالات اور وقت کا ولولہ۔ ان حالات میں اگر یہ معاملہ انجام پایا تو
کیا نتیجہ نکلے گا! ابتداء میں مسرت حصول مطلوب کا ہیجان تمام محسوسات پر غالب
آ جائیگا۔ لیکن بہت تھوڑی دیر کیلیے۔ اس کے بعد فوراً کشاکش و کشمکش اور مشکلات
و صعوبات کا سلسلہ شروع ہوگا اور جیسا کہ اکثر حالتوں میں ہوا ہے۔ عجب نہیں
کہ خود اس معاملہ سے دل برداشتہ ہو جائے۔ یہ کشمکش زندگی کیلیے سب سے بڑا عیب ہے۔ اگر
ابھی ایک لمحہ کیلیے گوارا و احساس نہیں ہو سکتا۔ یہ عام قاعدہ ہے۔ لیکن جب حالت پیش آئیگی
تو کوئی علاج سودمند نہ ہوگا۔ سب سے زیادہ یہ کہ پوری امانت داری کے ساتھ خود
اس شخص کے مصالح پر غور کرنا چاہیے جس کی محبت میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ایک معصوم
لڑکی ہے۔ دنیا اور دنیا کے مصائب سے بے خبر۔ کیا یہ بہتر ہوگا کہ آپ اس کو ایک
ایسی زندگی میں ڈال دیا جائے جس کے مصائب و مشکلات سے ہم کو ابھی علم ہے! اور امانت
یہی کہ عیش و آرام حاصل۔ جو اس کے لیے مہیا نہ کر سکینگے

۳

پھر اپنی بیوی کا خیال کیجیے - جب تک مجھے معلوم ہے آپکو
کوئی شکایت نہیں          کیا محبت و وفا کا یہ اقتضا ہونا چاہیے
کہ بلا وجہ اُسکی تمام بقیہ زندگی تلخ کردی جائے ؟

میری شادی کو دس سال ہوگئے - یقین کیجیے کہ اسکے لیے ایک نہیں
متعدد وجوہ و بواعث شرعیہ و عقلیہ ایسے موجود ہیں کہ اگر اُن میں ایک باعث
بھی کسی دوسرے شخص کے سامنے ہوتا تو وہ دوسرا نکاح کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ
کرتا - با ایں ہمہ میں نے ایک منٹ کیلیے بھی اسکا قصد نہیں کیا اور
نہ کرونگا - پھر ساتھ ہی دوسروں کی جانب سے اس بارے میں اسقدر مجبور کن ترغیبات
پیش آرہی ہیں کہ عزم کا باقی رکھنا بہت مشکل تھا - تاہم میرے ارادے
میں تزلزل نہ ہوا -

صداقت حیات بجز قربانی کے اور کچھ نہیں ہے - اگر ہم اپنی
خواہشوں کو قربان نہیں کرسکتے تو پھر نہ دنیا میں محبت ہے نہ سچائی
اور نہ ایمان

آپ کہینگے دل کیا بس میں ہے ! کون کہتا ہے لیکن جو بات ہے
جو کچھ بس میں ہے - دل سے اوپر بھی ایک طاقت ہے اُسکو جگا دیجیے
سونے نہ دیجیے - وہ دل کی لگام جس طرف چاہیگی موڑ دیگی -

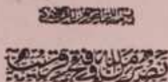
نتیجہ
اس بارے میں کثرت کے ساتھ عواقب و نتائج پر غور و تفکر، مطلوبات نفس کا پیچھا کرو
اور یہ حاصل نہ ہو تو، کثرت استغفار و دعا، اور مشغولیت دینیہ۔ ان شاء اللہ
نتیجہ سود مند ہو گا۔ اگر ایک دن بھی پورے اضطراب و التہاب کے ساتھ
نکل گیا تو پھر کوئی خطرہ باقی نہیں رہ گیا۔ صرف اس حقیقت کی ضرب اگر ایک دفعہ
پوری طرح لگ جائے کہ ایک وقتی اور اضطراب طلب و اشتہا جیسی نعمتیں ایک
وہمی و خیالی مطلوب کیلیے کس طرح ضائع جا رہی ہیں، اور اگر یہ سب کچھ اللہ کیلیے
ہو جائے، تو پھر یہی وجود خاکی کیا کچھ نہیں کر سکتا، تو پھر اس آزمائش
سے نکل جائیں ذرا بھی رکاوٹ پیش نہ آئیگی۔

(۲) لیکن اگر ضعفِ عزم ساتھ نہ دے اور اس ارادہ کی قوت نہ ملے تو پھر
دوسرا مشورہ یہ ہے کہ تمام تر خیالات چھوڑ کر فوراً بنگلور چلے جائیے
اور جس طرح بھی ممکن ہو اُن کے والدین کو راضی کر کے نکاح کر لیجیے۔
اور جس قدر مشکلات و موانع پیش آ جائیں، انکو گوارا کر لیجئے یا قطعی فیصلہ
کر لیجیے۔ یہ بات پھر بھی ہزار درجہ موجودہ اضطراب نفس سے
بہتر ہو گی۔ اقلاً بہت سے زیادہ نقصانات مفقود ہو جائینگے۔
خلاصہ یا فوراً بلا تاخیر اس خیال کو بالکل دل سے نکال ڈالیے۔ یا فوراً بلا تاخیر
جا کر کسی طرح نکاح کر لیجیے۔ تیسری حالت کوئی نہیں۔ اور اگر التوا رکھا جائیگا تو سخت لغزش ہوگی۔
والعاقبۃ للمتقین۔ ابوالکلام احمد

TELEGRAPHIC ADDRESS
"KHILAFAT"

Reference No..............









تار کا پتہ "خلافت" مجلس خلافت صوبہ بنگال ۱۹۲ء کلکتہ

# Bengal Provincial Khilafat Committee

Abul Kalam Azad. *President.*

...uddin Ahmed, B. L., Vakil, High Court
...d Yasin, B. L., Burdwan
...d Akram Khan, 'Mohammadi' & 'Zamana.'
*Secretaries*

12, ZAKARIA STREET,

*Calcutta*.................................192

مکرمی الجلیل السلام علیکم

مولوی محمد ذکریا بھاگلپوری ایک نہایت مخلص و صالح ہیں
قومی خدمات میں سرگرم رہتے ہیں اب انہیں تحصیل علم کا
شوق ہوا ہے اور علیگڑھ کالج میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔
امید ہے کہ جناب پرنسپل کالج کے نام کوئی ایسی تحریر عنایت
فرما دیجئے جس میں ممکن رعایتوں کی سفارش ہو

مخلصکم
ابوالکلام

---

یہ خط زکریا بھاگلپوری کے نام تو نہیں لیکن ان سے متعلق ضرور ہے۔ لہٰذا ان کے تعارف سے قبل مولانا آزاد کے قلم سے ان کا تعارف پیش خدمت ہے ——— ادارہ

# زکریا بھاگلپوری کے بارے میں

محمود واجد



صوبہ بہار اور خصوصاً بھاگلپور کی سرزمین سے کسی علمی اور ادبی پودے کا جنم لے کر کامیابی سے پھلنا پھولنا حیرت سے کم نہیں۔ یہی حشر اس پودے کا ہوا جسکا ذکر یہاں کرنا چاہتا ہوں۔ بہر حال اس نے کسی طرح اپنے قدم یہاں جمائے۔ اس کے سائے میں کتنوں کو پناہ ملی تشنگانِ علم و تحقیق کی پیاس بجھتی رہی۔ وہ ایک مشعل بنا رہا جس سے دوسرے کسب ضیا کر کے روشنی کا مینارہ بن گئے لیکن وہ شخص اپنی ذاتی زندگی میں "چراغ تلے اندھیرا" کے مصداق رہا اس نے اپنے علم و فضل سے کوئی بھی معاشی یا معاشرتی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہاں خود پریشان حال رہ کر دوسروں پر خوشحالیاں بکھیر دیا۔ اوروں نے شہرت اور مرتبے پائے اور اسے گمنامی اور بے کسی ملی۔ اس شخص کو کم و بیش چودہ سال مولاناؒ کی معیت میں رہنے کا فخر حاصل رہا ہے۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ ایک بڑے شخص سے رشتہ جوڑ لینا ایک عام سی روش بن گئی ہے۔ یہ شخص بذاتِ خود نصف درجن بیرونی اور چوتھائی درجن ملکی زبانوں کا ماہر ہے۔ علم، ادب، فلسفہ، تاریخ اور مذہب جیسے متنوع موضوعات کے سلسلہ میں بڑی اچھی بصیرت رکھتا ہے۔ کسی زمانہ میں مشہور صحافی رہ چکا ہے۔ اس کی خطابت نے کافی شہرت پائی ہے، مولانا محمد علیؒ، مولانا آزاد، مولانا آزاد سبحانی، خواجہ حسن نظامی اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ساتھ مل کر علمی اور ملکی کام کرنے کا اسے فخر حاصل رہا ہے۔ ملک دشمن عناصر کو وطن کی سرزمین سے اکھاڑ پھینکنے میں اس نے کافی حصہ لیا ہے۔ سراغرسانی، تحریک، مجادلہ اور پھر قید و بند کی اذیتیں برداشت کی ہیں۔ الغرض وہ سب کچھ کیا ہے جو اس وقت کی سچی ملکی خدمت کے لیے ضروری تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ارباب بست و کشاد جن کے ساتھ یہ ہم نوالہ و ہم پیالہ رہے، اہل علم جنھوں نے ان کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا اور وہ سارے لوگ جو ان کے زیر بار احسان ہیں ان کے آڑے وقت میں کبھی کام نہ آسکے۔ کسی کی نظر اس دیے پر نہیں پڑتی جس نے کبھی اپنی ضیا سے ذہنوں کے چراغ روشن کیے تھے اور آج تنہا نحیف و نزار کاندھوں پر سارے کنبے کا بوجھ سنبھالے حالات کے تند جھونکوں کے خلاف لڑ رہا ہے۔ اس شخص کا نام مسٹر ابو عمر

محمد ابراہیم زکریا ہے۔ انھیں عرف عام میں "مسٹر صاحب"[1] کہتے ہیں۔ ان کی حیثیت مولانا مرحوم کے عزیز "دوست"، شاگرد اور کسی طرح کی ہے جیسا کہ ان خطوط سے ظاہر ہوگا جن کا ذکر میں آگے کروں گا۔ ان کا اور مولانا کا ساتھ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۴ء تک رہا ــــ کلکتہ، رانچی اور پھر کلکتہ میں ایک ساتھ رہے۔

مسٹر صاحب اپنی خود نوشت سوانح عمری[2] (غیر مطبوعہ) میں فرماتے ہیں ــــ "میں آٹھ برس کا تھا کہ ۱۸۹۷ء میں پہلا زلزلہ ہوا۔ میرے والد جناب شیخ دیانت اللہ احمد صاحب رئیس انگریزی آباد مالدہ (بنگال) کے ملک التجار اور جامع مسجد کے امام تھے۔ آپ مع بال بچوں کے ہجرت کر کے بھاگل پور (بہار) آئے۔ محلہ تاتار پور میں زمین خرید کر مکان بنوایا... میری شادی بیس برس کی عمر میں بمقام راج محل، ضلع سنتھال پرگنہ (بہار) میں رئیس شہر حاجی رستم کی دختر خورد سے ہوئی۔ خاکسار کو تین لڑکیاں اور تین لڑکے ہیں (اس وقت دو لڑکیاں۔ ایک بیوہ، دوسری شادی شدہ اور ایک لڑکا ہے جو میٹرک پاس کر کے برسوں سے بیکار ہے)۔ میری تعلیم ابتداءً مقامی مدرسہ نور الہدیٰ میں ہوئی۔ فارسی ہر سہ دفتر ابوالفضل وغیرہ اور عربی میں منطق، فلسفہ، ادب، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں انتہا تک رہی ہے، سند بھی موجود ہے۔ فن مناظرہ کی تعلیم مدرسہ الٰہیات کانپور میں رہی۔ اس وقت اس تعلیم گاہ کے پرنسپل مولانا آزاد سبحانی تھے۔ تفسیر قرآن کی تعلیم دار الارشاد کلکتہ جس کے پرنسپل حضرت علامہ ابوالکلام آزاد تھے۔ اس خاکسار کو عیسائی، آریا، قادیانی کے رد میں خانقاہ رحمانیہ مونگیر (بہار) میں ایک عرصہ تک کام کرنا پڑا۔ تصوف میں حضرت علامہ محمد علیؒ سے شرف تلمذ رہا اور آپ ہی سے بیعت کی نعمت حاصل ہوئی... آپ کے بعد عنایت و کرم فرمائی کی نظر حضرت علامہ ابوالکلام آزادؒ کی رہی ــــ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۴ء تک حضرت علامہ کے ساتھ کلکتہ، رانچی، پھر کلکتہ میں رہنا پڑا۔ مولانا کے قائم کردہ مدرسۃ العلوم رانچی کا ایک عرصہ تک صدر المدرسین رہا.... ۱۹۱۱ء سے بذریعہ خطابت و صحافت تا ایں دم جہاد کر رہا ہوں ــ خلافت، کانگریس اور دیگر انجمن اور پبلک اجتماع میں لاکھوں سامعین کے درمیان تقریریں کرنی پڑتی تھیں۔ اخبار زمانہ" کلکتہ "جمہور" کلکتہ، "مسلم گزٹ" کلکتہ اور دیگر اخبارات کے ایڈیٹوریل میں کام کرتا رہا۔ "الہلال" اور "البلاغ" کے اسٹاف میں بھی علمی خدمت انجام دے کر شرف و عزت حاصل کرتا رہا۔ "البشیر" پٹنہ کے ایڈیٹوریل میں میرے مضامین شائع ہوا کیے ہیں۔ "مومن گزٹ" کانپور کا ڈھائی سال تک چیف ایڈیٹر رہا۔ ٹیگور کے شانتی نکیتن سے اور پنڈت اندر پر کئی تمغے حاصل کیے۔ بھاگل پور ٹی کل کالج کے پروفیسروں کو قدیم اسلامی تاریخ کی تعلیم دیتا رہا۔ مکھن لال رائے[3] چودھری ایم۔ اے شاستری ایم اے، بی ایل، پی آر ایس کو میں نے شروع سے اردو، فارسی، عربی، تاریخ، قرآن اور اسلامک کلچر وغیرہ کی تعلیم دی

۱۔ مسٹر صاحب کا اگست ۶۰ء میں انتقال ہوگیا حالانکہ کتاب کی تکمیل کے مراحل تک وہ زندہ تھے۔ م۔ د ۲۔ اس کا مسودہ میرے پاس موجود ہے۔ ۳۔ ابھی کئی سال ہوئے کہ مکھن لال رائے چودھری کا انتقال ہوگیا۔ م۔ د

اور میری ہی سعی موعود سے "دینِ الٰہی[1]" انگریزی میں لکھی گئی اور پی آر ایس کی ڈگری اور سونے کا تمغہ بابو صاحب کو ملا۔ میری پوری سعی سے "اسماع فی الاسلام[2]" کی کتاب انگریزی میں لکھی۔ پھر "اسٹیٹ ریلیجنس آف دی مغل[3]" لکھا۔ پھر اسلامک کلچر کی تعلیم کو مکمل کرنے مصر بھیجے گئے۔ ان دنوں کلکتہ یونیورسٹی کے اسلامک ہسٹری اینڈ کلچر کے صدر ہیں۔ ڈاکٹر کے۔ کے بوس نے دکن کی تمام فارسی تاریخیں مجھ سے پڑھ کر "تاریخ بیجاپور[4]" لکھی اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے علاوہ اور لوگوں نے بھی بہت کچھ پڑھا اور سیکھا ــــــ!

کانگریس کی شرکت سے پہلے سودیشی تحریک میں بابو شیام سندر چکرورتی ایڈیٹر "سرونٹ" بابو سرندر ناتھ بنرجی ایڈیٹر "بنگالی" اور بابو بپن چندر پال بانی بم کے ساتھ کام کرتا رہا۔ یہ ۱۹۰۴ء کی بات ہے۔ ۱۹۰۶ء میں سودیشی تحریک میں اہم سے اہم خفیہ کام انجام دینا پڑا۔ بج بج کے گولی کانڈ میں ماخوذ ہوا۔ رانچی کے ڈورنڈہ برٹش فوجی کیمپ میں انگریزوں کے خلاف کام کرتا رہا۔ کلکتہ، رانچی، کانپور وغیرہ میں تحریر و تقریر کے ذریعہ سیاسی کام انجام دیتا رہا۔ پھر راشٹرپتی راجندر پرشاد کی ہدایت سے مسلم ماس کنٹاکٹ کیلیے پٹنہ اور بھاگل پور میں کام کیا۔ ۱۹۴۲ء میں یہ پور بھاگل پور جو برطانوی فوجوں کے حلقہ قید میں تھا وہاں صدر کانگریس کمیٹی کی ڈاک آغا صاحب بن کر لے جایا کرتا تھا۔ اسی سال پولیس کی تلاشی سے میری تمام کتب مثلاً "پورانی انسائیکلوپیڈیا" "بک آف نالج" دس جلدیں "ہسٹری آف نیشنز" دس جلدیں وغیرہ کئی ہزار بنگلہ، انگریزی کتب ضبط کر لی گئیں۔ اس کے قبل ۱۹۱۱ء میں جلیان والا باغ کے ہنگامے میں بھی پکڑا گیا تھا۔ مار لگی اور دو ہفتہ بھر جیل میں رہا۔ ۱۹۲۳ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں بھی برسرِ کار رہا۔"

یہ تھی داستان اس منحنی سے شخص کی جس کی ہستی معدوم سی نظر آتی ہے۔ جو پتھر کا جگر چیر کے جوئے شیر لانے چلا تھا مگر جوئے شیر اوروں کو مل گیا اور اسے تیشہ بھی نہ مل سکا کہ رسمِ عاشقی نباہتا۔ اب تو نہ جینا ہے نہ مرنا ہے زندگی ایک بے برگ شجر ہے جس سے درد کی کونپلیں موسمِ گل میں بھی پھوٹتی ہیں! یہ حضرت مسٹر زکریا بھاگلپوری مقامی اسکول (لڑکیوں کے اسکول) میں ہیڈ مولوی ہیں ــــــ اور مولوی آپ جانیں محض مولوی ہوتا ہے چاہے اس نے کتنے ہی علوم کے عزیزے انڈیل دیے ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے ان سے جب میری پہلی پہلی ملاقات بھاگل پور کے ایک کتاب فروش کی دکان پر ہوئی تھی تو وہ کسی سے محوِ گفتگو تھے۔ ان کے ایک جملے نے مجھے چونکا دیا ــــــ "جب تک ہم یہ نہ جانیں کہ گھر سے اسکول تک جو چیزیں ملتی ہیں ان کی ماہیت اور حقیقت کیا ہے تو علم کیا ہوا۔!" پھر میں اکثر ان کے یہاں آنے جانے لگا اور جب ان کے لڑکے کو پڑھانے کا ذمہ لیا تو مجھے اور قریب سے ان کے ماحول کو دیکھنے کا موقع ملا

---

۱۔ دینِ الٰہی۔ ایم ایل رائے چودھری ۲۔ میوزک ان اسلام ایم ایل رائے چودھری ۳۔ اسٹیٹ ریلیجن آف مغل۔ ایم ایل رائے چودھری ۴۔ ہسٹری آف بیجاپور کے۔ کے۔ بوس۔

جس میں گھٹن زیادہ تھی اور شگفتگی کم ——!

ادب، تاریخ، مذہب، فلسفہ، زبان، سائنس پر اکثر نادر کتب ان کی مختصر سی ذاتی لائبریری میں جمع ہیں۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں وہ شخص غریب کیسے ہو سکتا ہے جس کے پاس اتنا بڑا خزانہ ہو لیکن پچھلے دس برسوں سے سنگین معاشی حقیقت کسی نہ کسی شکل میں انھیں اپنا شکار بنائے ہوئے ہے اور اب تو یہ عالم ہے کہ اکثر باتیں ان کے ذہن سے اترتی جا رہی ہیں۔ ہاں ان کی پرانی علمی زندگی کا ذکر آتا ہے تو آنکھوں میں غیر معمولی چمک آ جاتی ہے۔ جانے یہ چمک بھی نئی نسل کو وہ دے سکیں گے یا نہیں! ایک لڑکا ہے محمد علی جو برسوں سے میٹرک پاس کر کے بیٹھا ہے عمدہ افسانوی ادب کا مطالعہ کرتا ہے عمدہ افسانے لکھتا ہے اور پھاڑ دیتا ہے یہاں تک کہ ایک دن اپنی تعلیمی سارٹیفکیٹ کو بھی پھاڑ بیٹھا —— اس منظر سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ یہ اُس خاندان کا حال ہے جس کا ماضی قوم کی بھٹی میں جل گیا اور اسے منتشر راکھ کے ڈھیروں کے علاوہ کچھ نہ مل سکا[۱]!

لیجیے میں کہاں سے کہاں نکل گیا —— آپ سوچیں گے اس سے مولانا کی زندگی کا کیا تعلق ہے —— تعلق ہے میرے بھائی اور نہ مولانا کی شفقت کا دریا یوں جوش نہیں مارتا —— ! پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ مولانا نے ان کے لیے کیا کیا؟ اس کا جواب خود مسٹر صاحب کی زبانی سنیے۔ ایک دن میں نے مسٹر صاحب سے کہا —— آخر اب مولانا آپ کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتے؟ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا ——

"بھائی مولانا کی مثال اکبر کے دربار کے ابوالفضل اور فیضی جیسی ہے جن سے ان کی قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا! اور میں بے بس سا ہو گیا —— یہ اس مولانا کا ذکر ہے جو ہندستان کے صف اوّل کا سیاستداں رہا۔ اور میرے موضوع کے دائرہ میں وہ مولانا ہیں جو ایک عام آدمی ہیں، ایک بزرگ ہیں، ایک دوست ہیں —— !! ——

---

۱ چند سال قبل حضرت عزیز منعمی مرحوم وزیر ریاست بہار کی سعی مشکور سے انھیں ایک ہزار کی رقم سرکار سے مکان بنانے کو ملی۔ مگر یہ مختصر رقم بیکاری اور بیماری کی نذر ہو گئی۔ (م۔ع)

# DANESH

QUARTERLY JOURNAL

Chief Editor:
Cultural Counsellor Islamic Republic of Iran

Editor:
Dr. Syed Sibte Hasan Rizvi

Honorary Advisor:
Dr. S. Ali Raza Naqvi

Published by:
Office of The Cultural Counsellor
EMBASSY OF THE ISLAMIC
REPUBLIC OF IRAN
House No. 25, Street No. 27, F/6-2
Islamabad, Pakistan.
✆ 818204/818149

# کچھ اپنے، کچھ مولانا آزاد کے بارے میں



مولانا آزاد کے مکتوب الیہ

**زکریا بھاگلپوری**

کے قلم سے

مولانا محمد علیؒ سجادہ نشین خانقاہ رحمانیہ مونگیر (بہار) بڑے بزرگ اور صوفی گذرے ہیں۔ میں نے ان سے بیعت حاصل کی تھی اور وہیں رہا کرتا تھا۔ ان کے حکم اور دعا سے آریہ اور قادیانی عقائد کی رد میں تقریریں کیا کرتا تھا اور بڑا مقبول تھا۔ بعدۂ انھوں نے مجھے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے نام تعارفی خط لکھا اور الہلال جو انھیں دنوں شروع ہوا تھا اس میں رکھ لینے کو کہا۔ حضرت مولانا آزاد خط لے کر کھڑے ہوگئے اور احتراماً کھڑے کھڑے سارا خط پڑھا۔ بڑے تپاک سے مجھ سے ملے، بٹھایا اور شفقت سے رکھا۔ بہت مانتے تھے۔

الہلال کے ابتدائی دور کلکتہ سے رانچی میں نظر بند ہونے اور رہا ہونے تک گہرا تعلق رہا۔ رہائی کے بعد مولاناؒ دہلی گئے، تو میں الگ ہوگیا۔

ان کے والد ہجرت کر کے مکہ تشریف لے گئے۔ وہاں شادی کی۔ دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ بڑے لڑکے غلام یسین آہ جامعہ ازہر (مصر) کے پڑھے ہوئے تھے۔ عالم اور شاعر تھے۔ مولانا ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ بہنوں میں سب سے چھوٹی آبرو خانم ملکہ بھوپال کی سکریٹری تھیں۔ بڑی تعلیم یافتہ عمدہ مقرر اور مضمون نگار تھیں۔ بڑی بہن کی شادی کلکتہ کے کسی تاجر کے یہاں ہوئی تھی۔ مولانا کے والد مکہ سے بمبئی واپس آئے اور پھر کلکتہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ ان کے والد صوفی تھے۔ مولاناؒ میں بچپن سے بڑوں کی طرح بولنے کا سلیقہ آگیا تھا۔ جہاں تہاں تقریر کرتے تھے۔ ایک بار لوگوں نے ان کے والد سے اس بات کی شکایت کی۔ انھوں نے مسکرا کر فرمایا۔ یہ تو ایک دن کی بات ہے ابھی کھیلنے کے دن ہیں۔ چنانچہ ایک دن پکڑ کر مولاناؒ کو بٹھایا اور توجہ کی۔ سارے بچکانہ خیالات یکسر ختم ہوگئے اور سنجیدہ ہوگئے۔ پھر مطالعہ کیا۔ ذہن قدرتی طور سے کھل گیا تھا۔ آج کی بہت سی تصانیف میں اکثر غلط باتیں مولانا سے منسوب کردی گئی ہیں۔ کسی نے مولانا کی تعلیم جامعہ ازہر (مصر) بتائی ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولاناؒ نے باضابطہ تعلیم کہیں بھی حاصل نہیں کی۔

مولانا بڑے باذوق آدمی تھے۔ عمدہ پوشاک تو ہوتی ہی تھی لیکن کھانے کا خاصا امتیازی ذوق رکھتے تھے۔ ارزانی کے دنوں میں بھی ان کا دسترخوان ایک وقت میں تیس روپے کا ہوتا تھا۔ کھانا اکیلے کبھی نہیں کھاتے تھے۔ میں مستقل تھا اور اکثر لوگوں کا روزانہ تانتا بندھا ہوتا تھا۔ خانساماں بہترین قسم کا رکھا گیا تھا جو بقول خود کبھی نواب واجد علی شاہ کے یہاں نوکر تھا۔ نواب کی گرفتاری کے بعد مارا مارا پھرتا تھا کہ مولاناؒ نے رکھ لیا۔ مولانا کی افراجی

کے بعد وہ کہیں نہ رہ سکا۔ مولانا عمدہ کھانا، عمدہ ناشتہ اور عمدہ کافی پیتے تھے۔ سگریٹ قسطنطنیہ کا ہوتا تھا۔ ایک بار میں نے کافی پینے کا سبب پوچھا تو کہنے لگے کہ کافی پینے سے نیند نہیں آتی اور تصنیف کا کام کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

مولانا کہتے تھے کہ اُردو مشکل زبان ہے اور اسے سیکھنے کے لیے اہل زبان کو پکڑنا چاہیے۔ چنانچہ کچھ دنوں تک مولانا نے دہلی کے لال کنوواں کے چوراہے پر ایک چائے کا ہوٹل کھول رکھا تھا جس میں دو نوکر چائے بنانے کو رکھ چھوڑا تھا۔ خود کاغذ قلم لے کر ایک جگہ بیٹھ رہتے۔ جہاں کوئی بوڑھا شخص ادھر سے گذرا اور آواز دی ——— "اے مرزا جی! اجی حضرت ذرا چائے تو پیتے جانا۔" چائے پلاتے گپیں کرتے ڈھلے ڈھلائے محاورے بے تکلفی سے سنتے اور فوراً نوٹ فرما لیتے، چائے کے پیسے بھی نہیں لیتے اور رخصت کر دیتے۔

میرے بعد عبدالرزاق ملیح آبادی آئے تھے اور وہ بھی ساتھ ہوئے۔ یہاں پر ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک دن مجھ میں اور ملیح آبادی میں ایک لفظی بحث چھڑ گئی۔ میں کہتا لفظ 'بَک' صحیح ہے اور ملیح آبادی کہتے 'بَھل' صحیح ہے۔ آخر میں مولانا کو ثالث بنایا گیا۔ مولانا پہلو بچا گئے، کہنے لگے 'دونوں صحیح ہے۔ بھئی ابھی تو اردو بن رہی ہے!' میں نے یہ سوال اودھ پنچ کو بھیجا۔ جواب آیا: 'ملیح آباد آم کے لیے مشہور ہے زبان کے لیے نہیں'۔

کلکتہ الہلال کے دفتر رپن لین کے اوپری منزل میں مولانا اور نیچے دفتر تھا جو میری رہائش گاہ بھی تھا۔ رپن لین میں بھی انگریز رہا کرتے تھے۔ سامنے کے مکان کی ایک میم مولانا پر فدا تھی۔ ایک بار مجھ سے کہنے لگی۔ آپ کا مولانا بہت بڑا پادری ہے۔ اس لیے مجھے ہر وقت تانک جھانک کرنا پڑتا ہے!

مولانا بڑے پاکباز تھے۔ ان کے عقیدتمندوں کی تعداد بیرون ہند بھی بہت زیادہ تھی۔ افغانستان کے ایک عالم سر پر قرآن پاک رکھ کر ننگے پاؤں رانچی پیدل آئے تھے۔ یہ "الہلال" پڑھ کر مولانا کے معتقد ہوئے تھے۔ بہر حال وہ نووارد شخص پہلے عبدالکریم ٹھیکیدار سے ملا جو مولانا کے معتقد اور مرید تھے۔ عبدالکریم نے مجھ سے کہا میں نے خفیہ طور سے مولانا سے ملوایا۔ ایک انسپکٹر سی آئی ڈی سامنے کی بلڈنگ میں ٹھہرا تھا جو ہر شخص کا حلیہ، آنے کا مقصد وغیرہ لکھا کرتا تھا۔ یہ رانچی کی نظر بندی کا دور تھا۔ کلکتہ میں بھی ان کا ایک دستور العمل تھا۔ بعد نماز مغرب (عشا تک) قرآن پاک کا درس دیتے تھے (اُسے ایک نعبد کی تفسیر کو کئی مہینوں میں مکمل کیا) پھر عشا کی نماز پڑھنے جاتے۔ چلتے وقت دونوں ہاتھ پیچھے بندھا ہوتا اور سر نیچے ہوتا۔ مجھ سے راہ میں باتیں کرتے جاتے۔ مسجد میں پہنچ کر نماز خود پڑھاتے۔ کوئی آگے نہیں بڑھتا تھا۔ تفسیر پاک کے سلسلے میں انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ میرے 'دارالارشاد' میں لیے گئے نوٹس میں ہے۔

# دارالارشاد (کلکتہ) میں

## مولانا آزاد کا درس قرآن



زکریا بھاگلپوری

قرآن پاک کی تفسیر کے سلسلے میں مولانا کا نام ایک مستند بلکہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ان چند سطور کی جھلکیں "شرح وبیان" کے تحت پیش کر رہا ہوں شان نزول کا ہلکا اشارہ میں ابتدا میں دے چکا ہوں۔ یہ دراصل کلاس نوٹس ہیں اسے سیناپسس یا خلاصہ ہی کہہ لیجیے۔ قرآن کریم کی شرح پاک اور مولانا آزاد کا انداز بیان مے عرفاں کے پیمانوں سے لبریز دو آتشہ کے صحیح معنی کچھ ہو سکتے ہیں تو شاید یہی ہیں۔ ان پر میری رائے سے زیادہ آپ کے فہم کی ضرورت ہے۔ دارالارشاد کے بانی اور پرنسپل مولانا تھے جو نمبر ۴۵ رپن لین کلکتہ میں کھولا گیا۔ ۵ رفروری ۱۹۱۶ء سے اس کی ابتدا ہوئی اور ۲۸ مارچ ۱۹۱۶ء کو اس کا خاتمہ اپنوں ہی کی ایک سازش کے نتیجہ میں ہو گیا۔ یہ مسٹر صاحب کے کلاس نوٹس ہیں جو انھوں نے ایک متعلم کی حیثیت سے مولانا کے لکچر سن کر لکھے۔ ان جواہر پاروں کو میں بغیر کسی حذف و اضافہ اور تغیر و تبدل بعینہ پیش کر رہا ہوں تاکہ اہل علم کو اپنی رائے قائم کرنے میں سہولت ہو ——— محمود حاجد



۵ر فروری ۱۹۱۶ء (السورۃ الفاتحۃ)

استعانت : تحفظ خود عمل فطری ہے۔ انسان اپنی محنت کا قائم مقام پیدا کرتا ہے۔

صنعت : ترکیب و انتخاب کو کہتے ہیں۔ ہر تلاش جو انسان نے کی ہے محض فطرت کی تحریک پر ہے۔ فطرت حدود اللہ ہے اور اسی کو اسلام کہتے ہیں۔ کونٹ ٹالسٹائی: روسی فلاسفر، ماہر علم الاخلاق

طغیان : پانی کا اوپر اٹھنا۔ گوش : جرمن فلاسفر، ماہر علم الاخلاق۔

فطرت کی برباد کن قائم مقام صنعت ہے۔ تمدن کی بربادی کا سبب پیدا کرنے والا تمدن ہے۔ صنعت کی زیادتی برباد کنِ فطرت تمدن ہے۔ قوت فطریہ پر اعتماد کرنا اور صنعت سے احتراض کرنا ترقی کا سبب ہے۔ فطرت کی مخالفت جرم ہے۔ صنعت غیر فطری بھوک پیدا کرنے والی چیز ہے۔ کونٹ ٹالسٹائی حامی اسلام تھا۔ اسلام کو دنیا میں پیش کیا تاکہ قوت فطری کو دنیا میں قائم کرے۔ ہر فطری ولولہ پر نماز مقرر ہے۔

مرعوبیت صنعت : برباد کن عالم اسلام ہے اور یہی ایک علت ہے جو عالم اسلام میں چھائی ہوئی ہے۔۔
جذباتِ ایمان ہی سبب ترقی ہے اور غلبہ و فتح۔

ایاک نعبد وایاک نستعین ہی سے عربوں نے ساری دنیا پر فتح و نصر پایا۔ جو اللہ پر اعتماد کرے گا اس میں انتہائی

قوت و زور موجود ہوگا ایاک نعبد کی طرح ایاک نستعین بھی ایک مستقل چیز ہے۔ بقول ابن قیم۔

۷ر فروری ۱۹۱۶ء

مسلمانوں میں تنزلی کا سبب یہ ہے کہ وہ مسئلہ استعانت کو چھوڑ بیٹھے استعانت بلا محنت و کوشش محض لغو ہے۔

ہمت اور کوشش ہی جذبات ہیں اور صبر برداشت بھی شامل ہے۔ ہر قوم جذبات ہی سے قوم بنی ہے۔

اعتقادات تو ذہنی ہیں۔ جذبات سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور ترقی جذبات ہی سے ہوتی ہے ترقی و تنزلی کو محض جذبات سے تعلق ہے۔

ترقی و کامیابی میں استعداد و کوشش کرو۔

فتح و نصرت محض جذبات میں ہے۔

فوج کی کامیابی سپاہی کے بدن و جسم پر نہیں ہے بلکہ جذبات اور استطاعت میں ہے۔ تم جتنا کر سکتے ہو کرو باقی میں کر لوں گا۔ استطاعت تک استعداد کر کے خدا پر بھروسہ کرو یعنی استعانت۔ تدبیر دفع ایک بدترین اور قوی عجز کا نام ہے، بچاؤ علامت ہے۔ بزدلی کی دفع کا ظہور تنزلی میں ہوتا ہے۔

وسائل پر بھروسہ کرنا جو بربادی کا نتیجہ ہے استعانت اس کو مٹا کر اقدام کی راہ دکھاتی ہے۔

اعتقادات کو ذہنیات و دماغ سے تعلق ہے ترقی و تنزلی کو محض جذبات سے لگاؤ ہے مقصد نزول قرآن دفع وسائل ہے۔

۸ر فروری ۱۹۱۶ء

انسان یا قوم کی ترقی و عزت صرف احساس میں ہے۔ احساسات کا مٹنا ہی بربادی ہے۔

سورہ فاتحہ ایک ایسی قوم بنا رہا تھا جو ساری دنیا اور اقوام کا فرمانروا ہو اور سب کے لیے چراغ ہدایت ہے۔ سورہ فاتحہ کا ارادہ یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی قوت و احساس پیدا کر دے جو کسی مشکل و سختی میں کبھی نہ دبے اور اپنی خواہش میں کبھی کامیاب ہو اور تمام جہاں میں تنہا یسیر الرحمٰن ہے۔ جب انسان کل مشکل طے کر چکا تو اس کو اب کیا کرنا چاہیے اس لیے ایک نصب العین ہونا ضروری ہے۔

بسم اللہ انقطاع کل خدا کا توسل پیدا کر کے سب سے الگ کر دے۔ تخلقوا باخلاق اللہ دا وسط اخلاق پیدا کرو۔

بسم اللہ اور الحمد میں یہ ربط ہے کہ وہ عالم میں ایک حس رفیع پیدا کر دے جو سوائے اللہ کے اور کوئی چیز اس کی نظر میں نہ ہو۔

مشکلات حیات مالک یوم الدین کے اقرار سے دفع ہو گئے۔

## (السورۃ الفاتحہ)

۹ فروری ۱۹۱۶ء

راستہ، مسافر، منزل مقصود —— یہی نصب العین ہے۔ جب انسان صراط المستقیم کا متمنی ہوتا ہے معاً منزل طواغیت وضلالت کی طرف بھی نظر پڑتی ہے اور ایک تحقر آمیز نگاہ اس پر ڈالتا ہے۔ بغض وحسد کوئی مستقل چیز نہیں ہے بلکہ محبت کے ذیل میں آجاتے ہیں۔ انعام یافتہ کا کوئی دوست نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ مغضوب علیہم سے دشمنی نہ پیدا کریں۔ قرآن کریم نے ہم کو جو مخصوص سا چیز بتلائی ہے وہ یہ ہے کہ ایک کی دوستی کے واسطے دوسرے کی دشمنی پیدا کرنا ہوتا ہے۔

### آمین

۱۰ فروری ۱۹۱۶ء

یہ لفظ عبرانی ہے۔ حضرت عباسؓ نے کہا کہ اللہ ایسا ہی ہے یہ وہ لفظ ہے کہ سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ کو دیا گیا۔

سورہ فاتحہ میں آمین ضرور کہنا چاہیے کیونکہ آنحضرت صلعم برابر پڑھتے تھے۔

سورہ فاتحہ کو کیوں نماز میں شرط کیا گیا۔ چونکہ یہ دستور العمل ہے۔ خدا نے مسلمانوں کو عطا کیا ہے۔ دن میں ۳۲ بار تو اس کو یاد کرایا جاتا ہے۔ نماز سریہ میں تو سورہ فاتحہ کو امام کے پیچھے ضرور پڑھنا چاہیے۔ بوجہ نہیں سننے کے ورنہ سننا چاہیے کیونکہ یہ دستور العمل ہے۔ اور جہریہ میں امام چونکہ زور سے پڑھتا ہے۔ مقتدی کے لیے یہی کافی ہے اگر سن رہا ہو وہ پڑھے۔

لفظ "سورۃ" چہار دیواری —— اطلاق فی القرآن الشریف۔ چونکہ قرآن سورتوں سے گھیرا ہوا ہے۔

سورتوں کی ترتیب آنحضرت صلعم نے خود کی ہے۔

### سورۃ بقرہ

۱۱ فروری ۱۹۱۶ء

مکی سے مراد آغاز عہد کا نزول اور مدنی سے مراد آخری نزول ہے۔

تورات بخت نصر کے زمانہ میں زائل ہوگئی۔ حضرت عزیر علیہ السلام نے اپنے حافظہ کی بدولت مرتب کیا پھر ٹیٹس کے حملہ میں برباد ہوگئی۔ دنیا کی یہ حالت ہے کہ وہ کمزوروں کو زائل کردیتی ہے اور جس میں سلامتی وصحت ہے وہ تو باقی رہتی ہے باصول علم ارتقاء۔

دنیا ہر بہتر اصلح چیز کو باقی رکھتی ہے اور معیوب کو برباد کردیتی ہے۔ بقاء اصلح ہی قرآن کو سلامت رکھتی ہے۔ اسی قاعدہ کی رُو سے زبانیں بھی جو اصلح نہ ہوں فنا ہوجاتی ہیں اور ہوگئیں۔ باطل کیسے رہ سکتا ہے؟ کیونکہ وہ تو مٹنے والی شے ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ قرآن کی ایک ایک چیز بدستور موجود ہے قرآن پاک خود موجود ہے۔ کیونکہ وہ اصلح ہے اور موجود رہے گا اور یہی صداقت ہے۔ بخت نصر نے حملہ کیا اور تورات کو برباد کردیا۔ ہلاکو خان آیا کل کتابیں جلا کر دجلہ میں ڈال دیا جس سے پانی سیاہ ہوگیا ہے۔ پر قرآن پاک کو کچھ نہ کرسکا۔ دنیا کو جس چیز کی

ضرورت ہے اس چیز کو فطرت چھوڑ دیتی ہے۔ باتفاق کل سورہ بقرہ مدنی ہے بعض اختلاف کرتے ہیں کہ وہ مکی ہے۔ مکی عموماً مجمل ہے برخلاف مدنی کے۔ دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں سب اجمال و تفصیل ہیں کیونکہ یہ ارتقاء کا اصول ہے چنانچہ قرآن میں بھی اجمال و تفصیل ہے۔ اس قیاس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منجانب صاحب فطرت ہے نزول قرآن ہی شاہد ترتیب ہے جس قدر سورتیں ہیں وہ ضرورت پر نازل ہوئی ہیں اسلیے بادی النظر میں اختلاف باب معلوم ہوتا ہے۔

۱۲ر فروری ۱۹۱۶ء (السورۃ البقرۃ)

تمام تعلیم میں خدائی اصول یہ رہا ہے کہ ایک جماعت تیار ہو جو تبلیغ دین الٰہی کی کیا کرے۔ نبوت انبیاء کام کر کے چل دی۔ اب وہ جماعت جو اس کے قائم مقام میں ہے نبوت کی جگہ کام کرتی ہے۔

نزول قرآن کا دو کام ہے۔ ایک تو وہ جماعت تیار کرنا جو نبوت کی جگہ کام کرے۔ دوسرا کام یہ تھا کہ وہ نسل جو آنے والی ہے اس کی صلاحیت کی جائے۔

فطرت جب کوئی چیز بناتی ہے تو وہ ابتدا میں اجمال کے ساتھ ہوتی ہے بعدہٗ تفصیل وار ہوتی ہے۔

خدا کا کوئی کام بلا نظم کے نہیں۔ اللہ کا کوئی کام بلا ربط نہیں ابتدا میں جس طرح حالت گذرتی ہے اور انتہا میں جس طرح مکمل ہوتی ہے۔ بعینہٖ قرآن پاک کی ۲۳ سالہ زندگی میں گذاری تعلیم باقاعدہ تدریجاً استعداد کے موافق ترقی کرتی ہے۔

ترتیب قرآن استعداد مخاطبین کے موافق ہے اور نزول تنذیہ دبنا جماعت۔

تعلیم کی اولین بنیاد وجدان و جذبات ہے۔ انجماد قوٰی دماغی ابتدائی مرحلہ ہے اور وجدان سے یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے اس کے بعد مرتبہ ذہن و عقل کا آتا ہے۔

جتنی ابتدائی چیزیں ہوتی ہیں وجدانیہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ چونکہ مکی سورتیں ابتدائی سورتیں ہیں اس لیے وہ وجدان سے تعلق رکھتی ہیں۔ فطرت مقتضیٔ وجدان ہے۔

۱۴ر فروری ۱۹۱۶ء

۲۷ سورتیں مدنی ہیں اور باقی مکی ہیں بروایت ابن عباسؓ سورہ بقرہ سے لغایت سورہ ۵ تک کل مدنی ہیں باتفاق۔ انفجار = یک بیک جلدی سے قوت کا ابھرنا —— پھٹ جانا سورہ مکی میں کثرت سے تعذیب و صلاۃ کا ذکر آیا ہے۔ بقول مل سب سے پہلے ترقی کے واسطے پولیٹیکل ترقی بعدہٗ اور ترقیاں ہو جائیں گی جب انسان آزاد ہوا اور قید سے باہر ہوا تو وہ اب ہر قسم کی ترقی کر سکتا ہے۔

قرآن نے سب سے پہلے دعوت فکر عمومی دی ہے یعنی پہلی منزل قید سے نکلنا ہے جب وہ قید سے نکل چکا تو

اب باغ کی دعوت (د) جاتی ہے۔ یعنی فلاح وبہبودی۔ سورہ مکّی میں بھی تدریجی فرق موجود ہے۔ اجمال وتفصیل میں بھی فرق ہے۔ مکّی میں بھی پہلی سورہ چھوٹی ہے۔ یونس، ہود، رعد، ابراہیم، نحل وغیرہ بڑی ہیں اور مکّی ہیں۔ مکّی میں عموم کم اور خصوصیت زیادہ ہے۔

مکّی سورتوں میں سب سے زیادہ سہولیت ہے اور مدنی میں برعکس۔ مثلاً نزول میں سب سے چھوٹی سورتیں جیسے پارہ عمّ مقدم و متوسط و متاخر۔ اس میں کوئی حکم حلال وحرام نہیں ہے۔ اس میں اصولی اور عمومی بحث ہے۔ نبأ عظیم میں فتح مکّی کی خبر ہے۔ اللہ جس چیز کی سب سے پہلے دعوت عمومی دیتا ہے وہ اس کی صنعت کاری وغیرہ ہے۔ پھر تہذیب کا بیان ہے۔ جزا و سزا کا ذکر و جداگانہ ہے۔

<u>۱۵ فروری ۱۹۱۶ء</u> (سورۂ بقر)

مَنْ حَرَّمَ ... کے بیان سے مذمت دنیا، رہبانیت وغیرہ کو رد کا ہے۔ غرضی جو کچھ بیان کیا گیا ہے، محض مکی ہے۔

سورہ نحل میں زیادہ دلچسپ بیان ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں دین الٰہی کے بڑے بڑے نتائج مندرج ہیں۔

سورہ رعد میں مظاہر فطرت کا خلاصہ ہے اور یہ تمام مکّی ہیں۔

سورہ بقرہ مدنی ہے اور یہ سب سے پہلے کیوں رکھی گئی؟ گرچہ اور بھی مدنی سورتیں تھیں؟ شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا ہے کہ جب سورہ بقر اتری تو اس وقت کون کون مذہب جزیرہ عرب میں تھے۔ (تفصیل کے واسطے دیکھو فوز الکبیر)۔

اللہ نے عرب ہی کو مرکز برائے اصلاح عالم کیوں مقرر کیا؟

قرآن کریم نے مُنکر کو منکر صرف اسلئے نہیں کہا ہے کہ وہ خدا کا ماننے والا نہیں تھا بلکہ اس کو جو اپنے عمل اعتراف خدا کو ظاہر نہیں کیا۔ جس وقت قرآن نے نزول کیا اس وقت بھی منکرین خدا موجود تھے۔ یہ مقابلہ نیا نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ تھے کہ خدا کو جانتے تھے تو ضرور لیکن ہستی خدا سے منکر تھے۔

قرآن شریف میں اہل کتاب سے کون مراد ہے؟ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کے وقت میں بھی اختلاف ہوا تھا کہ اصحاب ژند و اوستا بھی اہل کتاب ہیں۔ بعض کی رائے میں قریش عرب بھی اہل کتاب ہو سکتے ہیں کیونکہ جب صحف ابراہیم کا لفظ قرآن شریف میں وارد ہوا ہے اور قریش بھی اپنے کو متبع ابراہیم کہتے ہیں۔ بہر کیف یہود و نصاریٰ کو تو قرآن پاک نے اہل کتاب کہا ہے اور مشرکین عرب کا صرف دعویٰ ہی تھا کوئی کتاب موجود نہ تھی ——— لہٰذا مشرکین عرب کو اہل کتاب نہیں کہہ سکتے۔ یونان میں مدون کتاب "ہیروڈوٹس کی تاریخ" ہے۔ اس وقت یہودی سب سے زیادہ 'اعلم' سب سے زیادہ معلومات کا خزانہ رکھنے والے تھے۔ سب سے زیادہ مذہبی معلومات رکھنے والے یہی یہود ہیں۔ مخاطب اگر سب سے زیادہ اعلم ہے تو اس کی تفہیم کے واسطے کلام بھی زیادہ فصیح اور پُر از اشارات ہونگے یہی اصول مدِّ نظر رکھا جاتا ہے۔۔

۱۶ فروری ۱۹۱۶ء (السورۃ البقرۃ)

حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ ہم نے دو سال میں سورہ بقر پڑھی۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب انھوں نے سورہ بقر ختم کی تو اس خوشی میں لوگوں کو دعوت دیا اور ایک بقرہ قربانی دی۔ سورہ بقرہ میں یہ خصوصیت ہے کہ اس کا عامل دنیا و دین دونوں کا حاکم ہوتا ہے۔ اس کے پڑھنے والے دنیا کی اصلاح کرتے ہیں۔ دنیا سے صرف ظلمت و ضلالت ہی نہیں دور کرتے بلکہ ظلم و تعدی، بطالت و استبداد کو جڑ سے اکھیڑ پھینکتے ہیں۔ اس کی تلاوت دل میں صادق جذبات و حقیقی وجدان پیدا کرتی ہے۔

سورتوں کا نام آنحضرتؐ ہی نے مقرر کیا تھا کیونکہ مسلم شریف میں آیا ہے کہ بعض مرتبہ دو دو سورتیں بھی اتری ہیں اور آپ نے کاتب سے فرمایا ہے کہ فلاں سورت کو فلاں جگہ اور فلاں سورت کو فلاں جگہ لکھ لو۔ نظر بریں روایت یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی کہ سورۂ قرآن اور اسماء سور آنحضرت صلعم کے عہد ہی میں مرتب ہو چکے تھے۔ اور ربط مقرر ہو چکا تھا۔ ہاں رکوع و اوقاف قرآن حجاج نے مقرر کیا تھا۔

حروف مقطعات: عربی کے جمیع حروف ابجد با معنی ہیں۔ لہٰذا کل حروف کے اسماء بھی ہیں مثلاً الف جس کے معنی ابتدا اور ایک کے ہے۔ لیکن قرآن پاک میں جس قدر حروف مقطعات ہیں ان کے معنیٰ آج تک فہم میں نہیں آئے۔ جمیع عقول فہم معنیٰ سے عاجز ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا ہے کہ ان کے معنی خدا ہی جانتا ہے۔ لہٰذا جس کے معنی مجھ کو تیقن کے ساتھ معلوم نہیں اس کی تاویل کرنا نہیں چاہیے۔ اگر سورتوں کا نام کہا جائے تو چنداں غیر مفید نہیں۔

ذالک الکتاب لا ریب فیہ قرآن کے اندر جو کچھ ہے بیان کرنے کے قبل ہی سچائی کا دعویٰ کرتا ہے کیونکہ قرآن پاک حقیقتاً مدون شدہ کتاب ہے۔ خدا اپنے علم میں اس کی تدوین کر چکا تھا۔ اب بحالت نزول بھی کتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نزول سورت ہی میں وہ الکتاب کہلایا۔

۱۹ فروری ۱۹۱۶ء

قرآن شریف نے سب سے پہلی چیز جو دنیا میں پیش کیا وہ لاریب فیہ ہے۔ قرآن کی یہی سب سے پہلی صفت ہے۔ تمام تعلیم الٰہی تمام صفت لامتناہی جو خدا کی کتاب میں ہونا چاہیے وہ لاریب فیہ۔ اب دعویٰ پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ مشاہدہ چیزوں کو دکھلا کر وجود کی موجودگی کا یقین دلا دیتا ہے۔ مگر اس کی حقیقت نہیں بتلا سکتا ہے۔ جتنی چیزیں تجربہ کی ہیں ان میں یقین کو اس لیے دخل نہیں کیونکہ حقیقت حاصل نہیں ہے۔ جب حقیقت نہیں آئی تو یقین نہیں ہے پس سب میں شک ہے۔ یورپ کے مشہور فلاسفر ہیوم نے کہا ہے کہ جس قدر چیزیں نظر آ رہی ہیں کوئی یقین کا درجہ نہیں رکھتی ہیں سب میں شک ہے۔

بیکن نے فلسفہ اور علم طبعی کو علاحدہ کیا ہے۔ ۲۰ مذہب فلسفہ جدید میں پیدا ہو چکے ہیں۔ بعد تمام دلائل
کے یہ امر پائے ثبوت کو یوں پہنچی۔ غیب وہ ہے کہ جس کو حواس خمسہ سے دریافت نہ کر سکیں۔

۲۱ر فروری ۱۹۱۶ء — ذالک الکتاب لاریب فیہ

ہر نوع انسان جس چیز کا متلاشی ہے وہ یقین ہے۔ اور یہی کامیابی ہے۔ یونانی اسکول سوفسطائی کی تعلیم
اب بھی یورپ کے بہتر سے بہتر اسکول میں موجود ہے اور وہ تعلیم شک دیتی ہے۔
ڈاکٹر سی۔ بان بھی وجود کا قائل نہیں وہ شک بتلاتا ہے۔ یقین کا خاصہ عدم تزلزل، عدم تغیر، عدم تذبذب
ہے۔ یقین انمول ہے۔ سوائے شک کے دنیاوی ترقی کچھ نہیں دیتی۔ انکار کی پیدائش فطرت کے خلاف اور نیچر کے
مخالف ہے۔ وہ انکار خواہ کسی میں ہو انکار تو عدم علم کا ثبوت ہے۔ انکار محض جہل ہے۔ ارباب علم نے کبھی بھی
انکار خدا نہیں کیا۔ اگر کیا تو چند اراذل وسفہاء نے۔ جب کسی کو کسی چیز میں یقین نہیں ہوتا تو عزم ومحنت بھی مفقود
ہوتا ہے۔ جب سپاہی کے اندر یقین نہیں ہے تو وہ ضرور شکست و ناکام رہے گا۔ کامیابی یقین وعملِ صالح پر منحصر ہے۔
اختلاف نتیجہ شک ہے اور یہ جہل ہے۔ یقین تو علم ہے جب علم ہوگا تو اختلاف کبھی نہ ہوگا۔ شریعت علم ویقین ہے
اس لیے اس میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ جس چیز کو ہم محسوس نہیں کر سکتے وہ غیب ہے۔ دنیا میں وحی الٰہی ہی یقین
ہے چونکہ خوف میں شک رہتا ہے جب شک یعنی خوف زائل ہو جاتا ہے تو امن بھی قائم رہتا ہے۔ کفر شک
ہے اور یقین ہی ایمان ہے۔ دوسرے الفاظ میں علم ایمان ہے، جہل کفر ہے۔ اگر یقین کا کوئی منتہا درجہ ہے تو وہ بعائر
ہے۔ تقلید نتیجہ ہے جہل کا۔ علم کبھی بھی تقلید نہیں۔ تقلید تو محض ظن ہے جو شک ہے۔ شریعت کا نام علم رکھا اور علم
کے بعد تو جہل ہے۔ اہل علم واہل جہل بصیر واعمیٰ، شب زندہ دار کو چونکہ خداوند کریم پر پورا یقین ہے جب ہی تو وہ
رات کو کھڑا رہتا ہے۔ لہٰذا اول بنیاد کامیابی کی یقین ہے اور شک زوال کامیابی —— !

۲۲ر فروری ۱۹۱۶ء — ھدی... مفلحون

راغب اصفہانی: متقین کا مادہ وقا ہے، کسی چیز کی حفاظت کرنا۔ اذیت سے اب اس کا اطلاق خوف پر بھی ہے۔
یعنی خوف اس بات کا کرنا اذیت ومضر سے بچا رہے۔ قرآن نے جو جماعت تیار کی ہے اس کا اولین نام متقی ہے۔ ابتدا
میں انسان نے خدا کو خوف میں ڈھونڈھا۔ موسیٰؑ کے وقت میں اللہ وبندہ کا تعلق مانند تعلق زوجہ وزوج کے تھا۔
بعدہٗ قہریت کا وزن کم کرنے کے لیے مسیحؑ نے باپ بیٹے کا تعلق بتایا۔ اور اب محبت کی ارتقائی نسبت زیادہ ہو گئی
اس لیے اب کل تعلق دوری کو چھوڑ کر ملا دیا اور ربوبیت کا تعلق پیدا کر دیا تاکہ کوئی غیر تعلق نہ رہے۔ اب خاص خداوندی

تعلق براہ راست پیدا ہوگیا کیونکہ اب بندہ صاحب استعداد ہو چکا ــــــــ !

سورہ فاتحہ میں اللہ نے جو پہلا حسن دکھایا وہ یہ ہے کہ پہلے نام بتایا بعدہ رب کہا جو غایت درجہ کی مہربانی ہے۔ اللہ کا خاص تعلق محبت سے ہے۔ انسان کی اصلی فطرت نیکی ہے۔ انبیاء کا کام صرف زنگ کو جو فطرت میں چھا گیا ہے دور کرنا ہے۔ بدنیکی کا عدم ہونا ہے۔ عدل پر چلنا ہی خیر ہے۔ گمراہی و مضرت سے بچانا فطرت و قلب کو یہی ارتقا ہے۔

٢٣ر فروری ١٩١٦ء

نزول: لغوی' اوپر سے نیچے آنا۔

آخر: لغوی یعنی وہ جو سب کے بعد آوے۔

قرآن نے جزا و سزا کا نتیجہ دنیا و قیامت دونوں میں ہونا ظاہر کیا ہے۔ قانون مکافات دونوں جگہ ہے۔

الغیب: نظر سے پوشیدہ ہونا' غیر محسوس ہونا۔

دعویٰ کے صدق و کذب کی جانچ یہ ہے کہ دعوی کو کر کے دکھاوے۔ مثلاً حکیم کا دعوی حذاقت میں فرد ہونا یہ ہے کہ وہ مریض کو لاوے اور اچھا کرے۔ دیگر دعوی کی لیاقت ہے یا نہیں۔

قرآن نے جو دعویٰ کیا ثابت کر دکھایا بیماری دفع کی اور جماعت متقی تیار کر دی۔ جو تندرستی حاصل کرتا ہے وہ ایمان الغیب پر یقین رکھتا ہے۔

الغیب: ذات الٰہی چونکہ حواس سے غیر محسوس ہے' وہ قرآنی جماعت جس کے اندر اللہ تعالیٰ کے وجود پر اس قدر یقین ہو جائے جس قدر محسوسات میں بھی نہیں ہو سکتا ہو۔ اس طرح یقین کرنا کہ بالکل زوالِ شک ہو جائے۔ کمال درجہ پر یقین رکھنا ہی ایمان ہے۔ مثلاً عبادت الٰہی اس طرح کرنا گویا اللہ کو نظر سے دیکھ رہا ہو۔

الصلوٰۃ: ایام جہالت میں اس کے معنی تھے گھوڑے کے پیچھے گھوڑا کا دوڑنا' تالی بجانا۔ یعنی عرب جاہلیت میں عبادت کے وقت عبادت میں کچھ موسیقی کا استعمال کرتے تھے۔ اصل معنی جو شعراء عرب نے استعمال کیا ہے وہ بلند دعا کے ہے۔ متقی تو خود ہدایت یافتہ ہوتا ہے پھر متقی کی ہدایت کیسی؟ یہ اتقا جو اس کو ملا ہے وہ قرآن شریف ہی سے۔ اس کو جو تندرستی ملی ہے وہ اسی علاج سے۔ وہ گروہ جو اپنی بیماری کو اچھی طرح سمجھا اور علاج کرایا وہی لوگ متقی ہیں۔

قرآن کریم کی یہ عادت ہے کہ پہلے وہ وجدان بیان کرتا ہے بعدہٗ ذہنیات۔ سورہ بقرہ میں زیادہ تر یہود ہی کے بیان ہیں۔

٢٦ر فروری ١٩١٦ء

ایمان بالغیب' یہ صفت متقی کی ہے جو قرآن کے ذریعہ نبی' مومن خیر البریہ ہے۔ یہ دنیا میں سالم ہے' یہ علمی بحث

ہے۔ اور باعتبار عمل کے غیب پر یقین رکھنے والا ہے۔ قرآن نے جس جماعت کو تیار کیا ہے گو دنیا ایمان بالشہود پر چل رہی ہے مگر یہ جماعت وہ ہے کہ اللہ نے جو چیز پر پیدا کردیا اس کے تسلیم میں کچھ شک نہیں کرتے جو رسولؐ نے کہہ دیا اس کو بن دیکھے مان لیا۔ متقی مومن کی یہی پہچان ہے۔ مومن و غیر مومن میں یہی فرق ہے کہ مومن اللہ اور رسولؐ کی بات میں شک نہیں کرتے۔ اگر ان سے کہا جائے کہ تم آگ میں کود جاؤ اس میں تمہاری فلاح ہے وہ بلا شک و شبہ آگ میں کود جائیں گے۔ غیر مومن تو حواسِ خمسہ پر زندہ ہے۔ اگر اس کو روٹی ملی تو زندہ ہے اگر یہ گم ہوگئی تو وہ مرگیا۔ اور اللہ کے بندۂ مومن کا یقین تو اللہ ہی کے فرمان اور رسولؐ کے حکم ہیں۔ وہ حواس پر یقین رکھتے ہیں حواس پر بھروسہ نہیں کرتے۔ مومن تو ایمان بالغیب فطرۃً ساتھ لیتا آتا ہے کیونکہ ایمان بالغیب تو ذوق سلیم ہے اور جب ہی تو کافر کو مریض کہا ہے۔ کیونکہ مرض ہی کی وجہ سے ایمان کی حلاوت معلوم نہیں ہوتی محض تلخ معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات کس قدر بوالعجب ہے کہ وہ امر جو ہماری نظر سے گم ہے جس کو ہم نہیں دیکھ سکتے اس پر پورا یقین ہے اس کی فرماں روائی پر زندگی منحصر ہے۔ اگر ایمان بالغیب نہیں ہے تو وہ ہرگز مومن نہیں ہے۔ جب ایمان بالغیب پر یقین رکھتا ہے تو وہ سنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ تمکو تمام دنیا کی خلافت دی جائیگی اور وہ ایمان بالغیب کا متوالا فوراً یقین کرلیتا ہے آخر وہی ہوا جو وعدہ ہوا تھا۔ جس نے ایمان بالغیب پر یقین کرلیا اب وہ کبھی بھی شک نہیں کرتا چنانچہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم کو ایران کے تخت کسریٰ کا تاج ملے گا گرچہ ان سے وطن چھوٹتا ہے عزیز سے عزیز چیزیں چھوٹتی ہیں مگر وہ ہے کہ اس یقین پر پورا بھروسہ کیے ہے آخر وعدہ کے موافق فائز المرام ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے یہی جماعت تیار کی اور وہ جو کچھ کہا اس پر وہ اس طرح یقین کرلیا کہ اس کے خلاف ذرہ بھر بھی شک نہ ہوا گرچہ اس پر کیسا ہی ستم ہو۔

۲۸ر فروری ۱۹۱۶ء

بغیر دیکھے ہوئے یعنی بے بغیر دلائل کے۔ مومن ایک وجود ہے جس کا سررشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے جو کہا وہ یقین ہوگیا۔ سبب تنزل صرف ایمان بالغیب کا گم ہونا ہے۔

اور ترقی جو قرون اولیٰ میں حاصل ہوئی تھی وہ ایمان بالغیب کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ چونکہ اس میں ایمان بالغیب تھا اس لیے ثمرہ پایا۔ ساری دنیا پر حکومت کی وہ صرف ایمان بالغیب تھا ورنہ اور کیا تھا؟ اس لیے تعداد کا مسئلہ ان میں سے جاتا رہا تھا —— یقین کا ثبوت اعضاء جوارح سے ہونا چاہیے۔ اللہ جو کچھ فرمائے اس کو مان لینا اور اس پر یقین کرنا۔ اُمت آخرہ کو اُمت اولیٰ پر اسی لیے فضیلت ہے چونکہ یہ آنحضرت صلعم پر بن دیکھے

یمان لایا ہے۔ اور وہ آنکھ دیکھا ایمان رکھتے تھے۔ ایمان بالغیب ہی کی فضیلت میں اُمتِ آخرہ کی تعریف کی گئی ہے۔
ایمان بالغیب میں دل و دماغ شامل ہیں اور اعضائے جوارح میں صوم و صلوٰۃ شامل ہیں جس قدر مطلوبات ہیں وہ شامل جوارح سے ہیں۔ تیسری چیز ثمرہ اعمال ہے یعنی تلاشِ رزق۔ تلاشِ رزق صرف تنازع البقا ہے۔ مال نتیجہ جد و جہد اور یہی تیسری چیز ہے۔ جیسے دل و دماغ: ایمان بالغیب، اعضائے جوارح: صلوٰۃ، مال و دولت: رزق مما تجبون۔

خدا کا مسافر جب سفر طے کرے گا تو پہلی منزل دل و دماغ ہے۔ دوسری منزل اعضاء جوارح اور تیسری منزل مال و دولت۔ انھیں تین منزلوں کا مرکب صراطِ مستقیم ہے۔

۲۹ فروری ۱۹۱۲ء والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک

اب کسی ایک پر خصوصیت نہیں ہے بلکہ وہ ایسا گروہ تیار ہوا ہے جو کسی ایک صداقت پر دعویٰ نہیں کر سکتا کیونکہ یہ تو ایسی جماعت ہے کہ اب اور ماقبل کی کل صداقتیں اسمیں موجود ہیں۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ ہم نے ایک ایسی جماعت تیار کر دی ہے جس میں صداقتِ موسوی و مسیحائی سب موجود ہے۔ متقی میں آخری درجہ وما انزل من قبلک ہے۔ وبالآخرۃ ہم یوقنون (مفصل بیان سورہ فاتحہ میں دیکھو) الی مفلحون۔

فلاح یافتہ وہ ہے جس کے یقین و عزم و عمل اس قدر مضبوط ہوں کہ وہ کبھی کبھی کسی نقصان سے دب نہیں سکتا۔ ! ان الذین کفروا ــــ کفر بمعنی چھپانا۔

۱ مارچ ۱۹۱۲ء

جب کبھی راستی پیش کی جائے تو بلحاظ قبول کون جماعت اور کون نوع ہو گی۔ ایک جماعت وہ نظر آئے گی جو حق پسند یعنی متقی۔ وہ پہلی جماعت ہے نیز اس میں استعداد بھی قبول حق کی موجود ہے یہ وہ جماعت جس میں ارشتۂ قبولیت موجود ہے۔ واولٰئک ھم المفلحون ٥

قرآن نے گمراہوں کو دو جماعت میں تقسیم کیا ہے۔ چونکہ یہ بحث مذہبی ہے اور قرآن مذہبی کتاب ہے۔ دنیا میں دو گروہ ہیں اصولاً ایک وہ جس نے حق کو نہیں پہچانا۔ اور جو روشنی حق کی اور ہدایت کی آتی ہے وہ اس سے فیض حاصل نہیں کرتا بلکہ آنکھوں کو اس سے بچاتا ہے چونکہ اس میں استعدادِ اخذ فیض نہیں ہے۔ چونکہ بطالت اس کے قلب میں پوری طرح تسلط کر چکی ہے، قوت احساس فنا ہو چکی ہے۔ وہ جس حال میں ہے قانع ہے۔ قوتِ تمیز مفقود ہے۔ کفر تو تکذیب رسول ہے یعنی انکار حقیقت۔ دوسری نسل اسی کے ضمن میں پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ باوجود معرفت حق کے حق سے اعراض ــــ وہ تو جانتا ہے کہ اس میں حق کی روشنی ہے مگر اس کے تسلیم میں فقدانِ غرض کی وجہ پیدا ہوتی

ہے۔ بعوض قبولیت کے وہ امرارِ حق میں پوری طرح کوشاں رہے گا۔ وہ حق کو اس لیے دفع کرتا ہے کہ اس کی قبولیت میں اسکی غرض فوت ہوتی ہے۔ تجارت میں کمی واقع ہوتی ہے تو صرف قبول ہی نہیں کرے گا حق کو مٹانے کی پوری کوشش کرے گا۔

اب تیسری جماعت وہ ہے جس میں کچھ دعویٰ تو حق کا معلوم ہوتا ہے مگر محض جاہل ہے۔ مذہبی جماعت ہونے کا حریفانہ دعویٰ تو کرتا ہے مگر حقیقت سے بے علم۔ وہ دوسرے کو دھوکا دیتا ہے۔ اپنے نفس کو بھی دھوکا دیتا ہے۔ یہ دنیا میں بوسیع ساری ہے۔ خادع مخادع کا عامل ہے۔ چونکہ علم مذہب ہے اس لیے مفسد ٹھہرتے ہیں۔

ان الذین کفروا... سواءٌ علیھم انذرتھم ام لم تنذرھم ——

وہ اس لیے نہیں دیکھیں گے۔ ختم اللہ علی قلوبھم ——

اس کی ضرب پہلی یہود پر پڑتی ہے۔

ومن الناس من یقول ——

۲ر مارچ ۱۹۱۶ء

عمل صالح سے بقاہے اور غیر صالح سے فنا ہے یہی قانونِ الٰہی ہے۔ کوئی تعمیر بلا تخریب کے ہوہی نہیں سکتی۔ تعمیرِ کثیر تخریب قلیل پر فوقیت رکھتی ہے۔ مذہب اگر تعمیر ہے تو شمشیر ہے اس کی مضبوطی منحصر ہے۔ قانون بقاءِ اصلح کے مطابق مذہب کا تلوار چلانا نہایت بہتر کام ہے اور یہی سنت اللہ ہے اور اس میں تبدیلی محال ہے۔

ختم: ڈھانک لینا' قلب: عقل

یخادعون اللہ: یعنی وہ جس عمل کو کرتے ہیں حقیقت میں وہ عمل نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ان میں ہے حالانکہ ان میں نہیں ہے۔ وہ دراصل اپنے نفس کو دھوکا دیتے ہیں وہ تخلفِ الٰہی کرتے ہیں لیکن حقیقت میں اپنے نقصان میں پڑے ہوئے ہیں۔

فی قلوبھم مرضٌ: سے مراد تعطلِ عقول، تعطلِ تفہیم ہے کمال ضعف۔

فزادھم اللہ مرضاً: اب امرِ الٰہی ظاہر ہوگا اور ان کے تعطلِ تفہیم و بصارۃ کا نتیجہ نکلے گا جسکی زیادتی پر دکھ کی زیادتی ہوتی ہے۔

۴ر مارچ ۱۹۱۶ء

ختم اللہ علی قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم، فزادھم اللہ مرضاً

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ ہی مرض بڑھانے والا ہے تو پھر جزا و سزا کیا؟ یہ خیال محض غلط ہے۔

صحابہ کرام جو بہترین قرآن سمجھنے والے تھے کبھی بھی اس کے متعلق ایسا خیال نہیں کیا اور نہ شبہ کیا ——

یہ تو اس جماعت کی حالت ہے جو نسلاً بعد نسل اپنی سہل انگاری سے ایسی بری کرلی ہے۔ اب خواہ ڈراؤیا نہ ڈراؤ وہ تو اس کی طرف خیال نہیں کرنے والے۔ وہ تو اللہ کی دی ہوئی چیز سے کام نہیں لیتے تو قانونِ الٰہی یہ ہے کہ

ایسا مریض ضرور مر جائے گا۔ جس قوت سے کام نہ لیا جائے تو لامحالہ وہ قوت زائل ہو جائے گی کیوں کہ یہ قوانین قدرت ہیں اور اسی قانون کو اپنی قدرت کی طرف نسبت دیتا ہے اسی لیے ختم اللہ۔۔۔ فرمایا۔ کیونکہ یہ طریقۂ تعبیر ہے اسی مسئلہ کو بعض مسئلہ قضا و قدر کہتے ہیں محض غلط اور صریح غلط۔ فزادہم اللہ مرضاً سے مراد شریعت حقہ کا نزول ہے کیونکہ وہ تو اس سے اعراض کرتے ہیں۔ حق کے آنے سے ضرور دکھ بڑھے گا۔ واذا قیل لہم لاتفسدوا۔۔۔ جب ان سے کہا جائے کہ فساد مت کرو جواباً کہتے ہیں کہ ہم تو مصلح ہیں فساد سے کیا علاقہ۔ بعض کہتے ہیں کہ اصلاح سے مراد صلح ہے درمیان قریش و مسلمان کے کیونکہ کافر کہتے تھے کہ ہم تو ان دونوں کو ملا دینا چاہتے ہیں اور اللہ کہتا ہے کہ نہیں! یہی فسادی ہے۔

فساد سے مراد کفر ہے۔ اصلاح سے مراد ہے شریعت اسلامیہ کا قائم ہونا۔ مصلح سے مراد جو شریعت الٰہی پر چلے اور مفسد سے مراد جو شریعت الٰہی کا مخالف ہو۔

ملأ فرعون نے بھی جماعت موسیٰؑ کو مفسدین فی الارض کہا مگر اللہ جانتا ہے مفسد اور مصلح کون ہے؟ سب جانتے ہیں کہ مفسد ہلاک ہوا اور مصلح وہ تھا جو فتح و نصرت کا مالک ہوا۔ مفسدین کا ایک یہ بھی فساد ہے کہ جب کبھی اس کے سامنے حق پیش کیا جائے تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو محض فساد ہے۔ واذا قیل لہم آمنوا۔۔۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم سفہا کی طرح ایمان لائیں گے؟ اس میں ان کی حقارت علی المومنین معلوم ہوتی ہے۔ اخلاص سے ایمان لانا گویا ان کے نزدیک یہ فعل سفیہوں کا ہے۔ فی الحقیقت جو جماعت ایمان لے آئی وہی تو عقلمند ہے جو دائمی آرام و عزت و عظمت حاصل کر رہا ہے، عقلمند تو ضرور ہے جو ایک مٹھی خاک دے کر سونا خریدتا ہے ——!

۶، ۷ / مارچ ۱۹۱۶ء

دوسری جماعت وہ ہے جو خادع ہے۔

قانون قدرت یہ ہے کہ ہر چیز جو ضعیف ہے فنا ہو جائے گی اور قوی باقی رہتی ہے۔ صحیح موجود رہتا ہے بیمار فنا کو پہنچتا ہے اس طرح جس کی روح قوی ہے وہ موجود رہتی اور کمزور فنا کو پہنچتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ حق قائم رہے گا اور باطل مٹ جائے گا۔ لہٰذا سنت اللہ بدلیل (۱) استعداد (۲) التہاب (۳) انفجار یہ تینوں اصلاح و افساد میں بھی موجود ہیں ——!

قانون اہمال (یہ قرآنی اصطلاح ہے بعوض استعداد کے) یہ خدا کے قوانین ہیں۔

قانون مکافات ہے۔ جیسا جرم ہوگا عذاب بھی ویسا ہی ہوگا۔ دیکھو سرسید نے جیسی یورپ کی پوجا کی

دلی اہی تعلیم یورپ نے انھیں برباد کیا۔ دنیاوی سزا کل غیر موافق ہے مگر خدا معصیت کے موافق سزا دیتا ہے۔ سب سے بڑا ظلم تو یہ ہے کہ ہے تو باطل مگر دعویٰ حق کا کرتا ہے۔ دنیا حق پرستوں کے لیے ہے بطالت کے واسطے نہیں کیونکہ دنیا خیر الاخرہ ہے، جب کبھی حق منجانب خدا آتا ہے تو کوئی کبھی بھی قبول نہیں کرتا ہے جب تک کہ وہ قربانی نہیں دے۔

سچائی کا معجزہ یہ ہے کہ جب کبھی حق ظاہر ہوا ہے تو ضعفاء سے ہوا ہے، غربت سے ہوا ہے، تجربہ بڑی سے ہوا ہے، سچائی ہر موقع پر قربانی چاہتی ہے جس طرح ایک دہقان اپنی تھوڑی آئندہ امید پر خالی کرتا ہے۔ بعینہٖ ایک حق پرست بھی اپنا تھوڑی کل کی امید پر خالی کرتا ہے۔ مصلحت پرستی ایک شیطان لعین ہے۔ مومن پر استہزا کرنے والے ہی منافق اور دنیا میں فساد پھیلانے والے ہیں۔ واذا لقوا الذین آمنوا۔۔ یہ آیت منافق کے واسطے ہے۔ یعنی درمیانی راہ نکالنے والے ہیں۔ خارجی چیز کا احساس اندر کی لیاقت سے ہوتا ہے قرآن کا قول ہے کہ ہم کو لے لو جو کچھ ہے وہ ہم میں ہے۔ قرآن ایک قاعدہ کلیہ ہے۔ ترقی کے واسطے قرآن کو قبول کرلو۔ دنیا میں حکومت قرآن ہی سے پھیلی ہوئی ہے۔ نفاق تنزل ہے۔ انسان کے لیے دو درجے ہیں ایک تو اعلیٰ دوسرا ادنیٰ، تیسرا درجہ کوئی نہیں اگر ہو تو وہ نفاق ہے۔ شیاطین بمعنی سردار۔

تبلیغ —— ہجرت

وہ تو استہزا کرتے ہیں مگر وہ خود اپنے اوپر استہزا کرتا ہے۔

۸ رمارچ ۱۹۱۶ء

جب تک ایمان و عمل صالح نہ ہوگا کبھی بھی نجات نہیں پا سکتے۔ وہ چیز جو بین بین ہوتی ہے وہ راہ محض خدع کی ہے اس کی تعریف نفاق ہے۔

واذا خلوا الی شیاطینہم۔۔ ان کے رؤسا سردار شیطان کی اصل شیطنت ہے جس کے معنی ہیں دوری یعنی جس میں حق سے دوری ہو وہ شیطان ہے۔ جب کبھی سچائی ظاہر ہوتی ہے تو ایک جماعت شیطان کی مخالفت میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ شیطان انسان و جنات دونوں میں ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے شیطان فرعون کی مخالفت ہوئی۔ ابراہیمؑ سے شیطان نمرود کا مقابلہ ہوا۔

اللہ یستہزئ بہم ویمدہم فی طغیانہم —— حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ یمدہم کے معنی (ڈھیل) فرصت پہنچا جانا، مدد، مہلت، پھیلاؤ، طوالت۔

قانون امہال: کسی مواد کے دور و تکمیل میں جو وقت ہوتا ہے وہی یہ ہے جو قانون تینوں کا مجموعہ ہے

یعنی استعداد' التہاب'، انفجار' معصیت کی پیدائش استعداد ہے۔ ان کے انضمام و اجتماع کا نام التہاب ہے اور ان کا پھٹ جانا انفجار ہے۔ انفجار ہی عذاب الٰہی ہے۔

قرآن پاک میں عذاب بھی چند اقسام میں منقسم ہے ——— سورہ عنکبوت میں ہے اللہ تعالیٰ کی شہادت انفجار ہے جو مخالف کو بتا دیتی ہے کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر ہے۔ اللہ تعالیٰ دکھا دے گا کہ یہ عذاب کیا اور کب آجائے گا۔ سورہ نحل میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو چاہتا تو فوراً عذاب میں ڈالتا اور پھر کون تھا جو ان کو بچاتا۔ چونکہ اللہ نے وقت مقرر کر دیا اب وقت پر عذاب ظاہر ہوگا ——— معصیت کا انفجار کثرت معصیت ہے۔

اللہ کا وعدہ بالیقین سچ۔ مشاہدہ شاہد ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص نماز پڑھ کر کبھی بھی مرض خبیثہ میں نہیں مبتلا ہوا اور زانی برابر مبتلا ہوتا ہے۔ کفر اور ارباب کفر کو مہلت ان کی بھلائی نہیں ہے بلکہ اور بھی بلا ہے۔ اشترا کے معنی بعض نے استدلال کہا ہے ——— اولٰئک ——— الضلالۃ بالھدیٰ

اہل کتاب کے پاس تو ضرور ہدایت تھی مگر انھوں نے ہدایت کو تاراج کر دیا اور گمراہی کو بالعوض خریدا۔ تمثیل عرب میں یہ دستور تھا کہ جس چیز سے تمثیل دی جاتی تھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر جز میں ملتا ہو۔ دوسری یہ ہے کہ ایک جز کا دوسرے جز سے ممثل ہونا۔

۹ مارچ ۱۹۱۶ء

ہر دو مثال ہر دو جماعت کے واسطے ہیں۔ تمثیل مرکب کے کل جز دوسرے کے کل جز سے نہیں مل سکتے۔ تمثیل مفصل کے کل جز دوسرے سے ملتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کو جب مدینہ والے اپنے وطن میں لائے اور باعث حصول ہدایت ہوئے مگر بعض نے نفاق کیا اور ایمان سے محروم رہ گئے۔ یہ مثال اول کی ہے۔ یہی ختم اللہ علیٰ ... کے مصداق ہیں۔ وترکھم فی ظلمات ... بکم ... روشنی سے محروم کر دینا۔ تو بھلا خیال کرو تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ دوسری تمثیل کصیب من السماء ... یہ تفسیر تمثیل مفصل ہے ——— فیہ ظلمات و رعد و برق ... بارش میں بجلی کی چمک اور کڑک دونوں موجود ہوتے ہیں۔ جب انسان کسی چیز سے ڈرتا ہے تو اسکو تو مٹا نہیں سکتا بلکہ اپنی ہستی کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب بجلی چمکتی ہے تو وہ موت کے ڈر سے کانوں میں انگلی ڈال لیتا ہے اور آنکھیں چھپا لیتا ہے اور یہی تو بارش کے اجزا ہوتے ہیں۔ حصول بارش میں ان کی برداشت بھی ضروری ہے لیکن وہ کہاں بچ سکتے ہیں کیونکہ اللہ تو محیط ہے اور وہ ایسا ہی کرے گا۔ جس قدر بارش محبوب و مطلوب ہے اسی قدر اس کے اندر رعد و برق کا خوف و ڈر بھی ہے۔ اگر تم بارش چاہتے ہو تو تم کو لازم ہے کہ بجلی کی کڑک و چمک کو برداشت کرو۔ گرچہ بجلی

کی کوندے کچھ جانیں بھی ہلاک ہوتی ہیں یا للمرتا بزدل اس خوف و ڈر سے بارش کی رحمت باری سے محروم رہتے ہیں

۱۳ رمارچ ۱۹۱۶ء

تشبیہ و تمثیل ــــ اللہ تعالیٰ نے دو جماعتوں کے بارے میں دو تمثیل دی ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو اس میں دیکھتا ہے کہ بجلی گرتی ہے ہلاکت بھی ہوتی ہے اور امید کی روشنی بھی چمکتی ہے۔ بارش جو حقیقت میں محمود و محبوب ہے۔ تاہم اس میں بعض اجزا نہایت ہولناک و دہشت ناک ہیں۔ اگر بارش کی طلب ہے تو بجلی و رعد کے برداشت کی قوت بھی دل میں پیدا کرنا چاہیے۔ تمہارے واسطے بارش اپنی جبلت نہیں چھوڑ سکتی۔ علیٰ ہذا القیاس۔ ہدایت ورشد کی بھی یہی حالت ہے بعینہ۔ طالب بارش ورود بارش کو دیکھ کر ہمہ تن تیار ہو جاتا ہے تخم ریزی پوری مستعدی کے ساتھ کرے گا۔ جو لوگ بجلی سے ڈرنے والے ہیں جو لوگ رعد سے خوف کھاتے ہیں ان کو پیغام مل جانا چاہئے کہ ان کا بارش میں کچھ حصہ نہیں ہے۔

بارش ہدایت میں جو رعد و برق ہے وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ وہ انفاق ہے ہجرت ہے۔ اللہ نے دو قسم کے امثال بیان کیے ہیں ایک نوری دوسری ناری۔ قرآن پاک نہایت مربوط و منتظم ہے۔ ہر سورت کا ایک موضوع ہے۔ یہی دو اصول فہم قرآن کی جان ہیں۔ قرآن پاک کی ترتیب بمطابق خطبہ عرب العربا کی ہے۔ سامع کو سمجھانے کے واسطے تمہید ضروری ہے تاکہ مضمون الیہ کے فہم میں آسانی ہو۔ مخلص وگریز شاعری میں مضمون کے فہم کے واسطے اصلی مطلب کی طرف رجوع کراتا ہے۔ گویا گریز تمہید کو اصلی مطالب کے طرف ملا دیتا ہے اگر سامعین پہلے ہی سے مضمون الیہ کے سننے کے واسطے موجود ہوں تو تمہید کی ضرورت نہیں۔ اگر مطالب اصلی سے ناواقف ہیں تو تمہید کی ضرورت ہوتی ہے۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ تک کی تو تمہید ہے اس کے بعد اصل مطالب آئیں گے بلفظ تخاطب یاایہا الناس۔

۱۴ رمارچ ۱۹۱۶ء

یاایہا الناس ــــ اس میں سب سے پہلی چیز تخاطب ہے۔ اس تخاطب سے مقصود اہل مکہ ہیں اور یاایہا الذین آمنوا... سے مقصود اہل مدینہ ہیں۔

از ابن عباسؓ۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ مدنی میں بھی یاایہا الناس کا لفظ موجود ہے جس سے قول بالادب جاتا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ حیات مکی محض ایام ابتدائی ہے جس سے تخاطب کفر ہے اسلیے لفظ یاایہا الناس استعمال ہوا ہے۔

قرآن کریم میں سات قسم کے خطاب موجود ہیں۔ پہلا خطاب مدح مثلاً یاایہا النبی وغیرہ۔ دوسرا ذم یعنی خطاب تذلیل مثلاً یاایہا الکافر وغیرہ۔ تیسرا خطاب اضافی ہے مثلاً یا عبادی وغیرہ۔ یعنی بطور رحمت و شفقت۔ چوتھا خطاب اسمی ہے مثلاً یا عیسیٰ وغیرہ۔ پانچواں جنسی مثلاً یاایہا الناس وغیرہ۔ چھٹا ندائے نسبت مثلاً یابنی اسرائیل وغیرہ۔ ساتواں ندائے شفقت مثلاً یاایہا المزمل وغیرہ۔

پیغمبروں میں جو اضطراب پیدا ہوتا ہے وہ کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ کمال بلوغ نبوت کا سبب ہے۔ اس وقت ایک غیر یعنی عشق ہوتا ہے۔ مثلاً کوہِ حرا کی سیر اور کوہِ طور کی سیر ——

انسان بعض وقت اپنے بڑوں کو جو گذر چکے ہیں ان کی اس قدر تعظیم و تکریم کرتا ہے جس سے بت پرستی کی بنیاد پڑتی ہے۔ آہستہ آہستہ تماثیل پرستی بھی جاری ہو جاتی ہے۔ اس خیال کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے زمانے کے لوگ ہی اسی قسم کی فضیلت و تقدس کے لائق ہیں۔ جب یہ تعظیم مذہب میں آتی ہے تو وہ عظیم الشان نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ ان کی تو پرستش شروع ہو جاتی ہے اور خلف کی ترقی معدوم۔ تقلید کا غلام ہو جاتا ہے۔ یہی چیز ہے جس نے خدا سے مہجور کر دیا۔ لہٰذا قرآن پاک نے جہاں کہیں کہا ہے تو وہ یہ کہ کتاب اللہ کو قائم کرو۔ صرف زمانہ قدیم میں ہونا ہی شرف نہیں ہے بلکہ عمل و غور و خوض، تعلیم اعلیٰ بہترین معلم —— نہ کہ تقدم زمانی۔ اپنے بڑوں کی تقدیس حد شرعی سے زیادہ، یہاں تمہارا خیال ایک لمحہ کے واسطے بھی پیدا ہو جائے کہ وہ سب سے زیادہ بہتر ہے ہم کو اسی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے تو کتاب اللہ چھوٹ جاتی ہے اور یہی شرک ہے۔ آیت یہ ہے کہ والذین من قبلکم . . . اللہ جس نے تم کو پیدا کیا بس اسی طرح تمہارے اگلے کو بھی پیدا کیا۔ یہ کیا بوالعجبی ہے کہ تم اس کو پوجتے ہو یا محض ارباب من دون اللہ بنا رکھی ہے محض اس بنا پر کہ تم سے پہلے تھے۔ اسی وجہ سے کہا ہے کہ سیروا فی الارض فانظروا —— یعنی یہ جو تم سے پہلے گذرے ہیں وہ کیسے ہیں اور کیا حالت ان پر گذری۔ یہی وجہ ہے کہ تم کو پوری طرح متنبہ کیا۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلی مساوات تخلیق بیان کی ہے۔

۱۵ر مارچ ۱۹۱۶ء

ربوبیت میں دو تعلق ہے۔ روح وغیرہ چند چیزیں علوم متعارفہ کی طرح ہمکو مان لینا چاہیے۔ کیونکہ کسی علم پر بحث کرنے کے واسطے چند چیزوں کو مان لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ مبحث فیہ کی بنیاد ہے۔ ایک عالم ارضی ہے جہاں تمہاری حسی ضرورت پوری کی جاتی ہے۔ فیکذا عالم سماوی ہے جہاں ضروریات روحانی پوری کی جاتی ہے۔ اور یہ تقسیم

بلحاظ عالم کے ہے۔ قرآن پاک چونکہ کتاب فلسفہ نہیں ہے لہٰذا وہ چیز کے ماہیت سے بحث نہیں کی ہے صرف چیز کا ذکر کر دیا کیونکہ اس چیز کی ضرورت ہے فقط اتنی کہ انسان اس سے تعلق رکھتا ہے ـــــ طبقۂ محدثین اس سے محترز رہا اگر کچھ تفسیر میں ذکر آ گیا ہے تو اس کو متاخرین نے فلسفۂ یونان سے لیا۔

بناءً: کسی چیز کو اس طرح رکھنا کہ صورت پیدا ہو جائے مثلاً سیارگان و ثوابت کی خوبصورت نظام کا قیام۔

انداد: مماثلت و تشابہت پیدا کرنا۔

شہداءکم: سے مراد تمہارا خدا یعنی تمہارے الٰہ و انداد حق کو کہیں بھی ناکامی نہیں ہے کبھی اس کو شکست نہیں۔ اس پر پورا یقین ہو اور اس کا ثبوت عمل ہونا چاہیے۔ صرف قرآن پاک کا دعویٰ پیشکش امر حق ہے اور حق کو یقیناً فتح ہے ـــــ طاقت بمعنی حق کمزوری بمعنی بطالت۔

<u>۱۶ر مارچ ۱۹۱۶ء</u>

تاریخ اعجاز قرآن ـــــ پہلا دور صحابہ کرام کا ہے جس میں عجز ثابت ہوا اور کوئی بھی نہیں پیش کر سکا۔ دوسرا دور جس میں علوم فنون نے ترقی کیا۔ ہاں دور اول میں فصاحت بلاغت کی ترقی معراج ترقی پر پہنچی ہوئی تھی وہ اس لوئی سے عاجز ہو گئے اور کلام خدا تسلیم کر لیا۔ غیر عرب پر معنوی دعویٰ ہے۔ باقلانی کی کتاب جس میں قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت کے دلائل بیان کیا ہے، مگر وہ بھی چنداں مفید نہیں۔ قدماء کی تصنیفات غائب ہو گئیں۔ سورۂ قصص میں دعویٰ اعجاز قرآن موجود ہے۔ سورۂ ہود میں موجود ہے کہ تم قرآن کی طرح ایک آدھ سورہ لے آؤ۔ کلام الٰہی کو قطعاً بلیغ ہونا چاہیے جو فوراً دل میں اتر جائے۔ جب کلام الٰہی میں دعویٰ ثبوت مقابلہ کے واسطے طلب ہوتا ہے تو اس میں ہدایت کا ہونا بھی یقینی ہے۔ قرآن پاک کا دعویٰ نہیں تو صرف قرآن کی مثل لاؤ ہے اور کہیں تو ایک سورہ بھی اس کی مثل لاؤ ـــــ اگر ضمیر آنحضرت صلعم کی طرف رجوع کریں تو دعویٰ ثبوت کا ہوگا مگر اس سے قرآن کا اعجاز اضافی رہ جاتا ہے مگر اس کی چنداں وقعت نہیں۔ مگر تورات کی شمولیت نے واضح کر دیا ہے کہ مثال سے مراد اعجاز قرآن ہے اور شمولیت میں قرآن پاک سے تورات بھی ہے۔ دعویٰ جو دراصل ہے وہ کلام الٰہی کے ہونے میں ہے جو اس کو جھٹلاتا ہے وہ ایک ایسا ہی کلام بنا لائے اور ایسا نہیں ہوا۔ پس قرآنی دعویٰ اپنے تمام اعجاز قرآن میں ہے یعنی جمیع اجزاء میں یہ دعویٰ شریک ہے۔ قرآن نے دعویٰ کیا ہے کہ میں کلام الٰہی ہوں اور فصاحت و بلاغت اور ہدایت و حکمت بھی ہے۔ سورۂ قصص میں جو دعویٰ ہے وہ یہ ہے کہ ایک مثل بھی قرآن و تورات جیسی لاؤ۔ اس میں معلوم ہوتا ہے کہ صرف بلاغت ہی معیار صداقت نہیں ہے کیونکہ تورات میں یہ صفت نہیں ہے بلکہ یوں کہو کہ دعویٰ صرف کلام الٰہی

میں ہے اور ہے بھی یہی۔ کوئی بھی اس کا مقابل نہیں لا سکتا کیوں کہ اللہ تو مدعی کے ساتھ ہے مفتری کے ساتھ خدا کہاں؟
ہمارا دعویٰ جزء کتاب میں نہیں ہے بلکہ کل میں ہے اور جمیع اوصاف جس میں آگئے بلاغت تو بدرجہ اولیٰ ہے۔

۱۷ر مارچ ۱۹۱۶ء

اعجاز قرآن ـــــ معتزلہ کا دعویٰ ہے کہ قرآن کا دعویٰ فصاحت و بلاغت میں نہیں ہے بلکہ دعویٰ رشد و ہدایت میں ہے اور اشاعرہ کی دلیل ہے کہ قرآن کا دعویٰ صرف حکمت میں نہیں ہے بلکہ فصاحت و بلاغت میں ہے کیونکہ اہل عرب کو تو دعویٰ فصاحت دانی میں تھا اسلیے تحدی فصاحت میں کی گئی ختم اصل دعویٰ تو تعلق الٰہی میں ہے۔ آخری فیصلہ درمیان حق و باطل میں ہے۔ یعنی حق کے مقابل ایک ایسی ہی قوت لاؤ اور اعانت بھی اپنی مددگار سے طلب کرو اسکے مقابل ایک نمونہ پیش کرو جو ایسا ہی فعلاً کن ہو جیسا کہ قرآن پیش کر رہا ہے۔ دیگر خصائص یہ ہیں کہ اس آیت میں خصوصیت کیا ہے؟ ایک چھوٹی سے چھوٹی سورۃ لے لو مثلاً والعصر۔

عصر سے مراد ہے عموماً زمانہ۔ اور زمانہ شہادت دیتا ہے کہ انسان خسران میں مبتلا ہے اس کی حالت تاریخ میں مذکور و مندرج ہے۔ عموماً ہر حالت میں انسان خسران میں ڈوبا ہوا ہے یا اس غالب سبب ہے بمقابلہ خوذ و کامیابی کے۔ اس عام تباہی میں عام سعادت کا حاصل کرنا ہی کامیابی ہے۔ ہر وہ شے بمقابلہ خرابی کے بمقابلہ گھاٹے ٹوٹے کے آتی ہے وہ کامیابی ہے۔ یہی عام سعادت والعصر نے پیش کیا ہے۔ یعنی چار چیزیں عصر کی پیش کردہ ہیں۔ ایک یقین جس کو قرآن نے ایمان کہا ہے۔ شے دیگر عمل صالح ہے یعنی ہر وہ عمل جو عدل ہو، اوفق ہو، حقیقت و واقعیت کو ساتھ لیے ہو۔ ایمان اور صالح عمل دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں کہیں ایمان ہوگا عمل صالح کا ہونا ضروری ہے اگر یہ نہیں ہے تو ایمان ہرگز نہیں ہے۔ ثالث حق ہے۔ جتنے اعمال غیر صالح ہیں ان کو فنا ہے اور یہی قدرت کی سنت۔ زمانہ گواہ ہے غیر صالح کا انفجار عذاب الٰہی ہے۔

چوتھا صبر۔ توصیہ حق باہم دیگر۔ اسی توصیہ کو قرآن نے امر بالمعروف کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کا اسوہ حسنہ انبیاء کرام نے پیش کیا۔ توصیہ حق میں بڑی بڑی تکلیفیں ہوتی ہیں۔ اقدام میں سد راہی ہوتی ہے۔ مصیبت اور بلا کے انبار سر پر آتے ہیں تو اس کے دفع کے واسطے صبر ہے۔ یعنی قربانی اور قربانی کو طے کرنا بلا صبر کے محال ہے۔ جب کبھی حق آئے گا تو صبر بھی شامل آئے گا۔ اگر صبر تمہارے ساتھ نہیں ہے تو گویا حق نہیں ہے۔ ہاں ہر کامیابی کے واسطے یہ چار صفتیں ہوتی ہیں ـــــ یہی اعجاز ہے جو بیان ہوا۔

۲۸ر مارچ ۱۹۱۶ء استاذ مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ کی اخراجی کا حکم جاں سوز کا واقع ہونا اور دارالارشاد کا خاتمہ، طلبہ کی رخصتی، اختتام امید ـــــ

••

دریابادی

مولانا عبدالماجد دریابادی کا اپنی تصنیف سے انکار

مراسلات

## عبدالماجد دریابادی کا اپنی تصنیف سے انکار

راقم نے استفسار کیا تھا کہ فلسفۂ اجتماع کہاں سے ملے گی، مصنف کتاب مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب نے جواباً جو مکتوب لکھا اس میں مولانا نے اپنی تصنیف "فلسفۂ اجتماع" کو اپنی تصانیف سے خارج کرنے کا اعلان کر دیا۔

پروفیسر مکرم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی

مکرم گستر! وعلیکم السلام

فلسفۂ اجتماع میری بالکل نوعمری کی تصنیف ہے، ۱۹۱۴ء کی۔ جب میں نشۂ الحاد میں سرشار تھا، دو ہی چار سال بعد جب توفیق توبہ ہو گئی تو پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اس کتاب کو اپنی فہرست تصانیف سے خارج کر دیا اور اس کی اشاعت قطعاً روک دی۔ چنانچہ اب وہ کتاب کہیں بھی نہیں مل سکتی۔ پچاس برس سے زائد ہوئے کہ کتاب اپنے مرگھٹ پر پہنچ چکی۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

بسم اللہ

# صدق

مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۷۰ء دریاباد ضلع بارہ بنکی

[illegible]

# ذاکر حسین

## ذاکر صاحب

——— پروفیسر ظل الرحمٰن خاں



ذاکر صاحب: خدا بخش خاں کے بعد اس لائبریری کے سب سے بڑے محسن تھے بہت کچھ انہوں نے اسکے لیے کیا۔ وسیع جیسے بڑے کلکشن کے علاوہ اور متعدد ذخیروں کا اضافہ کرایا اور صوبائی حیثیت سے بلند کر کے اس ادارہ کو مرکز سے وابستہ کر قومی اہمیت کا ادارہ بنوایا۔

ذاکر صاحب کی یادیں ان کے قریبوں اور عزیزوں سے انکی ذاتی یادیں بطور ذاکر خطبات پیش کرانے کا اہتمام خدا بخش لائبریری پچھلے کئی برسوں سے کرتی رہی ہے۔ اس سلسلے میں خورشید عالم خاں صاحب، محمد شبیر خاں صاحب، رحمت اللہ خاں صاحب شیروانی، مرحومہ صالحہ عابد حسین، عبداللطیف خانصاحب اعظمی وغیرہ کی یادیں اس جرنل میں پیش کی جا چکی ہیں۔ ظل الرحمٰن خانصاحب کا یہ مقالہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

● ادارہ

# ذاکر صاحب

پروفیسر ظل الرحمٰن خاں

پروفیسر ظل الرحمٰن خاں (پ ۱۹۳۵ء تقر)
شاہجہاں پوری پٹھان ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
سے شعبہ طبیعات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی پھر اس
شعبہ کے چیرمین ہوئے۔ ہاشم علی صاحب کے
جانیکے بعد یونیورسٹی کے کارگزار وائس چانسلر بھی
ہے فی الحال شعبہ طبیعات میں پروفیسر ہیں۔ علیگڑھ
کے طویل قیام کے باوجود شاہجہانپوری پختون
ہونا ایک لمحے کیلئے بھی کبھی نہیں بھولے۔ ذاکر صاحب
کے خویش ہونے کے ناتے ذاکر صاحب پر
ان کا فرمایا ہوا سب سے زیادہ مستند ہوگا۔



ان کا وطن قائم گنج، ضلع فرخ آباد تھا۔ ان کے والد فدا حسین خاں صاحب وکالت کے سلسلے میں حیدرآباد دکن چلے گئے تھے لیکن آبائی وطن ہمیشہ آتے جاتے رہے۔ وہاں کوٹھی بھی بنوائی۔ اس طرح ان کا تعلق یوپی اور حیدرآباد دونوں سے ہے۔

ابتدائی تعلیم اسلامیہ اسکول اٹاوہ میں حاصل کی جہاں وہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر الطاف حسین صاحب اور منیجر مولوی بشیر الدین سے بہت متاثر ہوئے۔ اسکول کے زمانے سے ہی ان کو تحریک خلافت سے گہری دلچسپی پیدا ہوگئی۔ وہ تحریک کی حمایت میں تقریریں کرتے اور چندہ جمع کرتے۔ میں نے سنا ہے کہ ان کے ہونے والے خسر نے ان کی تقریر سنکر اپنی بیٹی کی ان سے شادی کرنیکا فیصلہ کر دیا۔

ہائی اسکول پاس کرکے انھوں نے علی گڈھ میں ایم۔ اے۔ او کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں ان کے خاص دوستوں میں رشید احمد صدیقی، حبیب الرحمٰن صاحب اور اقبال احمد خاں سہیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سنا ہے ذاکر صاحب کورس کی چیزیں تو کم پڑھتے تھے لیکن علمی اور ادبی محفلیں گھنٹوں چلا کرتی تھیں۔ کھیل کے میدانوں کے پاس تماشائیوں میں بھی دیکھے جاتے تھے۔

زمانہ طالبعلمی میں ہی انھوں نے افلاطون کی کتاب "ریاست" کا اردو میں ترجمہ کیا جو بہت مقبول ہوا۔ علی گڈھ کی طالبعلمی کے دور میں وہ صوبہ سرحد کے اورنگزیب خاں سے الیکشن جیت کر یونین کے نائب صدر بنے۔ اس زمانے میں طالبعلم صدر نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں اقبال احمد خاں سہیل نے ایک "تہنیت نامہ" فارسی میں لکھا جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

چو بینم رفعتِ اورنگ زیب از جا بر آرم  چو افتد دیدہ بر ذاکر نگہ را پر فشاں دارم

مرا زیبد اگر صد نغمہ بر لب چوں ہزار آمد  کہ در گلزارِ دانش باز فصلِ نوبہار آمد

بیاید ذاکرِ فرخندہ طالع با ہوا داراں  کہ با خیلِ عزیزاں کارواں سالار می آید

نگارِ یونین را ساعت صد زیب و زیں آید  کہ اکنوں سروِ گلزارِ ہنر ذاکر حسین آمد

آخری شعر ملاحظہ ہو :۔

الٰہی دورِ جامِ مہر تا بر آسماں باشد  دریں میخانۂ دانش ہمیں پیرِ مغاں باشد

جب اورنگ زیب خاں شاید اگلے سال الیکشن جیتے تو اس موقع پر بھی سہیل صاحب نے ایک تہنیت نامہ فارسی میں لکھا۔

ذاکر صاحب کا کہنا تھا کہ اورنگ زیب خاں کے خلاف ان کا الیکشن اس بات کا اعلان تھا کہ علی گڈھ میں اب چھوٹے آدمی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے پہلے بڑے بڑے جاگیرداروں کی اولادیں چھائی ہوئی تھیں۔ چھوٹے آدمی کی زبان کھولنے کی ہمت نہیں تھی اور اِکّا دُکّا جنھوں نے کھولی ہوگی انھوں نے نقصان اٹھایا ہوگا۔ لیکن چھوٹے آدمی کی یہ جیت عارضی تھی کیونکہ شاید اگلے سال ہی بڑا آدمی کرسی صدارت پر براجمان ہو گیا۔ اب جاگیردار تو باقی نہیں رہے مگر دس سال سے جو فیل ہو رہا ہے اس کی اہمیت تھوڑی بہت اب بھی ہے، گو کہ فرق ہوا ہے۔

جب گاندھی جی کی تحریک ترک موالات شروع ہوئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علی گڈھ میں اس کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوگی، لیکن بالآخر ایسا نہ ہوا۔ مایوسی کے دور میں جب آخری بار علی برادران نے ایم۔ اے۔ او کالج میں تقریر کی تو ذاکر صاحب اور ایک دوسرے کسی صاحب نے تحریک میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ جس پر سب کو بہت تعجب ہوا کیونکہ ذاکر صاحب کا بظاہر کوئی رجحان اس طرف پہلے نہیں معلوم ہوا تھا اور دوسرے اس وقت تحریک علی گڈھ میں دم توڑ چکی تھی۔ رشید صاحب کا بیان ہے کہ ذیل کے شعر کا جو محمد علی جوہر نے پڑھا تھا، ذاکر صاحب کے دل پر بہت گہرا اثر پڑا ؎

سپردم بہ تو مایۂ خویش را　　　تو دانی حسابِ کم و بیش را

چنانچہ وہ جامعہ پہنچ گئے جو پہلے علی گڈھ میں قائم ہوئی اور پھر وہاں سے دہلی منتقل ہو گئی۔ پہلے قرول باغ میں رہی اور پھر وہاں سے اپنی موجودہ جگہ پر پہنچی۔

چونکہ جامعہ کے زمانے کے حالات سے لوگ عام طور پر واقف ہیں اس لئے اس زمانے کے زیادہ تر حالات کا ذکر صرف اشارۃً کیا جائیگا۔ شدید مالی مشکلات سے تو لوگ واقف ہی ہیں۔ اسی زمانے میں ایک روایت کے مطابق دہلی کارپوریشن کی ایک نشست کے لیے ان کا الکشن نواب زادہ لیاقت علی خاں سے ہوا اور دوسری روایت کے مطابق لیاقت علی خاں صاحب کے کسی قریبی رشتے دار سے ہوا، جس میں لیاقت علی خاں صاحب نے سرگرم حصہ لیا۔ دونوں روایتوں کے مطابق ذاکر صاحب الیکشن جیتے۔

گو وہ علی گڑھ چھوڑ کر چلے آئے تھے، ان کا علی گڑھ سے اس زمانے میں برابر تعلق رہا۔ وہ اس زمانے میں وہاں کی کورٹ، اکیڈمک کونسل یا اگزیکیٹو کونسل کے برابر ممبر منتخب ہوتے رہے۔ ان BODIES میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا۔

جامعہ کے زمانے میں ان کو برابر چندے جمع کرنے کا کام کرنا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ وہ مسجد کے لیے چندہ لینے میرے وطن شاہجہانپور بھی آئے۔ ہمارے شہر کے مشہور تاجر اور رئیس حاجی سعید خاں صاحب مرحوم نے جامعہ میں مسجد بنانے کے لئے شاید بیس ہزار روپئے دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے لئے ذاکر صاحب خود آئے۔ حاجی صاحب نے بتایا کہ وہ چاندی کے سکّے دیں گے۔ علی گڑھ کے زمانے میں والد مرحوم کی ذاکر صاحب کے بڑے بھائیوں سے اچھی دوستی رہی تھی اور وہ ذاکر صاحب کے یونین کے الکشن میں ان کے خاص طرفداروں میں تھے۔ شاید ان کے نام کی طرف ہی اقبال سہیل صاحب کے تہنیت نامے میں اشارہ ہے۔ چنانچہ ذاکر صاحب والد مرحوم سے ملنے ہمارے گھر آئے اور ان سے یہ چاہا کہ جب حاجی صاحب رقم ادا کریں تو وہ سکّے لیکر انھیں بیس ہزار روپے کے نوٹ دیدیں کیوں کہ سکوں کے بوجھ ڈھونے میں پریشانی

اور خطرہ دونوں چیزیں تھیں۔ لیکن اس سب کی نوبت نہیں آئی کیونکہ کوئی فقہی مسئلہ ایسا حائل ہو گیا کہ حاجی صاحب نے چندہ نہیں دیا۔ ذاکر صاحب نے معاملے کی تفصیل مجھے بتائی تھی مگر بدقسمتی سے مجھے اب یاد نہیں ہے ورنہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا۔ چندہ جمع کرنے کے کام میں انکو اکثر تلخ تجربے ہوئے۔

گاندھی جی کی دعوت پر ایک کمیٹی کی مدد سے ابتدائی تعلیم کی وردھا اسکیم انھوں نے مرتب کی۔ اس کی دو باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ابتدائی تعلیم بچے کی مادری زبان میں ہونا چاہئے اور دوسری یہ کہ تعلیم کو بالکل سیکولر رکھا گیا۔ البتہ پرائیویٹ اداروں کو یہ آزادی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے خرچ پر جن بچوں کے والدین اجازت دیں ان کو مذہبی تعلیم دیں۔ یہ اور دیگر اصول قومی سطح پر اصولاً مانے گئے اور قومی پالیسی کا حصہ بن گئے۔ یہ دیگر بات ہے کہ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان میں سے زیادہ تر کی ابتدائی تعلیم اردو میں نہیں ہو رہی ہے۔ گو کہ بنیادی تعلیم کی اسکیم عملاً ناکامیاب ہو گئی مگر ان دو اصولوں کو اصولاً مان لیا گیا۔ اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اس سے کانگریس میں خصوصاً اور ملک میں عموماً جو لوگ سیکولر پالیسیوں کو عمل میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، ان کے ہاتھ مضبوط ہوئے اور آئندہ کے آزاد امیدوار کی سیکولر پالیسی بنانے میں مددگار ثابت ہوا۔ اس لئے ذاکر صاحب کو سیکولرازم کا معمار کہا گیا ہے۔ مگر یہ بات قابلِ بیان ہے کہ مجموعی طور پر ملک کی فضا اس لحاظ سے سیکولر تھی کہ لیگ اور جناح تک نے کبھی بھی آزادی سے پہلے اسلامی حکومت کی بات نہیں کی۔ بلکہ عام طور پر لوگوں کو یہ اندازہ تھا کہ جناح اس طرح کی ریاست کو وجود میں لانے کے خلاف ہیں۔ اس کا بالکل صاف اندازہ جناح کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو ڈھاکہ میں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے سامنے کی۔ کانگریس میں سیکولر خیالات کے لوگ بھاری اکثریت میں تھے گو کہ مخالف خیال کے لوگوں کی تعداد بھی نہ کے برابر نہیں تھی۔ پھر بھی کانگریس میں کوئی گروہ اعلانیہ طور پر ہندوستان کو ہندو ریاست بنانے کی بات نہیں کرتا تھا۔ شاید صرف ہندو مہا سبھا ایسی گفتگو کرتی رہی ہو گی، مگر اس کی کوئی طاقت نہیں تھی۔ گاندھی جی رام راج کی بات کرتے تھے جس سے غلط فہمیاں پھیلانے کا لوگوں کو موقع ملا مگر وہ بلاشبہ سیکولر ہندوستان کے حامی تھے۔ ان کا کوئی ذرا سا بھی تعلق ہندو راشٹر کے فلسفے سے نہیں تھا۔

لہٰذا ابتدائی اور بنیادی تعلیم کو سیکولر رکھنا کوئی جدت نہیں تھی۔ یہ ہماری تحریکِ آزادی کی روایات، ملک کے مزاج، اور ضروریات کے عین مطابق تھا۔

کم از کم ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اتنی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، اتنے مختلف رسم و رواج ہیں، اتنے مختلف دھارے ہیں کہ ایر IYER اور آئینگر IYENGAR تضاد کی حد تک مختلف ہیں گو کہ دونوں جنوبی

ہند کے برہمن ہیں، پھر مختلف خطوں کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی تجربات اتنے مختلف ہیں کہ سیکولرازم کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ کم از کم ہندوستان میں مذہب کی بنیاد پر ریاست اور حکومت نہیں چلائی جا سکتی۔ اقلیت کی طرف سے تو شاید مذہبی حکومت کی مخالفت اتنی شدید نہ ہو جتنی اکثریت کے مختلف طبقوں، مزدوروں، اچھوتوں، عورتوں اور نوجوانوں کی طرف سے ہوگی۔ برہمن کی برتری کو آج کون مانے گا جب کہ باپ کی رزی کو جوان نہیں رہے ہیں۔

ہم تو آزادی سے پہلے کے ہندوستان کی بات کر رہے تھے۔ اس وقت ملک کا مزاج کم از کم لاشعوری طور پر سیکولر تھا۔ پھر بھی اخلاقی بنا پر بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ بچوں کو مذہبی تعلیم ملنا چاہئے۔ اس لئے ابتدائی تعلیم کو سیکولر کہنے کی تجویز عام طور سے جو سوچنے کا ڈھنگ تھا اس سے الگ تھی۔ کمیٹی میں اس بات پر کافی اختلاف رہا۔ ملک کے پیمانے پر مسلمانوں میں اس پہلو کی خاص طور پر بہت مخالفت ہوئی۔

جمہوریت، سیکولرازم، اور سوشلزم پچھلے دو سو سال کی دین ہے، اور یہ یورپ سے ہمارے پاس آئے۔ میری رائے میں ان کو پرانی تاریخ میں ڈھونڈنا گمراہ کن ہے۔ ہندوستان میں جمہوریت کو تو ہم نے جوں کا توں لے لیا، مگر سیکولرازم اور سوشلزم میں ہم نے ترمیمیں کی ہیں۔ مثلاً یورپ میں سیکولرازم کے ارتقا میں ایک ہلکا سا عنصر مذہب کی مخالفت کا بھی ملتا ہے۔ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے۔ اب دو طریقے ممکن تھے۔ ایک تو یہ ہو سکتا تھا کہ ریاست اور حکومت مذہب کی تقریباً بالکل بات ہی نہ کرتی یا سب مذاہب کی برابر سے بات کرتی۔ بظاہر آخر الذکر طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا جھکاؤ اکثریت کی طرف بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح سے سیکولرازم مسخ ہو گیا ہے۔

صاف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کو ان خطروں کا احساس بہت پہلے سے تھا۔ یا تو اس صدی کی دوسری دہائی کے اواخر میں یا تیسری دہائی کے شروع میں انھوں نے کچھ اس طرح سے کہا ہے کہ کچھ لوگ اس وقت بہت اچھی نیت سے مذہب کو سیاست میں استعمال کر رہے ہیں۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ یہ کہیں بہت نقصان دہ ثابت نہ ہو۔ میں نے اسے خود کہیں پڑھا ہے مگر مجھے یاد نہیں کہ کہاں۔ اس کو ڈھونڈ کر نکالنا چاہئے۔ لہٰذا انھوں نے یہ بہتر سمجھا کہ ریاست اپنے آپ کو مذہب سے بالکل الگ رکھے۔ مگر یہ بات صاف رہنا چاہئے کہ ان کی سیکولرازم میں مذہب کی مخالفت کا ذرا سا بھی عنصر نہیں ہے ——————— چونکہ سیکولرازم پر میں نے اتنی گفتگو کی ہے تو میں اتنا اور کہہ دوں کہ میری رائے میں اس وقت ہندوستانی ریاست تو سیکولر ہے۔ مگر حکومت پوری طرح نہیں ہے۔

جامعہ کے آخری دور کی قابل ذکر بات سلور جوبلی ہے جو ۱۹۴۶ء میں منائی گئی۔ اس کی خاص بات یہ

تھی کہ مختلف قومی پارٹیوں کے لیڈر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ اس سے جامعہ کے کام کا ملک بھر میں چرچا ہوا لیڈروں نے ایک پلیٹ فارم پر آکر اس بات کی توقع اصولاً پیدا کی کہ مختلف الخیال لیڈر مل جل کر ملک کے مسائل پر تبادلۂ خیال کرسکتے ہیں اور ایک CONSENSUS پیدا کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ توقعات پوری نہ ہوسکیں کیونکہ ملک کی فضا بہت مکدّر ہوچکی تھی اور اب کسی تصفیہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ پھر بھی سلور جوبلی کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

۱۹۴۶ء میں انتخابات کے بعد پنڈت نہرو کی قیادت میں جب عبوری حکومت INTERIM GOVERNMENT قائم ہوئی تو ذاکر صاحب کو وزیر تعلیم بننے کی دعوت دی گئی جس کو انھوں نے قبول نہیں کیا۔ چونکہ یہ بات عام طور پر معلوم ہے، اس لئے میں کوئی اور تفصیل بیان نہیں کروں گا۔

آزادی اور تقسیم ملک کے فوراً بعد جب ذاکر صاحب ریل سے کشمیر جارہے تھے تو جالندھر اسٹیشن پر ان کو بلوائیوں نے گھیر لیا اور بڑی مشکل سے ایک سکھ افسر کی وجہ سے ان کی جان بچی۔ یہ واقعہ تفصیل سے اور لوگوں نے بیان کیا ہے، اس لئے میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہوں گا کہ اس طرح کے تجربے کے باوجود ان کے خیالات اور رویّے میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔

جب کشمیر کا قضیہ طے کرنے کے لیے یو۔ این (U.N) کی طرف سے ایڈمرل نمٹز ADMIRAL NIMITZ آئے تو ایک شاید چودہ نکاتی پروگرام ذاکر صاحب نے ان کے سامنے پیش کیا۔ اس سب کے علاوہ انھوں نے اس دور میں ہندوستان اور بیرون ملک کے سفر کئے اور مختلف اہم کمیٹیوں کے ممبر رہے۔ فساد سے متاثر لوگوں کی مدد کرنے کی مہم میں شدومد سے لگے رہے۔

ذاکر صاحب اور دیگر جامعہ والوں کی مالی مشکلات کا اندازہ ذیل کی باتوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ایک صاحب جن کا تعلق عرصے تک جامعہ سے رہا۔ بعد میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوگئے، دو تین سال قبل ان سے جامعہ میں میری ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو انھوں نے کہا کہ میں سب بڑے بڑے کمیونسٹ لیڈروں سے واقف ہوں اور میں نے ذاکر صاحب کو بھی جامعہ کے دور میں دیکھا ہے، میں یہ پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ رہن سہن کے اعتبار سے ہندوستان کے سب سے بڑے کمیونسٹ گاندھی جی اور ذاکر صاحب تھے۔ جامعہ میں ان کے گھر کی حیثیت ایک COMMUNE کی تھی۔

دوسری بات بہت دلچسپ ہے۔ قرول باغ کے ایک بنیے نے جب ذاکر صاحب صدر تھے، ان کے ساتھ فوٹو کھنچوانے کی خواہش ظاہر کی۔ ذاکر صاحب راضی ہوگئے۔ اوپر سے ان کو روکا گیا کہ وہ اس بنیے کے ساتھ فوٹو نہ

کھنچوا دیا کیونکہ اس کی خراب شہرت ہے۔ انھوں نے یہ بات نہ مانی اور فوٹو کھنچوا یا۔ جب ان سے وجہ پوچھی گئی تو ان کو یہ انکشاف کرنا پڑا کہ ان کے قرول باغ کے زمانے میں وہ بنیاان کو اُدھار دیتا تھا ورنہ فاقے ہوتے۔

پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کے بہت اصرار پر انھوں نے علی گڈھ کا وائس چانسلر ہونا قبول کر لیا اور سنہ ۱۹۴۸ء میں علی گڈھ پہنچ گئے۔ اس سلسلے میں اور باتیں تو لوگ جانتے ہیں مگر شاید ایک اہم بات زیادہ لوگوں کے علم میں نہ ہو اس لئے میں اسے مختصراً بیان کروں گا۔ یہ معلومات مجھے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب مرحوم سے حاصل ہوئی تھی۔ جب ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم ہوئی تو اکثریت میں مسلمانوں کے خلاف بہت سخت ناراضگی پیدا ہوئی جو دشمنی کی حد تک پہنچ گئی۔ اس وقت پنڈت گوبند بلبھ پنت یو پی کے وزیر اعلیٰ تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان یو پی میں رہیں اور بڑے پیمانے پر ہجرت نہ ہو مگر فضا کو دیکھتے ہوئے ان کو اس میں بڑی دشواری نظر آتی تھی چنانچہ انھوں نے یہ سوچا کہ تقسیم ملک کی ذمہ داری مسلمانوں سے ہٹا کر اردو اور مسلم یونیورسٹی پر ڈال دی جائے۔ آپ کو یہ یاد رہے کہ علی گڑھ کے طلبا اور اساتذہ نے مسلم لیگ کی حمایت میں زبردست حصّہ لیا تھا۔ اس سب کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ تقسیم ملک کی ذمہ داری مسلمان اور ہندوؤں پر برابر کی ہے۔ میں یہ مزید کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری آزادی کی جنگ میں بہت سی کمزوریاں تھیں مثلاً یہ طے نہ ہو سکا کہ گؤکشی کے مسئلہ پر کیا کرنا چاہیئے، بابری مسجد رام جنم بھومی اور کرشن جنم بھومی وغیرہ قسم کے مسائل پر قومی تحریک کا کیا رویہ ہونا چاہئے تو پھر تقسیم تو ہونا ہی تھی۔ مسلمانوں پر ذمہ داری کیوں رکھ دی جائے۔ خیر ان باتوں پر بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔ ہم پنت جی کی بات پر واپس آجائیں۔ انھوں نے یہ سوچا کہ غصّہ کو مسلمانوں سے ہٹا کر اردو اور علی گڈھ یونیورسٹی پر منتقل کر دیا جائے اور اس طور سے ان دونوں کا مکمل طور سے خاتمہ کر دیا جائے۔ اس طرح مسلمانوں کو یو پی اور ہندوستان میں باقی رکھا جا سکے گا۔ اس پالیسی کو سمپورنانند جی کی پوری حمایت حاصل تھی۔ اس پس منظر میں ذاکر صاحب کا علی گڈھ کا وائس چانسلر بننا خاص اہمیت کا حامل ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکز نے ذاکر صاحب کو علی گڈھ بھیجنے کا فیصلہ پنت جی کی رائے کے خلاف کیا۔ شاید پنت جی کو ذاکر صاحب سے اس وجہ سے کچھ ناراضگی پیدا ہو گئی جس کا ویسے تو کوئی ظاہری اظہار نہیں ہوا لیکن ہم آئندہ صفحات میں بتائینگے کہ شاید یہ ناراضگی آگے چل کر بہت اثر انداز ہوئی۔

علی گڈھ جو بالکل ختم ہوتا ہوا معلوم ہو رہا تھا اسے ذاکر صاحب کے آنے سے ایک نئی زندگی ملی۔ شروع میں کچھ لوگوں کو جنھوں نے پاکستان کی مہم میں نمایاں حصّہ لیا تھا، ان کو ذاکر صاحب سے خطرہ تھا کہ ان سے بدلے لیے

جائیں گے، لیکن ذاکر صاحب نے ایسا نہیں کیا اور ہر اس آدمی کو جو یونیورسٹی کے لیے کسی بھی طریقے سے مفید ہو سکتا تھا، انھوں نے اس کو اپنا تعاون دینے کا وعدہ کیا اور یہ رویہ اختیار کیا کہ جو کچھ ہوا اس کو بھلا دیا جائے بشرطیکہ آئندہ کام خوش اسلوبی سے ملک کے آئین اور قانون کے مطابق ہو۔

انھوں نے تحقیق کے کام پر زور دیا جو علی گڈھ میں کم سے پہلے صرف خال خال ہو رہا تھا۔ اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے انھوں نے باہر کے لوگوں کا بڑی تعداد میں تقرر کیا، اور جہاں کوئی اچھا آدمی ملا اس کو بلا امتیاز مذہب وملت وخیالات تقرر کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ علی گڈھ میں اس کی روایت نہیں تھی۔ سرسید نے خود یہی پالیسی رکھی تھی اس کے بعد ان کے پوتے سر راس مسعود نے بھی بالکل یہی پالیسی اختیار کی تھی۔ مگر پچھلے پندرہ سولہ سال میں لوگ اس پالیسی کو بھول گئے تھے۔ لہٰذا بہت سے لوگوں کو غیرمسلموں اور ترقی پسند خیالات کے لوگوں کا خاصی بڑی تعداد میں لیا جانا برا لگا۔ لیکن ذاکر صاحب اپنی پالیسی پر قائم رہے۔ پھر انھوں نے وہاں کے اساتذہ کو بڑی تعداد میں باہر کے ملکوں میں پڑھنے اور تحقیق کا کام کرنے بھیجا۔ یونیورسٹی کا بجٹ کئی گنا بڑھا۔ تحقیق کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ پڑھائی لکھائی کا معیار بڑھا۔ یونیورسٹیوں نے نام پیدا کرنا شروع کر دیا۔ کھیلوں کا معیار بھی جو تقسیم ملک کے بعد بہت گر گیا تھا، آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہوگیا اور اپنی پرانی سطح پر آگیا۔ اس کا ذکر زیادہ تفصیل سے آگے چل کر ہوگا۔ ڈرامے آئے دن ہونے لگے۔ سنگیت اور نغمے سنائی دینے لگے۔ غرضکہ کلچرل سرگرمیاں زور و شور سے ہونے لگیں۔ علی گڈھ کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہاں ایک نابینا اسکول پہلے سے تھا۔ وہ خیرات زکوٰۃ پر چلتا تھا جس سے وہاں کے بچوں پر بہت برا اثر پڑتا تھا۔ ذاکر صاحب نے اس کو گرانٹ پر لے لیا جس سے اسکول کی کارکردگی اور وہاں کے بچوں کی زندگی پر بہت اچھا اثر پڑا۔

علی گڈھ میں جو لوگ میرے طالب علمی کے زمانے میں رہے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ مارچ سے لے کر جون تک ایسی دھول اڑتی تھی کہ سڑک پر چلنا دشوار ہو جاتا تھا۔ ذاکر صاحب نے بڑے پیمانے پر وہاں درخت لگائے اور لان تیار کرائے۔ اس سے خوبصورتی میں اضافہ ہوا اور دھول اڑنا بند ہوگئی۔

ذاکر صاحب نے علیگڈھ کے اقامتی کردار میں کچھ تبدیلیاں کرنے کی کوشش کی مگر اس میں ان کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ذاکر صاحب کے زمانے میں بہت سی اہم شخصیتیں مثلاً پنڈت نہرو، بابو راجندر پرشاد، ڈاکٹر رادھا کرشنن، راج گوپال اچاریہ، پنڈت گوبند بلبھ پنت اور مولانا آزاد وغیرہ علیگڈھ آئے۔ ان کے علاوہ بیرون ملک کی کئی اہم شخصیتیں بھی علیگڈھ آئیں، جن میں شاہ سعود اور شہنشاہ ایران خاص طور قابل ذکر ہیں۔ مولانا آزاد، ذاکر صاحب کے شروع زمانے میں آئے۔ اس موقع پر خاصی بدمزگی ہوئی اور مولانا ناخوش واپس گئے۔

ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کی کارگردگی کو بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کی طرف ذاتی توجہ دی۔ طالب علموں کے لیے وظائف کا انتظام کیا۔ اپنی جیب سے بھی خاصی رقم دی۔ ہالوں میں خود جاکر طالب علموں کی ہمت افزائی کرتے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں فضا بالکل بدل گئی اور یاس کے بجائے نوجوان ہر طرف پر امید نظر آنے لگے۔ سیکولرازم اور جمہوریت کی قدریں نوجوانوں کے ایک بڑے طبقے میں ہر دلعزیز ہو گئیں۔ علم کی پیاس سی پیدا ہو گئی اور نوجوانوں میں جدوجہد کرکے آگے بڑھنے کی امنگیں پیدا ہو گئیں۔ بعد میں سب کو یہ اعتراف ہوا کہ ذاکر صاحب کے آنے سے یونیورسٹی بڑے خطروں سے بچ گئی اور اس نے بڑی ترقی کی۔

ذاکر صاحب کے دور میں جب نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب کو پاکستان میں قتل کر دیا گیا تو علی گڈھ میں اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے معاملات کو بگڑنے سے روکا۔ ایگزیکٹو کونسل یہ رزولیوشن پاس کر چکی تھی کہ کسی کی موت پر بھی یونیورسٹی سائرن نہیں بجایا جائے گا۔ لڑکوں کا اصرار تھا کہ سائرن بجایا جائیگا ذاکر صاحب نے لڑکوں کے موڈ کو جانپ لیا تو انھوں نے یونین میں جاکر یہ کہا کہ اگر یونین بغیر کسی اختلاف کے یہ رزولیوشن پاس کر دے کہ سائرن بجایا جائے تو میں اسے مان لوں گا۔ اس پر دو لڑکوں نے ہاتھ اٹھانا چاہے کہ ان کو اس بات سے اختلاف ہے۔ ایک تو رضی الدین احمد جو بعد میں تروپتی یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہوئے۔ اور ایک صاحب ککڑ تھے جن کا پورا نام مجھے یاد نہیں ہے۔ بہر طور بہت تھی لڑکوں نے ان کا ہاتھ نیچے دبا دیا۔ لیکن ذاکر صاحب کو شبہ ہو گیا کہ کچھ لوگوں کو خلاف رائے دینے سے روکا جا رہا ہے، تو انھوں نے کہا کہ چونکہ اس پر اختلاف ہے۔ اس لئے سائرن نہیں بجایا جا سکتا۔ لڑکوں نے کہا کہ ان کو غلط فہمی ہے۔ کوئی اختلاف نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ بات صاف تھی کہ اس پر اختلاف تھا۔ جب لڑکوں نے ذاکر صاحب کی بات نہیں مانی اور جس کمرے میں سائرن تھا اس کا دروازہ توڑنے لگے اور بالکل داخل ہونے والے تھے تو انھوں نے کہا۔ "میں حکم دیتا ہوں کہ سائرن بجایا جائے۔"

علی گڈھ کے دور کی ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ سائنس کے ایک غیر مسلم پروفیسر صاحب کی بہت مخالفت پیدا ہو گئی۔ ذاکر صاحب ان سے دل میں شاکی تھے۔ مگر برابر ان کی حمایت کرتے تھے۔ یہ ضرور صحیح تھا کہ ان پروفیسر صاحب کا رویہ ڈکٹیٹروں جیسا تھا، مگر ان میں بہت خوبیاں بھی تھیں۔ علاوہ ازیں وہ اپنے مضمون میں کافی شہرت کے مالک تھے اور ہندوستانی یونیورسٹیوں کے اپنے مضمون کے سب پروفیسروں سے زیادہ اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں مجھ سے ذاکر صاحب نے کہا کہ دوسرے آدمی میں یہ سب خرابیاں جو موصوف میں ہیں وہ تو ہوں گی اور مضمون اتنا بھی نہیں آتا ہوگا۔ اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بات مجموعی طور پر صحیح ہے۔ ان کا

کہتا تھا کہ ہمارے نوجوانوں کو لوگوں کے ساتھ نباہ کرنا سیکھنا چاہئے۔ کوئی ABSOLUTE JUDGEMENT دیے جا سکتے۔ جیسے آدمی ہیں ان ہی سے کام نکالنا ہوگا۔ وہ آدمی جیسا لوگ چاہتے ہیں کہاں سے آئے گا۔

ایک اور دلچسپ بات مجھے حسین علی کاظمی مرحوم نے سنائی۔ یہ علی گڑھ میں بعد میں [illegible] PHYSICAL CULTURE ہوئے۔ اپنے علیگڈھ کے شروع کے دور میں ذاکر صاحب نے حسین علی صاحب کو بلایا اور ان سے کہا کہ یونیورسٹی کا اہم کام تو علم اور تحقیق کے کام کو بڑھانا ہے لیکن عام مسلمان علیگڈھ کو اسکی ہاکی ٹیم کی کارکردگی سے جانتا ہے۔ لہٰذا میری خواہش ہے کہ آپ ہاکی کوچ کی حیثیت سے کام کرنا قبول کریں اور ایک ایسی ٹیم بنا کر دیں جو علی گڈھ کی ہاکی کی پرانی عظمت کو دوبارہ زندہ کر دے، مجھ سے جو مدد ہو سکے گی وہ میں کروں گا۔

ڈاکٹر نور الحسن صاحب کو بلا کر ان سے کہا کہ وہ ان کو ہاکی کلب کا پریسیڈنٹ بنانا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کہکر معذرت کی کہ وہ کبھی ہاکی نہیں کھیلے ہیں اور نہ ان کو اس سے کچھ واقفیت ہے۔ وہ اس میں کیا کر سکیں گے۔ ذاکر صاحب نے ان سے کہا کہ انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور یہ کام آپ کو قبول ہی کرنا ہے کیوں کہ جو ممبر ہیں ان میں آپ ہی ان سے آپ اس کام کو اور سب سے بہتر کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر نور الحسن صاحب نے اس کام کو قبول کیا اور ایک ایسی ٹیم بنائی کہ شاید اس جیسی ٹیم علیگڈھ نے پہلے بھی بہت مشکل سے بنائی ہوگی۔ یہ سب کی متفقہ رائے ہے کہ نور الحسن صاحب جیسا کامیاب ہاکی کا پریسیڈنٹ کوئی نہیں ہوا ہے۔

اس کے علاوہ نور الحسن صاحب کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شعبۂ تاریخ کی بنیادوں کو مضبوط کیا اور اس کے کام کو آگے بڑھایا۔ اس سلسلے میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ پروفیسر محمد حبیب مرحوم اور شیخ عبدالرشید مرحوم نے وہاں بہت پہلے سے صحت مند روایات قائم کی تھیں، اور شعبے کی آئندہ ترقی کیلئے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ شعبۂ تاریخ کے کام کو آگے بڑھانے میں دیر لگی، تو مخالفوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ سیاست لڑانے کے سوا کوئی علمی اور تحقیق کا کام وہاں نہیں ہو رہا ہے اور سب ایک FRAUD ہے۔ مجھ سے تو ذاکر صاحب نے کبھی اس سلسلے میں کوئی بات اشارتاً بھی نہیں کہی مگر میں نے اڑتی پھرتی یہ بات سنی ہے کہ وہ بھی شاکی ہو گئے تھے کہ ان کی توقعات پوری نہیں ہوئی ہیں۔ مجھ کو اس میں ذرا شک ہے، کیونکہ ان کی زندگی ہی میں کچھ نتائج سامنے آنا شروع ہو گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ذاکر صاحب اب زندہ ہوتے تو شعبۂ تاریخ کے کام سے نظریاتی اختلافات رکھنے کے بعد بھی بہت خوش ہوتے۔ ان میں وہ بات تھی کہ دو متضاد دھاروں میں ایک ساتھ خوبیاں دیکھ سکتے تھے (اس کی اور مثالیں بھی میں پیش کروں گا) چنانچہ اگر آج ذاکر صاحب زندہ ہوتے تو وہ بیک وقت

پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر عرفان حبیب، پروفیسر اطہر علی، پروفیسر اقتدار عالم خاں صاحب اور کئی لوگوں کا از حد ستائش کرتے اور پروفیسر محمد حبیب اور شیخ رشید کے علاوہ نور الحسن صاحب کی خدمت کا اعتراف کرتے۔

پنڈت نہرو کی علیگڈھ آمد کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اس موقعہ پر ذاکر صاحب نے جو تقریر کی اس کی ایک چھوٹی سی بات مجھے یاد رہ گئی جو اکثر میں اپنے طالب علموں کو بتاتا رہتا ہوں۔ وہ میں یہاں اس لئے بتا رہا ہوں کہ ذاکر صاحب کا اسی طرح قصے سنا کر چیزوں کو بتانے اور سمجھانے کا طریقہ تھا۔ کہنے لگے کہ اکثر ایجاد بہت چھوٹی سی بات سے ہوتی ہے۔ مثلاً ریل کی پٹری پہلے سے تھی۔ اس پر گھوڑا گاڑیوں سے کوئلہ کی کانوں میں کوئلہ ڈھویا جاتا تھا۔ اسٹیم انجن کانوں میں جو پانی بھر جاتا تھا اسکو نکالنے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ جارج اسٹیفنس نے صرف یہ کیا کہ اسٹیم انجن کو پٹریوں پر رکھ دیا۔ اس طرح ریلوے کی ایجاد ہوئی۔

علیگڈھ کے زمانے کی ایک اہم بات یہ ہے کہ وہ رادھا کرشنن کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔ ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم کی تاریخ میں اس کمیشن کی رپورٹ کی بہت اہمیت ہے۔

علی گڈھ کے قیام کے دوران انھوں نے ملک اور بیرون ملک کے کئی سفر کئے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اردو کی حمایت میں دستخطوں کی مہم چلائی۔

ویسے تو علی گڈھ میں ان کو طلبا اور اساتذہ کی بڑی اکثریت کا اعتماد اور تعاون حاصل رہا مگر آخر میں کچھ ساتھیوں سے شاکی ہو گئے اور دل برداشتہ رہنے لگے۔ چنانچہ بغیر TERM پورا کئے ہوئے ۱۹۵۶ء میں علی گڈھ چھوڑ دیا۔

کچھ ہی عرصے بعد بہار کے گورنر مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد پہلے وائس پریسیڈنٹ اور پھر پریسیڈنٹ کے عہدے پر فائز رہے۔ دو سال ہی پریسیڈنٹ رہے تھے کہ قلب کا دورہ پڑنے سے ۳ مئی ۱۹۶۹ء کو انتقال ہو گیا۔

**خیالات، مسائل اور شخصیتوں کی طرف رویہ:** ذاکر صاحب نے تحریک خلافت سے زندگی شروع کی لیکن جب وہ ایم، اے، او، کالج آئے تو وہاں کے تجربات سے ان میں جاگیردارانہ نظام کی قدروں کے خلاف فکر شعوری طور پر پیدا ہوئی اور میرے خیال میں اس نے ان کی مستقبل کی زندگی کا راستہ متعین کر دیا۔ شاید وہی ان کو گاندھی جی کے ساتھ لے گئی، اسی سے آگے چل کر انھوں نے سیکولرازم، نیشنل ازم، اور جمہوریت کے راستے ڈھونڈے، اور پھر زندگی بھر ان کو نہ چھوڑا۔

ان باتوں کے ساتھ ساتھ ان میں تکمیلیت پسندی بدرجۂ اتم تھی۔ اسی نے ان میں جمالیاتی حس پیدا کردی۔

مندرجہ بالا کی روشنی میں ہم ان کی فکر پر مختصراً ایک نظر ڈالنے جا رہے ہیں:

۔ جاگیردارانہ نظام مخالف رویہ: جیسا کہ ذکر آچکا ہے اس کی شروعات علیگڈھ سے ہوتی ہے۔ جب وہ علیگڈھ کے وائس چانسلر ہوئے تو انھوں نے کوشش کی کہ وہاں کے اقامتی کردار میں ایسی تبدیلیاں پیدا کریں جس سے جاگیردارانہ قدریں کمزور ہوں لیکن اس میں ان کو زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ ایک چھوٹی سی تبدیلی جو ہوئی وہ مجھے یاد ہے۔ پہلے ہالوں میں نائی بال کاٹنے اور شیو بنانے کے لیے مقرر تھے۔ انھوں نے اس طریقے کو ختم کردیا۔

ذاکر صاحب کے آنے کے بعد مولانا آزاد کی رائے اور مشورے سے ۱۹۲۰ء کے یونیورسٹی ایکٹ کی جگہ ۱۹۵۱ء کا ایکٹ لایا گیا۔ اس سے پہلے کے ایکٹ نے یونیورسٹی کو رؤسا اور جاگیرداروں کے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا نئے ایکٹ میں یہ اثرات بہت کم کردیے گئے اور یونیورسٹی کو ایک صحت مند راستے پر ڈالا گیا۔

علاوہ ازیں ۱۹۲۰ء کے ایکٹ میں جو دو ایک باتیں سیکولرازم کے منافی تھیں وہ ختم کردی گئیں، مثلاً غیر مسلم اب کورٹ کے ممبر ہو سکتے تھے۔ ایک تبدیلی اس ایکٹ کی رو سے یہ کی گئی کہ اگر کوئی مسلمان طالبعلم چاہتا تو دینیات کے بجائے HISTORY OF CIVILIZATION لے سکتا تھا۔ اس کا استعمال تو دو چار سال میں کہیں ایک دو بار ہی ہوتا ہے، مگر اصولاً یہ امکان اس ایکٹ کی رو سے پیدا کردیا گیا۔

سیکولرازم: بنیادی تعلیم کی سفارشات کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اگر MINUTES دیکھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ اگر ذاکر صاحب ذرا ڈھیلے پڑ جاتے تو سیکولرازم کا خاتمہ بہت پہلے ہو گیا ہوتا۔ ابھی تو رانس چل رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ مریض جانبر ہو جائے۔ غالباً اسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اچاریہ کرپلانی نے ذاکر صاحب کے لیے کہا ہے کہ وہ ہماری سیکولرازم کے معمار تھے۔ یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ملک میں عام طور پر ایک سیکولر مزاج تھا۔ لیکن چیزیں واضح اور صاف نہیں تھیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ مذہبی تعلیم دینے کی سفارش کردی جاتی۔ کمیٹی میں تو یہ رائے اکثریت میں معلوم ہوتی تھی۔

ایک بات جو مجھے اچھی طرح یاد پڑتی ہے، مگر مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے کہاں دیکھا، اور جس کا ذکر آچکا ہے، یہ ہے کہ یا تو اس صدی کی دوسری یا تیسری دہائی میں ذاکر صاحب نے اس بات کے خطرے کا اظہار کیا کہ مذہب کو سیاست سے نہ ملایا جائے۔ اس کو ڈھونڈا جائے۔ اگر یہ مل جاتی ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی سیاسی بصیرت ان کے ہمعصروں سے زیادہ تھی۔

ان کا سیکولر رویہ اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ جب وہ نائب صدر اور صدر تھے تو گو کہ وہ سب نمازیں پڑھتے تھے اور قرآن شریف کی تلاوت برابر کرتے تھے۔ وہ جمعہ کی نماز پڑھنے نہیں جاتے تھے۔ کبھی ان سے اس پر بات تو نہیں ہوئی مگر یقیناً اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کا یہ خیال تھا کہ ایک سیکولر ریاست کے نائب صدر یا صدر کو DEMONSTRATIVE WAY میں RELIGIOUS نہیں ہونا چاہیے۔[1]

ایک دفعہ کچھ مسلمانوں نے یہ سوچا کہ کانگریس کے سب مسلمان ایم۔ پی ایک گروہ بنالیں اور کسی ایک طرف سودا BARGAIN کر کے ہو جائیں تو اس سے بڑا فائدہ ہوگا۔ ذاکر صاحب نے اس کی سختی سے مخالفت کی جس کی وجہ سے یہ پلان ناکامیاب ہوگیا۔

۱۹۴۷ء میں جامعہ کا حال بہت ہی خراب ہوگیا۔ کوئی طالبعلم نہیں رہا۔ ہر طرف آگ لگ رہی تھی اور قتل و غارتگری ہو رہی تھی اور کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شاید کوئی مسلمان مع ذاکر حسین خان کے ہندوستان میں نہ رہیگا۔ تو وہاں کے استادوں نے ذاکر صاحب سے پوچھا کہ ہم لوگ ایسے میں کیا کریں تو انھوں نے کہا کہ ہم پھول بوئیں تاکہ ہم اپنے بعد کے آنے والوں کو خوبصورتی کا سبق سکھائیں۔ اس سے پہلے ان کے جالندھر کے حادثے کا ذکر آچکا ہے۔ ایسے تجربات کے بعد اپنا توازن قائم رکھنا ہر آدمی کے لئے ممکن نہیں ہے۔ یہ وہی کر سکتا ہے جو سیکولرازم کے عظیم ترین معماروں میں سے ہو۔

کبھی انھوں نے پرائیوٹ گفتگو میں بھی ذرا سی دیر کے لیے بھی کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جو سیکولرازم سے ہٹ کر ہوتی۔ میں تو کہوں گا کہ پنڈت نہرو کے لیے سیکولر ہونا آسان رہا ہوگا کیونکہ انھوں نے مذہب قریب قریب ترک کر دیا تھا۔ ذاکر صاحب نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ ان کو مذہب عزیز تھا اور ملک کی فلاح و بہبود کے ساتھ مسلمانوں کی فلاح و بہبود بہت عزیز تھی۔ کبھی لغزش ہو سکتی تھی۔ کچھ ایسا خیال پڑتا ہے کہ کبھی بہت غصے میں یہ ایک دفعہ کہا ہے کہ اگر اس طرح کا دشمنانہ رویہ رکھا گیا تو میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاؤں گا کہ شاید مسلمانوں نے پاکستان ٹھیک بنایا۔ باقی وہ برابر سیکولرازم کی تلقین کرتے رہتے تھے۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے کہ ان کو مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی اور ہمدردی تھی۔ اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ میں ایک بہت دلچسپ واقعہ سناتا ہوں:

"یہ بات ۱۹۶۷ء کی ہے جب وہ صدر تھے۔ میں کشمیر سے قریب ایک ماہ بعد واپس آیا۔ اس دوران عرب اسرائیل جنگ ہو چکی تھی جس میں عربوں کو شکست فاش ہوئی تھی۔ میں بھی اس سے متاثر تھا۔ میں سفر سے آتے

[1] جماعت سومی کے [illegible] سید صاحب کو ذاکر صاحب نے [illegible] [illegible]
[illegible] ۲۲۰۔ صفحہ [illegible] (ادارہ)

ہی سو گیا تھا۔ جیسے ہی اٹھا تو دیکھا کہ ذاکر صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایسا واقعہ پہلی اور آخری بار ہوا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ ملازمین سے کئی بار پوچھ چکے تھے کہ میں اٹھا یا نہیں۔ آتے ہی بولے کہ "جنگ ہوئی تھی . . ." اتنا کہا تھا کہ آنسو نکل آئے اور وہ ویسے ہی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر واپس چلے گئے۔

یہ PAN-ISLAMISM نہیں تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہماری تحریک آزادی نے، خاص طور پر گاندھی جی نے ہمیشہ واضح طور پر عربوں کا ساتھ دیا تھا۔ ان کو امپیریل ازم کے خلاف جدوجہد کرنے والی سب قوموں سے ہمدردی تھی۔ عربوں سے یقیناً کچھ زیادہ رہی ہوگی۔

تکمیلیت: وہ چاہتے تھے کہ جو کام کریں وہ بہترین کریں ورنہ نہ کریں۔ دوسرے درجے کا کام کرنے کو وہ برا سمجھتے تھے۔ اسی لئے ان کو تقریر لکھنے میں بڑی الجھن ہوتی تھی اور وہ اس سے بہت کڑھتے تھے، ان کا موڈ خراب رہتا تھا کیونکہ وہ بہترین چیز لکھنا چاہتے تھے۔ ان کی تقریر بالکل آخر وقت تیار ہو پاتی تھی۔

تکمیلیت پسندی کے فلسفے کی وجہ سے ہی انھوں نے نسبتاً بہت کم تحریری مواد چھوڑا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میر نے اپنے ذیل کے شعر میں ان کے فلسفے کی خاصی ترجمانی کی ہے:

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں　　　عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

مذہبی افکار: ان کے فلسفۂ حیات میں خاص دخل قرآن، صوفی، لبرل فلسفی، شاعر، آرٹسٹ، اور گاندھی جی کو ہے۔ ان کے یہاں خوبصورتی مذہبی عقیدے کا ایک خاص عنصر ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ خدا عظیم ترین خوبصورتی ہے۔

وہ خوبصورتی کے سچے دلدادہ تھے۔ وہ ان کی روحانی غذا تھی۔ وہ خوبصورتی آرٹ، سنگیت، رقص، رنگین پتھروں، پھولوں اور عمدہ لانوں وغیرہ میں دیکھتے تھے۔ لان پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ رانچی میں میں ان کے ساتھ لان میں ٹہل رہا تھا۔ میں لان کی خوبی کے بارے میں اس وقت کچھ نہیں جانتا تھا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا یہ لان کیسا ہے۔ میں نے اپنے خیال میں مصلحتاً کہا کہ اچھا خاصا ہے، تو اس پر انھوں نے جھنجھلاہٹ سے کہا کہ اگر یہ اچھا خاصا ہے تو پھر اچھا کیا ہے۔

ان کے اسلام کے تصور میں ڈرامہ، سنگیت، اور رقص وغیرہ حرام نہیں تھا۔ شاید ان چیزوں کی خوبصورتی ان کا خدا سے سلسلہ ملاتی ہے۔ ان کے مذہبی افکار یقیناً عام لوگوں سے مختلف تھے گو کہ وہ مجموعی طور پر پابند شرع

تھے۔ ان کو FULLY PRACTICAL MUSLIM کہنے میں مجھے ذرا سا بھی تامّل نہیں ہے۔ مجیب صاحب نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ ان کو نہ تو کٹر کہا جا سکتا ہے نہ غیر کٹر۔ ان کی شخصیت اور افکار ایسے نہیں ہیں جنکو دو چار الفاظ میں مروّج اصطلاحوں کی مدد سے بیان کیا جا سکے۔ اکبر کے ذیل کے شعر ان کے افکار کو سمجھنے میں کسی قدر مددگار ہوں گے:

ہیں ہر ایک مذہب میں کچھ کافر بھی کچھ دیندار بھی　　یاد رکھ تو بات یہ اک محرمِ اسرار کی
میں کب کہتا ہوں اے واعظ کہ میں نے راز دیں سمجھا　　فقط اتنا ہی سمجھا ہوں کہ تو بھی کچھ نہیں سمجھا

یہ بات ظاہر ہے کہ اس طرح کی مذہبی فکر رکھنے والا آدمی تنگ نظر نہیں ہو سکتا۔

**قوم و ملت اور ہندوستانی نیشنل ازم کا ان کا تصور:** علما میں سب سے پہلے مولانا حسین احمد مدنی نے مدلل اور واضح طور پر یہ کہا کہ قوم اور ملت دو الگ چیزیں ہیں اور قوم کی بنیاد وطن پر ہے۔ اس بات کی بنیاد تو پہلے سے شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے رکھی تھی مگر مدنی صاحب نے اس کو پر زور طریقے پر پیش کیا۔

اس نقطۂ نظر سے سر محمد اقبال کو سخت اختلاف ہوا اور انھوں نے ایک بہت سخت نظم بہ عنوان "حسین احمد" لکھی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اس کا اس سے سخت جواب مولانا اقبال سہیل خاں نے لکھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ذاکر صاحب کے قوم و ملت کے بارے میں خیالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس لیے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

گفت و خوش گفت بر سرِ منبر　　ملت از دیں و قوم از وطن است
ہم روایت دلیل ایں معنی　　ہم ز آیت ثبوت ایں سخن است

آگے چل کر حب الوطنی پر کہتے ہیں:

گر نیاید بہ ملت آسیبے　　عین ایمان محبت وطن است
قوم ما ہست ہر کہ ہست بہ ہند　　خواہ شیخ است و خواہ برہمن است

. . . . . . . . . . . . . . . . .

مسلم و ہندو و مجوس و یہود　　گل و نسرین و لالہ و سمن است
ہر کہ گفتہ خلاف ایں معنے　　راہبر نیست بلکہ راہزن است
ہر کہ خاک افگند بہ دیدۂ حق　　خاک بر سر و خاک در دہن است

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، اقبال سہیل خاں علیگڈھ میں ذاکر صاحب کے ساتھی رہے تھے اور ذاکر صاحب

ان کی لیاقت، ذہانت اور قابلیت کے بہت قائل تھے۔ ذاکر صاحب نے کہا ہے کہ "علی گڑھ میں شعر اور تنقید و ادب کے امام سہیل تھے۔" رشید احمد صدیقی نے ان کے لئے کہا ہے "... اس زمانے میں علی گڈھ کی ادبی فضا پر ذوق چھائے ہوئے تھے، لیکن سہیل نے وقتاً فوقتاً ذوق پر ایسی کرمی اور کبھی استہزا اور تفریحی تنقید کی اور غالب کی شاعرانہ عظمت کا ایسا سکہ بٹھایا کہ کالج میں ذوق کا کوئی حمایتی نہ رہا۔"

کہا جاتا ہے کہ سہیل صاحب کا جواب پڑھ کر سر محمد اقبال نے مولانا حسین احمد سے لکھ کر معافی مانگی اور ان اشعار کو مجموعہ سے خارج کرنے کی ہدایت کی، مگر اس پر عمل نہ ہوا۔ لیکن جیسا میں نے کہا ہے، اگر ایسا ہوا تو پھر تین چار اشعار نہیں بہت کچھ اور بھی خارج کرنا پڑے گا۔

انڈین نیشنلزم پر ذاکر صاحب بالکل صاف طور پر UNITY IN DIVERSITY کے قائل تھے۔

اس کو حال میں میں نے ای۔ کے۔ گجرال کی ایک تقریر سے واضح طور پر سمجھا۔ مختصراً عرض ہے:

انگریزوں کے آنے سے پہلے ہندوستان بہت سی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک بڑا حصہ مغلوں کے پاس تھا، لیکن دور دراز کے علاقے خود مختار تھے صرف مختصر عرصے کے لیے اشوک اور اورنگزیب کے زمانے میں تقریباً پورا ہندوستان ایک حکومت میں تھا۔ اس طرح ہندوستان میں نہ صرف یہ کہ مختلف مذاہب تھے، مختلف زبانیں تھیں بلکہ مختلف علاقوں کے تاریخی تجربات اور معاشی حالات بھی مختلف تھے۔

انگریزوں کے آنے کا جو ردِ عمل ہوا اس سے دو مکتب خیال پیدا ہوئے۔ ایک تو وہ تھے جنھوں نے DIVERSITY کا اعتراف کیا اور UNITY IN DIVERSITY کی بات کی۔ دوسرا مکتب وہ تھا جس نے ان فرقوں کو نظر انداز کیا اور پورے ملک کے سب خطوں کو یکساں ایک بنانے کی کوشش کی۔ ان دونوں مکاتب میں شروع سے رسہ کشی چلی آرہی ہے۔ کانگریس میں بھی دونوں مکاتب رہے ہیں، لیکن اوّل الذکر مکتب حاوی رہا ہے۔ اسی مکتب کے علمبردار گاندھی جی، پنڈت نہرو، ذاکر صاحب اور بہت سے اور لوگ ہیں۔

دوسرے مکتب کے لوگ اقلیتوں سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ کیا تم اپنی ملت کو مقدم سمجھتے ہو یا ملک کو۔ اس سے بدمزگی اور ناراضگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ سوال بالکل ایسا ہے جیسا کہ بعض لوگ ناسمجھی میں بچوں سے پوچھتے ہیں کہ آیا ان کو ماں سے زیادہ محبت ہے یا باپ سے۔ اس سے بچّے کی نفسیات پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ بچہ دونوں سے محبت کرتا ہے۔ یہی قدرتی بات ہے۔

# قاضی عبدالودود

- ارمغان بہار (عکس، مع مقدمہ)

——— علی حیدر نیر

- یادداشتہائے ودود



قاضی صاحب ہمارے عہد کے سب سے بڑے اردو دانشور تھے اور اب سب دانشوروں کی شناخت کرانے ہے کہ اپنے پیچھے انھوں نے جو کچھ غیر منضبط ترکہ چھوڑا ہے اس میں ان کی بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جو چھپیں تو لیکن آج تک چھپی رہی ہیں۔ "ارمغان بہار" کے نام سے ایک گلدستہ انھوں نے ۱۹۶۳ء میں ترتیب دیا تھا۔ ڈاکٹر علی حیدر نیر نے اسے از سر نو پیش کرنے کا اہتمام کیا ہے ہم ان کے مسنون ہیں۔

آخر زمانے میں قاضی صاحب کا یہ عالم تھا کہ لکھتے تھے اور اِدھر اُدھر ڈال دیتے تھے کبھی کبھی اسی چیز کو سامنے میسر نہ رہنے کے سبب دوبارہ سہ بارہ لکھتے تھے۔ انگنت موضوعات پر ان کی یہ یادداشتیں ہزاروں چھوٹے بڑے پرزوں کی شکل میں موجود ہیں۔ ان میں سے وقتاً فوقتاً پیش کیا جاتا رہے گا شاید کوئی چیز کسی کے کام آجائے۔ ان یادداشتوں میں کئی ایسی ہیں جو کسی نہ کسی مضمون کی شکل میں آ چکی ہیں، کچھ بالکل نئی چیزیں ملیں گی۔

ادارہ

سیّد علی حیدر نیّر
استاد ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی
پٹنہ، بہار

# ارمغان بہار

## مرتبہ، قاضی عبدالودود مع تعارف

"ارمغانِ بہار" صوبہ بہار کے گذشتہ تیئس۲۳ شعرا کے اشعار کا انتخاب ہے۔ اس کو قاضی عبدالودود نے حسب فرمایش جناب انوارالحسن عظیم آبادی مرتب کیا، اور جسے ڈاکٹر ذاکر حسین (گورنر بہار) جو سبکدوش ہو کر دہلی جارہے تھے، ان کے وداعی دعوت کے موقع پر ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ کی جانب سے بطور یادگار بتاریخ ۲؍ مئی ۱۹۶۲ء پیش کیا گیا۔

مذکورہ انتخاب میں یہ اصول پیش نظر رہا کہ وہ بیرونی اصحاب جو کم عمری میں بہار آئے اور یہیں اقامت گزیں ہو گئے، اُنھیں بہاریوں میں محسوب کیا گیا جیسا کہ مرتب نے ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں قاضی صاحب نے حسبِ ذیل ارکان پر مشتمل ایک مجلسِ مشورت تشکیل دی تھی:

۱۔ جناب کلیم الدین احمد، ۲۔ جناب عطا کاکوی، ۳۔ جناب جمیل مظہری، ۴۔ جناب سید حسن، ۵۔ جناب دوارکا داس شعلہ، ۶۔ راقم الحروف (سید علی حیدر نیّر)۔

اس انتخاب کے سلسلے میں عملی طور پر یہ اصول کارفرما تھا کہ مذکورہ اشخاص سے جو اشعار یا شعرا کے متعلق واقفیت حاصل ہوتی۔ قاضی صاحب کی پسند اور تصدیق کے بعد ہی اسے اس انتخاب میں داخل کیا جاتا بالخصوص شعرا کی سنِ پیدایش، وفات اور تلمذ کے سلسلے میں قاضی صاحب کا فیصلہ حرفِ آخر ہوتا۔

انتخاب کا آغاز راسخ عظیم آبادی کے منتخب اشعار سے ہوا جو قدما میں سب سے عظیم شاعر تھے۔ بعد ازاں کسی خاص قاعدے کی پابندی کیے بغیر اسے مرتب کیا گیا۔ عنوانات میں بطور اشاریہ "ش" سے شاگرد اور "م" سے متوفی مراد ہے۔

"ارمغانِ بہار" میں جن تیئس۲۳ شعرا کا انتخاب درج ہے۔ ان میں راسخ، ضیا، باقر، حسرت، امین، ثابت، رضا، سلطان، سلیم، کمال اور مبارک کے سال وفات کی تعین ہے۔ نیز احقر بہاری، ضیا، رضا، رضوان عظیم آبادی، حیران، تمنا، مبارک (شاہ مبارک حسین) اور مبارک (ڈاکٹر مبارک تلمیذ داغ) کے تلمذ کی

نشاندہی کی گئی ہے۔

"ارمغان بہار" گرچہ ایک مختصر انتخاب ہے، لیکن اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس سے قاضی عبدالودود کے ذوق شعری اور طریقۂ انتخاب پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتابچہ گرچہ مطبوعہ ہے لیکن کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ قاضی صاحب کی علمی خدمات کے سلسلے میں اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ قاضی صاحب کا ارادہ تھا کہ اس کا سلسلہ جاری رہے اور جہاں تک ممکن ہو مختصر انتخابات منظر شہود پر لائے جائیں، لیکن یہ منصوبہ تشنۂ تکمیل ہی رہا۔ اور اس سلسلے کا یہ پہلا اور آخری انتخاب شائع ہوا۔

چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش ہیں جن سے ذوق انتخاب کا اندازہ ہو سکتا ہے:

تمہاری بات اے راسخ سمجھ میں کس طرح آئے — مگر بھی یاس کا کرتے ہو اور روتے بھی جاتے ہو

(راسخ)

صبح سے بیتابئ دل کو آہ نہیں کچھ بجا تا ہے — دیکھیے کیا ہو شام تلک جی آج بہت گھبراتا ہے

(سید)

سیر کر چمن چمن فصل بہار دیکھ کر — دام بچھے ہیں جابجا بلبلِ زار دیکھ کر

(اثر)

ہمیں تو عمر دو روزہ عذاب ہے اے خضر — بلائیں تم نے ہیں عمرِ جاوداں کے لیے

(اختر بہاری)

پوچھا جو کسی نے اے اختر کیوں مشق سخن کو چھوڑ دیا — بولے کہ گیا جب موسم گل بلبل نے چمن کو چھوڑ دیا

(سید حفیظ الدین بلخی)

مرا کارنامۂ زندگی مری حسرتوں کے سوا نہیں — یہ کیا نہیں وہ ہوا نہیں یہ ملا نہیں وہ رہا نہیں

(مضطر مظفرپوری)

جو ٹپکے راز کھل جائے نہ ٹپکے آگ لگ جائے — تری یہ کشمکش اے دیدۂ پُرنم سمجھتے ہیں

(ضیا)

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے — ہم راتوں کو رویا کرتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

(باقر)

ویراں ہو خزاں سے چمن یاں تلک کہ ہائے — چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

(حسرت)

سنا ہے آج میخانے میں جام مے پرستوں نے — لٹا یا دین و دنیا دونوں ہمت اس کو کہتے ہیں

(ابن خواجہ امین الدین)

دن گیا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی — عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی

(دل)

گر یار نے آنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا — اب تک دل مضطر نے کیا کیا نہ کیا ہوتا

(جوشش)

ہزار پیار کرے گا ہزار چاہے گا — مری طرح نہ کوئی تجھ کو یار چاہے گا

(ثابت)

زلف و رخ سے دور پڑے ہیں کہ دل اب یہ کام کریں — شام سے رو رو صبح کریں یا صبح سے رو رو شام کریں

(رضا اش بر ضیا)

رضا کا اب خدا حافظ ہے یارو — یہی مجنوں کو بیماری ہوئی تھی

نکہت گل کو لیے گوشش پہ پھرتی ہے صبا — رشک آتا ہے ہمیں دیکھ سبکباروں کو (فیق)

یاد آگیا کسی کا کہنا وہ بے رخی سے — بولے کوئی نہ ہم سے بولیں نہ ہم کسی سے (سلطان)

چلے جب روٹھ ہم زنداں کے در کی توڑ کر کڑیاں — تو زنجیریں منانے کو وہیں پاؤں کی آپڑیاں (سلیم)

پاس جب آپ کو نہیں پاتے — آپ میں آپ کو نہیں پاتے (رضوان)

جی دھڑکتا ہے مرا ہجر کی پھر رات آئی — ہائے جس بات کو ڈرتے تھے وہی بات آئی (حیران)

دشت میں خاک بسر پھرتے ہیں غم کرتے ہیں — لوگ جس بات کو ہنستے ہیں وہ ہم کرتے ہیں (تمنا)

وہ جو نامور تھے زمانے میں ذکر سن لو فسانے میں — مجھے دیر ہوگی بتانے میں یہی نام ہے کہ نشاں نہیں (مبارک ش وحید)

اڑتا پھروں ہوں دشت میں جوں گرد کارواں — منزل کہیں ہے، راہ کہیں، راہبر کہیں (کمال)

مینا بھی بھرا جام بھی لبریز ہمارا — پیتے نہیں اللہ رے پرہیز ہمارا (مبارک ش وحید)

شمع سے پروانہ لپٹا اور جل کر رہ گیا — یہ تماشا جس نے دیکھا ہاتھ مل کر رہ گیا " " "

یہ غم کدہ ہے اس میں مبارک خوشی کہاں — غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے " " "

خدا کے سامنے اے محتسب سچ بولنا ہوگا — مرے شیشے میں مے دیکھی ہے یا خونابہ دیکھا ہے (مبارک ش وحید)

# ارمغان بہار
# ARMAGHAN-I-BIHAR



جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر بہار
۲ مئی سنہ ۱۹۶۲ء

IDARA-I-TAHQIQAT-I-URDU

ادارۂ تحقیقاتِ اُردو، پٹنہ

# ارمغانِ بہار

صوبۂ بہار کے شعرای گذشتہ کے اشعار کا انتخاب

از

قاضی عبدالودود

جناب انوارالحسن عظیم آبادی کی فرمایش سے

لبل لیتھو پریس، رمنہ روڈ، پٹنہ، نے چھاپا۔

# عرضِ حال

ارمغانِ بہار صوبۂ بہار کے شعرائے گذشتہ کے اشعار کا انتخاب ہے۔ وہ بیرونی اصحاب جو کمعمری میں یہاں آئے اور توطن پذیر ہو گئے، بہاریوں میں محسوب ہوئے ہیں۔

انتخاب کے ذمہ دار جناب "قاضی عبدالودود ہیں" ادارہ اصحابِ ذیل کا جن سے اشعار کے جمع کرنے یا جانچنے میں مدد ملی ہے نہایت ممنون ہے: جناب کلیم الدین احمد، جناب عطا کاکوی، جناب جمیل مظہری، جناب سید حسن، جناب دوارکا داس شعلہ، جناب سید علی حیدر نیر۔

ابتدا راسخ سے کی گئی ہے، جو غالباً شعرائے قدیم میں سب سے بڑے تھے۔ ان کے بعد ترتیب میں کسی خاص قاعدے کی پابندی نہیں کی گئی۔ شعرا کی فہرست آخر میں ملیگی، عنوانات میں ش سے شاگرد اور م سے متوفیٰ مراد ہیں۔

ارمغانِ بہار کی اشاعت کے اخراجات جناب انوار احسن حیرت نے ادا کیے ہیں۔ ادارہ ان کا بغایت شکر گذار ہے۔

## راسخ، غلام علی، م ۱۲۳۸ھ

اپنی جانب تھا کشاں ہر عضو تیری درد کو
ہای ری لذّت کہ جھگڑا جس کا ہمدیگر رہا

تمہاری بات ای راسخ سمجھ میں کس طرح آئی
گلہ بھی یار کا کرتی ہو اور روتی بھی جاتی ہو

صبح سو بیتابی ہی دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہی
دیکھیو کیا ہو شام تلک جی آج بہت گھبراتا ہی

ہونٹ ہیں سوکھی تر ہیں آنکھیں زرد ہی چہرہ راسخ آہ
بندی سو صاحب حال تمھارا اب نہیں دیکھا جاتا ہی

نہیں ہوش والوں پہ کچھ حسد مجھی رشک ہی تو انھوں پہ ہی
جنھیں تیری جلوی کی سامنی مری طرح بیخبری رہی

ضبط گریہ تو ہی پر دل پہ جو اک چوٹ سی ہی　　قطری آنسو کی ٹپک پڑتی ہیں دو چار ہنوز

چشم کیا کیا تھی یہ دیکھا ہی نہ ان نی ہاتھ اٹھا
اک نگاہ سرگیں کی میں تو حسرت میں رہا

اگر کچھ درد رکھتا ہی تو راہ عشق یوں طی کر
کہ نی کانٹا کوئی ٹوٹی نہ پھوٹی آبلہ پا کا

مجھی تو زندگی سی تھی میں اس کو کیا جانوں　　تمھیں کہو کہ لیا تم نی کس ادا سے دل

ہنر مستغنی اس سے ہے کہ قدر افزا میسر ہو
شناسا گو نہ ہو تیرا کوئی پر تو تو گوہر ہو

الٰہی دے وہ آتش دل کے اندر — کہ جس سے شعلۂ دوزخ رہے تر
جگر وہ جس میں ہووے داغ پر داغ — ہزار آتشکدے ہوں زیر ہر داغ
رہے سوزش سے سینہ رشک گلخن — نفس آتش پہ دل کی مارے دامن
لبوں سے آشنا ہو نالۂ گرم — رہے جوں موم آتش دیدہ دل نرم
دھواں آہوں کا پہنچے آسماں تک — محبت آتش افگن ہووے یاں تک
مزے سے درد کے جو آشنا ہو — الٰہی اب مجھے وہ دل عطا ہو
شکست تازہ سے ہر دم رکھے ساز — رہے باب شکست اس پر سدا باز
شب لگ کے گلے مرے بلا فصل — روئی تا صبح حسرت وصل
دشمن ہوئی میرے جی کی ہیہات — افزودنی خواہش ملاقات
گھٹنے لگی ہائے طاقت صبر — پہنچی نزدیک رخصت صبر
اشکوں نے کہ دل تھا ان کا مسکن — پھیلائے پاؤں تا بدامن
دریا بہا آنکھ سے لہو کا — ٹپکا خوں ہو دل آرزو کا
بیتابی سے بس کہ سر اٹھایا — سینے سے جگر لبوں تک آیا
تھا یہ دل داغ داغ کا حال — ہو باد میں جوں چراغ کا حال

## سعید، محمد عباس عرف ابو صاحب

سیر نہ کر چمن چمن فصل بہار دیکھ کر
دام بچھے ہیں جابجا بلبل زار دیکھ کر

# اثر، امداد امام

جنگل جنگل صحرا صحرا ماری ماری پھرتی ہیں
آہو وحشی جان کی ہم کو ساتھ ہماری پھرتی ہیں

نہ کر شکوہ ہماری بےسبب کی بدگمانی کا
محبت میں تری سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

خزاں زندگی ہے تفرقہ اہل محبت کا
مزا دنیا میں جینے کا بہار دوستاں تک ہے

ہیں تو عمر دو روزہ عذاب ہے اے خضر
بلائیں تم نے سہیں عمر جاوداں کے لئے

اثر مطلب کا ہوا کرتا ہے دیوانہ بھی
قیس صحرا کو گیا کوچۂ لیلیٰ ہو کر

سمجھایا بہت دل کو سمجھانے کو کیا کہیے
دیوانہ ہے دیوانہ دیوانے کو کیا کہیے

آتے ہی چلے جانا کیا آنا ہے کیا جانا
اس آنے کو کیا کہیے اس جانے کو کیا کہیے

خدا کی خدائی ہمیشہ رہیگی
جو ہوتا رہا ہے سو ہوتا رہیگا

# احقر بہاری، ش ازل لکھنوی

پوچھا جو کسی نے اے احقر کیوں مشق سخن کو چھوڑ دیا
بولے کہ گیا جب موسم گل بلبل نے چمن کو چھوڑ دیا

# سید حفیظ الدین بلخی

مرا کارنامۂ زندگی مری حسرتوں کے سوا نہیں
یہ کیا نہیں وہ ہوا نہیں یہ ملا نہیں وہ رہا نہیں

کچھ نہ تھا سب کچھ ہوا پھر کچھ نہیں
رنگ ہے آغاز کا انجام میں

جن کو ہے آداب مجلس کا لحاظ
خاک اڑتی ہے انہیں کے جام میں

## مضطر مظفر پوری

جو ٹپکو راز کھل جائے نہ ٹپکو آگ لگ جائے
تری یہ کشمکش ای دیدۂ پُرنم سمجھتو ہیں

## ضیا، ش شوق نیموی، م ۱۳۱۹ھ

کچھ کہا جاتا نہیں حال پریشانی دل کہیں بیٹھینگو تو دل اور پریشاں ہوگا
تصویر ہوں میں غم کی کچھ سننا نہ کچھ کہنا تانی ہوئی اک چادر خاموش پڑی رہنا
بڑھتی چلی ہو جی کی الجھن دل کو سنبھالی جاتی ہیں
دیکھیو آگو عشق میں کیا ہو لوگ بہت سمجھاتی ہیں
اک ٹیس جگر میں اُٹھتی ہو اک درد سا دل میں ہوتا ہو
ہم راتوں کو رویا کرتی ہیں جب سارا عالم سوتا ہو
کبھی دُکھی ہوئی دل سو جو آہ کی ہوتی پُکار چار طرف سو پناہ کی ہوتی
ضیا تری لاشو پہ کرتی ہو ماتم تری جامہ زیبی تری نوجوانی
کو چو سو نکلواتی ہو عبث ہم ایسو وطن آواروں کو
رہنو دو پڑو ہیں ایک طرف دکھ دیتو ہو کیوں بیچاروں کو

## حزیں وظہور، میر محمد باقر، م قبل ۱۱۶۶ھ

ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ ہائے
چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

## حسرت، ہیبت قلی خاں، م ۱۲۱۰ھ

عجب طرح کا عشق حسرت نے ٹھانا ‌ ‌ ‌ کبھی اس کے کوچے میں آنا نہ جانا
ترا غرور مرے عجز کے مقابل ہے ‌ ‌ ‌ ادھر پہاڑ ادھر ایک شیشۂ دل ہے
سنا ہے آج میخانے میں جام مے پہ مستوں نے
لٹایا دین و دنیا دونوں ہمت اس کو کہتے ہیں

## امین، خواجہ امین الدین، م ۱۱۹۹ھ

کیا فائدہ ہے رونے سے اے اہل درد پھر ‌ ‌ ‌ آتا ہے بعد مرنے کے یاں کوئی مرد پھر
ہم کو کیا گر بہار آتی ہے ‌ ‌ ‌ دل وہ غنچہ نہیں کہ وا ہوگا
دن گیا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی
عمر کٹنی کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی

## دل، محمد عابد، معاصرِ امین

بدنام ہوئے عشق میں حاصل نہ ہوا کچھ ‌ ‌ ‌ فریاد کی نسبت تو خموشی میں اثر تھا
گر یار نے آنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا
اب تک دل مضطر نے کیا کیا نہ کیا ہوتا
دل مضطر کو مارے درد و غم ناحق جدائی میں
یہی انصاف ہے کیا اے خدا تیری خدائی میں

## جوشش، برادر محمد عابد، دل

وہ زمانہ کیا ہوا جو مری گریے میں اثر تھا ‌ ‌ ‌ یہی چشم خونفشاں تھی یہی دل یہی جگر تھا

ہر ایک خار بیاباں رکھے ہے نوک زباں  یہ ماجرا ہے ہماری برہنہ پائی کا
ہزار پیار کریگا ہزار چاہیگا  مری طرح نہ کوئی تجھ کو یار چاہیگا
چمن میں یار بن رہنے کو تو کیا ہے رہا کیجے
و لیکن جی نہیں لگتا ہمارا اس کو کیا کیجے
اختیاری کیا ہے یہ آوارگی  وہ مثل ہے بندگی بیچارگی
جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ  رہتا ہے مدام آب دیدہ
ماتمکدۂ جہاں میں جوں ابر  رونے کے لیے ہوں آفریدہ
گر آرزو ہے دل میں اتنی ہی آرزو ہے  تاراج بے نیازی اقلیم آرزو ہو
گلزار محبت میں نہ پھولے نہ پھلے ہم  مانند چنار آگ میں اپنی ہی جلے ہم

## ثابت، اصالت خاں، م ۱۲۰۸ھ

بگولے کا کبھو صدمہ کبھو صرصر کی زحمت ہے
ہماری خاک یوں اڑتی پھرے اے ابر رحمت ہے
زلف و رخ سے دور پڑے ہیں کہ دل اب کیا کام کریں
شام سے رو رو صبح کریں یا صبح سے رو رو شام کریں

## رضا، ش میر ضیا، م ۱۲۱۶ھ

دل کی بیتابیوں سے عشق چھپایا نہ گیا  نام کس نے لیا تیرا کہ میں پایا نہ گیا
جفائے عشق کا جب بزم میں بیان ہوا  رضا کی سن کے خرابی ہمیں بھی کان ہوا
شکوہ کریں کسی سے ہم ہائے کیا کسی کا  اپنا ہی دل ہوا ہے دشمن ہماری جی کا
یارب یہ کس کے غم میں آنکھیں بھر آئیاں ہیں
دامان و آستیں میں گل سے لڑائیاں ہیں

مجھ آگے گرفتاری ہوئی تھی — نہ اتنی زندگی بھاری ہوئی تھی
رضا کا اب خدا حافظ ہے یارو — یہی مجنوں کو بیماری ہوئی تھی

گر خوش نہ کیا مجھ کو نہیں اس کا تو غم ہائے
ہوتی مری غیروں پہ ستم ہائے ستم ہائے
آنکھوں میں کس کی زلف سیہ فام چھا گئی
چاروں طرف جو دیکھوں ہوں اب شام چھا گئی
کیا کہیے اب اے یاراں اس عشق کی رسوائی
جس کے لیے سودا ہو سو ہے کہے سودائی

## فیض، ش مصحفی

نہیں معلوم زندانی ہوئے یا قید سے چھوٹے
کھلا در تھا پڑا سنسان اس دم قید خانہ تھا

پھر رہا نظروں میں میری جو سماں رات کا ہے
دن پہ بھی جوش تصور سے گماں رات کا ہے
روز و شب ایک سا عالم ہے جدائی میں تری
دن کا آرام کہاں اور کہاں رات کا ہے
لطف گلشن نہیں جب تازہ گرفتاروں کو
توڑ کے پھینک دو گل پھونک دو گلزاروں کو
نکہت گل کو لیے گوشش پہ پھرتی ہے صبا
رشک آتا ہے ہمیں دیکھ سبکباروں کو
دیکھا زنداں میں جو آ کہنہ اسیروں کا حال
زندگی موت ہوئی تازہ گرفتاروں کو

## سلطان، خواجہ سلطان جان، م ۱۲۷۲ھ

پڑا جلتا ہوں حسرت سے لبوں پر ہر گھڑی اُف ہے — تصور بھی نہیں اس دلربا سے بے تکلف ہے

کیوں کر وہ خوشدلی کا زمانے میں نام لے — جو سانس لیتے آہ کلیجے کو تھام لے

مرے نالوں کی ہے کچھ اور ہی راہ — نہ اس کی پیروی تو اے جرس کر

کسی سے دل کی حقیقت میں آہ کیا کہتا — جو کچھ کہ رنج و الم ہے سو میرے جی پر ہے

میں کیا بتاؤں کہ اس گل سے ربط کیسا تھا — نہ فرق عاشق و معشوق میں تھا، ایسا تھا

دام بلائے عشق میں ہم بے سبب پڑے — کم بخت دل پہ ہائے خدا کا غضب پڑے

وہ میرے پاس نہیں مفت میں جان جاتی ہے — الٰہی مجھ کو شب ہجر کاٹے کھاتی ہے

آگ دل میں لگ گئی شمع رُخِ جانانہ سے — جب بنا پتلا مرا خاکستر پروانہ سے

کہیں خوشی ہے کہیں رنج ہے زمانے میں — یہی ہے کسوت عالم کے تانے بانے میں

لاکھ تدبیریں کیں پر تجھ سے نہ اے جان بنی — ہائے کیا بات کروں جان پر اب آن بنی

نہ پھر ہو جائے کچھ کھٹکا مرا دل اس سے ڈرتا ہے — تصور اس کا اس دم مجھ سے ہنس کر بات کرتا ہے

دل کو کس طور سے بہلاؤں میں — میرے اللہ کدھر جاؤں میں

سارا زمانہ چھوڑا اب جن کی دوستی میں — قدرت خدا کی ہم سے وہ بیر رکھیں جی میں

میری جرأت کو نہ اپنے عشق میں بدنام کر — میں نے کس دن آہ کی سینے کو ظالم تھام کر

جو آج سمت فلک میری آہ جاتی ہے — ہر ایک شعلہ جہاں تک نگاہ جاتی ہے

صدموں سے غمِ عشق کے جی چھوٹ گیا ہے — کھائی ہے وہ چوٹ آہ کہ دل ٹوٹ گیا ہے

کیا ہوئے یاران ہمدم ہائے وہ محفل کہاں — وہ طبیعت کو مزے وہ چہچہے وہ دل کہاں

دلِ مرحوم کے یاں ذکر سے سینہ بھر آتا ہے — نہ اس کا نام لے تو اے زباں ہر بار جانے دے

یاد آگیا کسی کا کہنا وہ بے رُخی سے — بولے کوئی نہ ہم سے بولیں نہ ہم کسی سے

ہمیں کیا کام ہے اس سے جو خوش سارا زمانہ ہے — ہمارے تو مقدر میں فقط افسوس کھانا ہے

تجھ معلوم کچھ اس کی خبر ہی ای وفا دشمن — جب آدھی رات ہوتی ہی تو کوئی اٹھ کر روتا ہی
اسی کا ذکر اب ساری جہاں کی زندگانی ہی — وہ کیا نام خدا ہی جس کی یہ افسانہ خوانی ہی
ہوئی عید اس کی آنی سی مرادیں سب ملیں دل کی — مکاں کا حسن ہی اپنی عجب زینت ہی محفل کی
غضب اس وقت تم نی اپنی جانی کی سنائی ہی — کلیجہ بھک سا ہی آگ کیا دل میں لگائی ہی
مرا پہلو کبھی خالی نہیں رہتا ہی ای ہمدم — نہیں آتا ہے وہ جب تک تو دل میں درد رہتا ہی
وہ دن ہیں یاد جو اٹھو کا میں نی نام لیا — تو تم نی جھپٹ ہی میں دامن کو میری تھام لیا
پڑا ہوں غم کی بس میں کوئی میری بیبسی دیکھو — یہ دن بھر سوچ میں کٹنا یہ شب کی بیکلی دیکھو

## سلیم، میر محمد سلیم، م عشرۂ آخر ماۂ دوازدہم

چین بستی میں ہی اس دل کو نہ ویرانی میں — ہی عجب طرح کی وحشت تری دیوانی میں

چلو جب روٹھ ہم زنداں کی در کی توڑ کر کڑیاں
تو زنجیریں منانی کو وہیں پاؤں کی آ پڑیاں

## رضواں عظیم آبادی، ش سلیم و مجرم

پاس جب آپ کو نہیں پاتی — آپ میں آپ کو نہیں پاتی
کشور دل میں آج لوٹ پڑی — فوج غم کس کی ہای ٹوٹ پڑی

## حیران، ش بوشش

جس وقت یار آ کی ہم آغوش ہو گیا — شکوہ جو دل میں تھا سو فراموش ہو گیا
جی دھڑکتا ہی مرا ہجر کی پھر رات آئی — ہای جس بات کو ڈرتی تھی وہی بات آئی

نہیں رہتی ہو تم ہرچند میں کہتا ہوں رہنی کو
چلی جاؤ بھلا رہ جائیگی یہ بات کہنی کو

روئیے کس کے لیے اور کس کا ماتم کیجے
عمر جاتی ہے چلی کچھ اپنا ہی غم کیجے

## تمنا، علی رضا، ش بوشش

دشت میں خاک بسر پھرتے ہیں غم کرتے ہیں — لوگ جس بات کو ہنستے ہیں وہ ہم کرتے ہیں
تمنا جنس دل بازار میں جس سمت تو رکھے
خریداروں کا پھر ادھر گذر ہووے تو میں جاؤں
گئی ہے تو جب سے اسی دم سے خوش ہیں — نہ آئی خوشی پاس ہم غم سے خوش ہیں

## مبارک، شاہ مبارک حسین، ش وحید الہ آبادی

وہ جو اس جشن خسروی میں نہیں — لاکھ ساماں ہیں دل کسی میں نہیں
ہنس کے بھی دیکھا رو کے بھی دیکھا — جو مزا غم میں ہے خوشی میں نہیں
وہ جو نامور تھے زمانے میں کہیں ذکر سن لو فسانے میں
مجھے دیر ہو گی بتانے میں یہی نام ہے کہ نشاں نہیں

## کمال، شاہ کمال علی دیوروی، م ۱۲۱۵ھ

تو ننگ و نام کی کیا بات پوچھے ہے زاہد — کہیں کسی کا محبت میں ننگ و نام رہا
اٹھتا پھروں ہوں دشت میں جوں گرد کارواں — منزل کہیں ہے راہ کہیں راہبر کہیں
کبھی خطا نہ کرے تیر گر کماں یہ ہے — زمیں پہ کیوں نہ تم ہو جو آسماں یہ ہے
اس دل کو تئیں درد سوں کب تاب بیاں ہے — احوال خرابی کا مری تم پہ عیاں ہے

## مبارک، ش داغ، م ۱۳۷۷ھ

مینا بھی بھرا جام بھی لبریز ہمارا — پیتے نہیں اللہ رے پرہیز ہمارا

ہم کو معلوم ہو انجام محبت کیا ہے — ایک دن موت کی امید پہ جینا ہوگا

شمع سے پروانہ لپٹا اور جل کر رہ گیا — یہ تماشا جس نے دیکھا ہاتھ مل کر رہ گیا

یہ غمکدہ ہے اس میں مبارک خوشی کہاں
غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے

خدا کے سامنے اے محتسب سچ بولنا ہوگا
مرے شیشے میں مے دیکھی ہے یا خوناب دیکھا ہے

---



# ارمغان بہار

ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ کی طرف سے
جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو
وداعی دعوت کے موقع پر بطور یادگار
بتاریخ ۲ مئی سنہ ۱۹۶۲ء پیش کیا گیا۔

---

مطبوعہ لیبل لیتھو پریس - رمنہ روڈ - پٹنہ—۴

# یادداشتہائے ورود

سلیمان شکوہ شاہ عالم کے بیٹے اور بہادر شاہ (ظفر) کے حقیقی چچا تھے۔
یہ سنہ ۱۲۰۵ھ میں باپ کی اجازت کے بغیر عازم اودھ ہوگئے تھے اور وہیں مرتے
دم تک مقیم رہے تھے۔ یہ صاحب دیوان شاعر اور شعرا کے مربی تھے۔ قادر جیسے نامی
طور پر ملازم ہے مصحفی و انشا و جرات برسوں انکے دامن دولت سے وابستہ رہے تھے۔
غازی الدین حیدر کے تخت شاہی پر جلوس کرنے کے بعد انکی ایک بیٹی کی شادی
نصیر الدین حیدر ولیعہد سے ہوگئی تھی لیکن جب باپ کی موت کے بعد نصیر الدین حیدر
تخت نشین ہوا، تو انکی بدسلوکی کی وجہ سے سلیمان شکوہ کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور
اودھ کے دوسرے مقامات میں قیام کے بعد یہ آگرہ میں مستقل طور پر سکونت
پذیر ہوگئے، جہاں سنہ ۱۲۵ھ میں انکی وفات ہوئی۔ گلشن بیخار میں جس
وقت انکا ترجمہ قلمبند ہوا اس سے چند سال پیشتر یہ دہلی بھی گئے تھے۔
اس کا امکان ہے کہ غالب لکھنؤ یا دہلی میں انکی خدمت میں حاضر ہوئے ہوں،
بہرحال، انکا ایک "رقعہ" غالب کے نام آیا تھا، جسکے جواب میں نثر
"فرمانکتب" الخ لکھی تھی کلیات نثر صفحہ ۱۰۱ میں موجود ہے۔ یہ
رقعہ غالباً سید قاسم علیخاں کی معرفت ملا تھا، خود سلیمان شکوہ
کے کسی کام کے لئے حاکم کے (ممکن ہے کہ کوئی انگریز ہو) سے جسکا اثر
غالب سے تعلقات تھے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ غالب لکھتے ہیں کہ
حاکم مذکور دہلی سے باہر گیا ہوا ہے اس لئے میں خود پا برکاب ہوں۔ لیکن حاکم

علیخاں نے سہرے شروع کرنے کے باوجود حاکم کی تلاش میں پانی پت تک گئے، مگر حاکم وہاں نہ ملا - بعد انھیں کا دربدری کی کچھ طرح کی تکالیف ستاتی رہیں ان پر جلد ہی یہی اغلب ہے کہ کام حسب دلخواہ انجام پایا ۔ غالب کے خط میں یہ عبارت ہے : " سید قاسم علیخاں نیت کردہ کردہ اند کہ خانہ زادگاں با غم و اندوہ چہ مایہ آویزش بودہ است .. پا در رکاب و فردای این نگارش گام سپنج بادیۂ آوارگی میشوم " یہ خبر نہیں کہ کس سمت کی طرف اشارہ ہے ۔

سہرا یعنی اصحاب سہرے کو ایک مستقل صنف سخن اور غالب کو اسکا موجد قرار دیتے ہیں ۔ غالب کا سہرا جو دیوان اردو میں ہے غزل سے الگ بھی ہے ، لیکن غالب نے کلیات نثر میں اسے " غزل " کہا ہے ۱۲۵۵ھ ۔ ذوق کا سہرا تو غالب کے سہرے کے جواب میں ہے ، لیکن ، حکیم آغا جان عیش دہلوی معاصرین غالب کا بھی ایک سہرا ہے جسکی زمانہ تصنیف کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے کیونکہ مضامین فرحت مائدہ سے ) یہ تو ممکن ہے غالب کے سہرے کی تقلید ہو لیکن مہاراجہ کلیان سنگھ ، عاشق کا سہرا جو انکی مثنوی " تاریخ زیبا " میں ہے غالب کے سہرے سے بہت پہلے کا ہے ، گو یہ قریب بہ یقین ہے کہ غالب کو اسکی خبر بھی نہ ہوگی کہ عاشق نے سہرا کہا تھا ۔

سید حفیظ الدین (متوفی ۱۲۵۴ھ) لسان کے برادر عمزاد ذہین و حاضر جواب تھے ۔ غالب جس زمانے میں کلکتہ گئے ہیں یہ کمسن تھے ، ایک شادی میں انکی غزل سنکر غالب نے پوچھا کہ " دیا یار شناکی نشینہ اش بدید ؟ " انھوں نے جواب دیا کہ " قبلہ رذ دیکہ کافر غالب آمدہ " غالب نے اٹھ کر دو بوسے اور " شاباش " و " زندہ باد " کہتے ہوئے انھیں اپنے پہلو میں بٹھایا (تذکرہ فارسی گویان مصنفہ لسان ہے) ۔

بھی تسلیم
کلیات آفرین جلد ۱ کا ایک نسخہ جس وقت موصول ہوا تھا، میرے لیے اس کا بالاستیعاب
مطالعہ ممکن نہ تھا، اور چاہتا تھا کہ اس کے متعلق مفصل طور پر اظہار رائے کروں۔ یہ تو اب
بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا لفظ لفظ غور سے پڑھ جاؤں لیکن اس کی ورق گردانی از ابتدا تا
انتہا ضرور کی ہے اور سرسری مطالعے سے جن امور کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانے
کی ضرورت محسوس ہوئی ہے ان کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔ مگر اس سے پیشتر آپ
کے بیٹے کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

۱۔ "دو عالم بوی گل بگرفت و نشمیدم بہ نمادل" ص ۲ - حافظ کی ایک غزل کا مصرع ہے
"بوی خوش تو ہر کہ ز باد صبا شنید از یار آشنا سخن آشنا شنید" اسی غزل کی بیت ہے، جو
آخری ہے "از جگر گوشہ ... بوی ... شنیدہ" "نشمیدم" کی جگہ "نشنیدم" چاہیے
آفرین نے بھی "نشمیدم" نہ لکھا ہوگا
۲۔ "وہ یمن برائع"، ص ۳ مفہوم میری سمجھ میں نہ آیا۔
۳۔ "نہ پسندی" لکھا ص ۹ ایران میں ملا کر لکھنے کا دستور ہے، بالفرض علاحدہ بھی
لکھا جائے تو "نہ" اور "پسندی" کے درمیان فاصلہ نہ چاہیے
۴۔ "کہنگی ہا"، ص ۱۲ ملا کر لکھنا چاہیے ۵۔ "بہ بت"، ص ۱۴ = "ببت"
۶۔ "بوالہوسی" ص ۱۴ = "بوالہوسی" ۷۔ "شالان" ص ۱۵ = "شالان"
۸۔ "گلہا"، ص ۱۷ = "یک جا" ۹۔ "بگرفت"، ص ۳۱ = "بگرفت" ۱۰۔ "کن دم" = "کن دم"
۱۱۔ "افگندہ" = "افگندہ" ۱۲۔ "مشکل کشا"، ص ۳۴ = "مشکل کشا"، ۱۳۔ "گیا" ص ۵۱ = "گیاہ"، ۱۴۔ "پیالہ"
ص ۵۳ = "پیالہ"، ۱۵۔ "بر لحظہ"، ص ۶۳ = "ہر لحظہ"، ۱۶۔ "طپیدن"
ص ۶۵ = "تپیدن" ایران میں باخصوص "تپیدن" ۱۷۔ "بیخودی" ص ۱۶
= "بیخودی" ۱۸۔ "در تو زندہ ام"، ص ۷۱ مصرع ... معلوم ... ۱۹۔

۔ آئینہ ص ۱۸۱ تا ...

۲۶ حال رندی الخ ص ۶ تا ... ۲۹ پیرکار ص ۲۲۹ = پیرگار ۱۰

۳۱ باد دستانہ ص ۳۳۶ ۵ = بادستانہ — خانہ دار ص ۱۷۴ = خانہ عمار

۳۲ نجم الشاعر ص ۳۷۴ بحر الشائیہ ہمزہ بلفظ میں آئی تو مصرع ناموزوں ہے

۳۳ باہینہ ص ۲۷۱ = آئینہ

املا کا طریقہ مقرر ہونا چاہیے کہ کون لفظ کس طرح سے لکھا جائیگا۔ یہ فیصلہ بھی ہونا چاہیے کہ مرکبات کس طرح لکھے جائینگے۔

آپ نے اچھی اچھی کتابیں شائع کی ہیں۔ ... ہیں کچھ ہیں کچھ ...

اب مطبوعات کی فہرست بھجوا دیں۔ ~~...~~

فہرست ٹھیک ہو گی۔ جن کتابوں کی ضرورت ہو لکھیں گے۔

تو ہی بت نامہاں نے کیوں مسجد یہ بتخانہ کیا　　تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

یہ مطلع میر حسن نے میر اعلیٰ علی بن میر ولایت اللہ خاں دہلوی کی طرف منسوب کیا ہے۔
اور اس میں شک نہیں کہ انھیں کا ہے، لیکن یہ ذرا مختلف شکل میں سید محمد خاں رند
سخن آتش کدہ

ماہنامہ "نگار" کے "ریاض" (جنوری فروری ۱۹۴۳ء) میں ریاض کی کچھ قدیم تحریریں
جناب سید عقیل احمد جعفری نے بعنوان "ریاض کے بعض اعتقادی مباحث" جمع کر دی
ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے: "جناب ناسخ مرحوم پر ایک سخت چوٹ قومی تعصب
کے پردے میں چکبست نے کی ہے، جس کا کسی تذکرے میں ذکر نہیں ہے، اور نہ کوئی اور ثبوت
چکبست اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں:
مشاعرہ شروع ہونے سے قبل شیخ ناسخ نے نسیم سے مخاطب ہو کر کہا: پنڈت صاحب
ایک مصرع کہا ہے، دوسرا نہیں سوجھتا، انھوں نے جواب دیا "فرمائیے" - ناسخ نے
~~مصرع پڑھا ... ناسخ نے ... مسمار ... نہ گیا~~ ... ان کے منہ سے
مصرع نکلتے ہی نسیم نے کہا: "تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا"،
سب پھڑک اٹھے - شیخ ناسخ نے بہت چوٹ کی تھی مگر نسیم نے ٹھنڈا کر دیا"
اس کذب وافترا کے بیان میں چند باتیں قابل غور ہیں: (۱) ناسخ کی غیور طبیعت
اور شاعری کے دعوے ایسے نہ تھے جو وہ نسیم کو قابل خطاب سمجھتے اور ان کو اس
تعظیم و تکریم کے ساتھ مخاطب کرتے جو آتش کو بھی کبھی خیال میں نہ لاتے تھے (۲)
ناسخ ایسی بے تہذیب نہ تھے کہ وہ ایک ہندو کو (اور پھر اپنے محبوب ہندو کو)
مخاطب کر کے اس دن کس مصرع پڑھتے (۳) نسیم جیسے لاالٰہ کا فر جواب سہی مگر
ناسخ کا دبدبہ اور طنطنہ ایسا تھا کہ وہ ان کو ناسخ کے سامنے زبان نہ کھولنے دیتے
(۴) دراصل نسیم نے کوئی مصرع لکھا یا نہ ناسخ نے کوئی مصرع پڑھا، نہ اس حکایت
کا ذکر کسی اور مقام پر کہیں دیکھا گیا - یہ صرف غلط قومی جوش کا نتیجہ ہے جس نے دے دیا

--- نگار میں اسی طرح ... نسیم کا محبوب ناسخ ہونا کہیں اور نظر سے نہیں گزرا، اور اسی طرح
سمجھنے کی ... ہو گئی ... وجہ نہیں ہے

ڈاکٹر ولی الحق انصاری نے عرفی کا کلیات مرتب کیا ہے جس میں اس کی کل نظم و نثر جو انھیں ملی ہے شامل ہے۔ یہ کلیات ان کے مقدمے کے ساتھ ڈی۔ لٹ کی ڈگری کے لیے پیش ہوا ہے اور میں نے ایک ممتحن کی حیثیت سے اسے از ابتدا تا انتہا دیکھا ہے۔

ڈاکٹر انصاری نے عرفی کے کلیات اور دیوان کے جن نسخوں کی مدد سے اپنا نسخہ مرتب کیا ہے ان سے متعلق ضروری معلومات ان کے مقدمے میں موجود ہیں۔ ان کی تلاش داد طلب ہے، لیکن جب تک کتب خانوں کی فہرستوں کا جائزہ نہ لیا جائے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کل قابل اعتنا نسخوں کا انھوں نے مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے جن نسخوں کو دیکھا ہے، ان سے کس طرح کام لیا ہے، اس کے متعلق بھی کوئی رائے ان نسخوں کا مطالعہ کیے بغیر قائم نہیں کی جا سکتی۔ انھوں نے مقدمے میں لکھا ہے کہ عرفی کے دیوان قصائد کے صرف ۲ نسخوں سے انھوں نے کام لیا ہے، باقی کی طرف رجوع نامناسب سمجھا گیا ہے۔ اس کی جو وجہ انھوں نے بتائی ہے وہ قطعاً ناقابل قبول ہے۔ انھیں دیوان قصائد کے کل قابل اعتنا نسخوں کو دیکھنا تھا، اور قصائد کی شرحوں کا بھی مطالعہ کرنا تھا۔ شرحوں کو دیکھنے سے ایک تو صحیح متن بہم پہنچانے میں مدد ملتی، دوسرے ہر قصائد کے مشکل اشعار کے مطالب درج مقالہ کر سکتے تھے۔ لیکن المیہ اس مقالے کا یہ ہے کہ مطالب سے مطلقاً بحث نہیں۔

کہ (یعنی امتحانی مقالہ) میں جن تذکروں سے مدد لی گئی ہے کم سے کم ان تذکروں کا تذکرہ پیش نظر ہے تو یہ سمجھ میں نہ آیا کہ کلمات الشعرا، مرآۃ الخیال، سفینۂ خوشگو، خزانۂ عامرہ، مجمع النفائس یا [illegible] نشتر عشق، [illegible] وغیرہ کیوں ناقابل اعتنا سمجھے گئے (یعنی [illegible] مقالہ کا) :

ر) دربارۂ ابوالکلام آزاد" سرسید کی سیاسی پالیسی اور انگریز پرستی سے انکی
ہمیشہ اختلاف رہا ہے" آل احمد سرور "آزاد نمبر، اردو ادب ص ۷۱" لطف یہ کہ
اسی شمارے میں "جشن تاجپوشی کا کلکتہ میں دلچسپ مشاعرہ" کے عنوان سے
ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر الہلال سے نقل ہوئی ہے جس میں عبارات ذیل
موجود ہیں :

"وہ آپ (آزاد برادر آزاد) کے بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ "اللہ کی مخلوق میں
رحیمی کی صفت بڑی اعلیٰ ... ہے جن لوگوں میں یہ صفت ہوتی ہے اسی تعلق کی
وجہ سے لوگ ان کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ ہماری گورنمنٹ کو جب کہ ہم پر
آزادی کے ساتھ سلطنت کرتی ہے اور ایک حد تک رحیمی کی صفت رکھتی
ہے، تو ضرور ہے کہ ہم کلمہ رحمت کو رنج اور خوشی میں شکریہ ادا کرتے
رہیں گے ... آزاد نے بڑی صفائی سے اردو میں گھنٹہ تک لکچر دیتا رہا۔ اس کی
اول ابتدائی عالم سے آج تک کی ایک مختصر تاریخ بیان کی کہ
تمام بادشاہوں کی حکومت میں انسان کی نظر نہ ملتی بلکہ باوجود اختلاف
مذہب کے (کلام) اختلاف قومیت اور اختلاف طبائع کہ اس آزادی کے
ساتھ سلطنت کرنا یہ انگریزی گورنمنٹ کا ہی حصہ ہے آزادی اور اہل ملک
ثابت ہوتا ہے" ص ۱۸۲

آزاد نمبر میں "ایک نظم بھی ہے جو الطاف حسین کے جشن تاجپوشی کے موقع پر لکھی گئی
یعنی یہ "انگریز پرستی" نہیں تو اور کیا ہے ؟ سرور صاحب کو [illegible] مدیر
ہونے کے باوجود اردو ادب کے مضامین کو پڑھنے کا وقت نہیں ملتا۔

[illegible] ضرورت کی بنا پر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے
آزاد [illegible] قبل اس کی زبان [illegible]
[illegible] آزاد کا [illegible] ان میں ایک [illegible]
[illegible] کہ ان کے نزدیک اردو میں مستقل کتابیں
ایک ہندو [illegible] تھا اور سید محمد خان مسلمانوں کی سیاسی نجات دہندہ
[illegible] ان سے یہ بھی کہا تھا کہ یہ تحریر [illegible] کی [illegible] میں لسان الاخلاق
میں لکھی جا چکی ہے۔ یہ کام [illegible] تھا مگر ان کی نظر سے گزرا
یا نہیں۔ بہر حال یہ آزاد [illegible] سے مستقل شائع ہوا تھا۔ میں نے
[illegible] کی تحریر دیکھ کر [illegible] اس [illegible] کی طرف متوجہ کیا اور یہ تحریر
کی کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ انھوں نے جواب نہیں [illegible]
کہ [illegible] "[illegible]" واقعی غلط ہے لیکن باوجود اس کی ہماری زبان
[illegible] اور ایک [illegible] آزاد [illegible] کی [illegible] شائع ہو چکی
ہیں [illegible] اب تک [illegible] ان کی متعلق کچھ لکھی [illegible]
[illegible] تھوڑی [illegible] تبدیل [illegible] کچھ [illegible] اور اس میں کچھ
[illegible] ایک [illegible]
[illegible] یا [illegible] میں کہا کرتا تھا کہ ۵ برس کی عمر میں جو
[illegible] ایک [illegible] یہ [illegible] کہا کہ اس
کی [illegible] یہ [illegible] اب [illegible] جہاں [illegible] میں
[illegible]

[illegible]

(۸۳) ا ص۱۵ تذکرہ کا سرورق کا نام عمدۃ المنتخبہ ۔ ۳ ص۷۴ زمانۂ تصنیف غالباً ۱۲۲۱ھ ۔ صحیح عمدۂ منتخبہ حسینی کی سال
آغاز ۱۲۱۷ معلوم ہوتا ہے فہرست اسپرنگر صفحہ ۱ میں بھی یہی ہے یہ ممکن ہے کہ ۱۲۲۱ھ میں مکمل ہو گیا تھا اور نسخۂ اختیار کر لیا ہو
لیکن جو خطی نسخے ملتے ہیں ان میں اس کے بعد کی باتیں درج ہیں ۔

(۸۴) ا ص۱۶ تذکرہ شوقی (حسن) طبقات الشعرائے قدرت اللہ شوقی (ص۱۲) سے مختلف ۔ مگر جلد ۲ میں جہاں شوقی تخلص کے ذیل میں
کا ذکر ہے حسن متخلص بہ شوقی موجود نہیں ۔ حسن علی شوقی ہیں مگر یہ انھوں نے تذکرہ لکھا اور نہ خود دتاسی اس کو تذکرہ منسوب
کرتا ہے ۔ قدرت اللہ شوقی کے علاوہ اس تخلص کے ایک اور شاعر کا تذکرہ ہے مگر وہ ہندی کے ایک اس میں فارسی گویوں کا حال بھی ہے
(فہرست اسپرنگر ص۱۶۱)

(۸۵) ص۱۸ تذکرۂ عشقی نظم ایات دتاسی کی نظر سے نہیں گزرا لیکن اس کے متعلق اس کی معلومات کا ماخذ فہرست اسپرنگر ہے لیکن اسپرنگر نے تخلص
پر قناعت کی ہے نام نہیں دیا ۔ دتاسی نے اپنی طرف سے محمد اللہ لکھ دیا ہے (مقدمہ ص۱۹) صحیح وجیہ الدین ہے

(۸۶) ا ص۱۹ تذکرۂ محمد علی ترمذی کا ذکر گلزار ابراہیم میں ہے یہ بالکل غلط ہے ۔ گلزار کے متعدد نسخے میں نے دیکھے ہیں کسی میں اس کا
نام نہیں آیا ۔ دتاسی نے مرتع علی گردیزی کو محمد علی ترمذی پڑھا ہوگا ۔ جلد ۳ میں محمد علی ترمذی کا جو ترجمہ ہے اس سے اتنا
بھی ثابت نہیں کہ یہ وجود خارجی رکھتے تھے ۔ اسی سلسلے میں یہ گزارش ہے کہ جمال الدین لطف اللہ ترمذی کے تذکرے کا ذکر ... باغ معانی
میں دیکھا ہے (ورق [illegible])

(۸۷) ا ص۲۰ دتاسی عیار الشعرا کا زمانۂ تصنیف اس بنا پر کہ خوب چند مصنف اس میں ۱۳ سال تک مسلسل اضافے کرتا رہا ۱۱۹۷ تا ۱۲۱۴
بتاتا ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ ۱۲۱۴ صحیح ہے ۔ ۱۲۱۶ کی جگہ ۱۲۲۲ ہونا چاہیے ۔ یہ ان تذکروں میں سے ہے جن کے متعلق دتاسی
کی معلومات کا مدار فہرست اسپرنگر پر ہے اسپرنگر یہ لکھتا ہے اس کا آغاز ۱۲۱۸ یا ۱۲۱۳ میں ہوا اور مصنف ۲۳ سال سے زیادہ
بلکہ اس میں اضافے کرتا رہا ۔ اس میں جو آخری سنہ ملتا ہے وہ ۱۲۴۷ ہے ص۱۸۵ ۔ دتاسی کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا ۔ اس کے برخلاف
نظر ابتدا کے متعلق اسپرنگر کا قول بھی صحیح نہیں ۔ دیباچہ نسخۂ انڈیا آفس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اکبر ۱۱۹۸ھ ... اس کی
شروع کیا اور ۱۲۰۸ھ میں اس نے کتابی شکل اختیار کی ۔ اضافے بعد کے ہیں ۔

(۸۸) ا ص۲۱ + محمد نیز کا (مرتع علی خان حسینی) صاحب تذکرہ ۔ زمانۂ تصنیف ۱۱۶۵ھ قریب ۔ گردیزی لکھتا ہے کہ انجام کی موت
(سنہ ۱۱۵۹) کو ۵ برس گزرے ہیں ۔ ... سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس کا تذکرہ گردیزی کے تذکرے کے بعد لکھا گیا ... بھی اسی کی حمایت
نہ ہو کر یہ ابتدا ہندی میں لکھا یا ... ان کا شمول فارسی کے خلاف ... یہ بات ہے کہ یہ فارسی گو شاعر
ہیں اور ان کا تخلص حسینی ہے (گلشن عشق ورق [illegible]) انکا ترجمہ دستور کے مطابق تخلص کے تحت ہونا تھا ۔ دوسری بات یہ ہے کہ انجام
کا تخلص ترجمے میں آیا تھا ۔ یہ تذکرہ جیسا کہ خاتمۂ نو نسخۂ مصنف میں ہے ۱۱۶۲ھ میں مکمل ہوا ۔

(۸۹) جلد سوم میں نواب لطف اللہ خان سلطان (گلشن بے خار ص[illegible]) کا نام نواب [illegible] خان لکھا ہے ... ترجمے میں بار ... ہجری کی ایک سلطنت نا ... شجاعت علی محمد خان ... کا نام محمد علی خان [illegible] لکھا ہے

(۹۰) دتاسی نے مشہور فارسی گو مرزا فاخر مکین کا نام مرزا افز لکھا ہے جلد ۱ ص۲۴۳ [illegible]

۵۹

(۹۱) بہرحال مرشد آبادی کے دیوان کا کسی نے ذکر نہیں کیا، اور بعد میں حیدرآبادی کا دیوان چھپ گیا ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ حیدرآبادی کتب خانے میں حیدرآبادی ہی بعدم کا دیوان ہو گا لیکن ذناسی کے نزدیک دکن مرشد آبادی کا دیوان ہونا زیادہ قرین قیاس ہے (جلد۱)

(۹۲) جلد۱: سن وفات آرزو ۱۱۰۱ھ غلط ہے۔ صحیح ۱۱۶۹ ہے جو بقول آرزو تذکرہ نویس سے معلوم ہوتا ہے۔ سفینۂ خوشگو نے ذناسی نے آرزو کی سوبیت فلطی کا نام مجمع غلطی لکھا ہے اور تذکرۂ شعرا کو جس میں ہر جگہ فارسیگو جن کا حال آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مجمع النفائس کے دوسرے نسخے ہیں جن میں شامل ہیں۔ ہندستانیوں کیلئے مخصوص بتاتا ہے

(۹۳) جلد۱: آبرو کے نام نجم الدین پر علیخاں کا اضافہ کیا ہے اور قیاس بتایا ہے کہ پولد لکھنؤ تھا۔ یہ گوالیار کو تھے دیس ہیں یعنی ہرگز لکھنؤ سے کسی قسم کا تعلق ثابت نہیں

(۹۴) جلد۱: چپا بقول قاسم نواب حسین الدولہ کی ملازمت تھی۔ عبارت قاسم: "جیتا تخلص محمد جیشمند نشان... حسام الدولہ" ذناسی نے چپا کا نام بدلا اور اسی مورد یہ صورت بنا دیا۔ اس کی بناء پر حسام کو حسین لکھا معلوم ہوتا ہے

(۹۵) جلد۱: محمد علیخاں حشمت کے نام پر میر کا اضافہ صحیح نہیں۔ انھیں حشمت تخلص کا حشمت کا استاد کہنا غلط ہے۔ ذناسی ان کا دیوان اردو کا ذکر کرتا ہے مگر اس کا ثبوت موجود نہیں کہ درست ہو۔ محمد امین خاں کے قتل اور انکا مقتول ہونا بقول ذناسی ۱۱۵۲ھ کا واقعہ ہے لیکن خان مذکور ۱۱۶۷ھ کی لڑائی میں مارے گئے تھے (سیر المتاخرین وغیرہ)۔ دیوان تاباں کی ایک نظم بھی اس پر شاہد ہے کہ حشمت کی موت ۱۱۶۷ھ میں ہوئی۔

(۹۶) مفتی برکت اللہ خاں برکت ساکن گوپامئو ضلع سیتاپور، پسر مفتی قدرت اللہ فارسی دان وکیل تھے۔ تذکرہ مسرت افزا میں ان کے اشعار سات درج ہیں اور مفتوں بھی ہیں۔ اس میں مفتی محمد برکت اللہ ابن مفتی قدرت اللہ کا تخلص درج نہیں۔ یہی حال فارسیگوئی کا ہے ان کی زندگی کے حالات بھی فرد لیتے ہیں مگر اس تذکرہ میں ان کی طرف دو شعر ہیں۔ برکت اللہ خاں برکت فارسیگو گوپامئو (گلشن بیخار) متوفی الذکر سے مختلف ہیں۔ یہ اردو کہتے تھے۔ (جلد۱)

(۹۷) جلد۱: ذناسی کا یہ قول صحیح نہیں کہ نواب علیخاں حیدر کا دیوان دہلی کے شاہی کتب خانے میں تھا۔ دکن حیدر کا دیوان تھا وہ انڈیا آفس کو گیا تھا، یہی آگیا تھا اور عبارت مجموعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ فقیر آغا جان عیش دہلوی کا ہے۔ ذناسی نے بیٹی کو نرائن فرد مفتی لکھا ہے یہ درست ہوتا تو مفتی اپنی اولاد کے مطابق۔ ریاض الفصحا میں اس کا ذکر نہیں کرتے۔ لیکن وہ یہ کہتے ہیں کہ یہاں اختیل وغیرہ کی ملازمت میں رہیں مگر اب خود استاد ہیں کسی کی تلمذ کے معترف نہیں۔ ان کا چاند تک تعلق ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ خلیل الاخرمیری کلکتہ کے نسخہ کلیات میں ایک قصیدہ ان کی مدح میں ہے جو ملوث ترین آخرون پر مشتمل ہے۔

(۹۸) جلد۲ میں شیفتہ کا دوسرا تخلص حسرتی کی جگہ مسرت لکھا ہے

(۹۹) جلد۲: ان کے ۱۸۵۵ء سے قبل فوت ہونے یعنی سال وفات رائج کے تسامح کا مستعمل ہونا "تاریخ ادب اردو" میں شیفتہ نے لکھا ہے یعنی اس سال پہلے یا اس سے لازم ہوگی۔ یہ بعض اضافات نے قطع نظر ۱۲۴۸ھ، ۱۲۵۰ میں لکھا گیا ہے اس کو حوالے کی تحقیق زمانہ حشر صرف شائع ہو سکتی تھی

(۱۰۰) [redacted] اختر جو پسر زادۂ آصف الدولہ کے ہمراہ لکھنؤ میں محض قرابت نہ تھی

(۱۰۱) جلد۱: [redacted] سعید (دیوان حقہ کا نسخہ ما سہو ہے) لاحقہ (سفینۂ ہندی ناسخ کو قطعوں میں نظم بھی بجائے ذناسی [redacted] شاگرد لکھا ہے۔ اس کا صحیح سال وفات ۱۲۰۳ھ (سفینۂ ہندی) کو موتی نکالا

(۱۰۲) تمکین بیگم ماحب اپر شاہ رائی عشق تماسی کا یہ بیان کہ اس کا ذکر گردیزی نے کیا ہے غلط ہے۔

(۱۰۳) امیر خاں عمدہ کا تخلص انجام (متوفی ۱۱۵۹ھ) کا خطاب عمدۃ الملک تھا یعنی اس کے صفحہ ۲۰ میں لکھا ہے: المالک محمد اسحق خاں کے بعد امیر خاں اور بعد کو عمدۃ الملک کا خطاب پایا۔ لطائف الخیال میں کا تخلص تھا اور بہار عیش صفحہ میں اس تخلص کا کوئی اور ذکر ہے گو تفصیل ہمارے ذہن میں جلد اول میں لکھا ہے کہ انجام (نواب عمدۃ الملک امیر خاں) پسر نواب امیر خاں و اشرف خاں بہادر ز ابتدا (...) نواب عمدۃ الملک مسمیٰ بہ عالم خاں بعد از آن گر دوتی ابتدا سنہ ۱۱۵۹ میں مقتول ہوئے (حاشیہ میں عالم خاں) قاسم کا قول ہے کہ یہ نام خود انجام کا تھا۔ (الف) انجام الدولہ خان الخانان کی بیٹی تھی اور ان کا خطاب خاں عالم تھا (اخلاق السعادت ۱۲۵) انکو بیگم کا تخلص یا خطاب بھی امیر خاں تھا (ریاض الفصحا ص) اگر کسی نے پسر نواب اشرف کا تخلص انجام لکھا ہے تو اسی وجہ سے (ب) قاسم کا قول یہ ہے: انجام اگرچہ مشہور آنست تخلص امیر خاں پسر نواب اشرف خاں بہادر زادہ نواب عمدۃ الملک امیر خاں بہادر الملقب عالم خاں گفتہ اما از سخن ان ہیچ یافت نمی شود کہ ایں تخلص نواب عمدۃ الملک امیر خاں مرحوم بہ کبر (؟) واللہ اعلم۔

(۱۰۴) ار مغان + السیر (...) ... سمرو (...) الفرانسی انگریزی الاصل مشہور جنرل سمرو کا بیٹا اور ملقب بہ نواب ظفریاب (...) اور (...) کا شاگرد تھا۔ ساکن سردھنہ۔ صاحب تخلص کی کتب میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کا خطاب مشکوۃ الملک، ممتاز الملک ظفریاب خاں بہادر نصرت جنگ بتاتی ہے اور اسے دلسوز کا شاگرد کہتا ہے۔ اس کی وفات ۱۲۲۳ھ میں ہوئی۔ سندی میں بھی یہ جعلی مسیو صاحب دو تخلص کرتے تھے۔ (...) اور یہی صحیح ہے۔ صاحب کا خطاب تذکرۂ دکا میں بھی ممتاز الملک ہی لکھا ہے (...) اسیر گجر صاحب ۵۰۰، لیکن قاسم نے ممتاز الملک لکھا ہے۔ اس وقت یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ صحیح کون ہے۔ یہ دلسوز کا شاگرد تھا اور ۱۲۲۲ (سال اختتام تذکرۂ قاسم) کے قبل وفات پا چکا تھا۔ ظفریاب (...) اس کا رفیق اور اشعار کا شاگرد تھا (ذکا ... فہرست جلد ۲۔ تذکرۂ قاسم میں بھی سمرو نام ہے۔ لوکھنؤ... بیگم سمرو کی کتاب (... فرنگیاں) اس وقت ... مشکل ... شمسی ... اس سے بحث کی ہے۔

(۱۰۵) افکار ... (محمد فیضہ صاحب) نے گو یہ نظر نہ کیا وقت ابطال آبادی میں غلام حسین خاں... کوکب کی صحبت میں گزارا۔ یہ صاحب دیوان اور ... تھا۔ ... آنکی ... مخزن الغرائب ... کا ذکر کیا ہے۔ (الف) کوکب کے عمدہ ... سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے ... کا ام کوکب کا ذکر کہیں نہیں دیکھا۔ (ب) ... کے نسخوں سے ... اشعار ... لکھے ہیں ... ہیں۔

(۱۰۶) سرو ... یوسف (میر یوسف علی خاں) دہلوی ... عزت اللہ عشق (... شگفتہ) فتح علی خاں ... میر ... ابو الحسن ... فتح علی حسینی اور عزت اللہ عشق سے ... ۱۱۹۸ھ ... قیاس ہے کہ یہ ... نیز ... فارسی (۱۱۵۰ تا ۱۱۹۹) ... مرتب ... میں ... ہیں (ایضاً ... یوسف علی خاں) ... نواب ... اصالت خاں کا ذکر ... کیا ہے ... (الف) ... میر یوسف ہی لکھا ہے۔ خاں ... تماسی ب ... فتح علی خاں (اور میر فتح علی حسینی) ... مگر یہ ... نہ تھی ... وفات ... قاسم کے وقت زندہ تھے۔ تذکرہ ... لکھا ہے ... انہیں ... (ب) ... قاسم ... نہ تھی ... یہ ... یوسف (...) (فہرست جلد ۲)

(۱۰۷) ۳ ص۲۰۱ تجلی میر محمد حسین تخلص سخن سرکار رعایا میاں حاجی، مگر سخن نے لکھا ہے "تجلی میر محمد حسین المشتہر بحاجی"
انکا نام محمد حسین بھی صحیح نہیں ہے یہ انکے والد کا نام ہے

(۱۰۸) ۳ ص۱۲۱ یار علی خاں شوکت لکھنوی ہیں شاگرد مصحفی علی (رضا) اسیر کے اشعار مگر ان کا اسم ہے۔ اس نام و تخلص کے شاعر کا شعر
گلزار میں نہیں اور نہ مگر اسیر کے اشعار اس میں ہیں یہ بھی نہیں لکھی گئی ص۲۸۹

(۱۰۹) ۳ ص۱۲۳ شوقی (محمد رفیع) اپنے شوق کی عمر ۳۰ سال کی فہرست اسپرنگر ماخذ دتاسی) میں ۲۰۔ سے زیادہ اس سے اختلاف کا دتاسی کو کوئی نصر

(۱۱۰) ۳ ص۱۱۳ شرف (اشرف علی) مصطفی آبادی شاگرد شیدا (اصحو چاپی) ملحاں لسیع ۱ ص۲۱۵ اشرف (شیخ اشرف علی)
مصطفی آبادی شاگرد اصحو ملحاں اسیر۔ دونوں ایک ہیں

(۱۱۱) جہاں میں حسن علی آگاہ اور لطف علی آگاہ کا الگ الگ ذکر ہے اور لاغر (بدون تخلص) کا ترجمہ جلد ۱ میں ہے دتاسی نے یہ خیال
ظاہر کیا ہے کہ دونوں آگاہ غالباً ایک ہیں (جلد ۱ ص۱۱۲) - اصل میں آگاہ داراں کو مولوی شیفتہ نے شاگرد ظاہر کیا ہے لیکن شیفتہ نے ملا یہ
نہیں بتایا کہ وہ کس کے شاگرد ہیں۔ اس نے انکو طبیب ہونا بھی ذکر کیا ہے اس کی سند میری علم میں نہیں۔ آگاہ ثانی البتہ شیدا کے
شاگرد ہیں اور آگاہ ثانی لطف علی بھی مختلف۔ یہ لطف خاں جن کا ذکر جلد ۲ میں ہی ایک ہیں

(۱۱۲) محمد کسی قطع میں لفظ مہر (بالکسر) کا طور پر شعر آئی جو ردیف ہی سے قافیہ مناسبت رکھتا ہے۔ اسی مہر بالکسر پڑھیگا۔ اس لیے
ہمیں اسکی کوئی وجہ نظر نہیں کہ تخلص کی صلاحیت نہیں رکھتا - دتاسی کو جہاں یہ تخلص ملا ہے اسی بالضم سمجھا ہے اور مہر (مکسور المیم)
تخلص کرنے والوں کا تخلص مہر (مضموم المیم) لکھا ہے۔ ان میں سے ایک مرزا حاتم علی بیگ کی بابت قطعی ثبوت موجود ہے کہ
انکا تخلص مہر بکسر میم ہے۔ انکا ترجمہ جلد دوم کے صفحہ جلد اول میں ہے جہاں مرزا حاتم علی بیگ لکھا ہے انکا ذکر ہے۔ غالب کا شعر ذیل
جو درج ہے یہ ہے:

جناب میں بھی چاہوں از سر مہر کہ ہو مرزا حاتم علی مہر

(۱۱۳) جلوہ: جعفر علی نقیس کے والد کا نام میر زین العابدین لکھا ہے۔ اس کی جگہ میر زاہد ہی چاہیئے (تذکرہ محسن)

(۱۱۴) گلدستہ ناز میں محمد نور الدین جوش (جوشش چاہیے) کو بعد شاہ عالم لکھا ہے ظاہر ہے کہ یہ کلمہ ح ہے یعنی بجائے عالم
طباعت کی غلطی ہے مگر دتاسی کو اس کا ادراک کہاں ہے وہ شاہ عالم ہی سمجھ کر داخل کتاب کرتا ہے اور گلدستہ میں جو شعر ہے
اس کا ترجمہ کرتا ہے شعر حاتم کا ہے (نکات الشعراء) اور عالم حاتم کا غزل ہے:

مانا ہے سنگدل نے لگا مجھ کو رنگ اسیر ہے ۔۔۔۔۔ کہو یہ مجھ سے زار کا لازم ہے سنگ سرخ

(۱۱۵) ۳ ص۲۷ کریم الدین کا قول ہے کہ صاحبقران ۱۸۴۷ میں ۳۵ برس کے تھے۔ یا فقط سن بجری کا سال انتقال ۱۲۲۳ھ ہے جو مقصود ہے
بعمر نصت امالی الہی جہاں در گذشت۔

(۱۱۶) ۳ ص۲۸۸ سعید (سعید محمد خاں) مولف سعید کی نسبت یہ گیارھویں صدی کے فارسی گویوں کے حالات فارسی تذکروں میں ہیں، ہندوستانی
زبان میں انکا ایک مصرع کہنا بھی ثابت نہیں۔

(۱۱۷) ۱ ص۲۲۶ آشفتہ (مرزا رفیع علی حکیم) "طلیعہ گوہر دماغ کی دفتر زنجیر علی معمور" جلد ۲ میں مرزا میر اور بی ہے - ایضاً ص۲۱۵
آشفتہ شاگرد مائل کا نام غلام الدین ہی ہے اور مجھ کو خان بلیغ کا لکھنا ۲ آشفتہ اول کا نام مرزا رفیع علی (تذکرہ نیری مختلی)

ہے "یکم وحی محی کمر باشی" پیرو مرشد آج ایک خط سرور کو بھیجا ہے مگر [illegible] میں لکھی ہے کہ وہ دکھانا بھول جاتی
اس کے بعد لکھا نہ غلط جانیے۔ "نزک قسمیں" ذال کا فارسی میں نہ ہونا، فارسی میں حروف مختلف المخرج در گفتار وردن قریب
المخرج کا نہ ہونا۔ عبد الواسع سے شیخ علی حزیں تک انھوں نے اپنی تحریر میں اس کو بتایا ہے، ائمہ فن کے اقوال کا ناقابل فہم ہونا
عبد الواسع اور غیاث الدین اور عبد الرزاق ان ناموں کی [illegible] نظر میں ہی تو رہ جائے۔ ایک شخص یعنی [illegible]
باپ نے اس کا نام میر باقر رکھ دیا۔ اصل فارسی کو اس کمتری نے "قبیلہ علیہ" تباہ کیا، [illegible]
عبارت عربی ۔۔ کھو دیا، ان کا بھی [illegible] کہاں سے لاؤں جو صاحب عالم کی نظر میں [illegible] ہوں ۔۔۔ غور کر دیکھو تو خوش
نا [illegible] کہا ہے [illegible] بعد میں [illegible] وہ منہ کیا بتاؤں ۔۔ میرا کہنا [illegible] پڑھو۔ فوت ہمیشہ سے کام لو۔ ان کلموں پر
[illegible] سو جی سانہ پیرا [illegible] اگر [illegible] جاتی تو رہ جاتی۔ تمہاری [illegible] پر اور میر [illegible] کی نسبت پر نظر کرکے
لکھا ہے۔ [illegible] کہتا ہے [illegible] کو اس میر کی تحریر کو مانو، مگر اس کمتری نے مجھے بھی اور اس علم سے مجھ کو کمتر نہ جانو۔۔
عربی کا حرف اور ہے اور فارسی کا قاعدہ اور ہے۔ سمجھو یا نہ سمجھو۔۔ اختیار ہے۔ [illegible] غور کرو کچھ
عبد الواسع [illegible] [illegible] "واقف محوش الاوخل" نہ [illegible] میں [illegible] ۔۔ [illegible] ۔۔ مانو نہ مانو،
تم جانو۔ اس مطلع و حسن مطلع کو کیا سمجھوں اور اس کا شکر کیونکر بجا لاؤں؟ خدا کی بندہ نوازیاں ہیں
کہ مجھ ننگ آفرینش کو۔۔ "فاتحان درگاہ سے بھلا ہوتا ہے" وہاں عام ہیں نہ مرنا ظاہر اسی لیے تھا کہ یہ سعادت نصیبی
میری مقدر میں تھی۔ خدا کا واسطہ اب اور اشعار نہ کہیں ورنہ [illegible] میں بھی بیانہ کر دوں گا۔ خدا ہی
بعض اشخاص کی نظر پڑ گئی۔ پہنچ گئے باری میں بھی آپ نے کچھ لکھا ہے، نسخۂ مطبوعہ بہت غلط ہے لیکن مطلوب ہو تو
بھیج دوں۔ ۲۲ شاہ مقبول عالم کی شادی کی مبارکباد۔ قاطع کی نقل آگئی تو جا لگی۔ خطوط انھی کو بھیجو۔ آپ کی اور
حقیر کی ملاقات ہو، دل بہت خوش ہوا "[illegible] ہرگز نہ رہی [illegible]"۔ ۲ کوئی وجہ آپ کے یہاں [illegible]
پر آنا ممکن ہے مگر "[illegible]" ناممکن ہے۔ "زبان کے باب میں مختصر بیان" ۶ ایک شخص کا گستاخی سے کلام ذکر

لکھتا ہوں اور یہ بھی لکھتا کہ کیوں لکھتا ہوں؟ "مرا بخیر زیک جنس در شمار آمد دہان کہ نسبت زبہ پہلائے فرق تا مگسش" ہے
ہندیوں میں خسرو کو سعدی کے رتبہ کا منکر ہوں۔ "لے صاحب دستور نگرف کا کلام لکھی آورد" غیاث الدین کا کلام حدیث نبوی
آپ ہی غور فرمائیے اور انصاف کیجیے۔ فا دیوان فارسی آپ کے پاس ہے؟ دستنبو میں نے تو نہیں بھیجی آپ نے ازراہ عنایت خرید لی
آپ کے پاس ہے یا نہیں؟ "فتنہ و فساد" کے بعد ۲ قصیدوں کا مطلب "نظم به آدم دل به شیطان طوق لعنت الخ" الا ایک رباعی کی
"دنیا بحیث ورماد غرض بحیث الخ" کو لکھا کچھ بھی کیا سقط سہو کیوں لکھی ہے؟ مستعار مانگو تو بھیج دوں لگے ہیں
مرا اعتقادی کے خط میں لکھا کہ آرہا ہوں کہ آپ روز روز نئی نئی تقریب کی اطلاع چاہتی ہیں؟ قدم بوسی کی تمنا حد سے زیادہ
ہے مگر اب جانتا ہوں کہ یہ آرزو گور میں لے جاؤں گا لاکھ گو بندہ پرور نہ وہ دن رہے خستہ و درماندہ ہوں معلوم ہوتا ہے کہ صاحب عالم
نے ترک کیا ہے کہ دلی والوں کی مدح میں قصیدہ نہیں غالب کہتے ہیں کہ میں مدح کش اور محسن کشور بھی اس کی طبع نظر کی
کرادوں تو اس کا اہل و دماغ کہاں؟ فرض کیجیے کہ قصیدہ لکھ کر آپ کو بھیجا آپ دلی روانہ کریں متوسط نہ جانا تک
پیش کر دیا تو کا ... پیش کر دیا کیا پیش گیا۔ ان سے [illegible]
[illegible]

جاف عربی ہے اور فرہنگ محمد معین اس پر مشعر کہ یہ ایران میں اسی طرح مستعمل ہے اس میں تصرف نہیں ہوا۔ اس کا مستند سنجاف با علان نون ہے کثرت جرأت ( کلیات جلد ۲ ) ؎

در پردہ رگ جاں میں مری واں جو نہاں ہیں ص ۲۷۳ وہ منزی سنجاف میں پوشاک کے دور ہے

فرہنگ آصفیہ میں یہ ہندی اور عربی سنجاف میں فارسی۔ سنجاف لگانا کی سند میں رشک کا ایک شعر جس میں سنجاف با علان نون آیا ہے مصحفی کے دیوان اول کا مرتب نے جہاں بھی عربی سنجاف آیا ہے اسے سنجاف کر دیا ہے اور شعر ذیل کے حاشیے میں لکھا ہے "سنجاف داماں" = دامن پر لگی ہوئی گوٹ" :

زر لعنت وہر وہ کو تواضع کر رہی ہے ص ۲۲۴ تا قطع کر سیدھے اس کی سجاف رہاں

ص ۱۰۱ میں ہے "ہم خود سنجاف سرخ سو کچھ کم نہ تھا میاں" مخطوطات دیوان اول کے جو نسخے میری نظر سے گزرے ہیں ان میں سجاف بغیر نون ہے۔ سنجاف بنون غنہ کی کتاً کسی نے علم ہی نہیں اور میں نے کسی کو اس طرح بولتے ہوئے بھی نہیں سنا۔

— صوفیانہ (غلط یا ) صوفیانہ (بدرجہا) - بہت یا جمع ہے صوفی میں ایک ہی ی قاعدے کے مطابق اس پر انہ کا اضافہ ہو سکتا ہے "یانہ" کا نہیں۔ فرہنگ محمد معین میں صرف اسی طرح - اردو میں سند صرف اسی کی ملتی ہے۔ جرأت اسی ہے :

خضب سادہ رویوں کی یہ سادگی بھی ص ۲۸۵ کہ پہنے ہیں صوفیانے بندھی ہیں

صوفیانے قافیہ ہے دوسرے قوافی فسانے، ترانے وغیرہ۔ صوفیہ بدرجہا صوفی کا اسم مجرد ہے جو اسرار التوحید میں ملتا ہے اور فرہنگ محمد معین میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر اضافہ "انہ" کا سوال ہی نہیں۔

— افعی، افعی ہندی - عربی لفظ افعی ہے ایران میں اس کی عام شکل افعی ہے۔ افعی کی طرف ایک سند میر کے علم میں ہے اور وہ مظفر علی اسیر کے دیوان قصائد کا ایک شعر میں ہے، جس میں یہ بطور قافیہ آیا ہے۔ افعی کا اردو کے متعدد اشعار میں آیا ہے۔ اول جملہ شعر غالب :

یہ نہ تھی ہم بھی ہر ایک قدم افعی نہ ہوا

دکس کی بیلنٹنی سوت کا باعث ہوئی کسی طرح ایک اچھا مادۂ تاریخ بھی کہا جا سکتا، زمانۂ وفات کے متعلق اپنی رائے پر اب بھی قائم ہوں۔

— ایلیٹ نے جو ایک سربرآوردہ فنکار اور نقاد تھے پرانے متنوں کی ترتیب کو بڑا اہم کام سمجھتے ہیں اور اسکو کرتے رہے ہیں ان کے نزدیک اسپرٹ یسی اینشنٹ کچھ نہیں۔ اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ کام ان لوگوں کو اپنے ذمے لینا چاہئیے اور جو اس کا اہل ہیں۔ اس کی ہمت افزائی خواہ کسی شکل میں ہو، ایک اخلاقی جرم ہے۔ اردو کی بدقسمتی ہے ہندوستان و پاکستان میں بجز اکثریت اس کام کو اپنے ذمے لینے والوں کی ایسے لوگوں کی ہے جو نااہل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق کی مرتب کی ہوئی کئی کتابوں پر میرے تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔ تذکرۂ گردیزی کے متعلق اب تک میں نے کچھ نہیں لکھا۔ اس کا حال دیکھیے۔ پاکباز کے ترجمے کے بعد اپنی روش کے مطابق ان کے اشعار پیش کیے ہیں جن میں سے ایک کے متعلق لکھا ہے کہ یہ خوشگاہ قزلباش خاں کا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے [illegible] اور اسی کے پاکباز کے جتنے شعر ہیں قزلباش خاں کی طرف منسوب کر دیے ہیں۔ اسی جگہ بھی خبر نہ تھی [illegible] شعروں میں انھیں شامل کر لیا، حالانکہ ان کا ذکر اور فہرست شعرا میں بھی ہے۔ داخل ہیں حالانکہ اگر انھیں گردیزی کو یہ منظور ہوتا تو الف یا قاف میں ان کا ترجمہ مع اشعار یا صرف اشعار مع نام و تخلص درج ہوتے۔ نہ معلوم ڈاکٹر عبدالحق خوشگاہ کو کیا سمجھے۔ گردیزی نے اسے شیدیدہ کی جگہ استعمال کیا ہے۔

۔ مارچ ۱۹۳۶ء کے معیار میں میرا ایک مضمون ہے جس میں تذکرۂ خوشگو (اس وقت تک طبع نہیں ہوا تھا) کے نسخۂ کتب خانۂ خدا بخش سے ترجمۂ آبرو تین فارسی اشعار کے ساتھ نقل ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آبرو کی تاریخ وفات ۲۴ رجب ۱۱۳۳ھ ہے۔ اس کے بعد اس کے دو مصرعوں کا اشارہ ہے جو ۱۱۴۶ھ کی مصدق لیکن یقینی اور میں نے ان کا ذکر اپنے کسی مضمون میں کر دیا۔ ایک مدت کے بعد دیوان ناجی مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق میں غزل ۲ العزیز ۱۱۸۸ جس میں مرتب نے قطعہ کہا ہے:

بتاں میں سنگدل تاریخ کا مصرع تو پڑھنا ہی — کہ بیلطفی سیں اون کی آبرو نے جی دیا مر مر

مصرع آخر سے ۱۱۵۶ نکلتا ہے۔ خوشگو آبرو کا استاد بھائی تھا اور آبرو کے مرنے کے وقت دہلی میں تھا۔ کوئی وجہ نہیں کہ انھیں صحیح سال وفات معلوم نہ ہو۔ میرا قیاس ہے کہ مصرع آخر دراصل یوں ہے "کہ بیلطفی سیوں اون کی آبرو نے جی دیا مر مر" "واو" لکھ جانے سے مصرع ۱۱۴۶ پر ختم ہو جاتا ہے۔ مرتب کا ذہن کاتب کی غلطی کی تصحیح کر سکتا یا نہ کر سکتا۔ انھیں اس اختلاف کا ذکر ضرور کرنا تھا

۲۔ مرتب دیوان ناجی نے اپنے مقدمے میں اس کا ذکر نہیں کیا کہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی نے نقوش اشار کے متعدد میں، جو انھوں نے میری استدعا پر لکھا تھا، "ناجی کو شیخ آبادی" شعرا میں شمار کیا ہے۔ مجھے حیرت تھی کہ سید صاحب کو یہ بات کس طرح معلوم ہوئی۔ ایک مدت کے بعد ان کا خط اتنا ... سے مجھے معلوم ہوا کہ پہلے پہل ناجی کا شیخ آبادی ہونا انھوں نے لکھا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ یہ لائے کہ ناجی کو انھوں نے نامکمل جواب دیا کہ عنفوان شباب کا زمانہ تھا، جب وطن اس کا باعث تھا میں نے کہیں ناجی کا شیخ آبادی ہونا دیکھا تھا نہ سنا

۳۔ مرتب دیوان ناجی نے ناجی کے زمانۂ ولادت کے متعلق میرا قیاس کر لیا ہے لیکن زمانۂ کے بارے میں میرے قیاس کو اس لیے تسلیم نہیں کیا کہ دیوان ناجی میں امیر خان انجام مقتول ۱۱۵۰ھ کی وفات کا قطعۂ تاریخ نہیں۔ ناجی کے دیوان میں صرف ایک مادۂ تاریخ ہے جو غزل کے ایک شعر کا مصرع ہے اور اس بنا پر کہ کاف بیانیہ جس سے مصرع آخر شروع ہوتا ہے مادے میں شامل ہے اور مصرع آخر بجائے خود سال مذکور پر مشتمل ہو۔ مگر اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ

ناسخ دبستانِ لکھنؤ کے بانی کی ایک مثنوی سراج نظم ہے، جو ۱۲۵۴ھ میں تمام ہوئی۔ یہ نام تاریخی
ہے۔ اسی سال ناسخ کی وفات ہوئی۔ اس میں ایک عربی کتاب کے مطالب نظم ہوئے ہیں۔ اس
میں بکثرت عربی الفاظ ہیں جنھیں اردو نے قبول نہیں کیا۔ بطور نمونہ چند یہیں اور یہیں تک ہیں ص۳ تا —
— "ہالک" ایک نعتیہ شعر میں آیا ہے "ہیں ازل اور ابد کے یہ مالک ص۳ یہی باقی ہیں اور سب
ہالک" یہ بات کہ سب ہالک ہیں بجز خدا قرآن میں ہے۔ ناسخ کا قول صریحاً قرآن کے خلاف ہے
— لائح "سب براہین مجمیں (کذا) ہیں واضح ص۵ آں نگارا و واضح و لائح" — تلال
"یہ جواہر جو سارے مثل پہلے ص۸ ہیں تلال و جبال میں یکجا ہے" — لبن "فائدہ مند تھا جو
شرب لبن ص۹" — طالح "مشتغل ہے وہ مصالح کا فقط شخص طالح کا شغل صالح" —
ادوات "ہوتی ادوات موت سے تنبیہ ص۱۳" — بلع "ہیں مدد وقت بلع آب و طعام
ص۱۷" — اوجاع "ناخن موجود ہوتے میں اکثر ص۱۸ رنج و اوجاع ہوتے ہیں باہر"
— استیلاء "ہوا داخل میں بعد استیلاء ص۲۰" — تاثی "وجہ تدریج کی تاثی کی"
(تاثی میر کے یہاں آیا ہے) نامانوس عربی الفاظ سراج نظم میں اور بھی ہیں

- دساتیر فارسی: پارسیوں کی وہ مذہبی کتاب جو ان کو سب سے بڑے پیغمبر یعنی فرزآباد و وخشور ان (نام پیغمبر) پر آسمان سے آسمانی زبان میں نازل ہوئیں (کذا)" یا یوں کہو کہ وہ کتاب جو مہ آباد یعنی آبادیوں کے سب سے بڑے پیغمبر پر زبان فارسی میں نازل ہوئی۔" دساتیر ۱۵ صحیفوں اور پندنامہ سکندر پر مشتمل ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ آسمانی زبان میں ہے جو روئے زمین پر نہیں بولی جاتی۔ آباد (فرزہ = بزرگ دساتیری زبان کا لفظ) کا زمانہ جیسا کہ ... برس سے زیادہ بتایا گیا ہے۔ مہ آباد صاحب شریعت نبی تھا، جس کو یزدان (بشمول زردشت) کو حکم ہے کہ آباد کی پیروی اور اس کی شریعت کی ترویج کریں۔ یہ شریعت ہمیشہ کے لیے اور ہر ملک کے واسطے ہے۔ دساتیر کے جو نسخے ملتے ہیں ان میں متن کے ساتھ ترجمہ تفسیر جو آخری دساتیری پیغمبر ساسان پنجم معاصر خسرو پرویز کی طرف منسوب ہے۔ اس سے دساتیری خدا کا وعدہ ہے کہ اس کے اخلاف میں پیغمبر ہمیشہ رہیں گے۔ ترجمہ و تفسیر کے متعلق جہاں تک مجھے یاد ہے کہا گیا ہے کہ زبان پارسی دری میں ہے۔ اس کا ایک نسخہ بمبئی کے ایک زردشتی، ملا فیروز کو ملا، اور انھوں نے اسے انیسویں صدی کے خمس اول میں مع ترجمہ انگریزی و فرہنگ شائع کیا۔ اس سے قبل کسی فرنگی مستشرق نے اسے نہیں دیکھا (بمبئی کے گورنر سے جو اس کا ترجمہ کرنے پر بحث نہیں)، مگر دبستان مذاہب میں اس کے متعلق جو کچھ ہے وہ ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔ خود اس کتاب کے معائنے کے بعد سب نے اسے مجعول قرار دیا، اور کچھ دن کے بعد زردشتی بھی ان کے ہمنوا ہو گئے۔ اب کوئی اسے اصلی کتاب نہیں سمجھتا مگر بعض احباب اسے عہد خسرو پرویز کی کتاب سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ متن ایک مصنوعی زبان میں ہے۔ ترجمہ و تفسیر عہد خسرو پرویز کی زبان میں نہیں بلکہ عہد صفویہ کی فارسی میں ہے اسی فرق کے ساتھ کہ اس میں کچھ مصنوعی الفاظ بھی ہیں۔ زردشتی عقائد کے بموجب زردشت افضل البشر اور پیغمبر ہے جس کی شریعت ہمیشہ کے لیے ہے۔ دوسرے دساتیری پیغمبر (بشمول آباد) کا ذکر ان کی مذہبی کتابوں میں نہیں۔ دساتیر میں زردشت کو اسی قسم کا پیغمبر ہے جیسے ... آباد اور پیغمبر ہیں۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ کچھ زردشتی کچھ دنوں کے لیے اسے اپنی کتاب مقدس سمجھے۔ مجھے یقین ہے کہ دساتیر (متن مع ترجمہ و تفسیر) کا مصنف آذر کیوان تھا جو دعویٰ کرتا تھا کہ وہ ساسان پنجم کی نسل سے تھا۔ آخری صحیفے میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ساسان پنجم کی نسل سے پیغمبر ہوں گے اس سے مراد یہ ہے کہ آذر کیوان دعوائے پیغمبری کر سکے۔ اس کی کوئی کتاب تو ایک فارسی مثنوی کے سوا موجود نہیں، اور اس میں یہ دعویٰ نہیں کہ میں پیغمبر ہوں لیکن یہ کہ میری روح جسم سے جدا ہو کر آسمانوں کی سیر کیا کرتی ہے۔ اس کے معتقد بہت سے ہیں جو اس کے عہد میں بھی اسے پیغمبر سمجھا گیا تھا۔ رجوع ... آذر کیوان ایرانی ہے، ہند آیا تھا اور پٹنہ میں مرا۔ اس کی وفات ۱۰۲۷ھ سے دو تین سال قبل ہوئی۔ دبستان مذاہب کا مصنف جو ... بھی ہے ... میں اس کا بیان ہے ... لیکن مجھے یقین ہے کہ ... نے دساتیر کی شکل بھی نہ دیکھی ہو گی۔ اس سے حقیقی ان کی معلومات کا مدار دیباچہ دبستان ... پر ہے مگر انہیں

روشنی کی وساطت انھوں نے اسے محض سرسری طور پر دیکھا تھا اور وقت نہ تھا کہ جو جواب تھا لکھ دیا۔ "دساتیر" فرضی لغت کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور اس کی زبان فارسی کس طرح ہو سکتی ہے جب خود دساتیر آسمانی زبان میں ہو کہ جس کا ترجمہ ہو تو کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ "وخشوراوفرزان وخشور" کیا بلا ہے؟ صحیح وخشوراں (وخشور فارسی میں = پیمبر) وخشور یا وخشور وخشوراں ہے۔ وہی کتاب جو پہلے پارسیوں کی تھی، چند سطر بعد آبادیوں مذہبی کتاب کی کتاب ہو گئی۔ ممکن ہے کہ مؤلف پارسیوں اور آبادیوں کو ایک سمجھے ہوں مگر جس طرح انھوں نے لکھا ہے اس طرح نہ لکھنا تھا۔ مؤلف نے دیباچے میں لکھا ہے کہ "فارسی الفاظ کا زبان زند یا زند (بدون واو عطف) اور کلیتہ تک پر سراغ نہیں پایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی لفظ کی بحث میں جو مجھ سے نظر انداز ہو گئی ہو دساتیر کا ذکر آ گیا ہو مگر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کوئی بات ایسی نہ ہو گی جو دیباچہ گلستاں سخن میں ہے گو اس کا امکان ہے کہ نسخ شدہ صورت میں ہو

دیوانِ یقین

دیوانِ یقین مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے مرتب کیا تھا اور اس پر ایک طویل مقدمہ (     ) لکھا تھا جو بعض احباب کی رائے میں تحقیق و تدقیق کا ایک شاہکار ہے۔ مرزا صاحب کی انشاپردازی اور ظرافت مسلم ہے لیکن اس مقدمے میں یا کہیں اور تحقیق و تدقیق کا حق ان سے ادا نہیں ہو سکا، اور نقاد کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بلند نہیں۔

- بالو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں بنگال اور بہار میں زیادہ رائج ہے۔
اس لفظ کو ۲ شعروں میں مجھے ملا ہے، اور دونوں کلیات جرأت ۲ (مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن)
میں ہیں ایک مثنوی راحت و چری میں ہے اور ایک سلیمان شکوہ کی ایجنٹی میں آیا ہے اور
جس کی تخمیس جرأت نے کی ہے:

کہا درویش نے آ بیٹھ بابو ۶۳ بتا مجھ کو کہاں سے آیا ہے تو
گریں ہے خلق سے رم کھل آ ہو لطف ۲۵ ملے ہے عرش جب گرد ہیں آہو
بری دنیا بڑا ہے ان کا قابو نہ سمجھو کہ کہاں تم اس کو بابو
فقیروں کا یہی ہے رنگ چھالا
بجائے

بابو ایران فارسی میں مقبولیت پر نہ سمجھا کہ ایران میں ہندوستان سے گیا ہے۔ وہاں باب = پدر
پر اضافہ "و" سے قبل ہم دیکھتے ہیں ۔ اسرار التوحید میں جو
صدی ہجری میں تصنیف ہوئی ہے، ابوسعید کے والد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بابوالخیر تھے۔
بابو فرہنگ نفیسی میں بھی ہے۔

— بیبی ۔ قدرت ہوئی میں نے ایک انگریزی مجلے میں شرقی ترکی کے الفاظ دیکھے تھے، ان میں سے ایک
بیبی بھی تھا، مگر بمعنی زوجہ اپنی' دوسرے معانی کے ساتھ فرہنگ نفیسی اسی کی مصدق ہے اور اس
میں بھی بمعنی زوجہ اپنی۔ فرہنگ آصفیہ میں یہ فارسی ہے بمعنی مذکور مع معانی دیگر۔ بطور سند قدیم ترین
کتاب میں اس معنی میں آیا ہے فضلی کی کربل کتھا ہے۔ امام حسن اپنی زوجہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

اس دیس میں آئیں تو ان کا نام بھی بلا تکلف ان کے ساتھ آگئے، جیسے امرود، ناشپاتی۔ یہ (تلخیص
الادویہ ص ـــ) قدیم ترین کتاب جو ہند میں لکھی گئی اور جس میں یہ لفظ آیا ہے تزک بابری ہے جس کا ترجمہ
عبدالرحیم خان خاناں نے کیا ہے میری نظر سے گزرا ہے۔ اس کو چوتھے یا پانچویں صفحہ میں یہ لفظ ہے۔
میں پروفیسر نذیر احمد کا ممنون ہوں کہ انھوں نے براہ مہربانی اصل نسخے کو (جو علی گڑھ میں ہے) کو دیکھنے
کی زحمت گوارا کی اور میرے خیال کی تصدیق کی کہ یہ اسی میں ہے۔ ایرانی شاعر نوعی خبوشانی یہاں آیا تھا
اس کے دیوان میں یہ مصرع ہے "این لگو یہ ناشپاتی و سیب و انار و بہ نیست"، شعرائے اردو میں سودا
قائم کے یہاں یہ آیا ہے کی ولیم صاحب پہنچے آگے تھے تو ان کو معلوم ہوا تھا کہ یہ مغربی ایشیا کا
لفظ ہے۔ فرہنگ معین: "امرود ایضاً - ۱- نوعی گلابی" درمیل چہار باغ ہا میوہ ہای الوان فرزوان
از ناشپاتی و بادام و فندق و گیلاس و عناب" تاریخ بخارا ۲۴۱ - ۲ - میوہ ایست مشابہ امرود
در زبان عرب اشنداح - بامراجعہ بمآخذی کہ در دسترس بود ثابت این میوہ شناختہ نشد" گلابی
وہ پھل ہے جو عربی میں کمثری ہے اور انگریزی میں Pear - فرہنگ اشنداج میں جس پھل کو امرود مشابہ
بتایا ہے وہ گواوا ہے جسے ہند میں امرود کہتے ہیں (ربہ ـــ) شرف نامہ، شرف الدین علی یزدی یہ بھی
ظفر نامہ

۳۳،۳۴ — گزارش حاصل مصدر "گزاردن" کا ہے اور اردو میں مستعمل تھا، اور "گذارش" گذاشتن کا حاصل مصدر اردو میں مستعمل تھا نہیں۔ دونوں کے معنی مختلف ہیں (ار فرہنگ معین)
لوگ گزارش کو زے ہی سے لکھا کرتے تھے لیکن ذال فارسی کی مشکل غالب کا بنایا ہوا طلسم ٹوٹ گیا، تو بہت سے لوگ گزارش کو بجائے "ز" ذ کرکے صحیح سمجھنے لگے

۳۵ کاغذ کو فارسی سمجھنے کے باوجود غالب ذ سے لکھتے تھے۔ حالانکہ زیادہ سے زیادہ "تمسخرہ" بنا لینگے۔ وہ دال سے لکھتے تو مثنوی روم کا ایک شعر سند میں پیش کر سکتے تھے
ایک مصرع ہے "مثنوی ہفتاد تا کاغذ شود" دوسرا مصرع یاد نہیں۔ اسی طرح ایک جگہ۔ فرہنگ معین کا فقرہ "کاغذ دولتی" کاغذ دراصل ترکی لفظ ہے ترکی میں اس کی شکل بدلی

۳۶
شکنجہ پیشانی "چین بر ابرو و غمناک صائب؛
در رکاب سبزہ دارد پای حسن تو بہار "تا نگیں در باغ داری نخچۂ پیشانی بہانش
(چراغ ہدایت مؤلفہ خان آرزو)۔ یہ معنی فرہنگ معین میں ہیں۔ کلیات میر جلد ا (شائع کردہ ۔۔۔) کے ۔۔۔ شعروں میں آیا ہے۔ اس قابل ہے کہ شعرائے اردو اسے استعمال کریں۔ میرؔ

۳۷
— قشریدہ (الف مفتوح، ش مضموم) (ق مضموم، ش مفتوح، ع ساکن، ر مکسور، ی معروف، ر مفتوح، عربی میں حروف ۳ قشعر) کلیات میر میں دو جگہ آیا ہے، اور معنی نے اسے استعمال کیا ہے۔ دونوں کے یہاں ش ساکن، ع متحرک۔ اردو میں استعمال ٹھیک نہیں سمجھا گیا کم سے کم مولانا کی صحرائے عاشقی کی ۱۵۵ سطروں کو اس جگہ پر ہونا ہے۔ قشعریرہ

— چوداں ایک زیور ہے۔ اس کی جمع چودانیاں ہے اور خاص صورتوں میں چودانیوں کلیات ذوق، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی میں یہ مصرع ہے "دیکھیں ہیں جب گہر تری ان چودانیوں جلد ۲، ص

لکھ کر ایجی تھی کیونکہ یہ اشعار اس کے زائیدۂ طبع سے نہیں، اس کی طرف منسوب اس لیے کر دیے گئے ہیں کہ ایک پردہ نشیں کی زبان سے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا اصلی مصنف حاذق خلف ... ہے جس کے دیوان (قلمی ۱۱۴۳ھ ...) میں یہ اشعار غزل کے دوسرے اشعار کے ساتھ موجود ہیں۔ حاذق کا مقطع یہ ہے:

۱۸ من کم از خورشید حاذق را نمی بینم بچشم ہر کہ او حلقِ حسن دارد حسن بنمود مرا

۱۸ کلمات الشعرا مصنفہ سرخوش ص۲۲ میں بھی یہ حاذق کے نام سے مندرج ہیں، بلکہ اس میں پہلے شعر کے متعلق یہ لطیفہ بھی ہے: "روزی پیشِ ملا شیدا این مطلع خود را برخواندم "بلبل الخ"، شیدا گفت صاحبِ این شعر را در امروز گفتہ باشند۔ حکیم (حاذق) برآشفت و او را در حوض غوطہ داد" اس سلسلے میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اشعار زیرِ بحث دیوانِ مخفی (مطبوعہ ۱۲۶۸ھ ص ۱۱۹) میں جو ناشر کے نزدیک زیب النساء کی ملک ہے موجود ہیں۔ یہ بات تو اب ثابت شدہ ہے کہ مروجہ دیوانِ مخفی خواہ مطبوعہ ہو خواہ مخطوطہ زیب النساء کا نہیں، بلکہ غیر معروف ایرانی شاعر کا ہے۔ اس لیے اس ... پر زیب النساء کی طرف سے تو دعویٰ ہو ہی نہیں سکتا۔ رہا ایرانی مخفی کا معاملہ تو اس کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس لیے کہ مطبوعہ دیوان میں الحاقی کلام داخل ہو گیا ہے جس سے قلمی دیوان (از آں جملہ نسخۂ ...) خالی ہیں۔ یہ اشعار دیوانِ مطبوعہ میں یہ سمجھ کر شامل کر لیے گئے ہیں کہ یہ زیب النساء کے ہیں اور دیوان بھی اسی کا ہے۔

ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی انھوں نے مرشد کی کتاب پر مقالہ لکھا تھا (۲۱ ۔ ۱۰ ۔ ۲ ۔ ۲) میری والد کو داستان
امیر حمزہ سے دلچسپی تھی اور ان کے یہاں نول کشور والی تمام جلدیں تھیں جن میں طلسم ہوش ربا وغیرہ کی بھی
کچھ جلدیں تھیں اور میں نے یہ سب دلچسپی سے پڑھی تھیں۔ اس کے بعد ناولوں کا شوق ہوا۔ عبدالحلیم شرر اور انگریزی
ناولوں کے ترجمے پڑھتا رہا۔ علی گڑھ جانے کے بعد انگریزی ناول پڑھنے لگا۔ انگلستان جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا
اور ایک برس جب میں بیمار رہا، تو ایسی کتابیں جن کے مطالعے سے دماغ پر زور پڑے پڑھنا ممنوع تھا۔ ناول، مختصر
کہانیاں اور ڈرامے ہی پڑھتا رہتا تھا۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد بھی ناولوں کا شوق رہا۔ ایک اچھی لائبریری
دور رہی۔ لائبریری سے ناول مستعار لے کر پڑھا کرتا تھا، اور میں بے خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ انگریزی اور فرانسیسی کا
کوئی قابل قدر ایسا ناول جو ۱۹۲۰ء سے قبل شائع ہوا ہو اور میری نظر سے نہ گزرا ہو۔ ڈاکٹر رشید حسن عسکری کو
غلط فہمی ہوئی کہ یہ مقصود بالذات نہ تھا، مگر ادھر کئی سال سے ناولوں سے مطلقاً دلچسپی نہیں رہی ہے۔
(د) عبدالحلیم شرر کی "شہزادی ..." سے کیا یہ مراد ہے کہ انھوں نے حضرت سکینہ کے پہلے بعد دوسری کی
عقد ثانی کو شرر کا اختراع سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے جو کچھ لکھا تھا، اس کے ملنے پر نظر ایرانی
محقق نے فرہنگ فارسی میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس کا مصدق ہے۔ آیات بینات کے رد میں جو کتابیں لکھی
گئی ہیں، میں نے پہلے پہل ان کا نام خاص نمبر میں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ ایسی کتابیں جو اہل تشیع اور
اہل سنت کی دل آزاری کا باعث ہوتی ہیں، ہرگز نہیں شائع ہونی چاہئیں۔ ان سے اختلافات بڑھتے ہیں اور مسلمانوں
کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایک بار ڈاکٹر حسن عسکری اور ڈاکٹر فضل اللہ حیدر صاحب یہاں آئے ہوئے تھے۔ میں نے
مقدم الذکر سے پوچھا کہ کیا اہل تشیع کے نزدیک حضرت علی کا مرتبہ کل پیغمبروں سے باستثنائے پیغمبر اسلام
بلند تر ہے۔ ان کا جواب یہ تھا کہ پیغمبروں سے بلند تر نہیں سمجھتے، اوروں سے بلند تر سمجھتے ہیں۔ میں نے مؤخر الذکر
سے پوچھا کہ آپ کیا کہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم لوگ تو بلند تر سمجھتے ہیں۔ اس کے چند مہینوں کے
بعد میں نے دائرۂ ادب کے جلسے میں جو اہل تشیع وہاں جمع تھے سب سے یہی سوال کیا۔ ڈاکٹر حسن عسکری نے
وہی کہا جو پہلے کہا تھا، لیکن اوروں نے بالاتفاق ان کی تردید کی۔ ڈاکٹر حسن عسکری نے میرے عقیدے
کے بارے میں لکھا ہے کہ خلفا کے سلسلے میں ان کی رائے عام اہل سنت کی تحقیق سے کچھ مختلف ہے۔ شاید یہی صحیح ہے۔
میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پیغمبر صاحب چاہتے تھے کہ ان کے جانشین حضرت علی ہوں، لیکن اپنی زندگی میں اس کا
اعلان نہیں کیا اور موت کے وقت اعلان کا موقع نہیں دیا گیا۔ اس کے بعد جس طرح انتخاب ہوا، غلط تھا،
یہ لازم تھا کہ اس کا موقع دینا تھا کہ وہ کسی لمحہ ہوتی۔ انتخاب ہو رہا تھا، اور حضرت ابوبکر و حضرت عمر

ناول (۱) ص ... (الف)

کو نامزد کیا۔ جانشین کا انتخاب وہ خود کریں، یہ پسندیدہ نہ ہو لیکن، حضرت عمر اس کے لیے نامزد ہی نہ تھے
حضرت عمر نے حضرت عثمان اور حضرت علی کو نامزد کیا۔ ان دونوں میں کون جانشین ہوگا اس کا جو طریقہ
انھوں نے اختیار کیا وہ ٹھیک نہ تھا۔ حضرت عثمان اس کے لیے بالکل موزوں نہ تھے۔ اگر وہ حضرت
حضرت علی کو نامزد کرتے، تو اہل سنت و اہل تشیع کا اختلاف نہ پیدا ہوتا اور اسلام کو جن
ان عظیم نقصانات کا سامنا کرنا پڑا تو ان کی وجہ یہی ہے۔ (لیکن یہ بحث اب بھی کہ نقصان ہو چکے)

سکینہ بنت الحسین کے بارے میں شرر کی سرافشانی ۲۰۷۔ ناظرین ایک معاصر ایرانی
محقق کی سرافشانی بھی دیکھیں:
"زنی جمیل و خوش خوی و در مصائب صبور بود۔ خانۂ او مرکز تجمع شعرا و محل مناقشہ و بحث بود۔
وی با شاعران بزرگ ہمچون فرزدق و جریر صلہ عطا میکرد۔ سکینہ نخست بزنی مصعب بن زبیر درآمد
و پس از قتل او زوجۂ عبداللہ بن عثمان گردید و پس از مرگ او زید بن عمر با وی ازدواج کرد
ولی زید بتوجہ سلیمان بن عبدالملک او را طلاق گفت۔ سکینہ در مدینہ درگذشت (۱۱۷) طرۂ سکینہ باوی
منسوب است۔ عبداللہ [illegible] بن عبدالحبیب دو کتاب در احوالش نوشتہ اند" (فرہنگ فارسی
دکتر محمد معین جلد ۵ ص۔)
کیا شرر نے جو کچھ لکھا ہے وہ اسی سے متعلق ہے؟ یہ بات کہ وہ ۱۰ برس کی تھیں کہ زندان یزید میں
ان کی وفات ہوئی، ہندوستان میں گڑھی گئی ہے کہ لوٹنے کھسوٹنے کا موقع ملے۔ ڈاکٹر حسن عسکری صراحت کرتے ہیں
کہ اس معاشرے میں ان کا کیا خیال ہے۔ فرہنگ معین میں سکینہ بضم س وفتح ک ہے، ہندوستان میں زبانوں
پر بلکہ س وکسرہ ک ہے۔ [illegible] اہل تشیع کہ ان کے شوہروں کو باب دشمن حضرت
علی سمجھتے ہیں

# بازیافت

راجندر سنگھ بیدی کا اولین افسانہ 'فرشتہ'



راجندر سنگھ بیدی کی اولیں تحریر ملاحظہ ہو، جب وہ محسن تخلص کے ساتھ لکھتے تھے۔ یہ تحریر غالباً انگریزی کے کسی ادب پارے کا ترجمہ ہے اسکے لیے ہم ڈاکٹر قمر رئیس کے ممنون کرم ہیں

ادارہ

جندر سنگھ بیدی محسن

# فرشتہ

(۱)

طوفان پورے جوبن پر تھا۔ اور برف زمین پر سفید چادر کا نمونہ پیش کر رہی تھی۔

ایک فرشتہ جس کے چہرے پر معصومیت نمایاں تھی۔ رات کے وقت ایک تیرہ و تار گلی میں ترانۂ وحدت گاتا جا رہا تھا۔ تکان کی وجہ سے اس کے دودھیا سفید پر پیٹھ پر پڑے ہوئے تھے۔ اور سینہ میں اُسکا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔

اور اس کی نگاہیں لوگوں کے دروازوں کی زنجیروں پر تھیں۔

چاند چھپا ہوا تھا۔ اور تارے بھی اپنا مُنہ بادلوں کے نقاب میں چھپا بیٹھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فرشتہ اپنی جائے قیام گاہ تک نہ پہنچ سکا۔ کیونکہ آسمان پر چڑھنے کے لئے جو روشنی کی سیڑھیاں تھیں۔ وہ بادلوں نے اٹھا لیں تھیں۔

(۲)

"دروازہ کھولو اور مجھے اپنی آگ کے پاس جگہ دو ...... اُف! کس قدر سردی ہے ...... دروازہ کھولو" فرشتہ نے ایک دروازہ کو کھٹکھٹاتے ہوئے کہا۔

ساری دنیا سو رہی تھی۔ لوگوں نے اِس فرشتے کی چیخ و پکار کو بھی اپنی نیند کے خوابوں کا ایک حصہ سمجھا اور اس پر کسی نے توجہ نہ دی۔

"میں تمہاری خواہش پوری کرونگا ــــ سُنا! لالچی لوگو ...... دروازہ کھول دو، آہ! تم کس قدر سنگدل ہو گئے ہو۔ تمہارے دِل کے تاریک گھر میں رحم کی روشنی نہیں ــــ اُف سردی ...... دروازہ کھولو ــــ جلدی"۔

اب برف باری پہلے سے زیادہ ہونے لگی۔ سرد ہوا کے جھونکے ہر کسی کو سامنے ٹانگوں پر کھڑا ہوتے دیکھ کر اُسے سرنگوں کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تند ہوا کے جھونکے دیار کے بڑے بڑے درختوں کو جنکا سر ثریا تک پہنچا تھا۔ اک خوفناک آواز سے توڑ کر نیچے گرا دیتے تھے۔ اور وہ درخت جو کہ تھوڑی دیر پہلے آسمان کو

چھوتا تھا اب زمین پر پڑا تھا۔

"دروازہ کھولو! میں تمہیں ایک بہت ہی اچھی چیز دونگا — برائے خدا...... مرا — بوڑھی اماں ......مرا" فرشتے نے ایک دروازہ کو کھٹکھٹاتے ہوئے کہا۔

بڑھیا جس کا چہرہ گناہوں کی آلودگی سے پاک وصاف کندن کی طرح چمک رہا تھا۔ اور جس کا نحیف ونزار بدن اس کے دائم المریض ہونے کی علامت تھا باہر نکلی۔

اس نے آوارہ فرشتہ کی پُرسوز اور الم انگیز آواز سُنی۔ اور دروازہ کھول دیا۔

اس لئے نہیں کہ اُسے کوئی بیش قیمت شے ملے گی — مطلق نہیں — وہ دکھی تھی۔ اور ستم رسیدہ لوگوں کے مصائب سے بخوبی واقف تھی۔ اس نے فرشتہ کو اندر بلا لیا۔ آگ جلا کر اس کے نم دار پر جو کہ برودت کی وجہ سے سُن ہو چکے تھے۔ سکھائے اور پھر اُسے سونے کے لئے نرم اور آرام دہ بستر دیا۔

جب مشرق کی طرف افق پر سرخی کی جھلک نمودار ہوئی تو فرشتہ اُٹھا۔ اور جب آفتاب نے اپنا سیاہ لبادہ اُتار کر اپنی نیلی شعاع سے دنیا کو سلام کیا تو فرشتے نے اُٹھ کر بڑھیا کی پیشانی کو بوسہ دیا اور آسمان کو پرواز کر گیا۔

صبح کو لوگوں نے دیکھا۔ بڑھیا تمام دکھوں اور تکلیفوں سے نجات حاصل کر چکی ہے۔

●●

("چندن" جنوری ۳۲ء)

# مشرق وسطیٰ کے سفرنامے

سفرنامہ قسطنطنیہ، عراق و ایران

——— سید حسن عسکری

# حرفے چند

مشرق وسطیٰ، شرق اوسط، مڈل ایسٹ، مغربی ایشیا و شمالی افریقہ ——— مختلف ناموں سے یہ علاقہ ہمارے لیے بڑی مانوس دنیا ہے جس میں عرب ہیں، ترک ہیں، ایرانی ہیں۔

ہندستانی سیاح اس علاقہ میں جاتے رہے ہیں اور اپنے تاثرات قلم بند کرتے رہے ہیں۔ اردو میں ایسے سفرناموں کا بہت اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ انیسویں صدی میں اور پھر ۱۹۴۷ء تک بیسویں صدی میں جو کچھ میسّر ہے اُسے وقتاً فوقتاً پیش کیا جاتا رہے گا۔

'مشرق وسطیٰ' قواعد کی رو سے صحیح نہیں لیکن اردو نے اسے اپنا لیا ہے اس لیے عمومی عنوان یہی رکھا جا رہا ہے: مشرق وسطیٰ کے سفرنامے۔

یہ سفرنامہ ۱۹۲۲ء کے آس پاس لکھا گیا ہے۔ مصطفےٰ کمال پاشا کے ابتدائی عہد کا حوالہ اس میں ملتا ہے۔

——— ع۔ ب

# سفرنامہ قسطنطنیہ عراق و ایران

## فہرست


| | |
|---|---|
| دیباچہ | ۲ |
| از پیرس تا اسلامبول | ۱۹ |
| روانگی از اسلامبول بہ بیروت | ۳۹ |
| از بیروت تا بغداد | ۴۸ |
| از بغداد تا تہران | ۶۱ |



مرتبہ
سید حسن عسکری
ڈپٹی کلکٹر



آقای رضاخان پهلوی فرمانروای ایران

# سفرنامہ

## قسطنطنیہ عراق و ایران

مرتبہ

سید حسن عسکری ڈپٹی کلکٹر

سابق ترجمان قنصل خانہ بغداد و ممبر ملٹری مشن ٹو پرشیا مشہد

باہتمام سید احمد حسین۔ بی۔ اے پروپرائٹر

تعلیمی پریس لکھنؤ میں چھپا



# دیباچہ

عرب کا قول ہے "دُرْ مَعَ الدَّهْرِ كَيْفَ مَادَارَ" یعنی جطرف زمانہ پھرے اُسکے ساتھ پھر جا۔ ایک شاعر نے بھی کہا ہے :-

"زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز"

یہ ظاہر ہے کہ زمانہ مین ہمیشہ انقلاب رہا ہے اور قیامت تک رہے گا، تاریخ کے پڑھنے اور ہر روز کے تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے خیالات مذہب رسوم و عادات مین بھی تقتضاے وقت کے موافق انقلاب ہوا کیا ہی البتہ ہر ملک اور ہر قوم مین ہمیشہ ایسے لوگ ہوئے ہین جنھون نے زمانہ کے ساتھ چلنا اختیار نہین کیا لیکن متاسفانہ ہندوستان کے مسلمانون مین اس قسم کے اشخاص ابتک بکثرت پائے جاتے ہین اور اُنکی خام خیالی اوہام پرستی تقلید آبائی اور استبداد کا یہ نتیجہ ہے کہ مصر شام روم و ایران بلکہ دُنیا کے

تمام مسلمانون مین ہندستان کے مسلمان زیادہ ذلیل وحقیر خیال کئے جاتے
ہین حتی کہ اہل عراق تک اُنکو ہندی بطّال کے لقب سے یاد کرتے ہین اور ایران
مین لفظ ہندی اُسی مفہوم مین استعمال کیا جاتا ہے جس معنی مین لفظ Native
(نیٹیو) اکثر ہندستان کے انگریز استعمال کرتے ہین۔ اسلامبول مین ہندستانی
مسلمان بہت ہی حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے ہین اور بہت سے ترک
اُن سے ملنا یا معاشرت کرنا پسند نہین کرتے اگرچہ بہت سے سیاسی اسباب
کی وجہ سے ہندستان کے مسلمان اور مسلمانون کی نگاہ مین وقعت رکھتے ہون
لیکن اصلی سبب اُنکی جہالت اور قدامت پرستی ہے۔ قدیم عادات و رسوم کو
اگرچہ کیسی ہی مضر و بیہودہ ہون یہ اُن کو ترک نہین کرتے لوازم زندگانی،
آداب معاشرت لباس و خوراک وغیرہ وہی قائم رکھنا چاہتے ہین جو ہندوستان
مین صدیون سے ہین ہر امر اور ہر فعل کو اسلام بیچارے کی طرف منسوب
کرتے ہین خواہ اُسے اسلام سے تعلق ہو یا نہ ہو۔ ہندوستان کے تمام مسلمان
یہان تک کہ علما بھی یورپ کا بنا ہوا کپڑا استعمال کرتے ہین کیونکہ وہ سستا
اور عمدہ ہوتا ہے لیکن انگریزی قطع کا بنا ہوا لباس مثلاً کوٹ پتلون بُرا
سمجھا جاتا ہے حالانکہ مین نے خود بہت سے مصری ترکی و ایرانی علمار کو

پتلون پہنے ہوئے دیکھا ہے۔ مشہد مقدس مین مسجد گوہر شاد کے متولی اور امام جماعت کو مین نے ہمیشہ عمامہ وقبا کے ساتھ پتلون پہنے ہوے دیکھا، میز پر چھری کانٹے کے ساتھ کھانا مذموم بلکہ شائد حرام خیال کیا جاتا ہے اور ہاتھ سے کھانا سنت قرار دیا جاتا ہے لیکن جَو کے بغیر چھنے آٹے کی روٹی نمک یا سرکہ یا چھوارہ کے ساتھ کھانا سنت نہین سمجھا جاتا۔ تعجب ہے کہ قورمہ پلاؤ شامی کباب۔ متنجن۔ مزعفر۔ مرغ مسلم تو جائز بلکہ واجب موکد لیکن میز پر چھری کانٹے سے اُبلا ہوا گوشت اُبلی ہوئی ترکاری بدنما ڈبل روٹی کھانا ناجائز بلکہ حرام مؤبد ہو۔ اسی سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کے سلمانون مین ظاہر پرستی بہت ہی زیادہ اور حقیقت شناسی بہت ہی کم ہے اور یہ فقط جہالت، اخلاق کی کمزوری اور اوہام پرستی کی علامت ہے۔ میرا مقصود یہ ہرگز نہین ہے کہ ہر شخص کو کوٹ پتلون ہی پہننا یا میز ہی پر چھری کانٹے سے کھانا چاہیئے لیکن اگر کوئی شخص ایسا کرنا چاہے تو اُسکے فعل کو خلاف مذہب نہ قرار دینا چاہیئے۔ ہندوستان کے سلمانون مین یہ تنگ خیالی وظاہر پرستی زیادہ تر ہندوؤن کی معاشرت وعورتون کی جہالت سے پیدا ہوگئی ہے عورتون مین یہ ناقابل علاج جہالت اسوجہ سے ہے کہ اُن کی نانیان،

دادیان، اصلاً ہندو تھین جنکو اُن کے اجداد نے جب ہندوستان مین آئے تھے مسلمان کر کے اُن کے ساتھ عقد کر لیا تھا، وہ مسلمان تو ہو گئی تھین لیکن اُن کے خیالات، عادات، رسوم و آداب وہی رہے جو ہندؤن کے تھے۔ چنانچہ وہی قدیم خیالات و مراسم اب بھی باقی ہین اور بچے لڑکین سے اُنھین کو سیکھ لیتے ہین۔ اِسلیے مسلمانون کو اپنی عادتون کی اصلاح اور اخلاق کی تہذیب اور آداب معاشرت کی ترقی کیلئے دو باتین لازم ہین اوّلاً نوجوان تعلیم یافتہ مسلمانون کو چاہیے کہ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کرین اور دوسرا امر جو اُس سے بھی زیادہ ضروری ہے یہ ہے کہ عورتون کی تعلیم و تربیت مین پوری کوشش کرین۔

جو نوجوان حضرات ممالک اسلامیہ کا سفر اختیار کرین اگر وہ ناکتخدا ہون تو اُن کو چاہیے کہ کسی اسلامی ملک کی تعلیم یافتہ عورت سے نکاح کر کے اپنے ہمراہ ہندستان لائین تاکہ اُن کے امور خانہ داری مین اصلاح و ترقی ہو اور بچون کی تعلیم و تربیت عمدہ طرح سے ہو سکے۔ اس سفر مین مجھکو یہ بھی معلوم ہوا کہ اب اُن ملکون کی عورتین ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانون کے ساتھ نکاح کرنے سے اسقدر پرہیز نہین کرتین جیسا پہلے کیا کرتی تھین۔ البتہ

یہ وہی شخص کرسکتا ہے جو اُن کے لئے گرمیون مین راحت کا سامان مہیا کرسکے اور گردش و تفریح کے لئے گاڑی یا موٹر رکھ سکے۔ وہان کی عورتین یہان کی عورتون کی طرح مکان کی چار دیواری مین قیدیون کی طرح زندگی نہین بسر کرسکین گی اور نہ اُن کی صحت کیلئے ایسا طریقہ زندگانی مفید ہوگا۔ اگر کوئی شخص اُن کو گرمیون مین پہاڑ پر بھیجنا چاہے تو بآسانی کر سکے گا۔ کیونکہ وہ زنانے بورڈنگ ہوس یا ہوٹل مین بغیر کسی زحمت کے تنہا قیام کرلین گی۔

اس مقام پر یہ بھی ذکر کردینا غیر مناسب نہین ہے کہ حتی الامکان ہر ملازم گورنمنٹ بعد پنشن لینے کے کسی اسلامی ملک میں جاکر قیام اختیار کرے۔ ہر مسلمان خصوصًا شریف طبقون کے مسلمانون کو ہمیشہ یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہندوستان انکا آبائی وطن نہین ہے اور انکے اجداد عمومًا دوسرے ملکون سے ہندوستان آکر آباد ہوگئے تھے اسلئے جب وہ تحصیل معاش سے دست کشی اختیار کریں تو انکو چاہیے کہ اپنے اصلی وطن کو واپس جائیں جس طرح انگریز بعد پنشن لینے کے انگلستان چلے جاتے ہیں جن لوگون نے ایسا کیا ہے مثلاً سید امیر علی صاحب نے انگلستان مین اور بعض نوابون نے عراق مین اور ایک خاندان نے طہران مین قیام اختیار کرلیا ہے وہ لوگ وہانکے اصلی باشندون کی طرح نہایت ہی اچھی صحت و آرام و راحت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہین نادرشاہ نے اپنے سپاہیون کو وصیت کی تھی کہ ہندستان مین کبھی قیام نہ کرنا ورنہ تم لوگ بھی

مثل ہندوستانیوں کے سست آرام طلب کمزور و بزدل ہوجاؤ گے افسوس ہے
کہ مسلمانون نے اُسپر عمل نہین کیا لیکن انگریز نادر شاہ کی وصیت کے مطابق
چل رہے ہین - جن پارسیون نے ہندوستان مین قیام اختیار کرلیا ہے وہ
بہ نسبت ایران کے باشندون کے بہت ہی کمزور و نحیف الجثہ معلوم ہوتے ہین
لیکن اگر وہ عموماً یورپین طریقہ زندگانی کا اختیار نہ کرتے تو اور بھی بدتر ہوجاتے
چونکہ اُن مسلمانون سے جو خود سن رسیدہ اور جنکے اخلاق بوسیدہ اور
عادات پوسیدہ (پرانے) اور قواے جسمانی از کار افتادہ ہوگئے ہین کسی اصلاح
و ترقی کی اُمید نہین کی جاسکتی اسلئے میری عرض صرف نوجوان مسلمانون کی
خدمت مین ہے کہ وہ خواب غفلت سے بیدار ہوکر خود کوشش کرین اور
دوسرون کو جگائین - میرے نزدیک بہت ہی مؤثر اور آسان طریقہ اُن کے
بیداری کا یہ ہے کہ جو اُن مین سے صاحب استطاعت ہو اُسکو چاہیے کہ تعلیم کے
تکمیل کرنے یا کسی ملازمت یا پیشہ اختیار کرنے کے بعد کم سے کم کسی ایک
اسلامی ملک کا سفر اختیار کرے تاکہ وہان کے مسلمانون کے اخلاق و عادات
و مذہبی اصلاحات کو دیکھکر فائدہ اُٹھائے اور ہندوستان واپس آکر اُن کے
جاری کرنے کی کوشش کرے چنانچہ آیہ شریفہ فلولا نفر من کل فرقۃ طائفۃ

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ مین اسی اُمر کی طرف حکیم مطلق نے اشارہ فرمایا ہے۔

مین نے محض اسی غرض سے یہ مختصر سفرنامہ جوانون کے لئے بطور Guide book. یعنی ہدایت نامہ کے لکھا ہے لیکن جو حضرات یہ چاہتے ہین کہ ہندوستان سے باہر قدم نہ اُٹھائین اور محض سفرنامون کو پڑھکر ممالک اسلامیہ کے متعلق اطلاعات حاصل کرین اُن کو اِس سفرنامہ کے پڑھنے سے چندان فائدہ نہوگا کیونکہ اِس مین عمارات و مناظر طبیعی وغیرہ کا مفصل بیان جو اکثر سفرنامون مین ہوا کرتا ہے نہین ہے اور مین نے قصداً اُن کے ذکر کرنیسے احتراز کیا ہے۔

میرے نزدیک یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی اسلامی ملک کے سفر کرنیسے پہلے انگلستان کا سفر کرلینا نہایت ہی مفید ہوگا کیونکہ ہندوستان کے عام مسلمانون کا لباس و طرز معاشرت وغیرہ دوسرے اسلامی ملکون سے اسقدر مختلف ہوگیا ہے کہ اگر ایک ہندوستانی پہلی مرتبہ اُن ملکون مین جائے گا تو اسکو بہت سی مشکلین پیش آئین گی نہ بہ آسانی وہان کے لوگون سے معاشرت کر سکے گا، نہ وہان کی تعلیم یافتہ سوسائٹی مین عزت و احترام کے ساتھ داخل کیا جائے گا لیکن اگر اُسنے انگلستان کا سفر کرکے یورپ کے

عام طرز معاشرت سے واقفیت حاصل کرلی ہے تو اُسکو ایشیا کے کسی ملک میں زیادہ زحمت نہ اُٹھانی پڑے گی۔ کیونکہ ایشیائی ممالک اور مصر اسلامبول میں بجز بعض خصوصیات کے عام طور پر طرز معاشرت مغربی جدید طریقے کا ہو گیا ہے وہاں کے عام مسلمانوں اعلےٰ سے ادنیٰ اور عالم سے جاہل تک کم و بیش زمانہ کی رفتار سے واقف ہو گئے ہیں جیسا کہ سر سید احمد خاں مرحوم ہندوستان کے زمانۂ جاہلیت میں زمانہ کے رنگ کو پہچان گئے تھے اور اسلئے اسکی رفتار کے ساتھ چلنے پر کاربند ہوئے۔

بعد اس مختصر بیان کے اب چند ضروری امور کا ذکر کرتا ہوں جنکا سفر کرتے وقت لحاظ رکھنا چاہیے۔

(۱) ہندوستان سے روانہ ہونے سے پہلے پاسپورٹ یعنی پروانہ راہداری حاصل کر لینا چاہیے اور جن ملکوں کے لئے ویزہ (Visa) یعنی اجازت کی ضرورت ہو اُس ملک کے قونسل کے جو ہندوستان میں ہو دستخط پاسپورٹ پر کرا لینا چاہیے یا پاسپورٹ کو ہر وقت اپنے پاس رکھنا چاہیے کیونکہ اگر کسی ملک میں ڈاک خانہ یا ٹامس کوک کے دفتر یا بنک مین خط یا روپیہ لینے جائیگا تو سب سے پہلے آپ سے پاسپورٹ مانگا جائیگا۔

(۲) جس ملک کا سفر کرنا مقصود ہو وہاں کے متعلق تمام ضروری باتوں کی اطلاع کسی گائڈ بک یعنی ہدایت نامہ یا سفرنامہ کو پڑھ کر یا کسی شخص سے جسنے وہاں کا سفر کیا ہو حاصل کرلینی چاہیئے

(۳) ٹامس کوک اور ایسٹرن ٹرنسپورٹ کمپنی Eastern Transport Company سے جنکے دفتر بمبئی میں ہیں سفر کے متعلق کافی اطلاعات حاصل ہو سکتے ہیں اور اُنکے ذریعہ سے روپیہ اور خط کے بھیجنے اور ملنے کا عمدہ انتظام ہوسکتا ہے اگر کوئی شخص بوشہر کے راستہ سے شیراز و اصفہان جانا چاہے تو روپیہ کا انتظام بنک شاہنشاہی ایران کے ذریعہ سے جسکی ایک شاخ بمبئی میں ہے بآسانی ہو سکتا ہے اور اگر کوئٹہ کے راستہ سے مشہد مقدس کا سفر مقصود ہو تو دزداب میں اس بنک کی ایک شاخ ہے جہاں چک اور ڈرافٹ وغیرہ ملسکتے ہیں بغداد میں بھی بنک شاہنشاہی ایران کی ایک شاخ ہے اسلئے بمبئی میں بغداد کیلئے بھی ڈرافٹ ملسکتا ہے۔

(۴) لباس یوروپین وضع کا ہونا چاہیئے کیونکہ اسلامی ملکوں میں بھی اسی قسم کا لباس عموماً استعمال ہونے لگا ہے لیکن یورپ میں انگریزی ٹوپی اور اسلامی ملکوں میں وہاں کی مخصوص ٹوپیوں کا پہننا زیادہ مناسب ہوگا۔ گمرک "یعنی Customs. کی زحمتوں سے بچنے کے لئے حتی الامکان تھوڑا لباس ساتھ لیجانا چاہیئے۔ سفید کوٹ پتلون کا دوسرے ملکوں میں بہت ہی کم استعمال

ہوتا ہے لیکن اگر کسی ریشمی کپڑے کا ہو تو یورپ ایشیا دونوں جگہ گرمیوں میں پہنا جاسکتا ہے۔ ایک بڑا کوٹ فراک یا مارننگ یا ٹرکش مع ایک دھاری دار پتلون کے ضرور ہمراہ ہونا چاہئے کیونکہ ایران و اسلامبول میں معزز لوگوں کے پاس جاتے وقت ایسے لباس کی ضرورت ہوتی ہے۔

مختلف رنگوں کی ٹائی کا استعمال بہت کم ہے۔ حتی الامکان ہمیشہ سیاہ ٹائی لگانا چاہیئے۔

جوتے سیاہ اور عمدہ قسم کے ہوں کیوں کہ ایران اور دوسرے ملکوں میں لوگ عموماً اچھے قسم کے جوتے پہنتے ہیں۔ بارش کے زمانہ میں جوتے کو کیچڑ سے بچانے کے لئے گالش کی ضرورت ہوتی ہے اور اُن ملکوں میں وہ بکثرت ملتا ہے اس لئے ہندوستان سے ساتھ لیجانے کی ضرورت نہیں۔ اُن ملکوں میں کرتے و پائجامے صرف سوتے وقت پہنے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی سے خالی کرتا اور پائجامہ پہنے ہوے ملے تو نہایت ہی بدتہذیب سمجھا جائے گا۔ میں نے معمولی ایرانیوں کو دیکھا ہے کہ گھر میں تعطیل کے دن بھی کرتے پائجامے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ صبح کو ہاتھ منہ دھوکر پورا لباس پہن لیتے ہیں اور شب کو سوتے وقت تک اسی لباس کو پہنے رہتے ہیں اسلئے یہاں سے بہت سے کرتے اور پائجامے ہمراہ نہ لیجانا چاہیئے۔ ضروری کپڑوں

کے علاوہ بستر۔ گلاس۔ لوٹا۔ اور دو چھوٹے پورٹ مینٹو یا چمڑے کے دو سوٹ کیس بھی ہمراہ ہونا چاہیئے۔

(۵) ہر ملک کے گمرک یعنی (Customs.) کے قواعد میں بہت تھوڑا سا فرق ہے۔ اسلئے ہر ایک کو علٰحدہ علحدہ لکھنا بیکار ہے۔ البتہ چند ضروری باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ سیگار اور سیگرٹ بہت کم ہمراہ لیجانا چاہیئے روزمرہ کے استعمال کے لئے جہاں چاہیئے وہیں خرید لیجیے۔ نشہ کرنے والی چیزیں افیون وغیرہ۔ اسلحہ اور خوشبودار چیزیں مثل عطر وغیرہ کے ہمراہ لیجانا ممنوع ہے البتہ سر میں لگانے کے لئے معمولی تیل مستثنیٰ ہے۔ کپڑے جوتے وغیرہ حتی الامکان استعمال شدہ ہوں۔ اگر نئے ہوں تو اُن کو چند روز استعمال کر لینا چاہیئے۔ اگرچہ شخصی استعمال کی چیزوں پر گمرک نہیں ہے لیکن بعض وقت گمرک کے ملازمین ناواقف سیاحوں کو دھوکا دے کر کچھ لے لیتے ہیں۔ یا کم سے کم اُن کو زحمت دینے کے لئے دیر تک اُنکی ہر چیز کا معائنہ کرتے ہیں مجھ کو تمام سفر میں گمرک کے متعلق جسقدر تکلیف کراچی مین ہوئی وہ نہ بغداد نہ اسلامبول نہ شام نہ ایران نہ فرانس نہ اٹلی نہ کسی دوسرے یورپین مقام پر یہ امر نہایت ہی قابل افسوس ہے کہ ہندوستانی ملازمین گورنمنٹ دوسرے ملکوں کے

ملازموں سے زیادہ تر تکلیف دہ ہوتے ہیں اور اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابھی ہندوستان کے لوگوں میں بالکل سلف گورنمنٹ یعنی استقلال داخلی کی قابلیت نہیں ہے۔

(۶) چونکہ ہر ملک میں مختلف سکوں کا رواج ہے اس لئے انگریزی پونڈ کے نوٹ یا ڈرافٹ کا ہمراہ لیجانا زیادہ مناسب ہے کیونکہ ہر ملک میں پونڈ باسانی چلجاتا ہے۔ بعض مختلف سکوں کے نام اور اُنکی قیمت یہاں ذکر کیے جاتے ہیں

فرانس میں فرانک چلتا ہے جسکی قیمت قبل از جنگ ۲۵ فرانک فی پونڈ تھی اور اب ایک پونڈ کی قیمت سو فرانک سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔

اٹلی میں لیر چلتا ہے اور ایک پونڈ کی قیمت قریب ۱۲۰ لیر کے ہوگئی ہے

بلجیم و سوئزرلینڈ میں بھی فرانک چلتا ہے۔ بلجیم میں اُسکی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے لیکن سوئزرلینڈ میں اسکی قیمت قریب قریب ایک ہی حالت پر باقی ہے جہاں اُسکی قیمت ۲۵ فرانک سے کچھ زائد ہے۔

مصر میں انگریزی و مصری پونڈ دونوں چلتے ہیں اور مصری پونڈ کی قیمت انگریزی پونڈ سے کچھ زیادہ ہے۔

اسلامبول میں لیرہ عثمانی و پیاسٹر چلتا ہے اور سو پیاسٹر کا ایک لیرہ ہوتا ہے

ان دنوں انگریزی پونڈ کی قیمت ۸ لیرہ عثمانی ہوگئی ہے۔ فرانک بھی یہاں بہ آسانی چلجاتا ہے۔

بیروت میں شام کے لیرہ و پیاسٹر کا رواج ہے اور یہاں کا ایک لیرہ دو لیرہ عثمانی کے برابر ہے انگریزی پونڈ و فرانک بھی یہاں بہ آسانی چلجاتا ہے دمشق میں۔ بیروت کا لیرہ کچھ کم قیمت پر لیا جاتا ہے۔ وہاں نقد سکہ اور نوٹ کی قیمت میں بھی فرق ہے مثلاً ایک لیرہ دمشقی سو پیاسٹر کا ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایک لیرہ کا نوٹ بھنایا جائے تو سو پیاسٹر سے کچھ کم پر چلے گا۔ اسی شہر دمشق کو جو شام کا پایۂ تخت تھا شام بھی کہتے ہیں۔

بیت المقدس میں انگریزی پونڈ و فرانک اور دوسرے ملکوں کے بھی سکے چلتے ہیں۔

بغداد میں اب ہندوستانی روپیہ کا رواج ہے لیکن انگریزی پونڈ اور ایرانی قران بھی بہ آسانی بھن جاتا ہے۔

ایران میں قران چلتا ہے اور ایک پونڈ انگریزی کی قیمت ان دنوں قریب چالیس قران کے ہے اور ایک روپیہ کی قیمت تین قران ہے۔ لیکن روپیہ ایران میں نہیں بھن سکتا ہے۔ انگریزی پونڈ کے بھنے میں بھی دقت ہوتی ہے لیکن

بنک شاہنشاہی میں دے لیا جاتا ہے۔ ایک تومان دس قران کا ہوتا ہے۔ لیکن کوئی سکہ ایک توماں کا نہیں ہے۔ قران کے دو سکے ہیں ایک ایک قران کا ہے اور دوسرا دو قران کا۔ پہلے کو ایک ہزاری اور دوسرے کو دو ہزاری بھی کہتے ہیں۔ نصف قران اور ربع قران کے بھی سکے ہیں۔ ایک قران بیس شاہی کا ہوتا ہے۔ شاہی کو صِنار بھی کہتے ہیں جو مخفف ہے صد دینار کا۔ نیم شاہی کا بھی سکہ ہے جو ہندوستان کے ڈبل کی طرح ہوتا ہے۔

(۷) زبان کا مسئلہ بہت ہی مشکل اور ضروری ہے۔ ہندوستانیوں سے یہ امید رکھنی کہ وہ فرنچ یا عربی جدید یا ترکی یا فارسی جدید ہندوستان میں رہ کر سیکھ سکیں غیر ممکن ہے البتہ اگر انگریزی داں شخص فرنچ سیکھنا چاہے تو چھ مہینے میں بقدر ضرورت کے جان سکتا ہے۔ لیکن تلفظ کرنے میں ضرور اسکو دشواریاں پیش آئینگی۔ اگر کوئی شخص کچھ عربی و فارسی جانتا ہو تو اُن ملکوں میں جاکر آسانی سے وہاں کے روزمرہ بولنے کی زبان سیکھ سکتا ہے لیکن چونکہ اب انگریزی قریب قریب ہر ملک میں وہاں کے تعلیم یافتہ لوگ کم و بیش سمجھ لیتے ہیں اسلئے زبان کی ناواقفیت سے اسقدر دقت نہیں اُٹھانی پڑیگی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ اسلامبول میں تعلیم یافتہ لوگ فارسی بقدر ضرورت کے

سمجھتے اور بول لیتے ہیں۔ اسلئے اگر کوئی ہندوستانی صرف فارسی جانتا ہو تو
تعلیم یافتہ لوگوں سے ملنے میں کچھ آسانی ہوجائے گی لیکن عام دکانوں اور
قہوہ خانوں میں فارسی سے کچھ مدد نہیں ملے گی۔

(۸) ہر ملک کے ضروری آداب سے بھی فی الجملہ واقفیت ہونی چاہیئے
مثلاً ایران میں سلام کرنے کا طریقہ صرف گردن کو تعظیماً جھکا کر آہستہ سے سلام علیک
کہنا ہے۔ اسلامبول و شام و عراق میں سلام کرتے وقت ہاتھ کو طرف سینہ و پیشانی
کے لیجانا چاہیئے۔ لیکن کسی ملک میں رخصت ہوتے وقت سلام علیک نہیں
کہا جاتا اِس بدعت حسنہ کا رواج صرف ہندوستان میں ہے۔ علیگڈھ کالج
میں بھی یہ طریقہ جاری ہے۔ خدا جانے اسکا رواج ہندوستان میں کیونکر ہوا۔
انگلستان و ایران میں بات کرتے وقت ہاتھوں کو زیادہ حرکت دینا خلاف
تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ ڈکارنا۔ جمھائی لینا۔ زمین پر تھوکنا یا ناک صاف کرنا۔
ہر ملک میں سوائے ہندوستان کے بہت ہی بُرا خیال کیا جاتا ہے۔
ہر شخص تھوکتے اور ناک صاف کرتے وقت رومال استعمال کرتا ہے۔ ہندوستانیوں کو
چاہیئے کہ ان امور کا ہندوستان میں خیال رکھیں اور جب دوسرے ملکوں میں
جائیں تو زیادہ تر اُنکا لحاظ کریں تاکہ حقارت و ذلت کے ساتھ نہ دیکھے جائیں

مختصر یہ ہے کہ جس ملک میں انسان جائے وہاں کے آداب کو غور سے دیکھکر
اُسپر عمل کرے جیسا میں نے اوپر ذکر کیا ہے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ اسلامی ملکوں
کی سیاحت کرنے سے پہلے انگلستان کا سفر کرلیا جائے۔ وہاں کا سفر نہایت ہی
آسان ہے بمبئی سے "پے اینڈا و کمپنی (P & O. Co.) کے کسی جہاز میں سکنڈ
کلاس کا ٹکٹ ۵۶ یا ۶۰ پونڈ کو لیکر سیدھے لندن چلے جائیے یا مارسلیس سے
اُترکر ریل کے ذریعہ سے پیرس ہوتے ہوے لندن جائیے۔ لیکن میرے نزدیک
مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کا پہلا سفر ہو اور فرنچ زبان سے بھی ناآشنا ہو
اُسکو چاہیئے کہ سیدھا انگلستان ہی چلا جائے اور واپسی کے وقت پیرس کو
دیکھلے۔ پیرس سے اگر چاہے تو بذریعہ اکسپرس اورینٹ ریل کے تین دن
میں اسلامبول چلا جائے۔ یہ ریل ہر روز پیرس سے ایک مرتبہ شب میں روانہ
ہوتی ہے اور اُسمیں صرف اول درجہ ہوتا ہے اور شب کو سونے کا سامان
یعنی (واگون دولی (Wagon de lit.) مہیا کیا جاتا ہے۔ کرایہ
قریب چودہ سو فرانک یعنی ۵۶ پونڈ کے ہے۔ خوراک کا صرفہ اِسکے علاوہ ہوگا۔
جن ملکوں میں ریل ہوکر جائے گی اُن ملکوں کا ویزہ (Visa.) پاسپورٹ پر
ہونا چاہیئے۔ ان زحمتوں سے بچنے اور تین دن تک ریل میں قید رہنے سے

بہتر ہوگا کہ مارسلیس سے جہاز میں سوار ہو کر پانچ چھ روز میں اسلامبول چلا جائے
اول درجہ جہاز کا کرایہ مع خوراک کے قریب بارہ تیرہ پونڈ اور سکنڈ کلاس کا
قریب آٹھ پونڈ کے ہے پھر اسلامبول سے بذریعہ ریل کے حلب اور حلب سے بذریعہ
موٹر کے بیروت چلا جائے لیکن دریا کا سفر زیادہ مناسب ہے۔ اسلامبول سے
کسی جہاز میں سوار ہو کر چار پانچ روز میں بیروت چلے جائیے وہاں کا بھی
اول درجہ جہاز کا کرایہ قریب بارہ تیرہ پونڈ کے ہے اور سکنڈ، تھرڈ کا
اور بھی کم۔ بہت سے لوگ سکنڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں اور کافی آرام
ملتا ہے۔ بیروت سے اگر دل چاہے تو یافہ (yafa) اور یافہ سے
بیت المقدس چلے جائیے اور وہاں سے بیروت واپس آکر تین گھنٹے میں
موٹر کی سواری سے دمشق جائیے۔ دمشق سے اگر دل چاہے تو موٹر میں
سوار ہو کر ۲۶ گھنٹہ میں صحرا کو طے کر کے بغداد چلے جائیے یا ریل کے ذریعہ سے
تین چار روز میں مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہو جائیے۔ بیت المقدس
سے سیدھے بغداد جانے کا راستہ بھی کھل گیا ہے اور Nairn Coy
کی موٹر بتیس ۳۲ گھنٹے میں پہونچ جاتی ہے لیکن اگر شب کو راستہ میں قیام کرے تو
البتہ اس سے زیادہ وقت صرف ہوگا۔ دمشق سے فرنچ کمپنی کی موٹر Palmyra

پالمیرا ٹھہرتی ہوئی بغداد جاتی ہے لیکن Nairn Coy کی موٹر سیدھے بغداد چلی جاتی ہے۔ دونوں کمپنی ۲۵ پونڈ کرایہ فی شخص لیتی ہیں۔ بغداد سے طہران تک پانچ دن میں موٹر جاتی ہے اور کرایہ بھی ۲۵ پونڈ ہے طہران سے مشہد، اصفہان و شیراز جانے کے لئے انگریزی یا فرنچ کمپنی کی موٹر نہیں چلتی۔ لیکن ایرانیوں۔ قفقازی ترکوں اور بغدادی عربوں کی موٹریں بکثرت اُن مقامات کو جاتی ہیں۔ مصر جانے کا راستہ ہر شخص کو معلوم ہے اس لئے اُس کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب میں یہاں سے اپنا سفرنامہ پیرس سے طہران تک کا چند فصلوں میں لکھتا ہوں :-

---

## فصل اوّل از پیرس تا اسلامبول

میں ۱۴ ستمبر روز یکشنبہ کو پیرس سے سات بج کر پچاس منٹ شب کی گاڑی سے مارسلیس کو روانہ ہوا۔ ۲٦۵ فرانک کو اوّل درجہ کا ٹکٹ لیا۔ یہ گاڑی اکسپریس تھی۔ اس میں صرف اول درجہ تھا۔ سکنڈ کلاس کا کرایہ

پیرس سے مارسلیس تک ۲۱۷ فرانک ہے۔ اسباب کے بک کرانے میں جو تین چمڑے کے سوٹ کیس اور ایک بستر تھا، ۳۰ فرانک دینے پڑے۔ صبحکو ۸ بجے مارسلیس پہونچا۔ اسیوقت ایک موٹر میں بندرگاہ پر گیا اور موٹر والے نے ۲۵ فرانک لیا۔ یہ کرایہ معمول سے زیادہ تھا کیونکہ فرنچ مثل انگریزی ٹیکسی والوں کے ایماندار نہیں ہوتے اور ایسے موقع پر اجنبی سے زیادہ لے لیتے ہیں۔ مارسلیس سے قسطنطنیہ تک اول درجہ جہاز کا کرایہ ۱۲۸۷ فرانک ہے۔ یا فرنچ (Pacquet) پاکے کمپنی کا جہاز تھا جس میں سوار ہوا۔ میرے کیبن (Cabin.) میں جواہرات کا ایک ارمنی تاجر تھا جو پیرس سے اسلامبول کو جارہا تھا۔ جہاز بجائے ۱۱ بجے چلنے کے ڈھائی بجے دن کو چلا۔ جہاز میں مختلف قوم کے لوگ سوار تھے۔ منجملہ دیگر مسافروں کے اسلامبول کی سفارت انگریزی کا سکریٹری دو تین امریکن اور دو نارویجین تھے۔ چند ترک بھی جہاز پر تھے جو مدت تک نیویارک میں رہ کر اب اسلامبول واپس جارہے تھے۔ ایکنے انمیں سے ایک نارویجین عورت کے ساتھ نکاح کرلیا تھا اور اُس سے دو بچے تھے۔ جو اُسکے ہمراہ جارہے تھے۔ چونکہ وہ صورت اور لباس سے بالکل یورپین معلوم ہوتا تھا اسلئے مجھے پہلے نہیں معلوم ہوا کہ وہ ترک ہے۔ دو تین روز کے بعد

اثنائے گفتگو میں اُسنے اپنا نام فتح اللہ بتلایا اور یہ بھی کہا کہ اسکی یورپین بیوی مسلمان ہوگئی ہے۔ اِن لوگوں کے ہمراہ ایک اور عورت تھی جو یوروپین لباس پہنے ہوئے تھی بجز اِسکے کہ بجائے انگریزی ٹوپی کے اُسکے سر پر ایک عصابہ تھا اور پردہ نہیں کرتی تھی۔ یہ مراکش سے آرہی تھی عربی اور ترکی خوب جانتی تھی۔ اور کچھ فرنچ بھی سمجھ لیتی تھی لیکن انگریزی نہیں جانتی تھی۔ ایک جوان یہودی بھی اسلامبول جارہا تھا جو تقریباً ہر زبان بول سکتا تھا اُسنے کہا کہ اسکا ایک دوست الٰہ آباد میں ہے جسکے پاس جواہرات کی دکان ہے۔ اور ایک اور بھی ترک اسی جہاز پر تھا جو بالکل یوروپین معلوم ہوتا تھا اور ہمیشہ فرنچ مسافروں کے ساتھ گانے بجانے میں مشغول رہتا تھا۔ اثنائے کلام میں معلوم ہوا کہ وہ ترک تھا اور اُسنے مجھسے ترکی اور فرنچ میں ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق بہت کچھ گفتگو کی۔ وہ سینما کا فلم اوپریٹر تھا اور اسلامبول فلم لینے جارہا تھا۔ ایک ڈینش سے بھی جہاز پر ملاقات ہوئی جو ڈنمارک کے تھیوسافیکل سوسائٹی کا سکریٹری تھا اور ڈینش گورنمنٹ کا سفیر ہوکر قسطنطنیہ جارہا تھا۔ اُسنے گاندھی اور ٹاگور کی بہت تعریف کی اور کہا کہ اُسکا ارادہ ہندوستان کی مسافرت کا ہے کیونکہ اُسکے سوسائٹی کی ایک شاخ مدراس کے کسی شہر نوالی میں ہے۔ اُسکو علم تصوف اور علم الارواح کا بہت شوق معلوم ہوتا تھا اور اکثر مجھ سے ان مسائل پر گفتگو

کیا کرتا تھا۔ اُس سے جب زیادہ بے تکلفی ہو گئی تو اُس نے مجھسے اسٹائنر (Steinner.) کے طریقہ تصوف کے متعلق بہت کچھ گفتگو کی۔ اُس سے معلوم ہوا کہ قسطنطنیہ میں ایک سوسائٹی اسٹائنر کے تصوف کی ہے اور وہ خود بھی اُسکا ممبر تھا۔ اُسنے مجھ سے قسطنطنیہ کے ایک عالم شیخ عبدالوہاب آفندی کی بہت تعریف کی اُنکا مجھکو پتہ بتایا اور کہا کہ اُنسے ضرور ملنا۔ چنانچہ میں قسطنطنیہ میں اُنسے ملا، اُنکی ملاقات کا ذکر آیندہ کروں گا۔ اسی جہاز پر ایک یہودن سے ملاقات ہوئی جو قسطنطنیہ کے کسی وکیل کی بیوی تھی اور کئی زبانیں جانتی تھی۔ یہ عورت نہایت ہی ہوشیار و کاروباری معلوم ہوتی تھی اور ہر شخص سے اپنے شوہر کی تعریف کرتی تھی اور سفارش کرتی تھی کہ اُس سے ضرور ملو اور کہتی تھی کہ اُسکے شوہر سے قسطنطنیہ کے بڑے بڑے معزز حکام و ممبران پارلیمنٹ سے ملاقات ہے۔ اگر کسی قسم کی دشواری پیش آئے گی تو وہ ضرور مدد دے گا۔ وہ غالباً ترکوں کی طرف سے محکمہ راز میں ملازم تھی۔ اسی جہاز میں دو جوان لڑکیوں کو روز دیکھتا تھا جنسے کئی دن کے بعد کسی موقع پر گفتگو ہوئی۔ وہ انگریزی۔ فرنچ۔ جرمنی اور ترکی بول لیتی تھیں۔ مدت سے یورپ میں تعلیم پاتی تھیں دو دن کے بعد معلوم ہوا کہ وہ دو ترکن بہنیں تھیں اور اپنے والدین سے ملنے قسطنطنیہ جارہی تھیں

بڑی بہن سے ریاضی کے کسی مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ اثنائے کلام میں میں نے علم مثلث [ Trignametry ] کے ایک مسئلہ پر نہایت بے اعتنائی سے اظہار خیال کیا۔ اُس نے مجھے فوراً ٹوک دیا اور ہنسکر مجھکو میری غلطی کیطرف توجہ دلائی۔ مجھکو نہایت تعجب ہوا اور میں نے دل میں نادم ہوکر اپنے مطلب کی تصحیح کی اُس سے حقوق زن و شو اور تعلیم و حقوق نسواں کے مسائل پر اکثر گفتگو ہوا کی اُسنے کہا کہ مرد چاہتے ہیں کہ عورتیں اُنکی محکوم رہیں اور اپنی معاش کو آزادانہ طریقہ پر حاصل کرنے سے محروم رہیں۔ ہندستان کی مسلمان عورتوں کی حالت کو سنکر اُسنے بےحد اظہار تاسف کیا۔ میں نے کہا کہ اگر تعلیم یافتہ ترک عورتیں ہندوستان جائیں اور وہاں کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ساتھ نکاح کریں تو وہ ہندستان کی عورتوں کے تعلیم و تربیت میں بہت کچھ مدد دے سکیں گی اُسنے کہا کہ جب پہلے ترک عورتیں زیادہ آزاد خیال اور تعلیم یافتہ نہیں تھیں اُسوقت ہندوستان جانے میں شاید تعرض کرتی رہی ہوں لیکن اب وہ غالبا وہاں کا جانا ناپسند نہ کرینگی۔ یہ ایک نمونہ وہانکی تعلیم یافتہ عورتوں کے عمدہ خیالات کا ہے جو یہانکی عورتوں کیلئے سبق آموز ہو جہاز بحر میڈیٹرینین۔ بحر ایڈریاٹک اور بحر ایجین سے گذرتا ہوا چھٹے روز

اہر ستمبر کو شام کے وقت چناق پہونچا۔ لیکن ترک حکاموں نے جہاز کو آگے جانیے روک دیا۔ اگرچہ جہاز کے کپتان نے بہت شور و غل کیا لیکن حکاموں نے یہ کہا چونکہ جہاز کی روانگی کا تار نہیں آیا تھا اِسلئے ہم آگے جانے کی اجازت نہیں دیسکتے۔ بہت سے مسافر اپنی جگہ پر سخت اعتراض کر رہے تھے کہ ترک نہایت ہی سخت اور غیر منصف ہیں لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ یہ جہاز کے کپتان ہی کی غلطی تھی کہ قلعہ چناق پر پہونچنے کی اطلاع جیسا کہ اُسکو قاعدہ کی رو سے دینی چاہیے تھی نہیں دی تھی۔ آخر کار شب کو تمام مسافر جہاز ہی پر رہے۔ دوسرے روز جہاز علے الصباح چناق سے روانہ ہوا اور گیلی پولی جزیرہ سے گزر کر شام کو ۸ بجے قسطنطنیہ پہونچا۔ چونکہ رات ہوگئی تھی اِسلئے تمام مسافر شب کو جہاز ہی پر رہے۔ رات کے وقت قسطنطنیہ جہاز پر سے ایسا خوشنما معلوم ہوتا تھا کہ کاش تمام عمر راتیں وہیں گزرتیں۔ صبح کے وقت ڈاکٹر اور افسر پولیس جہاز پر آئے۔ سب سے پہلے اول درجہ کے (Saloon) میں مجھکو بلایا۔ قبل اسکے کہ میں اُنکے پاس جاؤں میں نے قفقازی ٹوپی جو ایران میں چندارمہ پولیس کے افسر دیتے ہیں دے لی تھی اور ڈمشن سفیر نے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اُس قسم کی سیاہ استرخانی ٹوپی جیسی مصطفےٰ کمال پاشا استعمال کرتے ہیں پہن لی تھی

افسر پولیس نے میرا پاسپورٹ دیکھکر بہت سے سوالات مجھ سے ترکی میں کئے اور مین نے
ٹوٹی پھوٹی ترکی مین جواب دیا۔ مین نے دیکھا کہ یہ افسر ہر شخص سے خواہ انگریز ہو یا
فرنچ ترکی ہی مین سوالات کرتا تھا۔ اگرچہ وہ خود فرنچ خوب جانتا تھا اور غالبًا
انگریزی و جرمنی سے بھی واقف تھا۔ جہاز ہی پر حمال آگیا اور میرا اسباب اُتار کر
گمرک خانہ لے گیا۔ جیسا فرانس جاتے وقت کیلے ( Calais )
مین حمالوں کا شور و غل سُنا تھا وہی منظر یہاں بھی سامنے تھا۔ گمرک کے افسر
نے میرے تمام اسباب کا معائنہ کیا لیکن مجھے کچھ دینا نہیں پڑا۔ اگر کسی کے پاس
دو۔ تین درجن سگریٹ یا تھوڑا سا عطر ہو تو اسلامبول، ایران، شام و عراق مین انپر
کچھ محصول نہین لیا جاتا کیونکہ ذاتی استعمال کی چیزین گمرک کے محصول سے مستثنیٰ
ہین۔ جب میرا اسباب گمرک خانہ مین معائنہ کیلئے پہونچا تو حمال نے کہا کہ تھوڑا سا
انعام افسر کو دیدو تاکہ اسباب زیادہ دیر تک نہ دیکھا جائے لیکن میں نے انکار کر دیا
افسر گمرک نے میرے اسباب کو دیکھا لیکن نہ کسی قسم کا تعرض کیا اور نہ مجھسے انعام
کی خواہش ظاہر کی۔ گمرک خانہ سے باہر آکر ایک گھوڑا گاڑی پر سوار ہو کر مسرت ہوٹل
گیا۔ چونکہ وہان کوئی کمرہ خالی نہیں تھا اس لئے پیرہ کے امپیریل ہوٹل
( Imperial Hotel ) مین گیا۔ اس کا مالک ایک مصری یا شامی مسلمان تھا

وہان ایک کمرہ ڈیڑھ لیرہ ترکی یومیہ پر بغیر خوراک کے لے لیا۔ ممکن تھا کہ ایک لیرہ فی یوم پر ملجاتا اگر میں زیادہ قیام کرتا یا ہوٹل کے منیجر سے کرایہ کے کم کرنے کیلئے بہت زیادہ اصرار کرتا۔ حمال بھی میرے ساتھ ہوٹل تک گیا اور میرا اسباب گاڑی سے اُتار کر ہوٹل مین رکھا۔ جب اُس سے کرایہ گاڑی اور اسکی اُجرت کے بابت دریافت کیا تو اُسنے پچیس لیرہ ترکی یعنی تین پونڈ سے زیادہ بتایا۔ مین نے کہا کہ یہ بہت زیادہ ہے مین اسقدر نہین دونگا۔ ہوٹل کے کلرک کو بلایا اور اُس سے دریافت کیا کہ کسقدر دینا مناسب ہے۔ اُسمین اور حمال مین بہت مباحثہ ہوا۔ بالآخر حمال اور گاڑی والے کو مین نے دس لیرے دیئے جسمین سے ۴ لیرہ غالباً گاڑی والے نے اور چھہ لیرہ حمال نے لئے ہونگے۔ حمال نے ضرور مجھ سے زیادہ لیا۔ لیکن مین نے یہ غلطی کی تھی کہ اسباب حمال کو دینے سے پہلے اُس سے اُجرت طے نہ کرلی۔ اسمین شک نہین کہ حمال نے بہت زیادہ خدمت کی تھی کیونکہ اسباب کو جہاز سے اُتارنے گمرک خانہ تک لیجانے اور ہوٹل تک ساتھ آکر اسباب کے اُتارنے مین بہت کام کیا تھا لیکن جب بھی اُجرت زیادہ لی۔ واضح رہے کہ اندنون ایک انگریزی پونڈ کی قیمت آٹھ لیرہ ترکی تھی۔ اسلئے دس لیرے جو مین نے حمال کو دیے وہ ۲۵ شلنگ کے برابر ہوئے جو تقریباً اُنیس روپیہ کے

برابر ہوتے ہین۔ ہوٹل کا کرایہ بحساب ڈیڑھ لیرہ یومیہ قریب چار شلنگ یعنی
تین روپیہ کے ہوا جو یورپ اور ہندوستان کے ہوٹلون سے عموماً سستا تھا۔
لوقانده یعنی رسٹارنٹ یہان کثرت سے ہین اِسلئے جہان دل چاہتا تھا وہان
جاکر کھانا کھالیتا تھا۔ اِسلامبول مین لوقاندے بہت کثرت سے ہین اور نہایت ہی
صاف ستھرے یورپین طور پر رکھے جاتے ہین۔ کھانے مختلف قسم کے ہر وقت
اُنمین تیار رہتے ہین اور چار پانچ قسم کے عمدہ کھانون مین میرا تقریباً ایک لیرہ
یعنی ۲ ۱/۲ شلنگ صرف ہوتا تھا۔ اندنون عبداللہ آفندی کا لقانده نہایت
مشہور ہے۔ مین کئی مرتبہ وہان گیا اور بہت سے یورپین کو بھی وہان جاتے ہوئے
دیکھا۔ اِس شہر مین مٹھائی کی دکانین بکثرت ہین اور دودھ اور بالائی کے ساتھ
مختلف اقسام کی مٹھائیان بنتی ہین پیرس کے بعد شاید ہی کوئی دوسرا شہر علاوہ
اسلامبول کے ہوگا جہان اِس کثرت سے میٹھی چیزین بنائی جاتی ہون۔ یہان
دہی کا استعمال مثل ایران کے بکثرت ہے اور ہر لوقانده مین کھانے کے بعد
دہی اور کھانے کے ساتھ مٹھا پینے کے لئے ملتا ہے۔ مٹھا پینے کا رواج اسلامبول
اور ایران مین بکثرت ہے۔ مین جبتک اسلامبول اور ایران مین رہا ہمیشہ
کھانون کے بعد مٹھا پیا کرتا تھا۔ اندنون میوے اور انگور بکثرت ملتے ہین اور

بہت ہی سستے ہین۔ یہان کی مچھلی بہت ہی بڑی اور نہایت ہی لذیذ ہوتی ہے
اور ہر لوقانده مین کھانے کے لئے ملسکتی ہے۔ البتہ یہان کے لوقانده مین پلاؤ یا چلاؤ
ایسا اچھا نہین ہوتا جیسا ایران مین ہوتا ہے۔ ہمین شک نہین کہ پلاؤ یا چلاؤ کا پکانا
فقط ایرانیون ہی کا حصہ ہے۔ دوسرے روز کار روانسرائے والدہ خانی اس غرض
سے گیا کہ سید آغا طباطبائی تاجر سے جو میرے قدیم دوست تھے اور جن سے مجھے
ایران کے ایک شہر شاہرود (Shahroad) مین جنگ کے زمانہ مین ملاقات
ہوئی تھی جاکر ملون۔ وہان وہ نہین ملے اسلئے خان ترکیہ گیا وہان معلوم ہوا
کہ انکا دفتر سلامت خانی مین ہے چنانچہ وہان جاکر انسے ملا۔ ان کو جب مین نے
پہلے ایران مین دیکھا تھا تو وہ عبا پہنتے تھے اور ڈاڑھی رکھے ہوے تھے لیکن
یہان ڈاڑھی منڈی ہوئی اور یوروپین لباس مین تھے۔ وہ عرصہ سے اسلامبول مین
مقیم ہین اسلئے انکے ذریعہ سے سیر و سیاحت اور دریافت حالات مین بہت مدد ملی
وہ اسلامبول سے کچھ دور باہر رہتے تھے اور مجھے اپنے مکان پر لیگئے۔ صبح کو
اسٹیمر پر سوار ہوکر دوسرے جانب شہر کے جو ایشیائے ساحل ہے مقام حیدر پاشا
گیا اور وہان سے ریل مین سوار ہوکر گیوزیتہ جو ایک چھوٹا سا گاؤن ہے وہان
جاکر اترا۔ جب ان کے مکان پر گیا تو انھون نے اپنی بیوی اور لڑکی سے ملاقات کرائی

جب وہ آٹھ نو برس کی تھی اُسوقت اُسنے مجھے شماہرود مین دیکھا تھا۔ اسکا نام
ماہ سلطان ہے اب اسکی عمر ۱۵ یا ۱۶ برس کی ہوگی۔ جب مین نے اُس سے فارسی میں
دریافت کیا کہ تمنے مجھے پہچانا یا نہین تو اُس نے تھوڑی دیر غور کرکے فارسی مین
کہا کہ آقا آپ وہی تو نہین ہین جو میرے مکان پر شاہرود مین آیا کرتے تھے۔ اسکی
اس فہانت اور حافظہ پر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ اسوقت ایک سن رسیدہ ترک سے
فرنچ کا سبق پڑھ رہی تھی تھوڑی سی فرنچ مین بھی مین نے اُس سے گفتگو کی۔
پھر طباطبائی کے ساتھ اُنکے ہمزلف سے جو ایک ترک تبریزی تھے ملنے گیا۔
اُنھون نے اپنے دو لڑکون سے ملاقات کرائی۔ اُنکی عمر ۹ یا ۱۰ سال کی ہوگی۔
اُن لڑکون نے مجھ سے انگریزی مین گفتگو کی۔ جب مین نے پوچھا کہ اُنکی انگریزی
تعلیم کہاں اور کیونکر ہوئی تو اُن کے والد نے کہا کہ اُن کے جوار مین
پہلے ایک مدرسہ فرانسیسی پادریون کا تھا جسمین ترکی زبان کے ساتھ فرنچ
زبان کی بھی تعلیم دی جاتی تھی اور اُس مدرسہ مین نشان صلیب بھی لگا ہوا تھا۔ ترکی کی
جدید حکومت نے صلیب کے رکھنے پر اعتراض کیا اور کہا کہ چونکہ ہر مدرسہ مین ہر
مذہب کے بچے تعلیم پاتے ہین اسلیے جیسا کہ گورنمنٹ کے مدرسون میں کوئی خاص
علامت مذہبی نہین رکھی گئی ہے اس مدرسہ مین بھی نہین ہونی چاہیے۔

فرانسیسی پادریوں نے جب صلیب کا اُٹھالینا منظور نہین کیا تو اُنکو مجبوراً مدرسہ بند کردینا پڑا۔ امریکن پادریوں نے یہ اچھا موقع پاکر اپنا مدرسہ کھولدیا اور کہا کہ ہم کوئی نشان صلیب کا اسمین نہین لگائینگے۔ چنانچہ وہ مدرسہ اب خوب چل رہا ہے اور بہت سے ترک کے لڑکے وہان انگریزی پڑھتے ہین۔ یہ دونون لڑکے بھی اسی اسکول مین تعلیم پاتے ہین اور دن رات وہین رہتے ہین۔ ایرانیون اور ترکون مین یہ خاص بات مین نے دیکھی کہ وہ اپنے بچون کے دن رات بورڈنگ ہاؤس مین رہنے کو مکان کے رہنے پر ترجیح دیتے ہین۔ وہان سے پھر مین ایک نہایت ذی علم شخص مرزا حسین خان دانش سے ملنے گیا وہ اصلاً ایرانی ہین لیکن اُنکی تعلیم و تربیت اسلامبول مین ہوئی ہے وہ انگریزی۔ فرنچ۔ عربی۔ فارسی۔ ترکی نہایت اچھی طرح سے جانتے ہیں اور بہت ہی زبردست اہل قلم ہین۔ ڈاکٹر توفیق رضا بیگ مشہور ترک مصنف کی شرکت مین بہت کچھ تصانیف بھی کر چکے ہین۔ نہایت ہی روشن ضمیر اور آزاد خیال ہین اور اُنسے اور ترکون کے معاشرت و سیاست کے متعلق بہت ہی صحیح اطلاعات حاصل ہوے۔ ترکون مین وہ نہایت ہی مشہور اور فاضل لکھنے والے خیال کئے جاتے ہین۔ انھون نے رباعیات عمر خیام کی شرح ترکی زبان مین لکھی ہے اور پہلے اسلامبول کے دارالفنون مین پروفیسر بھی رہ چکے ہین اور بالفعل محکمہ "دیون عمومیہ" یعنی

مین ایک معزز عہدہ پر ممتاز (Public Debt Office)
ہین باشناسے گفتگو مین اُنسے معلوم ہوا کہ میرے مشفق قدیم سید سجاد حیدر صاحب بھی
اندنون سترت ہوٹل مین ٹھہرے ہوے ہین۔ چنانچہ مین اُنکے ساتھ ہوٹل گیا اور
سجاد حیدر صاحب سے ملا لیکن اس امر کا نہایت ہی افسوس ہوا کہ دو ہی روز کے بعد سجاد حیدر صاحب
مسر کو دیکھتے ہوے ہندوستان واپس چلے گئے۔ ایک روز اتفاق سے پیرہ مین
ڈنمارک کے ایک سفیر سے ملاقات ہوئی۔ اُسنے مجھ سے پوچھا کہ تم شیخ عبدالوہاب
آفندی سے ملے مین نے کہا نہین۔ وہ مجھکو اپنے سفارت خانہ مین لیگیا اور اپنے
سکریٹری کو میرے ہمراہ کر کے عبدالوہاب کی خدمت مین بھیجا۔ وہ عربی لباس
پہنے ہوے تھے اور کہا کہ مین مدینہ کے سادات مین سے ہون اور تیرہ چودہ برس
ہوے کہ مدینہ سے چلا آیا ہون۔ اُنھون نے مجھ سے اُردو مین گفتگو کرنی شروع کی۔
اُنکا سن قریب چالیس برس کے ہوگا لیکن انگریزی فرنچ۔ جرمنی روسی اطالیانی
یونانی۔ عربی فارسی۔ ترکی اور اردو بولتے اور لکھتے ہین۔ اُنکی ذہانت اور زبان دانی
پر نہایت ہی حیرت ہوئی۔ اُنھون نے کہا کہ اسلامبول ہی مین رہکر بعضے ہندوستانیون
سے اُردو سیکھ لی ہے۔ وہ بمقابل علم تصوف (Theosophy) کے
(Biosophy) کو ترجیح دیتے ہین اور انسان کی تہذیب اخلاق اور

تزکیہ روح کیلئے اُسکو زیادہ مفید و مُوثر سمجھتے ہین میرے خیال مین Steinner
کے طریقہ تصوف کی جانب بھی انکا میلان ہے۔ وہ کھانا نہایت ہی سادہ کھاتے
ہین۔ گوشت اور انڈا مطلق نہین کھاتے اور نہ کسی مشروبات یا دخانیات کا
استعمال کرتے ہین۔ اُنکے پاس عموماً روسی۔ جرمنی اور یونانی وغیرہ بہت آتے ہین
اور تمام یورپ مین جنکو علم الارواح مین کچھ دلچسپی ہے اُنسے ضرور ملتے ہین۔ وہ دوبار
پیرس اور ایک مرتبہ انکو Moscow بھی جا چکے ہین اور پیرس مین علم الارواح
پر ایک بہت ہی مفصل اور دلچسپ لکچر دیا تھا۔ اُنکا ارادہ ہندوستان مین آنے کا
ہے اور علوم روحانی اور طریقہ ریاضت جو ہندو فقیرون اور صوفیون مین رائج ہے
اُسکو سیکھنا چاہتے ہین اُنھون نے دو تین مرتبہ دعوت کی اور اُردو زبان مین برابر
گفتگو کی۔ جو حضرات ہندوستان کے اسلامبول جائین اُنکو چاہیے کہ مرزا حسین خان
دانش اور شیخ عبدالوھاب آفندی سے جو پروفیسر شیخ عبدالوھاب کے نام سے
مشہور ہین ضرور ملاقات کرین۔ چند دیگر تجار ایرانی۔ سفیر ایران اور بعض تعلیم یافتہ
ترکون سے ملاقات ہوئی۔ ایک ترک مجھکو ایک کلب لے گیا جو پیرہ مین واقع تھا۔
وہان ایک جوان ترک سے ملاقات ہوئی جو فرینچ خوب جانتا تھا اور ترکی راگون کو
یوروپین علم موسیقی کے رسم خط مین لکھکر پیانو پر بجاتا تھا۔ اُسنے مجھ سے کہا کہ اگر علیگڈھ کالج

میں کسی پروفیسر علم موسیقی کی ضرورت ہو تو میں جانے کے لئے حاضر ہوں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ بیچارہ علیگڈھ کالج کے متعلق کیسے دھوکے میں پڑا ہوا ہے۔ کیا علیگڈھ کالج کو اُسنے اسلامبول یا طہران کا دار الفنون سمجھا ہے جہاں اور علوم کے ساتھ علم موسیقی کی بھی تعلیم مسلمانون کو دی جاتی ہے۔ اُسنے مجھسے یہ بھی کہا کہ عنقریب اِس کلب میں ایک کنسرٹ (Concert.) ہونے والا ہے جسمیں تمام معزز ترک مرد اور عورت شریک ہونگے اور اُسکے بعد بال (Ball.) بھی دیا جائے گا۔ اُسنے کہا کہ ٹکٹ کی فروخت سے جو آمدنی ہوگی وہ شہدائے جنگ کے یتیم خانہ کو دیدی جائیگی۔ میں نے کہا کہ گو کنسرٹ کے زمانہ تک میں اسلامبول میں نہیں ہونگا لیکن ایک ٹکٹ میں نے ۵ لیرہ ترکی پر خرید لیا۔ ایک مرتبہ سجاد حیدر صاحب کے ساتھ اور دوبارہ ایک ترک پروفیسر کی معیت میں دار الفنون دیکھنے گیا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ترک تعلیم جدید کے ترقی کیجانب بیحد مائل ہیں اور تمام علوم ترکی زبان میں تعلیم ہونے لگے ہین اور ترکی اب گویا ایک مکمل علمی زبان ہوگئی ہے۔ مکاتب و نصاب تعلیم وغیرہ کے متعلق میں بالتفصیل نہیں لکھنا چاہتا۔ جو صاحب آئندہ سفر کرین وہ خود ان امور کی تحقیق کرلیں۔ بعض اخبارون کے نامہ نگارون اور مدیرون سے بھی ملاقات ہوئی لیکن اُنسے گفتگو کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ وہ لوگ ہر امر میں اپنی آزادانہ رائے کا اظہار نہیں کرسکتے۔ سیاسی امور کے متعلق جو خیالات وہ لوگ

اور بعض جوان ترکوں سے گفتگو ہوئی۔ اُنکے اظہار کرنے کی میں ضرورت نہیں سمجھتا۔ البتہ اسقدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے ترک ہندوستان کے مسلمانوں سے نہایت ہی مخالف معلوم ہوتے تھے کہ انھوں نے مسئلہ خلافت میں اسقدر کیوں کوشش کی کہ خلافت سلاطین آل عثمان کے خاندان سلاطین عثمانی میں قائم رہے۔ بہرحال میں اس مسئلہ میں اظہار رائے نہیں کر سکتا کہ اس اعتراض میں کہانتک ترک حق بجانب ہیں۔

میرے زمانہ قیام میں اتفاقاً وہ دن بھی آگیا جسدن اُس سے ایک سال قبل قسطنطنیہ کو ڈال ایتحادین کی فوجوں نے تخلیہ کرکے مصطفے کمال پاشا کی فوج کے حوالہ کردیا تھا۔ اُسدن تمام شہر میں جوش پھیلا ہوا تھا اور کل دُکانیں اور مکانات اور سرکاری عمارتیں اور سفارتخانے اور تمام جہاز خواہ عثمانی خواہ غیر عثمانی ترکی جھنڈوں اور پھریروں سے آراستہ تھے۔ میں نے تمام عمر میں کبھی کسی مقام پر خواہ یورپ ہو خواہ ایشیا میں اس کثرت سے بیرق اور جھنڈے کسی خوشی کے موقع پر نہیں دیکھے تھے منجملہ اور مقاموں کے پیرہ میں ایک جگہ طاق نصرت بنایا گیا تھا جہاں سے صبح کے وقت تمام مختلف فوجیں بری وبحری مع توپ خانے اور باجے وغیرہ کے گزریں۔ یہ جلوس گھنٹوں رہا اور میں صبح کا گیا ہوا دوپہر کو ہوٹل واپس آیا۔ لوگوں میں اسقدر جوش پھیلا ہوا تھا کہ نقض امن کا اندیشہ ہوتا تھا لیکن پولیس کا ایسا اچھا انتظام تھا کہ کسی قسم

کی بدنظمی یا فساد نہیں ہونے پایا۔

اسلامبول میں مساجد۔ مدرسے۔ تکیے دوسری عمارات عالیہ بکثرت ہیں لیکن جدید عمارتوں میں بڑے ڈاک خانہ و دیون عمومیہ کی عمارت نہایت ہی خوبصورت و عالیشان ہے۔ ایرانی سفارتخانہ کی بھی عمارت بہت ہی خوبصورت اور باب عالی کے قریب واقع ہے واضح رہے کہ روم میں تکیہ خانقاہ کو کہتے ہیں اور اسلامبول میں ہر قوم کا تکیہ علیحدہ بنا ہوا ہے جہاں اُس قوم کے فقرا اور غریب مسافر آکر قیام کرتے ہیں لیکن ایران میں تکیہ امام باڑہ کو کہتے ہیں البتہ جدید فارسی میں امام باڑہ کو حسینیہ کہتے ہیں اور تکیہ کی لفظ کا استعمال بڑے شہروں میں متروک ہو گیا ہے۔

اسلامبول میں قہوہ خانے کثرت سے ہیں اور بعضے ایسے خوبصورت و عالیشان ہیں کہ پیرس کے قہوہ خانوں کا مقابلہ کرتے ہیں بعض قہوہ خانوں میں آدھی رات تک عربی و ترکی ساز بجا کرتے ہیں اور شامی مرد و عورت جو عموماً یہودی یا نصرانی ہوتے ہیں عربی و ترکی گیت گاتے رہتے ہیں۔

ترکوں کو قومی امور کی جانب نہایت ہی انہماک ہے چنانچہ جمعہ کے دن کوئی شخص کسی مذہب یا کسی سلطنت کی رعیت ہو اپنی دکان یا دفتر نہیں کھول سکتا یہاں جمعہ کا دن ویسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسا لندن میں اتوار کا دن۔ یہ دیکھکر مجھ کو تمہاری حس کی

خوشی ہوئی۔ اپنے زمانہ وزارت میں سید ضیاء الدین صاحب نے ایسا ہی حکم طہران میں جاری کیا تھا لیکن اب رضا خاں کے زمانہ میں اُسپر عمل نہیں کیا جاتا۔

اسلامبول کی عمارات و مساجد و آداب معاشرت کے متعلق میں زیادہ تفصیل سے لکھنا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ بعض حضرات اُن مطالب کو اپنے سفرناموں میں مفصل لکھ چکے ہیں البتہ جن لوگوں کی یہ خواہش ہو کہ اسلامبول میں ترکوں سے معاشرت کریں اور انکی تمدنی حالت سے واقفیت حاصل کریں اُنکو چاہیئے کہ ترکی یا کم سے کم فرنچ زبان بقدر ضرورت سیکھ کر اسلامبول جائیں۔ اگرچہ اب انگریزی بھی اسقدر جاری ہو گئی ہے کہ بہت سے ترک اسکو جانتے ہیں لیکن فرنچ سے عام طور پر تعلیم یافتہ ترک واقف ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص فارسی بقدر ضرورت کے جانتا ہو تو تعلیم یافتہ ترک سے گفتگو کرنے سے ضرور مدد مل سکتی ہے کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی طرح ترک بھی فارسی ابتدا میں پڑھتے ہیں۔

ہر شخص غالباً اسکو جانتا ہے کہ اسلامبول کے ترک پہلے ہی سے دوسرے ملک کے مسلمانوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے لیکن اس جنگ عمومی کے بعد سے بہت ہی سرعت کے ساتھ مراحل تمدن و تہذیب کو طے کر رہے ہیں۔ اس امر کا ثبوت وہاں کے عورتوں کی تعلیمی و تمدنی حالت کو دیکھکر ہوتا ہے۔ دنیا کی تمام متمدن قوم کا

عقیدہ بلکہ میرے نزدیک بدیہی امر ہے کہ ہر قوم کی ترقی زیادہ تر عورتوں ہی کی
تعلیم و تہذیب پر موقوف ہے ہندوستان کے تمام مسلماں تمام دنیا کے مسلمانوں
سے اسی وجہ سے پیچھے رہ گئے ہیں کہ ان کی عورتیں تمام دنیا کی مسلمان عورتوں
سے تعلیم۔ تمدن اور آداب معاشرت وغیرہ میں بہت ہی پیچھے ہیں۔ اسلامبول
اور دوسرے اسلامی ملکوں میں عورتوں کی تعلیم عام طور پر جاری ہے اور مکان کی
چار دیواری میں محبوسانہ زندگی نہیں بسر کرتیں کہ اُن کی اور اُنکے بچوں کی صحت
خراب ہو جائے۔ ہر طبقے کی عورتیں عام طور پر باہر جاتی ہیں اور خرید و فروخت خود
کرتی ہیں بلکہ بعض بڑی دوکانوں میں مثل یورپ میں عورتوں کے ملازمت کرتی
ہیں۔ ترکوں نے عورتوں کے حقوق کا اسقدر خیال رکھا ہے کہ کوئی شخص بغیر
کسی عذر شرعی کے ایک سے زیادہ عورت حبالۂ نکاح میں نہیں لاسکتا اور یہ بھی
قانون وضع کر دیا گیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان جو کسی دوسری سلطنت کی رعیت ہو
کسی ترکن سے عقد کرے اور عثمانی ملک میں قیام کرنا چاہے تو اُسپر لازم ہوگا کہ
وہ عثمانی سلطنت کی رعیت ہو جائے ورنہ وہ ترکی سلطنت سے مع اپنی ترکن
بیوی کے نکالدیا جائیگا۔ چنانچہ دو تین ایرانی جنھوں نے ترکنوں سے عقد
کیا تھا اِس قاعدہ کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے یعنی عثمانی سلطنت کی تبعیت

قبول نہ کرنے کی وجہ سے اسلامبول سے مع اپنی بیویوں کے نکالدئے گئے۔

واضح رہے کہ یہ امر اسوجہ سے نہیں کیا گیا کہ ایرانی شیعہ تھے کیونکہ ترکوں کے نزدیک شیعہ و سنی میں باہمی نکاح کو ناجائز سمجھا جاتا ہے جیسا کہ ایران میں بھی انکا رواج ہے۔ میں نے کئی سنی المذہب ہندوستانی و عرب کو دیکھا کہ ایران میں شیعہ عورتوں کے ساتھ نکاح کیا۔ میں ہندوستان میں دو تین سنی مسلمانوں کو جانتا ہوں کہ جو ایران میں شیعہ عورتوں کے ساتھ نکاح کر کے اپنے ہمراہ اُن کو ہندوستان لائے ہیں غالباً خان بہادر مولا بخش صاحب نے جو گورنمنٹ آف انڈیا کے فارن افیس میں ملازم تھے مشہد مقدس میں ایک اچھے خاندان کی شیعہ عورت سے نکاح کیا تھا۔ اسیطرح بہت سے ایرانی مردوں نے ترکی اور مصری عورتوں سے نکاح کر لیا ہے۔

بہتر ہوگا کہ جو شخص اسلامبول جانا چاہے اُسکو چاہیے کہ امریکن اکسپرس کمپنی سے جنکی ایک شاخ بمبئی میں اور ایک اسلامبول میں ہے ضروری امور کے متعلق خط و کتابت کرے اسلامبول جانے کے لئے بہت ہی کم اسباب اپنے ہمراہ لیجاوے کیونکہ تمام ضروری چیزیں وہاں ملجاتی ہیں۔ میرے خیال میں اسلامبول کا روزانہ خرچ قریب ۱۲ شلنگ کے ہوگا اسطرح پر کہ کسی اسلامی یا یوروپین ہوٹل میں ایک کمرہ لے لے اور کھانا جس ریسٹارنٹ میں چاہے کھا لیا کرے۔ البتہ اگر زیادہ قیام کرنا چاہے تو

قدہ کوئی۔ گیوز تپہ۔ ارن پتہ یا بیوک درہ وغیرہ میں جا کر کسی بورڈنگ ہاؤس یا کسی ترک کے مکان میں ایک کمرہ لیکر قیام کرے ایسی صورت میں مصارف بھی کم ہونگے اور ترکوں سے معاشرت کرنے کا بھی زیادہ موقع ملے گا۔

## فصلِ دوم روانگی از اسلامبول بہ بیروت

اسلامبول سے روانہ ہونے سے دو تین روز پہلے ترکی پولیس سے اجازت نامہ روانگی کا حاصل کیا کیونکہ کوئی شخص اسلامبول سے بغیر پولیس سے اجازت نامہ تحریری لئے ہوئے کسی دوسرے شہر کو نہیں جا سکتا۔ لائڈ ٹرسٹینو کمپنی سے ۱۲ لیرہ یعنی تقریباً ۱۰ پونڈ کا اول درجہ کا ٹکٹ بیروت تک کے لئے خرید کیا اور جمعہ کے روز اسلامبول سے روانہ ہوا۔ جہاز کے روانہ ہونے سے پہلے پولیس کا افسر جہاز پر آیا اور پاسپورٹ اور اجازت نامہ روانگی کا ملاحظہ کیا۔ جہاز نے ساڑھے گیارہ بجے دن کو لنگر اٹھایا۔ جہاز پر ایک ترک کامل آفندی سے ملاقات ہوئی جو مع اپنے بیٹے امین آفندی اور ایک چرکس ملازم کے بغداد جا رہے تھے۔ ان لوگوں سے مراسم بڑھ گئے اور ہمیشہ ہندوستان اور یورپ کے سیاسی و تمدنی مسائل پر گفتگو ہوا کی۔ امین آفندی نہایت ہی خوبصورت تعلیم یافتہ اور خلیق شخص تھے اور انکا سن تقریباً پچیس برس کا ہوگا۔ ابھی تک

شادی نہیں ہوئی تھی۔ فرنچ خوب جانتے تھے مسکرات و دخانیات سے قطعی
پرہیز کرتے تھے علم تاریخ کو خوب جانتے تھے اور جنگ میں بھی خدمت کر چکے تھے
خلافت عثمانی کے سخت مخالف تھے اور انکا اعتقاد تھا کہ سلاطین دنیاوی خلافت
کے مستحق نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ وہ احکام شریعت کے پابند نہوں۔ انکا یہ بھی
خیال تھا کہ نقطہ نظر سیاست سے خلیفہ کا اسلامبول میں رہنا غیر مناسب ہے۔

دوسرے دن شنبہ کو جہاز (Smyrna.) ازمیر پہونچا۔ میں ترک
رفیقوں کے ہمراہ ایک کشتی میں سوار ہو کر شہر دیکھنے کے لئے کنارہ پر گیا۔ اس
شہر کو یونانیوں نے زمانہ جنگ میں قبل تخلیہ کرنے کے جلا دیا تھا اسلئے وہ بہت ہی
ابتر حالت میں تھا۔ یہ تجارت کا بہت ہی بڑا بندرگاہ ہے انجیر کی پیداوار اسکے
اطراف میں بکثرت ہوتی رہی ہے اور دوسرے ملکوں کو لاکھوں من انجیر یہاں سے جاتی ہے
زمانہ جنگ میں بہت سے یوروپین تجار یہاں سے چلے گئے تھے لیکن اب دوبارہ
کچھ واپس آرہے ہیں۔ اس جہاز پر ایک انگریز اور اسکی بیوی سے ملاقات ہوئی لیکن
اُن لوگوں کے لہجہ سے معلوم ہوتا تھا کہ انگریز نہیں تھے اور غالباً اپنی اصلی
قومیت کو چھپانے کے لئے انگریزی میں گفتگو کرتے تھے بسبب یوم ولادت
حضرت پیغمبر صلعم ہونے کے تمام جہازوں اور عمارات پر پھریرے اور جھنڈے نصب

کئے گئے تھے۔ تمام شب جہاز یہاں ٹھہر رہا۔ دوسرے روز صبح کو جہاز یہاں سے روانہ ہوا
اور تمام دن رات چلکر دوشنبہ کے دن سات بجے صبحکو مقام روڈس (Rhodes)
پہونچا۔ یہ بندرگاہ ایطالی والوں کے قبضہ میں ہے۔ جنگ بلقان کے بعد اُن لوگوں نے
بدون کسی جنگ کے اِس شہر پر قبضہ کر لیا تھا اور چونکہ اُسوقت کوئی ترکی فوج وہاں
موجود نہ تھی اِسلئے اُن لوگوں نے موقع پاکر شہر پر تصرف کر لیا۔ یہاں پر یونانی اور
ایطالیائی بکثرت آباد ہیں مسلمان رعایا ایطالیائی حکام سے خوش نہیں معلوم ہوتے
یہاں کے لیمو اور نارنگی بہت مشہور ہیں اور کثرت سے پیدا ہوتے ہیں شہر نہایت ہی
صاف اور رو بہ ترقی ہے۔ یہاں سے دو بجے شب کو جہاز روانہ ہوا۔ اور دوسرے روز
صبح کو انطالیہ پہونچا۔ یہ مقام ترکوں کے قبضہ میں ہے۔ چونکہ یہاں جہاز تھوڑی ہی
دیر ٹھہرا تھا اِسلئے کنارہ پر نہ جا سکا۔ جہاز دوپہر کو روانہ ہو گیا اور تمام شب چلکر
دوسرے روز صبح کے وقت جزائر سائپرس (Cypress.) کے بندرگاہ
لیموسل پر پہونچا۔ اُسکو دیکھنے کے لئے کنارہ پر گیا لیکن یہاں وہ رونق نہیں
پائی جو دوسرے بندرگاہوں میں تھی۔ بہت سے یونانیوں کو انگریزی ٹوپی پہنے ہوے
اور پا برہنہ مزدوری کرتے ہوے دیکھا۔ یہ لوگ نہایت ہی ذلیل حالت میں تھے
اور بہت ہی کثیف اور پھٹے کپڑے پہنے ہوے تھے۔ یہ شہر انگریزوں کے قبضہ میں ہے

اِس شہر میں تقریبًا ساٹھ ہزار ترک اور تین لاکھ یونانی آباد ہیں۔ تعلیم کی بہت ہی کمی ہے۔ بعض باشندوں نے اِس امر کی سخت شکایت کی۔ ایک ترک یہیں کا رہنے والا اسلامبول سے میرا ہم سفر تھا اور انگریزی بول لیتا تھا۔ اُسنے کہا کہ انگریزی حکومت یہاں کے لوگوں کو اعلیٰ قسم کی تعلیم دینا پسند نہیں کرتی۔ میں نے کہا کہ اگر فی الواقع ایسا ہے تو بہت ہی اچھا ہے کیونکہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا نتیجہ نہ گورنمنٹ اور نہ ہندوستانیوں کے لئے مفید ثابت ہؤا تمام ہندوستانی تعلیم یافتہ عمومًا اپنے پرانے مراسم بیہودہ میں باوجود تعلیم جدید کے مبتلا ہیں اور اُنکی تمدنی حالت میں بہت ہی کم ترقی ہوئی ہے۔ اُنکی تعلیم ایسی ہے کہ بجز سرکاری ملازمت کرنے کے اور کسی قابل وہ نہیں ہوتے ہیں اسلئے اُنکے وجود سے ملک کی ثروت میں ایک کوڑی کا بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ اُنکی دماغی تعلیم کا یہ نتیجہ ہے کہ تعصب مذہبی روز بروز رو بہ ترقی ہے اور بہت سے اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ مذہبی نزاع کے پیدا کرنے میں لیڈر بنجاتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کا نتیجہ گورنمنٹ کے لئے اسوجہ سے مفید نہیں ثابت ہوا کہ جن لوگوں نے اعلیٰ تعلیم انگریزی کی حاصل کی ہے اُن کو عمومًا ایسے عہدے نہیں ملتے جنکی وہ توقع کرتے ہیں اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گورنمنٹ کی مخالفت کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں اگر اُنکو علوم تجارت و فنون صنعت و حرفت کی تعلیم دی جاتی تو یہ نتیجہ نہ ہوتا۔ میری گفتگو سے اُس ترک کو پہلے کچھ تعجب ہوا لیکن

چونکہ زمانہ جنگ میں کچھ ہندوستانی فوج کو انہوں نے سائپرس میں اکیسی اور عام پر دیکھا تھا اسلئے انہے
بھی میرے خیال کی تصدیق کی کہ فی الواقع ہندوستان کے لوگ تمدنی حالت میں ابھی بہت ابھی
پیچھے ہیں۔ یہ عجیب بات دیکھی کہ جہاں یہاں کے لوگ زمانہ جنگ میں ہندوستان سے باہر گئے بجز
اسکے کہ وہاں کے باشندوں کی نظر میں زیادہ حقیر و ذلیل ہو گئے اور کوئی نتیجہ نہیں ہوا سلامبول
بیروت، شام عراق و ایران میں ہندوستانی اب سابق سے زیادہ مبتذل ہو گئے ہیں عراق و
حجاز میں ہندوستان کے حضرات "ہندی بطال" و "ہندی بابا چورتی" کے القاب سے پکارے
جاتے ہیں اور بعض ایرانیوں نے ازراہ تمسخر و استہزا ہندیوں کی شان میں یہ شعر نظم کیا
ہے شعر "ما مردم ہندیم و بود آں وطن ما ؛؛ ما گشتہ دالیم و چپاتی کفن ما"
طہران میں ایک موقع پر مجھکو بہت ہی شرم معلوم ہوئی جب ایک ایرانی نے جو محکمہ مال
میں ایک اچھے عہدہ پر ممتاز تھا بہت سے تعلیم یافتہ ایرانیوں کے مجمع میں مجھ سے پوچھا کہ کیا
ہندی لوگ ابھی سیگرٹ کا استعمال کرنا نہیں جانتے کہ بجائے اسکے کہ ہونٹھوں سے
لگا کر پئیں اسکو مٹھی کے اندر رکھکر مثل حقے کے پیتے ہیں دوسرے صاحب نے کہا کہ
میں نے اکثر ہندی سپاہیوں کو دیکھا ہے کہ وہ پائجامہ کا استعمال نہیں کرتے اور اکثر
تمام جسم میں تیل لگا کر زمین پر آفتاب میں اکڑوں بیٹھے رہتے ہیں۔ ان اعتراضات
کا میں نے کچھ جواب ضرور دیا لیکن فی الحقیقت وہ ایسا جواب نہیں تھا کہ وہ لوگ

قبول کر لیتے۔ اگر اچھے تعلیم یافتہ لوگ یہاں سے اِن ملکوں میں جاتے تو ممکن تھا
کہ ہندیوں کی جانب سے وہاں کے لوگوں کا خیال اچھا ہو جاتا کیونکہ میرا ذاتی تجربہ
ہے کہ وہ لوگ تعلیم یافتہ و روشن خیال ہندوستانیوں سے ملکر نہایت ہی خوش ہوتے
ہیں۔ وہاں کے لوگ ابتک نہیں جانتے کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدے یہاں
ملتے ہیں کیونکہ اُن لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستانی عموماً ابتک اس قابل نہیں ہوئے
ہیں کہ انکو انگریز اعلیٰ مرتبہ کی نوکریاں دیکیں جب میں نے ہندوستان کی ریفارم
اسکیم کا ذکر کیا تو اسلامبول اور طہران میں بہت سے لوگ سنکر کہنے لگے کہ ابھی کم سے کم
تیس چالیس برس کی تعلیم کے بعد یہ حقوق اگر ہندوستانیوں کو دئے جاتے تو زیادہ مناسب
ہوتا۔ بہرحال اس سائبرس کے ترک سے بہت دیر تک مجھ سے تعلیم کے مسئلہ پر گفت گو
رہی اور اثنائے کلام میں معلوم ہوا کہ وہ اپنی اولاد کو اسلامبول تعلیم دینے کیلئے
بھیجنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ جب آپکے ملک میں انگریزی حکومت ہونیکی وجہ سے
انگریزی زبان کا جاننا زیادہ مفید ہے تو آپ اپنے بچوں کو علیگڈھ کالج یا لندن کیوں
نہیں بھیجتے اُسنے کہا کہ نہ تو ہندوستان کی آب ہوا اچھی ہے اور نہ وہاں کا طرز معاشرت
مہذبانہ طریقے کا ہے اسلئے علیگڈھ میں نہیں بھیج سکتا۔ لندن بھیجنا بھی میرے
نزدیک زیادہ مفید نہیں ہوگا۔ میرا ارادہ ہے کہ پہلے انکی ابتدائی تعلیم اسلامبول میں ہو

اُسکے بعد انجینیری یا ڈاکٹری پڑھنے کے لیے جرمنی بھیجدونگا. اگر میرا مقصود گورنمنٹ
کی ملازمت دلانا ہوتا تو البتہ لندن انگریزی تعلیم کے لئے بھیجتا - میں شہر کی تھوڑی سی
گشت کر کے ڈاک خانہ گیا وہاں ایک ترک کلرک سے ملاقات ہوئی جو انگریزی بول سکتا
تھا اُسنے بھی کمی تعلیم کی شکایت کی اُس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں تین چار بیرسٹر
ہیں جنمیں سے دو یا تین مسلمان ہیں پھر میں کچہریوں کی طرف گیا اور وہاں معلوم ہوا کہ
عدالت دیوانی میں چیف جج انگریز اور ایک جج مسلمان اور دوسرا جج یونانی
ہوا کرتا ہے کچہریوں میں موکلوں کا اسقدر مجمع نہیں دکھائی دیا جیسا ہندوستان میں ہوا کرتا ہے
میں نے خاص طور پر اسلامبول اور طہران میں کچہریوں کو جاکر دیکھا تو وہاں ہندوستانی
کچہریوں کی سی بھیڑ کہیں نہیں دیکھی میرے خیال میں ہندوستان سے زیادہ کسی
ملک میں مقدمہ بازی کا رواج نہیں ہے اور اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی
کسی زمانہ میں سلف گورنمنٹ یعنی استقلال کامل کے مستحق نہیں ہونگے جس طرح میرا
اعتقاد خدا کے وجود کا ہے اسیطرح کی ناقابلیت کا بھی ہے. شہر کو
دیکھکر میں جہاز واپس پر آیا پنجشنبہ کے روز سہ پہر کو جہاز کا لنگر اُٹھا اور اسی روز شب کو
جہاز لارنکا (Lanarca.) میں جو جزائر سائپرس کا دوسرا بندرگاہ ہے
پہونچگیا اور چونکہ یہ چھوٹا سا بندرگاہ ہے اسلئے اُسی شب کو تھوڑی دیر ٹھہر کر

وہاں سے روانہ ہوگیا۔ دوسرے دن صبح کے وقت جہاز مرسین (Mersin)
پہونچگیا۔ یہ بندرگاہ ترکوں کے قبضہ میں ہے۔ یہاں تمام دن جہاز ٹھہرا رہا۔ اور
بہت سی روئی اور اُون یہاں جہاز میں لادی گئی مقام ادنہ جو یہاں سے ریل سے
ڈھائی گھنٹہ کی راہ ہے روئی کی کان ہے اور تمام ضلع میں بکثرت رُوئی پیدا ہوتی
ہے۔ یہاں کے لوگ عربی زبان بولتے ہیں۔ یہاں سے جہاز شب کو دس بجے روانہ ہوا
اور دوسرے دن صبحکو الگزاندرٹ (Alexandretta) پہونچا۔ یہ شام کا
بندرگاہ ہے اور فرنچ کے زیر نگرانی ہے۔ جہاز تمام دن ٹھہرا رہا اور ہزاروں بھیڑ
و بکری یہاں سے سوار کی گئیں۔ یہاں کے لوگ بھی عربی بولتے ہیں۔ یہاں سے
جہاز ۵ بجے شام کو روانہ ہوا اور تمام رات چلکر صبح کو آٹھ بجے طرابلس شام میں
پہونچا۔ طرابلس شام اسکو اسوجہ سے کہتے ہیں کہ دوسرے طرابلس کو طرابلس غرب
کہتے ہیں۔ یہ بندرگاہ بھی فرنچ کے زیر نگرانی ہے یہاں سے نارنگیاں بکثرت
لادی گئیں اور ۱۱½ بجے دن کو جہاز روانہ ہوکر اُسی روز چار بجے شام کو بیروت پہونچگیا
ناظرین کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ اسلامبول سے بیروت تک کنارے میں جو مختلف بندرگاہ
ملتے ہیں اُنمیں سے کوئی تو ترک کوئی ایطالی کوئی انگریزی اور کوئی فرنچ کے
قبضہ میں ہے۔ جہاز سے اُترکر ایک کشتی میں سوار ہوا اور کنارے گیا گمرک خانہ میں

اسباب کو دکھلا کر ایک ہوٹل میں جاکر قیام کیا اُسکا نام ادنہ ہوٹل تھا اور اسکا منیجر ایک یونانی تھا۔ ایک لیرہ یومیہ پر ایک کمرہ بدون خوراک لیا۔ یہاں کا ایک لیرہ دو ترکی لیروں کے برابر ہوتا ہے۔ اِس حساب سے یہاں کے ایک لیرہ کی قیمت ۵ شلنگ یعنی قریب تین روپیہ بارہ آنہ کے ہوئی۔ شب کو ایک قہوہ خانہ میں جاکر ترک رفیقوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ قہوہ خانہ بہت ہی بڑا تھا جسمیں ہر قوم کے لوگ عیسائی یہودی اور مسلمان کھانا کھا رہے تھے۔ کھانا کھا کر دوسرے قہوہ خانہ میں جو بہت ہی وسیع تھا اور جسمیں چشمہ کا فوارہ جاری تھا چاے اور نرگیلہ یعنی پیچوان پیا۔ جب ہم ہوٹل واپس آ رہا تھا تو رستہ میں ایک اور قہوہ خانہ دیکھا جسکے بالاخانہ میں بہت ہی زیادہ برقی روشنی ہو رہی تھی اور کثرت سے مجمع تھا۔ اُسکے باہر یہ اعلان لگا ہوا تھا "

"سیدنا الشیخ عبد القادر یغنی ھذا المساء"

"یعنی آج کی شب کو سیدنا شیخ عبد القادر صاحب گائینگے"۔ چونکہ میرے رفقا ترک اد زعربی سے ناواقف تھے اِسلئے ہم لوگ وہاں نہیں گئے بلکہ سیدھے ہوٹل چلے گئے۔ بیروت میں دو ہی روز رہا اِسلئے نہ کسی سے مل سکا اور نہ اچھی طرح بیروت اس مرتبہ دیکھ سکا۔ بیروت میں بہت سی پرانی عمارتیں گر گئی ہیں لیکن اُسکے بجاے بہت سی جدید دوکانیں ہوٹل قہوہ خانے اور بنک وغیرہ زیر تعمیر ہیں۔ یہاں کی علمی ترقی کی حالت سے ہر شخص واقف ہے

اسلئے اُسکے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے چونکہ میں نے فرانس میں شام آنے کے لئے فرنچ گورنمنٹ کا ویزہ ( Visa. ) اپنے پاسپورٹ پر نہیں کرایا تھا اسلئے مجھکو فرنچ کونسل کے پاس جاکر ۲ لیرہ و ۲۷ پیاسٹر فیس دیکر ویزہ کرانا پڑا۔

## فصل سوم از بیروت تا بغداد

دوشنبہ کے روز بیروت سے ایک موٹر بغداد جانے کے لئے کرایہ کرکے ۸ بجے دن کو دمشق یعنی شام روانہ ہوگئے اور ۵ بجے دمشق پہونچگئے۔ ایک ہوٹل میں جسکا نام دَارُالفریح تھا جاکر قیام کیا۔ اس شہر میں قہوہ خانہ اور لوقانده یعنی رسٹارنٹ جسکو یہاں فرنچ زبان کے تلفظ کے لحاظ سے "راستورانٌ" لکھتے ہیں بکثرت ہیں اور کھانے اچھے اور سستے ہیں۔ انگور اندنوں بکثرت اور نہایت ہی لذیذ تھا۔ ایسا عمدہ انگور میں نے اس سے قبل کہیں نہیں کھایا تھا۔ شام کی حالت ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی بعض بازار نہایت ہی خراب و کثیف ہیں البتہ فرنچ نے چند جدید عمارتیں تعمیر کرائی ہیں اور سواد شہر میں کثرت سے باغ اور چشمے ہیں بعض فرنچ افسروں سے اثنائے گفتگو میں معلوم ہوا کہ فرنچ شام سے چلے جانے کے لئے بالکل تیار ہیں کیونکہ اس ملک کی آمدنی کم اور مصارف زیادہ ہیں اسلئے فرنچ گورنمنٹ کو یہاں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جب جمعیت اتحاد الاقوام کا حکم شام کو چھوڑ دینے کا

ہوگا فرنچ فوراً اُسکا تخلیہ کردینگے - اُس افسر نے یہ بھی کہا کہ اگر برٹش گورنمنٹ عراق کو چھوڑدے تو فرنچ بھی فوراً شام سے چلے جائینگے - بادی النظر میں بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ یہاں فرنچ کی حکومت ہے تمام انتظام عرب حکام کرتے ہیں اور فرنچ گورنمنٹ برائے نام نگرانی کرتی ہے - دوسرے روز شنبہ کو اسی موٹر پر جس میں بیروت سے آئے تھے بغداد جانے کیلئے روانہ ہوئے - پوری موٹر ہم چار آدمیوں نے بیروت سے بغداد تک کیلئے چالیس پونڈ کرایہ پر لی تھی - یہ موٹر ایک ارمنی کی تھی اور خود مالک موٹر ہم لوگوں کے ساتھ شام تک آیا تھا - یہاں سے ایک مسلمان شوفر ہم لوگوں کو لے چلا یہ موٹر اس صحرا کے راستہ سے چلی جس راستہ سے نیرن کمپنی (Nairn Coy) کی موٹریں جاتی ہیں - اس راستہ میں نہ کوئی آبادی ہے اور نہ کہیں پانی ملتا ہے - بجز زمین و آسمان کے دوسری کوئی چیز نظر نہیں آتی - شام سے بغداد تک کی مسافت قریب ۵۰۰ میل کے ہے واضح رہے کہ علاوہ معمولی کرایہ کی موٹروں کے دو یوروپین کمپنی کی موٹریں بیروت سے بغداد اور بغداد سے طہران تک جاتی ہیں - ایک کا نام :-

Nairn Coy اور دوسری کا نام Eastern Trans-Port Company ہے - پہلی انگریزی اور دوسری فرنچ ہے دونوں کمپنیاں بیروت سے بغداد تک کے لئے فی کس ۲۵ پونڈ کرایہ لیتی ہیں - اور اسیقدر بغداد سے طہران تک کا بھی

کرایہ ہے۔ انگریزی کمپنی کی موٹر شام سے بغداد تک کم سے کم ۲۶ گھنٹے میں جاتی ہے اور صحرا میں کہیں نہیں ٹھہرتی لیکن فرنچ کمپنی کی موٹر ایک شب پالمیر Palmyra اور ایک شب ایک دوسرے مقام پر ٹھہرتی ہوئی جاتی ہے۔ ان دونوں مقاموں پر کمپنی کی طرف سے مسافروں کے لئے قیامگاہیں ( Rest House. ) بنی ہوئی ہیں اور خوراک اور خوابگاہ کمپنی کی جانب سے مہیا کی جاتی ہے۔ یہ راستہ انگریزی کمپنی کی راہ سے زیادہ محفوظ ہے اور اگر کسی شخص کو عجلت نہ ہو تو اسی راہ سے جائے۔ میری موٹر جسمیں اور تین ترک سوار تھے شام سے سہ پہر کو روانہ ہوے اور کچھ دور چلکر شب کو دس بجے صحرا میں ٹھہر گئی اور دوسری موٹر بھی جسکا شوفر ایک محمد علی ہندوستانی تھا ہملوگوں کی موٹر کے ساتھ ٹھہر گئی۔ صبح ہوتے ہی موٹر روانہ ہوئی لیکن ایک یا دو گھنٹہ چلی تھی کہ خراب ہو کر رک گئی۔ شوفر نے بہت کچھ کوشش کی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ہم لوگوں کے مایوسی کی حالت بڑھتی جاتی تھی اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اتفاقاً دو موٹریں Nairn Coy کی قریب ۵ بجے شام کے ہمارے قریب سے بغداد کو جاتی ہوئی گذریں۔ ہم لوگوں نے ہاتھ اُٹھائے ایک تو ٹھہری ہی نہیں۔ لیکن دوسری ایک منٹ کے لئے رک گئی۔ ہمارے شوفر نے اس موٹر کے شوفر سے اپنی موٹر کے خراب ہوجانے کا حال بیان کیا۔

اِس موٹر کے مسافر یورپین تھے اور شوفر بھی فرنچ یا اطالیائی معلوم ہوتا تھا
اُسنے ہنسکر عربی میں کہا کہ تم اب نہیں مرجاؤ اور یہ کہکر چلدیا۔ چونکہ اس صحرائے خطرناک
میں ہر شخص کو نفسی نفسی پڑی رہتی ہے اسلئے ایک شخص دوسرے کی مدد نہیں کرنا چاہتا۔ اب
جوں جوں شام قریب ہوتی تھی ہم لوگوں کی شام غریباں خطرناک تر ہوتی جاتی تھی۔
ترک رفقا میں جو امین آفندی تھے وہ محنت کرنے سے باز نہ آتے تھے اور چونکہ
انھوں نے اسکول میں کچھ انجنیری پڑھی تھی اسلئے وہ کچھ نہ کچھ انجن کے بنانے کی
فکر میں مشغول تھے حسن اتفاق سے قریب غروب کے انجن کچھ ٹھیک ہوا اور ہم لوگ
پھر شام کو واپس ہوے۔ ایک یا دو گھنٹہ چلنے کے بعد صحرا روشنی سے بھرا ہوا دکھلائی دیا
اور بدو عرب اپنے خیمے جنکی تعداد سیکڑوں کی معلوم ہوتی تھی نصب کر رہے تھے۔ یہ
دیکھکر ہم لوگ بہت ہی خوفزدہ ہوے کہ کہیں بدو عرب گولی مارکر ہم لوگوں کو
لوٹ نہ لیں مگر خدا نے خیریت کی اور موٹر بہت ہی سرعت کے ساتھ جلدی قریب
نصف شب کے ہملوگ صحرا میں ٹھہر گئے اور پھر علی الصباح روانہ ہوکر دوپہر کے وقت
دمشق میں پہونچگئے۔ دمشق پہونچتے ہی ہم لوگوں نے پولیس میں جاکر شوفر کی شکایت کی
اور کہا کہ یا تو موٹر والا ہمارا کرایہ واپس کرے یا دوسری اچھی موٹر بغداد تک کیلئے
دے۔ بعد از ہزار زحمت موٹر کا مالک بیروت سے بلوایا گیا اور اُسنے دوسری

موٹر دینے کا وعدہ کیا۔ شب کو پھر دار الفرح ہوٹل میں قیام کیا اور علی الصباح جامع اموی یعنی دمشق کی مشہور جامع مسجد کو جا کر دیکھا۔ اس مسجد میں وہ مقام بنا ہوا ہے جہاں حضرت امام زین العابدینؑ نے اسیری کی حالت میں خطبہ پڑھا تھا۔ مسجد اندر تو آراستہ ہے لیکن صحن خراب حالت میں ہے۔ اسی مسجد کے اندر حضرت یحییٰؑ پیغمبر کا مزار بھی بنا ہوا ہے۔ اہلبیت کے مظالم کی یادگاریں بھی کچھ موجود ہیں۔ حضرت زینبؑ کا مزار شہر سے باہر قریب چار میل کے فاصلہ پر بنا ہوا ہے۔

بارے جمعہ کے روز سہ پہر کو دوسری موٹر میں سوار ہو کر شام سے روانہ ہوا اور چھ سات گھنٹے چلکر شب کو صحرا میں ٹھہر گیا۔ دوسرے روز علی الصباح موٹر روانہ ہوئی اور تمام دن چلکر شب کو پھر صحرا میں ٹھہر گئی۔ دوسرے روز اتوار کے دن بہت سویرے موٹر چلی اور دس بجے دن کو مقام رمادی میں پہونچ گئی۔ چونکہ یہ مقام عراق کی سرحد ہے اسلئے کمرک خانے میں اسباب کا معائنہ ہوا۔ مفتش (انسپکٹر) جو عرب تھا نہایت ہی غور سے اُسنے اسباب کا معائنہ کیا اور آخر میں ایک فارم بھرنے کے لئے دیا اور کہا کہ اسکو بغداد کے گمرک خانے میں لیجا کر دینا۔ وہاں سے روانہ ہو کر فلوجہ پہونچا اور وہاں بھی مختصر سا معائنہ کیا گیا اور ۲½ بجے دن کو بغداد پہونچگیا۔ میں موٹر میں سیدھا گمرک خانہ گیا۔ ملازمین گمرک نے کہا کہ آج اتوار ہے اسباب

گمرک میں چھوڑ جاؤ اور کل آکر لیجانا جب گمرک کا انسپکٹر آیا میں نے اس سے
کہا کہ میں لندن سے آرہا ہوں اور میرے پاس کوئی اسباب قابل محصول نہیں ہے
اُسنے میرے اسباب کا معائنہ نہیں کیا اور کہا کہ تم اپنا اسباب لیجاؤ حالانکہ اُسنے میرے
رفقاے ترک کے اسباب کا بہت ہی سختی سے معائنہ کیا۔ چونکہ میں نے اس سے انگریزی
میں بات کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ میں لندن سے آرہا ہوں اُسنے میرے ساتھ
یہ رعایت کی تھی وہ بالکل ایک نوجوان عرب تھا لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مسلمان
تھا یا یہودی یا نصرانی، اُسنے مجھ سے یہ بھی کہا کہ میں سال آیندہ رخصت لیکر
لندن جاؤنگا۔ میں اپنا اسباب حمال سے اٹھواکر "Wellingdon
Hotel." ولنگڈن ہوٹل گیا جو یہاں کے بہت ہی اچھے ہوٹل موڈ
(Maude Hotel) کے مقابل میں واقع ہے۔ وہاں ایک کمرہ مع خوراک
کے دس روپیہ فی یوم پر لیا۔ چونکہ آج اتوار کا دن تھا اسلئے کثرت سے مرد وعورت
نصرانی، یہودی اور مسلمان بازاروں میں اچھے اچھے لباس پہنے ہوے پھر رہے تھے
لیکن اس مجمع میں مسلمان عورتیں بہت کم معلوم ہوتی تھیں۔ مجھکو اپنے قدیم احباب
سے ملنے کا اسقدر شوق تھا کہ اسی روز شام کے وقت پل کے دوسرے جانب
جو بغداد قدیم کے نام سے مشہور ہے گیا اور وہاں جاکر نواب احمد حسن خانصاحب سے ملا

اُنھوں نے زمانہ جنگ میں بسبب انگریزی رعیت ہونے کے بہت مصائب اُٹھائے تھے لیکن اب بھی اُنکو ویسا ہی خلیق اور زندہ دل پایا جیسا کہ وہ بائیس برس پہلے تھے۔ شب کو آٹھ بجے اُنکے پاس سے ہوٹل واپس آیا اور سفر کی تکان کی وجہ سے کھانا کھاکر فوراً سو رہا۔ اس ہوٹل کا مالک ایک عرب تھا جو علاوہ عربی کے انگریزی اور فرنچ بول لیتا تھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ عراق کا رہنے والا تھا یا شام کا۔ ہوٹل کے کل ملازم عرب تھے اور نہایت صاف کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ البتہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مسلمان تھے یا نصرانی۔ میرے علاوہ چند انگریز، دو تین امریکائی مرد و عورت دو ایک فرنچ اور دو چار شامی و مصری عرب بھی اس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ بجز میرے کوئی دوسرا ہندوستانی نہیں تھا۔ میں دوسرے روز وہاں سے کاظمین چلا گیا اور سید ناصر خادم کے مکان پر قیام کیا لیکن ہر روز کاظمین سے بغداد تھوڑی دیر کے لئے گھوڑے کی ٹریموے پر سوار ہو کر آجایا کرتا تھا بغداد میں میونسپلٹی کی طرف سے تعلیم۔ صفائی۔ اور بجلی کی روشنی وغیرہ کا کافی انتظام ہے۔ حتیٰ کہ میں نے کاظمین میں بھی دیکھا کہ تنگ کوچوں میں میونسپلٹی کا جاروب کش جاکر جھاڑو دیتا تھا اور کوڑے کو اُٹھاکر لیجاتا تھا۔ چونکہ بغداد کے باشندے صفائی وغیرہ کے خواہاں ہیں۔ اسلئے حکومت عراق بھی انگریزی گورنمنٹ کی مدد سے اُنکے لئے ہر امر کا

انتظام کر رہی ہے۔ ہندوستان کے لوگ چونکہ صفائی کے خوگر نہیں ہیں اسلئے اگر یہاں گورنمنٹ کی جانب سے کچھ انتظام بھی کیا جاتا ہے تو عموماً لوگ اُسکو پسند نہیں کرتے جب سے مینوسپلٹی ہندوستانیوں کو دیدی گئی ہے حالت بدتر ہوتی جاتی ہے اور غالباً کچھ دنوں کے بعد سڑک روشنی اور صفائی وغیرہ کی حالت ویسی ہو جائیگی جیسی ہزاروں برس سے تھی۔ یہاں کی تمدنی حالت میں پہلے ہی سے ترقی موجود تھی اور اب تو اور بھی زیادہ ہو گئی ہے تعلیم کی جانب عام توجہ ہو رہی ہے اور بہت سے ابتدائی مدرسے جاری ہو گئے ہیں۔ اِن مدرسوں میں چھ درجے ہوتے ہیں اور تمام مضامین عربی میں پڑھائے جاتے ہیں البتہ چوتھے درجہ سے چھٹے تک انگریزی بطور زبان ثانوی ("Second language.") کے پڑھائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ اور مدارس اعدادیہ یعنی (Intermediate Schools.) بغداد۔ بصرہ اور موصل میں قائم کردئے گئے ہیں۔ میں نے ایک ابتدائی اسکول کو جو کاظمین میں تھا جا کر دیکھا۔ وہاں کی عمارت۔ صفائی۔ فرنیچر اور انتظام تعلیم وغیرہ کو دیکھکر نہایت ہی تعجب ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کا ایک چھوٹا سا ہائی اسکول ہے۔ لڑکیوں کے لئے بھی چند ابتدائی مدرسے کھل گئے ہیں اور اُنکی تعلیم روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ بغداد میں عورتوں کا ایک کلب بھی

قائم ہوگیا ہے اور تعلیم یافتہ عورتوں نے سیاسی اور تمدنی معاملات میں حصہ لینا
شروع کردیا ہے۔ بڑے ڈاکخانہ میں سالار خاں بلوچی سے جو اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر
ہیں ایک اپنے قدیم ملاقاتی فہمی آفندی کا پتہ پوچھکر اُنسے ملنے گیا۔ اب وہ بغداد
میں فہمی المدرس کے نام سے مشہور ہیں جس زمانہ میں میں مع سجاد حیدر صاحب کے بغداد
کے قونسل خانہ میں ترجمان تھا اُسوقت ہم لوگوں سے اور اُنسے بہت ہی گہرے
مراسم تھے اُسوقت وہ معمم اور ریشدار تھے اور ترکی گورنمنٹ گزٹ کے ایڈیٹر تھے۔ اب جب
میں نے اُنکو دیکھا تو وہ یوروپین وضع میں تھے اور چہرہ بھی صاف تھا۔ اثنائے گفتگو میں
معلوم ہوا کہ وہ جدید دار الفنون کے جکا نام "جامعۃ آل البیت" ہے ڈائرکٹر ہیں
اور مبلغ نو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ جو رفتہ رفتہ پندرہ سو روپیہ تک ہو جائیگی
اِس دار الفنون کا نام جامعۂ آل البیت اسوجہ سے رکھا گیا ہے کہ امیر فیصل بادشاہ
عراق جو اُسکے مربی ہیں حسنی نسب کے سید ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بادشاہ کی
موٹر پر جو اُن کو لینے آئی تھی مجھے اِس دار الفنون کے دکھانے کو لیگئے اور برہان الدین
آفندی جو خاندان نقیب کے ایک تعلیم یافتہ جوان تھے اور یوروپین لباس پہنے ہوئے
تھے وہ بھی ہم لوگوں کے ساتھ گئے۔ یہ دار الفنون صیغۂ اوقاف کی طرف سے تعمیر ہو رہا ہے
اور کابینہ یعنی ہیئت وزراء کے زیر نگرانی ہے وزارت معارف یعنی صیغۂ تعلیم سے

اُسکو کوئی تعلق نہیں ہے - ابھی صرف شعبۂ دینیات و ہندسہ کے لئے ایک عمارت
دو منزلہ نہایت ہی خوبصورت و مضبوط تیار ہوئی ہے - نیچے کے حصہ میں دینیات
کے درجے اور اوپر کے حصہ میں ہندسے کے کلاس ہیں - ادب، فنون، حقوق و طب کے
لئے ابھی عمارتیں نہیں تیار ہوسکی ہیں - صرف موجودہ عمارت کی تعمیر میں قریب سات لاکھ
روپیہ کے صرف ہوچکا ہے تعلیم دینیات کیلئے فرنیچر، ریڈنگ روم، مدرسوں کے لئے
میٹنگ روم وغیرہ اسی طرح پر مہیا کئے گئے ہیں جیسا کہ یورپ کے عام کالجوں میں
ہوا کرتے ہیں - اِن دینیات کے درجوں میں علم تفسیر و احادیث وغیرہ کی جو تعلیم ہوتی ہے
وہ بطریق جدید مصر کے طریقہ پر ہوتی ہے - اِس میں شک نہیں کہ اس امر
کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ ہندوستان میں بھی قدیم طریقۂ تعلیم میں اصلاح کیجائے اور
جس طرح کہ علماے قدیم نے یونانی فلسفہ کے مقابلہ میں اصول مذہب اسلام کے اثبات
حقانیت کیلئے اور اسلام پر جو اعتراضات بروئے فلسفہ یونانی وارد ہوتے تھے انکے دفع
کرنے کے لئے علم کلام ایجاد کیا تھا اسی طرح اب ضرورت ہے کہ از روئے فلسفہ اور سائنس جدید
جو اسلام پر اعتراضات وارد ہوتے ہیں انکے رفع کرنے کے لئے ایک خاص قسم کے
علم کلام کی ترتیب دیجائے اور اسی نقطۂ نظر سے نصاب موجودہ کی ترمیم کی جائے -
عربوں کی اس روشن خیالی اور عالی حوصلگی کو دیکھکر جو ہمیشہ سے اُنمیں موجود رہی ہے

نہایت ہی خوشی ہوئی اور فوراً علیگڈھ اور شیعہ کالج یاد آگیا۔ خیر علیگڈھ نے تو بہت کچھ کیا ہے لیکن دیکھئے شیعہ کالج کیا کرتا ہے فوٹ بال و کرکیٹ کا کھیلنا شرعاً جائز قرار دیتا ہے یا نہیں۔ "ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا،، جب کچھ دنوں کے بعد اس دارالفنون کی عمارت مکمل ہو جائے گی اُسوقت یہ قابل دید کالج ہو گا۔ فہمی آفندی نے یہ بھی فرمایا کہ اس دارالفنون میں فارسی اور اردو زبان کی بھی تعلیم ہوگی۔ واضح رہے کہ یہ حضرت فہمی نہ کسی یورپ کے کالج کے تعلیم یافتہ ہیں اور نہ انگریزی جانتے ہیں اور نہ فرنچ۔ البتہ اسلامبول اور مصر میں کچھ دنوں رہے ہیں۔

علاوہ تعلیم کے عراق میں تجارت و زراعت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ ریل اور نہریں بہت سی نکلی ہیں اور روئی کی کاشت کے لئے بہت زیادہ کوشش کی جارہی ہے۔ جیسا پہلے میں نے ذکر کیا ہے۔ عراق میں روپیہ کا سکہ جاری ہے اور بغداد میں انگریزی اُردو کثرت سے لوگ جانتے ہیں اسلئے ہندوستانیوں کو یہاں اسقدر زحمت نہیں پیش آئے گی۔ جیسی دوسرے ملکوں میں ہوگی۔ بغداد میں متعدد ہوٹل ہو جانے کی وجہ سے نہایت ہی آرام سے مسافر قیام کر سکتا ہے۔ منجملہ بہت سے ہوٹلوں کے ولنگڈن۔ موڈ۔ کانٹینٹل۔ ضیار و گرانڈ بہت اچھے ہوٹل ہیں بمبئی و کراچی سے ہفتہ وار جہاز بصرہ کو جاتے ہیں بمبئی سے بصرہ تک اول درجہ کا کرایہ ڈاک کے جہاز میں مع خوراک کے مبلغ تین سو روپیہ ہے لیکن

دوم درجہ کا کرایہ غالباً دو سو یا کچھ کم ہے۔ اگر دو تین شخص باہم سفر کرتے ہوں اور موسم جاڑے کا
نہو تو ڈک (Deck.) پر بھی جا سکتے ہیں۔ ڈک کا کرایہ بمبئی سے بصرہ تک صرف
پینتیس ۳۵ روپیہ ہے۔ کھانے کا انتظام خود کرنا پڑیگا۔ دو تین طالب علم ملکر ڈک پر بہت ہی
آسانی سے سفر کر سکتے ہیں۔ جہاز بصرہ ساتویں دن پہونچ جاتا ہے اور پھر وہاں سے ریل
بغداد تک اٹھارہ گھنٹے میں جاتی ہے سکنڈ کلاس ریل کا کرایہ چوالیس ۴۴ روپیہ ہے لیکن
تیسرے درجے میں بھی آرام سے سفر ہو سکتا ہے اور کرایہ بھی بہت کم ہے۔ علیگڑھ اور
دوسرے کالجوں کے جوان طالبعلموں کو چاہیے کہ تعطیل کے زمانہ میں پانچ چھہ ملکر کم سے کم
عراق کا سفر کر لیا کریں۔ بغداد میں معمولی ہوٹل کا خرچ مع خوراک وغیرہ کے زیادہ سے زیادہ
پانچ روپیہ فی یوم ہوگا لیکن بہتر یہ ہوگا کہ وہ کاظمین میں کسی خادم کے یہاں قیام کریں
اور جب دل چاہے بغداد آدھ گھنٹے میں ٹریموے پر سوار ہو کر چلے جایا کریں۔ جہاں دل
چاہے کھانا کھا لیا کریں زیادہ سے زیادہ دو روپیہ فی یوم صرف ہوگا جب چلنے لگیں تو خادم
پانچ چھہ آدمی ملکر بیس پچیس روپیہ دیدیں۔ کاظمین سے ریل میں سوار ہو کر سامرہ کی
زیارت کرآویں۔ آمد و رفت کا کرایہ مبلغ پانچ روپیہ ہے۔ سامرہ کی آب و ہوا نہایت ہی
اچھی ہے اور وہاں کا خربزہ مشہور ہے حضرت امام علی نقی ؑ اور حضرت امام حسن عسکری ؑ
اور حضرت نرجس خاتون ؑ والدہ حضرت امام مہدی وہاں مدفون ہیں اور یہ روضہ

نہایت ہی اچھا بنا ہوا ہے۔ اس روضہ کا گنبد طلائی تمام مشاہد کے گنبدوں سے بڑا ہے اسی مقام پر مرزا محمد حسن شیرازی مجتہد رہتے تھے جو سرکار مرزا کے لقب سے مشہور تھے انیسویں صدی میں دنیا کے کسی مذہب میں کوئی رئیس روحانی اُنسے زیادہ اپنے مذہب میں مشہور اور بااثر نہیں گذرا ہے جب ناصر الدین شاہ سامرہ گئے تھے اور اُنسے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی تو نہ تو خود شاہ کے قیامگاہ پر گئے نہ اُنکو اپنے مکان پر آنے دیا بلکہ اُنسے حرم عسکریین میں ملاقات کی تاکہ دید و بازدید کا سوال نہ پیش ہو۔ اُنکی وفات سامرہ میں ہوئی تھی اور اُنکا جنازہ تخت روال میں ہزاروں آدمی اپنے کاندھوں پر قریب ۱۰۰ میل کے نجف اشرف تک لیگئے تھے۔ سامرہ میں چونکہ سنی المذہب کی آبادی کثرت سے ہے اسلئے وہ لوگ اُنکا جنازہ سامرہ کی سرحد یعنی دریاے دجلہ کے اُس پار تک جو شہر سے قریب تین میل کے ہے خود اپنے ہی کاندھوں پر لیگئے اور شیعوں کو جنازہ میں شریک نہیں ہونے دیا اور اسکے بعد پھر شیعہ جنازہ کو لیگئے۔ بغداد و کاظمین میں تمام ترکی حکام نے مع والی پاشا، کمانڈر انچیف اور ترکی فوج کے اُنکے جنازہ کی مشایعت کی۔ کاش کہ ہندوستان میں بھی شیعہ علما کے جنازہ کے ساتھ سنی اور سنی علما کے جنازہ میں شیعہ اسی طرح پر شرکت کرتے۔ اُن مرحوم کے چند واقعات ہیں جو نہایت ہی حیرت انگیز اور دلچسپ ہیں لیکن بسبب طوالت کے اُن کا ذکر نہیں کر سکتا منجملہ اور باتوں کے یہ بات خاص قابل ذکر ہے کہ جب پہلے پہل میں

ہندوستان سے سامرہ پہونچا اور انکی خدمت میں حاضر ہوا تو جب انکو یہ معلوم ہوا کہ میں انگریزی خواں طالب علم ہوں تو نہایت درجہ میری قدر فرمائی اور یہ فرمایا کہ ایسے طالب علم جو انگریزی کے ساتھ عربی بھی جانتے ہیں وہ زیادہ قابل قدر ہیں اسلئے کہ اس زمانہ میں ایسے لوگوں سے اسلام کو بہت کچھ فائدہ پہونچ سکتا ہے چنانچہ میرے زمانہ قیام میں بعض طلبا نے مثل پسر جناب مرزا حسین نوری مرحوم کے مجھسے انگریزی پڑھنی شروع کر دی تھی۔

سامرہ میں کچھ آثار خلفائے قدیم کے ابتک موجود ہیں کیونکہ بسبب خوبی آب و ہوا کے بہت سے خلفائے بنی عباسیہ نے اپنا پایہ تخت اسی مقام کو قرار دیا تھا مسافر کو چاہیے کہ سامرہ سے کاظمین واپس آ کے اور کاظمین سے پھر ریل کے ذریعہ سے کربلائے معلی اور وہاں سے موٹر میں سوار ہو کر نجف اشرف کی بھی زیارت سے مشرف ہو جائے نجف سے کوفہ بہت ہی قریب ہے عبرت کے لئے اُس مقام کو بھی دیکھ لے۔

## فصل چہارم از بغداد تا طہران

شنبہ کے روز کاظمین سے قریب دس بجے دن کے موٹر میں روانہ ہوا میرے ساتھ تین اور ایرانی مسافر تھے جو طہران جا رہے تھے۔ ہم لوگوں نے مبلغ چھ سو روپیہ پر ایک بالکل نئی فورڈ موٹر کرایہ کی تھی۔ میں نے اپنے حصے کا مبلغ ڈیڑھ سو روپیہ پیشتر ہی دیدیا۔ اگر انگریزی یا فرنچ کمپنی کے موٹر میں جاتا تو مبلغ ۲۵ پونڈ یعنی قریب تو تین سو چالیس

روپیہ کے دینے پڑتے۔ اگر میرا ساتھ ان طہرانی مسافروں کا نہوتا تو میرا ارادہ انھیں دو-
کمپنیوں میں سے کسی ایک کی موٹر میں جانے کا تھا جیسا کہ میں نے واپسی کے وقت طہران
سے کیا تھا۔ موٹر قریب ۴ بجے کے خانقین پہونچی اور بعد معائنہ گمرک کے وہیں ایک ہوٹل
میں ایک کمرہ لیکر ہم لوگ ٹھہر گئے بغداد سے خانقین تک ریل بھی آٹھ گھنٹے میں جاتی
ہے لیکن پھر وہاں سے طہران کے لئے موٹر ملنے میں دقت پیش آتی ہے اسلئے ہملوگوں نے
کاظمین ہی سے طہران تک کے لئے موٹر کرلی تھی

دوسرے روز اتوار کے دن صبح کو موٹر چلی اور راستہ میں دو مقام
ایک سرحد عراق اور دوسرا سرحد ایران پر گمرک کا معائنہ ہوا اور پھر ظہر
کے وقت ہم لوگ قصر شیریں پہونچ گئے۔ وہاں بھی گمرک کا معائنہ ہوا
اور وہاں سے چلکر ایک گھنٹہ رات گئے کرماں شاہ پہونچ گئے یہاں میں نے ایک ہوٹل
میں جسکا مالک ایک یونانی تھا قیام کیا اور ایک تومان یعنی تین روپیہ اور کچھ آنے
فی شب کرایہ دیا اور شہر میں جاکر ایک رستوران میں کھانا کھایا۔ یہ شہر بہت ہی قدیم ہے
کوچے بہت تنگ اور بازاریں چھت دار ہیں۔ شہر تو البتہ اچھا ہے وہاں بڑی عمارتیں
اور چوڑی سڑکیں ہیں۔ یہاں سے دو میل کے فاصلہ پر طاق بستان ہے جہاں پہاڑ
میں چند قدیم تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ رستم کا مجسمہ (Statue.) ایک پتھر کے

گھوڑے پر نہایت ہی عمدہ بنا ہوا ہے۔ دوسری محراب میں میخی خط میں کچھ لکھا ہوا ہے لیکن میں اسکو پڑھ نہ سکا۔ اس شہر میں ایک بہت بڑے زمیندار ہیں جو معاون الملک کے لقب سے مشہور ہیں وہ ایک نہایت ہی شاندار خوبصورت تصاویر و نقش و نگار سے مزین حسینیہ یعنی امام باڑہ تعمیر کر رہے ہیں اِس سے عمدہ امام باڑہ غالباً تمام ایران میں کہیں نہیں ہے ایک روز یہاں قیام کیا اور شب کو ایک ایرانی تاجر کے یہاں اپنے طہرانی رفقا کے ساتھ مہمان ہوا۔ مہمانی نہایت ہی پر تکلف تھی اور بہت سے ایرانی تاجروں سے وہاں ملاقات ہوئی۔ دوسرے روز سہ شنبہ کی صبحکو کرمانشاہ سے روانہ ہوکر غروب کے وقت ہم لوگ ہمدان پہونچگئے اور میں ہوٹل اقتصاد میں ایک کمرہ لیکر ٹھہر گیا۔ کرایہ ۵ قران یعنی قریب ۱۲/ کے شب کے حساب سے دیا۔ صبحکو ایک سلمانی یعنی (Hair dresser.) کی دوکان پر بال کٹانے گیا نائی نے بال کاٹتے وقت مسائل سیاسی پر اس طرح مجھسے گفتگو کی جیسا ہندوستان میں ایک اخبار پڑھنے والا معمولی گریجویٹ کرتا ہے۔ میں نے اخبار پڑھنے کی اسوجہ سے قید لگائی کہ ہندوستان میں بہت سے گریجویٹ اور تعلیم یافتہ اشخاص ہیں جو اخبار کو مہینوں یا مطلق نہیں پڑھتے۔ اثنائے گفتگو میں اُسنے مجھسے یہ بھی کہا کہ آپ یورپ کو چھوڑکر ایران کیوں آئے کیونکہ ایران میں مسافروں کو بہت سخت تکلیف ہوتی ہے۔ بال کاٹنے کے بعد اُسنے مجھکو چائے پلائی۔ چلتے وقت میں نے

اُسکو دو قران یعنے قریب دس آنے کے دئے اور اُسنے میرا شکریہ ادا کیا۔ سہ پہر کو بابا طاہر کے قبر کی زیارت کرنے گیا۔ مقبرہ بہت ہی خراب حالت میں تھا اور باوجود متوفات ہونیکے کوئی سامان نہ تھا۔ وہاں کے مجاور ایک جوان سید تھے جنھوں نے اثنائے گفتگو میں کہا کہ اُنکے جد بزرگوار کشمیر سے آئے تھے فوراً ہی میرے دل میں خیال گذرا کہ اگر یہ حضرت کشمیری الاصل ہیں تو وقف کو خوب کھاتے ہونگے۔ یہ شہر تجارت کا بہت ہی بڑا مرکز ہے اور یہاں کے قدیم باشندے اکثر یہودی ہیں یہاں ہر قسم کا میوہ بکثرت پیدا ہوتا ہے اور بہ نسبت کرمان شاہ قزوین اور طہران کے یہ زیادہ سرد مقام ہے یہاں کی آب و ہوا نہایت ہی اچھی خیال کی جاتی ہے۔ ایک روز یہاں قیام کیا اور سہ پہر کو شہر کے باہر گردش کرنے گیا۔ شہر کے باہر کثرت سے باغ ہیں اور یہاں کا جدید سربازخانہ (Barrack.) نہایت ہی عظیم الشان بنا ہوا ہے۔ شہر کے باہر انگریزوں کا ایک قبرستان دیکھا اور اُسپر "British military Cemetery" لکھا ہوا تھا جس سے معلوم ہوا کہ زمانہ جنگ میں جب (Dunster force.) کی فوج یہاں مقیم تھی اُسوقت کچھ انگریز افسر اور سپاہی اس قبرستان میں دفن کئے گئے تھے یہاں ایک امریکائی مریضخانہ یعنی ہسپتال بھی بنا ہوا ہے۔ پنجشنبہ کو ہملوگ ہمدان سے روانہ ہوے اور غروب سے دو گھنٹے پہلے قزوین میں پہونچ گئے۔ یہاں میں نے ایک

ہوٹل میں جسکا نام (Grand Hotel.) ہے ایک کمرہ ۵ قران یعنی
عہ ۱۱ر فی شب کرایہ پر لیکر قیام کیا۔ کھانا رستوران میں کھانے گیا بلکہ ہوٹل ہی میں کھا لیا۔
اور اسکی قیمت علیحدہ دی اِس شہر کے لوگ ترکی۔ فارسی اور روسی عموماً جانتے ہیں اور بہت سے
لوگ انگریزی حتیٰ کہ اردو بھی بول لیتے ہیں۔ چونکہ یہاں بھی جنگ کے زمانہ میں انگریزی اور
ہندوستانی فوج ٹھہری ہوئی تھی اِسلئے بازار کے کاسبوں نے انگریزی اور اُردو دیکھ لی
تھی۔ سہ پہر کو میں شہر گھومنے گیا اور جامع مسجد اور مقبرہ حسین بن امام علی رضا کو جا کر دیکھا
مسجد نہایت ہی قدیم اور عظیم الشان ہے لیکن بہت ہی بُری حالت میں ہے مقبرہ کی عمارت
نہایت ہی خوبصورت ہے۔ مرزا علی اصغر خاں صدر اعظم نے اُسکو تعمیر کرایا تھا۔ ایران اور
خصوصاً قم میں صدر اعظم مرحوم نے بہت سے مقبرے تعمیر کرائے ہیں اور تمام مقبروں کی
عمارت ایک ہی سی ہے جمعہ کے روز صبح کے وقت قزوین سے روانہ ہوئے اور بعد
از ظہر طہران پہونچ گئے۔ جب ہملوگ شہر کے قریب پہونچے تب میرے رفقا کے اعزا
واحباب اُن لوگوں کے استقبال کو آئے اور میں بھی آقا غلام حسن تبریزی کے ساتھ انکے
مکان پر چلا گیا اور شب کو انھیں کا مہمان رہا۔ مہمانی نہایت پر تکلف تھی اور قریب
۵۰ آدمی کے دسترخوان پر موجود تھے۔ چائے اور شیرینی کا سلسلہ کئی دن تک جاری رہا
دوسرے روز میں اپنے ایک پرانے ملاقاتی مرزا علی اصغر کاشف سے تیمچہ صدر اعظم میں

جاکر ملا۔ ایران میں تیمچہ اُس عمارت کو کہتے ہیں جہاں پر تاجروں کا آفس ہوتا ہے۔ اُنھوں نے چائے پلائی اور پھر میرے ساتھ وہ مکان کی تلاش میں چلے۔ چونکہ فوراً کوئی اچھی جگہ قیام کے لئے نہ ملسکی اسلئے ہوٹل اقتصاد میں جاکر ٹھہر گیا تین قران یعنی ایک روپیہ فی شب کرایہ طے ہوا اور کھانا جس رستوان میں دل چاہتا تھا جاکر کھالیا کرتا تھا۔ پہلے میں نے چاہا تھا کہ گرانڈ ہوٹل میں جاکر قیام کروں لیکن میرے دوستوں نے وہاں جانے سے منع کیا کیونکہ وہاں کا کرایہ کچھ زیادہ تھا دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ بغیر خوراک کے تین اور پانچ روپیہ فی یوم کی شرح تھی۔ چند اور ہوٹل طہران میں ہیں لیکن اسقدر نہیں ہیں جتنے بغداد میں اور نہ بہت آرام دہ ہیں۔ ایک ہفتہ اس ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد بانک قاسم مرزا صابری سے ملاقات ہوئی یہ وزارت مالیہ میں کلرک ہیں اور اُن کو میں شاہرود سے جانتا تھا۔ میں نے اُنسے اپنے لئے ایک مکان کی خواہش ظاہر کی تو اُنھوں نے کہا کہ تم میرے مکان میں آکر رہو۔ میں تم کو ایک کمرہ دیدوں گا اور کھانا بھی اپنی بیوی سے پکوا دیا کروں گا چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور اُنکے یہاں جاکر مثل بورڈ کے رہنے لگا۔ قریب پچاس روپیہ مہینہ کے میں کمرہ اور کھانے کے لئے دیتا تھا۔ صبح اور عصر چائے پیتا تھا اور دوپہر اور شب کو جو کھانا اُن کے یہاں پکتا تھا اُنکے ساتھ کھاتا تھا۔ کمرہ بھی نہایت

تکلف سے سجا ہوا تھا اور تمام ضروری چیزیں اسمیں موجود تھیں۔ اگرچہ اس قسم کا رواج طہران میں نہیں ہے لیکن انھوں نے میرے ساتھ خاص مہربانی کی تھی۔ طہران چونکہ بہت قدیم شہر نہیں ہے اِسلئے نہ تو بہت گنجان آبادی ہے اور نہ اسمیں تنگ کوچے اور گلیاں ہیں۔ سڑکیں بہت ہی چوڑی اور سیدھی بنی ہوئی ہیں اور عموماً سڑکوں کے دونوں جانب درخت لگے ہوے ہیں جیسا پیرس میں۔ ایسے مقامات کو یہاں خیابان اور فرانس میں بلوار ( Baulevard ) کہتے ہیں تمام ایشیائی ملکوں میں کوئی ایسا شہر نہیں ہے جہاں اسقدر خیابان ہوں جسقدر طہران میں ہیں منجملہ بیسیوں خیابان لالہ زار۔ خیابان ناصری۔ خیابان چراغ برق خیابان حسن آباد۔ خیابان دوشن تپہ۔ خیابان نادری خیابان حاجی ملا ہادی وغیرہ بہت اچھے خیابان ہیں۔ جس طرح لکھنؤ میں امین آباد حضرت گنج و چوک ہے اسیطرح یہاں خیابان لالہ زار و خیابان ناصری سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کی آبادی صرف قریب ڈھائی لاکھ کے ہے۔ لیکن چونکہ عموماً مکان بہت کشادہ ہیں اور قریب قریب ہر اچھے مکان کے اندر ایک باغ ہوتا ہے اِسلئے شہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے اور ناواقف مسافر یہ خیال کریگا کہ یہاں ۸-۱۰ لاکھ آدمی رہتے ہونگے۔ چونکہ شہر نہایت ہی کھلا ہوا ہے۔ اِسلئے یہاں کی آب و ہوا بہت ہی اچھی ہے۔

بلدیہ یعنی منیوسپلٹی بہت سرگرمی سے کام کرتی ہے اور شہر کی صفائی اور برقی روشنی وغیرہ کی جانب خاص توجہ کی جاتی ہے۔ البتہ جاڑوں میں جب برف باری ہوتی ہے اُسوقت سڑکوں پر اسقدر کیچڑ ہوتی ہے کہ چلنا دشوار ہوجاتا ہے اب تک گھوڑے کی ٹریموے چلتی ہے لیکن عنقریب برقی ہوجائے گی۔ گھوڑے گاڑیاں اور موٹریں کثرت سے کرایہ پر چلتی ہیں۔

طہران میں کوئی خاص عمارت نہیں ہے جسکا خاص طور پر ذکر کیا جاوے البتہ مسجد سپہ سالار اعظم نہایت ہی عظیم الشان ہے لیکن اسکا ایک حصہ ناتمام رہگیا ہے اُمرا کے ذاتی مکان البتہ نہایت ہی عمدہ ہیں اور ہر مکان کے اندر اکثر پارک یا کم سے کم بڑا سا باغ ہوتا ہے تمام مکانوں میں اتابک مرحوم کا مکان اور پارک نہایت عظیم الشان ہے اسمیں اب روس کا سفارت خانہ ہے۔ مجلس شوریٰ و بلدیہ و مدرسہ حربیہ کی بھی عمارتیں عمدہ ہیں۔ شاہی عمارتیں باہر سے تو بہت ہی معمولی معلوم ہوتی ہیں لیکن اندر سے نہایت اچھی ہیں اور نقش و نگار سے پُر ہیں۔

تعلیم کی جانب لوگوں کا بہت ہی زیادہ خیال ہے اور لڑکے اور لڑکیوں کے مدارس کافی تعداد میں ہیں جس خاندان میں تعلیم کا رواج ہے اسمیں لڑکے اور لڑکی کو برابر تعلیم دی جاتی ہے۔ البتہ جس خاندان میں تعلیم کا چرچا نہیں ہے اسمیں لڑکا اور

لڑکی دونوں محروم رہتے ہیں۔ ہندوستان کی طرح نہیں ہے کہ بیٹا تو گریجویٹ ہے، اور لڑکی قرآن پڑھ لینے سے زیادہ کچھ نہیں جانتی اور بعض شرفا کے خاندان میں ایسی ہی لڑکیاں ہیں کہ قرآن بھی نہیں پڑھ سکتیں۔ علاوہ ایرانی مدرسوں کے تین مدرسے فرانسیسیوں کے ہیں اور دو بہت بڑے اسکول امریکائیوں کے ہیں ایک لڑکوں کے لئے اور دوسرا لڑکیوں کے لئے۔ اب امریکائی شہر کے باہر ایک بہت بڑا کالج تعمیر کر رہے ہیں اور بعد تعمیر ہو جانے کے اسکا شمار ایران کی بہت بڑی عمارتوں میں ہوگا۔ میرے خیال میں کئی لاکھ روپے اسکی تعمیر میں صرف ہو چکے ہیں اور اب بھی اسکی تکمیل میں دو تین لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

علاوہ ابتدائی و متوسط مدرسوں کے ایک دارالفنون بھی ہے جہاں فی الجملہ اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ مدرسہ طب۔ مدرسہ حقوق یعنی (Law College) جسکا پرنسپل ایک نہایت ہی قابل فرنچ ہے اور مدرسہ ارکان حرب یعنی Staff College بھی یہاں کے عمدہ درسگاہوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ دارالفنون میں ایک شعبہ تعلیم موسیقی کا بھی ہے لیکن تعجب ہے کہ یہاں کے علماء اور خصوصاً سید حسن مدرس و امام جمعہ خوئی جنکا شہر میں زیادہ اثر ہے اسکی مخالفت نہیں کرتے۔

علاوہ اِن مدارس کے یہودی اور ارمنیوں کے بھی مدرسے ہیں۔ ایک کانونٹ اسکول

(Convent school) بھی ہے جسمیں فرنچ کی راہبات یعنی (Sisters) تعلیم دیتی ہیں۔ روسیوں کے بھی مدرسے ہیں جہاں اُنکے لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔ یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ عموماً فرنچ جانتے ہیں۔ اور اب انگریزی کا بھی رواج کثرت سے ہو گیا ہے اور بالخصوص جب سے امریکائی مستشار (.Advisers) ایران کے ادارہ مالیہ میں مستخدم ہوئے ہیں۔

اخبار یہاں کثرت سے نکلتے ہیں اور متعدد قرأت خانے یعنی (Reading Rooms) ہیں جہاں لوگ جاکر مفت اخبار پڑھتے ہیں۔ یہ قرأت خانے عموماً کسی ایک شخص کے یا کسی خاص حزب کے قائم کردہ ہیں اور اُن کو محکمہ تعلیم یا بلدیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اکثر قرأت خانہ "طوفان" میں عصر کے وقت جاکر اخبار پڑھا کرتا تھا یا کتب بینی کیا کرتا تھا۔ میں نے اس قرأت خانہ کے ایک کمرہ میں دنیا کے قومی لیڈروں کی تصویریں دیکھیں جنمیں مہاتما گاندھی کو بھی وہاں موجود پایا۔ ذیل میں چند اخباروں کا نام لکھتا ہوں جس سے طہران میں روزنامہ نگاری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ "ایران، ستارہ ایران۔ کوشش۔ میہن۔ قانون۔ وطن۔ شفق سرخ۔ حیات ایران۔ نسیم صبا۔ حلاج۔ توفیق۔ فکر آزاد۔ ناہید۔ محشر۔ شہاب۔ تجدد۔ جنت۔ آسائش۔ طلوع۔ شمس۔ پیک۔ آواز تاجیک۔

ارمغان۔ نسیم شمال وغیرہ بعض اخبار شاید انہیں سے ایسے ہی ہوں جو کسی دوسرے شہر میں طبع ہوتے ہیں اور طہران کے قرأت خانوں میں پڑھنے کے لئے بھیجدیئے جاتے ہوں لیکن بیشتر انمیں ایسے ہیں جو طہران میں شایع ہوتے ہیں۔ اگر ایران کے تمام اخباروں کا شمار کیا جاوے تو غالباً انکی تعداد قریب سَو کے ہو گی۔ واضح رہے کہ تمام ایران کی آبادی دو کروڑ سے زیادہ نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کم ہو۔ یہاں چند کلب بھی ہیں اور سب سے اچھا فوجی کلب ہے امریکن اسکول کے طلاب کا بھی ایک کلب ہے جو مجمع جوانان ایران کے نام سے مشہور ہے اور جہاں اکثر شب میں مختلف مضامین پر لکچر بھی دیے جاتے ہیں ایرانیوں میں بسبب تعلیم اور روشن خیالی کے تعصب ہی کا نام نہیں۔ تبرا یا ایسی چیزوں کا جن سے سنیوں کے دل کو صدمہ پہونچے۔ مطلق رواج نہیں ہے اگر کسی ایرانی سے تبرا کا لفظ کہا جاوے تو وہ ہرگز نہیں سمجھیگا کہ اُس سے کیا مراد ہے۔ بجز اعیاد اسلام اور ایام ولادت ائمہؑ کے اور کسی دن کو وہ عید کا دن نہیں قرار دیتے۔ سنی۔ یہودی۔ پارسی اور ارمنی بالکل آزاد ہیں اور کسی دوسرے کے مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے پارلیمنٹ میں پارسی۔ یہودی اور ارمنی کے نمائندے منتخب ہوتے ہیں اور ان دنوں مجلس شورے کا منتظم ایک پارسی ہے جسکا نام ارباب کیخسرو ہے اور جو طہران میں بہت ہی محترم ہے۔

ہر روز عصر کے وقت ایک فوجی بینڈ میدان سپہ میں عمارت بلدیہ کے مقابل اور دوسرا میدان مجلس میں بجا کرتا ہے۔ موزیک سننے کے لئے ہزاروں مرد و زن جمع ہوا کرتے ہیں مغرب کی اذان ہوتے ہی بینڈ بند ہو جاتا ہے لیکن کبھی کبھی بعد ختم اذان بجنا شروع ہوتا ہے مجلس شوریٰ ان دنوں قاعدہ سے کام کر رہی ہے اور اکثر وکلائے مجلس پابندی کے ساتھ مجلس میں شرکت کرتے ہیں۔ ممبران مجلس میں سید حسن مدرس نہایت ہی با اثر و قابل شخص ہیں۔ اگرچہ وہ نجف اشرف کے تعلیم یافتہ ہیں اور جدید علوم سے بالکل ناواقف ہیں لیکن اُنکی ایک تقریر جو میں نے وضع مالیات ارض یعنے قانون مالگذاری کے متعلق سنی تھی اُس سے معلوم ہوا کہ اُن کو اکثر مسائل اقتصادی و سیاسی میں کافی مہارت حاصل ہے۔ مرزا حسین علائی جو اس سے پیشتر امریکہ میں سفیر تھے اور نصرۃ الدولہ فیروز مرزا جو سابق میں، وزیر امور خارجہ کے عہدے پر فائز تھے اور تقی زادہ جو اس سے قبل برلن میں مجلہ کاوہ کے مدیر تھے مجلس کے قابل ممبروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اندنوں مجلس کے رئیس یعنی (Speaker) آقا موتمن الملک ہیں جو نہایت ہی قابل قانون دان اور مدبر شخص ہیں۔ اُنکے بھائی آقا مشیر الدولہ بھی مجلس کے ممبر ہیں جو نہایت ہی باعلم و تجربہ کار ہیں اور بہت ہی خاموشی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ بعضے واقعات مجلس شوریٰ کے میں لکھتا۔ اگر

اگر خیال طوالت مانع نہ ہوتا۔

ایران کی انتظامی حالت ان اوقات میں بہت ہی غنیمت ہے اور اسمیں شک نہیں آقا رضاخاں سردار سپہ نے بہت کچھ اصلاح کردی ہے۔ محکمہ جنگ میں بہت کچھ ترقی ہوگئی ہے اور اسوقت ایران میں قریب ساٹھ ہزار فوج کے موجود ہے۔ بہت سے افسروں نے فرانس و جرمنی میں تعلیم پائی ہے اور جو یہاں کے مدرسہ حربیہ کے تعلیم یافتہ ہیں وہ بھی نہایت خوش اسلوبی سے اپنے خدمات کو انجام دے رہے ہیں۔ راستوں میں بہ نسبت پہلے کے بہت ہی اطمینان بخش امن و امان قائم ہوگئی ہے اور بجز اسکے کہ حال میں ایک حملے ترکمانوں نے مشہد و شاہرود کے درمیان قافلوں پر کردئے تھے اور کوئی ڈاکے نہیں پڑے۔ ایران و عرب میں عام طور پر اس قدر ڈاکے نہیں پڑتے جتنے ہندوستان میں ڈالے جاتے ہیں۔

نظمیہ یعنی پولیس کا انتظام بہت ہی قابل تعریف ہے اور زمانہ جنگ میں مجکو مشہد کی پولیس کے ساتھ بہت کچھ کام کرنے کا اتفاق ہوا لیکن میں نے عموماً پولیس کو بہت ہی بادیانت پایا۔ پولیس پبلک کو بہت کم موقع شکایت کا دیتی ہے اور رشوت ستانی یا جھوٹے مقدمات بنانے کی شکایات بہت ہی کم ہوتی ہیں۔ اسمرتبہ طہران میں میں نے پولیس کو اپنے وظائف منصبی کے انجام دینے اور پبلک کے ساتھ تہذیب و شائستگی سے سلوک کرنے میں نہایت ہی سرگرم پایا۔

یہ پولیس کا حسن انتظام ہے کہ اکثر شہروں میں عام طور پر چوری و نقب زنی نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں جسقدر سرقہ کا جرم ہندوستان میں ہوتا ہے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہوتا۔ بیت Finance Deptt ادارہ مالیہ میں بھی بہت کچھ اصلاح ہو گئی ہے اور قریب بس بارہ امریکن مستشار کے اس میں مستخدم ہیں مستشار کل Administrator General ڈاکٹر ملیسپو Dr Milispaugh امریکن ہے جسکو بہت وسیع اختیارات دئے گئے ہیں۔ خزانہ گمرک۔ ڈاکخانہ وغیرہ کے حسابات کی جانچ امریکاموں کے متعلق ہے۔ اگرچہ کچھ دنوں اسیطرح امریکن خدمت انجام دیتے رہیں اور موانع خارجی و داخلی نہ حائل ہوں تو یہ ادارہ نہایت ہی منظم و مرتب ہو جائے گا۔ ہر اسلامی و مذہبی عید کے موقع پر شاہ یا ولیعہد جو ان دونوں شاہ کے چھوٹے بھائی ہیں دربار میں رسم سلام کے لئے تشریف لاتے ہیں اور سلام کے شروع ہوتے ہی توپ چلنے لگتی ہے اور ایک سو دس آواز ہیں ہوتی ہیں کیونکہ لفظ علی کا عدد بحساب ابجد ۱۱۰ ہوتا ہے۔

جو لوگ سلام کے لئے دربار میں حاضر ہوتے ہیں اُن کا لباس عام طور پر سیاہ فراک کوٹ یا سیاہ سرداری جو ایک شیروانی سے مشابہ ہوتی ہے اور دھاری دار یا سیاہ پتلون اور سیاہ جوتا ہوتا ہے۔ جو لوگ سرداری پہنے رہتے ہیں اُنکو کالرو

ٹائی لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن فراک کوٹ والوں کو سخت کالر اور سیاہ
ٹائی پہننی پڑتی ہے۔ اسکے علاوہ ہر شخص بالتو یعنی اورکوٹ ( Over coat ]
یا عبا اوپر سے پہنکر جاتا ہے۔ لیکن اطاق پذیرائی ( Reception room )
میں داخل ہونے سے پہلے اپنے بالاپوش کو Cloak . room یعنی
بیرونی کمرہ میں چھوڑ دیتا ہے۔ جیسا تمام لوگ اُطاق پذیرائی میں جمع ہوجاتے ہیں
اُسوقت ہر شخص فرداً فرداً دوسرے کمرہ میں شاہ یا ولیعہد کی خدمت میں پیش
کیا جاتا ہے اور جاکر تعظیم کرتا ہے۔ شاہ یا ولیعہد اُس سے علیٰ قدر مراتب کھڑے
کھڑے مزاج پرسی کرتے ہیں۔ اس طرح شاہ ہوں یا ولیعہد اُن کو گھنٹوں کھڑے رہنا
پڑتا ہے۔ میں جب عیدِ ولادت حضرت علیؑ میں ولیعہد کی خدمت میں حاضر ہوا تو
وہ مجھ سے نہایت ہی خلق سے پیش آئے اور میرے بامحاورہ فارسی بولنے پر
بہت تعجب کیا اور اپنے مصاحبین خاص کی طرف خطاب کرکے فرمایا کہ" ایں
آقا خیلے خوب بامحاورہ حرف می زند۔ اُسکے بعد اُنھوں نے آگرہ کے تاج محل کی
بہت ہی تعریف کی میں نے بھی لکھنؤ کے دونوں امام باڑوں کا ذکر کیا۔ اُس پر
اُنھوں نے کہا کہ میں لکھنؤ اسٹیشن سے گذرا تھا اگر مجھ کو معلوم ہوتا تو میں ضرور جاکر
اُن کو دیکھتا۔

طہران اور دوسرے بڑے شہروں میں تعلیم یافتہ ایرانیوں کا لباس عام طور پر یوروپین ہے بجز اسکے کہ سیاہ ٹوپی اور اوپر سے عبا پہنتے ہیں۔ اس امر کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ جو شخص ایران کو جائے وہاں اسکو ایک عبا خرید لینی چاہیئے تاکہ جب اشخاص محترم سے ملنے یا مقدس اماکن یا مذہبی جلسوں میں جائے تو اُسکو ضرور پہن لیا کرے ایران میں بدون عبا یا بالتو ( Over Coat ) کے ایسے موقعوں پر جانا نہایت ہی بدتہذیبی خیال کیا جاتا ہے۔ عورتوں کا بھی لباس یوروپین (ادہ باٹی) ہوگیا ہے البتہ اوپر سے وہ سیاہ ریشمی چادر یعنی برقع پہنتی ہیں۔ عورتیں عموماً انگریزی جوتے اونچی اڑیوں کے مثل فرنچ اور انگریزی لیڈیوں کے پہنتی ہیں۔ مجھکو انکو تیز چلتے ہوے دیکھکر نہایت ہی حیرت ہوتی تھی کہ اس خراب اور اونچی نیچی سڑکوں پر اور برف باری کے بعد یخ بستہ کوچوں میں وہ کیونکر ایسے اونچے جوتے پہنے ہوے اس تیزی سے چلتی ہیں کہ دنیا میں کسی قوم کی عورتیں سوائے انگریزی اور امریکن کے ایرانی عورتوں سے زیادہ تیز نہیں چل سکتیں۔ عورتیں عام طور سے ہر شریف و وضیع کی اپنے گھروں سے باہر جاتی ہیں اور بازاروں میں خرید و فروخت کرتی ہیں جمعہ اور دوسری مذہبی اعیاد میں ہزاروں عورتیں شاہ عبدالعظیم کو جو طہران سے تین چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے زیارت و گردش کے لئے جاتی ہیں۔ اسی طرح

گرمیوں میں ہر روز کثرت سے عورتیں شمیران کو جو طہران سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے سیر و تفریح کے لئے جاتی ہیں۔

ایران میں بھی مثل دیگر ایشیائی اور یوروپین ممالک کے چند مخصوص مراسم ہیں جو دوسرے ملکوں میں نہیں ہوتے مثلاً عید نوروز جو ایرانیوں کی قومی عید ہے نہایت ہی جشن و اہتمام سے منائی جاتی ہے۔ آفتاب کے برج حمل میں داخل ہوتے ہی خوشی کے مراسم ادا کئے جاتے ہیں اور اسی وقت سے نیا سال شروع ہو جاتا ہے۔ ہر شخص اس روز نئے کپڑے پہنتا ہے اور تحویل آفتاب سے پہلے ہر گھر میں تمام خاندان ایک صاف و پاکیزہ مقام پر جمع ہوتا ہے۔ اور ایک سینی میں سات چیزیں رکھی جاتی ہیں جنکے نام حرف "س" سے شروع ہوتے ہیں اور جنکو ہفت "س" کہتے ہیں مثلاً سرکہ۔ سبزی۔ سیب۔ سیر سیاہ دانہ۔ سنجد۔ سمنو۔ ایک ظرف میں پانی دعا پڑھ کر رکھا جاتا ہے جسمیں سے بعد تحویل کے خاندان کا ہر شخص کچھ پانی پیتا ہے۔ ایک ظرف میں سرخ زندہ مچھلی بھی رکھی جاتی ہے اور انڈا۔ دودھ۔ پنیر۔ دہی۔ مچھلی پکی ہوئی اور بغیر پکی ہوئی اور مرغ پکا ہوا اور بغیر پکا ہوا اور چاندی اور سونے کے سکے بھی رکھے جاتے ہیں۔ مختلف رنگ کی شمع روشن کی جاتی ہیں خواہ تحویل آفتاب دن کو واقع ہو یا شب کو اور وہ خاموش نہیں کی جاتی ہیں مگر یہ کہ خود ہی جلکر تمام ہو جائیں۔ ہر شخص جنتری سے تحویل کے وقت کو

ساعت اور دقیقہ اور ثانیہ کے ساتھ جانتا ہے اور صاحب خانہ تحویل سے پہلے اپنے
مکان کے باہر چند دقیقہ کے لئے چلا جاتا ہے اور جوں ہی تحویل کا وقت آیا وہ مکان
میں داخل ہوتا ہے اور اپنے گھر کے لوگوں کو سونے کے سکے بطور عیدی کے دیتا ہے
تحویل کے وقت عموماً لوگ ایک مخصوص مختصر سی دعا پڑھتے رہتے ہیں۔ عید سے کچھ
دنوں پہلے لوگ اپنے گھروں میں کسی ظرف گلی یا مٹی میں جو گیہوں یا پھول وغیرہ بو دیتے
ہیں اور عید کے روز دسترخوان پر اُس سبزی کو بھی رکھ دیتے ہیں اور تیرھویں روز جب
تمام لوگ نحوست سال کو دور کرنے کے لئے گھروں سے باہر جاتے ہیں اور جسکو سیزدہ بدر
کہتے ہیں اُس سبزی کو لیجا کر میدان میں پھینک دیتے ہیں۔ جوان ناکتخدا لڑکیاں
سبزی پھینکتے وقت کہتی ہیں "سیزدہ بدر سال دگر۔ خانۂ شوہر بچہ بہ بغل" اور صحرا
میں جو سبزی ہوتی ہے اُسمیں گرہ لگاتی ہیں اور کہتی ہیں "زردی من از تو، و سبزی تو
از من" سیزدہ بدر کی ایسی رسم ہے کہ ہر شخص مرد و عورت اور بچہ ضرور اُس روز اپنے
مکان سے باہر نکل جاتا ہے اور لوگ نہایت ہی جشن اور سرور میں مشغول ہوتے ہیں۔
بڑے شہروں میں اُس روز خاص طور پر پولیس انتظام کرتی ہے کہ کوئی شخص جوان
عورتوں سے غیر مہذبانہ طریقہ پر نہ پیش آئے۔ بہت سے مذہبی خیال کے لوگ عید نوروز
منانے کے لئے عراق یا مشہد یا قم زیارت کرنے چلے جاتے ہیں۔ طہران سے ہزاروں آدمی

قم چلے جاتے ہیں کیونکہ بذریعہ موٹر کے طہران سے قم چند گھنٹوں میں انسان پہونچ سکتا ہے۔ اسیطرح بہت سے لوگ شاہ عبدالعظیم چلے جاتے ہیں۔ عید کے دوسرے روز شب کو ہر شخص مُرغ مسلم کھاتا ہے یہ وہی مرغ ہوتا ہے جو بے پکا ہوا دسترخوان پر تحویل کے وقت رکھا جاتا ہے۔ مچھلی کا صرف اُسدن اسقدر ہوتا ہے کہ ملک روس اور انزلی وغیرہ سے مچھلیاں خشک کی ہوئی بکثرت ایران میں دوکاندار بیچنے کے لئے منگاتے ہیں۔ مٹھائی کا بھی صرف اتنا ہوتا ہے جتنا ہندوستان میں دیوالی کے زمانہ میں ہوتا ہے۔ مراسم تحویل ادا کرانے کے بعد ہر شخص اپنے دوستوں امرا اور علماء سے ملنے جاتا ہے اور بعضے رؤسا و متمولین اُس روز لوگوں کو علیٰ قدر مراتب عیدی دیتے ہیں عیدی میں سونے کے سکے میں اشرفی یا پنج ہزاری یا دو ہزاری دی جاتی۔ نوروز کے پہلے کثرت سے پنجہزاری و دوہزاری کے سکے صرافوں کی کانوں پر بکتے ہیں۔ سونے کی پنجہزاری بقدر چوونی اور دو ہزاری بقدر دوانی کے ہوتی ہے۔ اصل میں پنجہزاری و دوہزاری سکے چاندی کے ہیں جو پانچ قران اور دو قران کے ہوتے ہیں اور سونے کے کم قیمت عیدی دینے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ زمانہ جنگ میں ایک سال عید کے موقع پر میں شاہرود میں تھا۔ وہاں شاہزادہ امیر اعظم حاکم شاہرود نے مجھکو دو اشرفی ناصر الدین شاہی عیدی دی تھی اور دوسرے موقع پر مشہد مقدس میں آقا قوام السلطنة

والی خراسان نے ۵ سونے کی پنجہزاریاں دی تھیں - طہران، اصفہان و شیراز میں بعض اُمرا عید کے دن ہزاروں روپیہ عیدی دینے میں صرف کرتے ہیں۔ لیکن اب اسمیں روز بروز کمی ہوتی جاتی ہے۔

عید نوروز ایران میں تیرہ روز تک منائی جاتی ہے اور اکثر تجار و کسبہ اس مدت تک کام کرنا بند کردیتے ہیں۔ عام طور پر لوگ ایک دوسرے سے ملنے جاتے ہیں اور ہر جگہ کثرت سے مٹھائی اور چائے صرف ہوتی ہے۔ تیرھویں تاریخ کو سیزدہ بدر کی رسم ادا کرنے کے بعد لوگ اپنے کاروبار میں مشغول ہوتے ہیں۔ جیسا یورپ کی تمام قوموں میں انگریز بڑے دن کو نہایت اہتمام سے مناتے ہیں اسیطرح ایشیا کی تمام قوموں میں ایرانی اپنی قومی عید کے مراسم کو بہت ہی سرگرمی سے ادا کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ جیسا ایران میں نوروز کے دن عیدی دینے کا دستور ہے اسیطرح انگریزوں میں بھی کرسمس کے زمانہ میں ہدیہ و تحفہ دینے کا رواج ہے۔ انگلستان کے دیہاتوں میں رات کے وقت لوگ کرسمس کی مخصوص گیت گاتے ہوئے لوگوں کے دروازوں پر جاتے ہیں اور صاحب خانہ انکو مٹھائی اور کچھ شربت دیتا ہے اور صبح کے وقت بچے لوگوں کے مکانوں پر جاتے ہیں اور اُن کو کچھ پیسے دیدیئے جاتے ہیں۔

•••

# مسلمان اور سائنس

- تاریخ علوم میں مسلمانوں کا مقام —— فواد سیزگین
- فلکیات میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام —— "
- عربوں کے علم الفلک کا یورپ پر اثر —— "
- آثار علویہ کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام۔ "



ارسطو کی گاڑی کے پہیوں نے

کیا خود بھی کچھ کام کیا ہے؟

فلسفہ میں، منطق میں،

اور خاص کر سائنس میں!

سیر گبن نے اس موضوع پر جو مفید خطبات دیے ہیں پاکستان کے صف اوّل کے سیاسی مفکر و نظریہ ساز نے انھیں اپنے چند شماروں میں ترجمہ کر دیا۔ موضوع ایسا ہے جس پر بہت کم لکھا گیا اور لوگوں کو پیاس رہتی ہے اسلئے ہم نے مناسب جانا کہ جبریل میں پیش کر دیں۔

● ادارہ

ڈاکٹر فؤاد سیزگین
ترجمہ : ڈاکٹر خورشید رضوی

# تاریخ علوم میں مسلمانوں کا مقام

مشہور معاصر ترک فاضل ڈاکٹر فؤاد سیزگین کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ تاریخ علوم و کتابیات عربی پر انکی مبسوط جرمن تالیف Geschichte des Arabischen Shrifttums (تاریخ التراث العربی) عالم گیر شہرت رکھتی ہے۔ تاریخ حدیث پر ان کے نتائج تحقیق خصوصیت سے اہم سمجھے جاتے ہیں۔

,,جامعة الامام محمد بن سعود الاسلامیة ،، کی دعوت پر ریاض جا کر انھوں نے عربی میں سات خطبات دیئے جنھیں جامعہ نے ۱۳۹۹ ھ/ ۱۹۷۹ ء میں — ( اسی سال ڈاکٹر فؤاد سیزگین کو شاہ فیصل ایوارڈ دیا گیا ) — ,,محاضرات فی تاریخ العلوم،، کے عنوان سے شائع کیا۔ ان میں سے پہلے خطبے ,,مکانة المسلمین فی تاریخ العلوم،، کا اردو ترجمہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ کھڑے بریکٹ میں مختصر اضافے راقم کی طرف سے ہیں۔ ان اضافوں کے لئے مندرجہ ذیل مصادر سے استفادہ کیا گیا:

(1) Dictionary of Scientific Biography,

American Coucil of Learned Societies New York — 1981.

(2) George Sarton, Introduction to the History of Science, Carnegie Institution of Washington 1927 onwards

(3) Encyclopaedia Britanica , 15th ed. 1985

(4) Wüstenenfeld Mahler Sche , Verglei Chungs — Tabellen ,

Wiesbaden , 1961

(۵) القفطی، علی بن یوسف، إخبار العلماء باخبار الحکماء ، مطبعة السعادة مصر ١٣٢٦ هـ

(٦) الزرکلی ، خیرالدین، الأعلام ، قاموس تراجم . دوسرا ایڈیشن، مطبعة کوستاتسوماس وشرکاء، ۱۳۷۳هـ/۱۹۵۴ء وبعد

(مترجم) -

---

ہر چند کہ مورخین علوم کے ہاں مختلف علوم کی تاریخ میں بدلتے ہوئے منظر نامے کی اہمیت ایک حقیقت مسلّمہ ہے تاہم عام علمی تاریخ کی کتابوں میں ، کئی صدیوں سے ایک تصور شدت سے غالب چلا آتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علوم کا ارتقاء نے خصوصاً ان علاقوں میں جو بحیرہ روم کے طاس میں واقع ہیں — دو ہی سیاسی مرحلوں سے گزرا ہے۔ ایک یونان قدیم کا مرحلہ دوسرے مغربی دنیا کا مرحلہ جس کا آغاز ,,تحریک احیائے علوم،، کے مظہر سے ہوتا ہے -

تاریخ فکر انسانی کے خط و خال اجاگر کرنے کے ضمن میں گزشتہ چند صدیوں کی تحقیقات سے ایسے نتائج سامنے آ چکے ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - یہ نتائج یقیناً اس قابل تھے کہ مورخین علوم کی توجہ انکی طرف مبذول ہوتی اور انکی روشنی میں نسلوں سے چلا آنے والا مذکورہ بالا تصور تبدیل ہو جاتا -

موجودہ صدی کی پہلی دو تہائیوں کے آغاز سے عملاً ڈنمارک کے عالم اوتو نویکباور (OTTO NEUGEBAUER) کی اہم مساعی سامنے آئیں

جن کا مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ یونانیوں کو تاریخ علوم کے ضمن میں اولیت حاصل نہیں بلکہ انہیں زمانہ ماقبل اسلام کی بعض اقوام کی کارگزاری ورثے میں ملی تھی - اس عالم کو بالآخر شاکیانہ انداز میں یہ کہنا پڑا کہ :

,,ہر وہ کوشش جو یونانیوں کے کارناموں کو ان سے پہلے کی دیگر اقوام سے مربوط کرنے کے لئے کی جاتی ہے شدید مخالفت سے دو چار ہوتی ہے- کوئی بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ یونانیوں کی حیثیت سے متعلق جس تصور کا وہ عادی ہو چکا ہے اس میں کوئی تبدیلی لائی جائے - یہ کیفیت ان تمام تحقیقات کے علی الرغم ہے جن سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یونانی دور سے قبل ڈھائی ہزار برس کا زمانہ موجود ہے جس میں مختلف ایسے کارنامے انجام دیئے گئے جن کے ہوتے ہوئے یونانیوں کا مقام، تاریخ علوم کے وسط میں متعین ہوتا ہے نہ کہ اسکے آغاز میں،،[۱]

گذشتہ دو صدیوں کے دوران علوم عربیہ پر مستشرقین کی تحقیقات نے تاریخ علوم کے اس غلط تصور کو متزلزل کرنے میں کچھ اثر دکھایا - مگر وہ تقریباً اس متواضعانہ اعتراف سے آگے نہیں بڑھتا کہ عربوں نے قدیم یونانیوں اور ، احیائے علوم کے دور میں، لاطینیوں کے مابین واسطہ بننے کی خدمت انجام دی -

اس ضمن میں میری خواہش ہے کہ اس موضوع پر کلمۂ حق پیش کروں اور مجملاً امر واقع کا اظہار کروں - ساتھ ہی ساتھ مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ جدید تحقیقات کے نتائج - اگرچہ ہنوز محدود ہیں - بہرحال حقیقت کا سراغ پانے اور اسکا اظہار کرنے کی کوشش میں ہیں - عجیب بات ہے کہ اس کے بعد بھی مورخین علوم ، یونانیوں اور احیائے علوم کے مابین ایک ایسے مرحلے کو نظر انداز کرتے دکھائی دیتے ہیں جس میں بڑی تازہ کاری کا ظہور ہوا -

میری ان معروضات میں کلمۂ حق کا تقاضا ہے کہ میں تاریخ علوم میں عربوں کے ظہور کی مناسبت سے چند نکات کی نشان دھی کرتا چلوں :

اول یہ کہ ,,عربوں کے ھاں ابتدائے علوم کی تاریخ،، - نیز یہ کہ یہ ,,کس مرحلے کے علوم،، تھے - کے مسئلے پر ھنوز اختلاف رائے پایا جاتا ہے -

اس ضمن میں میرا نقطۂ آغاز اکثر محققین سے جداگانہ ہے - میری رائے یہ ہے کہ اسلام میں فکری و عملی نتیجہ خیزی پہلی صدی ھجری ھی میں شروع ھو گئی تھی -

میں اس بحث کے اِجمال پر ھی اکتفا کروں گا اور ان تاریخی شواھد سے صرف نظر کروں گا جن کی تفصیل میں جانا یہاں ممکن نہ ھو گا -

اسلامی معاشرہ جس کی تشکیل پہلی صدی ھجری کے وسط سے مختلف منظر ناموں، متعدد ثقافتوں اور متفرق زبانوں سے مل کر ھونی شروع ھوئی ، فی الواقع مختلف مکاتب فکر اور انکے افکار کا نقطہ اتصال بن گیا - جبکہ اس سے قبل یہ سب عناصر ایک دوسرے سے جدا تھے - اور ایک دوسرے پر ان کا اثر تقریباً مفقود تھا -

یہی وہ معاشرہ تھا جس نے رابطہ پیدا کیا اور اسی میں فکر انسانی کے ایک نئے دور نے جنم لیا - ھمیں اس امر میں قطعاً شک نہیں کہ ابتدائی مسلمان حکام کا رویہ ، اجنبی ثقافتوں کے حاملین کی جانب سے پیش آمدہ صورت حال کے روبرو ، بے خبری کا رویہ نہ تھا -

لوگوں میں ایک گروہ ایسا ہے جس کے لئے یہ رائے قابل قبول نہیں کیونکہ ان کا خیال یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب اس حد تک سادہ تھے کہ ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اُن نئے حالات پر کوئی ردّ عمل پیدا کر سکیں، جن سے وہ دوچار ھوئے ... ایسا تصور

رکھنے والوں کی خدمت میں ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اس بحث میں اساسی نقطہ یہ ہے کہ عرب ۔ کم از کم جغرافیائی اعتبار سے ۔ بابلی آرامی اقوام کے وارث تھے ۔ اور اگر ایک اور زاویے سے دیکھا جائے تو وہ آس پاس کی متمدن اقوام سے مکمل طور پر کٹے ہوئے بھی نہیں تھے ۔

اس حقیقت کو سمجھے بغیر دور جاہلیت کی عربی شاعری کے بلند فنی ارتقاء اور دل کش صنعت گری، دوسری صدی ھجری کے نصف اول اور نصف ثانی میں علم نحو کی تیزی سے رونمائی اور اسکی وسیع پیش رفت نیز یونانی کتب کے ترجمے اور متعلقہ موضوعات پر ان سے اثر پذیری سے قبل نباتات ، حیوانیات اور موسیقی جیسے بعض علوم کی عجیب و غریب نشو و نما کا راز پانا از بس دشوار ہوگا ۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں دیگر اقوام کے علوم و معارف کو بے تکلف اخذ کرنے کی کوشش میں ایک اہم محرک کا بہت بڑا دخل تھا ۔ اس محرک کی وضاحت فرانز روز نتھال کے اس مختصر تبصرے سے ہو جاتی ہے جو ان کی کتاب ,,اسلام میں قدیم یونانیوں کے علوم کا تسلسل (۲) ،، میں وارد ہوا ہے اور جس میں وہ کہتے ہیں :

,,غیر زبانوں سے کتابوں کا ترجمہ کرانے کا وسیع کام ایک ایسا مظہر ہے کہ عملی یا نظری فائدۂ محض کا محرک اسکی توجیہ کے لئے کافی نہیں ۔ بلکہ ضروری ہے کہ علم کے بارے میں خود دین اسلام کے موقف کو بھی سمجھا جائے اور یہی موقف بہت بڑا محرک تھا نہ صرف زندگی کے دینی پہلو کیلئے بلکہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کیلئے ۔ اسلام کا یہی موقف علوم کی جستجو اور انسانی دانش تک رسائی کے دروازوں کو کھولنے کیلئے سب سے بڑا محرک تھا ۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ترجمے کا کام

صرف عملی زندگی کی بعض ضروری اشیاء تک محدود رہتا۔

میں یہاں اجمالاً اس بات کا اعادہ کرنا چاہوں گا کہ اجنبی علوم کا مرحلہ، تاثر کے اعتبار سے، ظہور اسلام کے بعد تھوڑی سی مدت میں شروع ہو چکا تھا ۔ اس کا ذریعہ پہلی صدی ہجری میں بعض کتب کے ترجمے کی وساطت سے اصحاب علوم سے رابطہ تھا ۔ اس کی حقیقت وہ نہیں جو بعض مورخین خیال کرتے ہیں یعنی یہ کہ یہ مرحلہ دوسری صدی ہجری کے وسط کے بعد، خلافت عباسیہ کے آغاز کے ساتھ، اور دوسری صدی کے انجام اور تیسری کے آغاز کے موڑ پر خلیفہ مامون کے قائم کردہ ,,بیت الحکمة،، کی تأسیس کے بعد پیش آیا ۔ اسلام کی فکری تاریخ میں اس ,,بیت الحکمة،، کی اہمیت میں مبالغے سے کام لیا جاتا رہا ہے اور اسکی حیثیت کو بالکل غلط انداز میں سمجھا گیا ہے ۔

استفادے کا معاملہ ۔ جسکا آغاز بہت ابتدائی زمانے سے ہوا اور جو حیرت خیز تیزی سے ترقی کرتے ہوئے استفادے سے تقلید تک جا پہنچا ـــ تیسری صدی ہجری کے اواسط سے اختراع و تازہ کاری کے مرحلے میں داخل ہو گیا ۔

پھر اس مرحلے میں بھی کہ جسے غالب رنگ کے اعتبار سے استفادہ و تقلید کا مرحلہ کہا جاتا ہے عالم اسلام کے علماء نے عربی شعر کی پیمائش اوزان کا علم یعنی علم عروض ایجاد کیا اور علم لغت و نحو کو ترقی دی ۔ علم کلام و فلسفہ کی اصطلاحات کا وسیع ذخیرہ، اصول فقہ اور خود فقہ کا علم جو مختلف قواعد پر استوار ہے ، اس پر مستزاد ہیں ۔ اس ضمن میں عربوں کا یہ تصور بھی قابل ذکر ہے کہ الجبرا ایک مستقل چیز ہے نہ کہ اعمال حسابیہ کی ایک فرع ۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عربوں نے کرۂ ارض کے محیط کی ٹھیک ٹھیک

پیمائش کیلئے ایسا طریقہ وضع کرنے کا اهتمام کیا جو اراطوستانس [ ERATOSTHENES۔ تقریباً ۲۷٦ ـ ۱۹۵ ق ـ م] کے اس طریقے سے مختلف تھا جسے غالباً اهل بابل سے اخذ کیا گیا اور جسکی درستی کا انحصار اتفاقات کے عنصر پر تھا ـ

اسی مرحلے پر عرب علماء تیقّن کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچ گئے که بطلیموس [ Ptolemy ـ تقریباً ۱۰۰ ـ ۱۷۰ء] کے قیاسات اور فلکی زائچے غلطیوں پر مشتمل هیں ـ چنانچه انکی صحت کی جانچ پرکھ ، اور تصحیح و تکمیل ضروری ہے ـ اسی طرح انہوں نے چاند دکھائی دینے کے فرق کا قیاس ایسے حسابی طریقوں پر قائم کر لیا جو یونانیوں کے هاں غیر معروف تھے ـ

انہوں نے جغرافیه پر بھی قلم اٹھایا چنانچه ایک طرف ان جغرافیائی نتائج کو جانچا جو یونانیوں کی وساطت سے ان تک پہنچے تھے اور دوسری طرف اس جانچ پرکھ کے نتیجے میں انہوں نے کرۂ ارض کی حدود معلومه میں وسعت پیدا کی ـ

اس مرحلے میں عربوں نے علم کیمیا کو نظری و عملی بنیادوں پر استوار کیا اور اس ضمن میں ان نتائج پر انحصار کیا جن تک مختلف اقوام نے اسلام سے فوراً پہلے کے دور تک رسائی حاصل کی تھی لیکن ان کے هاں رابطه باهمی کی وہ صورت نه ابھر سکی تھی جس کے ذریعے وہ ایک دوسرے سے تأثر قبول کرتے اور بالآخر ایک جامع اور مهتم بالشان امتزاج تک پہنچ جاتے ـ ( حقیقت یه ہے که اس سلسلے میں مجھے محققین کی اکثریت سے اختلاف ہے جن کا خیال یه ہے که مسلمانوں کے هاں ,,علم الصنعة،، کے نام سے علم کیمیا کی بنیاد چوتھی صدی هجری سے قبل نہیں رکھی جا سکی تھی ـ)

هم تاریخی حقائق سے انحراف کے مرتکب نہ ہوں گے اگر هم یہ تصور کریں کہ استفادہ و تقلید کا مرحلہ تیسری صدی ھجری کے اواسط میں آکر اختراع و تازہ کاری کے مرحلے میں داخل ہو گیا تھا ۔ اسی طرح ہم اس مرحلے ۔ یعنی اختراعی مرحلے ۔ کی ابتداء کا سنگ میل اس نقطے کو قرار دے سکتے ھیں جب مسلمان علماء کو اپنے بارے میں یہ شعور حاصل ہوا کہ وہ اختراع و تازہ کاری پر قادر ھیں اور نتیجةً اس بات پر بھی قادر ھیں کہ ان حقائق تک رسائی حاصل کریں جن تک ان سے پہلے اہل یونان کی رسائی نہ ہو سکی تھی ۔

اگر اس شعور کی ایک مثال مقصود ہو تو ہم ,,بنی موسیٰ،، کے نام سے معروف تین مشہور بھائیوں [ ابو جعفر محمد بن موسیٰ ، ( م ۲۵۹ ھ / ۸۷۳ء ) ،ابو القاسم احمد بن موسیٰ ، الحسن بن موسیٰ] کے موقف کا ذکر کر سکتے ھیں جو ارشمیدس[ARCHIMEDES ۔ تقریباً ۲۸۷ ۔ ۲۱۲ ق ۔ م] اور ابلونیوس [APPOLONIUS ۔ م ۔ دوسری صدی ق۔مُ کا آغاز] پر ایک مشترکہ تحقیقی مطالعے میں مصروف رہے ۔ یہ تینوں بھائی ,,آ،، کے یونانی عدد کی حد بندی قدماء کے مقابلے میں زیادہ باریکی کے ساتھ کرنا چاھتے تھے ۔ نیز انھیں زاویے کو تین متساوی اقسام میں تقسیم کے مسئلے کا نیا حل مطلوب تھا ۔ اور بسا اوقات وہ ان اغلاط کی درستی بھی کرتے تھے جو انکی رائے میں ابلونیوس کی کتاب ,,المخروطات،،[CONICS] میں سرزد ہو گئی تھیں ۔

اسی طرح ریاضیات کے میدان میں ہم یہ ذکر کر سکتے ھیں کہ الماھانی [ ابو عبداللہ محمد بن عیسی،م.تقریباً ۲۶۷ ھ/ ۸۸۰ ء] نے تیسری صدی ھجری کے اواسط میں یہ کوشش کی کہ تیسرے درجے کی مساوات کا عددی حل تلاش کرے ۔

رازی [ابو بکر محمد بن زکریا۔تقریباً ۲۴۰/ ۸۵۴ ء ۔ ۳۲۳ ھ/۹۳۵ ء ]نے طب اور بصریات کے میدان میں اقلیدس [Euclid ، زمانہ،تقریباً ۲۹۵ ق م] اور جالینوس[GALEN ۔ تقریباً ۱۲۹ ۔ ۲۰۰ ء] کے اس قول کو رد کیا کہ اشیاء کے دکھائی دینے کا عمل بینائی کے آنکھ سے نکل کر اشیاء کی طرف جانے سے عبارت ہے۔ رازی وضاحت کرتے ہیں کہ دکھائی دینے کا عمل مادے سے آنکھ تک روشنی کی رسائی پر مبنی ہے۔ اسی طرح انکی یہ رائے ہے کہ آنکھ کی پتلی، آنکھ میں داخل ہونے والی روشنی کی مقدار کی مناسبت سے سکڑتی یا پھیلتی رہتی ہے۔

ایک اور مثال الکندی [ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الصبّاح ۔ تقریباً ۱۸۵ ھ/ ۸۰۱ ء ۔ ۲۵۲ھ/۸٦٦ء ] کی ہے جو آثار علویه ( METEOROLOGY ) کے میدان میں ارسطو اور دیگر علمائے یونان کے نتائج سے اختلاف کرتا ہے اور بعض نہایت اہم آراء پیش کرتا ہے جن میں سے بعض دور جدید کے نتائج سے دور نہیں ۔

میری رائے میں ،،عطاء و اختراع، کے مرحلے کے دو پہلو نمایاں ہیں : ایک یہ کہ پانچویں صدی ھجری کے اواسط تک علماء خود کو بڑی حد تک قدیم یونانیوں کے شاگردوں کی صف ہی میں شمار کرتے رہے حالانکہ وہ خود علوم کے جملہ پہلوؤں میں شاندار جدید نتائج تک پہنچ چکے تھے ۔ دوسرے یہ کہ مذکورہ بالا زمانے کے بعد سے یہ علماء خود کو ۔ دیگر اقوام سے قطع نظر ۔ صرف اپنے مسلمان اساتذہ کے کارناموں کا تسلسل خیال کرنے لگے ۔

،،عطاء و اختراع کے اس مرحلے کی آخری حدود کیا تھیں؟ س سلسلے میں محققین کے ہاں یہ تصور غالب ہے کہ اسلامی

علوم میں جمود کا آغاز ساتویں صدی هجری سے هوا ـ میں یه وضاحت ضروری سمجھتا هوں که مجھے ان محققین کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیونکه یه ان حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا جن کا انکشاف بہت سی ایسی تحقیقات سے هو چکا ہے جو ,,جمود سے متصف،، اس صدی کے بعد آنے والے علماء کی کاوشوں سے متعلق هیں ـ

یه ثابت کرنے کے لئے دلائل کی چنداں ضرورت نہیں که علوم عربیه ، ساتویں اور آٹھویں صدی هجری میں اپنے نقطه عروج کو پہنچ گئے تھے ـ مثال کے طور پر دوران خون کے سلسلے میں ابن النفیس [علاء الدین ابو الحسن علی بن ابی الحزم م ـ ٦٨٧ ھـ/ ١٢٨٨ ء] کی دریافت ، چھوت کے مسئلے پر لسان الدین ابن الخطیب [محمد بن عبداللہ بن سعید السلمانی ٧١٣ ھـ/١٣١٣ ء ـ ٧٧٦ ھـ/ ١٣٧٣ ء] کی وضاحت اور نصیر الدین طوسی [محمد بن محمد بن الحسن ۵۹۷ ھـ/ ١٢٠١ ء ـ ٦٧٢ ھـ/ ١٢٧٣ ء] کی طرف سے علم المثلثات [TRIGONOMETERY] کو ایک مستقل علم کی حیثیت سے وضع کرنے کا ذکر کیا جا سکتا ہے ـ یاد رہے که اهل غرب بالعموم علم المثلثات کو مستقل حیثیت دینے کا سہرا ریجیو مونتانوس (REGIOMONTANUS) [جرمن حساب دان و ماهر فلکیات ، JOHANN MULLER کا لقب ـ ١٣٣٦ ھـ ـ ١٤٧٦ ء] کے سر باندھتے هیں جو پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں هوا ہے ـ

مزید براں ساتویں اور آٹھویں صدی هجری کے دوران شرف الدین طوسی [المظفر بن محمد بن المظفر ـ م تقریباً ٦١١ ھـ/ ١٢١٤ ء] کی طرف سے چوتھے درجے کی مساوات کی تنظیم اور اس پر بحث ، علم ریاضیات میں غیاث الدین الکاشی [یا الکاشانی ، جمشید بن مسعود ـ م ـ ٨٣٢ ھـ/ ١٤٢٩ ء] کی

متعدد اہم دریافتیں ، علم الفلک میں قطب الدین شیرازی [محمود بن مسعود بن مصلح ۶۳۳ ھ/ ۱۲۳۶ ء ۔ ۷۱۱ ھ/ ۱۳۱۱ ء] اور ابن الشاطر [علاء الدین ابو الحسن علی بن ابراھیم ۔ تقریباً ۷۰۴ ھ/ ۱۳۰۵ ء ۔ ۷۷۷ ھ/ ۱۳۷۵ ء] کی شاندار مساعی اور فلسفہ تاریخ اور علم الاجتماع کی تاسیس کو بھی ذہن میں رکھنا چاھیئے۔

یہاں میرا مقصد یہ نہیں کہ عربی میں لکھنے والے علماء کے کارناموں کو شمار کرنے کی کوشش کروں۔ ایسی کوشش کے لئے تو کئی خطبے درکار ہوں گے ۔ علاوہ ازیں اس میدان میں تحقیق خود ابھی اپنے سفر کے آغاز میں ہے۔ میرا مقصود صرف اتنا ہے کہ تاریخ علوم میں عرب مرحلے کے بعض اہم امتیازی اوصاف کا ذکر کر دوں۔

میری رائے میں تاریخ علوم میں مسلمان علماء کے ظہور نے ایک اہم مظہر کی تشکیل کی۔ وہ یہ کہ علم و دانش کے مراکز۔ جن میں اسلام سے فوراً قبل کے دور تک یونانی اور بابلی علوم کا ورثہ ارتقا کے ایک خاص مرحلے تک پہنچ چکا تھا — اب ان کیلئے باھمی تاثیر و تاثر کے امکانات بڑی حد تک مفقود تھے ۔ لیکن جلد ھی اسلامی معاشرے کی صورت میں ارتکاز کا وہ عنصر میسر آ گیا جو علم و دانش کے مراکز کو باھمی تاثیر و تاثر کے امکانات فراھم کر سکتا تھا ۔

ایک اور بات بھی بہت اہم ہے۔ وہ یہ کہ — اسلام سے فوراً قبل کے دور میں ۔ بعض علماء اپنی تالیفات کو بعض مشہور قدیم علماء کے نام سے منسوب کر دینے کا رجحان رکھتے تھے اور اس طرح خود کو ان علماء کے پیچھے چھپا لیتے تھے ۔ شاید یہ خود اعتمادی کے فقدان کا نتیجہ تھا یا ممکن ہے بعض اور اسباب کا اثر ہو جن کے باعث وہ اکثر اپنی کتابیں دوسر...

سے منسوب کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔

یونان کے مشہور علماء سے منسوب یہ جعلی کتابیں علم و دانش کے مراکز میں متداول تھیں۔ بعد ازاں انھیں کو اولین مآخذ کی حیثیت حاصل ہو گئی پھر یہ ترجمے کی وساطت سے مسلمانوں تک پہنچیں۔حالانکہ اس جعل سازی یا غیر حقیقی مؤلفین کی طرف نسبت میں ان کا اپنا کچھ دخل نہ تھا۔ انھی جعلی کتابوں کی وساطت سے یونانی علوم کی اہمیت کی دھوم ہوئی اور لوگوں کو ان کے عظما ، یا مؤلفین کے نام معلوم ہوئے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلّق ہے سو ان کے ہاں بدیسی علم و دانش سے استفادے کی صورت حال نے آغاز ہی سے — بلا تردد اور بغیر کسی داخلی اضطراب یا نفسیاتی الجھن کے — اپنے پیشرووں کے بارے میں ایک واضح موقف پیدا کر دیا تھا۔ اور اس عظیم الشان موقف کی اہمیت اس وقت واضح ہوتی ہے جب ہم اسکا موازنہ لاطینیوں کے اس موقف سے کرتے ہیں جو انھوں نے اپنے اساتذہ، یعنی عربوں کے بارے میں اختیار کیا۔

تاریخ علوم میں داخل ہونے والے جس عنصر کو ,,وضاحت،، سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کے حوالے سے ہم ایک اہم پہلو پر گفتگو کر سکتے ہیں اور وہ ہے عرب علماء کے ہاں اپنے پیشرووں کی جانچ پرکھ کا عمومی انداز۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان علماء نے اپنے پیش رووں سے اخذ و استفادہ کیا۔ اور پہلی تین ہجری صدیوں میں وہ اخذ و استفادہ پر مجبور تھے۔ انھوں نے یونانیوں سے، ہندوؤں سے، ایرانیوں سے سریانیوں سے استفادہ کیا اور ان سب اقوام کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں آغاز کار میں یہ

ضرورت بھی تھی کہ ان پیش رووں کی کتابوں کو سمجھنے کیلئے ان کے جانشینوں سے مدد لیں کیونکہ وہ اصحاب دانش کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو واسطے کا کام دے سکتے تھے ایک ہی معاشرے میں رہ رہے تھے ۔ یہیں سے ہم اس سبب کو سمجھنے کے لائق ہوتے ہیں جس نے ان کے دلوں سے غیر قوم کے اساتذہ کے سامنے متکبرانہ روش اختیار کرنے کی نفسیاتی گرہ دور کر دی، انہیں ان کے روبرو تواضع کا رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا اور اپنی تنقید میں تردد یا احتیاط کا ایک خاص موقف اختیار کرنے پر مائل کیا ۔

اس بات کا یہ مفہوم نہ سمجھا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے پیش رووں پر مطلقاً تنقید نہیں کی یا انکے ہاں قدماء پر تنقید کا حوصلہ نہیں پایا جاتا تھا ۔ حقیقت اسکے برعکس ہے کیونکہ انہی علوم میں مسلمانوں کی دل چسپی کی تاریخ دیکھی جائے تو انہوں نے بہت آغاز ہی میں قدماء پر تنقید کی ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انکی تنقید ایک خاص وضع پر تھی جو علمائے عرب کی اپنی ہے ۔ مختصر ترین الفاظ میں اسکی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ تنقید کا ایک اخلاقی اسلوب ہے اور ان ناقدین کو بڑی وضاحت کے ساتھ قانون ارتقائے علوم کا ادراک حاصل تھا ۔

مسلمانوں کے وہ اصول ، جنکی بنیاد پیشرو اقوام کے محرک علمی کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے پر تھی ، کئی بنیادوں پر قائم ہیں ۔ ایک یہ کہ بعد میں آنے والے اپنے پیش رووں کے منّت پذیر ہیں ۔ اور بعض غلطیوں یا لغزشوں کے واقع ہونے سے اُن پیش رووں کی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہیں آتی نیز یہ کہ پیش رووں کی تصحیح کرنے میں کوئی شے مانع نہیں ۔ بشرطیکہ

کسر شان اور حرف گیری میں مبالغے سے کام نہ لیا جائے ۔ مسلمان علماء کی رائے میں کوئی بھی عالم خواہ کتنا ہی عظیم المرتبت کیوں نہ ہو غلطی سے محفوظ اور لغزش سے مبّرا نہیں ان اصولوں نے ان کے ہاں تنقید کے اخلاقی اصولوں کی بنیاد رکھی اور ان کی تنقید کو مفید اور باثمر بنایا ۔ تاہم محققین کی ایک بڑی تعداد اس حقیقت سے غافل رہی اور امر واقع کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو کر عالم اسلام کے علماء پر تنقیدی صلاحیت کے ضعف اور قدماء کی تقلید محض کا الزام عائد کرتی رہی ۔

اس موقف کی ایک مثال پیش کرنے کے لئے میں ۱۹۵٦ ء کی بوردو [BORDEUX] کانفرنس کے شرکاء میں سے ایک محقق کا ذکر کروں گا ۔ اسلامی علوم میں جمود کے سبب پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ علمائے اسلام کی مساعی بس اسی قدر تھیں کہ انھوں نے جو کچھ اپنے اساتذہ سے سیکھا وہ تقلیدی انداز میں ٹھیک ٹھیک آئندہ نسلوں تک پہنچا دیا انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ان علماء میں خود اعتمادی کی کمی تھی ۔ اور انھوں نے اپنے اساتذہ کے بعد کوئی نئی شے اختراع کرنے کی کوشش نہیں کی (۳) ۔

اس قسم کی رائے کی تنقیص کو سب سے پہلے تو اتنا ہی کافی ہے کہ اس عظیم فرق پر نگاہ ڈالی جائے جو بعد کی صدیوں میں شاگردوں کے کام اور اُن سے پہلے اُن کے اساتذہ کے کام میں پایا جاتا ہے ۔ یہاں بیرونی کا وہ قول نقل کر دینا کافی ہو گا جس میں تنقید کی اخلاقی بنیادوں کے خط و خال نہایت اختصار کے ساتھ نمایاں ہیں ۔ بیرونی نے کہا ہے:

,,میں نے وہی کیا ہے جو ہر انسان پر واجب ہے کہ اپنے فن میں کرے-یعنی اس فن میں جو لوگ اس سے پہلے ہو گزرے ہیں ان

کے اجتہادات کو قبـول کرے ۔ اور اگر کچھ خلل پائے تو بے جھجھک اس کی اصلاح کر دے اور جو کچھ خود اسے سوجھے اسے اپنے بعد آنے والے متاٌخرین کے لئے بطـور ایک یادداشت ، محفوظ کر جائے۔ ( القانون ۱/۳ ـ ۵ )

اسکے بعد میں اسلامی علوم کے ایک اور عنصر کو زیر بحث لانا پسند کروں گا ۔ میرا اشارہ نظریے اور تجربے کے مابین عدل و توازن کے اصول کی طرف ہے۔

بہت سے لوگ جو اس میدان میں عرب علماء کے موقف سے بے خبر ہیں اس گمان میں مبتلا ہیں کہ بجا طور پر راجر بیکن (ROGER BACON) [م تقریباً ۱۲۹۲ ء ] ایک طویل مدت سے اس منہج علمی کا بانی شمار کیا جاتا ہے جسکی رو سے علوم طبیعی میں تجربے کو تحقیق کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے۔ اس عالم کی سبقت کا تصور ہمارے آج کے دور تک باقی ہے۔ لیکن علم منطق کے فاضل مورخ برانتل (C. PRANTL) [م ۱۸۹۳ ء] نے ــ اگرچہ وہ اسلامی علوم میں اختصاص نہیں رکھتے ــ اس روش عام کے خلاف آواز اٹھائی ۔ (۴) انہوں نے کہا ,,راجر بیکن نے وہ تمام نتائج عربوں سے اخذ کئے تھے ، جو علوم طبیعیة میں اس سے منسوب چلے آتے ہیں "۔

ویڈیمان (۵) (E. WIEDEMANN) اور شرام (۶) (M. SCHRAMM) جیسے بعض ماہرین خصوصی نے بڑی وضاحت سے تجربہ و نظریہ کے قانون کی بنیاد رکھنے میں مسلمان علماء کے مقام اور راجر بیکن اور لیو نارڈو ڈاونشی (LEONARDO DA VINCI) [۱۳۵۲ ھ ـ ۱۵۱۹ ء] جیسے لوگوں پر ان کے نمایاں اثرات کی نشاندھی کر دی ہے۔ اب اس روشن حقیقت میں بحث و اختلاف کی گنجائش نہیں رہی کہ مسلمان علماء کی توجہ کا انحصار محض تجربے پر نہیں تھا بلکہ انہوں نے دراصل اس مسئلے پر توجہ دی کہ تجربے سے قبل نظریے کا ہونا لازمی ہے۔

اور ان معنوں میں گویا انہوں نے تجربے کو ایک واسطے کی شکل دی جسے تحقیق کے دوران تسلسل کے ساتھ استعمال میں لایا جاتا ہے۔

ویڈیمان پوری صراحت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ اس موضوع پر عربوں کو اولیت کا شرف حاصل ہے بلکہ جن نتائج تک راجر بیکن پہنچ سکا وہ ان معلومات کے مقابلے میں بہت کم ہیں جو قدیم عربوں کے ہاں موجود تھیں ۔

علاوہ ازیں ویڈیمان نے مسلمان علماء کے ہاں تحقیق کے انداز اور اس کی پیشکش کے ایک اور اہم امتیازی پہلو پر بھی نظر ڈالی ہے اور کہا ہے (۷):

,,یونانیوں کے ہاں نتائج تحقیق ہمارے سامنے اپنی آخری کلاسیکی شکل میں آتے ہیں چنانچہ ـ بعض استثنائی صورتوں کے علاوہ ـ ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ ہم ان کی اٹھان کا سراغ لگا سکیں ۔ لیکن عربوں کے ہاں صورت حال یکسر مختلف ہے۔عرب جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں اس کے قدم بہ قدم ارتقاء کی وضاحت کرتے ہیں ۔ کچھ اسی طرح جیسے آج ہمارے بعض محققین کرتے ہیں ۔ انکی اس وضاحت کے پیش نظر ہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انکی طبعیتوں میں اپنے کام کی قدم بہ قدم پیش رفت پر اطمینان و سرور کی ایک کیفیت پائی جاتی ہے اور وہ اپنی تحقیقات میں اپنے ذوق فنی اور ان آلات کے کمال کے سبب ، جن سے وہ کام لیتے تھے ، کامیابی سے ہم کنار ہوئے ,,.

یہ بات محققین سے پوشیدہ نہ ہو گی کہ مسلمان علماء ، مشاہدہ فطرت، مسلسل فلک بینی ، دقت نگاہ اور اپنے ان آلات کے باعث جو انہوں نے ایجاد کئے، دنیا کے سامنے اپنے پیش رووں کے مقابلے میں ایک تازہ تر مرحلے کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں ۔

اس امر سے قطع نظر کہ انہوں نے بعض نئے علوم کی بنیاد رکھی۔ اور بعض علوم کو نئی بنیادوں پر استوار کیا مثلاً نحو انشائی جس کا نام انہوں نے ,,علم المعانی ،، رکھا کیمیا ، بصریات، مثلثات ۔ بطور ایک مستقل علم ۔فلسفہ تاریخ اور علم الاجتماع، انہوں نے بارہا دوسری صدی سے لے کر نویں صدی ھجری تک یہ کوشش بھی کی کہ علوم کی شناخت اور تصنیف نئے زاویہ ھائے نگاہ کے مطابق کریں۔ ان تمام حقائق کے پہلو بہ پہلو ایک اور حقیقت کی تصریح بھی ضروری ہے وہ یہ کہ فلسفہ اور علوم طبیعیہ کی تاریخ اصطلاحات میں ان کا بہت بڑا مقام ہے۔ نیز یہ کہ انہوں نے صرف اتنا ھی نہیں کیا کہ جو سرمایہ دوسروں سے ان تک منتقل ھوا اسے جلا بخشی ہو بلکہ ان اصطلاحات کا بہت بڑا حصہ انہوں نے خود وضع کیا۔ تاریخ علوم میں مسلمانوں کے مقام اور لاطینی دنیا میں انکے زبردست اثر پر بات کرتے ہوئے لازم ہے کہ ھم اس امر کو بھی زیر بحث لائیں کہ ان کا یہ اثر محض عربی کتب کے ترجمے یا صلیبی جنگوں اور مغرب و مشرق کے اتصال ھی کے باعث پیدا نہیں ھوا بلکہ بہت بڑا اثر استفادہ و تقلید کے اس عمل پر مبنی تھا جسکا آغاز دسویں صدی عیسوی میں ھوا اور تسلسل سے کئی صدیوں تک جاری رہا اس کی تکمیل تین راستوں سے ہوئی۔

ھسپانیہ، سسلی/ اٹلی ، بیزنطہ

میں یہاں اس صورت حال کی تفصیل میں نہیں جا سکتا کیونکہ یہ میرا اصل مقصود نہیں ہے۔ یہاں میرے پیش نظر چند نکات کو سامنے لانا ہے۔ ایک یہ کہ استفادہ و تقلید کا عمل لاطینیوں کے ھاں اس سے مختلف صورت میں تکمیل کو پہنچا جس میں کہ وہ عربوں کے ھاں مکمل ھوا ۔ وہ اسطرح کہ مسلمانوں کی اس تک رسائی ان لوگوں کی وساطت سے ہوئی جو اسلام قبول کر چکے تھے۔ نیز اپنے ان ہم وطنوں کی وساطت سے جو بدیسی علوم سے واقف تھے۔ لاطینیوں

کے ہاں صورت حال مختلف تھی ۔ وہ ۔ یعنی لاطینی ۔ مجبور تھے کہ علوم ، مختلف اداروں کے نظام، اور جامعات کے طریقہ ہائے کار و لائحہ ہائے عمل اپنے سیاسی اور دینی حریفوں سے اخذ کریں چنانچہ جن لوگوں سے وہ اخذ کر رہے تھے ان کے لئے دشمنی اور بغض کے جذبات رکھتے تھے اور اس کیفیت کا اثر نفسیاتی الجھنوں کی صورت میں انکے ہاں عمل استفادہ پر منعکس ہوا ۔ ایسی صورت میں عین فطری تھا کہ ان کے ہاں وضاحت و صراحت کے عنصر کا فقدان ہوتا جبکہ مسلمانوں کے ہاں دوسروں سے استفادے کے عمل میں یہی دو اصلی عنصر ہیں ۔

ایک اور بات اس سے بھی بڑھ کر ہے مسلمانوں کے علوم سے لاطینیوں کے عمل استفادہ نے سرقہ و انتحال کی صورت پیدا کر لی ۔ اس کی وضاحت کئی متخصصین بہت سے تحقیقی مضامین میں کر چکے ہیں جن میں انہوں نے کھول کر دکھایا ہے کہ کسطرح لاطینی علماء نے بعض بحثیں مسلمان علماء کی کتابوں سے اخذ کر کے خود اپنی طرف منسوب کر لیں ۔ یا مکمل کتابیں اپنی زبانوں میں ترجمہ کر کے یہ دعویٰ کیا کہ یہ ان کی طبع زاد تصانیف یا انکی اپنی تالیفات ہیں ۔ اسی طرح بعض کتابیں عربی سے ترجمہ کر کے یہ کہا کہ یہ یونانی مشاہیر مثلاً ارسطو ، جالینوس ، روفوس [ RUFUS OF EPHESUS پہلی صدی ق ۔ م کے اواخر سے پہلی صدی عیسوی کے اواسط تک وغیرہ کی کتابیں ہیں ۔ اس روش اور اسکے دیگر مظاہر کی بکثرت مثالوں کا ذکر یہاں ضروری معلوم نہیں ہوتا ۔

یہاں یہ صراحت لازم ہے کہ میرا مقصد لاطینی کارگزاری کی تخفیف و توہین ہر گز نہیں ۔ میں تو بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ لاطینیوں کے ہاں عربوں سے اخذ کرنے کا انداز جن محرکات پر استوار تھا وہ ان محرکات سے مختلف تھے جن کے تحت ان کے پیشرو اساتذہ یعنی عربوں نے یہ عمل اختیار کیا تھا ۔ اور ان امتیازی پہلوؤں کے ذکر

پر صرف ایک حقیقت مجھے آمادہ کرتی ہے۔ وہ ہے اس امر کی نشاندھی کہ مغربی دنیا میں علمی مرحلے کا ارتقاء مسلمان علماء سے متاثر ہے۔ اور یہی امر بہت سے لوگوں سے مخفی ہے۔

ایک اور بات جس کا اس سلسلہ کلام میں ذکر ضروری ہے،یہ ہے کہ علوم عربیہ سے استفادہ و تقلید کا یہ مرحلہ جو مسلمان علماء کے خلاف بغض و نفرت پر استوار تھا، ایک ایسے وقت میں پیش آیا جب علوم عربیہ سے استفادے کا معاملہ ابھی نامکمل تھا اور پختگی کو نہیں پہنچ پایا تھا۔

یہاں دل میں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ بھلا کیونکر ممکن ہوا کہ [علم کے]مغربی مرحلے کے احیاء پر عربوں کے اثرات سے مورخین کئی صدیوں تک چشم پوشی کرتے رہے۔ لیکن مغرب میں مسلمانوں اور ان کے علوم کے خلاف عداوت (۸) کی جو روح جاری و ساری رهی اس کی جہات کو سمجھ لینے کے بعد جواب صاف ظاہر ہے اور اس صورت حال کا پھیلاؤ غالباً راجر بیکن ( ۱۲۱۰ - ۱۲۹۰ ء ) کے عہد تک پہنچتا ہے جس نے وہ تمام نتائج جو اس کے نام سے منسوب کئے جاتے ھیں حقیقت میں ان عربی کتب سے اخذ کئے جن کا ترجمہ لاطینی میں ہو چکا تھا۔ پھر رایموندوس لولوس (RAYMUNDUS LULLUS) کے ظہور کو لے لیجئے جس نے اپنی پوری زندگی اور تمام تر قوت ھر عرب شے کے خلاف جدوجہد میں گزار کر ۱۳۱۵ ء میں وفات پائی۔اس شخص نے علم کیمیا پر بہت سی کتابیں تالیف کیں جن کے بارے میں حال ھی میں یہ ثابت ہوا ہے کہ ان میں سے اکثر عربی الاصل ھیں۔ اسی طرح ان بہت سے لوگوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جو علوم کو عربوں کی غلامی کے جوئے سے آزاد کرانے کے داعی تھے۔ (۹)

اس میں شک نہیں کہ بعض علماء نے عربوں کا دفاع بھی کیا ان

میں اندریاس الباغوس (ANDREAS ALPAGUS) کا نام سب سے نمایاں ہے۔ علوم اسلامیہ کا مرتبہ اس کے دل میں اس حد تک تھا کہ اس نے مشرق کا سفر اختیار کیا ۔ ڈاکٹر کا پیشہ اختیار کر کے تیس برس دمشق میں قیام کیا پھر ۱۵۱۵ ء میں پاڈوا (PADUA) واپس چلا گیا اور بہت سی عربی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا ۔ انہی کتابوں میں ابن النفیس کی وہ مشہور کتاب بھی ہے جس کو مائیکل سروٹ (SERVET) [ ۱۵۱۱ ـ ۱۵۵۳ء] نے اپنی طرف منسوب کر لیا۔

تاہم غالب رو بغض و عداوت ھی کی رھی جو سولھویں صدی عیسوی تک جرمنی . فرانس اور اٹلی میں جاری رھی ۔ اس رو میں ایک نمایاں نام لیونھارٹ فوکس (LEONHART FUCHS) [۱۵۰۱ ـ ۱۵۶۶ ء] کا ہے جس کا تعلق ٹیوبنگن یونیورسٹی سے تھا ۔ جن لوگوں نے عربوں کے خلاف کشاکش بھی جاری رکھی اور ان کی کتابوں کو اپنے نام منسوب بھی کیا ان میں ایک مشہور نام پارا سیلسوس (PARACELSUS) [ ـ ۱۴۹۳ ـ ۱۵۴۱ ء ] ـ کا ہے۔

ہر چند کہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے دوران جب مغرب میں عربوں کے مقام کو فراموش کر دیا گیا تھا ۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ عربی کتب سے استفادہ جاری تھا، اور ہے۔ تاہم علوم کے مورخین نے اپنی تواریخ ترتیب دینے کا آغاز[فراموشگاری کی] اسی فضا میں کیا ۔ اٹھارویں صدی عیسوی البتہ علوم عربیہ کے حق میں ایک نیا عنصر لے کر آئی ۔ یعنی مستشرقین کا ظہور جن میں سے بہت سے اس کوشش میں مصروف رہے کہ علوم اسلامیہ کو ان کا جائز حق دلائیں اور انھیں تاریخ علوم میں صحیح مقام پر رکھیں۔اس سلسلے میں اھم ترین اور قدیم ترین شخصیت جیکب ریسکے (JAKOB REISKE [۱۷۱۶ ـ ۱۷۷۴ ء ] کی ہے اور کرٹ سپرنگل ، (KURT SPRENGEL) گوئٹے (J.W. GOETHE) [۱۷۴۹ ـ ۱۸۳۲ ء] اور الیگزنڈر فون ھمبولڈ (ALEXANDER VON HUMBOLDT) [۱۷۶۹ ـ

۱۸۵۹ ء] جیسے بعض مورخین اس کے هم نوا هوئے - لیکن ان لوگوں کی مساعی روش عام پر اثر انداز هونے کے لئے کافی نه تهیں خصوصاً اس صدی میں که جب تاریخ علوم کا جدید زاویه نگاه پخته هو رها تها اور وه یه تها که گیارهویں صدی عیسوی سے آگے تمام علمی نتائج کو مطالعۂ علوم یونانی کی نوبیداری تصور کیا جائے - اسی تصور کے نتیجے میں ,,احیائے علوم،، کی اصطلاح وجود میں آئی -

باوجودیکه بعض علماء کی مخالفانه روش علوم کی تاریخ عمومی کے بنیادی خطوط میں اسی صورت حال پر مصر رهی ہے اور آج بهی بڑی حد تک اسکے اثر کو باقی رکھے هوئے ہے؛ تاهم بعض مستشرقین کی کوشش سے بعض میدانوں میں غلط فهمیوں کا ازاله ممکن هو سکا ہے - خصوصاً ان علوم کی شاخوں میں جن پر محققین نے اپنے کام کا آغاز موجوده صدی سے قبل کیا تها - یه [ازاله] ان لوگوں کو اسی نسبت سے حاصل رها ہے جس نسبت سے وه روش عام کے اثر سے محفوظ تهے اور انیسویں صدی عیسوی کی سوچ پر لگی هوئی چهاپ ـــــ جو وضعی مکتب فکر (POSITIVISM) کے نام سے معروف ہے - کے شکار نه تهے -

توقع رکهنی چاهئیے که علوم عربیه کے مقام کا مسئله مستقبل قریب کی علمی تاریخ میں همارے زمانے سے بڑھ کر عدل و انصاف پر مبنی هوگا - اور اس توقع کو عملی جامعه پهنانے کے لئے اس اسلامی ورثے کے وارثوں پر یه لازم ہے که وه اظهار حقائق میں بهر پور حصه لیں -

---

۵۵۰

## حواشی

۱ ۔ دیکھیئے راقم کا مقالہ ,,کتاب مہرجان اقرام حنین،، بغداد ، ۱۹۷۴ء ، ص ۳۳۷

۲ ۔ دیکھیئے : Fr. Rosenthal, Das Fortleben der Antike im Islam. Stuttgart, 1965. S. 18.

۳ ۔ H. Ritter, Hat die religiöse Orthodoxie einen Einfluss auf die Dekadenz des Islams ausgeübt?

در کتاب : Klassizismus und Kulturverfall. Frank furt 1960. S.136

۴ ۔ اپنی کتاب تاریخ منطق میں (Geschichte der Logik, III, Leipzig,1927,121)

۵ ۔ اپنے متعدد مقالات میں خصوصاً دیکھیئے

Die Naturwissenschaften bei den Orientalischen Völkern.

Erinnger Aufsatze aus eruster Zeit ,1917, S.42 — 58.

٦ ۔ اپنے بعض مقالات میں خصوصاً دیکھیئے انکی کتاب

Ibn al Haythams Weg Zur Physik, Wiesbaden, 1963.

۷۔ اپنے متعدد مقالات میں ، خصوصاً دیکھیئے

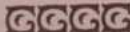
Die Naturwissenschaften bei den Orieutalischen Völkern.

Erinnger Aufsatze aus ernster Zeit, 1971, S.42 — 58

۸ ۔ پروفیسر H. Schipperges نے اس موضوع پر ایک مفصلاً مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے Ideologie und Historiographie des Arabismus.

دیکھیئے رسالہ Sudhoffs Archiv ، سال ۱۹٦۱ .

۹ ۔ ایضاً ص ۱۱ ۔ ۱۲ ، ۱۵



۲

# فلکیات میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام

ہر چند کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عرب/اسلامی علم الفلک ـــ جو دسویں صدی عیسوی میں یورپ منتقل ہوا اور یورپین ممالک میں اسے جذب کرنے کا سلسلہ سولھویں صدی عیسوی کے اوائل تک جاری رہا ـ ـ ہی یورپ میں ریاضیات اور فلک بینی کی اساس پر قائم ہونے والے علم الفلک میں دل چسپی کا بنیادی محرک تھا اور اسی کے وسیلے سے یہ علم کوپرنیکس [COPERNICUS] کی

شخصیت میں پہنچ کر ایک نئے مرحلے سے روشناس ہوا ۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ ہر چند کہ یہ سب کچھ حقیقت ہے مگر فلکیات کی عمومی تاریخ میں اسلامی علم الفلک کے جائز مقام کا اعتراف نہیں کیا جاتا۔ اس مقام کو کامل طور پر فراموش ہونے کئی صدیاں بیت چلی تھیں کہ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مستشرقین نے علم الفلک کے میدان میں اسلامی ورثے پر تحقیق اور اس سلسلے کے مخطوطات کی اشاعت کی لائق تعریف مہم شروع کی ۔

اس عرصے میں تحقیقات کے جو نتائج سامنے آ چکے ہیں وہ کوئی معمولی نتائج نہیں ۔ تاہم وہ ہنوز اس قابل نہیں ہیں کہ ہمیں مسلمان فلک شناسوں کے کام کی حدود کا مکمّل اور ٹھیک ٹھیک تصور فراہم کر سکیں اب تک اس میدان میں محققین کی کاوشوں سے جو کچھ روشن ہو سکا ہے اس نے اس بات میں شک کی گنجائش نہیں چھوڑی کہ علم الفلک کی عمومی تاریخ میں مسلمان فلک شناسوں کا حصہ بہت بڑا اور ابداعی[ORIGINAL] نوعیت کا ہے. اسی کا ایک خاکہ آپ کے سامنے پیش کرنا مقصود ہے۔

ہماری تازہ ترین معلومات یہ بتاتی ہیں کہ ستارہ شناسی سے متعلق قبل از اسلام عربوں کا علم بس محدود سا تھا ۔ وہ چاند کی اٹھائیس منزلوں اور بارہ برجوں سے واقف تھے اور گمان غالب ہے کہ سیاروں کے نام بھی جانتے تھے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کو چپٹا اور آسمان کو اس پر ایک گُنبد کی صورت میں تصور کرتے تھے ۔

اسلام سے فوراً پہلے کے زمانے تک یونان ، ہندوستان اور ایران میں عام تصور یہ تھا کہ زمین مرکزِ عالم میں واقع ہے اور تمام افلاک اپنے ثابت و سیّار اجرام کے ساتھ زمین کے گرد گھوم رہے ہیں اور اس کلّی حرکت کے نتیجے میں، جو چوبیس گھنٹے میں پوری ہوتی ہے .

رات اور دن وجود میں آتے ھیں - پہلی صدی ھجری کے نصف ثانی میں یہی تصور عالم اسلام میں منتقل ھو گیا -

اس تصور کو اسلامی حلقوں میں منتقل کرنے والے لوگ بلاشبہ وہ تھے جو اسلامی جھنڈے تلے آ جانے والے علاقوں میں ھنوز قائم علمی مراکز کے آخری منسوبین تھے - یہ لوگ جو اجنبی ثقافت کے حامل تھے انہی کے ھاتھوں ایرانی ، یونانی ، سریانی اور ھندوستانی کتابوں کا عربی ترجمہ عمل میں آیا جن میں علم الفلک کی کتابیں بھی شامل تھیں -

میں سمجھتا ھوں کہ دوسری صدی ھجری کے اواسط تک فلکی معلومات اور اس سلسلے کی ضروری اصطلاحات کافی حد تک مسلمانوں کی رسائی میں آ چکی تھیں چنانچہ انھوں نے عباسی خلیفہ منصور کی خواھش کے مطابق فلکیات پر ھندوستان کی سب سے بڑی کتاب ,,کتاب السندھند،، کا عربی میں ترجمہ کر ڈالا اور جن دو عالموں نے یہ ترجمہ کیا تھا، یعنی الفزاری اور یعقوب بن طارق، انھوں نے خود بھی علم الفلک پر کتابیں تصنیف کرنا شروع کر دیں - یہ دونوں فلکی حسابات میں دوسرے درجے کی مساوات کے استعمال پر قادر تھے - ,,کتاب السندھند،، کے ترجمے کے تقریباً بیس برس بعد مسلمانوں کو ھندسی اور تطبیقی علم الفلک پر اس حد تک معلومات حاصل ھو چکی تھیں کہ انھوں نے ۱۷۵ - ۱۸۰ھ کے درمیان بطلمیوس [PTOLMEY]کی کتاب المجسطی [ALMAGEST]نیز اس کی ,,زیج،، یعنی جنتری کا ترجمہ کر لیا -

اس اولین مرحلے میں مسلمان فلک شناسوں کی سرگرمیوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یقین ھو گیا کہ وہ دوسری صدی ھجری کے اختتام سے لے کر تیسری صدی ھجری تک کے عرصے میں اس

قابل تھے کہ مجسطی کے تمام نظریات و حسابات کو سمجھ سکیں اور اسی زمانے میں وہ فلکیات کے میدان میں اخذ و جذب کا مرحلہ مکمل کر لینے کے بعد آنے والے دور میں تازہ کاری کے لائق ہو چکے تھے۔

خلیفہ مامون کے حکم سے شمّاسیۃ بغداد اور دمشق کے نواح میں کوہ قاسیوں پر ایک ایک رصدگاہ کا قیام اس ضمن میں بہت کچھ ظاہر کرتا ہے۔ تاریخ فلکیات میں ابھی تک یہ پتہ نہیں چلایا جا سکا کہ کیا اس قسم کی رصد گاھیں اس سے پہلے بھی کبھی قائم ہوئی تھیں۔ ان دونوں رصد گاھوں کے قیام کے بعد ماہرین فلکیات اس قابل ہو سکے کہ بطلمیوس کے ہاں بہت سی باتوں کی اصلاح کریں اور پڑتال اور درستی کے بعد فلکی حسابات کی ایک جنتری تیار کریں۔ یہ دو جلدوں میں تھی۔

اس میدان میں ایک اہم بنیادی اقدام یہ تھا کہ مسلمانوں نے تدمر اور رقّہ کے مابین ایک درجے کے طول کی دقیق سائنسی طریقے پر پیمائش کی اور اسے $56\frac{2}{3}$ میل پایا اور اسی کے نتیجے میں انھوں نے خط استواء کا طول ۴۰۲۵۳ کلو میٹر برآمد کیا۔ پھر انھوں نے اپنے اس تمام حساب کو دھرایا تاکہ جغرافیۂ فلکی کے سلسلے میں اُن کا نقطہ آغاز غلطی سے پاک ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری کے آغاز سے انجام تک مسلمان فلک شناسوں کی توجّہ نئے فلکی نظریات وضع کرنے سے زیادہ سیّاروں کی حرکات کا مشاہدہ کرنے اور ان کا حساب لگانے پر مرکوز رہی۔ اس میدان میں جو نتائج انھوں نے برآمد کئے وہ نہایت اہم تھے۔ غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان فلک شناسوں نے محض مشاہدے اور حساب کی بنیاد پر وہ تحقیقات بیشتر مکمل کر لیں جو سترھویں

صدی کے بعد ایجاد ہونے والے بعض جدید آلات کے بغیر ممکن ہو سکتی نہیں ۔

اس میدان میں ان کی تحقیقات کے جو نتائج اب تک پایہ ثبوت کو پہنچ چکے ھیں ان سب کا شمار یہاں ممکن نہیں حالانکہ یہ مطالعہ ھنوز ابتدائی مراحل میں ہے۔

اختراع و تازہ کاری کے مرحلے میں ان کی عظیم کامیابی کو ہم مندرجہ ذیل وجوھات پر محمول کر سکتے ھیں ۔

١ ۔ وہ فلکیاتی مسائل کے حساب کے لئے ریاضی کو استعمال کر سکتے تھے اور ریاضی میں ان کے وسائل یونانیوں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ تھے ۔

٢ ۔ وہ رصدی آلات کا استعمال بھی یونانیوں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ شکل میں کر سکے ۔

٣ ۔ وہ ایسے رصدی طریقے استعمال میں لا سکے جن میں بعض یونانیوں سے بڑھ کر ترقی یافتہ تھے اور بعض ایسے تھے جن کا یونانیوں کو مطلق علم نہ تھا ۔

۴ ۔ مسلمان فلک شناسوں کے ھاں عملی تجربات کا تناسب قدماء سے بڑھ کر تھا ۔

اگر ہم جاننا چاھیں کہ فلکیاتی عمل میں ان کے ریاضیاتی وسائل کیونکر قدماء کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ تھے تو سب سے پہلے ھمیں یہ یاد کرنا ھوگا کہ انھوں نے دقیق حساب المثلثات [TRIGONOMETRY] سے کام لیا جبکہ اھل یونان کو اس کا علم ھی نہ تھا چنانچہ وہ مجبور تھے کہ اپنے فلکی اور جغرافیائی تجربات میں ایک پیچیدہ طریقۂ حساب استعمال کریں جو دائرے کی قوسوں اور اس کے نصف قطر کے باھمی نسبت تناسب کے مشاھدے پر مبنی تھا ۔

حساب المثلّثات نے اہل ہند کے ہاں بھی خاصی ترقی کی۔ چنانچہ وہ اپنے حسابات میں قائم الزاویہ مثلث کے دو ضلعوں کے تناسب کو بنیاد بنایا کرتے تھے اور ,,جیب،،[SINE] اور ,,تمام الجیب،، [COSINE] کے علم تک رسائی پا چکے تھے۔ انھوں نے ,,جیب،، کے لئے جدول کا استعمال بھی کیا۔ اہل ہند کے یہ علوم دوسری صدی ہجری میں مسلمانوں کے ہاں منتقل ہو گئے اور ہم دیکھتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری کے اواسط سے مسلمانوں کے ہاں پہلی بار ,,جیب الضلعین،، کی جگہ ,,جیب الزاویہ،، کی اصطلاح سامنے آتی ہے۔ یہ علم المثلّثات کے ارتقاء میں ایک نئے اصول کا آغاز تھا۔ اور یہ مسلسل ارتقاء ساتویں صدی ہجری میں جب نصیر الدین طوسی نے علم المثلّثات کو ایک مستقل علم کی حیثیت دے دی ،۔ اپنے نقطہ کمال کو پہنچ گیا۔

گذشتہ چند سالوں میں سامنے آنے والی تحقیقات کے نتیجے میں یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں حساب المثلّثات قریب قریب ان تمام باریکیوں کو محیط تھا جو موجودہ صدی تک اس شعبۂ علم میں معلوم ہو سکی ہیں (دیکھئے ج۵ ، ص ۵۳ ـ ۵۸ از ,,تاریخ التراث العربی،،) اور اس میدان میں اُن کا کام اِن لوگوں[ یعنی علمائے دورِ جدید] کی کار گزاری سے زیادہ دور نہ تھا۔

عرب ماہرین فلکیات تیسری صدی ہجری کے اواسط سے اس کوشش میں مصروف رہے کہ ایسے طریقے دریافت کریں جن سے کرۂ ارض پر مختلف مقامات کے مابین فاصلے کا حساب آسانی سے لگایا جا سکے کیونکہ انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ ان فاصلوں کے حساب کا یونانی طریقہ بہت مشکل ہے اور اس میں بہت وقت صرف ہوتا ہے۔ اس میدان میں پیش رفت کا اولین قدم ثابت بن قرّہ نے اٹھایا اور

مسلسل ارتقاء بالآخر چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں ..اضلاع المثلّث الکُرَوی.. کے حساب پر منتج ہوا۔ جس کے نتیجے میں مثلّثات کُرَویہ [SPHERICAL TRAINGLES]کا علم وجود میں آیا۔ یہاں رفع التباس کی غرض سے یہ وضاحت مناسب ہو گی کہ یونانیوں کے ہاں ہندسہ کرویہ [SPHERICAL GEOMETRY]کا علم ضرور موجود تھا لیکن مثلّثات کرویہ سے وہ ناواقف تھے۔

قدماء کے مقابلے میں مسلمانوں کے ہاں زیادہ ترقی یافتہ طریقہ ہائے حساب کے ضمن میں آخری بات یہ بھی عرض کرتے چلیں کہ انھوں نے وقت گزرنے کے ساتھ فلکی قیاسات میں حسابِ تفاضلی [DIFFERENTIAL CALCULUS] اور جداول المنحنیات سے بھی کام لینا شروع کر دیا تھا۔

جہاں تک اس بحث کا تعلق ہے کہ انھوں نے قدماء کے مقابلے میں بہتر رصدی آلات استعمال کئے سو اس کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اگلوں سے جو کچھ اخذ کیا اسے ترقی دی، مختلف آلات خود ایجاد کئے، انھیں حسب ضرورت بڑا یا چھوٹا کیا اور انھیں بہتر بنانے اور ان کی تفصیلات کے بیان پر بے مثال توجہ دی۔ مثال کے طور پر مراغہ اور سمرقند کی رصد گاہوں میں بعض ..ذات الربعین.. آلات کی بلندی ستر میٹر سے زائد تھی۔ ..آلۃ السدس الفخری.. * جسے حامد بن الخضر الخجندی نے ..میل اعظم.. [GREATEST OBLIQUITY OF THE ECLIPTIC]کی پیمائش کے

* ..السدس.. سے مراد دائرے کا چھٹا حصّہ ہے اور ..الفخری.. فخرالدولہ کی طرف نسبت ہے جس کی سرپرستی میں الخجندی نے یہ آلہ تیار کیا۔ آلے کی شکل اور کارکردگی کی تفصیل کے لئے دیکھئے:

Dictionary of Scientific Biography, American Council of Learned Societies, New York, 1981, 7:353.

لئے بطور خاص استعمال کیا تقریباً چالیس میٹر ** اونچا تھا ۔

ان جدید طریقوں کے ضمن میں یہ بھی ذکر کرتے چلیں کہ مسلمان پہلی قوم تھے جو مسلسل رصد کا اہتمام کر سکے اور یہ ان کی تعمیر کردہ رصد گاھوں کے سبب سے ممکن ہوا ۔ علمی مآخذ میں اکثر ایسی روایات دیکھنے میں آتی ھیں کہ فلاں فلاں رصد گاہ تیس برس یا زیادہ عرصے تک مسلسل کام کرتی رہی ۔

یہاں ہم ان کی علمی رسائی کی چند مثالیں دینا چاھیں گے جو ان وسائل کے سبب ان کے لئے ممکن ہو سکی ۔

ایک مثال یہ ہے کہ تیسری صدی ھجری کے نصف اول میں انھوں نے اپنی رصدگاھوں کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی کہ رات اور دن کے مساوی ہونے کے وقت کے آگے بڑھ جانے کی مقدار جسے وہ ,,الحرکۃ البطیئۃ،، *** .سست حرکت کا نام دیتے تھے ۔ سو برس میں ایک درجہ نہیں ہے جیسا کہ اھل یونان نے حساب لگایا تھا بلکہ ھر ٦٦ برس میں ایک درجہ ہے ۔ پھر وہ اس مدت کی تصحیح میں مسلسل مصروف رہے حتی کہ اسے ھر ۷۰ برس میں ایک درجہ طے کیا اور یہ تحدید دور جدید کے سائنس دانوں کی تحدید ۔ یعنی ھر ۷۲ برس میں ایک درجہ ۔ سے کچھ زیادہ دور نہیں ۔

اسی طرح ہم یہ ذکر کرنا چاھیں گے کہ تیسری صدی ھجری میں مسلمان فلک شناسوں نے پہلی بار اس نکتے پر توجہ دی کہ سورج کا ,,اوج،، — یعنی اس کے زمین سے زیادہ سے زیادہ فاصلے کا نقطہ — یکساں نہیں رہتا ۔ بعد ازاں وہ اس جنبش کی حد متعین کرنے میں مصروف رہے ۔ مثلاً ہم دیکھتے ھیں کہ پانچویں صدی ھجری میں

---

** قدیم اصطلاح میں چالیس ,,ذراع،، دیکھئے حوالہ بالا ۔ مترجم)

*** اس سے مراد غالباً PRECESSION OF THE EQVINOXES ہے ۔

البیرونی چاروں موسموں میں چار بار کی رصد کے نتیجے میں یہ کوشش کرتا ہے کہ اس جنبش کی مقدار حساب تفاضلی [DIFFERENTIAL CALCULUS] کے ذریعے معلوم کرے۔ اس جنبش کی آخری تعیین جو مسلمان فلک شناسوں نے طے کی وہ ۱۲۶۰۹ سیکنڈ سالانہ تھی اور یہ تحدید بھی دور حاضر کی تحدید یعنی ۱۱.۳۶ سیکنڈ سالانہ سے کچھ زیادہ اختلاف نہیں رکھتی۔

اسی طرح ایک مثال اُسی کوشش کی بھی دی جا سکتی ہے جو انھوں نے ,,میلِ اعظم،، [GREATEST OBLIQUITY OF THE ECLIPTIC] کا حساب لگانے کے لئے کی۔ بطلمیوس اسے ۲۳ درجہ اور ۵۱ منٹ تصور کرتا تھا۔ ہندوستانی علماء کے نزدیک یہ ۲۴ درجے سے عبارت تھا۔ مسلمان فلک شناسوں کی توجہ تیسری صدی ھجری کے اوائل ہی میں اس امر کی طرف مبذول ہو چکی تھی کہ میلِ اعظم کی تعیین کے بارے میں بطلمیوس کا بیان اصلاح طلب ہے۔ چنانچہ انھوں نے مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر اپنے دقیق آلاتِ رصد کے ذریعے اس کی پیمائش شروع کی اور چوتھی صدی ھجری کے وسط میں یہ سوال اٹھانا شروع کر دیا کہ آیا یہ جُھکاؤ یکساں ہے یا متغیّر۔ ابراھیم بن سنان بن ثابت اور ابو جعفر الخازن نے یہ مشاھدہ کیا کہ مختلف رصدی مطالعوں کے نتائج میں تفاوت، آسمان کے قطبین کی یکیارگی اور بےترتیب حرکتوں سے عبارت ہے۔ اس سے تقریباً پچاس برس بعد حامد بن الخضر الخجندی نے یہ دریافت کیا کہ میل اعظم وقت کے ساتھ ساتھ کم ہو رہا ہے۔ دور جدید میں اُس کی اِس دریافت کی تائید ہوئی مگر دور احیائے علوم اور بعد کے فلک شناسوں کو اس امر کا احساس نہیں ہوا۔ خجندی نے میل اعظم کی جو

تعیین کی تھی وہ ۲۳ درجہ ۳۲ منٹ اور ۲۲ سیکنڈ تھی - جدید علم فلک سے اس کا فرق بہت معمولی ہے یعنی صرف دو منٹ -

تیسری اور چوتھی صدی ھجری میں رصدِ آسمانی اور سیارات کی حرکت کے حساب پر توجہ مرکوز رکھنے کے بعد چوتھی صدی کے اواخر میں مسلمان فلک شناسوں نے روز بروز نئے فلکیاتی نظریات وضع کرنے میں دل چسپی لینی شروع کی - مثال کے طور پر ابو العباس ایرانشھری نے یہ دریافت کیا کہ ,,بطلمیوس کی رائے کے برخلاف مکمل سورج گرھن صرف اُس بُعد میں ممکن ہے جو اَبعَد کی نسبت وسط سے قریب تر ہو،، - *

مسلمان فلک شناسوں نے سورج اور سیّاروں کے مدار کی شکل پر بحث کا آغاز کیا - اور بعض نے یہ رائے ظاھر کی کہ ان کا مدار — دونوں کے قطر میں معمولی فرق کے ساتھ — بیضوی ساخت رکھتا ہے۔

اسی زمانے میں اس مسئلے پر بحث نے بہت طول کھینچا کہ زمین ساکن ہے یا متحرک ؟ کونی سکون کا قائل تھا اور کونی تحرک کا - جن لوگوں نے حرکت زمین کا نظریہ قبول کیا ان میں ابو سعید السجزی اور جعفر بن محمد بن جریر شامل ھیں جنھوں نے اسی بنیاد پر ایک اسطرلاب بھی تیار کی - بیرونی اس مسئلہ پر ساری عمر دماغ لڑاتا رھا - اس کے لئے کسی بھی رائے کو ترجیح دینا مشکل رھا۔ آخر میں وہ سکون زمین کے نظریے کی طرف اس لئے مائل ھو گیا کہ حرکت کا نظریہ قبول کر کے بعض طبیعیاتی سوالات کا جواب اس کے لئے بعض دشواریاں پیدا کرتا تھا اس مسئلے پر تقریباً یہی حال ابن

---

* غالباً مراد یہ ہے کہ مکمل سورج گرھن استوائی یا خط استواء سے قریبی عرض بلد میں ھی ممکن ہے جس قدر قُطبین کی جانب بڑھتے جائیں گے یہ صورت ممکن نہ رھے گی - (مترجم)

الہیثم کا تھا۔

پانچویں صدی ہجری کے نصف اوّل میں فلکیات کی تاریخ ابن الہیثم کی شخصیت میں ایک اہم مرحلے کو پہنچتی ہے۔ ابن الہیثم ہی وہ شخص ہے جس کے ہاں پہلی بار سیّاروں کی حرکات کی سائنسی وضاحت ملتی ہے جسے وہ ,,نظام طبیعی،، کا نام دیتا ہے جو اس کے الفاظ میں یوں ہے:

,,وہ مقدّمات جن پر کواکب، نیز عالم کے گرد حرکت کرنے والے تمام اجرام کے مداروں کی ترکیب مبنی ہے چار ہیں۔ ایک یہ کہ جسم طبیعی خود ایک سے زیادہ طبیعی حرکت نہیں کرتا۔ دوسرے یہ کہ بسیط جسم طبیعی کی حرکت میں اختلاف واقع نہیں ہوتا یعنی وہ گردش کے دوران ہمیشہ برابر وقت میں برابر فاصلہ طے کرتا ہے۔ تیسرے یہ کہ جسم آسمانی انفعال کو قبول نہیں کرتا اور چوتھے یہ کہ خلا موجود نہیں ہے،،۔

مذکورہ بالا امور کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابن الہیثم پہلی بار اس امر کی نشاندھی کرتا ہے کہ بطلمیوس نے پانچ سیّاروں کی حرکات کی جو ہیئت مقرر کی تھی وہ غلط ہے اور بطلمیوس نے بھی اسے غلط ہی جانتے ہوئے مقرر کیا تھا کیونکہ اس کے لئے اسکے علاوہ اور کچھ ممکن نہ تھا۔ (۱)

ابن الہیثم نے زیر تبصرہ مقامات کی نشاندھی یوں کی ہے: ,,سو یہ مقامات جن کا ہم نے ذکر کیا باہم تناقض رکھنے والے مقامات ہیں جنہیں ہم نے کتاب المجسطی میں پایا۔ کچھ ایسے ہیں جن میں وہ معذور ہے اور کچھ ایسے ہیں جن میں وہ کوئی عذر پیش نہیں کر سکتا۔ وہ یوں کہ کچھ مقامات تو بھول چوک کی ذیل میں آ جاتے ہیں جن سے انسان کا بچنا ممکن نہیں سو ان میں تو وہ معذور ہے

(۱) الشكوك على بطلميوس للحسن بن الهيثم، نشر عبدالحميد صبره و نبيل الشهابي القاهره ۱۹۷۱، ص ۳۳ ـ ۳۸

اور کچھ مقامات وہ ہیں جن میں اس نے جانتے بوجھتے غلطی کا ارتکاب کیا ۔ یعنی وہ ہیئتیں جو اس نے پانچوں سیّاروں کے لئے متعین کیں — سو ان میں اس کا کوئی عذر نہیں چل سکتا ۔

رہی اس بات کی دلیل کہ اس نے ان مقامات میں غلطی کا ارتکاب قصداً کیا، سو وہ نویں مقالے کی دوسری فصل میں اس کا یہ قول ہے : ... ،،اسی طرح اس مفہوم نے ہمیں ایک جگہ مجبور کر دیا کہ ہم بعض خارج از قیاس اشیاء کو استعمال میں لائیں ۔ مثال کے طور پر یہ سیّارے اپنے اپنے مدار میں حرکت کرتے ہوئے جو مجرّد دائرے بناتے ہیں ان پر دلائل قائم کریں ۔ نیز اس مضمون پر اسی نوع کی مزید گفتگو ... ،،

اس قول سے اس کا یہ اعتراف سامنے آتا ہے کہ اس نے سیاروں کی حرکات کی ہیئت کے سلسلے میں کچھ خارج از قیاس اشیاء سے کام لیا ۔ اور یہی وہ اشیاء ہیں جن سے اس کے ہاں تناقض پیدا ہوا ۔ کیونکہ حرکاتِ سیّارگاں کی ہیئتوں سے متعلق اس کے ہاں تناقض کی بنیاد یہی ہے کہ اُس نے ان حرکات کو حقیقی اجسام کے بجائے چند خیالی دائروں اور خطوط میں فرض کر لیا تھا ۔ پھر جب اُنھیں حقیقی اجسام میں تصور کیا گیا تو تناقض لازم آیا ۔ سو اُس کے اعتراف سے واضح ہو گیا کہ اُس نے ان مضامین میں غلطی کا ارتکاب جانتے بوجھتے کیا ۔ رہا یہ کہ اس ضمن میں وہ کوئی عذر نہیں لا سکتا سو وہ اس لئے کہ آخر کلام میں اس نے یہ کہہ کر عذر پیش کیا کہ : ،،... یہ سمجھتے ہوئے کہ اس نوع کی کسی شے کا استعمال — جب تک کہ اُس سے بنیادی طور پر کوئی قابلِ ذکر فرق نہ پڑتا ہو۔ مقصد کو کچھ نقصان نہیں پہنچاتا ،، ۔ وہ یہ کہنا چاھتا ہے کہ جو ہیئت اس نے فرض کی ہے اس سے سیّاروں کی حرکات میں کچھ

فرق واقع نہیں ہوتا ۔ مگر یہ بات غیر حقیقی ہیئتوں کے مفروضوں کا عذر نہیں بن سکتی کیونکہ اگر وہ ایک غیر حقیقی ہیئت کو فرض کرے گا اور وہ ہیئت اس کے تخیّل کے مطابق سیّاروں کی حرکات کو ان کے معمول پر قائم رکھے گی تو * (۲) ۔

اپنے ان اعتراضات میں ابن الھیثم کا ھدف وہ جدید عنصر ہے جس کا اضافہ بطلمیوس نے سیاروں کی ان ہیئتوں میں کیا جو قدماء کے ہاں معروف نہیں ۔ اس عنصر کا نام بطلمیوس نے ،،الفلک المعدّل للمسیر،،[EQUANT]رکھا ۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قدماء کے ہاں سیّاروں کی ہیئت کے دو بنیادی عناصر کا تعارف کرا دیا جائے کیونکہ انھی پر بطلمیوس نے اپنی خاص ہیئت کی بنیاد اٹھائی ۔

بات یہ ہے کہ قدماء نے جب سیاروں کا مشاہدہ شروع کیا تو دیکھا کہ زمین سے مشاہدہ کرنے والے کی نسبت سے ان میں سے ہر ایک کا فاصلہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے ۔ اُن کا نقطہ آغاز چونکہ یہ تصور تھا کہ زمین کائنات کے مرکز میں واقع ہے لہذا اُنھیں اِس مظہر کی توجیہ مہیا کرنے کی ضرورت پیش آئی ۔ چنانچہ انھوں نے یہ خیال کیا کہ سیاروں کے مداروں کے اپنے مرکز ہیں جو مرکز کائنات یعنی زمین سے الگ ہیں اور اُن مداروں کے مختلف مراکز زمین سے ہٹے ہوئے فرض کر لئے ۔ بعد ازاں جب انھوں نے دیکھا کہ یہ ترکیب ۔ یعنی ایسے مداروں کا تصور جن کے مرکز خارج میں واقع ہیں ۔ بھی زمین سے

* ... تو اس سے اس امر کا امکان ختم نہیں ہوتا کہ اس نے جو ہیئت فرض کی ہے اس میں غلطی کی ہو (تکمیل اقتباس از مترجم بحوالۂ مذکورۂ ذیل )

(۲) مرجع سابق ، ص ۳۷ ۔ ۳۸

سیاروں کے مختلف بُعد کی مکمّل توجیہ کے لئے کافی نہیں، تو انہیں ایک اور ترکیب کرنا پڑی - یعنی یہ مفروضہ قائم کرنا پڑا کہ سیّاروں کی کچھ اور چھوٹی گردشیں ایسے مداروں پر بھی جاری ہیں جن کے مرکز اُن افلاک کے مداروں میں گردش کر رہے ہیں جن کے اپنے مرکز خارج میں واقع ہیں - اِن چھوٹے مداروں کو اُنھوں نے ,,افلاک التّداویر،، [EPICYCLES] کا نام دیا -

بطلمیوس نے یہ کیا کہ سیّاروں کے لئے ایک تیسرے دائرے کا تصور قائم کیا جسے اس نے ,,الفلک المعدّل للمسیر،،[EQUANT] کا نام دیا - بطلمیوس کے تصور کے مطابق اس مدار کا مرکز نہ تو مرکز کائنات پر منطبق ہوتا ہے اور نہ مرکز فلکِ خارجی پر - اس نے یہ مفروضہ قائم کیا کہ اپنے اپنے ,,تداویر،،[EPICYCLES] میں گردش کرتے ہوئے سیّاروں کی حرکات اس فلکِ معدّل کے اعتبار سے منظم ہے نہ کہ مرکزِ فلکِ خارجی یا مرکزِ کائنات کے اعتبار سے -

یہی بطلمیوس پر ابن الهیثم کے اعتراض کی اساس ہے کہ اس نے یہ هیئت قائم کر کے سیّاروں کی منظم حرکات کے اصول میں خلل ڈال دیا اور ایک نئی هیئت پیش کر دی - افسوس کہ اِس نئی هیئت کی تفصیل ہم تک پہنچ نہیں سکی -

بعد ازاں اور کئی فلک شناس آئے جنھوں نے بطلمیوسی هیئت کو رد کیا - مثلاً ابو عبید الجوز جانی اور عمر خیّام - پھر ان کے بعد نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی، اور ابن الشاطر جیسے لوگ آئے جو یکے بعد دیگرے نئے نظریات پیش کرتے رہے اور ہر ایک اپنے پیش رو کے نتائج پر تعمیر کو آگے بڑھاتا رہا -

بیس برس قبل بعض محققین کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی کہ عین ممکن ہے اِن علماء نے نظریات ہی کے نتیجے میں کوپرنیکس

[COPERNICUS] نے سیاروں کی ہیئت میں بطلمیوس کے داخل کئے ہوئے نئے عنصر ,,الفلک المعدّل للمسیر،، کو رد کیا ہو اور بطلمیوسی نظام کو ترک کرتے ہوئے سورج کو مرکزِ عالم میں جگہ دی ہو۔

اس میدان میں متعدد تحقیقات کے بعد اِس امر میں کوئی شک باقی نہ رہا کہ مسلمان فلک شناسوں کے نظریات پوری تفصیلات کے ساتھ کوپرنیکس کے علم میں تھے اور اُس نے حرف بہ حرف اِنھیں اخذ کیا (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ,,تاریخ التراث العربی،، جلد ٦ پر میرا مقدّمہ)

آج جو مسئلہ اصحابِ تحقیق کو درپیش ہے وہ اِس امر کی وضاحت ہے کہ یہ نظریات کس طریق پر مغرب میں منتقل ہوئے؟ کیونکہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا ان متأخرین فلک شناسوں کی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا تھا یا نہیں۔ اس موقع پر میں مکمل تفصیلات اور دلائل تو پیش نہیں کر سکتا تاہم جو کچھ بالتفصیل اپنی کتاب کی چھٹی جلد میں لکھ چکا ہوں اس کی تلخیص پر اکتفا کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ مسلمان علماء کے یہ جدید نظریات مغربی دنیا میں عربی اور فارسی کتب کے یونانی زبان میں ترجمے کی وساطت سے منتقل ہوئے۔ یہ کام مدرسۂ ترجمہ سے منسلک لوگوں نے انجام دیا جو تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر سے طربزون اور قسطنطینوبل کے شہروں میں قائم تھا۔ غالباً یہ سلسلہ قسطنطینوبل کی فتح تک جاری رہا۔ ساتھ ھی ساتھ ان دونوں شہروں کے بہت سے رہنے والوں نے زبانی روایت کے ذریعے بھی ان دونوں دنیاؤں کے مابین واسطے کا کام دیا۔

بطلمیوس نے عالم کی جو ہیئت معیّن کی تھی اُس پر اندلسی فلسفیوں کی طرف سے بھی شک کا اظہار کیا گیا۔ چنانچہ محمد بن

یحیی بن الصائغ المعروف به ابن باجه (المتوفی ۵۳۳ھ) نے کہا : ..مرکز عالم کے گرد اپنے اپنے مداروں میں سیاروں کے فاصلوں کی پیمائشوں میں اختلاف کا سبب متعین کرنے کے لئے ..افلاک تداویر.. [EPICYCLES] کے تصور کی ضرورت نہیں - خارجی مرکز رکھنے والے دائروں [ECCENTRICS] کو قبول کر لینا ھی کافی ہے ..بعد ازاں ابن طفیل ( المتوفی ۵۸۱ھ) نے.. افلاک تداویر ..نیز خارجی مرکز رکھنے والے دائروں کو بھی قبول کرنے سے انکار کیا - اس کے بعد فلسفی ابن رشد (المتوفی ۵۹۵ھ) آیا اور افلاکِ تداویر نیز خارجی مرکز رکھنے والے دائروں کے انکار کی ضرورت کا نظریہ پیش کیا - اور صراحت سے کہا کہ سیّاروں کے مداروں کے مرکز مشترک ہونے چاھئیں نیز یہ کہ سیاروں کی حرکات لولبی [SPIRAL] حرکات ھیں اور اسی حرکت کی بنیاد پر وہ مرکز عالم سے سیاروں کے مختلف مداری فاصلوں کی وضاحت کیا کرتا تھا - اس کا عزم تھا کہ وہ عالم کی ایک نئی ھیئت متعین کرے گا لیکن موت نے اسے فرصت نہ دی -

اس آرزو کی تکمیل ابو جعفر البطروجی (المتوفی ٦٠٠ ھ تقریباً) کے ھاتھوں ھوئی جس نے اپنا تعارف بطلمیوسی ھیئت کی جگہ لینے والے ایک نئے علم ھیئت کے بانی کی حیثیت سے کرایا - اس نے اپنی کتاب المرتعش میں اپنے اس موقف کا اظہار یوں کیا ہے (۳)-

..... میں یہ کہتا ھوں کہ بطلمیوس نے یہ وضعیں اس دعوے پر قائم نہیں کی تھیں کہ یہ حقیقت نفس الامری سے عبارت ھیں - نہ اُس کا موقف یہ تھا کہ جو اصول اُس نے بنائے ھیں لازماً اس کے رصدی وحسّی مشاھدے سے مطابقت رکھتے ھیں - اُس نے تو انھیں اُن [مخصوص] حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے وضع کیا تھا تاکہ ان کے ذریعے وہ حرکات اس طرح چل سکیں کہ ایک مخصوص نظام

(۳) کتاب المرتعش، نسخہ استانبول، کتب خانہ احمد الثالث ، نمبر ۳۳۰۲ ، ورقہ ۱۰/ب - ۱۱/آ

اور ایک ایسی ترتیب کے تابع ہوں جس میں اختلاف و تفاوت کی گنجائش نہ ہو۔ یہ بات اُس سے پوشیدہ نہ تھی کہ اُس کی قائم کردہ وضع [در اصل] نظام میں مخل تھی اور [ہنوز] پختگی سے دور تھی کیونکہ اس کے وضع کردہ دونوں اصولوں سے ، الگ الگ اور یکجا بھی لازم آتا ہے کہ یا تو ایک خلا ہے جس میں خارجی مراکز والے یہ افلاک حرکت کرتے ہیں۔ یا پھر ان افلاک پر مشتمل افلاک کسی اور نامعلوم مادے سے پُر ہوں جس کے اجزاء ان میں حرکت کرنے والے اجسام کے منتقل ہونے کے ساتھ ساتھ منتقل ہوتے رہتے ہوں چنانچہ ان کے لئے جگہ خالی کر کے کسی اور جگہ کو خود پُر کرتے ہوں۔ یہ سب باتیں ناقابل قبول ، سچائی سے دور اور حقیقتِ آسمان سے مطابقت نہ رکھنے والی ہیں ۔ ..بطروجی کے خیال میں بطلمیوس نے اس سلسلے میں جو کچھ بھی کہا ہے اس کی اساس ..توہّم پر ہے نہ کہ حقیقت پر (۳) "

یہاں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ بطروجی کے اپنے الفاظ میں اس محرک حقیقی کا ذکر کر دیں جس نے بطروجی کو ان تحقیقات پر آمادہ کیا۔

"..... کہ تمہیں بتاؤں کہ مجھے کیا سوجھا اور عمر بھر کی مشغولیت اور سوچ بچار کے نتیجے میں جو متاع گراں بہا مجھے حاصل ہوئی اس کا رازِ دروں تم پر کھولوں۔ میں تم سے، اور ہر اس شخص سے جو میری تحریر پڑھے ، درخواست کرتا ہوں کہ یہ گمان نہ کرے کہ جن خیالات کا یہاں اظہار کیا جا رہا ہے ان کا مقصد قدماء کی رائے سے ٹکراؤ پیدا کر کے شہرت حاصل کرنا ہے کہ اللہ جانتا ہے اور گواہ ہے کہ میں نے آغاز ہی سے محض اس خاطر یہ مقصد اپنایا کہ لڑکپن کے دور ہی میں جب میں نے آسمانوں کی حرکت پر

(۳) مرجع - ص ۹ -

ریاضیات کا مطالعہ کیا اور اس علم کے امام بطلمیوس اور بعد میں آنے والے اسی کے متّبعین کے اقوال کا جائزہ لیا (جبکہ کرہ ثوابت کی حرکت کے مسئلے پر اس سے ابو اسحاق ابراهیم بن یحیی المعروف بالرزقالی کے سوا کسی نے اختلاف نہیں کیا ) ... (۵)

بطروجی کی یہ کتاب جس میں عالم کی ایک نئی هیئت پیش کر کے اسے بطلمیوسی هیئت کی جگہ دینے کی کوشش کی گئی ہے اور جس کا ترجمہ تالیف کے چند هی سال بعد، لاطینی اور عبرانی میں ہو گیا تھا، نہ صرف یورپ کے، فلکیاتی افکار پر اثر انداز ہوئی بلکہ سولھویں صدی عیسوی کے اواسط تک فلسفےاور طبیعیات کے افکار پر بھی اثر ڈالتی رهتی اور ان تمام میدانوں میں اس کا اثر بہت گہرا تھا اسی طرح اس کتاب نے بعد کے فلک شناسوں کی مساعی کے دوش بدوش ۔ جن میں ابن الهیثم، الزرقالی، جابر بن افلح، ثابت بن قرّة، نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی اور ابن الشاطر کی کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ــ علم الفلک کو اُس جدید مرحلے تک پہنچانے میں حصہ لیا جس کا ظہور کوپرنیکس کی شخصیت میں ہوتا ہے۔ چنانچہ کوپرنیکس کو اس نظر سے دیکھا جانا چاهئے کہ وہ علم الفلک کے تاریخی ارتقاء کی بہت سی کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے اور اس ارتقاء میں مسلمان سائنس دانوں کا حصہ ان کے پیش روؤں یا بعد میں آنے والوں سے کسی طور کم نہیں ۔

---

(۵) مرجع سابق، ۱/ب

●●●

۳

# عربوں کے علم الفلک کا یورپ پر اثر

ایک معاصر جرمن عالم نے ۱۹۵۷ء میں ایک کتاب تالیف کی
س میں اس سوال کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ
رھویں صدی عیسوی میں یورپ میں اچانک یونیورسٹیاں کیونکر
جود میں آ گئیں جبکہ اس سے قبل، ایسی یونیورسٹیوں کا کوئی نمونہ
قدیم یونانیوں کے ہاں ملتا ہے نہ رومیوں یا بیزنطیوں کے ہاں۔ مؤلف
خود کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ یہ ادارہ ایسی چیز ہے جس کی
ریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی اور یہ کہ یہ یورپ میں کسی خارجی
ر کے بغیر از خود وجود میں آ گیا۔

کتاب مذکور کی اشاعت کے پانچ برس بعد، میرے رفیق کار
سرجس (H. SCHIPPERGES) نے — جو ایک مدت سے اس مسئلے پر
حقیق کرکے قابل قدر نتائج تک پہنچ چکے ہیں کہ عربوں کا علم
ب یورپ میں کیونکر منتقل ہوا — اس پر اصلاحی نظر ڈالی اور یہ
سوال اٹھایا کہ مؤلف کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ ان اداروں یا ان

کے ابتدائی مرحلوں کے بارے میں یہ سراغ لگائے کہ عالم اسلام میں ان کے وجود کا کہاں تک امکان ہے۔ موضوع پر طویل بحث اور بہت سے دلائل مہیا کرنے کے بعد شپرجس نے یہ ثابت کر دیا کہ بارھویں صدی عیسوی میں یورپ کی یہ سب یونیورسٹیاں، طلیطلہ کے راستے، مکمل طور پر اسلامی یونیورسٹیوں کی تقلید میں بنی تھیں۔

مغربی تحریک احیائے علوم کے تمام پہلوؤں پر اسلامی علوم اور ثقافتوں کے عمومی اثر کا یہ مظہر تین راستوں، یعنی ھسپانیہ، اٹلی اور بیزنطہ کے راستے، عمل میں آیا۔

اس خطبے میں میری کوشش ہو گی کہ یورپ میں عربوں کے علم الفلک کے اثرات سے متعلق ایک عمومی تصور آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث میں اپنی کتاب [GESCHICHTE DES ARABISCHEN SHRIFFTUMS] کی چھٹی جلد میں کر چکا ہوں۔ سامعین کرام سے درخواست ہے کہ دلائل و مراجع کے لئے اس جلد کی طرف رجوع فرمائیں۔

اجتماعی رابطے کے [عمومی] اثرات سے قطع نظر، عربی سے لاطینی میں کیا جانے والا قدیم ترین ترجمہ جو اب تک معلوم ہو سکا ہے دسویں صدی عیسوی کا ہے۔ کتاب کے مؤلف کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ ترجمہ ,,ASTROLOGIA،، کے عنوان سے، لوپیٹس برسلونی [LUPITUS]، نامی کسی شخص نے کیا تھا۔

عجیب بات ہے کہ اسطرلاب سے متعلق اولین کتاب بھی دسویں صدی عیسوی ہی کے اواخر میں سامنے آئی جس کا مؤلف گربرٹ (GERBERT) بتایا جاتا ہے۔ یہ وہی شخص ہے جو سیلوسٹر ثانی کے نام سے پاپائے روم رہا اور اسی نے لاطینی دنیا میں عربی ہندسے متعارف کرائے۔ وہ ایک مدت تک طلیطلہ اور برشلونہ میں رہ چکا تھا۔

ریاضیات کے ایک مورخ نے اس رائے کو رد کیا ہے کہ گربرٹ نے اسطرلاب پر اپنی کتاب کا مواد مسلمان فلک شناسوں سے اخذ کیا یا کم از کم یہ کہ ان سے استفادہ کیا ـ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں انکار کا یہ رویہ قبول عام پا رہا تھا کہ اس کتاب کے دریافت ہو جانے سے ــ جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ـ حقیقت واضح ہو گئی اور اصل و ترجمہ کے مابین ربط ثابت ہو گیا ـ علاوہ ازیں لوبینس کے نام گربرٹ کا ایک خط بھی دریافت ہو گیا جس میں وہ کہتا ہے :

,,میں نے سنا ہے کہ آپ نے اسطرلاب پر ایک عربی کتاب کا ترجمہ کیا ہے ـ استدعا ہے کہ یہ ترجمہ مجھے بھجوا دیں ـ اس کے معاوضے کی جو شکل بھی ہو میں اس کے لئے تیار ہوں،، ـ

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ فلکیات کی بعض اصطلاحیں گربرٹ کی کتاب میں اپنی عربی صورت ہی میں باقی رہیں کیونکہ لاطینی زبان میں ان کے مترادفات نہ ہونے کے سبب ، ان کا ترجمہ ممکن نہ تھا ـ موضوع سے ہٹ کر یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ یہ لوگ اصطلاحات کے ترجمے میں غلطی کا شکار ہوا کرتے تھے ـ اس کی ایک مثال (SINUS) کا لفظ ہے جو مسلمان فلک شناسوں کے ہاں مستعمل لفظ ,,الجیب،، کے ترجمے کے طور پر برتا گیا ـ مسلمانوں کے ہاں یہ اصطلاح ہنود کی زبان سنسکرت سے آئی تھی ـ انہوں نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا ہی نہیں ـ تاہم لاطینی مترجم اس صورت حال کو نہ سمجھ سکا اور لغتوں کی ورق گردانی کرکے اس نے یہ سمجھا کہ مراد عربی کا لفظ ,,الجیب،، ، یعنی لباس کی جیب ہے ـ

خیر یہ جملہ معترضہ تھا ـ میں گربرٹ کی کتاب کے موضوع کی طرف واپس آتا ہوں ـ اس امر میں شک کی گنجائش نہیں کہ جو

کتاب اس کی طرف منسوب ہے یا تو اس نے اسے عربوں سے اخذ کیا ہے یا پھر وہ کسی عربی کتاب کا ترجمہ ہے جو گربرٹ سے منسوب ہو گیا۔

یہاں یہ نکتہ اہم ہے کہ اسی زمانے سے لاطینی دنیا میں عملاً تطبیقی و ریاضی علم الفلک سے دل چسپی کا آغاز ہوا۔ اس سے قبل ان کے ہاں علم الفلک سے تھوڑا بہت لگاؤ ضرور پایا جاتا تھا مگر وہ دراصل قدیم ,,کوزمولوجی،، ہی کے تسلسل سے عبارت تھا۔ بطلمیوس کی ہندسی فلکیات سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ مختصراً میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ وہ بطلمیوس اور اس کے نظام فلکی سے واقف ہی نہیں تھے۔ اور اگر ہوتے بھی تو اس کو سمجھ نہیں سکتے تھے کیونکہ اس کی کتاب کو سمجھنے کے لئے علم ہندسہ کا جو عنصر ضروری تھا وہ ان کے ہاں سرے سے موجود نہ تھا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ گیارھویں صدی عیسوی میں اسطرلاب سے متعلق دو کتابیں اور تالیف کی گئیں۔ دونوں میں اسی کتاب کی تقلید کی گئی جو گربرٹ سے منسوب ہے۔ یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی میں استفادے کا مرکز طلیطلہ تھا۔

گیارھویں صدی کے اواخر میں طلیطلہ کے ساتھ فرانس کے دو شہر طولوز (TOULOUSE) اور شارتر (CHARTRES) بھی شامل ہو گئے اور ان کے بعد پیرس۔

استفادے کے سلسلے کا ایک اہم کام وہ ہے جو قسطنطینوس افریقی [CONSTANTINE THE AFRICAN] نامی ایک عربی الاصل شخص نے انجام دیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ الجزائر کا ایک عرب تاجر تھا جسے جنوبی اٹلی کے شہر سالرنو (SALERNO) جانے کا اتفاق ہوا ان کے ہاں طب کے پست معیار کو دیکھتے ہوئے اسے خیال پیدا ہوا کہ اٹلی میں عربوں کے علم طب کو متعارف کرائے۔ چنانچہ وہ اپنے وطن

واپس گیا اور چند سال میں طب کی تحصیل کی - پھر دوبارہ اٹلی آیا اور اپنے ساتھ طب عربی کی بہت سی کتابیں لایا - کہا جاتا ہے کہ وہ یا تو پہلے سے عیسائی تھا یا عیسائی مذہب اختیار کر گیا اور لاطینی زبان سیکھی اور اسے ایک خانقاہ میں بٹھا دیا گیا تاکہ وہ وہاں علم طب پر عرب اطباء کی تالیف کردہ ستر کے قریب کتابوں کا ترجمہ کرے - ان میں سے بعض کو اس نے یونانی اطباء سے، بعض کو اپنے آپ سے اور بعض کو حقیقی مؤلفین سے منسوب کیا - یہ صورت حال اس وقت واضح ہوئی جب ان میں سے کچھ کتابوں کا ازسر نو لاطینی میں ترجمہ کیا گیا کہ انہی میں سے بعض جالینوس یا روفوس [RUFUS] یا ارسطو کے نام سے متداول چلی آ رہی تھیں -

آئیے علم الفلک پر اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کریں ... ہم دیکھتے ہیں کہ بارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ، بتّانی کی ضخیم کتاب نیز فرغانی کی اور خوارزمی کی کتاب (بترتیب مجریطی*) کا ترجمہ کیا گیا - ان سب کتابوں کو سمجھنے کے لئے اچھی خاصی فلکی اور ھندسی معلومات درکار ھیں -

۱۱۳۹ اور ۱۱۳۸ء کے درمیان ہم مارسیلیہ کے شہر میں ایک شخص کو دیکھتے ھیں - جس کا نام معلوم نہیں ہو سکا - کہ وہ اپنے ہم مذھبوں کے لئے، ایک جنتری تیار کرتا ہے جسے وہ ,,لاطینی جنتری،، کا نام دیتا ہے - لیکن دراصل اس کا کام الزرقالی کی جنتری

---

* ابو جعفر محمد بن موسی الخوارزمی کی ,,زیج السند ھند،، کو ابوالقاسم مسلمہ بن احمد مجریطی نے ۹۷۹ء/۳۶۹ھ کے لگ بھگ، ھجری تاریخوں اور قرطبہ کے طول بلد کے مطابق از سر نو مرتب کیا - تفصیلات کے لئے دیکھئے :

Dictionary of Scientific Biography, American Council of Learned Societies New York — 1981, 7 : 360—1, 9 :39.

(مترجم)

کے ایک عوامی سے ترجمے سے عبارت ہے جس میں عربی اصل کی تاریخوں کو عیسوی سالوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس نامعلوم شخص نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ الزرقالی کا پیرو ہے۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ کلدانی اور ہنود اور عرب، اہل مغرب کو علمی قیادت فراہم کرتے ھیں ۔ اسے بطلمیوس کا نام ضرور معلوم ہے لیکن وہ علم الفلک کی تاریخ میں اس کے کام سے ہرگز واقف نہیں

صرف علم الفلک کے میدان ھی میں نہیں بلکہ علی العموم اسلامی علوم سے اکتساب کے سلسلے میں ایک اہم مظہر، بارھویں صدی عیسوی میں ایک بڑے مترجم کا ظہور ہے جس کا نام جیرارڈ کرمونی (GERARDO DE CREMONA) تھا ۔ اس نے طلیطلہ کے شہر میں عربی زبان اور اسلامی علوم سیکھے اور نوّے سے زائد عربی کی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا ۔ ان میں سے پانچ فلکیات کے میدان سے تعلق رکھتی ھیں ۔ یعنی بطلمیوس کی کتاب المجسطی پر جابر بن افلح کی اصلاح، الزرقالی کی جنتری، طلوع فجر پر ایک کتاب جو ابن الھیثم سے منسوب ہے، نیز الفرغانی کی کتاب کا ترجمہ جو اس سے قبل بھی ایک بار ترجمہ کی جا چکی تھی. اسی طرح بطلمیوس کی کتاب المجسطی کا عربی سے لاطینی ترجمہ جس سے پہلے المجسطی لاطینی میں غیر معروف تھی ۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ جیرارڈ کرمونی نے جو ترجمے کئے ان کے ذریعے میدان فلکیات کے بعض اہم عناصر لاطینی دنیا میں منتقل ہونے اور جس زمانے میں لاطینیوں کا تعارف بطلمیوس کی کتاب المجسطی سے ہوا اسی زمانے میں الزرقالی کی جنتری بھی ان کے علم میں آگئی جس میں مجسطی سے متعلق بعض اہم نتائج موجود ھیں ۔ اسی طرح المجسطی پر جابر بن افلح کی اصلاح کے ذریعے لاطینیوں کو مجسطی

پر شدید تنقید اور اس میں بعض اہم تصحیحات سے بھی واقفیت حاصل ہو گئی - سب سے بڑھ کر یہ کہ جابر بن افلح کی اسی کتاب کی وساطت سے ان کی رسائی علم المثلثات [TRIGONOMETRY] کے تفصیلی تعارف تک ہوئی جس کا وسیع اثر کوپرنیکس کے عہد تک بہت سے مؤلفین کے ہاں نظر آتا ہے- خود کوپرنیکس نے اس کتاب سے دور رس استفادہ کیا - بایں ہمہ جابر بن افلح پر یہ تہمت چلی آتی ہے کہ اس نے بطلمیوس پر غلط الزامات عائد کئے ہیں -

الزرقالی کی جنتری اور اس کی دیگر کتب کے لاطینی و عبرانی ترجمے نے لاطینی دنیا میں علم الفلک کے آئندہ ارتقاء پر گہرے اثرات مرتب کئے - اوروں پر ان اثرات کی بات ایک طرف، اب تو یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ خود کوپرنیکس نے - ماخذ کا ذکر کئے بغیر- الزرقالی کی جنتری سے بہت کچھ نقل کیا ہے- ہاں کوپرنیکس اوج الشمس [SOLAR APOGEE] کی سالانہ حرکت، جو الزرقالی کے حساب سے ۴ء ۱۲ ہے کی مناسبت سے رواروی میں اس کا ذکر ضرور کرتا ہے اگرچہ خود اسے یہ تسلیم کرنے میں تامّل ہے کہ اوج الشمس میں حرکت پائی جاتی ہے-

بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ مشہور سائنسدان کپلر (KEPLER) بھی الزرقالی کی کتاب سے متأثر ہوا مثلاً اس نے سیّارۂ مریخ کے مدار کی بیضوی شکل کے بارے میں اس کے نظریے سے اثر قبول کیا -

ریجیومونتانوس (REGIOMONTANU S) کی کتاب میں ایک عجیب چیز ہے- اس نے الزرقالی کا جو ترجمہ کیا، چھاپے کی غلطی سے، اس میں جہاں یہ ذکر تھا کہ چار رصدی مطالعوں کے بعد وہ یہ ثابت کر سکا کہ اوج الشمس کا نقطہ (40 r — quattuor) ہے وہاں طباعت میں یہ عدد ,,402 ،، بن گیا اور اسی کی بنیاد پر کپلر نے ایک معروف فلک شناس کو خط لکھا جس میں یہ پوچھا گیا تھا کہ کیا

اس کے پاس الزرقالی کی وہ کتاب ہے جس میں اس نے یہ بتایا ہے کہ اس کے رصدی مطالعوں کی تعداد ۴۰۲ تک پہنچ گئی تھی۔

طلوع صبح کے موضوع پر جو کتاب ابن الھیثم سے منسوب ہے۔ اور درحقیقت ایک اور فلک شناس، محمد بن یوسف بن معاذ کی ہے جس کا تعلق اندلس سے تھا اور جو پانچویں صدی ھجری میں ہوا ہے۔ — فضا میں شعاعوں کے ٹوٹنے کے مسئلے پر اس کے اثر کا سراغ سولھویں صدی عیسوی کے آخر تک ملتا ہے۔

اس امر کا ذکر بھی اھمیت سے خالی نہ ہوگا کہ مترجم جیرارڈ کرمونی کو یہ خیال ہوا کہ ان کتابوں کا ترجمہ کر لینے کے بعد اب وہ اس قابل ہو گیا ہے کہ نظری فلکیات [THEORETICAL ASTRONOMY] پر لاطینیوں کے لئے خود ایک کتاب تالیف کر سکے۔ لیکن درحقیقت جو کچھ اس نے کیا وہ صرف اس قدر تھا کہ اس نے الفرغانی اور البتّانی کی دو کتابوں کی باھم آمیزش کر دی ۔ ہر چند کہ بعد کے زمانے میں اس کتاب کو تصحیفات نیز موضوع کے اعتبار سے ناپختگی کے سبب تنقید کا نشانہ بنایا گیا ... پھر بھی تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں اس کے کچھ نہ کچھ تقلید کرنے والے پیدا ہونے ۔ مثلاً تیرھویں صدی عیسوی میں ہم دیکھتے ھیں کہ ایک مشہور لاطینی فلک شناس آلونیس دو انسولیس (ALONIS DE INSULIS) متوفی ۱۲۰۳ء ایک کتاب ترتیب دیتا ہے جس میں جابر بن افلح اور الفرغانی کی کتاب کے علاوہ جیرارڈ کی کتاب — (جو خود بھی بعض عربی مآخذ کی نقل ہے جیسا کہ ذکر ہو چکا) — کا بھی چربہ اڑاتا ہے۔

لاطینی علم الفلک کی تاریخ میں ایک اہم پیش رفت یہ ہوئی کہ ولیم (GUILLAUME) * نامی ایک انگریز فلک شناس نے الزرقالی کی ,,زیج طلیطلہ،، (طلیطلہ کی جنتری)، جسے کسی گمنام شخص نے مرسیلیہ کے حالات کے مطابق ڈھال دیا تھا ، لی اور اس میں ضروری تبدیلیاں کرکے اسے لندن کے حالات کے مطابق بنا دیا ۔ یہ جنتری جو ,,لندن کی جنتری،، کہلائی، ایک طویل عرصے تک اپنے مقام کو برقرار رکھ سکی اور کئی صدیوں تک وہاں فلکی حسابات کے لئے بنیاد کا کام دیتی رہی ۔

تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل تک لاطینی حلقوں میں ــ بطلمیوس پر جابر بن افلح کی تنقید کے علاوہ ــ نظام عالم پر ابن رشد اور البطروجی کا نظریہ بھی راہ پا چکا تھا، جو بطلمیوس کے نظام عالم کی جگہ لینا چاھتا تھا ۔ یہ نظریہ لاطینی دنیا میں اس شرح کے جو ابن رشد نے ارسطو کی کتاب السماء والعالم پر لکھی تھی نیز ہیئت عالم پر البطروجی کی کتاب کے ترجموں کی وساطت سے پہنچا ۔ اسی آخر الذکر کتاب نے یورپ میں ، سولھویں صدی عیسوی کے اواسط تک، نہ صرف فلک شناسی کے میدان میں ذہنی رویے پر گہرے اثرات چھوڑے بلکہ فیزیائی فلسفے کے زاویۂ نگاہ کو بھی متاثر کیا ۔

مذکورہ بالا دونوں کتابوں کا ترجمہ انگریز عالم مائیکل سکاٹ (MICHAEL SCOTUS) نے کیا ۔ علاوہ ازیں اسنے اس غیر بطلمیوسی

---

* لفظ WILLIAM ھی کی ایک صورت ۔ دیکھئے :

Websters' New Biographical Dictionary,

Merriam — Webster Inc., Springfield M. A., U.S. A., 1983, P. 430

نیز دیکھئے :

Dictionary of Scientific Biography, 14 : 399:,

- William the Englishman. ..

نظام کی ترویج کے سلسلے میں دو کتابیں خود بھی تالیف کیں ۔ یہاں میں بطور خاص اس بات کا ذکــر کرنا چاھوں گا کہ یہ شخص البطروجی کے نظام کی توضیح پر اپنی کتاب کو نیکولاوس دمشقی [NICOLAUS OF DAMASCUS] سے منسوب کرتا ہے جسکا زمانہ پہلی صدی قبل مسیح کا ہے۔ اس سے یہ مشکل پیدا ھوتی ہے کہ آئندہ نسلوں میں اس کتاب کو مشہور فلک شناسوں اور فلسفیوں کے ھاں ایک مقام حاصل ھوتا ہے مگر اس مفروضے پر کہ یہ نیکولاوس دمشقی کی کتاب ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں البطروجی کی کتاب کے ترجمے کے بعد سے لاطینیوں کو دو متضاد نظاموں سے سابقہ پڑتا ہے یعنی بطلمیوسی نظام اور غیر بطلمیوسی نظام ۔ نتیجۃً ان میں ایک طبقہ ایک نظام کی پیروی کرتا ہے اور دوسرا دوسرے کی ۔ جبکہ ایک تیسرا طبقہ ان دونوں میں سے کسی ایک نظام کو قبول کرنے کے سوال پر تردّد کا شکار ھو جاتا ہے اور تذبذب میں پڑ کر عرب اساتذہ کی جانب سے وصول ھونے والی نو بہ نو معلومات کے مطابق اپنے موقف میں تبدیلی کرتا رھتا ہے میں اس آخر الذکــر طبقے میں سے تین اشخاص کا ذکر کروں گا جو تیرھویں صدی عیسوی میں پیرس کے مکتب فکــر کے ستون سمجھے جاتے ھیں یعنی راجر بیکن (ROGER BACON) البرٹس میگنس (ALBERTUS MAGNUS) اور رابرٹس گروسٹسٹے (ROBERTUS GROSSETESTE) ۔

رابرٹس بڑے مؤلفین میں سے تھا اور اس کا شمار ارسطو کے پیرووں میں ھوتا ہے چنانچہ وہ اپنی کتابوں میں اس کے مسلک کا دفاع کرتا ہے۔ حال ھی میں یہ انکشاف ھوا ہے کہ ارسطو کی کتابیں مطلقاً اس تک پہنچی ھی نہیں ۔ اور فلکیات کی تارخ میں جو کچھ

رابرٹس سے منسوب ہے البتانی اور ثابت بن قرہ کی کتابوں سے منقول ہے۔ بطلمیوس کا اس نے بس سرسری سا ذکر کیا ہے۔ حقیقت میں اس کا میلان البطروجی کی طرف ہے مگر وہ متردد ہے۔ ساتھ ھی اس کی کتابوں کے قاری کو یہ بات اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کہ وہ بعض اور عرب فلک شناسوں کے افکار کو اخد کرتے ہوئے یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ یہ افکار البطروجی کے اصولوں سے ٹکراتے ھیں۔ پندرھویں صدی عیسوی میں بھی کسی رابرٹس سے منسوب ایک اور لاطینی کتاب ملتی ہے اور اس کے بارے میں بھی یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ عرب فلک شناسوں ھی کے افکار سے منقول ایک مجموعہ ہے۔

رابرٹس کی ایک کتاب ,,مدوجزر،، پر ہے جو آج تک اس موضوع پر پہلی اھم کتاب تصور کی جاتی ہے۔ میں نے اس کا موازنہ الکندی کی کتاب سے کیا تو دیکھا کہ یہ اسی کا خلاصہ ہے۔ اس پر، ان شاء اللہ، میں ,,آثار علویہ،، [METEOROLOGY] پر اپنے خطبے کے دوران بات کروں گا ـ چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس بات کا مشاھدہ کیا جا سکتا ہے کہ بطلمیوسی مکتب فکر کے لوگ پیرس اور آکسفورڈ میں، مشاھدۂ افلاک اور سیاروں کے مداروں کے حساب پر توجہ رہے ھیں تاھم وہ کوئی نئی بات پیش کرنے سے قاصر ھیں کیونکہ وہ ھنوز اپنے عرب اساتذہ سے اخذ کردہ معلومات کو ھضم ھی نہیں کر سکے ـ

البرٹس میگنس (ALBERTUS MAGNUS) اپنی زندگی کے بیشتر حصے میں البطروجی کے نظریات کا پیرو رہا لیکن جب ثابت بن قرہ کی کتاب اس تک پہنچی جو مدار سیّارگاں کی وضاحت میں اس کے خاص نظریات پر مشتمل تھی تو میگنس کا غالب میلان بطلمیوس کی طرف ہو گیا ـ

جہاں تک راجر بیکن کا تعلق ہے سو اسے ان دونوں مسلکوں میں سے کسی ایک کے قبول کرنے میں سب سے زیادہ تردّد رہا اور اسی تردّد کے سبب اسے یہ شہرت حاصل ہوئی کہ وہ ناقدانہ ذہن کا مالک ہے۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ ابن الھیثم کی کتاب ھیئۃ العالم کے زیر اثر فلکی حرکات کے مشاہدے کے سلسلے میں اس کا میلان عرب بطلمیوسیوں کے مسلک کی طرف ہے۔ لیکن نظام عالم کو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سمجھنے کے لئے وہ البطروجی کے نظریے کو زیادہ مناسب پاتا ہے۔

پیرس کے فلک شناس حلقے کے لوگوں نے تیرھویں صدی عیسوی کے اختتام سے لے کر چودھویں صدی عیسوی تک کے عرصے میں عرب بطلمیوسیوں کی آراء قبول کرکے خود کو تذبذب سے نجات دلا لی۔ اور یہ ھیئت عالم پر ابن الھیثم کی کتاب کے ترجمے کے بعد ھی ممکن ہو سکا۔

ابن الھیثم کی کتاب کے ترجمے کے ساتھ لاطینی فلک شناس حلقوں میں ایک نیا عنصر داخل ہوتا ہے جو لاطینی فیزیانی فلکی رویّے کو بہت گہری تحریک بہم پہنچاتا ہے۔ اس نئے عنصر کا نام (IMAGINATIO MODERNORUM) یعنی ،،عالم کی نئی ھیئت،، تھا اور پہلا فلک شناس جس نے تذبذب کے موقف کو خیرباد کہنے کی جرأت کی برنا رڈوس دو ویریدینو (BERNARDUS DE VIRIDINO) تھا

چودھویں صدی عیسوی کے اوائل سے پیرس اور آکسفورڈ میں بطلمیوس مکتب فکر کی بالادستی قائم ہو جاتی ہے اور یہ لوگ فلکیاتی مشاہدات و حسابات میں دل چسپی کا آغاز کرتے ھیں۔ لیکن ھنوز وہ کوئی نئی چیز پیش کرنے سے قاصر تھے کیونکہ انھوں نے جو کچھ اپنے عرب اساتذہ سے اخذ کیا تھا ابھی اسے ھضم نہیں کر

سکے تھے ۔ ان فلک شناسوں میں مشہور ترین لیوی بن گرسون (LEVI BEN GERSON) ہے ۔ تاہم مورّخین علم الفلک کے وہ دعوے اب ہمیں غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر سکتے جن کی رو سے متعدد دریافتوں کا سہرا اس شخص کے سر ہے ۔ کیونکہ آج ہمارے لئے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ان دریافتوں کو ان کے حقیقی دریافت کنندگان کی طرف لوٹا سکیں ۔ مثلاً اس فلک شناس کے ہاں ہمیں بطلمیوس پر تنقید ملتی ہے جو کئی صدیوں سے اس کے نام درج چلی آتی ہے ۔ لیکن محقّق سے یہ بات مخفی نہیں رہی کہ اس نے بطلمیوس پر جابر بن افلح کی تنقید کو دہرانے سے زیادہ کچھ نہیں کیا ۔

سائنس کی تاریخ میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ بصریات کے میدان میں حجرہ تاریک [CAMERA OBSCURA] کو دریافت کرنے اور چاند کے مشاہدے کے سلسلے میں اس کو استعمال کرنے والا لیوی ہے ۔ تاہم نوے برس ہونے یہ حقیقت منکشف ہو چکی ہے کہ یہ کارنامہ دراصل ابن الھیثم نے انجام دیا تھا اور اس شہرت کا زیادہ حقدار وہی ہے ۔

اس طرح مثلّثات کرویہ [SPHERICAL TRIANGLES] کی دریافت لیوی سے منسوب کر دی گئی ہے مگر تیس برس پیشتر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ سہرا ۔ چوتھی صدی ھجری کے ـــ الخجندی ، ابو الوفاء البوزجانی، اور ابونصر بن عراق کے سر ہے اور ہمارے لئے یہ سراغ لگانا مشکل نہیں رہا کہ لیوی نے یہ سب کچھ کہاں سے اخذ کیا ۔

اسی طرح لیوی سے یہ بات منسوب ہو گئی کہ اس نے رصد کا وہ آلہ ایجاد کیا جو لاطینی دنیا میں ,,عصائے یعقوب [JACOB'S STAFF] کے نام سے مشہـــور ہوا ۔ اسی آلے کی ایجاد پر پندرھویں صدی عیسوی کا جرمن عالم ریجیو مونتا نوس بھی فخر کرتا نظر آتا ہے ۔ معاصر علماء نے اس امکان پر بھی بحث کی ہے کہ ریجیو مونتانوس نے

لیوی بن کرسون کی اس ایجاد کو ناجائز طور پر خود سے منسوب کر لیا ہو ۔ تاہم مشہور عالم ویڈیمان [WIEDEMANN] نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ دراصل ابن سینا اس آلے کا موجد ہے۔ مزید برآں ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ یہ آلہ ابن سینا کے ہاتھوں جس درجہ کمال کو پہنچ چکا تھا سترھویں صدی عیسوی کے ان علماء کے ہاں اس درجے کو نہیں پہنچ سکا ۔

آخری بات یہ کہ کسر اعشاریہ کی دریافت بھی لیوی بن گرسون سے منسوب کر دی گئی ہے حالانکہ اب ہمارے علم میں ہے کہ یہ سہـــرا الاقلیدسی کے سر ہے جو چوتھی صدی هجری کے مسلمان حساب دانوں میں سے ہے۔

پیرس اور آکسفورڈ کے مکاتب فکر پر مزید گفتگو طوالت کا باعث ہوگی لہذا اسے چھوڑتے ہوئے میں لاطینی فلکیاتی حلقوں کے ایک اور مظہر کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا جو میری نظر میں اپنی جگہ اهم ہے اور توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتا ہے۔ یہ ان نئی کتابوں کا وجود ہے جو عربی کتب کے تراجم کے پہلو بہ پہلو ایک اہم حیثیت رکھتی ھیں - میری مراد ان بڑی بڑی تالیفات سے ہے جو عربی مآخذ کی نقول پر مشتمل ھیں مگر جو مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اصل مآخذ اور اصل اساتذہ کے ناموں کو فراموش کر دینے کا سبب بنیں ۔

مثال کے طور پر شاہ الفونس دهم (ALPHONS) قسطلیة میں علماء کی ایک بڑی جماعت کو اپنے گرد جمع کرتا ہے تاکہ وہ علم الفلک پر ان سب عربی کتابوں کے مواد پر مشتمل ایک جامع تالیف تیار کر سکیں جو اس وقت ان کے ہاں معروف تھیں ۔ چنانچہ انہوں نے عملاً بیس کتابیں یکجا کیں اور ان کا خلاصہ تیاز کیا ۔ انهی میں ابن

الھیثم کی کتاب ھیئۃ العالم بھی تھی - یہ مجموعہ اپنے پرتگیزی عنوان سے مشہور ھوا اور یورپ میں (LIBROS DELSABER) کے نام سے عام ھوا اور اسے اپنے لاطینی ترجمے کی وساطت سے یورپ میں بہت فروغ حاصل ھوا -

اسی طرح کی ایک اور کتاب ,,سیّاروں کا جدید نظریہ،، (THEORICAE NOVAE PLANETARUM) ہے جس کا مولّف فلک شناس پوائرباک (PEURBACH) تھا - وہ پندرھویں صدی عیسوی کا آدمی ہے- اس کتاب میں اس نے عربی سے کئے ہوئے کئی تراجم یکجا کر دیئے ھیں - لیکن اساسی طور پر اس کا انحصار ابن الھیثم ، ثابت بن قرّہ اور الزرقالی کی کتابوں پر رھا ہے-

ایک اور کتاب ریجیومونتانوس کی تالیف ہے جس کا عنوان ,,بطلمیوس کی عظیم کتاب کا خلاصہ ،، ہے مگر درحقیقت یہ البتّانی اور الزرقالی کی کتابوں کی تلخیص سے عبارت ہے- مزید یہ کہ یہ فلک شناس ۱۳۶۴ء میں اٹلی کے شہــر پاڈووا [PADOVA] میں الفرغانی کی کتاب پر لیکچر دیا کرتا تھا -

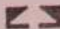
یہ آخر الذکر دونوں مشہور کتابیں، کوپرنیکس، گلیلیو اور کپلر کے اھم مآخذ میں شامل تھیں -

یہاں میں خود کو مجبور پاتا ھوں کہ متأخر مسلمان فلک شناسوں مثلاً نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی اور ابن شاطر سے کوپرنیکس کے متأثر ھونے کے مسئلے پر چند الفاظ کہوں - یہ مسئلہ گذشتہ بیس برس سے ماھرین علم فلک کے درمیان اھم ترین اختلافی مسائل میں شامل ھو گیا ہے- کوپرنیکس نے سیاروں کی حرکات سے متعلق ان علماء کے بعض نظریات اخذ کئے - اس خطبے کی حدود میں رھتے ھوئے کوپرنیکس کے بعض اکتساب کی وضاحت بلاشبہ مشکل

ہوگی ۔ اپنی کتاب ,,تاریخ التراث العربی،، کی چھٹی جلد کے مقدمہ میں میں نے اس مسئلے کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مختصراً یہ کہ چودھویں صدی عیسوی کے دوران بحیرۂ اسود کے مشرقی ساحل پر واقع شہر طرابزون [TRABZON] میں نیز قسطنطینیہ میں ترجمے کے لئے ایک ایک مدرسہ قائم ہوا ۔ ان دونوں مدرسوں کے علماء یورپ میں اپنے بھائیوں کی مدد کے لئے مذہبی جوش کے تحت عالم اسلام میں تالیف کی جانے والی تازہ ترین کتابوں کا ترجمہ کیا کرتے تھے ۔

تاریخ علوم پر اپنی تحقیقات کے دوران میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عالم اسلام سے لاطینیوں کے اکتساب کا مسئلہ اتنا پھیلاؤ رکھتا ہے کہ علماء کی ایک بڑی جماعت مل کر بھی کئی دھائیوں میں اس کی وضاحت کرنے پر قادر نہ ہو سکے گی ۔

جوں جوں انسان یورپ کے اصل مآخذ کی گہری تحقیق کرتا ہے اس کے ہاں یہ تصور قوت پکڑتا چلا جاتا ہے کہ وہاں کی نام نہاد تحریک احیاء اس بچے سے ازحد مشابہت رکھتی ہے جسے اس کے حقیقی باپ کے بجائے کسی اور کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو ۔



(۴)

# آثار علویہ * کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام

اس موضوع کا انتخاب — جس سے آپ لوگوں کی اکثریت کو واسطہ نہ رہا ہوگا۔ میں نے اسلئے کیا ہے کہ یہ ایک ایسی حقیقی مثال سمجھی جاتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ علوم کے بارے میں ، خصوصاً مسلمانوں کے حصے سے متعلق،دور حاضر کی آراء مبنی برحقیقت نہیں ہیں۔ نیز یہ کہ اس علمی ورثے کی تحقیق پر توجہ دینا ہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے ان آراء کو اسلامی علوم کے حق میں ہموار کیا جا سکتا ہے۔

یہ موضوع معمولی سے معمولی مطالعے اور توجہ سے بھی محروم رہا ہے اور اس میدان میں جو کتابیں تالیف ہوئی تھیں انہیں فلکیات کی کتابوں کے ذیل میں رکھ دیا گیا ہے۔ اس علم کے مؤرخین نے اس کے الگ الگ موضوعات پر نیز اسکی عمومی تاریخ پر متعدد تحقیقات کی ہیں ۔ عموماً وہ آغاز چھٹی صدی قبل مسیح سے لے کر ظہور اسلام تک کے علمائے یونان کے کام سے کرتے ہیں اور پھر اگلے مرحلے

---

Meteorology*

کے بارے میں ، تیرھویں صدی عیسوی کے اختتام یعنی اس دور کے اوائل تک کے لئے سکوت اختیار کرتے ھیں جسے وہ احیائے علوم کا دور قرار دیتے ھیں ۔

دور حاضر میں، کچھ ھی عرصہ قبل ، بعض علماء کو جب رسائل اخوان الصفا کا جرمن ترجمہ پڑھنے کا موقع ملا تو انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ ان رسائل میں ایک فصل فضائے آسمانی میں واقع ھونے والے بعض امور سے متعلق ہے ۔ اسی طرح معروف عالم ویڈیمان (E · Wiedemann) جس کی ساری علمی زندگی تاریخ علوم میں مسلمانوں کا مقام واضح کرنے کی کوشش میں بسر ھوئی ۔ نے بھی ایک مختصر مقالہ لکھا ہے جو آثار علویہ پر ان بحثوں سے متعلق ہے جو البیرونی کی کتاب ,,الآثار الباقیة عن القرون الخالیة ،، میں اس کی نظر سے گزریں ۔ تاھم یہ سب چیزیں آثار علویہ کی تاریخ میں مسلمان علماء کی مساعی کے سلسلے میں کوئی قابل ذکر تصور مہیا کرنے کے لئے کافی نہ تھیں ۔

جہاں تک ,,آثار علویہ ،، کی اصطلاح کا تعلق ہے سو یہ Meteorology کی عربی صورت ہے جس کا مفہوم ہے وہ اشیاء یا تغیّرات جن کی نمود زمین سے اوپر اوپر ھوتی ہے ۔ اس اصطلاح کا آغاز چوتھی صدی قبل مسیح میں ھوا ۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ فلاسفۂ یونان فضائے آسمانی میں وقوع پذیر ھونے والے مظاھر کی توضیح میں دل چسپی لیا کرتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے ان کی مختلف توجیہات پیش کی ھیں ۔ یہ معلوم نہیں ھو سکا کہ یونانیوں نے دیگر اقوام خصوصاً اھل بابل سے کس حد تک استفادہ کیا ۔ مگر اتنا ثابت ہے کہ قدیم ھی سے ان کی رسائی اھل بابل و مصر سے منقول بعض جغرافیائی جائزوں تک رھی جن میں کچھ سادہ سی فضائی معلومات

بھی شامل تھیں ۔

یونانیوں کے ہاں اس موضوع پر پہلی مفصّل کتاب ، ارسطو کی کتاب ,,الآثار العلویہ (۱) ،، ہے۔ اس میں اس نے متقدمین کے افکار کی جمع و ترتیب کی ہے۔ یہ امر لائق توجہ ہے کہ باعتبار اہمیت متقدمین کے افکار کی درجہ بندی کرتے ہوئے ارسطو کی رائے اکثر صائب نہیں ہے۔ مؤرخین علوم کے ہاں یہ رائے غالب رہی ہے کہ آثار علویہ کا علم، ارسطو کے شاگرد تھیوفراسٹس (Theophrastos) کے ہاں ایک اہم مرحلے میں داخل ہوا ۔ اس قیاس کی اساس عربی زبان میں ہم تک پہنچنے والے بعض نثر پاروں کی تاویل پر تھی کیونکہ یونانی اصل تو ضائع ہو چکی تھی ۔ عربی اور سریانی میں دریافت ہونے والے کچھ ٹکڑوں پر تحقیق کی گئی اور بعض علماء نے ان سے بعض نتائج اخذ کئے ۔

چار برس ہوئے رامپور (ہندوستان) میں[اس کتاب کے]عربی ترجمے کا واحد مکمل نسخہ میرے ہاتھ لگا ۔ میں نے یہ دیکھنے کے لئے اس کا مطالعہ کیا کہ آثار علویہ کی تاریخ میں تھیوفراسٹس کی حیثیت سے متعلق جو قیاس آرائیاں کی گئیں ، کہاں تک درست ہیں ۔ کھلا یہ کہ اس میدان میں بہت مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ مبصّر کتاب بعض عجیب و غریب توجیہات و آراء کا جواز ـــــ بشمول ان آراء کے جو خود تھیوفراسٹس نے پیش کی ہیں ـــــ محض اس مفروضے پر فراہم کرنے کی کوشش میں حق بجانب نہیں کہ دراصل یہ عرب مترجم کی کوتاہیٔ فہم کا نتیجہ ہیں جس نے ، بقول موصوف ، کتاب کو اچھی طرح سمجھے بغیر ہی ، اس کی تلخیص کر ڈالی ہے۔

رہی مسلمان علماء کی حیثیت سو اس کو ، کماحقّہٗ معلوم کرنا

هی ممکن نہیں رہا کیونکہ اس میدان میں ان کی زیادہ تر اہم کتب ضائع ہو چکی ہیں مثلاً الکندی ، ابن الہیثم اور البیرونی کی وہ کتابیں جن میں اس علم کے پیچیدہ مسائل پر بھرپور بحث کی گئی تھی ۔ چنانچہ ہم مجبور ہیں کہ اپنے اس خطبے میں ان مخصوص رسائل پر، جن کا موضوع آثار علویہ کے لخت لخت مسائل ہیں نیز مسلمان سائنسدان فلسفیوں کی ان آراء پر انحصار کریں جو ان کی کتابوں میں بالواسطہ آ گئی ہیں ۔

مسلمانوں کے ہاں آثار علویہ کی تحقیق کے سلسلے میں ایک اہم دستاویز الکندی کے رسائل ہیں ۔ آثار علویہ پر الکندی کی اہم ترین عطا ,,قانون انبساط احجام ،، ( حجم میں پھیلاؤ کا قانون ) ہے جس کی بنیاد پر اسے پہلا عالم قرار دیا جا سکتا ہے جس نے اس علم کو اس قانون کی اساس فراہم کی۔جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ارسطو اور اس سے قبل اور اس کے بعد کے لوگوں کے ہاں علم آثار علویہ کی اساس زمین سے اوپر سورج کے اثر سے دو قسم کے بخارات یعنی تر بخارات اور خشک بخارات کے جدا ہونے کے تصوّر پر قائم تھی (۲) ۔ تر بخارات بارش ، برف اور اولوں وغیرہ کا مادہ تھے جبکہ خشک بخارات ہواؤں کا مادّہ تھے ۔

الکندی نے فضائی احوال کی تشکیل کے ضمن میں ,,قانون انبساط احجام،، کو بنیادی اُصول کی حیثیت دی ۔ بنا بریں وہ ہمیں اس میدان میں جدید نظریات کا پیشرو نظر آتا ہے ۔ اپنے مخصوص اسلوب میں وہ اس قانون کو ان الفاظ میں پیش کرتا ہے ۔ (۳)

,,ہر جسم جو ٹھنڈا ہوتا ہے وہ سکڑ جاتا ہے اور ٹھنڈا ہونے سے قبل جتنی جگہ گھیرتا تھا اس سے کم اسے درکار ہوتی ہے ۔ اور ہر جسم جو گرم ہوتا ہے وہ پھیلتا ہے اور گرم ہونے سے قبل جتنی جگہ

گھیرتا تھا اس سے زیادہ اسے درکار ہوتی ہے،،۔

ہم دیکھتے ہیں کہ الکندی نے نہ صرف ،،قانون انبساط،، کو علم آثار علویہ کی اساس بنایا بلکہ اس قانون کی اولین جامع و مختصر تعریف بھی وہی ہے جو اس نے فراہم کی۔ اگرچہ اس قانون کا علم علمائے یونان کو بھی تھا جیسا کہ ہم بلیناس کی کتاب ،،علل الاشیاء أوسرُّ الخلیقۃ،، (۴) میں دیکھتے ہیں، جس کی تألیف اسلام سے فوراً پہلے کی چند صدیوں کے دوران میں ہوئی۔ بلیناس کی کتاب میں قانون انبساط کی تعریف الکندی کی جامع و مختصر تعریف سے مختلف انداز میں یوں آئی ہے: ،،برودت کے خواص میں سکڑنا اور جمنا ہے اور حرارت کے خواص میں پگھلنا اور پھیلنا،،۔

اسی قانون کی بنیاد پر الکندی بارش کے عمل کی توجیہ میں ارسطو سے مختلف بات کہتا ہے۔ ارسطو کا موقف یہ ہے کہ بارش ہونے کا سبب مرطوب بخارات کا برودت سے اتصال ہے (۵)۔ بارش ہونے کی یہ وضاحت اصولاً درست ہے لیکن ارسطو یہ نہیں بتاتا کہ جب مرطوب بخارات ٹھنڈے ہوتے ہیں تو ٹھنڈ کا ان پر کیا اثر ہوتا ہے۔ جبکہ الکندی بارش کے عمل کی آخری علّت تک پہنچتا ہے یعنی بخارات کے حجم کا سکڑنا جو درجہ حرارت میں تبدیلی سے واقع ہوتا ہے۔ اس طرح اس کی توجیہ مکمل طور پر دور جدید کی توجیہ سے آ ملتی ہے۔

الکندی اور ارسطو کے مابین جو بڑا فرق ہے وہ ہواؤں کے چلنے کے سلسلے میں دونوں کے نظریات سے واضح ہو جاتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک ہواؤں کا مادّہ خشک بخارات ہیں جبکہ الکندی کی نظر میں چلتی ہواؤں کا مادّہ ہوائے محض ہی ہے۔ (٦) ضروری معلوم ہوتا ہے

که هواؤں کے چلنے کی جو توضیح ارسطو نے پیش کی ہے وہ آپ کے سامنے بیان کر دوں تاکہ الکندی کے نظریات کی اھمیت کھل کر سامنے آ سکے۔ ارسطو نے ہواؤں کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے: عمودی ہوائیں اور افقی ہوائیں۔ اول الذکر اس کے خیال میں خشک بخارات کے اٹھنے اور بلندی پر جا کر سردی سے ٹکرانے کے سبب پیدا ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں یہ بخارات زمین کی طرف لوٹ آتے ہیں اور یہ حرکت عمودی ہواؤں کو جنم دیتی ہے۔ افقی ہوائیں اس کی رائے کے مطابق، کرہ ارض کے گرد موجود طبقہ ہوائی کی حرکت سے عبارت ہیں جو فلک افقی کے ساتھ کلّی حرکت کی تابع ہیں۔ یہ عجیب و غریب تصوّر بہت بڑے تضادات پر مشتمل ہے۔ ایک محقق نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ,,ارسطو خود بھی نہیں سمجھ سکا کہ اس نے یہاں کیا کہا ہے،،۔

آئیے اب دیکھیں کہ الکندی ہواؤں کے چلنے کی کیا توجیہ کرتا ہے:

,,جب سورج شمالی جھکاؤ میں ہوتا ہے تو شمالی جانب کے مقامات گرم ہو جاتے ہیں اور جنوبی جانب کے مقامات سرد ہو جاتے ہیں۔ نتیجۃً شمالی ہوا اپنی حرارت کے باعث پھیلتی اور جنوب کی سمت رواں ہوتی ہے کیونکہ جنوبی ہوا سرد ہو جانے کے باعث سکڑ چکی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ موسم گرما کی اکثر ہوائیں شمالی اور موسم سرما کی اکثر ہوائیں جنوبی ہوتی ہیں۔ بجز ان صورتوں کے جو زیریں[یعنی زمینی]اسباب سے پیش آتی ہیں۔ مثلاً ندی نالوں کا بہاؤ، عارضی طغیانیاں، تھمے ہوئے پانی، اور چوٹیوں کی بلندی کہ یہ اور ایسے ہی دیگر اسباب ایسی وجوہ پیدا کرتے ہیں جن سے بخارات کا بہاؤ مختلف سمت اختیار کر لیتا ہے اور نتیجۃً، مقامات کی بلندی کے اعتبار سے، مختلف قسم کی ہوائیں رونما ہوتی

ہیں " ۔

الکندی کا یہ نظریہ مکمل طور پر اس جدید نظریے سے ہم آہنگ ہے جو اٹھارھویں صدی عیسوی میں جارج ہیڈلی (George Hadley) اور عمانویل کانٹ (Immanuel kant) سے منسوب کیا جاتا ہے۔

قانون انبساط احجام ہی کی بنیاد پر الکندی اور بھی کئی فضائی تشکیلات کی وضاحت کے سلسلے میں ارسطو سے اختلاف رکھتا ہے مثلاً برف اور اولوں کا وجود میں آنا ۔ میں یہاں اس کی تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں پاتا ۔ مگر مناسب خیال کرتا ہوں کہ فضا میں بخارات کے بلند ہونے کی حدود کے سلسلے میں ارسطو کی رائے پر الکندی کی تنقید کا ذکر کرتا چلوں ۔ ارسطو کا خیال تھا کہ طبقہ ہوا کی بلندی سولہ ( ستاڈیون) یعنی تقریباً تین ہزار دو سو میٹر سے زائد نہیں ہوتی ۔ اس پر الکندی یوں تبصرہ کرتا ہے :

"فلسفی" [ارسطو] کو کیونکر علم ہوا کہ روئے زمین سے بخارات کا ارتفاع سولہ ستا ڈیا سے زائد نہیں ہوتا ۔ نیز یہ کہ روئے زمین اور اس قریب ترین مقام کے درمیان ۔ جہاں بخارات منجمد ہو کر بادل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ۔ کس قدر فاصلہ ہے " ۔

ارسطو کی آراء پر ناقدانہ بحث کے بعد وہ کہتا ہے :

"جو کچھ ہم نے عرض کیا اس سے واضح ہو گیا کہ اس حد کا معیّن اندازہ نہیں ، جہاں پہنچنے پر بخارات کثیف ہو کر پانی بن جاتے ہیں ... بسااوقات اس کے زمین سے قرب یا بلندی کے اعتبار سے کچھ زیریں عوامل رونما ہوتے ہیں ۔ چنانچہ وہ مقامات جہاں سربفلک پہاڑ ہوتے ہیں بلند بخارات کو گردش کی حرکت کا اثر قبول کرنے سے باز رکھتے ہیں ... الخ " ۔

آثار علویہ پر الکندی کے ہاں جو اہم نکات ملتے ہیں ان میں سے

ایک وہ رائے ہے جو اس نے فضا میں نظر آنے والے لاجوردی رنگ کا سبب متعیّن کرنے کے سلسلے میں پیش کی ۔ اس موضوع کی تاریخ پر ہمارے علم کے مطابق الکندی ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ رائے قائم کی کہ آسمان کا رنگ دراصل لاجوردی نہیں ۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :

,,فضا جو زمین کا احاطہ کئے ہوئے ہے اثر پذیر ہو کر ایک هلکی سی روشنی دینے لگتی ہے جس کا سبب وہ زمینی ناری اجزا هیں جو اُس حرارت کے باعث منتشر ہو جاتے هیں جسے انھوں نے زمین سے انعکاس شعاع کے سبب قبول کیا ہوتا ہے ۔ (چنانچہ ) همارے سروں پر جو تاریک فضا ہے وہ ضیائے ارضی اور ضیائے کوکبی کے امتزاج سے تاریکی اور اجالے کے بین بین ایک رنگ میں نظر آنے لگتی ہے اور وهی یہ لاجوردی رنگ ہے ،،۔

تاهم سائنس کی تاریخ میں یہ مذکور ہے کہ اٹلی کے لیونارڈو ڈاونچی اور جرمن شاعر گوئٹے وہ دو شخص تھے جنھیں پہلے پہل یہ توجیہ سوجھی ۔ لیکن جب هم الکندی کی وضاحت اور اس کی توجیہ کا موازنہ ان دونوں کی آراء سے کرتے هیں تو هم دیکھتے هیں کہ الکندی کی رائے ، جو سائنسی علم رکھتا ہے ، ان دونوں سے زیادہ دقیق ہے جن میں سے ایک نے تو مصوّر کی نگاہ سے اس مظهر کو بیان کیا اور دوسرے نے شاعر کی نگاہ سے ۔ اور ان تینوں میں جنھوں نے اس مظهر کی توجیہ پیش کی ، صرف الکندی هی ایسا ہے جس نے اس کے مقداری پہلو پر نظر ڈالی اور یہ رائے قائم کی کہ درمیانی فضا کی مقدارِ کثافت لاجوردی رنگ کے مدارج پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ اس مقداری مشاهدے سے پہلی بار بروکے (Brücke) نامی عالم نے ، انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں استفادہ کیا ۔

الکندی کا ایک مستقل رسالہ ,,مدوجزر،، کے موضوع پر بھی ہے جو انیسویں صدی عیسوی سے پہلے کے دور میں مدوجزر کے مظہر کی سب سے بھرپور اور سب سے مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔

اس مظہر کی وضاحت کی تاریخ میں ہم یہ سنتے ہیں کہ اراتھوستنیز (Arathostenes) یونانی اور سلیکوس (Seleukos) بابلی نے دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں یہ رائے قائم کی کہ مدوجزر کا کسی نہ کسی شکل میں چاند کی حرکات سے تعلق ہے۔ تاہم یہ دونوں اس مظہر کی توجیہ نہ کر سکے اور یہ گمان قائم کر لیا کہ جب کبھی چاند سمندر کے پاس سے گزرتا ہے، سمندر حیوان کی طرح سانس لیتا ہے۔

جہاں تک الکندی کا تعلق ہے سو وہ مدوجزر کئی اقسام سے واقف ہے اور ان کو اس طرح بیان کرتا ہے جس طرح وہ آج ہماری موجودہ صدی میں معروف ہیں۔ تاہم اسے یہ علم نہیں کہ اصل سبب چاند کی کشش ہے۔ شاید، قانون انبساطِ احجام کے زیر اثر ہونے کے باعث اس نے یہ توجیہ قائم کی کہ چاند فضائے زمینی سے گزرتے وقت حرارت پیدا کرتا ہے جو حرارت شمسی کے علاوہ ہوتی ہے۔ اس حرارت سے ہوا کا حجم پھیلتا ہے اور نتیجۃً سمندر کا حجم جس کے پاس سے چاند گزرتا ہے، بھی پھیل جاتا ہے۔

یہ بات مجھ پر واضح ہو چکی ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی کے لاطینی عالم رابرٹ گروسٹسٹے (Robertus Grosseteste) نے الکندی کی کتاب دیکھی تھی اور اس سے وسیع پیمانے پر استفادہ کیا تھا۔ اور گروسٹسٹے کے رسالے ہی کو مدوجزر کے مظہر کا اولین مفصّل علمی بیان شمار کیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ الکندی کی توجیہ گروسٹسٹے پر واضح نہیں ہو سکی چنانچہ اس نے اسے ایک عجیب و غریب

انداز میں سمجھا (دیکھئے میری کتاب تاریخ التراث العربی کی ساتویں جلد ) ۔

مسلمان علماء نے چاند کی کشش کے سبب سے مدوجزر کی توجیہ تک فوراً بعد کی صدیوں میں رسائی پالی ۔ چنانچہ ایک گمنام مؤلف کا ایک رسالہ ہم تک پہنچا ہے جو مختلف آراء کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی رائے بھی پیش کرتا ہے جو چاند کی کشش کی بنیاد پر اس کی توجیہ کرتے ہیں ۔ امکان یہ ہے کہ یہ رسالہ پانچویں صدی ہجری میں تالیف ہوا ہو ۔ اس میں مؤلف نے کرۂ ارض پر مدوجزر کے اہم مقامات کے نقشے بھی بنائے ہیں ۔

یہاں میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ آثار علویہ کے میدان میں مسلمانوں نے جن جن نتائج تک رسائی حاصل کی سب کو بیان کر دوں تاہم الکندی کے بعد کے بعض اہم نتائج کی طرف اشارے پر اکتفاء کرتا ہوں ۔

قابل ذکر امور میں سے ایک یہ ہے کہ النیریزی جو چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ہو گزرا ہے ، پہلی بار بادلوں اور بخارات کی بلندی کی پیمائش کے لئے آلات وضع کرتا ہے اور یہ آثار علویہ کی تاریخ میں ایک نیا مرحلہ ہے ۔ چوتھی صدی ھی کے اواخر میں ابوسھل الکوھی یہ حساب لگانے کی کوشش کرتا ہے کہ شہابیے کن کن فاصلوں پر ھیں اور اس نوع کی تحقیق فضائی امور سے متعلق ھی تصوّر ہوتی تھی ۔

تاہم آثار علویہ کی تاریخ میں عربی کی اہم ترین کتاب ، ابراھیم بن سنان بن ثابت بن قرۃ کی کتاب ,,الابانۃ عن الطریقۃ المتعرّفۃ''[۷] ہے ۔ اس کی وفات چوتھی صدی ہجری کے اواسط میں ہوئی جبکہ اس کی عمر ابھی چالیس برس کی بھی نہ تھی ۔ ریاضی

اور علم الفلک کے میدان میں اس نے حیرت انگیز دریافتیں کیں - تصنیف و تالیف کا آغاز اس نے اٹھارہ برس کی عمر ھی میں کر دیا تھا - سورج کی حرکات پر اس کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے اچانک مجھے اس کتاب [الابانۃ] کی اهمیت کا احساس ھوا کیونکہ اس میں آثار علویہ پر ارسطو کی کتاب زیر تنقید لائی گئی ہے - ارسطو پر اس کی تنقید کے بعض اقتباسات دیکھ لینے کے بعد میں اس کی اس کتاب کو عربی اسلامی ورثے کی اهم ترین گم گشتہ کڑیوں میں شمار کرتا ھوں - سب سے پہلے اس شدید تنقید کا ذکر مناسب ھو گا جو اس نے پیروان ارسطو پر ان الفاظ میں کی ہے : (۸)

,,ان لوگوں کی مصیبت یہ ہے کہ یہ ارسطو کی تمام تر آراء کے دفاع میں افراط سے کام لیتے ھیں اور یہ سمجھتے ھیں کہ ان میں لغزش کا وجود ممکن نہیں حالانکہ انھیں علم ہے کہ ارسطو مجتہد ضرور تھا معصوم و مؤیّد نہ تھا - اور اجتہاد میں خواہ کتنی ھی عرق ریزی کیوں نہ کی جائے بہرحال لغزش کا اندیشہ باقی رھتا ہے - یہ وہ مقام ہے جہاں ان کی ھٹ دھرمی (۹) سے شکایت پیدا ھوتی ہے اور ان کے طور طریقے پر افسوس ھوتا ہے - یعنی وہ اسے اپنے لئے درست سمجھتے ھیں کہ ارسطو کی کتاب الآثار العلویہ کی بتمام و کمال پیروی کرتے رھیں،، -

ارسطو کی کتاب پر اس کی تنقیدات میں سے صرف تین ھم تک پہنچی ھیں :

۱ - پہلی بات جسے وہ سخت غلطی قرار دیتا ہے ارسطو کی یہ رائے ہے کہ خط سرطان سے نیچے آبادی ختم ھو جاتی ہے اور اس سے آگے جنوب کی سمت اس کا وجود ممکن نہیں (۱۰) کیونکہ اس کے خیال کے مطابق شمال اور مغرب کی طرف سایہ نہیں پایا جاتا -

۲ - دوسری بات پہاڑوں کی فضا میں بخارات کے وجود کی حدود سے متعلق ارسطو کی رائے ہے۔ (۱۱) اس سلسلے میں وہ کہتا ہے: (۱۲) ,,ارسطو کا خیال ہے کہ بخارات کوہ قاقوس[Caucasus] تک بلند نہیں ہوتے اور ہوائیں وہاں تک نہیں پہنچتیں۔ اس پر اس کا استدلال یہ ہے کہ وہ لکیریں اور ہندسے جو قربانیوں اور ذبیحوں کی راکھ پر بنائے جاتے ہیں جوں کے توں باقی رہتے ہیں - نہ ہوائیں ان کو مٹاتی ہیں نہ بارش ختم کرتی ہے۔[تاہم اس نے ہوا کی تاریکی کا کوئی ذکر نہیں کیا](۱۳) حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو اس پہاڑ پر چلنے کا راستہ ہی نہ سوجھتا اور نہ وہ سب کام ممکن رہتے جو وہ اپنی قدیم جاہلیت کے دور میں وہاں جا کر انجام دیتے تھے - پھر وہ اس تاریکی (۱۴) کا بیان بھی ضرور کیا کرتے کیونکہ یہ باقی باتوں سے بڑھ کر اچنبھے کی چیز تھی بلکہ اس سے متعلق ایسی اساطیر گھڑ لیتے جو قربانی کے جانور لے کر اس پہاڑ پر جانے والوں اور پھر واپسی پر ان سے[وہاں کے احوال] سننے والوں کے عقائد کو تقویت پہنچاتیں "۔

۳- تیسری بات جو میرے خیال میں اس کا سب سے اہم اعتراض ہے اس اصول کے رد میں ہے جس پر یونانی اور بہت سے مسلمان علماء بھی نہ صرف آثار علویہ کے میدان میں بلکہ طبیعیات کے سلسلے میں بھی یقین رکھتے تھے - یہ اصول اہل یونان کے ہاں (Antiperistasis) کہلاتا تھا (۱۵)۔ الکندی کے الفاظ میں یہ اصول ,,متضاد عوامل مثلاً ظاہر و باطن کی کیفیات کی تقسیم " سے عبارت ہے۔ مراد یہ کہ حرارت اپنے آپ کو آس پاس کی برودت کے مقابلے میں سمیٹ کر رکھتی ہے۔ اور اس کے اثر سے خود کو گھٹنے نہیں دیتی اور اسی طرح بالعکس۔ ارسطو بہت سے فضائی مظاہر کی توجیہ اسی اصول کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ارسطو کی رائے میں

موسم گرما کی بارش گرم بخـــارات کے اس برودت سے ٹکرانے کا نتیجہ ہوتی ہے جو گرم ہوا میں محبوس ہوتی ہے۔ الکندی اور بعض دوسرے مسلمان علماء مثلاً ابن العمید اسی فضائی مظہر کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ گرم بخارات فضا میں سرد ہوا سے ٹکراتے ہیں جس کے نتیجے میں گرم بخارات کا حجم سکڑ جاتا ہے اور یہی توجیہ وہ اس سلسلے میں پیش کرتے تھے کہ موسم گرما میں مصر اور جزیرہ عرب میں بارش کم کیوں ہوتی ہے اور ہندوستان میں زیادہ کیوں ہوتی ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ ہندوستان میں موسم گرما کی بلرش کی جو توجیہ ابن العمید نے بیان کی ہے وہ موجودہ دور کی توجیہ سے کامل مطابقت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ اس کا سبب بحرہند سے آنے والے بخارات کی کثرت کا اس شمالی ہوا سے ٹکراؤ ہے جو سورج کے شمالی جھکاؤ کے باعث پھیل کر ادھر آ رہی ہوتی ہے۔

یہ اصول ,,جوّالأسراب،، [تہ خانـوں کی فضا] کے عنـوان سے چوتھی صدی ہجری میں علماء کے ہاں موضوع اختلاف بنا رہا ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابراهیم بن سنان ارسطو کے اصول کو تجربے کی بنیاد پر یوں رد کرتا ہے: (١٦)

(١٧) ,, اور میں نے دو مساوی اور باہم مشابہ برتنوں میں اس حد تک ٹھنڈے اور گرم سادہ پانی کی ، یکساں مقدار ڈالی جسے چھونے سے تکلیف محسوس نہ ہو۔پھر دونوں کو بیک وقت خشک(١٨) ہوا کے سامنے رکھا ، سو ٹھنڈے پانی کی سطح جم گئی جبکہ گرم پانی میں ہنوز گرمی کی کچھ رمق باقی تھی ۔ میں نے اس تجربے کو دہرایا اور گرم پانی کو خوب کھولا لیا (١٩)۔ نتیجۃً ٹھنڈا پانی جم گیا ۔ جبکہ گرم پانی ہنوز پہلے تجربے والے درجہ حرارت تک بھی نہیں آیا تھا۔
علاوہ ازیں تہ خانوں کی فضا کے بارے میں ان کی یہ رائے ہے کہ

وہ موسم گرما کی نسبت موسم سرما میں زیادہ گرم ہوتی ہے نیز بالعکس ، حالانکہ دونوں موسموں میں موم یا پگھلی ہوئی چربی کے وہاں کی فضا میں جم جانے کی مدت کا تجربہ اور پھر اس بات کا ریکارڈ کہ جسم سے متصل لباس (۲۰) کی وہ کم سے کم مقدار کیا ہے جس سے دونوں(۲۱) موسموں میں وہاں پر جسم موسم کی شدت سے بس محفوظ رہ سکے ، ان کی رائے کو غلط ثابت کرتا ہے اور اسی رائے کی تصدیق کرتا ہے کہ گرمی اور سردی ہوا کو لاحق ہونے والی دو کیفیتیں ہیں ۔ نیز یہ کہ ہوا کا جو حصہ زمین کی بیرونی سطح سے متصل ہوتا ہے وہ ان دونوں کیفیتوں سے زیادہ متاثر ہوتا ہے بنسبت اس حصے کے جو سطح زمین سے دور ہوتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ارسطو کے معتقدین میں سے ایک فاضل شخص نے مجھ سے کہا : ،، اگر اسے درست مان لیا جائے تو کیا (۲۲) ہمارے تمام علوم طبیعیات ناقص نہ قرار پائیں گے ؟ میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر ناقص ٹھہریں گے تو وہ اصول ٹھہریں گے جن پر تم نے عمارت اٹھائی ہے اور جو چیز حقیقت پر مبنی نہیں اس کے علم کو ،،علم،، کہنا ہی درست نہیں،،۔

مندرجہ بالا بحث کے تسلسل میں میں یہاں ایک شعاعی مسئلے کا بھی ذکر کرنا چاہوں گا جو (Meteorology) کے دائرے میں زیر بحث آتا رہا ہے۔ یعنی روشنی کی رفتار کا مسئلہ۔ علمائے یونان آسمانی بجلی اور گرج کی رفتار پر بحث کیا کرتے تھے اور اس ضمن میں بار بار یہ کہتے تھے کہ روشنی کے محسوس ہونے میں وقت صرف نہیں ہوتا جبکہ آواز کے محسوس ہونے میں وقت لگتا ہے۔ مسلمان علماء بھی اسی رائے کے قائل تھے جن میں ابن سینا بھی شامل ہے۔ لیکن ابن الہیثم نے پہلی بار یہ لکھا کہ روشنی کی رفتار بھی محدود ہے اور اسے ،،بر زمان،، قرار نہیں دیا جا سکتا ۔

اخر میں اس اہم توضیح کا ذکر کرنا چاہوں گا جو مسلمان علماء نے ہالہ اور قوس قزح کے پیدا ہونے کی توجیہ میں پیش کی ۔ اس ضمن میں انہوں نے حیران کن نتائج تک رسائی حاصل کی ۔ یہاں ان کی تفصیل میں جانا ممکن نہ ہو گا صرف اجمالاً ان کا ذکر کروں گا۔

ان کی دریافتوں کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہو گا کہ ہم یہ بھی جانتے ہوں کہ یونانیوں بالخصوص ارسطو اور اس کے شاگرد تھیوفراسٹس کے تصوّرات کیا تھے ۔ ان کے ہاں نقطۂ آغاز یہ تھا کہ آنکھ سے نکلنے والی بصری شعاع بادل تک اور پھر منعکس ہو کر چاند اور سورج تک پہنچتی ہے گویا اس مسئلے کی وضاحت میں ارسطو، صاف طور پر یہ کہتا تھا کہ بادل کا زمین سے فاصلہ اتنا ہی ہے جتنا چاند اور سورج سے ہے (۲۳) ۔ ہالہ بننے کے سلسلے میں تھیوفراسٹس کا تصوّر یہ تھا کہ چاند اپنی روشنی کی موجوں نیز اپنے گرد موجود بادل اور کہرکے ساتھ دور ہٹ جاتا ہے ۔

چوتھی صدی ھجری کے اواخر میں مسلمان علماء نے یہ سمجھ لیا کہ چیزوں کا نظر آنا ان چیزوں سے آنے والی شعاع کے آنکھ میں داخل ہونے کے سبب سے ہوتا ہے اور اسی اساس پر وہ ہالہ اور قوس قزح کے پیدا ہونے کو زیر بحث لاتے تھے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی توضیحات کا ارتقاء بالآخر ساتویں صدی ھجری کے کمال الدین الفارسی کی شخصیت میں اس صحیح حل تک پہنچ گیا جو فرانسیسی عالم ڈیکارٹ (Descartes) کے ہاں سترھویں صدی عیسوی میں نظر آتا ہے ۔ یعنی یہ کہ قوس قزح فضائے آسمانی میں موجود قطروں میں شعاع کے ایک یا دوبار ٹوٹنے کا نتیجہ ہے اور رنگ اس شکستِ شعاع کے زاویوں کے اختلاف سے پیدا ہوتے ہیں ۔

# حواشی از مترجم

۱ ۔ ارسطو کی یہ کتاب چار مختصر حصوں میں منقسم ہے۔ تعارف کے لئے دیکھئے :

Sarton George, Introduction to the History of Science, Washington, 1950-53, 1/333.

"Meteorology" کے عنوان سے اس کے مکمل انگریزی ترجمے کے لئے دیکھئے :

Great Books of the Western World, (Britannica Great Books), Chief Ed. Hutchins R.M., Encyc. Brit. Inc. 1952, 8/445-494 (tr. by E.W. Webster)

نوٹ :

آئندہ حواشی میں اس انگریزی ترجمے کے حوالے کے لئے صرف ،،ارسطو، "Meteorology" استعمال ہوگا۔

۲ ۔ دیکھئے ارسطو ، Meteorology ، ص ۳٦۳

۳ ۔ خطیے میں اقتباسات کے حوالے مہیا نہیں کئے گئے اور الکندی کے سلسلے میں تو کتاب کا نام بھی مذکور نہیں لہذا اصل تک رسائی ہمارے لئے ممکن نہ ہو سکی ۔

٤ ۔ Appolonius of Tyana سے منسوب کتاب

Book of Causes (or Secret of the Creation)

مراد ہے۔ دیکھئے :

Dictionary of Scientific Biography, American Council of of Learned Societies, Chief Ed. C.C. Gillispie, New York, 1981, 7/41, 13/407.

۵ ۔ دیکھئے ارسطو ، Meteorology ص ۳۵۳ ۔

٦ ۔ چلتی ہوا ( ریح ، Wind ) ، ہوائے محض ( ہواء Air ) اس بحث کے سلسلے میں ملاحظہ ہو ارسطو ، Meteorology ص ۳۵۵ ، ۳٦۵ ۔

۷ ۔ مطبوعہ حیدرآباد میں ،،المحترقۃ ،، ہے اور فاضل محقق نے اس کی اصلاح کی ہے۔ دیکھئے ، ابراھیم بن سنان ، کتاب فی حرکات الشمس ، دائرۃ المعارف العثمانیۃ ، حیدر آباد دکن ۱۳٦۷ ھ / ۱۹۳۸ ع ص ۵٦ ۔

نوٹ :

آئندہ حواشی میں اس کتاب کے حوالے کے لئے صرف ،،حرکات الشمس ،، استعمال ہوگا۔

۸ ۔ بحوالۂ بالا ۔ خطیے میں اقتباس کی عبارت کئی جگہ لفظی فرق رکھتی ہے۔

۹ ۔ بحوالۂ بالا ۔ مطبوعہ میں ،،وھذا موضع شکایۃ آباء ھم ،، ہے۔ خطیے میں بھی اسی طرح نقل کیا گیا ہے۔ تاہم ہماری سمجھ میں اس کا کچھ مفہوم نہیں آیا۔ شاید یہ ،،موضع شکایۃ إبائھم،،

ہو گا جس میں ,,اِباء ,, سے مراد ,,اباۓ حقیقت ,, ہے۔ اسی قیاس کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے۔

۱۰۔ بحوالۂ بالا ، نیز موازنہ کیجئے ارسطو ، Meteorology ، ص ۳٦۷ ۔

۱۱۔ یہاں غالباً فاضل محقّق کو غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ اصل کتاب میں اس مقام پر نہ تو پہاڑوں کی فضا میں بخارات کا مسئلہ زیر بحث ہے نہ اس سلسلے میں ارسطو کی رائے زیر تنقید ہے۔ تنقید اس رویے پر ہو رہی ہے کہ ارسطو کے متّبعین اس کی اپنی آراء پر بھی اکتفاء نہیں کرتے بلکہ اپنی طرف سے ان آراء پر مزید قیاسات قائم کر کے انہیں مشاہدے کا قائم مقام تصوّر کرنے لگتے ہیں ۔ اس ضمن میں احمد بن الطیّب السرّخسی کی وہ رائے زیر بحث لائی گئی ہے جو انہوں نے اپنی کتاب ,,ارکان الفلسفہ ,, میں بیان کی ہے اور جس کے بموجب بہت زیادہ بلند مقامات پر ہوا کا رنگ سیاہ ہو جاتا ہے۔ ابن سنان اس پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ارسطو کی کتاب ,,الحس والمحسوس ,, (Sense and the Sensible) میں ہوا کی سیاہی کا جو اشارہ ملتا ہے ، سرخسی نے اس پر مبالغے کی عمارت کھڑی کر دی ہے۔ حالانکہ کوہ پیماؤں کا تجربہ و مشاہدہ اس امر کی قطعاً تصدیق نہیں کرتا ۔ اسی سلسلے میں اس نے یہ استدلال پیش کیا ہے کہ خود ارسطو کے نزدیک کوہ قاقوس بلند ترین پہاڑ ہے جس تک ، بقول ارسطو بخارات اور ہواؤں کی بھی رسائی نہیں ، لیکن اس نے وہاں بھی ہوا کی سیاہی یا تاریکی کا کوئی ذکر نہیں کیا ۔ الغرض ارسطو کا ذکر ضمناً آیا ہے اصل تنقید سرخسی کی مبالغہ آرائی پر ہے۔ دیکھئے ، حرکات الشمس ، ص ۵۳ ۔ ۵۵ ، ۵٦ ۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ارسطو کے ہاں جہاں کوہ قاقوس کے بلند ترین پہاڑ ہونے کا ذکر ہے وہاں ذبیحوں وغیرہ کی راکھ اور اس پر بنائے جانے والے نقوش کا ذکر ہمیں نظر نہیں آیا ( دیکھئے ارسطو ، Meteorology ، ص ۳۵۰) ۔ اگرچہ ہواؤں کے ضمن میں ایک اور مقام پر یہ جملہ موجود ہے :

"They do not seem to blow above the level of the highest mountains"

(ارسطو ، Meteorology ، ص ۳۴۷ ) ۔

شاید اس کا سبب یہ ہے کہ ابن سنان ( م ۳۳۵ ھ/۴۷ ۔ ۹۳٦ ء) کے سامنے ارسطو کی کتاب کا کوئی قدیم تر اور زیادہ مکمل نسخہ تھا ۔ معاصر مغربی دنیا میں جن مخطوطات سے اس کتاب کا متن معیّن کیا گیا ہے ان میں قدیم ترین غالباً وہ ایک نسخہ ہے جس کا تعلق دسویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے سے ہے۔ ( دیکھئے : ISIS, III, 1920, p. 278)

۱۲۔ حرکات الشمس ، ص ، ۵۵ ، یہاں بھی اقتباس کی عبارت اصل سے کامل مطابقت نہیں رکھتی ۔

۱۳۔ فاضل محقّق نے ,,لم یذکر فیہ شیئاً من سواد الھواء ,, کے الفاظ یہاں سے حذف کر دیئے ہیں حالانکہ ان کے بغیر وہ استدلال سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا جس کی تلخیص اوپر بیان ہوئی ( دیکھئے حوالہ بالا )

۱۴۔ حرکات الشمس ( حوالۂ بالا ) میں ,,الظلام ,, ہے اور یہی بر محل معلوم ہوتا ہے۔ فاضل محقّق نے اسے ,,الکلام ,, بنا دیا ہے۔

۱۵۔ دیکھئے : Dictionary of Scientific Biography, 9/133, 13/330.

۱۶ - ہماری فہم ناقص کے مطابق یہاں بھی فاضل محقق کو ایک گونہ التباس ہوا ہے کیونکہ آگے بیان ہونے والی دو مثالوں میں سے پہلی کا ,,جوّ الأسراب,, سے کوئی تعلق نہیں ، صرف دوسری اس سے متعلق ہے - پہلی مثال اسی رویے کے ضمن میں لائی گئی ہے جس پر تنقید سرخسی کے حوالے سے ہوئی - اسی تسلسل میں متبعین ارسطو کا یہ قیاس زیر بحث آیا ہے کہ گرم پانی چونکہ لطیف تر ہوتا ہے اور اس کے سالموں میں باھمی فاصلہ زیادہ ہو جاتا ہے ، اس لئے وہ ٹھنڈے پانی کی نسبت جلد جم جائیگا کیونکہ ٹھنڈا پانی کثیف ہوتا ہے اور اسکے سالمے بہم پیوستگی کی حالت میں ہوتے ہیں - اس کے رد میں ابن سنان نے ٹھنڈے اور گرم پانی پر اپنے تجربے کی تفصیل بیان کی ہے جس کا تہہ خانوں کی فضا سے کوئی تعلق نہیں - البتہ دوسرا تجربہ جو موم اور چربی وغیرہ پر کیا گیا ، زیر زمین درجۂ حرارت سے متعلق ہے اور ایک الگ چیز ہے -

۱۷ - اس اقتباس کے متن — ( حرکات الشمس ، ص ۵۶ - ۵۷ ) — میں کئی مقامات محل نظر معلوم ہوتے ہیں اور یہ گمان گزرتا ہے کہ شاید ان میں ایڈیٹنگ کی کچھ خامی ہے - تاہم اصل مخطوطے تک رسائی نہ ہونے کے سبب ہمارے لئے اس سے زیادہ کچھ ممکن نہیں کہ عبارت جس حد تک بھی ہمارے فہم ناقص میں آ سکے اس کی ترجمانی کر دیں -

۱۸ . حرکات الشمس ( ص ۵۷) میں ,,النّاف,, ہے جس کا کچھ مفہوم سمجھ میں نہیں آتا - ممکن ہے کہ یہ ,,النشّاف,, ہو جس سے مراد چوس لینے والی یعنی حرارت جذب کر لینے والی ہوا ہو - خطبے میں اسے ,,الجاف,, بنا دیا گیا ہے اور مفہوم کے اعتبار سے یہ بھی ,,النشّاف,, کے قریب قریب ہی ہے - چنانچہ اسی کے مطابق ترجمہ کر دیا گیا ہے -

۱۹ - حرکات الشمس اور خطبے دونوں میں ,,أعلیت,, ہے - ہمارے قیاس میں یہ أغلیت ,, ہے -

۲۰ - حرکات الشمس اور خطبے دونوں میں ,,الشباب,, ہے جو سیاق کلام میں ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے - ہم نے اسے ,,الثیاب,, تصور کیا ہے -

۲۱ - حرکات الشمس میں ,,منھا,, ہے - خطبے میں بجا طور پر اسے ,,منھما,, بنا دیا گیا ہے -

۲۲ - حرکات الشمس اور خطبے میں ,,لوصحّ ھذا لا ینقص ما معنا من العلوم ... ,, ہے لیکن سیاق و سباق نیز وزان عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ ,,لا,, کی جگہ ألا ,, ، بصیغۂ استفھام ، سمجھا جائے

۲۳ - موازنہ کیجئے ارسطو Meteorology ، ص ۳۷۷ .

# قرآنیات

ابتدائی دور کے ہندستانی مسلمان اور قرآن پاک کے تراجم

—— ڈاکٹر محمد انصار اللہ

چینی زبان کے الفاظ قرآن میں

—— ڈاکٹر صباحی حسن



قرآنیات پر عموماً اور قرآن کے مفسروں کی ۱۴ سو سالہ خدمات میں خصوصاً جو خدا بخش سیمینار ۱۹۹۰ء میں ہوا تھا، اسمیں ایک مقالہ ڈاکٹر انصار اللہ نے بھی پیش کیا تھا۔ وہی مقالہ پیش خدمت ہے۔ ڈاکٹر مہدی حسن کا مختصر سا مقالہ بھی اپنے موضوع پر خاصا نیا ہے۔ امید ہے دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

ادارہ

# ابتدائی دور کے ہندستانی مسلمان

اور

# قرآن پاک کے تراجم

ڈاکٹر محمد انصار اللہ

۴/۵۰۵ سر سید روڈ

سر سید نگر، علی گڑھ



دکن کے علاقوں میں اس سلسلے میں، جس سے بالآخر شنکر آچارج کا تعلق ہے، ایک شخص یامن آچارج (यामुनाचार्य) ہوا ہے۔ شنکر آچارج کے زمانے پر اگر قیاس کریں تو یامن آچارج کو پہلی صدی ہجری / ساتویں صدی عیسوی کا آدمی ماننا ہوگا۔ تمل زبان میں اس کا نام آڑونڈار (आड़वन्दार) ہے یعنی وہ جو حفاظت کے لیے تشریف لائے۔ مہرشی شیوبرت لال ورمن کا کہنا ہے کہ یامن آچارج مسلمان تھا۔[1] اس شخص کے ظہور کے بارے میں جو روایت مشہور ہے اس سے بھی مہرشی جی کے قول کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ یامن آچارج ہی وہ شخص ہے جس سے بھکتی کے تصور کی ابتدا ہوتی ہے چنانچہ یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان میں آنے کے بعد ہی مسلمان بزرگوں نے یہ طریقہ بنالیا تھا کہ عبادات اور ریاضت کے معاملوں میں بھی ایسی صورت اختیار کی جائے جو یہاں کے ماحول اور مزاج سے مطابق ہو اور غربت کا احساس پیدا نہ ہو، تاکہ یہاں کے عوام ان کے زیادہ سے زیادہ قریب آسکیں اور ان کی باتوں کو جلد از قبول کرلیں۔ اس طرح اسلامی عقائد اور تعلیمات بالواسطہ طریقے پر بتدریج رواج پاتے رہے۔ ابتدائی دور کے مسلمانوں کی اسی رواداری نے انھیں بھکتی یعنی نیازمندیِ عشق کے طریقہ کو جو خالقِ کائنات تک رسائی بلکہ اس کی ذات میں فنا ہوجانے کا عمل تھا، اختیار کرلینے کی تحریک کی تھی۔ یامن آچارج کے بعد یہ طریقہ سلسلہ بہ سلسلہ شمالی ہند میں بھی پہنچا البتہ یہاں جن لوگوں نے اس طریق کو پہنچایا تھا وہ برہمن تھے اور انھوں نے اس طریق کو بھی اپنے مخصوص عقائد و نظریات کے مطابق ڈھال لیا تھا۔[2] شمالی ہند کے ابتدائی زمانے کے مسلمان صوفی بزرگوں نے بھی عشق کے راستے کو اختیار کیا تھا اور ان کا مشرب یامن آچارج کے طریقے سے مطابقت رکھتا تھا اس لیے یہاں کی زبان میں وہ صوفی بھگت کہلائے۔ یہاں کے مخصوص حالات میں انھوں نے بہترین انداز سے تبلیغ و اشاعتِ مذہب کے سلسلے کو جاری رکھا۔ بتایا گیا ہے کہ حضرت معین الدین چشتی اجمیری وہ پہلے بزرگ تھے جنھوں نے زبان ہندوی میں گیتوں کے گائے جانے کی اجازت دی۔ اجمیر میں آج تک عرس کے موقع پر استُتی (स्तुति) یعنی خدا کی حمد کے گانے کا رواج چلا آتا ہے۔ عالمگیر اورنگ زیب کے عہد کے شیخ اکھروتی نے تو زبانِ ہندوی (اردو) کی ابتدا کا سلسلہ بھی حضرت خواجہ بزرگ اجمیری سے ہی جوڑا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"و توہم نہ کنند کہ اولیاء اللہ بغیر از زبان عربی تکلم نہ کردہ، زیرا کہ جملہ اولیاء اللہ در ملکِ عرب مخصوص نہ بودہ۔ بلکہ بہر ملکے کہ بودہ زبانِ آں ملک را بکار بُردہ اند۔ و گمان نکنند کہ ہیچ اولیاء اللہ بزبان ہندوی تکلم نکردہ، زیرا کہ اوّل از جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والدین قدس اللہ سرہٗ بدیں زبان سخن فرمودہ"[3]

---

1۔ یہ بات راقم کو ڈاکٹر ڈی۔ اس ورمن نے بتائی ہے لیکن وہ یامن آچارج کو مسلمان نہیں مانتے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ سری رامانج کے بعد ان کے ایک شاگرد نرلیش سوامی ہوئے ہیں۔ 2؎ ہندی ساہتیہ کا اتہاس، رام کمار ورما ص ۱۶۹۔ 3؎ کبیر جوگ مہرشی شیوبرت لال ورمن مطبوعہ نظام آباد جلد ۱، ص ۱۸۔ [illegible] فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی انجمن ترقی اردو کراچی، مرتب سید عارف نوشاہی ۱۹۸۳ء ص ۱۳۶۔

بعد ازاں حضرت قطب الاسلام قدس اللہ سرہٗ و بعد ازاں حضرت گنج شکر قدس اللہ سرہٗ ۔۔۔"

حقیقت اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ ہندستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مسلمانوں کو دو چیزوں کی ضرورت پیش آئی ہوگی: اول مسجد، دوم زبان اہلِ ہند۔

ملک میں جن مقاموں پر انھوں نے قیام کیا ہوگا، وہیں کسی جگہ کو مسجد کے لیے مقرر کر لیا ہوگا اور وہی جگہ بالآ مسلمانوں کے دینی اور تعلیمی مرکز کی حیثیت اختیار کر گئی ہوگی۔ مسجدوں میں اسلامی عقائد کی تعلیم دی جاتی ہوگی اور یہ تعلیم نو مسلم اور غیر مسلم سب کے لیے عام رہی ہوگی بلکہ تعلیم دینے والوں میں نو مسلموں کا کردار زیادہ سے زیادہ اہم ہوتا ہوگا کیوں کہ وہ نہ صرف یہاں کی زبان بلکہ یہاں کے لوگوں کے مزاج اور اندازِ فکر کے بھی نبض شناس تھے۔ تعلیم پانے والوں میں اکثریت ان عوام کی رہی ہوگی جن کا تعلق غریب اور پست تر طبقے سے ہوگا چنانچہ تدریس اور رابطہ کی زبان غیر سنسکرت ہوگی اور چونکہ وہ بول چال میں رائج تھی، لب و لہجہ اور مقامی اصطلاحوں کے اختلاف کے باوجود ملک کے بڑے حصے میں سمجھی جاتی ہوگی۔ عوام اَن پڑھ تھی۔ ان کی بول چال کی زبان کو مسلمانوں نے اپنے رسم الخط میں لکھا ہوگا۔ ایسی قدیم تحریروں کی جستجو کا ابھی سلسلہ بھی غالباً شروع نہیں ہوا ہے۔ راقم کو قرآنِ پاک کے ایسے دو ترجموں کا علم حاصل ہو سکا ہے جن میں سے ایک تمل اور دوسرا ملیالم زبان میں ہے اور دونوں عربی خط میں لکھے گئے ہیں[1]۔ یہ ترجمے بہت جدید ہیں۔ قدیم تحریروں کی تلاش جاری ہے۔

زبانِ ہندوی (قدیم اردو) میں اسلامی تعلیمات کی تلقین و اشاعت کا ذکر سب سے پہلے تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے اواخر میں ملتا ہے جب بقول بزرگ بن شہریار ایک عراقی نے جو زبان ہندوی سے واقف تھا "الرا" (الور) کے راجا کو منصورہ (سندھ) کے بادشاہ عبداللہ کے حکم سے ۲۷۰ھ / ۸۸۳ء میں وہاں جا کر اسلام کی شریعت کا حال ہندوی زبان میں بتایا تھا۔ کہتے ہیں اس نے قرآن شریف کا اس زبان میں ترجمہ کر کے بھی سنایا تھا۔ تلقین و تبلیغ کا یہ کام زبانی تھا اور تا دیر اسی طور پر جاری رہا۔

سلطان محمود غزنوی پہلا بادشاہ تھا جس نے ہندستان کی مذہبی اور علمی زبان سنسکرت میں کلمۂ طیبہ کا ترجمہ اپنے "دلی والے" سکوں پر لکھوایا اور ساتھ ہی اس پر ہجری سال بھی منقش کرایا تھا۔ ان اندراجات کے جو دور رس اور دیرپا اثرات مرتب ہو سکتے تھے ان کا قیاس کیا جانا چاہیے۔ اس وقت سے گویا سنسکرت کا دروازہ

---

[1] مجھے جناب علیم صبا نویدی نے تمل زبان میں اسلامی موضوعات سے متعلق حال کے مطبوعہ ایسے دس رسالے راقم کے پاس بھیجے ہیں، جو عربی خط میں ہیں۔ اس سے یہ بات یقینی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ تمل زبان کے لیے اب بھی عربی خط کا استعمال ہوتا ہے۔ نوائے ادب بمبئی جولائی ۱۹۶۰ء ص ۲۲

مسلمانوں کیسلئے کھل گیا تھا اور پھر تو اپنے مسلک، عقیدے اور مزاج کے مطابق وہ اس زبان میں تصنیف و تالیف کا کام بھی کرنے لگے۔ اس صورتِ حال نے اس زبان کو نئی زندگی اور ایک مختلف مزاج عطا کیا مسلمانوں کے شعروں کو غالبؔ قدیم طرز کے "اشلوکوں" سے ممیز کرنے کے لیے "شلوک"[1] کہتے تھے۔

زبان ہندوی کو تو مسلمانوں نے شروع سے اپنا لیا تھا اور اپنے معتقدات و نظریات کو اس میں زبانی پیش کرتے آرہے تھے۔ فیروز تغلق کے عہد میں مولانا داؤد نے لورک اور چاندا کے معاشقہ کی داستان کو "چندائن" کے نام سے ۷۹۹ھ / ۱۳۷۷ء میں نظم کیا اور اس داستان کے واسطے سے انھوں نے نہایت موثر اور دلگداز انداز سے اسلامی تعلیمات کو پیش کیا تھا۔ یہی زبان ہندوی کی پہلی دستیاب تصنیف ہے اور اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ:
"مطابق تفسیر بعضے از آیاتِ قرآنی"[2] ہے اس کتاب میں متعدد اشعار واضح طور پر قرآن پاک کی آیتوں کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

اُس ابتدائی زمانے میں لازم تھا کہ قرآن پاک کی افہام و تفہیم ہندستانیوں کے مخصوص علمی اور فکری مزاج کی مناسبت سے ہو، چنانچہ تدبا خود اس کتابِ الٰہی کو بجائے قرآن کے "پُران" لکھتے رہے ہیں۔ شیخ قطبن نے اپنے ممدوح مسلمان بادشاہ کی ستائش کرتے ہوئے کہا ہے ؎

پنڈت اَو بُدھونت سیانا ۔۔۔ پڑھے پوران، ارتھ سب جانا

یعنی وہ صاحب علم اور زیرک ہے۔ وہ قرآن پڑھتا ہے اور اُس کے تمام مطالب سے آگاہ ہے۔ یہ لفظ اس معنی میں تا دیر مستعمل رہا ہے۔ ملک محمد جائسی نے بھی "پدماوت" میں کہا ہے ؎

پُن سو عثمان پنڈت بڑ گُنی ۔۔۔ لکھا پُران جو آیت سُنی

یہیں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ پنڈت کا لفظ صاحب علم کے معنی میں عام تھا۔ آج کے مروجہ اصطلاحی مفہوم میں اس کا استعمال بعد کے زمانے کی بات ہے۔

نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے ختم تک قرآن پاک کے مطالب کی پیشکش کا انداز وہی تھا جو مذکور ہوا۔ شیخ بہار الدین باجن نے اپنے کلام میں قرآنِ پاک کی مختلف آیتوں کے مطالب کو نظم کیا ہے۔ مثلاً سورۂ اخلاص کے مفہوم کو بھی اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

نا اُنھ جَینا، ناوہ جایا ۔۔۔ نا اُنھ مای باپ کہایا

---

[1] شیخ عبد القدوس گنگوہی کے رشد نامے میں ان کے شلوک منقول ہیں اور مولانا داؤد نے بھی چندائن میں کہا ہے: کہتا کا ب شلوک سنا ئیو لکھی لائے جیہ بانت
[2] منتخب التواریخ - عبد القادر بدایونی

نا اُنکھ کوں گودِہ چڑھایا ۔۔۔ باجن سب اُنکھ آپ نپایا

اسی طرح کہتے ہیں ؎

آں کاسۂ زنجبیل مزاجہا کافورا ۔۔۔ واں مشک لون ز بوئے شراب طہورا

پہلا مصرع اس آیت کا ترجمہ ہے: ۔۔۔ اِنَّ الابرار یشربون من کاس کان مزاجہا کافورا

اور دوسرا مصرع اس آیت کا: ۔۔۔ ویسقون فیہا کاسا کان مزاجہا زنجبیلا

یہ دونوں آیتیں سورۂ دہر کی ہیں۔

دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے آغاز سے اسلامی تاریخ کے واقعات اور اسلامی تعلیمات کے واضح لفظوں میں بیان کیے جانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اشرف بیابانی کی نظم "نوسرہار" میں جو ۹۰۹ھ/ ۰۴-۱۵۰۳ء کی تصنیف ہے، مسلمانوں کی تاریخ کے ایک غیر معمولی واقعہ یعنی سانحۂ کربلا کا بیان ہوا ہے اور اس کے بعد اسلامی عقائد اور مسلمان بزرگوں سے متعلق تصنیف و تالیف کا سلسلہ عام ہوگیا۔ جہانگیر بادشاہ نے تزک میں اپنے تیرہویں سالِ جلوس کا ایک واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

"بشارۃً الیہ فرمودیم کہ مصحف بہ عبارتِ سلیس خالی از تکلّف و تصنّع ترجمہ نماید و اصلاً بہ شرح و بسط شانِ نزول آں مقید نشدہ، بلغاتِ ریختہ قرآں را لفظ بہ لفظ فارسی ترجمہ کند و یک حرف بر معنی تحت اللفظ نیفزاید و بعد از اتمام آں مصحف ۔۔۔ روانۂ درگاہ سازد۔"

یہ نہیں معلوم کہ جہانگیر کی یہ فرمائش پوری ہوئی یا نہیں۔

یہ بات صحیح طور سے معلوم نہیں ہے کہ ہندستانی زبانوں میں قرآنِ کریم کا ترجمہ سب سے پہلے کس نے اور کب کیا تھا۔ کہا جاتا ہے[۲] کہ قاضی محمد معظم سنبھلی نامی کسی شخص نے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے پہلے سالِ جلوس یعنی ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء میں یہ کام کیا تھا۔ اس کے بعد کسی مجہول الحال شخص نے دوسرا ترجمہ ۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء میں بادشاہ مذکور ہی کے عہد میں کیا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں ترجموں کا کیا جانا خلاف قیاس نہیں ہے لیکن ان دونوں ترجموں کے بارے میں کوئی بات بھی ہمارے علم[۳] میں نہیں ہے۔

قرآنِ پاک کے اردو تراجم کے نقطۂ نظر سے نابینا بادشاہ شاہ عالم ثانی کا زمانہ خاص طور سے اہمیت رکھتا ہے۔ یہی نہیں کہ اس کے زمانے میں ایک سے زیادہ لوگوں نے اس کام کو کیا، بلکہ خود اسی نے اپنی مشہور تصنیف عجائب القصص[۴] میں

---

۱۔ اس کے لیے راقم پروفیسر شیخ فرید برہانپوری صاحب کا ممنون ہے۔ ۲۔ مقالات (محمود شیرانی) جلد ۲۔ ۳۔ قرآن کریم کے اردو تراجم مرتبہ ڈاکٹر احمد خان / سید عبد القدوس ہاشمی (مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد) ص ۱۲ ۴۔ عجائب القصص ص ۵۷، ۵۰۲ وغیرہ

(آغاز ۱۲۰۷ھ/۹۳-۱۷۹۲ء) میں احادیث اور آیاتِ قرآنی کا ترجمہ کرنے کے علاوہ ان کی تشریح اور تفسیر بھی لکھوادی ہے۔ ایسے مقاموں پر شیخ محمد واعظ الہ آبادی کی جامع المعجزات کے علاوہ کتب حدیث اور تفسیروں مثلاً تفسیر معالم التنزیل، تفسیر بیضاوی وغیرہ کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔

یہ بات عام طور سے تسلیم کی گئی ہے کہ قرآن پاک کا اوّلین ترجمہ وہ ہے جو شاہ رفیع الدین نے ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء میں کیا تھا۔ اس کے بعد یہ کام شاہ عبدالقادر نے ۱۲۰۵ھ/۹۱-۱۷۹۰ء میں کیا۔ لیکن مطبوعہ صورت میں اوّلین[1] دستیاب ترجمہ مولانا لطیف اللہ لکھنوی کا ہے۔ انھوں نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر لکھی تھی اور وہ اصل متن اور ترجمے کے ساتھ ڈاکٹر احمد خاں کے اندراج کے مطابق صدیقی پریس، بنارس میں ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء میں چھپ گئی تھی۔ اس کے کوئی چھ برس بعد حکیم محمد اشرف کاندھلوی کی سورۂ[2] یوسف کی تفسیر القلاب اسٹیم پریس، لاہور میں ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں دو سو سولہ صفحوں پر چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن کسی نامعلوم پریس سے ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں نکلا تھا۔ ڈاکٹر احمد خاں کے اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں منظوم ترجمۂ تفسیر بھی شامل ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی محفوظ ہے۔

شاہ عبدالقادر کے ترجمے نے غیر معمولی اہمیت حاصل کی۔ وہ قرآن پاک کا مکمل ترجمہ[3] ہے اور اس کی زبان بھی نسبتاً صاف ہے۔ وہ ترجمہ ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء میں دہلی اور کلکتہ دونوں مقاموں سے شائع ہوا تھا۔ کلکتہ والے ایڈیشن میں مقدمہ بھی شامل ہے۔

متعدد باصلاحیت حضرات نے اپنے اپنے طور پر قرآنِ پاک کا منظوم ترجمہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ جو حضرات اس کام کو مکمل کرنے میں کامیاب ہوگئے، ان میں محمد[4] نبی بخش اور محمد شمس[5] الدین شائق ایزدی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل الذکر کی تفسیرِ نبوی منظوم کریمی اسٹیم پریس لاہور سے ۱۹۲۰ء میں اور ثانی الذکر کا منظوم اُردو ترجمۂ قرآن مجید یونین اسٹیم پریس لاہور سے ۱۹۲۳ء میں پہلی مرتبہ اشاعت پذیر ہوا۔

اُردو نثر و نظم میں قرآنِ پاک کے جزوی اور مکمل جو ترجمے ہوئے ہیں ان کی تعداد کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ ڈاکٹر احمد خاں اور سید عبدالقدوس ہاشمی صاحبان نے اپنی کتاب میں ایک ہزار گیارہ مطبوعہ تراجم کا تعارف کرایا ہے۔ کچھ شبہ نہیں کہ بہت ایسے مطبوعہ تراجم ہوں گے جو ان حضرات کے علم میں نہیں پھر ایسے تراجم جو زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکے، بے شمار ہوں گے۔

قرآنِ پاک کے پڑھنے والے اس زمین کے چپے چپے پر موجود ہیں۔ یہ یقینی بات ہے کہ انھوں نے اس کو سمجھنے کیلیے اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ بھی کیا ہوگا۔ عالمِ اسلام کے ممتاز ترین عالم ڈاکٹر محمد حمید[6] اللہ صاحب کے ذخیرۂ کتب میں کم و بیش ایک سو بیس زبانوں کے تراجم موجود ہیں لیکن وہ بھی کل نہیں ہیں۔ اس قابلِ فخر ذخیرے میں خود اس برِّصغیر میں بولی جانے والی

---

۱؎ قرآن کریم کے اردو تراجم، مرتبہ ڈاکٹر احمد خاں و سید عبدالقدوس ہاشمی (مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۷۰ء) ص ۷، ۱۸ ۲؎ ص ۲۴۰
۳؎ ایضاً ص ۱۳۳ ۴؎ ایضاً ص ۲۳۵ ۵؎ ایضاً ص ۱۰۴ ۶؎ یہ فہرست ہمیں جناب عبداللہ (مدراس) نے عنایت کی ہے۔

زبانوں میں سے سرائیکی اور پشتو کے تراجم نہیں ہیں۔ دنیا میں بولی جانے والی کتنی ہی اور زبانیں بھی ہوں گی جن کے تراجم اس ذخیرے کی زینت نہیں بن سکے ہیں۔

آخر میں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم کے مطالعہ، ترجمہ اور تفسیر کا کام صرف مسلمانوں نے ہی نہیں کیا ہے۔ اس نیک کام میں غیر مسلموں نے بھی حصہ لیا ہے۔ جن عیسائی پادریوں اور عالموں نے ترجمہ مکمل کیا ان میں ریورنڈ احمد شاہ پادری، علی بخش پادری وغیرہ کے نام قابلِ توجہ ہیں۔ عیسائی پادریوں کا شائع کردہ پہلا قرآن کریم مع ترجمہ و تفسیر غالباً وہ ہے جو مطبع پیغام، دہلی سے ۱۸۴۴ء میں چھپا تھا۔ جو پادری اس کام کو مکمل نہیں کر سکے یا جنھوں نے محض کسی جز کا ترجمہ کیا ان میں جے علی بخش پادری اور سلطان محمد خاں پادری کا نام آیا ہے۔[1]

ہندو عالموں[2] میں کنھیا لال الکھداری نے قرآن پاک کا اردو ترجمہ (بلا متن) دھرم سبھا بک، لدھیانہ سے ۱۸۸۲ء میں چھپوایا تھا۔ اس مقام پر یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت[3] زبان میں بھی قرآن پاک کا ترجمہ کیا جا چکا ہے۔

میرے[4] ایک کرم فرما نے اطلاع دی کہ بنگلہ زبان میں بیسویں صدی عیسوی کے دوسرے عشرے میں گریش گھوش نامی ایک ہندو عالم نے قرآنِ مجید کا ترجمہ کیا ہے اور یہ بات مشہور ہے کہ اس زبان میں اوّلین ترجمہ یہی ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ اس سے پہلے[5] الثقافی پریس کلکتہ سے ۱۹۰۹ء میں قرآن حکیم کا بنگلہ میں مکمل ترجمہ چھپ کر شائع ہو چکا تھا اور اس کے مترجم کا نام مولانا عباس علی بتایا گیا ہے۔

تیلگو زبان میں البتہ اس نیک کام کے لیے ایک[6] ہندو عالم چلکوری نارائن راؤ کو اولیت حاصل ہے۔ اس ترجمہ کی خامیوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کے لیے محمد قاسم خاں نامی ایک مسلمان عالم نے اس کام کو از سرِ نو کیا اور ان کا ترجمہ حیدر آباد سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔

اوپر جو عرض کیا گیا اس سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ اس کرۂ ارض پر جس پر ہم بستے ہیں علمی نقطۂ نظر سے اس کے ماننے والوں اور منکروں نے جس کتاب کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی ہے وہ وہ قرآن پاک ہے جس میں خود خالقِ عالم نے یہ فرمایا ہے کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝

---

[1] قرآن کریم کے اردو تراجم، مرتبہ ڈاکٹر احمد خاں و سید عبدالقدوس ہاشمی (مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۷ء) ص ۱۹۰ [2] ایضاً ص ۱۸۶ [3] ایسے ایک ترجمے کے ایک صفحہ کا عکس جناب عبداللہ نے عنایت کیا ہے۔ اور یہ اطلاع دی ہے کہ اصل نسخہ شرف الملک اکیڈمی، مدراس کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ [4] قرآن کریم کے اردو تراجم مرتبہ ڈاکٹر احمد خان و سید عبدالقدوس ہاشمی ص ۸۳ [5] یہ اطلاع راقم کو ڈاکٹر اکرم شیخ مستان (علیگڑھ) نے دی ہے۔ [6] بحوالہ مکتوب جناب عبداللہ اعظمی

قاضی عبدالودود کا قائم کردہ

## ادارہ تحقیقات اردو کا علمی و تحقیقی مجلہ




اردو کے تحقیقی مقالوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ مشہور و معروف ناقدین و محققین کے قلم سے

تقریباً ایک ہزار صفحات  ڈھائی سو (۲۵۰) روپے میں

ملنے کا پتہ:

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

ڈاکٹر مہدی حسن
پی۔ایچ۔ڈی (جرمنی) ایف۔آر۔سی۔ایس

# چینی زبان کے الفاظ قرآن میں

کرسی۔ جن محققوں نے قرآن میں غیر ملکی الفاظ کی فرہنگیں ترتیب دی ہیں (ان میں اے جیفریز Arthur Jeffery. A. خاص طور سے قابل ذکر ہے) انھوں نے ایک لفظ بھی ایسا تلاش نہیں کیا جو چینی زبان سے مشتق ہو، بہرحال میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ طوفان Tufan J. B. B. R. A. S. 1946. 22-55 یہ لفظ چینی زبان کا ہے اور Kursi (کرسی)، یہ دوسرا لفظ ہے جو چینی زبان سے مشتق معلوم ہوتا ہے۔ پلیٹز کا اردو، انگریزی لغت "کرسی" کو عربی لفظ بتاتا ہے۔ جس کے معنی تخت یا "کرسی" ہوتے ہیں۔ یہ لفظ بہت پہلے عربی زبان میں داخل ہوگیا ہوگا اور عربی زبان میں مستعمل ہونے کے بعد ہی ہم اسے قرآن میں (۲۔ سورہ ۲۵۵۔ سطر) دیکھتے ہیں۔ عبداللہ یوسف علی کے قرآنی ترجمے میں، وہ سطر جس میں لفظ 'کرسی' استعمال ہوا ہے اس طرح لکھی گئی ہے۔ His Throne doth extend over the heavens (اس کا تخت بہشت تک پھیلا ہوا ہے)، ظاہر ہے کہ کرسی یہاں تخت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے؛ کسی لغت میں لفظ 'کرسی' پر اشتقاقی طریقے سے بحث نہیں کی گئی چنانچہ اس لفظ کی ساخت تک پہنچنے اور اس کے معنی کے تعین کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کی بنیاد معلوم کریں۔

لاہشید Lobscheid کے انگریزی۔چینی، لغت (حصہ اول؛ ص ۳۰۲ میں ایک لفظ K'au-Tsz-i ملتا ہے۔ جس کے معنی آرام کرسی ہوتے ہیں۔ Wade وہڈ کے طریقے کے مطابق لفظ 'K'au' اصل میں 'K'ao' ہے

Gile گائل کے چینی لغت میں (نمبر ۵۹۶۲) اس کے معنی 'کرسی کی پشت پر جھکنے کے ہوتے ہیں، K'au-tsz-i کے آخری لفظ 'I' کے معنی گائیل کی لغت میں (نمبر ۵۳۵۷) کرسی یا نشست کے ہوتے ہیں، درمیانی لفظ Tsz گائیل کے ہاں 'Tsz' کی صورت میں نظر آتا ہے اور اس کے معنی 'بیٹا' یا 'آقا' ہوتے ہیں۔ یہ لفظ چینی زبان میں مستعمل ہے لیکن انگریزی ترجموں میں کہیں نظر نہیں آتا اس لفظ کی حرفی تشریح اس طرح ہو سکتی ہے، آقا (Tsz)، کرسی (I) — پشت پر جھکنا (Kau)، چینی زبان کا 'Tsz' — 'Tzu' ہندوستانی کے 'جی' سے مشابہ ہے اور اسی طرح 'Tsz - Kau' کی طرح ہندوستانی میں بھی 'جی' کا لاحقہ لگانے سے تکلّف پیدا کیا جاتا ہے۔

جیسے ماتا جی۔ پتا جی۔ گرو جی۔ یونانی زبان میں بھی 'Eu' کے معنی 'اچھا' ہوتے ہیں۔ اسی طرح Euphrates کے حرفی معنی Good Phrates یا 'اچھا فرات' ہوں گے۔ چینی لفظ Kau-Tsz-i کی بہتر تشریح اس طرح ہو سکتی ہے۔ TSZ بمعنی اچھا۔ 'I' بمعنی نشست ۔۔۔ 'Kau' بمعنی پشت جس پر جھکا جائے۔ پوری ترکیب کے یہ معنی ہوئے، وہ پرعظمت نشست جس پر آرام سے بیٹھا جائے۔"

مہاتما بدھ چینی اور ہندوستانی مجسموں میں تخت پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اُن کے پیچھے ایک ستون نظر آتا ہے جس پر آرام کے لئے جھکا جا سکتا ہے۔ اس مجسمہ سے (Kau-Tsz-I) کی تشریح ہوتی ہے ۔۔۔ ہندوستانی میں 'گدی' کے حرفی معنی 'تکیہ' ہوتے ہیں۔ 'گدی پر بٹھانا' ہندوستانی میں 'تخت پر بٹھانے' کے مترادف ہے۔ چنانچہ 'گدی' یہ لفظ چینی زبان کے 'Kau-I' سے بہت زیادہ قریب اور مشابہ معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ جس طرح 'گدی' کے معنی تکیہ اور تخت ہوتے ہیں اسی طرح چینی لفظ Kau-Tsz کے معنی بھی 'کرسی' اور 'تخت' ہوتے ہیں۔ اسی طرح انگریزی میں chair کا مفہوم کرسی کے علاوہ عزت و عظمت سے وابستہ ہے جیسے He occupied the chair of honour، عربی تمدن کے ان اثرات کو دیکھتے ہوئے جنھوں نے قرون وسطیٰ کے یورپ کی علمی زندگی کو متاثر کیا ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ غالباً 'کرسی' یہ لفظ انگریزی میں کچھ سایانی ترمیم کے ساتھ chair پڑ گیا ہوگا۔

۱۔ لفظ 'Kau-i' گلیورے (Gilliway) کے چینی لغت (ص ۳۰۵۸) میں ملتا ہے جس کے معنی ہیں "اونچی پشت والی کرسی" ۔۔۔ 'اونچی پشت' سے جو اہمیت کرسی کو حاصل ہوتی ہے اس سے عظمت کا تصور پیدا ہو جاتا ہے ۔۔۔ (Fenn) فین کے چینی لغت میں (ص۔ ۱۹۱) اس لفظ کے معنی صرف کرسی یا 'نشست' کے ہوتے ہیں۔ لیکن صرف نشست سے 'I-Tsu' بمعنی اچھا یا باعزت کا تصور نہیں پیدا ہوتا۔

اس تجزیہ کے بعد یہ دونوں مرکب الفاظ Kau-Tsz اور I-Tsz تیسری صورت اختیار کرتے ہیں "Kau-Tsz-I" جس کا مطلب ہوا 'Tsz' بمعنی اچھا۔ 'I' بمعنی کرسی اور Kau بمعنی اونچی پشت۔ پوری ترکیب کا مطلب یہ ہوگا "اونچی پشت والی پرعظمت کرسی"۔

چین میں یقیناً باعزت و پرعظمت شخصیتوں کے لئے شاندار کرسیاں ہوتی ہوں گی جنھیں اسلام سے پہلے کے عربوں نے تخت سمجھا ہوگا۔

'دفتر' پر مضمون لکھتے وقت میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ چینی لفظ 'T'u-Seu'

ہندوستانی بنانے کے لئے 'ر' اس حرف کا لاحقہ لگایا گیا۔ چنانچہ لفظ Tu-SZU-R یا Tusser بن گیا۔

اسی طرح چینی لفظ 'ssu' بمعنی ریشم، یونانیوں کے پاس پہنچ کر 'ر' (R) کا لاحقہ بڑھاتے ہوئے Ser یا Sur بن جاتا ہے ــ لفظ Porcelain بھی چینی لفظ Po-Tsu-Lan سے بنا ہے۔ اس لفظ میں بھی "ر" (R) کا اضافہ ہے۔ چنانچہ "ر" کے اضافہ سے چینی لفظ Po-R-Tsu-Lan بن جاتا ہے اور لسانیاتی ترمیموں کے بعد Porcelain بنا کوئی تعجب خیز بات نہیں ــــ بالکل اسی طریقے سے K'au-TSZ-I عربی میں "ر" (R) کے اضافہ سے 'K'au-R-TSZ-I' بن گیا ہوگا۔ کیونکہ جب ہم (R) 'ر' کے اضافہ سے اس لفظ کا تلفظ ادا کریں تو ہمارا تلفظ 'کرسی' سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے ــ چینی زبان سے لفظوں کو بطور قرض لیتے ہوئے عجب نہیں کہ ہندوستانی، یونانی اور عربی زبان نے 'ر' (R) کا اضافہ کیا ہو،

چینی کلاسیکی لفظ Kau-Tsu-I جنوبی چین کی 'ہکا' بولی میں 'گائیل' (Giles) کے خیال کے مطابق اس لفظ میں 'K'au-TSZ-I' تبدیل ہو جاتا ہے۔ لاشیڈ Lahocheid لفظ کی اس صوتی تبدیلی سے متفق تھے۔ چنانچہ عربی لفظ 'کرسی' اس اعتبار سے 'ہکا' بولی سے بہت زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے K'au-TSZ-I سے KO-R-Z-I یا اور 'K'au-TSZ-I' سے Ku-R-S-I بنا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ کیونکہ ہکا بولی میں 'س' (S) کا استعمال اور کلاسکی چینی زبان میں 'ز' (Z) کا استعمال لفظ کی ساخت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

---

## خلاصہ

عربی لفظ 'کرسی' جو ہندوستان میں صرف کرسی کے لئے استعمال ہوتا ہے قرآن میں تخت کا مفہوم ادا کرتا ہے یہ لفظ چینی زبان سے لیا گیا ہے K'au-TSZ-I جس کے عرفی معنی پُر عظمت کرسی کے ہوتے ہیں جس کی پشت اونچی ہو، یہ معنی ہندوستانی کے لفظ 'گدی' سے ہم آہنگ ہیں، جس کا مطلب اکثر تخت سے لیا جاتا ہے۔ 'K'au-TSZ-i' کا تلفظ ایک عرب کی زبان سے 'K'au-R-TSZ-i' کی طرح ہوتا ہے جو کہ بعد میں 'Ku-R-S-i' یا کرسی بن گیا۔

**خزانہ** پلیٹز (Platts) اپنے اُردو۔ انگریزی لغت میں (ص ۴۸۹) لفظ 'خزانہ' کے معنی ذخیرہ۔ گھر، حفاظت گھر۔ یا خزانہ لکھتا ہے۔ علاوہ ازیں 'خزانہ'، اس لفظ کو فارسی بتایا گیا ہے۔ پلیٹز کے مطابق اس لفظ کا بازاری تلفظ 'خزانہ' ہوتا ہے لیکن صحیح تلفظ خِزانہ ہے، کیونکہ عربی میں لفظ 'خزن' ہے جس کے معنی محافظ کے ہیں۔ عربی لفظ 'خزن' سے اگر فارسی میں خزانہ بن جاتا تو یہ لفظ جدید ہونا چاہیئے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ قرآن میں اس لفظ کا استعمال موجود ہے، بہر حال ہندوستان میں بلا اشتداد لفظ 'خزانہ' اس طرح مستعمل ہے جیسے اس کا دوسرا تلفظ ہی نہیں ہے'۔ قرآن میں یہ لفظ صاف طور سے 'خزانہ' ہے ——— (سورۂ ۶۔ ۵۰، ۱۱۔ ۳۱، ۱۵۔ ۲۱)۔ عبداللہ یوسف علی اپنے ترجمہ میں (حصہ ۲۔ ص ۶۴۰) فٹ نوٹ (نمبر ۱۹۵۸) میں لکھتے ہیں Khazain خزائن کے معنی حفاظت گھر اور ایسی جگہیں ہیں جہاں قیمتی چیزیں جمع کی جاتی ہیں اور ضرورت کے وقت تقسیم کی جاتی ہیں۔ یہ مفہوم درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ بنیادی طور سے لفظ کے معنی ہیں غلہ گھر۔

لفظوں کی بنیاد معلوم کرنے کے لئے اور خصوصاً اس وقت جب تاریخ بھی خاموش ہو ترکیبی طریقہ ہی Synthatic-method. کارگر ہو سکتا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ لفظ (خزن) کے خاص اشارتی معنی (Connotative meaning) دریافت کرے 'خزن' کے بنیادی معنی 'حفاظت کرنا' یا (To guard) سے بھی کچھ مفہوم نکالے جا سکتے ہیں جیسے (Prison) قید خانہ وغیرہ، لاہشید Lahschid اپنی انگریزی۔ چینی لغت میں (ص ۱۶۸۴) 'Ts'ang' کے معنی 'حکومت کا ذخیرہ گھر' Store-house اور محض "ذخیرہ گھر" کے لئے 'Ho - Ts'ang' استعمال کرتا ہے۔ ذخیرہ گھر Store house کے لئے چینی زبان میں اور بہت سے الفاظ ہیں جس میں ایک لفظ 'Nagu' بھی ہے (Nagu)۔(Ho-Ts'ang) کے معنی لاہشید کے لغت میں 'اشیا کا ذخیرہ گھر' ہوتے ہیں۔ ویڈ (Wade) کے طریقے کے مطابق "Ho"، 'Au o' بتایا گیا ہے۔ گائیل (Giles) کے چینی انگریزی لغت میں (نمبر ۲۲۹ ۵) اس کے معنی 'اشیا یا زیور' ہوتے ہیں، دوسرا لفظ 'Ts'ang' گائیل کے لغت میں (نمبر ۱۱۵۹۱) 'Ts'ang' ہی کی شکل میں نظر آتا ہے اور جس کے معنی 'غلہ گھر' ہوتے ہیں۔ لاہشید کا استعمال کردہ لفظ 'Ho-Ts'ang' گائیل کے لغت میں بھی ملتا ہے اور اس کے معنی 'زیور گھر' ہوتے ہیں۔ 'Soch'uan' سوشان بولی میں اس لفظ کا تلفظ Hiro-Tsing

ہوتا ہے اور (Amanese) اینز بولی میں اس کا تلفظ Hwa-Tang ہوتا ہے۔
گائیل کے لغت (کیریکٹر نمبر ۸۶) 'Ao' کے معنی 'غلہ گھر' ہوتے ہیں، اور سوشانی Sochuan اور اینز Amanese میں 'Ao' کا تلفظ 'Naga' ہوتا ہے۔ گائیل کے لغت میں بھی یہ لفظ Ts'ang-Ao ملتا ہے (کیریکٹر نمبر ۱۱۵۹۱ اور ۸۶) جس کے معنی 'غلہ کی دکان' ہوتے ہیں، لاہشیہ کی لغت میں اس لفظ کے معنی کسی قدر واضح شکل میں نظر آتے ہیں، لاہشیہ اس لفظ کے معنی 'حکومت کا ذخیرہ گھر' بتاتا ہے۔ چینی، ایک لفظ کے لئے دو طرح کے لفظ استعمال کرنے کے عادی نظر آتے ہیں جیسے 'Huo-Ts'ang' اور Ts'ang-Ao ان دونوں لفظوں میں سے صرف ایک ہی لفظ مفہوم ادا کرنے کے لئے کافی ہے۔ ان دونوں لفظوں میں 'Ts'ang' مشترک ہے اور ان دونوں لفظوں کے اشتراک سے بنے ہوئے تیسرے لفظ 'Huo-Ts'ang-Ao' کے معنی ہوں گے 'غلہ گھر یا گودام'، اینز Amanese بولی میں اس لفظ کا تلفظ 'Hwa-T'ang-Naga' ہوگا۔ اور 'Huo-Ts'ang' کا تلفظ 'Hwa-T'ang' ہوگا۔

یل (Yull) اور برنل (Burnell) اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ Godown انگریزی لفظ ہے اور ملائی (Malay) Ga-Dong سے مشتق ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اینز لفظ 'Hwa-T'ang' ملائی میں Ga-Dong بن گیا ہوگا۔ اس طرح انگریزی لفظ Godown کی بنیاد 'Hua-Tsang' معلوم ہوتی ہے جس کے معنی لاہشیہ نے 'ذخیرہ گھر' بتلائے ہیں

اینز (Amanese) لفظ Hwa-Tang-Naga اگر (Ga-Dong Ngau) میں تبدیل ہو جائے جس کے آخر میں ng ہو اور Ngau کے ابتدا میں ng ہو تو اس کی آسان شکل Ga-Dong-Au ہو سکتی ہے، جو ملایا یا جاوا کی زبان سے تامل میں داخل ہو کر Ki-Dang-u بن گئی ہو، یل Yull اور برنل Burnell اس لفظ کے معنی اس گھر کے بتاتے ہیں جہاں چیزیں جمع کی جائیں۔ اس طرح سے Kidongu کے معنی گودام ہونے چاہئیں لیکن تامل زبان میں گودام کے معنی Kidongu نہیں ہوتے، حیدرآباد کے ضلع پربھنی کی مقامی بولی میں لفظ Gidungi کے معنی اس گھر کے ہوتے ہیں جہاں پانی جمع کیا جائے۔ لیکن مجھے Gidangi کے ساتھ پانی کا تعلق کچھ عجیب سا لگتا ہے۔

سوشان بولی (Sochuan) میں Hwo-Ts'ang Ngau کا مفہوم

متحرک غلہ گھر (Mobile grain establishment) ہو سکتا ہے جہاں سے شاید ریشم فروخت کرنے والے چینی قافلے اپنا غلہ حاصل کرتے ہوں گے۔ یوسف علی کے خیال کے مطابق یا تو غلہ ہر روز تقسیم کیا جاتا ہوگا یا پھر ضرورت کے وقت تقسیم ہوتا ہوگا۔ ریشم فروخت کرنے والے چینی قافلے آخر سفر میں (Syria) ملک شام میں ٹھہرتے تھے اور وہیں پر شاید لفظ Hwo-Tsing-Ngau عربی زبان میں Kha-zana بن کر داخل ہو گیا ہوگا۔

یہ حقیقت مسلم ہے کہ پرانے زمانے کی اقتصادیات میں 'رسم مبادلہ (Barter system)' رائج تھی اور خراج بھر اناج کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا۔ تمدن کے ایسے دور میں حکومت کا خزانہ سوائے 'غلہ گھر' کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ Gile گائیلی کے الفاظ میں اسلام سے قبل عربوں کا خزانہ کا تصور 'غلہ گھر' کا ہی ہو سکتا ہے۔

## خلاصہ

چینی لفظ Huo-Ts'ang کے معنی 'گودام' ہوتے ہیں۔ ایمئی Amanee بولی میں اس کا تلفظ Hwa-Tsang ہوتا ہے۔ ملائی زبان میں اس لفظ نے Ga-Dong کی شکل اختیار کی اور انگریزی کے 'Godown' سے قریب تر ہو گیا۔

چینی زبان میں 'Huo-Ts ang Ao' کے معنی 'غلہ گھر' ہوتے ہیں — ایمئی بولی میں اس کی شکل 'Hwa-Tsang Ngau' ہو جاتی ہے جو تامل زبان میں داخل ہو کر — 'Ki-Dang-u' بن جاتی ہے، جس کے معنی 'غلہ گھر' ہوتے ہیں۔

سوشان Souchan بولی کا لفظ 'Hwo-Ts'ang-Ngau' غالباً چینی قافلے اپنے ساتھ شام لے گئے ہوں گے اور بہت ممکن ہے عربوں نے اسے Kha-zana بنا لیا ہو جس کے ابتدائی معنی 'غلہ گھر' تھے چونکہ 'غلہ' ہی اس زمانہ کا خزانہ سمجھا جاتا تھا بیش قیمت اشیا پر لفظ 'خزانہ' کا اطلاق بعد کا تصور معلوم ہوتا ہے۔

# اے گرفتارِ ابوبکر و علی

- مناقب ابوبکر بزبان علی
- مناقب علی بزبان ابوبکر

تصنیف: علامہ زمخشری

ترجمہ: احتشام الحسن کاندھلوی



پیراں کم اڑتے ہیں مریداں زیادہ اڑاتے ہیں۔ بس وہی صورت شیعہ سنی مسئلہ کی ہے۔
عام شیعہ عام سنی کا دوست رہا ہے۔ مگر دونوں کے عالم دونوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا
دیتے ہیں علی اور ابوبکر میں وہ آویزش نہ تھی جو ان کے ہم جیسے نالائق پیروؤں کے درمیان ہے
اور وہ اسلیے ہے کہ مفادات بنالیے گئے ہیں کہ اگر آویزش نہ ہو تو، مفادات پر تو ضرب لگے گی نا۔

ہر آویزش میں پہل ہمیشہ بڑے بھائی کی طرف سے ہونی چاہیئے ''انصاف کا تقاضا
بھی یہی ہے۔
چنانچہ زمخشری احتشام کاندھلوی (دونوں ـــ بڑے بھائی!) نے پہل کی، اس کی
ہمیں خوشی ہے۔

ـــــــــــ ادارہ

تصنیف : علامہ زمخشری

ترجمہ : احتشام الحسن کاندھلوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# حضرت علیؓ کے مناقب حضرت ابوبکرؓ کی زبانی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اکثر حضرت علیؓ کے چہرے کو دیکھا کرتے تھے میں نے عرض کیا "ابا" آپ اکثر علی کے چہرے کو کیوں دیکھتے ہیں؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "بیٹی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا علی کے چہرہ کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔"

حضرت حبشی بن جنادہؓ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر تھا، آپ نے فرمایا جس شخص سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی وعدہ فرمایا ہو اسے کھڑے ہو کر بیان کرے۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا۔ اے خلیفۂ رسول اللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین مٹھی کھجور دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ آپ نے حضرت علیؓ کو بلوایا اور فرمایا "ابوالحسن یہ شخص کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے تین مٹھی کھجور کا وعدہ فرمایا تھا تم اس کو تین مٹھی کھجور دے دو۔ حبشی کہتے ہیں جب حضرت علیؓ اس کو کھجوریں دے چکے تو آپ نے فرمایا ان کو شمار کرو تو ہر مٹھی میں بلاکم و بیش ساٹھ کھجور آئیں۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا صدق اللہ و رسولہ (اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا)

ہجرت کی شب جب ہم غار سے نکل رہے تھے اور مدینہ کا ارادہ تھا " ابوبکر میرا اور علی کا ہاتھ شمار میں برابر ہے۔"

حضرت زید بن یثیع بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا حضور اقدس نے خیمہ نصب کرایا اور عربی کمان سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے۔ اس وقت خیمہ میں حضرت علیؓ، حضرت فاطمہ اور حسن و حسین تھے اور آپ نے ارشاد فرمایا اے گروہ مسلمین جو شخص ان اہل خیمہ سے صلح رکھے میں اس کے حق میں صلح مجسم ہوں اور جو ان سے

لڑائی کرے میں اس سے لڑنے والا ہوں اور جوان کو دوست رکھے میں اس کا دوست ہوں۔ ان سے وہ شخص محبت رکھتا ہے جو نیک بخت اور نیک ذات ہے اور بدبخت بدذات ان سے بغض رکھتا ہے۔

ایک شخص نے دریافت کیا، کیا زید تم نے خود حضرت ابوبکر سے سنا؟ حضرت زید نے فرمایا ہاں ربِّ کعبہ کی قسم۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے چھ روز بعد حضرت ابوبکر اور حضرت علی قبرِ مبارک کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے۔ حجرہ شریف پر پہنچکر حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے کہا۔ "خلیفہ رسول اللہ آپ پہلے اندر داخل ہوں"۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا میں اس شخص سے پیش قدمی نہیں کر سکتا جس کے متعلق میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا علی کو میرے ساتھ وہ تقرب حاصل ہے جو مجھے بارگاہ رب العزت میں حاصل ہے۔

حضرت علی روئے اور فرمایا میں اس شخص سے سبقت نہیں کر سکتا جس کے متعلق میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ نے ارشاد فرمایا ابوبکر کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں جس نے میری تکذیب نہ کی ہو۔ اور ابوبکر کے علاوہ ہر ایک کے دروازہ پر صبح کے وقت ایک قسم کی ظلمت ہوتی ہے۔

حضرت ابوبکر نے حضرت علی سے دریافت کیا کیا تم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟

حضرت علی نے جواب دیا میں نے اپنے چچازاد بھائی سے سنا ہے پھر حضرت ابوبکر نے حضرت علی کا ہاتھ پکڑا اور دونوں ایک ساتھ حجرہ شریف میں داخل ہو گئے۔

حضرت قیس بن ابی حازم سے مروی ہے ایک مرتبہ حضرت ابوبکر اور حضرت علی کی ملاقات ہوئی تو حضرت ابوبکر حضرت علی کو دیکھ کر مسکرائے۔

حضرت علی نے دریافت کیا آپ مجھے دیکھ کر کیوں مسکرائے؟ حضرت ابوبکر نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ تمھارے اجازت نامہ کے بغیر کوئی شخص پل صراط سے نہ گذر سکے گا۔

حضرت قیس کہتے ہیں یہ سن کر حضرت علی مسکرائے اور فرمایا ابوبکر میں تمھیں خوشخبری سناتا ہوں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے کہ صرف اس شخص کو اجازت نامہ دوں جو تمھیں محبوب رکھتا ہو۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور صحابہ کرام آپ کے گرداگرد جمع تھے کہ حضرت علی سامنے سے آئے سلام کیا! ور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کھڑے ہو کر صحابہ کے چہروں کو دیکھنے لگے کہ کون ان کو جگہ دیتا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داہنی جانب بیٹھے تھے آپ نے تھوڑا سا سرک کر فرمایا ابو الحسن اس جگہ بیٹھ جاؤ اور حضرت علی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے درمیان بیٹھ گئے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر خوشی کے آثار ظاہر ہوئے، پھر ارشاد فرمایا ابو بکر صاحب کمال کی فضیلت کو کمال والا ہی پہچانتا ہے۔

---

## حضرت ابو بکرؓ کے مناقب حضرت علیؓ کی زبانی

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر میں مجھ سے اور ابو بکر صدیقؓ سے ارشاد فرمایا تم میں سے ایک کی دائیں جانب حضرت جبرائیلؑ اور دوسرے کی دائیں جانب حضرت میکائیلؑ ہیں۔ اور حضرت اسرافیلؑ ایک جلیل القدر فرشتے ہیں جو جہاد میں شریک ہوتے ہیں اور صفِ قتال میں شامل رہتے ہیں۔

حضرت علی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دریافت فرمایا میرے ساتھ کون ہجرت کرے گا؟

حضرت جبریلؑ نے جواب دیا "ابو بکر صدیق" اسی روز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا لقب "صدیق" رکھ دیا۔

ابو یحییٰ حکم بن سعد کہتے ہیں میں شمار نہیں کر سکتا کہ میں نے کتنی مرتبہ حضرت علی کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ خود اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے نبی کے ذریعہ حضرت ابو بکر کا لقب صدیق رکھا۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ آیت وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖ (اور جو سچ لے کر آیا اور جس نے اس کی سچائی کو مانا) میں سچ لانے والے سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے۔ اور آپ کی سچائی ماننے والے سے مراد حضرت ابو بکر صدیق ہیں۔

حضرت نزال بن سبرہ ہلالی کہتے ہیں کہ ہم نے ایک روز حضرت علی کو ہشاش بشاش پاکر عرض کیا کہ امیر المومنین اپنے اصحاب کے واقعات بیان کیجئے۔ آپ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب (ساتھی) میرے بھی اصحاب ہیں۔

ہم نے عرض کیا اپنے مخصوص دوستوں کے واقعات بیان کیجئے۔

آپ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر صحابی میرا خصوصی دوست تھا۔

ہم نے مکرر عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے حالات بیان کیجئے۔

آپ نے فرمایا کہ تم میرے سے نام لے کر دریافت کرو۔

ہم نے عرض کیا حضرت ابو بکر صدیق کے حالات بیان فرمائیے۔

آپ نے فرمایا یہ وہ ہستی ہیں جن کا حق سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی صدیق لقب رکھا۔ اور نماز کی امامت کے لئے رسول اللہ کا نائب بنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہماری دینی امامت کے لئے پسند فرمایا اسی لئے ہم نے ان کو اپنی دنیوی امامت کے لئے منتخب کر لیا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ جعرانہ ادا کر کے مدینہ منورہ واپس تشریف لے گئے اور حضرت ابو بکر صدیق کو امیر حج بنا کر مکہ مکرمہ روانہ فرمایا۔ میں بھی ان کے ہمراہ روانہ ہوا جب ہم موضع عرج پہنچے اور آپ کو صبح کی نماز کی اطلاع دی گئی۔ آپ نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے۔ اچانک حجرہ کے پیچھے سے اونٹنی کی آواز سنائی دی آپ نماز پڑھانے سے رک گئے اور فرمایا یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی جدعاء کی آواز ہے۔ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حج کا ارادہ ہو گیا ہو اور آپ تشریف لا رہے ہوں تو پھر ہم آپ ہی کے ہمراہ نماز ادا کریں گے۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ حضرت علی پہنچ گئے حضرت ابو بکر نے ان سے دریافت کیا تم امیر بنا کر بھیجے گئے ہو یا محض قاصد ہو۔

حضرت علی نے فرمایا امیر نہیں بلکہ قاصد ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات برات دے کر مجھے بھیجا ہے تاکہ مواقف حج میں لوگوں کو پڑھ کر سنا دوں۔ ہم مکہ مکرمہ پہنچے جب چھٹی ذی الحجہ ہوئی تو حضرت ابو بکر نے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا جس میں احکام حج بیان فرمائے جب آپ خطبہ سے فارغ ہو گئے تو حضرت علی کھڑے ہوئے اور سورۂ برات

آخر تک سنائی۔ پھر جب ہم دسویں ذی الحجہ کو عرفات سے منیٰ واپس آئے تو حضرت ابوبکر نے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا جس میں طوافِ افاضہ اور قربانی وغیرہ کے احکام بیان کئے پھر حضرت علی کھڑے ہوئے اور سورۂ براءۃ آخر تک سنائی۔ گیارھویں تاریخ کو حضرت ابوبکر نے پھر خطبہ پڑھا۔ اس کے بعد حضرت علی نے کھڑے ہو کر سورۂ براءۃ سنائی۔

مروی ہے کہ جب دونوں حضرات مدینہ منورہ واپس پہنچے تو حضرت ابوبکر صدیق بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے اور عرض کیا یا رسول اللہ میرے لئے کیا حکم ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سراسر خیر ہے تم غار میں میرے ساتھی تھے اور حوض پر بھی میرے ساتھی ہو گے۔ لیکن براءت[عہ] میں خود پہنچا سکتا ہوں یا پھر میری طرف سے میرا کوئی قریبی رشتہ دار (اسی لئے حضرت علی کو بھیجنے کی ضرورت پیش آئی)

(ف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق کو روانہ کرنے کے بعد پھر ایک دم حضرت علی کو بھیجا اس پر حضرت ابوبکر صدیق کو خیال ہوا کہ شاید بارگاہِ رسالت میں میری کوئی بات ناپسند آئی جس کی بنا پر حضرت علی کو بھیجا گیا چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ادنیٰ بے التفاتی بھی کسی صحابی کو گوارا نہ تھی اس لئے آپ نے اپنے معاملہ کی صفائی چاہی اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی تسلی اور تشفی کے لئے آپ کے چند مناقب بیان فرمائے اور حضرت علی کو بھیجنے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ قریش مکہ کے دستور کے موافق اپنے کئے ہوئے معاہدہ کو میں خود فسخ کر سکتا ہوں یا میری طرف سے میرا قریب ترین رشتہ دار فسخ کر سکتا ہے۔ اس مجبوری کی بنا پر حضرت علی کو بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔

## حضرت علیؓ کی جانب سے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی تصدیق اور تصویب

حضرت علی مرتضیٰ نے فرمایا خدائے پاک کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ اچانک وفات ہوئی اور نہ آپ مقتول ہوتے بلکہ آپ چند شب و روز بیمار رہے موذن روزانہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور نماز کی اطلاع کرتا تھا اور آپ اس کو حکم فرماتے کہ ابوبکر کے پاس

---

عہ یعنی فسخ معاہدہ ۱۲

جاؤ اور ان سے کہو کہ نماز پڑھائیں آپ نے مجھ سے نماز نہیں پڑھوائی حالانکہ میں وہاں موجود ہوتا تھا اور آپ کو میری موجودگی کا علم بھی ہوتا تھا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا میرے متعلق کوئی عہد ہوتا تو کسی تیم زادے اور خطاب زادے کی یہ مجال نہ تھی کہ منبر نبوی پر کھڑا ہو کر خطبہ پڑھ سکے میں بزور شمشیر اس سے جہاد کرتا (اور اپنا حق حاصل کرتا)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ہم نے اپنے معاملہ میں غور کیا تو ہماری یہ سمجھ میں آیا کہ نماز اسلام کا ستون اور دین کی اصلی بنیاد ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کو ہمارے دین کی امامت کا حکم فرمایا تھا اسی کو ہم نے اپنی دنیوی قیادت کے لئے منتخب کر لیا اور حضرت ابو بکر صدیق کو اپنا امیر بنا لیا جب انھوں نے جہاد کا اعلان کیا ہم نے ان کے حکم پر جہاد کیا اور جو انھوں نے عطا کیا اس کو بخوشی قبول کر لیا اور ان کے حکم سے حدود اللہ قائم کیں کبھی کوئی اختلاف نہ رہا اور باہم ہمیشہ متحد اور متفق رہے مختصر یہ کہ اب کوئی ہمارے متعلق کسی قسم کی برائی اندر ہی اندر کیوں پھیلائے۔

حضرت سعید بن مسیب رض فرماتے ہیں جس روز حضرت ابو بکر صدیق سے بیعت کی گئی حضرت علی مرتضیٰ نے فرمایا لوگو جس شخص کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے بڑھایا ہو، اب کون اس کو پیچھے ہٹا سکتا ہے۔

حضرت سعید فرماتے ہیں کہ حضرت علی نے خلافت صدیق کی تائید میں ایسی مستحکم دلیل بیان کی جو کسی کے بھی ذہن میں نہ تھی۔

(ف) حضرت علی مرتضیٰ کے استدلال کا منشا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابو بکر صدیق کو نماز کی امامت کے لئے مامور فرمایا تو معلوم ہوا کہ وہ دیگر تمام صحابہ کرام سے افضل ہیں اور افضل کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو امیر بنانا درست نہیں لہذا حضرت ابو بکر کی موجودگی میں کسی کی امارت جائز نہیں ہو سکتی۔

## حضرت ابو بکر کا فسخ بیعت کا اعلان اور حضرت علی کا انکار

حضرت ابو الجحاف رض سے مروی ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیق سے خلافت کی بیعت کی گئی اور حضرت علی مرتضیٰ نے اپنے رفقاء سمیت بیعت کر لی تو حضرت ابو بکر صدیق تین مرتبہ کھڑے ہوئے اور فرمایا اگر کسی کو ناپسند ہو تو میں تمہاری بیعت فسخ کرتا ہوں۔ بر دفعہ

حضرت علی مرتضیٰ سب سے پہلے کھڑے ہوتے اور فرماتے خدائے پاک کی قسم نہ ہم آپ سے فسخ بیعت کرتے ہیں اور نہ کبھی اس کی خواہش کریں گے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی امامت کے لئے آگے بڑھایا ہے اب کون آپ کو پیچھے ہٹا سکتا ہے۔

## حضرت علیؓ کے فضائل حضرت ابوبکرؓ کی زبانی

حضرت شعبی سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت علی کے چہرے پر نظر ڈالی اور فرمایا اگر ایسے شخص کو دیکھنا ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت اور مرتبہ میں سب سے زیادہ قریب ہو اور جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے سب سے زیادہ تکالیف برداشت کی ہیں اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ عزیز اور پیارا ہو تو وہ انھیں دیکھ لے" اور حضرت کی جانب اشارہ کیا۔ حضرت علی نے فرمایا اگرچہ حضرت ابوبکر نے ایسا فرمایا لیکن وہ مخلوق خدا پر سب سے زیادہ شفیق و مہربان ہیں اور عشق الٰہی میں سرد آہ کرنے والے ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق غار ہیں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر ہر قسم کی مشقت برداشت کی اور حضور پر اپنا جان و مال سب کچھ قربان کر دیا آپ اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اپنے مال میں سے خرچ کرتے تھے اور سب سے زیادہ بارگاہِ رسالت میں مقرب تھے۔

علی بن قادم فرماتے ہیں جو شخص صحابہ سے ان کے خلاف بیان کرے وہ ہرگز قابلِ قبول نہیں۔

حضرت معقل بن یسار سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا حضرت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کنبہ میں سے ہیں۔

## حضرت ابوبکر صدیق کے فضائل حضرت علی کی زبانی

ابن اذینہ کہتے ہیں کہ میں جب کوفہ گیا تو حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا امیر المومنین مہاجرین اور انصار کو کیا ہوا جو وہ آپ کو حضرت ابوبکر سے گھٹاتے ہیں حالانکہ آپ سب سے بڑھے ہوتے ہیں اور آپ کے بڑے بڑے کارنامے ہیں اور آپ کے مناقب بھی سب سے زیادہ ہیں۔

حضرت علی تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا اگر تو قریشی ہے تو شاید بنو عائذہ کے کنبے میں سے ہے اور میرا خیال ہے کہ تو زوالہ کا رشتہ دار ہے۔

میں نے جواب دیا "ہاں"

حضرت علی نے فرمایا اگر تو میں حق تعالیٰ کی پناہ میں نہ ہوتا تو میں تجھے ابھی قتل کر دیتا کم بخت ابو بکر مجھ سے چار باتوں میں بڑھے ہوئے تھے جن کو میں نہیں پا سکا۔ ورنہ ان کے علاوہ کوئی اور شے پا سکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہ ہجرت اور نماز کی رفاقت اور نماز کی امامت اور اسلام کی اشاعت، ان سب امور میں حضرت ابو بکر مجھ سے سبقت لے گئے حضرت ابو بکر ہمیشہ میرے اور مشرکین کے درمیان حائل رہتے اور میرا کام دیتے۔ وہ کھلم کھلا دین کو ظاہر کرتے تھے اور میں اس وقت اپنے دین کو چھپاتا تھا قریش مجھے حقیر سمجھتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔

اگر حضرت ابو بکر لشکر کشی اور مرتدین کی سرکوبی سے درگزر کرتے تو ہمیشہ پیچیدگیاں پڑی رہتیں اور لوگ اصحاب طالوت کی طرح بے غیرت و بے حمیت ہو جاتے۔ حق تعالیٰ ابو بکر پر رحمتیں نازل فرمائے اور ان کو میرا سلام پہنچائے۔

پھر فرمایا کوئی شخص مجھے حضرت ابو بکر پر فوقیت نہ دے ورنہ میں اس کو سزا دوں گا اور اس پر مفتری کی حد جاری کروں گا۔

حضرت محمد بن حنفیہ کہتے ہیں کہ میں نے امیر المؤمنین حضرت علی سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل کون ہے؟

حضرت علی نے فرمایا بیٹا حضرت ابو بکر صدیق ہیں اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت ان کے سوا کسی سے مدد نہیں چاہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی رات کو حضرت ابو بکر کے گھر تشریف لے گئے اور میں آپ کی چادر مبارک اوڑھ کر لیٹ گیا اس لئے کہ حضرت جبریل علیہ السلام رات کے وقت بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کفار آپ کے ساتھ دغا اور فریب کر رہے ہیں تاکہ آپ کو قید کر لیں یا قتل کر دیں یا شہر بدر کر دیں اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چادر اوڑھے ہوئے باہر تشریف لاتے جو لوگ برے ارادہ سے باہر کھڑے تھے انھوں نے آپ کو دیکھ لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ — اور ہم نے ان کے سامنے اور

سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ | پیچھے ایک ایک پردہ ڈال دیا۔ پس ڈھانک لیا ہم نے ان کو تو کہ وہ دیکھ نہ سکیں۔

ایک مٹھی خاک پر دم کی اور ان کی طرف پھینک دی جس سے حق تعالیٰ نے ان کو اندھا اور بہرا کر دیا۔ پھر آپ حضرت ابوبکر کے پاس تشریف لے گئے اندر فرمایا ابوبکر مجھے ہجرت کا حکم ہو گیا ہے۔ اور حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی۔ حضرت ابوبکر آپ سے آگے آگے چلتے اور زمین سے کانٹوں کو ہٹا کر راستہ صاف کرتے جاتے اسی طرح ایک غار پر پہنچ گئے۔

حضرت ابوبکر نے چلنے سے پہلے حضرت عائشہ کی بہن حضرت اسماء کو کچھ دراہم دے کر فرمایا ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھانا تیار کر لینا اور چونکہ آپ کو گوشت مرغوب ہے اس لئے گوشت روٹی پکانا اور اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں آئے تو کہہ دینا میں عورت ذات ہوں اور اپنے کام میں مشغول ہوں۔

غار پر پہنچ کر حضرت ابوبکر نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ ذرا ٹھہر جایئے اور خود غار میں جا کر اس کو صاف کیا اور اس خیال سے کہ کوئی موذی چیز حضور کو ایذا نہ پہنچائے جو سوراخ نظر پڑا اس میں انگلی ڈال کر دیکھی ایک بڑا بھٹ تھا آپ نے اپنا پیر اس میں داخل کر دیا جو ٹخنوں تک اندر چلا گیا پھر باہر نکالا اور عرض کیا یا رسول اللہ تشریف لایئے میں نے آپ کے لئے جگہ صاف کر دی اور اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ آپ کے محافظ اور نگہبان ہیں۔

کفار قریش نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاک میں تھے کہ شیطان آیا اور ان سے کہا تم کس کام میں ہو میں بھی تمہارا ساتھی ہوں۔ انھوں نے کہا ہم محمدؐ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں یہ کہہ کر وہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آرامگاہ کو دیکھنے لگے تو وہاں آپ کی بجائے علی بن ابی طالب کو آپ کی چادر اوڑھے ہوئے پایا۔

اس وقت جب رسول اللہ تشریف لے گئے اللہ تعالیٰ نے ان کو بدحواس بنا دیا تھا۔

پس علیؓ اور ابوبکرؓ دونوں رسول اللہ کے جاں نثار فدائی ہیں۔

جب قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر میں آپ کی جگہ حضرت علیؓ کو پایا تو کہا آج اس جھوٹے شخص نے ہمیں خوب دھوکا دیا اور اس کا جادو ظاہر ہو گیا۔ شیطان نے ان سے کہا تم

ابھی ابھی باہر چلے گئے اور وہ سب آپ کے قدموں کے نشانات دیکھتے ہوئے حضرت ابو بکرؓ کے گھر پہنچے۔ وہاں حضرت اسماءؓ گوشت پکا رہی تھیں اور انھوں نے چراغ کو نکال کر باہر رکھ دیا تاکہ سالن کی بو محسوس نہ ہو۔ وہ سب حضرت اسماءؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور دریافت کیا کیا تمھیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خبر ہے؟

حضرت اسماءؓ نے جواب دیا میں عورت ذات ہوں اور اپنے کام میں مشغول ہوں۔ اس پر وہ لوگ وہاں سے چل دیئے اور جستجو کرتے کرتے غار تک پہنچ گئے۔ وہاں حق تعالیٰ نے ان دونوں کے نشانات قدم کو چھپا دیا اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق کے قدموں کے نشانات کا پتہ نہ چلا حتی کہ ایک شخص غار پر بیٹھ کر پیشاب کرنے لگا۔ اس وقت حضرت ابو بکر نے عرض کیا یا رسول اللہ ان لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو بکر! انھوں نے ہمیں نہیں دیکھا اگر دیکھ لیتے تو یہ شخص اس طرح ہمارے سامنے بیٹھ کر پیشاب نہ کرتا۔ پھر وہ لوگ وہاں سے منتشر ہو گئے۔ اور دونوں حضرات نے غار میں رات گذاری۔ حضرت ابو بکر کے ایک سانپ نے کاٹ لیا جس کی وجہ سے انھوں نے یہ رات سخت بے چینی سے بسر کی صبح کو تمام بدن پر ورم تھا اور حالت نازک تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا ابو بکر یہ کیا ہوا؟

حضرت ابو بکر نے عرض کیا "یا رسول اللہ سانپ نے کاٹ لیا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم نے اسی وقت مجھے کیوں نہ خبر کی۔

حضرت ابو بکر نے عرض کیا آپ کی نیند کو خراب کرنا گوارا نہ ہوا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک حضرت ابو بکر کے بدن پر پھیرا جس سے ان کی ساری تکلیف جاتی رہی اور بالکل خوش و خرم اور تن درست و توانا ہو گئے۔

حضرت ابو بکر کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ حاضر خدمت ہوئے تو حضرت ابو بکر نے اشارہ سے ان کو بلایا اور کہا بیٹا اگر کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرتا ہوا آئے تو کہہ دینا مجھے کیا خبر؟ اور چرواہے سے کہنا کہ بکریوں کو ایسی طرح غار پر لائے کہ ہمارا کوئی نشان و پتہ کسی پر ظاہر نہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حضرت اسماء دو روٹیاں لے جاتیں انھوں نے اپنی چادر کو پٹی کی طرح باندھ رکھا تھا جس میں ایک روٹی دائیں جانب اور ایک بائیں جانب چھپا کرلے جاتی تھیں تاکہ کسی کو ان پر شک و شبہ نہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز غار میں قیام فرمایا حضرت ابوبکر صدیق نے سفر کے لئے دو اونٹوں کا انتظام کر رکھا تھا وہاں اطلاع دی گئی اور حضرت عبداللہ ایک راستہ بتانے والا اور دونوں اونٹ لے کر پہنچ گئے۔

حضرت ابوبکر صدیق کو اپنی ذرا پرواہ نہ تھی۔ البتہ یہ اندیشہ تھا کہ اگر خدانخواستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دشمنوں نے قابو پالیا تو دین اسلام ختم ہو جائے گا۔

اگرچہ حضرت ابوبکر کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کامل یقین حاصل نہ تھا اس اضطراب اور بے چینی کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر سے ارشاد فرمایا فکر نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔ اسی کو حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ | دوسرا دو میں سے جس وقت وہ غار میں تھے جس وقت آپ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے غم مت کر اللہ ہمارے ساتھ ہے |

انہی کے متعلق ارشاد ربانی ہے

| | |
|---|---|
| فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ | پس خدا نے ان پر اطمینان نازل فرما دیا۔ |

پس حضرت ابوبکر صدیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء و مرسلین کے بعد سب سے افضل اور اعلیٰ ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق اسلام لائے اور سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ بیت اللہ میں علی بن ابی طالب نے نماز پڑھی۔

حضرت مسلم بن زفر کہتے ہیں کہ جب کبھی حضرت علی کے سامنے حضرت ابوبکر صدیق کا تذکرہ ہوتا تو آپ فرماتے تم اس شخص کا تذکرہ کر رہے ہو جو ہر کار خیر میں دوسروں سے سبقت اور بازی لے گیا۔ اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ہم نے جس کار خیر میں بھی پیش قدمی کا ارادہ کیا ابوبکر اس کام کو ہم سے پہلے کر گذرتے تھے۔

حضرت علی سے مروی ہے کہ میرے باپ ابوطالب کی وفات کے تین روز بعد کفار قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادہ سے جمع ہوئے اس وقت حضرت ابوبکر کے

ے راستہ بتانے کے لئے عامر بن فہیرہ کو ساتھ لائے جو حضرت ابوبکر کے خادم اور آزاد کردہ غلام تھے ۱۲

سوا کوئی آپ کے کام نہ آیا۔ حضرت ابو بکر تن تنہا مقابلہ کے لئے آئے اور کوشش کر کے مجمع کو ہٹاتے جاتے اور فرماتے تم بخو کیا ایسے شخص کو قتل کرتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار صرف اللہ ہے اور اس پر اللہ رب العزت کی جانب سے دلائل اور براہین پیش کرتا ہے۔ خدا کی قسم یہ شخص اللہ کا رسول اور پیامبر ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق کے سر پر دو مینڈھیاں تھیں اس ہنگامہ میں ان میں سے ایک ٹوٹ گئی۔

حضرت علی نے اپنے رفقاء سے فرمایا تمھیں خدا کی قسم دے کر دریافت کرتا ہوں کہ آل فرعون کے مومن شخص اور ابو بکر میں سے کون افضل ہے؟

اس پر سب خاموش رہے پھر آپ نے فرمایا خدا کی قسم حضرت ابو بکر کا ایک ایک دن مومن آل فرعون سے افضل ہے وہ ایک شخص تھا جس نے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا اس پر حق تعالیٰ نے اس کی تعریف فرمائی اور یہ ابو بکر صدیق ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان اور اپنا خون خرچ کیا ہے۔

حضرت محمد بن عقیل بن ابی طالب سے مروی ہے کہ ایک دفعہ امیر المومنین حضرت علی نے خطبہ پڑھا پھر فرمایا بتاؤ سب سے زیادہ بہادر کون ہے؟

ہم نے عرض کیا "امیر المومنین آپ ہی ہیں"

حضرت علی نے فرمایا میں نہیں بلکہ ابو بکر صدیق تھے اس لئے کہ جنگ بدر میں ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک خیمہ نصب کیا اور باہم مشورہ ہوا کہ یہاں کسی کو حفاظت کے لئے کھڑا ہونا چاہیئے تاکہ دشمن خیمہ تک نہ پہنچ سکے حضرت ابو بکر کے سوا کسی کی وہاں کھڑے ہونے کی ہمت نہ ہوئی۔ حضرت ابو بکرؓ اپنی تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے جب کوئی مشرک آپ کے قریب آتا آپ اس پر فوراً تلوار سے حملہ کرتے۔ ایک مرتبہ کفار قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کے پاس گھیر لیا اور آپ کو ستانا اور پریشان کرنا شروع کر دیا اور بار بار کہتے کیا تو نے ہی سب معبودوں کو ایک معبود کر دیا۔

خدا کی قسم اس وقت ابو بکر صدیق کے علاوہ کوئی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کے لئے نہ گیا (پھر تمام قصہ بیان کیا) حضرت عبد خیر سے مروی ہے کہ حضرت علی نے

فرمایا قرآن کریم کی خدمت کرنے والوں میں سب سے زیادہ اجر و ثواب کے مستحق حضرت ابوبکر صدیق ہیں۔ اس لئے کہ انھوں نے سب سے پہلے قرآن مجید کو جمع کیا ہے۔

حضرت موسیٰ بن شداد سے روایت ہے کہ حضرت علی نے فرمایا جماعتِ صحابہ میں حضرت ابوبکر صدیق سب سے افضل ہیں۔

## حضرت ابوسفیان کا حضرت ابوبکر کی خلافت کو ناپسند کرنا اور حضرت علی کی تردید

حضرت ابوسفیان حضرت علی اور حضرت عباس کی خدمت میں گئے اور ان سے کہا اے علی اور عباس خلافت قریش کے چھوٹے اور ادنیٰ قبیلہ میں چلی گئی اب اس کا کیا حشر ہوگا؟ خدا کی قسم اگر میں چاہوں تو ابھی ان کے خلاف اطراف و جوانب سے پیادہ اور سوار لشکر جمع کردوں۔ اس پر حضرت علی نے فرمایا خدا کی قسم میں اس بات کو پسند نہیں کرتا اگر ہم حضرت ابوبکر صدیق کو خلافت کا اہل نہ سمجھتے تو ہرگز ان کو خلیفہ نہ بناتے۔ ابوسفیان ہم مسلمان وہ قوم ہے جو ایک دوسرے کی خیرخواہ اور معین و مددگار ہو۔ اگرچہ ان کے اجسام اور اوطان دور دور ہوں۔ اور منافق وہ قوم ہے جس کا شیوہ دھوکا اور فریب ہے وہ ایک ساتھ رہ کر بھی ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے ہیں اور مکر و فریب پھیلاتے ہیں یعنی یہ بات کہ ہم ظاہر میں تو حضرت ابوبکر سے بیعت کرلیں اور دل سے اس کو ناپسند کریں۔ اسلامی تعلیمات اور مسلمان قوم کی خصوصیات کے بالکل منافی ہے یہ تو کھلا نفاق ہے اور منافقوں کی خاص علامت ہے کہ بظاہر رواداری برتی جائے اور اندرونی طور پر دھوکا اور فریب دیا جائے

## مرتدین وغیرہ کے بارہ میں حضرت ابوبکر کا حضرت علی سے مشورہ

جب حضرت ابوبکر صدیق خلیفہ منتخب ہوگئے تو عرب کے بعض قبیلوں نے مالِ زکوٰۃ بیت المال میں دینے سے انکار کیا اور کہا کہ ہم مال زکوٰۃ کو اپنے رشتہ داروں میں اور اپنی خواہش کے موافق خرچ کریں گے اس پر حضرت ابوبکر صدیق نے صحابہ کرام کو جمع فرمایا اور اس معاملہ میں ان سے مشورہ طلب کیا۔ بعض کی رائے تھی کہ ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے تا کہ اسلام سے واقف

ہوجائیں اور اسلام ان کے دلوں میں راسخ ہوجائے۔ بعض نے کہا ان کو اپنی حسبِ منشا خرچ کرنے دیجئے بعد میں آپ اس مال کو واپس لے لیں۔ حضرت ابو بکر حضرت علی کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا ابو الحسن تمھاری کیا رائے ہے؟

حضرت علی نے فرمایا جو کچھ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے اگر آپ نے اس میں سے کچھ بھی چھوڑ دیا تو یہ طریقہ نبوی کے خلاف شمار ہوگا۔

حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا جب یہ بات ہے تو اگر انھوں نے مالِ زکوٰۃ کی ایک رسی دینے سے بھی انکار کیا تو میں ان سے ضرور قتال کروں گا۔

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں والد ماجد اپنی سواری پر سوار ہو کر تلوار سونتے ہوئے ذوالقصہ عہ کی جانب روانہ ہوگئے۔ حضرت علی کو جب خبر ہوئی تو انھوں نے پہنچ کر سواری کی باگ پکڑلی اور کہا کہ خلیفہ رسول اللہ کہاں کا قصد ہے؟ میں آپ سے اس وقت وہی بات عرض کرتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ احد میں آپ سے فرمائی تھی کہ اپنی تلوار کو نیام میں رکھو اور ہمیں اپنا دکھ نہ پہنچاؤ۔ خدا کی قسم اگر ہم پر آپ کی مفارقت کا صدمہ پڑا تو پھر آپ کے بعد اسلام کا نظام ہرگز قائم نہ رہ سکے گا اور مسلمانوں کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

اس پر حضرت ابو بکر صدیق لوٹ آئے اور لشکر کو روانہ کر دیا۔ حضرت خالد بن ولید نے امیر المومنین حضرت ابو بکر صدیق کو اطلاع دی کہ اطرافِ عرب میں ایک شخص عورتوں کی حرام کرتا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق نے مشورہ کے لئے صحابۂ کرام کو جمع فرمایا جن میں حضرت علی بھی تھے۔ حضرت علی نے فرمایا قوم لوط کے سوا یہ گناہ کسی سے سرزد نہیں ہوا پھر جو معاملہ حق تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا وہ سب کو معلوم ہے میرے خیال میں اس شخص کو آگ لگا دینا چاہیے۔ اسی پر تمام صحابہ کا اتفاق ہوگیا۔ اور حضرت ابو بکر صدیق نے حکم تحریر فرمایا کہ اس شخص کو آگ میں جلا دیا جائے۔

## حضرت ابو بکر صدیق کی وفات کے بعد حضرت علی کے تاثرات

جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وصال ہوگیا اور آپ کو چادر اڑھا دی گئی تو

---

عہ ایک مقام کا نام ہے ۱۲

سارا مدینہ منورہ آہ وزاری سے گونج اٹھا اور وہ حالت ہوگئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت ہوئی تھی۔ حضرت علی آبدیدہ رنجیدہ انا للہ پڑھتے ہوئے تشریف لائے اور فرمایا آج خلافت نبوت ختم ہوگئی۔ پھر اس حجرہ پر پہنچے جہاں حضرت ابو بکر کا جنازہ رکھا ہوا تھا اور دروازہ پر کھڑے ہو کر فرمانے لگے ابو بکر خدا تم پر رحمت نازل فرمائے تم رسول اللہ کے دوست اور ساتھی تھے اور آپ کے مونس وغم خوار اور معتمد علیہ تھے تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی رازدار اور مشیر خاص تھے۔ تم سب سے پہلے اسلام لائے اور خلوص ایمان اور شدت یقین اور خشیت خداوندی میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ تم نے دین کی حمایت کی خاطر بہت تکالیف برداشت کیں۔ تم سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائی اور اسلام کے شیدائی تھے اور اپنے دوستوں کے لئے سراسر خیر و برکت اور بہترین ساتھی تھے تم بڑے عالی مناقب صاحب خیر بلند مرتبہ عالی حوصلہ تھے اور رشد و ہدایت اور رحمت و فضیلت میں سب سے زائد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھے۔ دربار رسالت میں تمہاری قدر و منزلت سب سے زیادہ تھی اور تم سب سے زیادہ قابل اکرام اور قابل اعتماد سمجھے جاتے تھے۔ حق تعالیٰ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بمنزلہ کان اور آنکھ کے تھے۔ اور آپ نے ایسے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی جب لوگ حضور کو جھٹلا رہے تھے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں آپ کا لقب "صدیق" رکھ دیا۔ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے وقت میں مال خرچ کیا اور غم خواری کی جب لوگ پہلوتہی کر رہے تھے اور آپ مصائب میں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساتھی رہے جب لوگ حضور انور کو چھوڑ بیٹھے تھے آپ نے مشکلات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خوب ساتھ دیا آپ ثانی اثنین اور رفیق غار تھے آپ ہی پر سکون و طمانینت نازل کی گئی اور آپ ہی ہجرت کے ہمراہی بنائے گئے۔ آپ دین الٰہی اور امت محمدی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اور نائب منتخب ہوئے جب لوگ مرتد ہونے لگے آپ نے بہترین طریقہ پر فرائض خلافت انجام دیئے اور وہ کارنامے کئے جن کو کسی نبی کے خلیفہ نے نہیں کیا جب لوگ سست ہوگئے تو آپ مستعد رہے اور جب لوگ پست ہمت ہونے لگے تو آپ خود قتال کے لئے تیار ہوگئے اور جب لوگ ضعیف ہوگئے تو آپ قوی رہے۔ آپ ہمیشہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر کاربند رہے آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ برحق تھے اور منافقوں کی کاوش اور کافروں کی ناگواری، حاسدوں کی ناراضگی فاسقوں کی ریشہ دوانی اور باغیوں کی مساعی کے باوجود نہ آپ کی خلافت میں کوئی جھگڑا ہوا اور نہ آپ خلافت سے باز رکھے گئے۔

جس وقت لوگ سست پڑ گئے تو آپ چست رہے اور اہم امور انجام دے اور جب وہ بول نہ سکتے تھے آپ گویا رہے، وہ بھٹک کر ٹھیر گئے تو آپ روشنی میں چلے انھوں نے آپ کی پیروی کی اور راہ یاب ہوئے۔

آپ پست آواز تھے مگر تلاوتِ قرآن اور گفتگو خوب صاف کرتے تھے۔ آپ کم گو اور راست گو تھے اور بیشتر خاموش رہتے تھے۔ آپ قدرت کلام، اصابت رائے۔ شجاعت تجربہ میں سب سے ممتاز تھے۔ خدا کی قسم آپ اس وقت بھی اسلام کے رئیس اور امیر تھے۔ جب لوگ اسلام سے پہلو تہی کر رہے تھے اور اس وقت بھی رئیس تھے جب لوگ جوق در جوق اسلام کی جانب مائل تھے آپ مومنوں کے رحیم باپ تھے جب وہ آپ کے عیال بن گئے تو آپ نے ان کا وہ بوجھ سنبھال لیا جس سے وہ عاجز ہو گئے تھے اور جو انھوں نے چھوڑ دیا تھا اس کی حفاظت فرمائی اور جو ضائع کر دیا تھا اس کی تلافی فرمائی ان کی ذلت اور گھبراہٹ کے وقت آپ نے اہتمام کیا اور عالی ہمتی سے کام لیا اور ان کے جزع و فزع کے وقت صبر و تحمل کیا اور ان کی جنایات کا بدلہ لے لیا۔ وہ اپنی ہدایت یابی کے لئے آپ کی طرف بڑھے اور کامیاب ہوئے اور آپ کے باعث وہ حاصل کر لیا جس کا ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ آپ معاندین اسلام کے لئے سراپا قہر و غضب تھے اور مومنوں کے حق میں سراسر رحمت و نعمت تھے۔ واللہ تمام امور میں آپ کی پرواز بہت بلند رہی اور آپ نے اہم امور میں ہمیشہ کامیابی حاصل کی اور اعلیٰ فضائل اور مناقب کو حاصل کیا۔ نہ آپ کی دلیل کبھی منقطع ہوئی اور نہ آپ کی بصیرت کم زور ہوئی اور نہ کبھی آپ پر بزدلی ظاہر ہوئی نہ کسی قسم کا خوف و ہراس ہوا بلکہ آپ ہمیشہ استقلال سے پہاڑ کی طرح جمے رہے جس کو نہ آندھیاں حرکت دے سکیں اور نہ اپنی جگہ سے ہٹا سکیں۔ آپ ویسا ہی تھے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے حق میں ارشاد فرمایا کہ سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنا مال و متاع خرچ کرنے والے تھے اور آپ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آپ اپنے

معاملہ میں ضعیف اور حق تعالیٰ کے معاملہ میں قوی اور اپنی نگاہوں میں حقیر اور بارگاہِ خداوندی میں مقرب اور لوگوں کی نگاہوں میں صاحبِ حشمت و شوکت۔ آپ امتِ محمدیہ کی بزرگ ترین ہستی تھے نہ کسی کو آپ کی شان میں طعنہ کی گنجائش اور نہ بدزبانی کا موقع اور نہ آپ کی نسبت لالچ کا گمان اور نہ کسی کی طرفداری کا وہم۔ ایک ضعیف اور ذلیل شخص آپ کے نزدیک قوی تھا جب تک آپ اس کا حق اس کو نہ دلا دیتے اور ایک قوی باعزت شخص آپ کے نزدیک ضعیف اور ذلیل تھا جب تک کہ آپ اس سے دوسرے کا حق نہ دلا دیتے۔ دور و نزدیک اس میں آپ کے نزدیک سب برابر تھے۔ آپ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ تقرب اور عزت اس شخص کو حاصل تھی جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرماں بردار اور متقی و پرہیزگار تھا۔ آپ کی شان حق گوئی اور راست بازی اور نرم خوئی تھی آپ کا فرمان حکم محکم اور حتمی فیصلہ ہوتا تھا اور آپ کا فرمان بردباری اور استواری پر اور آپ کی رائے دانائی اور پختگی پر مبنی ہوتی تھی۔ آپ جس طرف بھی چلے راستے کھل گئے اور دشوار آسان ہو گیا۔ آپ کی بدولت باطل کی آگ بجھ گئی اور دین اعتدال پر آگیا ایمان پھر سے قوی اور مضبوط ہو گیا اور اسلام اور مسلمان از سرِ نو جم گئے اور حکمِ الٰہی غالب ہو کر رہا اور معاندین سرنگوں ہوئے۔

آپ مسلمانوں کو چھوڑ کر چل دئے جس سے وہ حیران رہ گئے آپ نے بہت جلدی کی اور اپنے پسماندگان کو سخت مشکل میں پھنسا دیا۔ آپ تو پورے طور پر فائز اور کامیاب ہو گئے۔ آپ کو کسی کی آہ و زاری کی کیا حاجت۔ آپ کا تو آسمانوں میں پرتپاک خیر مقدم ہے لیکن آپ کی مصیبت نے مسلمانوں کو نڈھال اور شکست کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْن ہم حق تعالیٰ سے اس کے حکم پر راضی ہیں اور اس کا معاملہ اسی کے حوالہ کرتے ہیں۔ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں پر آپ جیسی کوئی مصیبت نازل نہ ہوگی اس لئے کہ آپ دین کے نگہبان اور دین کی عزت اور دین کے ملجا و ماویٰ تھے۔ آپ مومنوں کے حق میں سایۂ عاطفت اور قلعۂ مستحکم اور بارانِ رحمت تھے اور منافقوں کے حق میں سخت اور غیظ و غضب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تو اپنے نبی سے ملا دیا اب ہمیں آپ کے اجر سے محروم نہ رکھے اور آپ کے بعد ہمیں گمراہ نہ کرے۔

حضرت علی کی بات ختم ہونے تک سب لوگ خاموش رہے پھر اس قدر روئے کہ چیخیں نکلنے لگیں اور کہا رسول اللہ کے داماد تم نے جو کچھ فرمایا بالکل سچ اور حق فرمایا۔

# وہ احادیث جن کو حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے روایت کیا

اسماء بن حاکم فزاری سے مروی ہے کہ حضرت علی نے فرمایا جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنتا تو حق تعالیٰ مجھے اس سے نفع پہنچاتے اور جب کوئی دوسرا شخص مجھ سے حدیث رسول بیان کرتا تو میں اول اس سے قسم لیتا جب وہ قسم کھا لیتا تب میں اس کو سچ سمجھتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے مجھ سے حدیث بیان کی اور حضرت ابوبکر سچے تھے (لہٰذا ان سے قسم لینے کی ضرورت نہ تھی)

حضرت ابوبکر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کسی مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے پھر اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھے اور توبہ و استغفار کرے تو حق سبحانہ وتعالیٰ اس کی مغفرت فرما دیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپ کے دفن کرنے میں صحابۂ کرام کی مختلف رائے تھی بعض نے بقیع کی رائے دی بعض نے موضع جنائز پسند کیا اور بعض نے صحابہ کے قبرستان کا مشورہ دیا۔ اسی دوران میں حضرت ابوبکر صدیق تشریف لائے اور فرمایا ہٹ جاؤ نبی کے روبرو موت و حیات دونوں حالت میں بلند آواز سے گفتگو نہ کرنی چاہیے۔

حضرت علی نے فرمایا حضرت ابوبکر اپنے معمولات میں قابل اعتماد ہیں۔

حضرت ابوبکر نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت کی تھی کہ جس جگہ نبی کا وصال ہوتا ہے اسی جگہ دفن کیا جاتا ہے۔

(ف) چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق کا خلیفہ ہونا تقدیر الٰہی میں لکھا جا چکا تھا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے مناسب احکام خاص طور پر ان کو بتلا دئے تھے۔ نبی کا کسی مقام پر وصال ہونا یہ گویا حق تعالیٰ کی جانب سے اس مقام کا نبی کی آرام گاہ کے لئے انتخاب ہے پس جس جگہ نبی کا وصال ہو وہی اس کا دفن اور آرام گاہ بنے گی۔ اس قاعدہ کلیہ سے حضرت یوسف علیہ السلام مستثنیٰ ہیں

ان کا وصال مصر میں ہوا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی وصیت کے مطابق ان کے تابوت کو فلسطین لے جا کر دفن فرمایا۔ اور اس استثنار کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی بارگاہِ الٰہی میں یہ تمنا اور التجا تھی کہ ان کی آخری آرام گاہ ان کے وطن میں ہو جہاں دیگر انبیاء بنی اسرائیل آرام فرما ہیں۔

حضرت علی سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا ابو بکر جب لوگوں کو دنیا کی طرف جھپٹتے ہوئے دیکھو تو تم آخرت کو مقدم رکھنا۔ اور آبادی اور ویرانہ ہر جگہ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو جب تم اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو گے تو اللہ تعالیٰ بھی تمہیں نہ بھولیں گے۔ اور کسی مسلمان کو ہرگز حقیر مت سمجھنا کیونکہ ادنیٰ مسلمان بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک باعظمت و حرمت ہے۔

حضرت علی سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا گناہوں کے حق میں ایسا ہے جیسا آگ کے حق میں پانی (یعنی جیسا پانی ڈالنے کے بعد آگ کے تمام اثرات ختم ہو جاتے ہیں اسی طرح درود شریف پڑھنے کے بعد گناہوں کے سارے اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔) اور بارگاہِ نبوی میں سلام بھیجنا غلاموں کے آزاد کرنے سے افضل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تمام نفوس سے افضل ہے۔

## حضرت فاطمہؓ اور حضرت ابو بکرؓ کا تذکرہ

حضرت فاطمہ زہراؓ حضرت ابو بکر صدیق کی خدمت میں آئیں اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باغ فدک مجھے ہبہ فرما دیا تھا لہٰذا وہ مجھے دے دیجئے۔

حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا صاحبزادی تم سچ کہتی ہو مگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ اس باغ کی آمدنی سے تمہارا روزینہ دے کر باقی کو فقیروں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ فرماتے تھے تم اسے لے کر کیا کرو گی؟

حضرت فاطمہ نے فرمایا جس طرح میرے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے، اسی طرح میں بھی کروں گی۔

حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا میں تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہوں

کر اس کی آمدنی اسی طرح خرچ کروں گا جس طرح تمہارے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرچ کرتے تھے۔

حضرت فاطمہ نے فرمایا قسم کھاؤ کہ ایسا ہی کروگے۔

حضرت ابو بکر نے فرمایا خدا کی قسم ایسا ہی کروں گا۔

حضرت فاطمہ نے فرمایا "اے اللہ تو گواہ رہ"

پھر ہمیشہ حضرت ابو بکر صدیق اس باغ کی آمدنی سے اہلِ بیت کرام کے اخراجات دے کر باقی فقیروں اور مسکینوں اور مسافروں پر تقسیم کردیتے تھے ان کے بعد حضرت عمر فاروق بھی ایسا ہی کرتے رہے۔ پھر حضرت علی نے بھی اپنے دورِ خلافت میں ایسا ہی کیا۔ حضرت علی سے کسی نے اس بارہ میں گفتگو کی تو آپ نے فرمایا جس کام کو ابو بکر اور عمر کرتے تھے اس کا خلاف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے۔

حضرت فاطمہ حضرت ابو بکر صدیق کی خدمت میں تشریف لے گئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ورثہ کا مطالبہ کیا۔

حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا میرے ماں باپ تم پر اور تمہارے والد پر قربان ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہم انبیاء کی جماعت کا کوئی وارث نہیں ہوتا جو کچھ مال و سامان ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔

(ف) حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی وراثت نہ ہونے میں چند منافع ہیں۔

اوّل یہ کہ نبی کی ذاتِ گرامی پر کسی کو دنیا طلبی اور جمع مال کا شک و شبہ نہ ہو جو اس کی گمراہی اور تباہی کا باعث بنے۔ دوسرے یہ کہ نبی کے رشتہ داروں کے دل میں کبھی یہ وسوسہ نہ آئے کہ نبی کے بعد یہ مال و متاع ہمارا ہوگا۔ یہ خیال گویا نبی کی وفات کی خواہش ہے جو موجب ہلاکت و بربادی ہے۔ تیسرے یہ کہ نبی اپنی ساری امت کے لئے بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے اور امت نبی کی اولاد ہوتی ہے اور یہ روحانی تعلق تمام مادی تعلقات پر غالب ہوتا ہے۔ اسی لئے نبی کے ورثہ کی حق دار ساری امت ہوتی ہے۔

حضرت فاطمہ زہرا رضی حضرت ابو بکر صدیق کی خدمت میں تشریف لائیں اور فرمایا خلیفہ رسول اللہ! آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہیں یا رسول اللہ کے اہلِ بیت؟

حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا میں وارث نہیں بلکہ اہل بیت وارث ہیں۔

حضرت فاطمہ نے فرمایا پھر خُمس کا کیا معاملہ ہے؟

حضرت ابوبکر نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب حق تعالیٰ کسی نبی کو کچھ مال دیتے ہیں تو نبی کے وصال کے بعد وہ مال بعد والوں کا ہوتا ہے اب جب میں خلیفہ ہوا تو خیال ہوا کہ اس کو مسلمانوں میں تقسیم کر دوں۔ حضرت فاطمہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تم زیادہ واقف حال ہو۔ اور واپس تشریف لے گئیں۔

حضرت ابوبکر صدیق فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت فاطمہ کا حضرت علی کے ساتھ نکاح کا ارادہ کیا تو فرمایا میری لاڈلی بیٹی میری آنکھوں کی ٹھنڈک فاطمہ کا اچھی طرح بناؤ سنگھار کرو اور خوشبو خوب لگاؤ اور مہندی لگانا نہ بھول جانا۔

حضرت فاطمہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا میرے بعد ایک جماعت ظاہر ہو گی جن کو روافض کہیں گے جس جگہ تم ان کو پاؤ قتل کر دینا۔ یہ لوگ مشرک ہیں اور ان کی علامت یہ ہے کہ وہ ابوبکر و عمر کو گالیاں دیں گے۔

حضرت فاطمہ زہرا جب بیمار ہوئیں اور مرض بڑھ گیا تو حضرت ابوبکر صدیق ان کی عیادت کے لئے ان کے گھر تشریف لے گئے اور اندر آنے کی اجازت چاہی۔

حضرت علی نے حضرت فاطمہ سے کہا کہ حضرت ابوبکر صدیق دروازہ پر کھڑے ہیں اگر تم چاہو تو ان کو اندر آنے کی اجازت دے دو حضرت فاطمہ نے حضرت علی سے دریافت کیا کیا یہ بات تمھیں پسند ہے؟ حضرت علی نے فرمایا "ہاں"

پس حضرت ابوبکر صدیق گھر میں تشریف لے گئے اور حضرت فاطمہ سے گفتگو کی اور معذرت چاہی پھر حضرت فاطمہ ان سے راضی ہو گئیں۔

## حضرت فاطمہؓ کی نماز جنازہ

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے مغرب و عشا کے درمیان انتقال فرمایا حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عثمان غنی اور حضرت عبدالرحمن بن عوف اور حضرت زبیر ابن عوام وغیرہم حضرات جنازہ پر حاضر ہوئے جب جنازہ نماز کے لئے رکھا گیا تو حضرت علی نے فرمایا، ابوبکر آگے بڑھئے اور نماز پڑھایئے۔

حضرت ابوبکر نے فرمایا کیا تمھاری موجودگی میں میں آگے بڑھوں؟

حضرت علی نے فرمایا ہاں خدا کی قسم آپ کے ہوتے ہوئے کوئی اور نماز نہ پڑھائے گا۔
پس حضرت ابو بکر صدیق آگے بڑھے اور نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو رات ہی میں دفن کر دیا گیا۔

حضرت ابو بکر نے حضرت فاطمہ کے جنازہ کی نماز میں چار تکبیریں کہیں۔

## حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کے مناقب حضرت ابو بکرؓ کی زبانی

حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات حسن و حسین کے متعلق ارشاد فرمایا یہ دونوں جنتی نوجوانوں کے سردار ہیں۔

(ف) بعض روایات میں ہے کہ اہل جنت سب کے سب نوجوان اور ہم عمر ہوں گے پس ارشاد نبوی کے یہ معنی ہوئے کہ انبیاء و مرسلین اور خلفاء راشدین کے علاوہ جن کی فضلیت یقینی اور واضح ہے۔ یہ دونوں حضرات باقی تمام اہل جنت کے سردار اور سرتاج ہوں گے۔

حضرت ابو سعید سے روایت ہے کہ ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور سجدہ میں تھے کہ حضرت حسن یا حسین آئے اور کود کر آپ کی پشت پر بیٹھ گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پکڑا اور آہستہ سے اتار کر سامنے بٹھا دیا میں نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھا ہوا دیکھا ہے اور میں نے حضرت ابو بکر صدیق کو دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی وجہ سے ان سے محبت کرتے تھے اور ان کو اپنے کندھے پر بٹھایا کرتے تھے۔

حضرت عقبہ بن حارث بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت ابو بکر صدیق کے ساتھ عصر کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد آپ مسجد سے واپس ہو رہے تھے اور آپ میرے اور حضرت علی کے درمیان تھے کہ راستے میں کچھ بچے کھیل رہے تھے جن میں حسن بن علی بھی تھے۔ حضرت ابو بکر نے ان کو پکڑا اور گود میں اٹھا لیا اور فرمانے لگے میرے باپ تم پر قربان ہوں تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہو علی کے مشابہ نہیں ہو۔

حضرت علی یہ سن کر ہنسنے لگے۔

ایک دفعہ حضرت ابو بکر صدیق منبر نبوی پر تشریف فرما تھے کہ حضرت حسن آئے اور

کہا میرے والد کی جگہ سے اترو۔

حضرت ابو بکر نے فرمایا بے شک خدا کی قسم یہ تمہارے والد ماجد کی جگہ ہے میرے باپ کی جگہ نہیں۔ یہ کہہ کر ان کو گود میں اٹھالیا اور رونے لگے۔

حضرت علی نے فرمایا خدا کی قسم یہ میرے اشارہ سے نہیں ہوا حضرت ابو بکر نے فرمایا واللہ میں آپ کو متہم نہیں کرتا۔

## حضرت ابو بکرؓ کا وصال اور حضرت عمرؓ کی خلافت

معیقیب بن ابی فاطمہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابو بکرؓ کے نفقات پر ملازم تھا۔ آپ جب مرضِ موت میں مبتلا ہوئے تو میں حاضر خدمت ہوا وہاں ایک صحابی کو آپ کے پاس تنہائی میں بیٹھے ہوئے پایا جو حضرت عمر کی خلافت کے متعلق اختلاف کر رہا تھا میں نے اس وقت لوٹنا چاہا لیکن جب آپ نے بیٹھنے کا اشارہ فرمایا تو میں بیٹھ گیا اتنے میں ان کی باہمی گفتگو زور سے ہونے لگی اور حضرت ابو بکر نے غصہ سے فرمایا خدا کی قسم یہ کام بغیر سوچے و سمجھے نہیں کیا گیا بلکہ عمر تمہارے لئے تم سے بہتر ہیں اور تم اپنے لئے سراسر شر و فساد ہو۔ واللہ اگر میں تجھے حاکم بنادوں تو تو اپنی ناک کو گدی کے پیچھے لگالے (یعنی حق سے اعراض کرکے باطل کی طرف متوجہ ہوجائے اور اپنی حیثیت سے زیادہ اپنے کو اونچا سمجھنے لگے) تو میرے پاس آنکھیں ملتا ہوا اس لئے آیا ہے کہ مجھے میری رائے سے باز رکھے اور میرے دین میں رخنہ ڈالے خدا تجھے کھڑا ہونے کی بھی توفیق نہ دے واللہ اگر مجھے معلوم ہوا کہ تو نے عمر کی تحقیر یا بدگوئی کی تو تجھے شہر بدر کرکے تلخ چراگاہوں میں بھیج دوں گا جہاں چرو گے اور سیر نہ ہوگے۔ پانی پیو گے اور سیراب نہ ہوگے۔ اس پر وہ شخص اٹھ کر چلا گیا پھر میں نے آپ کے قریب ہوکر سلام کیا اور کیفیت مزاج دریافت کی آپ نے سلام کا جواب دیا اور مزاج کی کیفیت بیان فرمائی اتنے میں اطلاع دی گئی کہ دروازہ پر حضرت عثمان اور حضرت علی حاضر ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آپ ان کو اندر آنے کی اجازت نہ دیں گے مگر آپ نے اجازت دے دی۔ وہ اندر آئے سلام کیا اور مزاج پرسی فرمائی آپ نے سلام کا جواب دیا اور کیفیت مزاج بیان فرمائی پھر فرمایا شاید تم بھی عمر کے متعلق وہی کہو گے جو فلاں شخص ابھی کہہ گیا ہے۔

انھوں نے عرض کیا خلیفۂ رسول اللہ وہ شخص کیا کہہ گیا؟

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اس کے خیال میں عمر ادنی گھرانے کا آدمی ہے اور بعد میں اسلام لایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت کم فائدہ پہنچا ہے۔ حضرت عثمان نے فرمایا خدا کی قسم اس نے بہت نازیبا کہا۔ اے خلیفۂ رسول اللہ عمر ویسے ہی ہیں جیسا آپ چاہتے ہیں اور آپ کی منشار کے مطابق ہیں علاوہ ازیں وہ نہایت جری اور قوی ہیں اور مؤمنینِ سابقین سے ہیں۔

حضرت علی نے فرمایا اس شخص نے جھوٹ بولا اور بہت سخت کہا۔ اگر آپ نے عمر کو خلیفہ بنا دیا تو وہ آپ کے خیال اور منشا کے مطابق نکلیں گے پھر وہ آپ کے ساتھ کام بھی کر چکے، آپ ان کی رائے پر چلتے تھے اور اس کو قبول کرتے تھے آپ کا جوار اذ ہو کر گزر ئے اور لوگوں کے کہنے سننے کی پروا نہ کیجئے۔ اگر عمر آپ کے گمان کے مطابق نکلے اور انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا تو آپ کا مقصد پورا ہو گیا اور اگر خدانخواستہ آپ کے گمان کے برعکس نکلے تو مقصد خیر ہی تھا۔ پھر وہ دونوں حضرات تشریف لے گئے اور آپ نے مجھ سے فرمایا معیقیب قریب ہو جاؤ اور بتلاؤ لوگ عمر کے متعلق کیا کہتے ہیں؟

میں نے عرض کیا اے خلیفۂ رسول اللہ کچھ لوگ ان کو پسند کرتے ہیں اور کچھ ناپسند کرتے ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ زائد کون ہیں؟

میں نے عرض کیا ناپسند کرنے والے۔

یہ سن کر فرطِ غم سے خاموش ہو گئے میں اپنی اس زیادتی پر بہت پشیمان ہوا اور سوچ میں رہا کہ اس کی تلافی کس طرح کروں اس لئے کہ حضرت عمرؓ میرے خصوصی دوستوں میں سے تھے کہ اتنے میں حضرت عمرؓ کے دروازہ پر حاضر ہونے کی اطلاع دی گئی آپ نے ان کو اندر بلا لیا۔ حضرت عمرؓ نے آکر سلام کیا آپ نے سلام کا جواب دیا پھر حضرت عمر نے مزاج پرسی کی آپ نے مزاج کی کیفیت بیان فرمائی اور فرمایا عمر بعض لوگ تمھیں پسند کرتے ہیں اور بعض ناپسند اور اکثر شر ہی لوگوں کو پسندیدہ ہوتی ہے اور خیر ناگوار گزرتی ہے۔

حضرت عمرؓ نے عرض کیا اے خلیفۂ رسول اللہ اس منصبِ خلافت کو مجھ سے علیحدہ کیجئے مجھے اس کی حاجت نہیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا لیکن خلافت کو تمھاری ضرورت ہے۔ اگر تمھارے سے کسی کی حق تلفی ہو جائے تو اس وقت تک اپنے ہاتھ کو اپنے منہ سے جدا رکھنا (یعنی کھانا نہ کھانا) جب تک کہ حق دار کا پیٹ نہ بھر جائے اور اس کا حق اس تک نہ پہنچ جائے۔ اگر ذاتی ضروریات تمھیں لوگوں کے مال میں شریک ہونے پر مجبور کر دیں تو اپنا روزینہ مقرر کر لینا لیکن اپنے کو ترجیح نہ دینا۔ اور کبھی مال جمع نہ کرنا۔ مال آنکھوں کو بھلا لگتا ہے اور دل اس طرف مائل ہوتا ہے امیر کا مال جمع کرنا اس کے خون کو بہا دیتا ہے اور اس کو ہلاک کر دیتا ہے اور اس کے دین کو ضائع اور برباد کر دیتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا آپ کے لئے گھبرانے اور مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ آپ کے لئے بہترین دن وہ ہوگا جب اللہ ربُّ العزت سے ملاقات ہوگی۔

حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا میری بھی یہی تمنا ہے اور مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ اسی مرض میں پوری ہوگی، اس لئے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خواب دیکھا تھا کہ مجھ پر تین دفعہ غشی طاری ہوئی اور تیسری دفعہ قے ہو کر سب کھانا نکل گیا۔ اس کے بعد میں دو مرتبہ بیمار ہو چکا اور یہ تیسری مرتبہ ہے بس اب میں جلد ہی جانے والا ہوں انشاء اللہ تعالیٰ۔

پھر حضرت ابو بکرؓ نے مجھ سے فرمایا معیقیبؓ ہمارا اور تمھارا کیا حساب ہے؟ میں نے عرض کیا میرے آپ کے ذمہ پچیس[25] درہم نکلتے ہیں اور آپ ان سے سبکدوش ہیں

آپ نے فرمایا ٹھہرو جلدی نہ کرو کیوں دنیا کو ہماری ساتھ کرتے ہو۔ پھر فرمایا میرے خیال میں یہ ہمارا اور تمھارا آخری معاملہ ہے۔ یہ سن کر میں رونے لگا۔

آپ نے فرمایا رو مت مجھے امید ہے کہ میں خیر کی طرف جاؤں گا اور ہمیشہ خیر ہی میں رہوں گا۔

پھر حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ عائشہ کے پاس سے پچیس[25] درہم لے آؤ۔ وہ دراہم لے آئی اور میں نے ان کو لے لیا۔ اس کو تھوڑی دیر بھی نہ گذری تھی کہ آپ کا وصال ہو گیا۔ بے شک آپ خیر کی طرف چلے گئے اور ہمیشہ خیر میں رہیں گے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ جب بیمار ہوئے تو آپ گھر کی ایک کھڑکی میں سے لوگوں کی جانب

متوجہ ہوئے اور فرمایا میں تمھارے سے ایک عہد لینا چاہتا ہوں کیا تم اس پر راضی ہو؟
لوگوں نے عرض کیا "خلیفۂ رسول اللہ" ہم راضی ہیں۔ پھر حضرت نے کھڑے ہو کر فرمایا۔ ہم عمرؓ بن الخطاب کے علاوہ کسی دوسرے سے راضی نہیں۔
جب حضرت ابوبکر صدیقؓ مرض الموت میں مبتلا ہوتے (حق تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور امت محمدیہ کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے)
اس وقت آپ نے صحابہ کے پاس قاصد بھیجا اور بیں منتخب چیدہ صحابہ کو بلایا۔ دس مہاجرین اولین میں سے جن میں حضرت عمرؓ بن الخطاب اور حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر وغیرہ وغیرہ عمائدین قریش تھے اور انصار میں سے حضرت سعد بن مالکؓ اور حضرت خزیمہ بن ثابت اور حضرت ابوطلحہؓ اور حضرت ابوایوب انصاریؓ اور حضرت سعد بن عبادۃ وغیرہ وغیرہ سرداران انصار تھے۔ یہ سب حضرات صحابہ کرام جمع ہو کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں پہنچے۔ اس وقت آپ کو ایک چادر اڑھا رکھی تھی اور ایک چادر آپ کے نیچے بچھا رکھی تھی اور آپ کے سرہانے ایک پیالہ رکھا ہوا تھا جس میں گیہوں تھے یا کھجور اور جو کے ٹکڑے۔
جب سب حضرات بیٹھ گئے تو حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا مجھے سہارا لگا کر بٹھا دو۔
لوگوں نے سہارا لگا کر آپ کو بٹھایا جسم پر گوشت کا نام نہ تھا ہڈیوں اور کھال کے سوا کچھ نہ تھا سر اور جسم کے بال جھڑ گئے تھے صرف ایک نحیف اور ناتواں جثہ تھا۔ آپ کا یہ حال دیکھ کر سب رونے لگے۔
آپ نے فرمایا خدا تم سب پر رحمت نازل فرمائے کیوں روتے ہو؟
صحابہ نے عرض کیا آپ کی اس ظاہری حالت پر، سارا جسم دبلا ہو گیا اور بال جھڑ گئے اور ساری رعنائی اور خوب صورتی جاتی رہی۔
حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا "جس شخص کو جہنم کی آگ میں جھونکے جانے کا خطرہ ہو جس کا عذاب دائمی ہے جس کی رسوائی بڑی رسوائی ہے جس میں رہنے والوں کا کام ہر وقت کو دونے سے چلانا اور واویلا کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہ حالت کچھ بھی نہیں اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی مدد اور رحمت اور مغفرت اور عفو و درگذر سے امید واثق ہو کر جنت تک پہنچ جائے گا۔ اور جو اس میں پہنچ گیا وہ تمام نعمتوں سے سرفراز ہو گیا اور تمام آفتوں سے محفوظ ہو گیا اور

ہر قسم کی تکالیف سے مامون ہو گیا۔ اور جس کو حق تعالیٰ خوش کر دیں اور وہاں کی راحت و فرحت سے نواز دیں تو جو حالت تم دیکھ رہے ہو ذرا بھی قابلِ التفات نہیں۔ پھر آپ کو غش آ گیا اور قریب تھا کہ آپ گر جائیں حضرت علی مرتضیٰؓ نے فوراً کپڑ کر آپ کو تھاما اور اپنے سینے سے لگا کر بٹھا دیا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا "ابو الحسن جو کچھ تم نے کیا حق تعالیٰ تمھیں اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔ اگر تم مجھے سہارے سے بٹھانا چاہتے ہو تو گھر کی دیوار سے سہارا لگا دو۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے آپ کو دیوار کے سہارے سے بٹھا دیا اور آپ کے پیچھے چادر رکھ دی۔ آپ نے بیٹھ کر حاضرین کی طرف دیکھا اور نگاہ جما کر دیکھا اور دیر تک دیکھتے رہے پھر آپ پر گریہ طاری ہو گیا آپ کو روتا دیکھ کر سب پر اس قدر گریہ طاری ہوا کہ بے ساختہ چیخیں نکلنے لگیں عورتیں بھی پس پردہ بے اختیار رو رہی تھیں اور آواز باہر آ رہی تھی۔

پھر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ضبط کر کے اپنے کو سنبھالا اور اشارہ سے عورتوں کو منع فرمایا وہ خاموش ہو گئیں اور مرد بھی کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے پھر آپ نے فرمایا گروہ مہاجرین و انصار پردہ ہٹ گیا اور دھوکہ کھل گیا اور وہ وقت آ گیا جس کا کوئی دفعیہ نہیں۔ جاءت سکرۃ الموت بالحق اناللہ وانا الیہ راجعون کوئی شخص موت سے نہیں بچ سکتا موت کے سوا کوئی ٹھکانہ اور چارہ کار نہیں۔ جس یقینی امر سے ڈرایا گیا تھا وہ قریب آ گیا۔

قیامت میں زیادہ قابلِ حسرت بد نصیب و بدحال جس کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہوگا وہ شخص ہے جو اپنی آخرت کو دوسرے کے دنیاوی منفعت کے عوض فروخت کر ڈالے اور موت کے وقت جب کہ اپنے پروردگار کے سامنے جا رہا ہو پروردگار عالم کو دھوکہ دینا چاہے میں اس وقت حق تعالیٰ سے اپنے لئے بہترین ٹھکانہ کا طلب گار اور امیدوار ہوں اور اخروی زندگی کے زیادہ قریب ہوں تمھیں خدا کے حوالہ کرتا ہوں اور دعاء کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ تمھیں بہترین خلیفہ عطا فرمائے۔

پھر فرمایا میں نے اس رات دس ہزار مرتبہ استخارہ کیا اور جناب باری سے التجا کی کہ مجھے ایسے شخص کی جانب رہنمائی فرما جس سے تو راضی ہو تا کہ میں اپنے بعد یہ کام اس کے حوالہ کر دوں۔ پھر آخر شب میں کچھ دیر کے لئے آنکھ لگ گئی۔ اب میں تمھیں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں اور اپنی بات میں بالکل سچا ہوں اگر ذرا بھی جھوٹ ہو تو یہی جھوٹ میری تباہی کے لئے کافی ہوگا

جھوٹ بولنے یا اپنی طرف سے کوئی بات بڑھانے سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

حاضرین نے عرض کیا "خلیفہ رسول اللہ بے شک آپ بالکل سچے ہیں"

آپ نے فرمایا میں نے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپ دو سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے جن کی آستین پر سجی ہوئی تھی ایک نور چمک رہا تھا جو آنکھوں کو چکا چوند کر رہا تھا۔ آپ کے ہمراہ دو شخص اور تھے ایک دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب اور آپ وسط میں تھے یہ دونوں بھی عمدہ پوشاک پہنے ہوئے تھے جس سے نور پھیل رہا تھا۔

میں نے ان جیسا آدمی کبھی نہیں دیکھا کوئی بلند مرتبہ معلوم ہوتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سلام کیا اور مجھ سے مصافحہ کیا پھر میرے سینہ پر اپنا دست مبارک رکھا جس سے وہ کرب و بے چینی جو میں محسوس کر رہا تھا جاتی رہی میں اب تک آپ کے دست مبارک کی ٹھنڈک محسوس کر رہا ہوں۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "ابو بکر تمھاری ملاقات کا شوق بڑھ گیا کیا تم بھی ہمارے مشتاق ہو؟

میں خواب میں خوب رویا جس کی بعد میں گھر والوں نے بھی خبر دی اور عرض کیا واشوقاہ الیک یا رسول اللہ (آہ یا رسول اللہ آپ کی ملاقات کا شوق)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھوڑی دیر بعد ہماری ملاقات ہوگی۔ ابو بکر حق تعالیٰ نے تمھارے معاملہ میں تمھیں خیر کی جانب رہنمائی فرما دی اب جو کچھ تمھارے دل میں آئے گا وہ بھی اللہ کی جانب سے ہے۔

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں مرنے کے قریب ہوں اب آپ کی امت کے لئے کس کو خلیفہ مقرر کروں؟ اور کس کو عوام کا حکمراں بناؤں؟ اور یہ ہار کس کے گلے میں ڈالوں؟

یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں نے آج استخارہ کیا ہے اور مجھے انشاء اللہ بہتراتی کی امید ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عادل صادق صاحب قوت و حرکت جن سے زمین و آسمان والے سب خوش ہیں۔ راہ راست پر چلنے والے متقی و پرہیزگار جن کا تقویٰ مقبول و مبرور ہے۔ عمر بن الخطاب تمام صحابہ سے افضل اور خلافت کے مستحق ہیں۔

پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں ہمراہیوں نے کہا اس کے بعد خدا کا فیصلہ

اور حکم نافذ ہو کر رہے گا۔ یہ دونوں (یعنی حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما) دنیا میں آپ کے وزیر رہے اور آپ ہی کے پاس مدفون ہوں گے اور جنت میں آپ کے قریب تر ہوں گے

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا اور ان دونوں نے بھی سلام کیا اور مجھ سے کہا تم مکروہات سے محفوظ ہو گئے اور بالکل پاک و صاف ہو گئے اب زمین و آسمان اور انسانوں اور فرشتوں میں تم "صدیق" ہو۔

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یہ کون ہیں؟ ان جیسا آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے ہیں" آپ کا اشارہ حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہ السلام کی طرف تھا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے گئے جب میں بیدار ہوا تو آنسو میرے چہرے اور ڈاڑھی پر بہہ رہے تھے اور گھر والے میرے گرد اور سرہانے کھڑے ہوئے مجھ پر ترس کھا رہے تھے انھیں کیا معلوم کہ میں نے کیا دیکھا اور کیوں رو رہا ہوں؟ میں پھر بن دیکھی اور بے سمجھی خبر دینے سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں اور آج تمھارے سے ایک عہد لینا چاہتا ہوں کیا تمھیں یہ پسند ہے

سب خاموش رہے اور حضرت علی مرتضیٰ نے فرمایا ہم عمر بن الخطاب کے علاوہ کسی کو پسند نہ کرتے اب آپ کی پسندیدگی نے ہماری پسند کو اور تقویت پہنچادی۔ حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت علی مرتضیٰ کے متعلق چند کلمات خیر فرمائے پھر حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا میں تمھارے پر عمر بن الخطاب کو حاکم بناتا ہوں تم ان کی بات کو سنو اور ان کی اطاعت کرو اور یاد رکھو ان کی رہنمائی میں ہر گز منتشر اور برباد نہ ہو گے۔ حضرت ابو طلحہ کے قریبی رشتہ دار ہونے کی وجہ سے سب کا خیال تھا کہ حضرت ابو بکر ان کو خلیفہ بنائیں گے جب آپ نے خلاف توقع حضرت عمر کو خلیفہ بنایا تو انھوں نے عرض کیا خلیفہ رسول اللہ قیامت کے دن اس کا بھی آپ سے سوال ہو گا لہٰذا امت کے لیے اچھی طرح غور کر لیجئے۔

حضرت علی نے فرمایا "طلحہ ہم عمر بن الخطاب کے علاوہ کسی کی بات سن سکیں گے اور نہ کسی کی اطاعت کر سکیں گے پھر فرمایا۔ واللہ عمر کے سوا کوئی اس بوجھ کو نہیں اٹھا سکتا بلکہ عمر جیسا بھی اس کا تحمل نہیں کر سکتا۔ اور ابو بکر کے بعد عمر کے سوا کوئی بھی خلافت کے لئے موزوں نہیں۔ حق گوئی۔ راست بازی۔ پاک دامنی پرہیزگاری۔ امانت داری۔ منافقوں پر درشتی۔ مسلمانوں پر نرمی وغیرہ وغیرہ اوصاف میں عمر سب سے ممتاز ہیں۔

واللہ عمرؓ وہ شخص ہیں جو اسلام لا کر کبھی مذبذب نہ ہوئے۔ قتال کیا اور کبھی سست نہ ہوئے۔ مشقتوں کو برداشت کیا اور کبھی پشت نہ پھیری۔ اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور کبھی بخل نہ کیا۔

پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔

خلیفہ رسول اللہ جس سے آپ خوش اس سے ہم بھی خوش ہیں اور جو آپ کی خواہش ہے وہی ہماری بھی خواہش ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے امت محمدیؐ سے کسی خیر و بھلائی اور نصیحت و خیر خواہی کی بات کو کبھی پوشیدہ نہیں رکھا اللہ تعالیٰ آپ کو امت محمدیہ کی طرف سے بہترین جزائے خیر عطا فرمائے اور آپ کو آپ کی آرزو اور آپ کی تمنا اور آپ کے وہم و گمان سے بہت زیادہ الطاف و انعامات سے سرفراز فرمائے۔

پھر سب لوگ آپ سے رخصت ہو کر چلے گئے اور مجمع منتشر ہو گیا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں جب سب لوگ چلے گئے تو میں اور میری سوتیلی مائیں آپ کے پاس حاضر ہو گئے ایک چادر آپ کے لئے بچھا رکھی تھی اس پر آپ کو لٹا دیا اور دوسری چادر اڑھا دی۔ آپ نے فرمایا میں اس وقت مرض میں کمی محسوس کرتا ہوں جی چاہتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤں پھر آپ سو گئے ہم سمجھے کہ شاید پھر غشی طاری ہو گئی اور آپ کو اسی حال میں چھوڑ کر چلے گئے۔ ابھی تھوڑی دیر بھی نہ گذری تھی کہ باہر سے ایک بلند آواز سنائی دی جس سے آپ گھبرا کر بیدار ہو گئے اور صاحبزادہ سے فرمایا "بیٹا دیکھو دروازہ پر کون ہے؟ وہ باہر گئے اور واپس آ کر کہا بعض مسلمان ملاقات کے لئے آئے ہیں۔

آپ نے فرمایا "ان کو اندر بلا لو"

صاحبزادہ نے ان کو اندر بلایا۔ وہ ہنستے کھل کھلاتے اندر داخل ہوئے سلام کیا اور مزاج پرسی کی۔ آپ نے ان کے سلام کا جواب دیا پھر دیر تک حق سبحانہ وتعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا پھر فرمایا تم لوگ جمع ہو کر ہنستے کھل کھلاتے کیوں آئے ہو اور کیا سرگوشیاں کر رہے ہو؟ جو تمہارے دل میں ہے صاف صاف زور سے کہو چھپاؤ نہیں وہ واضح اور کھلی بات ہے جو تم دل میں لئے بیٹھے ہو۔

انہوں نے عرض کیا "خلیفہ رسول اللہ آپ نے عمر جیسے سخت ؏ مزاج کو خلیفہ بنا دیا۔

---

؏ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی امور حق میں سختی اور اپنے عزم میں پختگی کے باعث بعض صحابہ کرام ان سے ڈرتے تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی نرم خو سہولت پسند خلیفہ مقرر ہو۔ حضرت ابوبکر اور

اللہ تعالیٰ کے روبرو جب آپ پیش ہوں گے اور آپ سے اس کے متعلق سوال ہوگا تو آپ کیا جواب دیں گے اور کیا دلیل پیش کریں گے؟

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر یہ سن کر بہت غصہ ہوئے میں نے اُن کو اس قدر غضب ناک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ مجھے ان کا یہ غصہ اچھا معلوم ہوا پھر فرمایا: پھر کیا تم مجھے میرے پروردگار کی دھمکی دیتے ہو؟ اگر اس ذوالجلال والاکبر نے مجھ سے اس کے متعلق سوال کیا تو عرض کروں گا میں نے ایسے شخص کو حاکم بنایا جو سب سے بہتر اور اعلیٰ تھا اور تیرے بندوں میں سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار تھا اور اہل زمین میں سب سے زیادہ تیری مرضیات کا شناسا تھا۔

خدا کی قسم جو کچھ ہونا تھا وہ آج مجھ سے صادر ہو چکا اور توحید اور ادائے فرائض کے بعد مجھے اپنے کسی عمل پر اتنا وثوق اور اطمینان نہیں۔ جتنا عمر کو خلیفہ بنانے پر ہے پھر تم عمر کو کسی عیب کی وجہ سے ناپسند نہیں کرتے بلکہ اس لئے ناپسند کرتے ہو کہ وہ انصاف پسند اور صلح جو ہے دھوکہ باز اور زمانہ ساز نہیں اُن کا باطن نفاق سے پاک و صاف ہے اور ان کا ظاہر قوت کے ساتھ حق سے وابستہ ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق کے یہ ارشادات سن کر ان سب نے بھی حضرت عمر کی تعریف کی گویا وقتی تاثر کے باعث مشتعل چنگاریاں تھیں جن پر پانی ڈال دیا گیا پھر وہ لوگ آپ کے پاس سے چلے گئے اور سارے میں مشہور ہو گیا کہ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو خلیفہ مقرر کر دیا۔

جب یہ لوگ آپ سے رخصت ہو کر چلے گئے تو آپ نے آدمی بھیج کر حضرت عمر کو بلایا اور تنہائی میں ان سے فرمایا، عمر تمہیں ایک وصیت کرتا ہوں اور ایسی بات بتاتا ہوں کہ اگر تم نے اس کو محفوظ رکھا تو مجھے امید ہے کہ تم اس بارِ (خلافت) کی ذمہ داریوں سے محفوظ رہو گے اور اس بوجھ سے سبکدوش رہو گے۔

حضرت عمر نے فرمایا، خلیفہ رسول اللہ ضرور فرمایئے میں اس کو غور سے سنوں گا جو کچھ آپ مجھ سے مطالبہ کریں گے اس کو پورا کروں گا اور جو آپ حکم دیں گے انشاء اللہ اس کی پابندی کروں گا۔

---

بحیثیت حضرت علی چونکہ سمجھتے تھے کہ بغیر اس کے کارِ خلافت سرانجام نہیں ہو سکتا اس لئے وہ اپنی رائے پر استقلال کے ساتھ جمے ہوئے تھے۔ ۱۲

حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا اللہ وہ ذات پاک ہے جس نے مخلوق کو اپنی قدرت سے پیدا کیا اور اپنی منشا کے موافق بنایا وہ ذات وحدہ لاشریک لہ ہے اللہ تعالیٰ کا جو حکم رات کے متعلق ہوتا ہے وہ دن کو مقبول نہیں ہوتا اور جو حکم دن کے متعلق ہوتا ہے وہ رات کو مقبول نہیں ہوتا۔ اور جب تک فرائض خداوندی ادا نہ ہوں نفلی کام قبول نہیں ہوتے۔ قیامت میں ان لوگوں کی ترازو بھاری اور وزنی ہوگی جن کا شیوہ حق کی پیروی اور پابندی ہو اور حق ان کے لئے سہل اور آسان ہو۔ جس ترازو میں حق کے سوا کچھ نہ ہو اس کا وزنی ہونا برحق اور بدیہی ہے اور ان لوگوں کی ترازو ہلکی ہوگی جو باطل کی پیروی کرتے ہیں اور باطل ان کے لئے آسان ہے جس ترازو میں باطل کے سوا کچھ نہ ہو اس کا ہلکا پھلکا ہونا کھلی بات ہے۔ اس کو ہلکا ہی ہونا چاہیئے حق تعالیٰ نے اہل جنت کا اچھے اعمال کے ساتھ اسی طرح تذکرہ فرمایا کہ ہر شخص یہ سمجھ جائے کہ ان کے علاوہ اور کوئی بھی حق تعالیٰ کی بارگاہ میں مرغوب اور پسندیدہ نہیں اور اس رتبہ کو بغیر رحمتِ خداوندی اور عنایت، تقویٰ و پرہیزگاری اور اوامر خداوندی کی پابندی اور منہیات سے رستگاری کے بغیر کوئی شخص بھی حاصل نہیں کرسکتا

پھر حق تعالیٰ نے دوزخیوں کے بُرے اعمال کا تذکرہ فرمایا اور ان کے اچھے اعمال کو اس لئے رد فرما دیا کہ وہ خلوص سے خالی تھا اور ان کو کرنے والے منہیات سے نہ بچتے تھے تاکہ ہر ایک ان سے بہتر بننے کی خواہش کرے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے نبی صادق مصدوق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر آیت رحمت اور آیت عذاب دونوں نازل فرمائیں چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۔ بلاشک تمہارا پروردگار لوگوں کی بخشش کرنے والا ہے ان کے ظلم کی بنا پر

دوسری جگہ ارشاد ہے

اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۔ بلاشک تمہارا پروردگار سخت گرفت کرنے والا ہے

تاکہ مومن ہر وقت رحمتِ خداوندی کا امیدوار بھی رہے اور عذاب الٰہی سے خوف زدہ بھی رہے اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑے اور اللہ تعالیٰ سے ناحق بات کی امید اور تمنا رکھے۔

عمر اگر تم نے میری وصیت کو محفوظ رکھا تو محبوب چیز نظر میں موت سے زیادہ کوئی شے

تمھیں محبوب نہ ہوگی اور موت کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ اور اگر تم نے میری وصیت کو ضائع کر دیا تو کوئی غیب دار چیز موت سے زیادہ تمھیں مبغوض نہ ہوگی اور تم موت سے کسی طرح بچ نہیں سکتے"

حضرت عمرؓ نے فرمایا خلیفۂ رسول اللہ میں نے آپ کی وصیت کو قبول کیا اور میں انشاء اللہ آپ کے فرمان کو مضبوط پکڑے رہوں گا۔

پھر حضرت عمر روتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوئے اور کہتے جاتے کم بخت عمر جس کام کو تو نے قبول کر لیا اس سے تیری خلاصی کس طرح ہوگی اور اس بار گراں کا تحمل کیوں کر ہوگا پھر خود ہی فرمایا خلاصی پرہیزگاری میں ہے اور نجات دنیا سے بے رغبتی میں ہے۔ اے نفس خشوع وخضوع کی کوشش کر اور بھوک، پیاس پر صبر اختیار کر۔

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں ابو بکرؓ کی جان آفریں کی قسم ابو بکر کا آخر وقت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر وقت کے مشابہ گذرا آپ درمیانی رات میں اٹھے اور فرمایا عائشہ وہ کپڑا کہاں ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک ڈھکا گیا تھا۔ آپ نے اس کو لیا اور اپنے چہرہ پر رکھا اس کی خوشبو سونگھی اور فرمایا اگر تم جھٹلاؤ نہیں تو مجھا پنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو آرہی ہے۔ پھر اپنا چہرہ قبلہ رخ کیا اور کہا اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی سَکَرَاتِ الْمَوْتِ وَشِدَّۃِ الموت وَغفر الموت

پھر آپ کو خوب پسینہ آیا اور اس محراب پر نگاہ جم گئی جس میں آپ نماز پڑھا کرتے تھے اور چند بار فرمایا۔

وَجَآءَتْ سَکْرَۃُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ — اور موت کی سختی (قریب آپہونچی) یہ (موت)
ذٰلِکَ مَا کُنْتَ مِنْہُ تَحِیْدُ — وہ چیز ہے جس سے تو بدکتا تھا۔

پھر کچھ افاقہ ہوا اور پتلی اپنی جگہ پر آگئی اور دیر تک کلمہ شہادت اور درود پڑھتے رہے پھر صلی اللہ علیک صلوٰۃ طیبۃ مبارکۃ پڑھا۔ اس کے بعد نگاہ قبلہ کی طرف پھر گئی اور بلند آواز سے کہا اللہ کے فرشتو اور میرے پروردگار کے قاصدو! السلام علیکم پھر آہستہ سے چند بار کہا لبیک لبیک من داع وسعدیک (اے بلانے والے میں حاضر ہوں)۔ پھر منہ کھولا اور بند کر لیا اور واصل بحق ہو گئے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

آپ کے دفن کے متعلق صحابہ کرام میں اختلاف رائے ہوا بعض نے بقیع غرقد کی رائے

دی اور بعض نے مدفن شہداء کو پسند کیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا نہیں میں اپنے گھر اپنے حجرہ میں اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن کردں گی اور دونوں حضرات کی قبور کی زیارت سے ان کی یاد تازہ رکھوں گی۔

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک دم سب پر نیند کا غلبہ ہوا اور اونگھ طاری ہو گئی۔ اسی حال میں ایک غیبی آواز سنی ضمّوا الحبیب الی الحبیب دوست کو دوست سے ملادو۔ ہم نے سر اٹھایا تو کوئی نظر نہ آیا البتہ آواز سب نے سنی حتیٰ کہ جو لوگ مسجد میں تھے انھوں نے بھی سنی۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن کرنا طے ہو گیا تو جو شخص بقعہ انور پر نظر ڈالتا نگاہیں خیرہ ہو جاتیں اور قبر کا کھودنا مشکل ہو گیا۔

حضرت علی نے فرمایا رات تک ٹھیر جاؤ جب رات ہو گئی تو حضرت علیؓ نے گورکن کے چہرے پر کپڑا ڈال کر اس کو حجرۂ منورہ میں داخل کیا اس نے اپنے چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے قبر اطہر و انور کی جانب پشت کر کے قبر کھودنی شروع کی۔

حضرت علی نے گورکن کو حکم فرمایا کہ جلدی کرو زیادہ دیر نہ لگے۔

باقی لوگ باہر کھڑے رہے جب لحد تیار ہو گئی تو آپ کے صاحبزادوں اور گھر والوں نے آپ کو قبر میں اتارا اور مٹی ڈال دی۔

--

# اسلام اور ہندومت

اسلام اور ہندومت کی بعض مشترک تعلیمات

ـــــــ مناظر احسن گیلانی



ہندو مذہب بلکہ ہندی مذاہب پر ہم اچھی طرح بھرپور طور سے اردو والوں کے سامنے اور پھر عزیزانِ وطن کے سامنے وہ سب کچھ پیش کر دینا چاہتے ہیں جس سے عزیزانِ وطن کی آنکھیں کھل جائیں کہ اردو کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہ تو پورے ہندوستان کی زبان ہے نہ پوری طرح سیکولر! لیکن فی الحال اس مسئلہ کو چھیڑنے سے قبل بطور دیباچہ مولانا گیلانی کی ایک معرکۃ الآرا تحریر پیش خدمت ہے۔

ادارہ

# اسلام اور ہندو مذہب کی بعض مشترک تعلیمات

از

ازمولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

"تناسخ اور اس کے ذریعہ نجات کے عقیدے کی تعلیم آپ نے (یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے) نہین دی، بہشت و دوزخ وغیرہ باتین عیسائیون اور یہودیون کے مذہب جیسے دہنی دین"

(ابھینو ڈل اتہاس ص ۴۴)

یہ ہے وہ علم جو اس وقت اس ملک کے آزاد ہونے کے بعد بھی ہمارے بچون کو سکھایا جا رہا ہے، مذکورہ بالا کتاب (ابھینو ڈل اتہاس) بہار کے اسکولون کے نصاب مین شریک ہے، مصنف کا نام بھولا داس بی اے ال ال بی ممبر بہار ریسرچ سوسائٹی ہے، کتاب ابھینو گرنتھا گار کی شائع کی ہوئی ہے،

جو فقرے اس کتاب کے آپ کے سامنے پیش کئے گئے ہین، اُن کو پڑھ کر پہونچنے والے انھین ہی نتیجون تک پہنچ سکتے ہین، کہ

۱۔ مسلمانون کی آمد سے پہلے ہندوستان مین جو لوگ آباد تھے، اور ویدک دھرم کے قائل تھے، اُن کے اس دھرم مین صرف تناسخ کا عقیدہ پایا جاتا ہے، اور بہشت و دوزخ وغیرہ عقائد سے اس دھرم کو کوئی تعلق نہین ہے،

۲۔ عیسائیون اور یہودیون کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد نیکی اور بدی کے نتیجے اُن کے سامنے بہشت و دوزخ کی شکل مین سامنے آئین گے،

دوسری بات یعنی عیسائیون اور یہودیون کے ذہن مین مرنے کے بعد بہشت و دوزخ کا عقیدہ پایا جاتا ہے، اور اسلام مین بھی یہی مانا جاتا ہے، کیا یہی واقعہ ہے؟ یہودیون کا حال تو یہ ہے کہ اُن کے دین کی بنیادی کتاب توراۃ، مرنے کے بعد جی اٹھنے کے عقیدہ سے خاموش ہے، نیکی اور بدی کے صلہ مین فلسطین کی سرزمین کا وعدہ اس کتاب مین پایا جاتا ہے، جس مین بار بار دہرایا گیا ہے کہ اسی ارض موعود مین شہد اور دودھ کی نہرین بہتی ہین، خدا کے حکمون کو مانو گے، تو اس سرزمین پر تمھارا قبضہ قائم رہے گا، باقی عیسائی مذہب سو اس مین مرنے کے بعد کی زندگی کا ذکر ضرور کیا گیا ہے، لیکن عیسائیون کا عقیدہ ہے کہ نیک آدمی مرنے کے بعد فرشتہ بن جاتا ہے، اور بدکار شیطان اور بھوت بن جاتے ہین، یہی وجہ ہے جو قرآن کی حیثیت پر عیسائی اس لئے چین بہ جبین ہوئے ہین کہ فرشتہ کی زندگی کو جنات و انہار و حور و قصور سے کیا تعلق،

باقی پہلی بات یعنی ہندوستان کے باشندے اسلام کے پیش کئے ہوئے عقیدے جنت و دوزخ سے قطعاً ناآشنا اور ناواقف تھے، اُن کے دین مین نجات کا ذریعہ صرف تناسخ کو مانا جاتا تھا، اور اُس کے سوا بھی اسلامی تعلیمات کے دوسرے اجزاء کے متعلق دیکھئے، کہ ویدک دھرم کی تصریحات اس باب مین کیا ہین،

افسوس ہوتا ہے کہ اسلام اور ہندوؤن کے ویدک دھرم کا مقابلہ صحیح علمی روشنی مین نہین کیا گیا، ایک ہندو ودوان (عالم)، کے تاثرات تو آپ دیکھ چکے، خود مسلمانون کا بھی حال اس معاملہ مین یہ ہے کہ براہ راست ہندوؤن کی کتابون کے پڑھنے کا موقع جن لوگون کا نہین ملا ہے، سُنی سنائی باتون کو واقعات قرار دے کر اس قسم کی چیزین اُن کی کتابون مین بھی درج ہو گئی ہین، اور تو اور محمد بن عبد الکریم شہرستانی جنھون نے مذاہب و ادیان ہی پر اپنی مشہور کتاب ملل و نحل لکھی ہے، اس مین بعض مسلمانون کے اس خیال کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ برہمن کا لفظ برہما نامی جس شخص کی طرف منسوب ہے، یہ دراصل حضرت ابراہیم کے نام کا ایک ہندی تلفظ ہے، اس پر تنقید کرتے ہوئے شہرستانی نے لکھا ہے کہ یہ عجیب بات ہے، اس لئے کہ برہمنون

کا طبقہ جو ہندوستان میں پایا جاتا ہے، وہ تو

المخصوصون بنفی النبوات اصلا ورأسا [illegible] نبوات کے سلسلہ کا سرے سے منکر ہے

خدا ہی جانتا ہے کہ شہرستانی نے "براہمہ" یعنی برہمن، ہندوستان کے کن لوگوں کو سمجھ لیا، اور اُن کی طرف یہ عجیب و غریب عقیدہ منسوب کر دیا، کہ وہ نبوات و رسالات ہی کے سلسلہ کے سرے سے منکر تھے، حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ برہمنوں کے دین کی بنیادی کتاب وید کے متعلق عام عقیدہ اس کتاب کے ماننے والوں کا یہی ہے کہ خالق کائنات کی نازل کی ہوئی کتاب ہے، اور کیوں نہ جانئے مہابھارت جو عام طور پر ہر ہندو کے گھر میں اب بھی پڑھی جاتی ہے، اسی میں بہ کثرت اس قسم کی باتیں آپ کو مل سکتی ہیں، مثلاً:-

"پرمیشر (خدا) کی سانس سے وید اتپن (پیدا) ہوئے"

(اُدیوگ پرب ادھیائے)

یا اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ یہ ہیں کہ

"تپشری (عبادت گذار) لوگ بید بچن (وید کے الفاظ) کو بھگوان کا واک (کلام) جان کر اس پر دڑھ بدھی (استقامت اختیار کرتے) رہے ہیں"

(شانتی پرب حصہ سوم ۲۲ ادھیائے)

بہرحال وید کا برہما کے منہ سے نکلنا، ہندوؤں کے سناتن دھرم کا عام عقیدہ ہے اور خواہ شہرستانی کو اس کا علم نہ ہو، لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کے سربرآوردہ علماء اور صوفیہ بھی اپنی کتابوں میں اس قسم کی باتیں لکھتے رہے ہیں، حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور فقرہ جو مکتوبات مظہری میں پایا جاتا ہے کہ خالق کائنات نے اپنے رحم و فضل سے

"کتابے مسمی بہ بید کہ چہار دفتر است و مشتمل بر احکام نہی و امر و اخبار ماضی و مستقبل است"

بہ تو سمطا مگے بر ہما نام کہ آں جار حہ ایجاد عالم ست فرستاد" (ص ۱۹۰)

مرزا صاحب نے برہما کو بجائے ابراہیم علیہ السلام کے ملک یعنی فرشتہ قرار دیا ہے، لیکن بہر حال اس کی توتصریح فرمائی ہے کہ وید خدا کی نازل کی ہوئی کتاب ہے، یہی ہندوؤں کا عقیدہ ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ناواقفیت کی وجہ سے شہرستانی نے ہندوؤں کو سرے سے نبوات و رسالات کا منکر ہی ٹھہرا دیا، اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام اور ویدک دھرم کے تعلیمات میں کیا تعلق ہے؟ سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پر نہ ہندوؤں میں صحیح طور پر کام کرنے والوں نے اب تک کوئی قابل ذکر کام کیا ہے، اور جیسا کہ چاہیے مسلمانوں میں بھی اس مسئلہ کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا وہ قرار واقعی طور پر مستحق ہے۔ بطور ابتدائی و تمہیدی مضمون کے ایک مختصر سا مقالہ آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، غرض یہ ہے کہ کام کی راہ ممکن ہے ان لوگوں کے سامنے آجائے، جو ہندو مذہب کے مطالعہ کا ذوق رکھتے ہیں،

افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کے قدیم مذاہب و ادیان کے وثائق اور یادداشتوں کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے نہیں کیا گیا ہے، ورنہ ان ہی کتابوں میں نہیں جن کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کا عام رواج اس ملک میں باقی نہیں رہا ہے، اور اسی وجہ سے ان کے مطالب اور معانی کی صحیح یافت دشوار ہو گئی ہے لے بلکہ مہابھارت جیسی عام کتاب جس کا اب بھی تقریباً ویدک دھرم کے ماننے والوں کے گھر گھر میں پاٹ ہوتا ہے اور ہر کہہ و مہہ چھوٹے بڑے کی رسائی خود اس کتاب تک اور اس کے مضامین تک آسان ہے، اسی میں ایسی حیرت انگیز چیزیں مل جاتی ہیں کہ آدمی مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے، اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ قرآن کے ذریعہ سے جو کچھ دیا گیا ہے، اس کا بڑا حصہ اب بھی ہندوستان کے باشندوں کے اگلے بزرگوں کی کتابوں میں موجود

---

لے میرا اشارہ وید اور اپنشد وغیرہ ہندوستان کے قدیم دینی سرمایوں کی طرف ہے، وید کے متعلق پنڈت سندر لال جی نے اپنی کتاب "قرآن اور گیتا" میں جو حال میں شائع ہوئی ہے لکھا ہے کہ وید کی زبان اتنی پرانی ہو چکی ہے، کہ صحیح مطلب کا سمجھنا از بس دشوار ہے۔

ہے، قرآنی تعلیمات کا بنیادی مسئلہ، اور جوہری روح جیسا کہ سب جانتے ہیں، توحید ہے، یعنی بجائے مخلوقات کے عالم کے پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل مجدہٗ ہی کی عبادت پر اصرار یہی قرآن کا محوری پیغام ہے، اسی محور پر اس کے سارے مطالبات گردش کرتے ہیں، لیکن یہ تو قرآن میں ہے، اب مہابھارت کے بن پرب کا اکھتروان ادھیاے کا ترجمہ پڑھئے، جس میں جو مہابھارت کی جنگ کے گویا رستم تھے، اس مگاڈ کر کرتے ہوئے، کہ ایک دفعہ ہنومان جی نے بھیم سین کو اپنے درشن دیئے تو اس وقت قدیم ہند کے سناتن دھرم کی خصوصیت کو بتاتے ہوئے ہنومان جی نے جیسا کہ اسی کتاب میں ہے یہ کہا کہ

"کرت جگ جس کو ست جگ کہتے ہیں، اس میں سناتن دھرم جاری تھا"

سناتن دھرم جب اس ملک میں جاری تھا تو اس کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت ہنومان جی کے بیان کے مطابق کیا تھی، سنئے ہنومان جی کی طرف یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ

"اس جگ میں دھرم کا ناش نہیں ہوتا تھا، دیوتا، دانو، گندھرب، کھتر، بکش، رنش[1] ایک پرشوتم بھگوان کی پوجا کرتے تھے" (بن پرب ادھیاے)

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ اس ملک کے آباد کاروں کے آبا (اولین اگلے آبا و اجداد) کے دین کا جوہری عنصر توحید ہی تھا، اور خالق عالم جل مجدہٗ ہی کی ذات پاک اس ملک کا واحد معبود ہنومان جی کے زمانہ میں تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب ملک پر رام چندر جی حکومت کرتے تھے، لیکن یہ سلسلہ کب تک جاری رہا؟ بھیشم پتامہ جن کا ذکر علم و عرفان حسن و کردار و عمل کے مثالی وجود کی حیثیت سے اس رزمیہ داستان مہابھارت میں کیا گیا ہے، جب زخمی ہو کر یہی بھیشم پتامہ تیروں کے سیج پر لٹا دیئے گئے تھے، اور ان کی مزاج پرسی کے لئے آخر میں خود شری کرشن جی بھی ان کے بالین[2]

---

[1] ملائکہ، جن، ارواح طیبہ، وخبیثہ کے متعلق ہندو ادبیات میں یہی الفاظ مستعمل ہیں، یکش و رنش، الجن والانس کے ہم معنی الفاظ ہیں۔۱۲

پہونچے، تو لکھا ہے کہ

"بھیشم جی کرانن بھگت جان کر ترلوکی درشن"۔

سے سری کرشن جی نے سرفراز کیا یعنی تینون عالم (لوک) کا مشاہدہ ان کو کرادیا، مذکورہُ بالا فقرے مین "انن بھگت" کا جو لفظ ہے، اس کا مطلب اسی کتاب مین یہ بیان کیا گیا ہے کہ

"جو کیون (صرف) نارائن (خالق عالم) کی اوپاسنا (عبادت) کرتا ہو"

(مہابھارت شانتی پرب ۳۳۱ ادھیاے)

جس سے معلوم ہوا کہ مہابھارت کی جنگ اس ملک مین جب لڑی گئی تھی اس وقت یک دینی زندگی کی روح یہی "انن بھگت" ہونا سمجھی جاتی تھی، اور یہ تو خیر پھر بھی ایک جمالی بات ہوئی، مہابھارت کی جنگ مین فاتح اعظم ہونے کی حیثیت راجہ جدھشٹر کو حاصل ہوئی تھی، ان ہی کو ان الفاظ کے ساتھ خطاب کرتے ہوئے یعنی:۔

"ہے مہابھاگ (بڑے خوش قسمت) راجہ جدھشٹر"

منجملہ اور باتون کے یہ اپدیش بھی ان کو دیا گیا تھا جس مین خالقِ عالم کو ان الفاظ مین روشناس کراتے ہوئے کہ

"وہی نارائن سرشٹی (عالم) کو اتپن (پیدا) کرتا ہے، اور پھر اپنے مین لے کر لیتا ہے،

(یعنی ہر چیز اسی کی طرف واپس ہو جاتی ہے "کل الیہ راجعون") وہی سب دیوتاؤن، رشیون

دانوون، گندھربون، نشرون، کا پالن پوشن کرنے والا ہے"

آخر مین راجہ جدھشٹر کو حکم دیا گیا تھا کہ

"اسی نرگن دیوتا کا پوجن کرو"

گویا:۔

ذَٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ

یہی اللہ ہے تمہارا پروردگار، بس اسی

فاعبدہ، کو پوجتے رہنا،

کی قرآنی آیت کا جو حاصل ہے، اسی کی تعلیم راجہ جدھشٹر[1] کو دی گئی تھی، اور مہابھارت کا یہ نرگن دیوتا جس کی پوجا کا مطالبہ راجہ جدھشٹر سے کیا گیا ہے جانتے ہین، ہندوستان کے آباد کارون کے آباء اولین کی معرفت اس کے متعلق کن گہرائیون تک پہنچ چکی تھی،

اسی کتاب کا وہ حصہ جسے "ادیوگ" کہتے ہین، اس کے گیارہوین ادھیائے ہین، ایک رشی جن کا نام سجات جی بتایا گیا ہے، ان ہی کی طرف یہ بیان منسوب کیا گیا ہو کہ

"سجات جی بولے کہ برہم کا روپ کیا برنن (بیان) کرون نہ پرتھی (زمین) مین ویسا ہے، نہ آکاش (آسمان) مین نہ اس کا کوئی جسم ہے، نہ وہ سمندر مین ہے، نہ ستارون مین نہ بجلی مین نہ بادل مین، نہ چندرماں آدکشترون مین دکھائی دیتا ہے، نہ سورج مین نہ اور کسی مین، کنتو اس کا روپ "اپارینہ" ہو"

اپارینہ کا ترجمہ مترجم صاحب[1] نے بے مثل و بے حد کیا ہے، نیز اسی ادیوگ کے بارہوین ادھیائے مین صراحتہً ان الفاظ کو ہم پاتے ہین،

"اس برہم کی صورت کسی نظیر اور مثال سے نہین بتائی جا سکتی، اور نہ کوئی اس کے مشابہ ہے۔"

الغرض لیس کمثلہ شیئ کے تعبیری لباس مین قرآن نے معرفت کی جس تنزیہی شان کو

---

[1] مترجم صاحب سے میری مراد منشی شری رام صاحب، شرد ہلوی ہین، جنھون نے چار ضخیم جلدون مین کافی تحقیق و تدقیق کے ساتھ مہابھارت کا اردو مین کامیاب ترجمہ کیا ہے، مطبع نولکشور مین متعدد بار یہ ترجمہ چھپا ہے، میرے پیش نظر ۱۹۱۲ء کا مطبوعہ نسخہ ہے، سارے حوالے مہابھارت کے اسی ترجمہ سے ماخوذ ہین،

ادا کیا ہے، کیا مہابھارت کے اس نقرے مین اس کے سوا اور بھی کچھ ہے

میرے سامنے اس وقت تفصیل نہین ہی صرف چند سرسری مثالون کو پیش کر رہا ہون، ورنہ اس

قوم کی باتین مثلاً:-

"جس کے اوپر نارائن کرپا (مہربانی) کرین، اس کا کوئی بگاڑ نہین سکتا، اور جس پر پرمیشر

کوپ کرین، اس کو کوئی بچا نہین سکتا، (سبھا پرب ادھیائے ۷۸)

| | |
|---|---|
| مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ | اللہ آدمی کے لیے جس رحمت کو |
| فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ | کھولے، اسے کوئی روک نہیں سکتا |
| فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهٖ، | اور جسے روک دے، اسے کوئی کھول |
| (صافات) | نہین سکتا، |

اور اسی مضمون کی بے شمار آیتون کے مفہوم ہی کے اعادہ کی شکل ہے، آپ بکثرت اسی مہابھارت میں پا سکتے ہین، اور قدم قدم پر اسی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کے باشندون کی اگلی نسلون کو جو کچھ دیا گیا تھا جیسے دوسرون تک اُن کے آبائی سرمایے کو قرآن نے واپس کیا ہے اسی طرح اس ملک کے صحیح موروثی دین کو اُن کے وارثون تک وہ پہنچانا چاہتا ہے، لوگون کو معلوم نہین ہے اور نہ توحید ہی نہین، مذہب کی عملی زندگی، کرم یعنی پاپ پن یا نیکی اور بدی کے قانون کی تابع ہے، اس عام اسلامی نظریہ اور جو کچھ اس کے تفصیلات ہین، ایک ایک جزاُس کا بھی آپ کو مہابھارت ہی مین مل سکتا ہے، اسی قانون کا ذکر ایک جگہ ان الفاظ مین کیا گیا ہے، یعنی

"پاپ پن، دونون پھل، والک (نتیجہ خیز بارآور) ہین، ایک سے سرگ (الجنۃ) اور دوسرے سے نرگ (النار) ملتا ہے (اذیوگ ادھیائے ۱۱)

نیز یہ کہ "آدمی تپ اس لوک (دار دنیا) مین کرتا ہے، اور پھل اس کا دوسرے لوک (عالم آخرۃ)

پن پاتا ہے۔"

نیز:-

پن سے پاپ کا ناش ہوتا ہے۔"

اسی کے ساتھ یہ بھی کہ

"جو کوئی منش (آدمی) پاپ کرم (گناہ کا کام) کر کے پشچاتاپ کرتا ہے (یعنی پچھتاتا اور نادم ہوتا ہے) وہ پچھلے کئے ہوئے پاپ سے چھوٹ جاتا ہے، اور جو یہ کہتا ہے کہ پھر ایسا پاپ کرم نہیں کروں گا، وہ اس کئے ہوئے پاپ کا پھل نہیں پاتا ہے"

(منا پرب ادھیائے ۹)

بہرحال نیکی اور بدی کے ان ہی کلیات پر تصدیق کی مہر ثبت کر کے موجودہ زندگی کے انجام کو قرآن نے جب بے نقاب کیا ہو، تو پھر میں یہ کیسے مان لوں کہ ہمارے وطن کے باشندوں کی طرف بھی اس کے خطاب کا رخ نہ تھا جن کی کتابوں میں نیکی اور بدی کے قانون کے ان تمام پہلوؤں کو ہم پاتے ہیں، جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، آخر آپ ہی بتائیے قرآنی آیات مثلاً

| | |
|---|---|
| لها ما كسبت وعليها ما اكتسبت (البقرہ ع) | یعنی ہر شخص کو اپنے بھلے کاموں کا نفع بھی ملتا ہے، اور برے کا وبال بھی اسی پر عائد ہوتا ہے، |

یا:-

| | |
|---|---|
| ان الحسنات يذهبن السيئات | بھلائیاں (پن) برائیاں (پاپ) کو زائل کر دیتی ہیں، |

اور یہ کہ:-

والذین اذا فعلوا فاحشۃ او
ظلموا انفسہم ذکروا اللہ
فاستغفروا لذنوبہم و لم
یصروا علیٰ ما فعلوا وہم یعلمون
اولٰئک جزاءہم مغفرۃ من
ربہم

(آل عمران)

جن لوگوں نے بے حیائی کا کام کیا، یا
اپنے اوپر ظلم توڑا، یاد آیا ان کو اللہ
پھر معافی چاہی اپنے گناہوں کی،
اور جو کچھ کر گذرے، اس پر اصرار
نہ کیا، بحالیکہ وہ جانتے ہیں
ان کا صلہ ہے اپنے مالک کی طرف
سے آمرزش،

میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ غیر مروج غیر مستند، دل کتابوں ہی میں نہیں، بلکہ اسی مہابھارت میں جب یہ موجود ہے کہ نیکی آدمی اس لوک (دنیا) میں کرتا ہے، اور پھل اس کا دوسرے لوک (عالم آخرت) میں پاتا ہے اور اس کے بعد سرگ، نرگ کا ذکر کر کے بار بار ہر تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس قسم کی باتیں ملتی ہیں، مثلاً سرگ (الجنۃ) کا تذکرہ کرتے ہوئے

"سرگ اس لوک (عالم) ہے جہاں سب پدارتھ (ساز و سامان) موجود ہیں،
وہاں رہنے والوں کو بھوک پیاس سردی گرمی کچھ نہیں لگتی"

بہشتی نعمتوں کی ایک طویل فہرست جس میں ملموسات، مطعومات، مشمومات، مسموعات، ملموسات[1] الغرض سارے حسی لذائذ کی تفصیل کے بعد آخر میں ہے

"اس دیہ (جسم) سے جو دیب دیہ (نورانی جسم) کہلاتی ہے، جس میں نہ بڑھاپا ہے نہ جوانی ہے، ہمیشہ ایک جیسی روپ رہتی ہے، سرگ باس ملتا ہے، وہاں سوائے ہر کہ

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ہر ہر انسانی حاسہ کے ساتھ جن جن لذتوں کا تعلق ہے، سب ہی کا ذکر وید کے دھرم کے سرگ میں کیا گیا ہے حتی کہ پیراؤں (حوروں) کے ساتھ بھوگ بلاس کے پراپت ہونے یعنی حاصل ہونیکا ذکر بکثرت ان کتاب میں ملتا ہے۔

(سرور) کے شوک پیڑا (دکھ کی تحیت) نہین ہے"۔ (بن پرب ادھیاے ۱۱)

اور اسی کے مقابلہ مین نرک کے متعلق

گھور نرک جہان اندھیرا ہے، اچھس (یا ملائکہ غلاظ شداد) پیڑا (تکلیف) دیتے ہین،

(بن پرب)

شاید ہی کوئی حصہ مہابھارت کا ہوگا، جو انسانیت کے اس آخری انجام یعنی ایجنت و نار کے ذکر سے خالی ہو، پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ نحو دیا موجودہ یہودیت جس کی آسمانی کتاب کو جنت اور دوزخ ہی نہین، بلکہ اس لوک اور عالم کے بعد دوسرے لوک یا عالم کی زندگی کے ذکر سے ہم قطعی طور پر خاموش پاتے ہین، اس دین کو تو محض یورپ والون کی اس قسم کی مصنوعی تقسیمون یعنی سامی و آریائی، و تورانی وغیرہ حصون مین مذہبی قومون کو بانٹ بانٹ کر یہ فیصلہ جو کر دیا گیا ہے کہ اسلام اور یہودیت و نصرانیت تو دین کی سامی قسم مین شریک ہین، اور ہندوستان وغیرہ مین جو دین اور دھرم پھیلا ہوا تھا، وہ دین کی آریائی شکل ہے، حالانکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ یہودیت اور نصرانیت کے متعلق چاہے کہنے والے کچھ ہی کہین، لیکن اسلامی دین جسے قرآن نے اس دعوی کے ساتھ پیش کیا ہے، کہ اصولاً دین کی یہ کوئی نئی شکل وصورت نہین ہے، بلکہ ساری انسانی نسلون کا جو حقیقی موروثی، اور آبائی دین اور دھرم تھا" اسی کو ہر قسم کی خارجی آمیزشون سے صاف و پاک کر کے قومون کے حوالہ کر دینا یہی اس کا واحد نصب العین ہے، مرحوم ڈاکٹر اقبال کے الفاظ مین

از قبائے لالہ ہائے این چمن
پاک شست آلودگیہائے کہن

قرآن کے پیش کرنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی خصوصیت جب یہی ہو تو، ایسی صورت مین کوئی وجہ نہین ہو سکتی کہ ہندوستان جیسے عظیم ملک کے باشندون کو قرآنی دائرے کے مذکورۂ بالا

احاطہ سے خواہ مخواہ باہر سمجھا جائے. بلکہ تحقیق و تلاش سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی کا آبائی، اور موروثی دھرم قرآن کے پیش کئے ہوئے دین سے جتنا زیادہ قریب اور نزدیک ہے، شاید یہ نزدیکی ان دینوں اور مذہبوں کی موجودہ شکلوں کو بھی بہ مشکل میسر آسکتی ہو، جن کو یورپ والوں کی مذکورہ بالا فرضی تقسیم کے رو سے سامی ادیان کی فہرست میں ہم شریک پاتے ہیں، حالانکہ محض چند سرسری باتیں، اور وہ بھی صرف ایک کتاب مہابھارت کے مختلف مقامات سے اخذ کرکے آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں، لیکن قرآن کے پڑھنے والوں سے میں حق کی گواہی کی درخواست دیتا ہوں' توحید فی الخلق توحید فی العبادۃ، توحید فی الافعال یا قانون بر و اثم (نیکی و بدی) اس قانون کے نتائج الجنۃ والنار توبہ و استغفار،

الغرض ان سارے اصولی حقائق جن پر قرآنی تعلیم کی بنیاد قائم ہے، کیا وہی ساری باتیں مہابھارت میں بھی نہیں مل رہی ہیں؟ سچ تو یہ ہے کہ بعض بعض فقرے مہابھارت کے مذکورۂ بالا حوالوں میں ایسے بھی ہیں کہ قرآن کی عربی عبارت کے سامنے بطور ترجمہ کے ہم اُن کو بآسانی درج کرسکتے ہیں،

اور یہ قصہ صرف مبدء و معاد نیکی و بدی ہی کے تفصیلات تک محدود نہیں ہے، بلکہ اخلاقی فضائل و رذائل کی جو فہرست اسلام میں پائی جاتی ہے، بجنسہٖ یہی فہرست ویدک دھرم کی بھی ہے، بلکہ ایسی چیزیں جو عموماً اسلام کے ساتھ مختص سمجھی جاتی ہیں، مثلاً جوا شراب خوری اُن کی حرمت کا بھی بار بار ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے، قمار (جوا) کی اہمیت تو اسی سے ظاہر ہے کہ مہابھارت کا موضوع ہی ایک حیثیت سے اگر سمجھا جائے تو قمار یعنی جوئے ہی کے نتائج اور انجام کو بیان کرتا ہے، یہی بتایا گیا ہے کہ یہ ساری خونریزیاں جو مہابھارت کی جنگ میں ہوئیں اور جیسا کہ اسی کتاب میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ کروڑہا کروڑ[1] انسان جو اس جنگ میں مارے گئے، سب کا خون پانڈو اور کورو خاندان کے خاندان

---

[1] استری پرب دسواں ادھیا میں جدھشٹر کی زبانی مقتولوں کی تعداد ایک ارب چھیاسٹھ کروڑ بیس ہزار بتائی گئی ہے،

کے شاہزادوں کے جذبۂ قمار بازی کے سر عائد ہوتا ہے، گویا جوا بازی کے نتیجے کو دکھلانے کے لئے کہا جا سکتا ہو کہ یہ کتاب مرتب کی گئی، مگر حیرت ہوتی ہے کہ بہت سی باتیں جو ہندوستان میں عموماً مروج ہیں، بلکہ عام تدبر دین اور دھرم کے نام لینے والے جن اعمال کو اپنی خصوصیت قرار دیئے ہوئے ہیں، اُن کے متعلق بھی اسی مہابھارت میں وہی نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے، جو اسلام کا ہے، مثلاً ادیوگ کے دسویں ادھیائے میں بدرجی کا ایک طویل اپدیش کو نقل کرتے ہوئے ان فقروں کو بھی ان ہی کی طرف ہم منسوب پاتے ہیں کہ

"تلوار کا زخم بھر جاتا ہے مگر کٹھور بچن کا زخم کبھی نہیں بھرتا، جب تک انسان کی نیک نامی دنیا میں رہتی ہے، تب تک وہ زندہ سمجھا جاتا ہو، قسم کھانے والے کی بات کا اعتبار نہیں رہتا"

اور اسی سلسلہ میں یہ بھی ہو کہ

"شاہ ریکھ یعنی ہاتھ کا ریکھا دیکھنے والا، شگون بتانے والا، جوتشی"

ان سب کو

"بے شرم بھڑوا، گربھ گرانے والا، اپنی استری (عورت) کا خرچ کھانے والا، برہمن ہو کر شراب پینے والا"

کی فہرست میں شریک کیا گیا ہے، حالانکہ آج ہاتھ کا ریکھا دیکھنے والے اور شگون بتانے کا پیشہ کرنے والے ہی اس ملک میں دین کے پیشوا سمجھے جاتے ہیں، یہی نہیں عام طور پر سمجھا جاتا ہو کر بھکشا لینا، اور بھیک مانگنا بھی برہمن کا مذہبی فریضہ ہے، لیکن اسی مہابھارت میں ہم بھکاری اور گداگر برہمن کے متعلق یہ الفاظ پاتے ہیں :

"جو برہمن سوال کرنے والا ہوتا ہے، اُس کی عزت نہیں ہوتی، ان اس کا دور ہو جاتا ہے سوال کرنے والے برہمن کا خوف چور کا سا ہوتا ہے"

اور آخر مین ہے :-

"بھیک مانگنے والا مرتا ہے دان کرنا کبھی نہین مرتا"۔ (انوساسن پرب چودہواں ادھیائے)

اسی طرح آج "بیاج" یعنی ربا یا سود خواری اس ملک مین جس قوم کا خصوصی پیشہ سمجھا جاتا ہے اسی کی دینی کتاب مین ہم یہ بھی پاتے ہین کہ

"بیاج (سود) کھانے والا کا ان (کھانا) بشٹا (گوہ) سمان (مانند) کہا ہے"

(شانتی پرب ۱۲-ادھیائے)

میرے سامنے اس وقت تفصیل نہین ہے۔ انشاء اللہ کسی مستقل مقالہ مین اپنے معلومات کو جمع کرکے پیش کرونگا۔ سردست صرف سرسری باتون کا ذکر کر رہا ہون۔

خیال تو کیجئے، پانی سے تطہیر یا پاکی تو خیر عام بات ہی لیکن ہماری فقہ کا ایک جزئیہ ہے، کہ آفتاب سے بھی چیزین پاک ہوتی ہین، ٹھیک اسی جزئیہ کو ان الفاظ مین آپ مہابھارت مین بھی پا دین گے۔

"سورج کی کرن سے سب بستو (چیزین) پوتر (پاک) ہوئی ہین"۔

(ادپرب ۷ ادھیائے)

حد یہ ہو کہ غسل کے ساتھ قریب قریب وضو کے مسئلہ کو بھی آپ چاہین تو پا سکتے ہین، عبادت کرنے

---

لے اسی ادھیائے مین ایک فقرہ جس مین اچھے برہمن کی خصوصیتون کو بتاتے ہوئے ایک خاص علامت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ جو برہمن

"ڈاڑھی مونچھ رکھنے والے ہین اُن کو نیوتہ دے کر اچھے پدارتھ بھوجن کراؤ" (انوساسن پرب ۹۰ ادھیائے)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مونچھ ڈاڑھی ہمارے وطن مین بھی بزرگ انسانون کی علامت ہمیشہ مانی جاتی تھی۔ ۱۲

سے پہلے کیا کرنا چاہئے اسی کا جواب دیتے ہوئے حکم دیا گیا ہے،

ممکن ہو تو انسان غسل کرے نہیں تو ہاتھ پاؤں دھو کر آچمن (کلی) کرکے شدھ (پاک)

آسن (جگہ) بیٹھ کر نارائن (خالق عالم) کا سمرن (ذکر) دھیان جپ وغیرہ کرے!!

(شانتی پرب ۱۴۷ ادھیائے)

اسی طرح صدقہ خیرات تو خیر مذاہب و ادیان کی عام بات ہے لیکن مہا بھارت میں اطلاع

دی گئی ہے کہ سب سے پہلے منوجی نامی راجہ کو راج ملا، اور اُن سے پرجانے وعدہ کیا، کہ آپ

"ہمارا پالن کریں ہم پشوؤں کا، اور سونے کا پچاسواں بھاگ (حصہ) اور اناج کا دسواں

، (حصہ) خزانہ کی ترقی کے لئے ..... تمہارے خزانے میں داخل کریں گے"

(شانتی پرب ۵۴ ادھیائے)

زکوٰۃ کے قانون کی تفصیل کہتے ہوئے پشوؤں (السوائم یعنی بھیڑ بکری گائے اونٹ وغیرہ)

اور زر نقرہ سے اسلام نے جس قدر زکوٰۃ نکالنے کا حکم دیا ہے، اور عشر یعنی دسواں حصہ زمین سے

پیدا ہونے والے اناج کا صدقہ جو طلب کیا گیا ہے، اس کو اپنے سامنے رکھیے، اور مہا بھارت کی زکوٰۃ

اطلاع کو پیش نظر رکھئے، اور غور کیجئے اُن قرآنی آیات پر جن میں فرمایا گیا ہے کہ تمہارے اگلے باپ دادوں

کے پاس جو کچھ آیا تھا، کیا اس کے سوا قرآن تمہیں کچھ اور دے رہا ہے، یا ارشاد ہوا ہے،

لیھدیکم سنن الذین من قبلکم، — تاکہ جو تم سے پہلے گذرے ہیں، اُن کے طور اور طریقوں کی طرف تمہاری راہ نمائی کی جائے،

(النساء)

قرآن کے ان دعووں کی تصدیق کے سوا میں نہیں سمجھتا کہ اور کیا چاہا جاتا ہے، ذرا ملاحظہ کیجئے،

جرائم کے سلسلہ میں چوری کے جرم کی سزا، قرآن میں جیسا کہ مشہور ہی ہے، یہ مقرر کی گئی ہے کہ چور کا ہاتھ

کاٹ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اصل مقصود تو چوری کا انسداد ہے۔ جرم کے انسداد ہی کے لئے یہ سزا مقرر کی گئی ہے۔ خود قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ، ورنہ اور حضرت یعقوب علیہ السلام جن کا دوسرا نام اسرائیل تھا، اور ان ہی کی طرف منسوب ہو کر یہود بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان ہی یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں کی زبانی قرآن میں چوری کی سزا ان کے پاس مروج تھی، یہ بتایا گیا ہے کہ چوری کا مال جس کے پاس نکلے، خود اسی چور پر مال کا مالک قبضہ کرلے، سورۂ یوسف میں یہ مشہور اعتراف حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں کا منقول ہے،

| | |
|---|---|
| قالوا جزاؤہ من وجد فی | (یعقوب علیہ السلام کے ان لوگوں نے) کہا کہ |
| رحلہ فہو جزاؤہ کذلک | بدلہ اس کا یہ ہے کہ جس کے سامان میں |
| نجزی الظالمین | چوری کا مال ملے وہی اس کا بدلہ ہے۔ |
| | ہم جرم کرنے والوں کو یونہی سزا دیتے ہیں، |

جس سے معلوم ہوا کہ چوری کے انسداد کے لئے اپنے خاص حالات کے لحاظ سے بنی اسرائیل کے لئے قطع ید (ہاتھ کاٹنا) کافی نہ تھا، کٹے ہوئے ہاتھوں کے باوجود بے شرمی کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چور چوری سے باز نہیں آتے تھے، اس لئے اس سے زیادہ سخت سزا ان کے یہاں غالباً مروج ہوئی تھی لیکن آئیے اور دیکھئے، ویدک دھرم جسے شمار کرنے والے سامی مذاہب کے مقابلہ میں آریائی دین کی فہرست میں شمار کرتے ہیں، اس میں اسی چوری کے جرم کی سزا کے متعلق جو آگاہی مہابھارت ہی سے حاصل ہوئی ہے، اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہو سکتا ہے، ایک شخص چوری کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے، اور وقت کے راجہ سودمن کے سامنے اس کا مقدمہ پیش ہوتا ہے، خود چور درخواست کرتا ہے کہ

"جو ڈنڈ (سزا) چور کو ہوتا ہے وہی ڈنڈ مجھے دو"

# سکھ مت

گرو گرنتھ صاحب اور اردو

ـــــــ عباداللہ گیانی



حکومت کی ایک بنیاد تو عقیدہ توحید خداوندی ہے۔ دوسری بنیاد اردو بھی ہے۔
یہ بات پیش نظر تحریر سے قبل کسی دوسری شکل میں محمود شیرانی کہہ چکے ہیں۔

ادارہ

عباداللہ گیانی

# گروگرنتھ صاحب اور اردو

گورو گرنتھ صاحب سکھ صاحبان کی مقدس مذہبی کتاب ہے اور سب کی سب منظوم کلام پر مشتمل ہے جو اکتیس راگوں میں منقسم ہے۔ اکثر سکھ اسے گوروگوبند سنگھ جی کے بعد اپنا علمی گورو تسلیم کرتے ہیں اور اس پر انسان گوروؤں کے سلسلے کو ختم یقین کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک گورو گوبند سنگھ جی نے اپنے بعد گوربانی کو گرنتھ اور پنتھ کے دو حصوں میں تقسیم کر کے انسان گوروؤں کا سلسلہ بند کر دیا تھا(۱)۔ علمی گوربانی گوروگرنتھ صاحب کو اور عملی گوربانی پنتھ کو سونپ دی تھی۔ گوروگرنتھ صاحب، گورو ارجن جی نے ۱۶۶۱ بکرمی مطابق ۱۶۰۳ء میں مرتب کیا تھا۔

---

(۱) سکھوں میں نام دھاری اور نرنکاری وغیرہ ایسے فرقے بھی ہیں جن کے نزدیک ہر زمانہ میں انسان نمونہ کا محتاج ہے اور انسان کے لیے کوئی کتاب نمونہ نہیں بن سکتی۔ بلکہ یہ مقام کسی مقدس انسان ہی کو حاصل ہے۔ وہ گورو گوبند سنگھ جی کے بعد بھی انسان گوروؤں کے اجرا کے قائل ہیں۔ وہ گرنتھ اور پنتھ کو ان معنوں میں گورو تسلیم نہیں کرتے کہ اب کوئی انسان گورو نہیں ہوگا۔ ان کے اپنے الگ الگ گورو ہیں۔ چنانچہ نام دھاری فرقہ کے لوگ گوروگوبند سنگھ جی کے بعد جن بزرگوں کو اپنے گورو مانتے ہیں وہ یہ ہیں: (۱۱) بابا بالک سنگھ جی، (۱۲) بابا رام سنگھ جی، (۱۳) بابا ہری سنگھ جی، (۱۴) بابا پرتاپ سنگھ اور (۱۵) بابا جگجیت سنگھ جی۔ اب ان کے گورو مؤخرالذکر بزرگ ہیں۔ نرنکاری صاحبان کے گوروؤں کا سلسلہ اس سے الگ ہے۔

عام طور پر مطبوعہ گورو گرنتھ صاحب خواہ وہ کسی سائز میں ہو ۱۴۳۰ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے ۔ گورو گرنتھ صاحب کے قلمی نسخوں میں اپنی بانیوں کے لحاظ سے تو کافی اختلاف پایا جاتا ہے ۔ خاکسار نے عام مروجہ مطبوعہ گورو گرنتھ صاحب کو مدنظر رکھا ہے اور اسی سے شبد اور شلوک نقل کیے ہیں ۔

سکھ تاریخ سے اس کتاب سے متعلق جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ کتاب سکھوں کے پانچویں گورو ارجن جی کی تالیف ہے اور اس کی تکمیل گورو گوبند سنگھ جی کے ہاتھوں ہوئی تھی اور مروجہ گورو گرنتھ صاحب میں مندرجہ ذیل سات سکھ گورو صاحبان کا بیان کردہ کلام مختلف راگوں کے شبدوں اور شلوکوں میں ملتا ہے ۔

پہلے گورو : گورو نانک جی
دوسرے گورو : گورو انگد جی
تیسرے گورو : گورو امر داس جی
چوتھے گورو : گورو رام داس جی
پانچویں گورو : گورو ارجن جی(۱)

---

(۱) گورو ارجن جی کے بعد ہونے والے چھٹے ، ساتویں اور آٹھویں گورو صاحبان سے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کوئی بانی بیان نہیں کی مگر گورو گرنتھ صاحب کے بعض قدیمی اور قلمی نسخے ایسے بھی ہیں جن میں ان تینوں گورو صاحبان کے نام پر بھی کچھ بانیاں درج ہیں ۔ مروجہ گورو گرنتھ صاحب میں ان کے نام کا کوئی شبد یا شلوک نہیں ہے اور جو شبد یا شلوک ان کے بیان کردہ بعض پرانے قلمی نسخوں میں ملتے ہیں ان کا رنگ ڈھنگ سکھ گورو صاحبان کے بیان کردہ کلام سا ہے اور ان میں بھی دوسرے سکھ گورو صاحبان کی طرح ” نانک “ لفظ بطور تخلص کے استعمال کیا گیا ہے ۔

نویں گورو : گورو تیغ بہادر جی
دسویں گورو : گوبند سنگھ جی (صرف ایک شلوک)

ان سکھ گورو صاحبان کے علاوہ بعض ھندو اور مسلمان بزرگوں کا بیان کردہ کلام بھی گورو گرنتھ صاحب میں درج ھے - جسے عرف عام میں "بھگتاں کی بانی" یا "بھگت بانی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ھے اور وہ بھگت یہ ھیں :

(۱) شیخ فرید جی - (۲) بھگت کبیر جی -
(۳) ترلوچن جی - (۴) نام دیو جی -
(۵) سدھنا جی - (۶) جے دیو جی -
(۷) بینی جی - (۸) راما نند جی -
(۹) پیپا جی - (۱۰) سین جی -
(۱۱) دھنا جی - (۱۲) بھیکھن جی -
(۱۳) پرما نند جی - (۱۴) سورداس جی -
(۱۵) پرمانند جی -

ان بھگتوں میں اکثریت ان کی ھے جو ھندو سماج میں ادنیٰ اور اچھوت تصور کیے جاتے تھے اور یہ سارے بھگت سکھ گورو صاحبان سے بہت پہلے گزرے ھیں - ان میں سے بعض بھگتوں کا زمانہ تو صدیوں قبل ھے یعنی سکھ گورو صاحبان ان سے صدیوں بعد پیدا ھوئے تھے -

بعض سکھ مؤرخین اور مصنفین کے نزدیک بھگتوں کا جملہ کلام گوروگرنتھ صاحب کے مؤلف گورو ارجن جی نے خود اپنی مرضی سے گوروگرنتھ صاحب میں شامل کیا تھا(۱) - لیکن سکھوں میں ایسے ودوان

(۱) مشہور سکھ ودوان پنڈت تارا سنگھ جی نروتم کا خیال ھے کہ گرنتھ صاحب میں درج شدہ بھگت بانی گورو ارجن جی نے خود ھی ان بھگتوں کے نام پر اچارن کی تھی گویا یہ کہ اس کے مصنف گورو ارجن جی خود ھی ھیں -

بھی موجود ہیں جن کے نزدیک سکھ گورو صاحبان کے کلام کے ساتھ ساتھ بھگتوں کا کلام شامل کرنے کی داغ بیل گورو نانک جی نے ڈالی تھی جنھوں نے اپنی زندگی ہی میں بھگت بانی کو جمع کر کے اپنے کلام کے ساتھ درج کر دیا تھا ۔ گورو ارجن جی نے گورو نانک جی کی جمع کردہ بھگت بانی ہی کو گورو گرنتھ صاحب میں درج کروا دیا تھا(۲) ۔

سکھوں میں بھگت بانی سے متعلق ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ گورو ارجن جی کی وفات کے بعد ان کے بڑے بھائی پرتھی چند جی نے (جو بعض مؤرخین کے نزدیک گورو ارجن جی کے سوتیلے بھائی اور اشد مخالف بلکہ خون کے پیاسے تھے) ہندوؤں اور مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے گورو صاحب کی منشاء کے خلاف بھگت بانی گورو گرنتھ صاحب میں درج کروا دی تھی اور گورو صاحب موصوف کے مؤلفہ گورو گرنتھ صاحب کو تلف کروا دیا تھا ۔ مروجہ گورو

---

(۲) جو لوگ اس امر کے قائل ہیں کہ بھگت بانی کے مصنف وہ بھگت ہی ہیں جن کے نام پر اسے گروگرنتھ صاحب میں درج کیا گیا ہے ۔ ان میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے نزدیک گورو ارجن جی نے اس میں مناسب ترمیم کرنے کے بعد اسے گرنتھ صاحب میں درج کیا تھا ۔

(۱) بعض سکھوں کے نزدیک یہ بھاٹ اصل میں چاروں ویدوں کے اوتار ہے ۔ یعنی ویدوں نے انسانی شکل اختیار کر کے سکھ گورو صاحبان کی تعریف میں کلام بیان کیا تھا جسے گورو ارجن جی نے گرنتھ میں شامل کر دیا ۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ بھاٹ ویدوں کے عالم تھے ۔ سکھوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے نزدیک یہ بھاٹ سکھ گورو صاحبان کی گدی نشینی کے وقت مختلف اوقات میں جو کلام بیان کرتے رہے اسے گورو ارجن جی نے گوروگرنتھ صاحب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر درج کروا دیا ۔

گرنتھ صاحب میں درج شدہ بھگت بانی کا گورو ارجن جی سے کوئی تعلق نہیں - گوروگرنتھ صاحب کے بعض قلمی نسخے ایسے بھی ھیں جن میں یہ بھگت بانی شامل نہیں ھے -

ان مختلف بھگتوں کے کلام کے علاوہ بعض اور لوگوں اور بھاٹوں(۱) کے نام سے بھی کافی کلام گورو گرنتھ صاحب میں درج ھے ، جن کے نام یہ ھیں :

(۱) بھائی مردانہ جی - (۲) بابا سندرداس جی ۔
(۳) رائے بلونڈ اور ستاؤوم - (۴) کلسہار -
(۵) جالب - (۶) کرت -
(۷) بھکہا - (۸) سل -
(۹) نل - (۱۰) گیند -
(۱۱) متھرا - (۱۲) بل -
(۱۳) ھربنس وغیرہ -

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ھے کہ گورو گرنتھ صاحب میں جن بھگتوں کا کلام درج ھے وہ سب کے سب سکھ گورو صاحبان سے بہت عرصہ پہلے گزر چکے ھیں - بعض تو ایسے بھی ھیں جن میں صدیوں کا بُعد ھے - اور سکھ گورو صاحبان میں بھی اکثریت ایسے لوگوں کی ھے جو اردو زبان کے نشو و نما پانے سے قبل وفات پا چکے تھے- اس لیے اردو کی اس ترقی پائی ھوئی صورت کا تو ذکر ھی کیا ، جو ھمارے زمانے میں ھے ، گورو گرنتھ صاحب کے شبدوں شلوکوں میں تو اردو کی وہ صورت بھی نہیں مل سکتی جو اسے شاہ جہان کے عہد میں حاصل ھوئی تھی - البتہ ایسے شبد اور شلوک یا ان شبدوں اور شلوکوں کی بعض سطور ایسی ضرور مل جاتی ھیں جن میں اردو کی جھلک نظر آ جاتی ھے اور اس سے یہ امر واضح ھو جاتا ھے کہ سکھ

گورو صاحبان اور ان سے قبل گزر چکے بعض بھگتوں نے هندی کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے ان الفاظ کو بھی اپنا لیا تھا جو آگے چل کر اردو زبان کو وجود میں لانے کا باعث بنے اور ایک مستقل زبان کی شکل اختیار کر گئے ۔

کلام کا ایک نسخہ گورو نانک جی کی بھینٹ کیا تھا ۔"

سکھ ودوانوں میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جن کے نزدیک گورو گرنتھ صاحب میں درج شدہ فرید جی کی بانی شیخ فرید شکر گنج اور شیخ ابراهیم ( فرید ثانی ) دونوں کی ملی جلی هے ۔

موجودہ مروجہ گورو گرنتھ صاحب میں شیخ فرید جی کے نام پر جو بانی درج هے وہ چار شبدوں اور ایک سو تیس شلوکوں پر مشتمل هے ۔ سکھ ودوان شیخ جی کے کلام کو ابتدائی پنجابی کلام کا درجہ دیتے هیں ۔ تاهم اس میں بھی عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش پائی جاتی هے جو اردو کے ارتقائی منازل کی نشان دهی کرتی هے ۔ ذیل میں هم شیخ جی کے کلام سے نمونہ پیش کیے دیتے هیں ۔

گورو گرنتھ صاحب میں راگ آسا کے آخر میں آپ کے یہ دو شبد درج هیں :-

دلهوں مهبت ( محبت ) جن سیئی سچیا
جن من هور مکھ هور سے کانڈھے کچیا
رتے اسک کھدائے ( عشق خدائے ) رنگ دیدار کے
وسریا جن نام تے بھوئے بھار تھیئے
آپ لیے لڑ لائے در درویس ( در درویش ) سے
تن دھن جنیدی ماؤ آئے سپھل سے
پرودگار ( پروردگار ) اپار اگم بے انت تو

جنهاں پچھاتا سچ چوما پیر موں
تیری پناہ کھدائے ( خدائے ) تو بکھسندگی ( بخشندگی )
سیکھ بھرید ( شیخ فرید ) کھیر ( خیر ) دیجے بندگی

[ گورو گرنتھ صاحب راگ آسا شیخ فرید ص ۴۸۸ ]

دوسرا شبد یہ ہے :-

بولے سیکھ بھرید ( شیخ فرید ) پیارے اللہ لگے
ایہ تن هوسی کھاک ( خاک ) نمانی گور گھرے
آج ملاوا سیکھ بھرید ( شیخ فرید )
ٹا کم کوجڑیا ( ں ) منہہ چنڈڑیا ( ں )
جے جانا مر جائیے گھوم نہ آئیے
جھوٹھی دنیا لگ نہ آپ ونجائیے
بولیئے سچ دھرم جھوٹھ نہ بولیئے
جو گور دسے واٹ مریداں جولیئے
چھیل لنگھندے پار گوری من دھیریا
کنچن ونے پاسے کلوت چیریا
سیکھ ( شیخ ) هیاتی ( حیاتی ) جگ نہ کوئی تھر رهیا
جس آسن ہم بیٹھے کیتے بیس گیا
کتک کونجاں چیت ڈوساون بجلیاں
سیالے سوهندیاں پر گل باهڑیاں
چلے چلن‌هار وچارا لیئے منو
گنڈھیندیاں چھ ماہ تڑندیاں اک کھنو
جمی ( زمیں ) پوچھے اسمان بھریدا ( فریدا ) کھیوٹ کن گیئے
جالن گوراں نال الاہے جیئی سہے

[ گورو گرنتھ صاحب راگ آسا شیخ فرید ص ۴۸۸ ]

شیخ فرید جی کے مندرجہ بالا دونوں شبدوں میں عربی اور فارسی

الفاظ کی آمیزش ہے ۔ چنانچہ محبت ، عشق ، رنگ ، در ، درویش ، پروردگار ، پناہ ، بخشندگی ، خیر ، اللہ ، گور ، خاک وغیرہ الفاظ کا تعلق عربی اور فارسی سے ہے ۔

گورو گرنتھ صاحب میں راگ سوھی میں شیخ فرید جی کے نام پر دو شبد درج ھیں ۔ ان میں بھی عربی اور فارسی الفاظ استعمال کیے گئے ھیں ، جیسا کہ :

تپ تپ لوھے لوھے ھاتھ مروڑو
باوٗل ھوئی سو سه ( شه ) لو رو
تے سه ( شه ) من میں کیا روس
مجھ اوگن سه ( شه ) ناھی دوس
تیں صاحب کی میں سار نه جانی
جوبن کھوئے پاچھے پچھوتانی
کالی کوئل تو کت گن کالی
اپنے پریتم کے ھوں برھے جالی
برھے بہون کیتے سکھ پائے
جا ھوئے کرپال تاں پربھو ملائے
ودھن کھوھی منده اکیلی
نه کو ساتھی نه کو بیلی
کر کرپا پربھ سادھ سنگ میلی
جاں پھر دیکھاں تاں میرا اللہ بیلی
واٹ ھماری کھری اڈینٹی
کھنبوں تکھی بہت پینٹی
اس اوپر ہے مارگ میرا
سیکھ پھریدا ( شیخ فریدا ) پنتھ سمار سویرا

اور دوسرا شبد یہ ہے :—

بیڑا بندھ نہ سکیو بندھن کی ویلا
بھر سروور جب اوچھلے تب ترن دوھیلا
ھتھ نہ لائے کسمبھڑے جل جاسی ڈھولا
اک آپنے ہتلی سہ ( شہ ) کیرے بولا
دودھا تھنٹی آوئی بھر ھوئے نہ میلا
کہے بھرید ( فرید ) سہیلیو ( سہیلیو ) سہ ( شہ ) الائے سی
ھنس چلسی ڈوسنا ایہ تن ڈھیری تھیسی

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ گوروگرنتھ صاحب میں شیخ فرید جی کے نام پر کچھ شلوک بھی درج ھیں ۔ ان شلوکوں میں شیخ صاحب نے عربی اور فارسی الفاظ استعمال کیے ھیں ۔ ذیل میں ھم ان شلوکوں سے بعض مثالیں پیش کیے دیتے ھیں :۔

والوں نکی پرسلات ( پل صراط ) کنیں نہ سنٹی آئے
بھریدا ( فریدا ) کیڑی ہوندی نی کیڑا نہ آپ مہائے

بھریدا ( فریدا ) دردرویسی ( درویشی ) گاکھڑی چلاں دنیا بھت
بھنہ اٹھائی پوٹلی کتھے ونجاں گھت ۔ ۲

...... ...... ...... ......

بھریدا ( فریدا ) جے تو اکل لتیپھ ( عقل لطیف ) کالے لکھ نہ لیکھ
آپڑے گریوان ( گریبان ) مہ سر نیواں کر ویکھ ۔ ۶

...... ...... ...... ......

بھریدا ( فریدا ) جاں تو کھٹن ویلا تاں توں رتا دنی سیوں
مرگ سوائی لیہ جاں بھریا تاں لدیا ۔ ۸

...... ...... ...... ......

بھریدا ( فریدا ) کوکیندیاں چانگیندیاں متی دیندیاں نت
جو سیتان ( شیطان ) ونجایا سے کت پھیرے چت ۔ ۱۵

...... ...... ...... ......

پھریدا ( فریدا ) خاک نہ لندئیے خاکو جیڈ نہ کوئے
جیوندیاں پیراں تلے موئیاں اوپر ھوئے - ۱۷
پھریدا ( فریدا ) جاں لب تاں نیہ کیا لب تاں کوڑا نیہ
کچر جھت لنگائیئے چھپر توٹے میہ - ۱۸
پھریدا ( فریدا ) جنگل جنگل کیا بھوھے ون کنڈا موڑیہ
وسی رب ھیا لئے جنگل کیا ڈھوڈھیہ - ۱۹

...... ...... ...... ......

پھریدا ( فریدا ) چنت کھٹولا وان دکھ برہ وچھاون لیپھ ( لحاف )
ایہہ ھمارا جیونا صاحب سچے ویکھ - ۳۵
برھا برھا آ کھیئے برھا توں سلتان ( سلطان )
پھریدا ( فریدا ) جت تن برھا نہ اوپجے سو تن جان مسان - ۳۶

...... ...... ...... .....

پھریدا ( فریدا ) چار گوایا ھنڈھ کے چار گوایا سم
لیکھا رب منگیسیا تو آں ھو کیہڑے کم - ۱۳۸
پھریدا ( فریدا ) در درواجے (دروازے) جائے کے کیوں ڈٹھو گھڑیال
ایہہ نردوساں مارئیے ھم دوساں دا کیا ھال ( حال ) - ۳۹

..... ...... ...... ......

ہاس دماسے چھت سر بھیری سڈو رڈ
جائے متے جیراں مہ تھیئے اتیاں ( یتیماں ) گڈ - ۴۵

...... ...... ...... ......

پھریدا ( فریدا ) کھنتھڑ میکھا (میخاں) اگلیاں
جند نہ کائی میکھ ( میخ )
واری آپو آپنی چلے مسائک ( مشائخ ) میکھ ( شیخ ) - ۴۷
پھریدا ( فریدا ) دوھی دیوے بلندیاں ملک بیٹھا آئے

گڑہ لیتا گھٹ لوٹیا دیوڑے گینا بوجھانے - ۴۸

...... ...... ...... ......

بھریدا ( فریدا ) کوٹھے منڈپ ماڑیاں ایت نہ لائے چت
مٹی پئی اتولوبی کوئے نہ ھوسی مت - ۵۷

بھریدا ( فریدا ) منڈپ مال نہ لائے مرگ ستانی چت دھر
سائی جائے سمال جھتے ھی تؤ ونجناں - ۵۸

بھریدا ( فریدا ) جنی کیں ناھیں گن تے کڑے وسار
مت سرمندا ( شرمندا ) تھیوھی سائیں دے دربار - ۵۹

بھریدا ( فریدا ) صاحب دی کر چاکری دل دی لاہ بھراند
درویساں ( درویشاں ) نو لوڑیئے رکھاں دی جیراند - ۶۰

بھریدا ( فریدا ) کالے مینڈے کپڑے کالا مینڈا ویس
گنہی بھریا میں بھراں لوک کہے درویس ( درویش ) - ۶۱

...... ...... ...... ......

جاں کواری تاں چاؤ ویواھی تا ماملے ( عاملے )
بھریدا ( فریدا ) ایہو پچھوتاؤ وت کواری نہ تھیئے - ۶۳

...... ...... ...... ......

بھریدا ( فریدا ) بھنی گھڑی سونوی ٹوٹی ناگر لج
اجرائیل ( عزرائیل ) بھریستہ ( فرشتہ ) کے گھر نائیہی اج - ۶۸

...... ...... ...... ......

بھریدا ( فریدا ) بے نواجا ( بے نمازا ) کتیا ایہ نہ بھلی ریت
کبھی چل نہ آئیا پنجے وکھت ( وقت ) مسیت - ۷۰

اٹھ بھریدا ( فریدا ) اجو ( وضو ) ساج
سبہ ( صبح ) نواج ( نماز ) گجار ( گزار )
جو سر سائیں نہ نویں سو سر کپ اتار - ۷۱

جو سر سائیں نہ نویں سو سر کیجے کانے
کنے ہیٹھ جلائیے بالن سندڑے تھانے - ۲ے

...... ...... ...... ......

بھریدا ( فریدا ) من میدان کر ٹوئے ٹبے لاہ
اگے مول نہ آوسی دوجک ( دوزخ ) سندی بھاہ - ۴ے

بھریدا ( فریدا ) کھالک ( خالق ) کھلک ( خلق ) میں
کھلک ( خلق ) وسے رب ماہ
مندا کس نو آکھیئے جاں تس بن کوئی ناہ - ۵ے

بھریدا ( فریدا ) جے دہ نالا کپیا جے گل کپے چوکنہ
پون نہ اتی ماملے ( معاملے ) سہاں نہ اتی دوکھ - ٦ے

...... ...... ...... ......

بھریدا ( فریدا ) برے دا بھلا کر گسہ ( غصہ ) من نہ ہڈھائے
دیہی روگ نہ لاگئی پلے سب کچھ پائے - ۸ے

بھریدا ( فریدا ) پنکھ پراھنٹی دنی سوھاوا باگ ( باغ )
نوبت وجی صبہ ( صبح ) سیوں چلن کا کر ساج ( ساز ) - ۹ے

...... ...... ...... ......

بھریدا ( فریدا ) مہل ( محل ) نسکھن رہ گئے واسا آئیا تل
گوراں سے نمانڑیاں بہسن روھاں ( روحاں ) مل
آکھیں سیکھاں ( شیخاں ) بندگی چلن اج کہ کل - ۹۷

بھریدا ( فریدا ) سوتے دا بناں ابوے دے جیوں دریاوے ڈھاھا
اگے دوجک ( دوزخ ) تپیا سنٹیئے ھول ہوے کاھاھا
اکناں نوں سب سوجھی آئی اک بھردے بے پرواھا
امل ( عمل ) جے کیتا دنی وچ سے درگہ اوگاھا - ۹۸

بھریدا ( فریدا ) دریاوے کنے بگلا بیٹھا کیل کرے

کیل کریندے ھنجھ لو اچنتے باج ( باز ) پئے
باج ( باز ) پئے تس رب دے کیلاں وسریاں
جو من چت نہ چیتے سن سو گالی رب کیاں - ۹۹

ساڈھے ترے من دیہری چلے پانی ان
آئیو بندہ دنی وچ وت آسونی بھن
ملک‌الموت جاں آوسی سب درواجے ( دروازے ) بھن
تناں پیاریاں بھائیاں اگے دتا بنھہ
دیکھو بندہ چلیا چوہ جنیا دے کن
پھریدا ( فریدا ) اسل ( عمل ) جے کیتے دنی وچ درگاہ آئے کم - ۱۰۰

پھریدا ( فریدا ) ہوں بلہاری تن پنکھیاں جنگل جناں واس
ککر چگن تھل وسن رب نہ چھوڈن پاس - ۱۰۱

...... ...... ...... ......

پھریدا ( فریدا ) پچھلی رات نہ جاگیوھے جیوندڑو موئیوہ
جے تیں رب وساریا تاں رب نہ وسریؤہ - ۱۰۷

پھریدا ( فریدا ) کنت رنگاولا وڈا وے مہتاج ( بے محتاج )
اللہ سیتی رتیا ایہ سچاواں ساج ( ساز ) ۱۰۸

پھریدا ( فریدا ) دکھ سکھ اک کر دل تے لاہ وکار
اللہ بھاوے سو بھلا تاں لبھی دربار - ۱۰۹

پھریدا ( فریدا ) دنی وجائی وجدی توں بھی وجھے نال
سوئی جیؤ نہ وجدا جس اللہ کردا سار - ۱۱۰

پھریدا ( فریدا ) دل رتا اس دنی سیوں دنی نہ کتے کم
مسل (مثل) پھکیراں (فقیراں) گاکھڑی سو پائیے پور کرم - ۱۱۱

...... ...... ...... ......

سبر ( صبر ) منجھ کانڑ اے سبر ( صبر ) کا لیہنٹو

سبر ( صبر ) سندا بان‌ؑ کھالک (خالق) کھتا ( خطا ) نہ کری ۔
115

سبر ( صبر ) اندر سابری ( صابری ) تن ایوے جالین
ھون نجیک ( نزدیک ) کھدائے ( خدائے ) دے
بھیت نہ کسے دین ۔ ۱۱۶
سبر ( صبر ) ایہہ سواؤ جے تو بندہ دڑ کرھے
ودہ تھیوھے درباؤ ٹوٹ نہ تھیوھے واھڑا ۔ ۱۱۷
پھریدا ( فریدا ) درویسی ( درویشی ) گا کھڑی چوبڑی پربت
اکنے کنے چالیئے درویساوی ( درویشاوی ) ریت ۔ ۱۱۸
[ گورو گرنتھ صاحب شلوک فرید ص ۱۳۷۷ تا ص ۱۳۸۴ ]

شیخ فرید جی کے بیان کردہ مندرجہ بالا کلام سے واضح ھے کہ ان کے زمانہ میں بولی جانے والی زبان میں بھی عربی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال رواج پڑ چکا تھا اور اس طرح اردو زبان کی بنیاد رکھی جا چکی تھی ۔

بھگت نام دیو جی کے نام سے جو کلام گوروگرنتھ صاحب میں درج ھے اس میں بعض ایسے شبد ھیں جنہیں ابتدائی اردو کا نمونہ کہ سکتے ھیں ۔ آپ فرماتے ھیں کہ :

میں اندھلے کی ٹیک تیرا نام کھوندکارہ ( خوندکارہ )
میں گریب ( غریب ) میں مسکین تیرا نام ھے آدھارا
کریما رھیما ( رحیما ) اللہ تو گنی ( غنی )
ھادرا ( حاضرہ ) ھدور ( حضور ) در بس (در پیش) تو منی (منیح)
درباؤ تو دھند تو بسیار تو دھنی
تو دانا تو بینا میں بیچار کیا کری
نامے چہ سوامی بکھسند ( بخشند ) تو ھری

[ گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ نام دیو ص ۲۷ ]

نام دیو جی کے اس شبد میں ھندی ، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے الفاظ استعمال کیے گئے ھیں اور اس کے معنے یہ ھیں :

میں اندھا ھوں اور خداوند تو ھی میرا سہارا ھے ۔ میں غریب اور مسکین ھوں تیرا نام ھی میرے لیے سب کچھ ھے ۔ اے رحیم اے کریم اللہ تعالیٰ تو ھی غنی ھے ، تو ھی حاضر ناظر ھے اور المتکبر ھے ۔ تو دریا ھے اور تو داتا ھے تیرے خزانے ھمیشہ بھرے رھتے ھیں ۔ تیرے سوا اور کوئی دوسرا دینے اور لینے والا نہیں ھے ۔ تو ھی (حقیقی) داتا اور بینا ھے ۔ میں تیری جملہ صفات بیان کرنے سے قاصر ھوں ۔ اے نام دیو کے مولا تو ھی بخشنہار ھے ۔

نام دیو جی کا ایک اور شبد یہ ھے :

ھلے یاراں ھلے یاراں کھسکھبری ( خوشخبری )
بل بل جاؤں ھوں بل بل جاؤں
لیکی تیری بیکاری آلا ( اعلیٰ ) تیرا ناؤں
کجا آمد کجا رپہتی ( رفتی ) کجا میروی
دوارکا نگری راس بگوئی
کھوب ( خوب ) تیری پگڑی میٹھے تیرے بول
دوارکا نگری کاھے کے مگول ( مغل )
چندیں ھجار ( ھزار ) آلم ( عالم ) ایکل کھانہ ( خانہ )
ھم چنیں پاتساہ ( پاتشاہ ) سانولے برنا
اسپت گج ہت نرا نرند
اسے کے سوامی میر مکند
[ گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ نام دیو ص ۲۷ ]

نام دیو جی کے نام سے درج شدہ اس شبد میں بھی فارسی ،

عربی اور ہندی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں عربی اور فارسی زبان کا اثر تمام ہندوستان میں پھیل چکا تھا اور لوگ اپنی تحریر و تقریر میں عربی اور فارسی کے الفاظ بھی بکثرت استعمال کیا کرتے تھے ۔

گورو گرنتھ صاحب کے ایک اور مقام پر نام دیو جی کے نام سے ایک اور لمبا شبد درج ہے ۔ اس میں بھی ہندی کے ساتھ عربی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال مثل سابق موجود ہے ۔ فرماتے ہیں :

سلتان ( سلطان ) پوچھے سن بے نامہ
دیکھوں رام تمھارے کاماں
نامہ سلتانے ( سلطانے ) باندھلا
دیکھوں تیرا میں ھر بیٹھلا
بسمل گؤ دیؤ جیوائے
ناتر گردن ماروں ٹھائے
بادساہ ( بادشاہ ) ایسی کیوں ہوئے
بسمل کیا جیوے نہ کوئے
میرا کیا کچھو نہ ہوئے
کرے رام ہوئے ہے سوئے
بادساہ ( بادشاہ ) چڑھیو اھنکار
گج ھستی دینوں چمکار
...... ......
کاجی ( قاضی ) ملاں کریں سلام
ان ہندو میرا ملیا مان
بادساہ ( بادشاہ ) بینتی سنیو
نامے سر بھر سونا لیھو
مال لیؤں تو دوجک ( دوزخ ) پڑوں

دین چھوڑ دنیا کو بھروں
پاؤں بیڑی ہاتھوں تال
نامہ گاوے گن گوپال
گنگ جمن جیوں الٹی بہے
تو نامہ ہر کرتا رہے
سات گھڑی جب بیتی سنی
اجہوں نہ آئیو تربھون دھنی
...... ......
کبھے تو دھرنی اکوڈی کروں
کبھے تو لے کر اوپر دھروں
کبھے تو موئی گؤ دیوں جیائے
سب کوئی دیکھے پتیائے
نامہ پرنوے سیل مسیل
گؤ دوہائی بچھرا میل
دودھہ دوھے جب مٹکی بھری
لے بادساہ ( بادشاہ ) کے آگے دھری
بادساہ ( بادشاہ ) مہل ( محل ) میں جائے
اوگھٹ کی گھٹ لاگی آئے
کاجی ( قاضی ) ملاں بینتی فرمائے
بکھسی ( بخشی ) ہندو میں تیری گائے
نامہ کہے سنو بادساہ ( بادشاہ )
ایہ کچھ پتیا مجھے دکھائے
ایہ پتیا کا ایہ پروان
ساچ سیل چالہو سلتان ( سلطان )
[ گورو گرنتھ صاحب بھیروں نام دیو ص ۶۶ - ۱۱۶۵ ]

نام دیو جی کے ایک اور شبد سے بھی ہم اسی نتیجہ تک پہنچتے

ہیں کہ اس زمانے میں ہندی الفاظ کے ساتھ عربی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال جاری ہو چکا تھا ۔ اسے ہم اردو کی ابتدائی حالت کا درجہ دے سکتے ہیں ۔ دیکھیے :

مائے نہ ہوتی باپ نہ ہوتا کرم نہ ہوتی کائیا
ہم نہیں ہوتے تم نہیں ہوتے کون کہاں تے آیا
...... ...... ...... ......
چند نہ ہوتا سور نہ ہوتا پانی پون ملایا
شاست نہ ہوتا بید نہ ہوتا کرم کہاں تے آیا

[ گورو گرنتھ صاحب راگ رام کلی نام دیو ص ۹۷۳ ]

یعنی ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ نہ ماں تھی ، نہ باپ تھا اور نہ کسی کا کوئی عمل تھا اور نہ کسی کا جسم ہی تھا ۔ ہم بھی نہیں تھے، تم بھی نہیں تھے اور کوئی بھی نہیں تھا... اس وقت یہ چاند اور سورج بھی نہیں تھے اور پانی اور ہوا کا بھی کوئی نام و نشان نہ تھا ۔ اس وقت شاستر اور ویدوں کا بھی کوئی وجود نہ تھا ۔ اس وقت کرم ( اعمال ) کہاں سے آ گئے تھے ۔

ہندو قوم کا یہ نظریہ ہے کہ ہر انسان کی پیدائش اس کے سابقہ اعمال کا نتیجہ ہے اور جس قدر بھی جاندار چیزیں چرندے، پرندے ، درندے ، کیڑے مکوڑے اور سبزیاں ، ترکاریاں ہیں یہ سب پچھلے جنم میں انسان تھے اور اپنے برے اعمال کے نتیجہ میں اب کوئی ھاتھی بن گیا ہے اور کوئی شیر ۔ کسی کو چوہے کا جنم مل گیا ہے اور کوئی بلی کی شکل میں پیدا ہو گیا ہے ۔ کوئی ٹماٹر بن گیا ہے اور کسی نے بیگن کی شکل اختیار کر لی ہے ۔ ایسے لوگوں سے نام دیو جی نے اپنے اس شبد میں سوال کیا ہے جب کہ کسی چیز کی تخلیق نہیں ہوئی تھی اس وقت یہ چاند ، سورج اور ستارے بھی موجود نہیں تھے اگر کسی ذی روح کی پیدائش اس کے پچھلے جنم کے اعمال کا نتیجہ ہے تو اس وقت اس کے اعمال کہاں سے آ گئے اور کس نے وہ

اعمال کیے تھے کیونکہ اس وقت تو کچھ بھی نہیں تھا ۔ موجودہ زمانے کا سائنسدان بھی اس نظریہ کا حامل ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب کہ زندگی ظہور میں نہیں آئی تھی اور یہ چاند، سورج، ستارے وغیرہ بھی نہیں تھے ۔

نام دیو جی کا یہ شبد بھی گورو گرنتھ صاحب میں درج ہے :

آؤ کلندر ( قلندر ) کیسوا
کر ابدالی بھیسوا
جن اکاس ( اکاش ) کلاہ سر کینی کوسے ( کفش ) سبت پیالہ
چمر بوس ( پوش ) کا مندر تیرا ایہ بدھ بنے گوپالا
چھپن کوٹ کا پہن تیرا سولہ سہس اجارہ ( آزارہ )
بھار اٹھارہ مدگر تیرا سہنک ( صحنک ) سب منسارا
دیہی مہجد (مسجد) من مولانا سہج نواج (نماز) گجارے ( گزارے)
بی بی کولاں سو کائن ( قائن ) تیرا نام نرنکار آکارے
بھگت کرت میرے تال چھنانے کہ پہ کروں پکارا
نامے کا سوامی انتر جامی پھرے سگل بے دیسوا
[ گورو گرنتھ صاحب بھیروں نام دیو ص ۱۱۶۷ ]

نام دیو جی کے اس شبد میں بھی ہندی کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں البتہ ان کی شکلیں کچھ بدل دی گئی ہیں ۔ مثلاً کفش کو کوسے، چرم پوش کو چمر پوش، پیراہن کو پہن، مسجد کو مہجد اور نماز کو نواج کی شکل دے دی گئی ہے ۔

گورو گرنتھ صاحب کے علاوہ کبیر جی کا اور کلام بھی ملتا ہے اور بعض کتابیں ''کبیر بیجک'' وغیرہ بھی ان کی طرف منسوب ہیں ۔ گورو گرنتھ صاحب کے بعض قلمی نسخوں میں تو کبیر جی کی بانیاں مروجہ گورو گرنتھ صاحب سے بھی زیادہ درج ہیں ۔

بعض ودوانوں نے کبیر جی کو گورو نانک جی کا اور بعض نے گورو نانک جی کو کبیر جی کا گورو ظاہر کیا ہے - بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ گورو نانک جی اور کبیر جی میں کبھی ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی ، کیونکہ گورو نانک جی جب بنارس گئے ہیں کبیر جی وفات پا چکے تھے - کبیر جی کی زندگی میں گورو جی کا بنارس جانا ثابت نہیں -

بھگت کبیر جی کے کلام میں بعض ایسے شبد بھی موجود ہیں جن میں ہندی کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں جو اس زمانہ کی ریختہ کا نمونہ کہے جا سکتے ہیں جیسا کہ ذیل کے شبد سے ظاہر ہے :

**راجہ رام توں ایسا**
**نربھو ترن تارن رام رائیا**
**جب ہم ہوتے تب تم ناہیں ، اب تم ہو ہم ناہیں**
**اب ہم تم ایک بھئے ہیں ایکے دیکھت من پتی آھی**
**جب بدھ ہوتی تب بل کیسا اب بدھی بل نہ کھٹائی**
**کہ کبیر بدھ ہر لئی میری بدھ بدلی سدھ پائی**
**کھٹ نیم کر کوٹھڑی باندھی بست انوپ بیچ پائی**
**کنجی کلیپھ (قفل) پران کر راکھیے کرتے بار نہ لائی**
**اب من جاگت رہ رے بھائی**
**گابھل ( غافل ) ہوئے کے جنم گوائیو چور مسے گھر جائی**
**پنچ پہروآ در میں رہتے تن کا نہیں پتی آرا**

کلام میں یہ الفاظ بکثرت استعمال کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ گو اس زمانے میں اردو زبان ابھی وجود میں نہیں آئی تھی تاہم اس کی داغ بیل پڑنی ضرور شروع تھی اور لوگ ہندی الفاظ کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی الفاظ بھی بکثرت استعمال کرنے لگے تھے -

اس سلسلہ میں کبیر جی کا ایک یہ شبد بھی پیش کیا جا سکتا ہے :

ایک کوٹ پنچ سکدارا پنچے مانگیں ھالہ (حالہ)
جمی (زمیں) نہیں کسی کی بوئی ایسا دین دکھالا
ہر کے لوگا مو کو نیت ڈسے پٹواری
اوپر بھجا کر میں گور ہہ ہکاریا تن ہوں لیا اباری
نو ڈاڈی دس منسف (منصف) دھاوہں رئیت (رعیت) بسن نہ دیہی
ڈوری پوری ماپے ناھیں بہ بسٹالا لیہی
بہتر گھر اک پورکھ سمایا ان دیا نام لکھائی
دھرم رائے کا دھپتر (دفتر) سودھیا باکی رجم (باقی رزم) نہ کائی
[گورو گرنتھ صاحب راگ سوھی کبیر ۷۹۳]

کبیر جی کے اس شبد میں بھی زمین ، منصف ، رعیت ، دفتر ، باقی اور رزم وغیرہ الفاظ عربی اور فارسی زبان کے ھیں ۔

ایک اور مقام پر بھی کبیر جی نے بیان کیا ہے کہ :

امل (عمل) سرانو لیکھا دینا
آئے کٹھن دوت جم لینا
کیا تیں کھٹیا کہاں گوایا
چلہو ستاب (شتاب) دیبان بلایا
ہر پھرمان (فرمان) درگاہ کا آیا
کروں ارداس گاو کچھ باکی (باقی)
لیؤ نبیر آج کی راتی
کچھ بھی کھرچ (خرچ) تمھارا ساروں
سبہ (صبح) نواج (نماز) سرائے گجاروں (گزاروں)
سادہ سنگ جاں کو ہر رنگ لاگا
دھن دھن سو جن پرکھ سبھاگا
ایت اوت جن سدا سہیلے

جنم بدارتھ جیت اسولے
جگت سویا جھنم گوایا
مال دھن جوریا بھیا پرایا
کہ کبیر تئی نو بھولے
کھسم (خصم) بسار ماٹی سنگ رولے

[گورو گرنتھ صاحب سوھی کبیر ۹۲ے]

ایک اور مقام پر کبیر جی کا یہ شبد درج ہے :

من کر مکہ کبلہ (قبلہ) کر دیہی
بولن ھار پرم گور ایہی
کہہ رے ملاں بانگ نواج (نماز)
ایک مسیت دسے درواج (درواز)
مسمل تاس بھرم کدوری (قدوری)
بھا کہہ لے نیچے ھوئے سبوری (صبوری)
ھندو ترک کا ساھب (صاحب) ایک
کہ کرے ملاں کہ کرے سیکھ (شیخ)

[گورو گرنتھ صاحب]

کبیر جی کے اور بھی متعدد شبد ایسے ھیں جن میں ریختہ زبان کی جھلک ھے - ذیل میں ھم ان کے چند شبد اور درج کیے دیتے ھیں :

۱ - ھمرا جھگرا رھا نہ کوؤ
پنڈت ملاں چھاڈے دؤو
... ... ...
پنڈت ملاں جو کچھو لکھ دیا
چھاڈ چلے ھم کچھو نہ لیا
ردے اکھلاس (اخلاص) نرکھ لے میرا
آپ کھوج کھوج ملے کبیرا

[ گورو گرنتھ صاحب بھیروں کبیر ۱۱۵۹]

۲ - سو ملاں جو من سیوں لرے
گور اپدیش نال سیوں جرے
کال پورکھ کا مردے مان
تس ملاں کو سدا سلام
ہے ہجور (حضور) کت دور بتاؤ
دندر بادھو سندر پاؤ -
کاجی (قاضی) سو جو کائیاں بیچارے
کائیاں کی اگن برہم پرجارے
... ... ...
جوگی گورکھ گورکھ کرے
ھندو رام نام اچرے
مسلمان کا ایک خدائے
کبیر کا سوامی رھیا سمائے

۳ - ستر سے سالار ھیں جاں کے
سوا لاکھ پیکابر (پیغمبر) تاں کے
سیکھ (شیخ) جو کہئیے کوٹ اٹھاسی
چھپن کوٹ جاں کے کھیل کھلاسی (خیل خلاصی)
مو گریب (غریب) کی کو گجراوے (گزراوے)
مجلس دور مہل (محل) کو پاوے
تیتیس کروڑی ہے کھیل کھانہ (خیل خانہ)
چوراسی لکھ پھرے دیوانہ
بابا آدم کو کچھ ندر (نظر) دکھائی
ان بھی بھست (بہشت) گھنیری پائی
دل کھلبھل (خلل) جاں کے جرد روبانی (زرد روبانی)
چھوڈ کیتب کرے سیتانی (شیطانی)

دنیا دوس (دوش) روس ہے لوئی
اپنا کیا پاوے سوئی
تم داتے ہم سدا بھکھاری
دیؤ جواب ہوئے بجگاری ( بزہ‌گاری )
داس کبیر تیری پناہ سمانا
بھست ( بہشت ) نجیک (نزدیک) را کھ رھمانا ( رحمانا )

[ گورو گرنتھ صاحب بھیروں کبیر ص ۱۱۶۱ ]

۴ - اول اللہ نور اپایا کدرت ( قدرت ) کے سب بندے
ایک نور تے سب جگ اپجیا کون بھلے کو مندے
لوگا بھرم نہ بھولو بھائی
کھالک کھلک (خالق خلق) کھلک ( خلق ) میں کھالک (خالق)
پور رھیو سرب ٹھائی
ماٹی ایک انیک بھانت کر ساجی ساجن ھارے
نہ کچھ پوچ ماٹی کے بھانڈے نہ کچھ پوچ کمھارے
سب میں سچا ایکو سوئی تس کا کیا سب کچھ ہوئی
ھکم ( حکم ) پچھانے سو ایکو جانے بندہ کہیئے سوئی
اللہ الکھ نہ جائی لکھیا گور گڑ دینا میٹھا
کہہ کبیر میری سنکا ناسی سرب نرنجن ڈیٹھا
[ گورو گرنتھ صاحب پربھاتی کبیر ص ۱۳۵۰ ]

۵ - اللہ ایک مسیت بست ہے اور ملک کس کیرا
ھندو مورت نام نواسی دوہ میں تت نہ ھیرا
اللہ رام جیؤں تیرے نائیں
تو کر مہرامت ( محرامت ) سائیں
دکھن دیس ھری کا باسا پچھم اللہ مقاما
دل میں کھوج دلے دل کھوجو ایہی ٹھور مقاما
براھمن گیاس ( غیاث ) کرھے چوبیسا

کاجی ماہ رمجانا ( قاضی ماہ رمضانا )
گیارہ ماس پاس کے راکھے ایکے ماھیں ندھانا
کہاں اڈیسے مجن کیا کیا مسیت سر نائیں
دل میں کپٹ نواج ( نماز ) گزارھیں کیا
ھج ( حج ) کابے ( کعبہ ) جائیں
اپنے اورت ( عورت ) مرداں ساجے ایہ سب روپ تمہارے
کبیر پونگرا رام اللہ کا سب گور پیر ھمارے
[ گورو گرنتھ صاحب پربھاتی کبیر ص ۱۳۴۹ ]

۶ ۔ جب ہم ایک ایکو کر جانیا
تب لوگا کاھے دکھ مانیا
ہم اپتہ اپنی پت کھوئی
ھمری کھوج پرو مت کوئی
ہم مندے مندے من ماھی
سانجھ بات کاھو سیوں ناھی
پت اپتہ تاں کی نہیں لاج
تب جانوگے جب اگھرے گو باج
کہ کبیر پت ھر پروان
سرب تیاگ بھج کیول نام
[ گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۲۷ ]

۷ ۔ نگن پھرت جو پائیے جوگ
بن کا مرگ مکت سب ھوگ
کیا ناگے کیا باندھے چام
جب نہیں چنیس آتم رام
[ گوروگرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۲۴ ]

۸ ۔ گربھ واس میں کل نہیں جاتی
برہم بندتے سب اتپاتی

کہ رے پنڈت بامن کب کے ہوئے
براہمن کہ کہ جنم مت کھوئے
جو تو براہمن براہمنی جایا
تو آن باٹ کاہے نہیں آیا
تم کت براہمن ہم کت سود
ہم کت لہو تم کت دودھ
کہ کبیر جو برہم بیچارے
سو براہمن کہیئت ہے ہمارے

[ گورو گرنتھ صاحب راگ گوڑی ص ۳۲۴ ]

۹ - ایسے اچرج دیکھیو کبیر
ددھ کے بھولے برولے نیر
ہری انگوری گدھا چرے
نت اٹھ ہاسے ہینگے مرے

[ گورو گرنتھ صاحب راگ گوری کبیر ص ۳۲۶ ]

۱۰ - چوآ چندن مردن انگا
سوتن جلے کاٹھ کے سنگا
اس تن دھن کی کون بڑائی
دھرن پرے اروار نہ جائی
رات جے سوویں دن کریں کام
اک کھن لیں نہ ہر کو نام
ہاتھ تاں ڈور مکھ کھائیو تمبور
مرتی بار کس باندھیو چور
کہت کبیر چیت رے اندھا
ست رام جھوٹا سب دھندا

[ گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۲۶ ]

۱۱ - تن من دھن گرہ سونپ سریر
سوئی سوہاگن کہے کبیر

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۲۸]

۱۲ - سکھ مانگت دکھ آگے آوے
سو سکھ ھمھوں نہ مانگیا بھاوے

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۳۵]

۱۳ - کون کو پوت پتا کو کا کو
کون مرے کو دے سنتاپو
ہر ٹھگ جگ کو ٹھگوری لائی
ہر کے بیوگ کیسے جیوں میری مائی

...... ...... ......

کہ کبیر ٹھگ سوں من مانیا
گئی ٹھگوری ٹھگ پہچانیا

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۳۱]

۱۴ - ہر جس سنیں نہ ہر جس گاویں
باتن ھی آسمان گراویں
آپ گئے اورن ہوں کھوویں
آگ لگائے مندر میں سوویں
اورن ھست آپ ھیں کانے
تن کر دیکھ کبیر لجانے

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۳۲]

۱۵ - پھرمان ( فرمان ) تیرا سرے اوپر پھر نہ کرت بیچار
تو ھی دریا تو ھی کریا تجھے تے نستار
بندے بندگی اکھتیار ( اختیار )
ساھب ( صاحب ) روس دھروں کہ پیار
نام تیرا آدھار میرا جیوں پھول جئی ہے نار
کہ کبیر گلام ( غلام ) گھر کا جیائے بھاویں مار

[ گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۳۸ ]

۱۶ - جب ہم ہوتے تم ناھیں اب تم ھو ہم ناھیں
اب ہم تم ایک بھئے ھیں ایکے دیکھت من پتی آھیں

[ گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۳۹ ]

۱۷ - ترک تریکت ( طریقت) جانیئے ھندو وید پوران
من سمجھاون کارنے کچھوا ک پڑھیئے گیان

[ گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۴۰ ]

۱۸ - لنکا سا کوٹ سمند سی کھائی
ته راون گھر کھبر ( خبر ) نه پائی
کیا مانگوں کچھ تھر نه رھائی
دیکھت نین چلیو جگ جائی
اک لکھ پوت سوا لکھ ناتی ( ناطی )
چیت سچیت چت ھونے رہ تو لے پرگس اجی‌آرا
نو گھر دیکھ جو کامنی بھولی بست انوپ نه پائی
کہت کبیر نوے گھر مو سے دسویں تت سمائی

[ گورو گرنتھ صاحب ورگ گوڑی کبیر ۳۲۹ ]

گورو گرنتھ صاحب کے ایک اور مقام پر کبیر جی کا یہ شبد درج ہے :

وید کتب اپھترا (افتراء) بھائی دل کا فکر (بھکر) نه جائے
ٹک دم کراری ( قراری ) جو کرو
ھاجر ھجور کھدائے (حاضر حضور خدائے)
بندے کھوج دل ھر روج (روز) نه پھر پریسانی (پریشانی) ماھیں
ایه جو دنیا سہر (سحر) میلا دستگیری ناھیں
دروگ (دروغ) پڑھ پڑھ کھسی (خوشی) ھوئے
بے کھبر (بے خبر) باد بکاھیں

هک (حق) سچ کھالک (خالق) کھلک (خلق) میانے
سیام مورت ناھیں
اسہان لہنگ دریا گسل (غسل) کردن بوَد
کر پھکر (فقر) دائم لائے چسمے (چشمے) جہاں تہاں موجود
اللہ پاکنگ پاک ھے سک (شک) کروں جے دوسر ہوئے
کبیر کرم کریم کا اوہ کرے جانے سوئے

[گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ کبیر ص ۷۲۷]

کبیر جی کے اس شبد میں افترا، دل، فکر، حاضر حضور، خدا، بندے، ھر روز، پریشانی، دنیا، سحر، دستگیری، دروغ، خوشی، بے خبر، باد، حق، سچ، خالق، خلق، دریا، غسل، کردن، بود، فقر، دائم، چشم، موجود، اللہ پاک، شک، کرم، کریم وغیرہ الفاظ عربی اور فارسی زبان کے ھیں - کبیر جی کا اپنے

گورو گرنتھ صاحب میں جن بھگتوں کے نام سے کلام درج ھے ان میں بھگت روداس جی بھی شامل ھیں -

بھگت روداس جی نے اپنے کلام میں ھندی کے ساتھ فارسی اور عربی کے الفاظ بھی استعمال کیے ھیں - آپ کے ان شبدوں کو اس زمانے کی ریختہ کا نمونہ کہا جا سکتا ھے جو ھندی اور اردو کی درمیانی کڑی ھے اور بعد کو اردو کی مستقل شکل اختیار کر گئی - آپ فرماتے ھیں:

بے گم ( بے غم ) ہورہ سہر ( شہر ) کو ناؤں
دوکھ اندوہ نہیں تہ ٹھاؤں
نہ تسویس کھراج ( تشویش خراج ) نہ مال
کھوپھ نہ کھتا ( خوف نہ خطا ) ترس نہ جوال ( زوال )
اب موھے کھوب ( خوب ) وتن ( وطن ) گہ پائی
اوھاں کھیر ( خیر ) سدا میرے بھائی
کائم دائم ( قائم دائم ) سدا پاتساھی ( باتشاھی )

دوم نہ سیم ( سوم ) ایک سو آھی
اباداں سدا مسہور ( مشہور )
اوھاں گنی ( غنی ) بسیں ماسور ( معمور )
تیوں تیوں سیل کرہں جیوں بھاوے
مہرم مہل ( محرم محل ) نہ کو اٹکاوے
کہ روداس کہلاس ( خلاص ) چمارا
جو ہم سہری ( شہری ) سو میت ہمارا

[ گورو گرنتھ صاحب گوڑی روداس ص ۳۴۵ ]

بھگت روداس جی کے اس شبد میں بے غم پورہ ، شہر ، تشویش ، خراج ، مال ، خوف ، خطا ، ترس ، زوال ، خوب ، وطن ، خیر ، قائم دائم ، پاتشاھی ، دوم ، سیم ( سوم ) ، اباداں ، مشہور ، غنی ، معمور ، محرم اور محل وغیرہ الفاظ فارسی اور عربی کے ھیں ۔ ھندی شاعری میں ان الفاظ کا استعمال ھند میں اردو زبان کی بنیاد رکھے جانے اور ھندی اور اردو کی درمیانی کڑی کا پتا دیتا ھے ۔

بھگت روداس جی نے اپنے کلام میں اور بھی کہیں کہیں فارسی اور عربی کے الفاظ استعمال کیے ھیں ۔ ذیل میں ھم ان کے بعض نمونے پیش کرتے ھیں :

۱ ۔ تم چندن ہم ارنڈ باپ رے سنگ تمھارے باسا
نیچ روکھ تے اوچ بھئے ھیں گندھ سو گندھ نواسا

...... ...... ...... ......

تم مکھتول ( مخمول ) سپید سپیئل ہم بپررے جس کیرا
ست سنگت مل رھیئے مادھو مدھوپ مکھیرا
جاتی اوچھی پاتی اوچھی اوچھا جنم ہمارا
راجہ رام کی سیو نہ کینی کہ روداس چمارا

[ گورو گرنتھ صاحب ص ۴۸۶ ]

۲ - جب ہم ہوتے تب تو ناہیں اب توھی میں ناھیں
الل اگم جیسے ھرئیو دده جل کیول جل مانہیں

[ گورو گرنتھ صاحب سورٹھ روداس ص ۶۵۷ ]

۳ - جو ہم باندھے موہ پھاس میں ہم پریم بندھن تم باندھے
اپنے چھوٹن کو جتن کرو ہم چھوٹے تم ارادھے

[ گورو گرنتھ صاحب سورٹھ روداس ص ۶۵۸ ]

۴ - جو تم گرور تو ہم مورا
جو تم چند تو ہم بھئے ہے چکورا
مادھو تم نہ تورو ہم نہیں توریں
تم سیوں تور کون سیوں جوریں
جو تم دیورا تو ہم باتی
جو تم تیرتھ تو ہم جاتی
ساچی پریت ہم تم سیوں جوری
تم سیوں جور اور سنگ توری
جہ جہ جاؤں تہاں تیری سیوا
تم سوں ٹھاکر اور نہ دیوا

[ گورو گرنتھ صاحب سورٹھ روداس ص ۶۵۸ ]

۵ - ماٹی کو پترا کیسے نچت ہے
دیکھے دیکھے سنے بولے دوریو پھرت ہے
جب کچھ پاوے تب گرب کرت ہے
مائیا گئی تب رون لگت ہے

[ گورو گرنتھ صاحب آسا روداس ص ۴۸۷ ]

۶ - سہ ( شہ ) کی سار سوھاگن جانے
تج ابھمان سکھ رلیاں مانے
...... ......

سوکت جانے پیر پرائی
جاں کے اندر درد نہ پائی
دکھی دوھاگن دوئے پکھ ھینی
جن ناہ نرنتر بھگت نہ کینی
پرسلات ( پل صراط ) کا پنتھ دوھیلا
سنگ نہ ساتھی گون اکیلا
دکھیا درد وند در آیا
بہت پیاس جواب نہ پایا
کہ روداس سرن پربھ تیری
جیوں جانو تیوں کرگت میری

[ گورو گرنتھ صاحب راگ سوھی روداس ص ۷۹۳ ]

۷ ۔ ناتھ کچھوآ نہ جانو
من مایا کے ھاتھ بکانو
تم کہیئت ھو جگت گور سوامی
ھم کہیئت کل جگ کے کامی
ان پنچن میرو من جو بگاریو
پل پل ھر جی کے انتر پاریو
جت دکھیو تت دکھ کی راسی
اجوں نہ پتانے نگم بھئے ساکھی

...... ...... ......

کہ روداس کیا کیسے کیجے
بن رگھوناتھ سرن کا کی لیجے

[ راگ جیتسری روداس ص ۷۱۰ ]

۸ ۔ اونچے مندر سال رسوئی
ایک گھری بھن رھن نہ ھوئی

ایہ تن ایسا جیسے گھاس کی ٹاٹی
جل گیو گھاس رل گیؤ ماٹی
بھائی بندھ کٹنب سہیرا
کبر کی نار ارھے تن لاگی
اوہ تو بھوت بھوت کر بھاگی
کہ روداس سبھے جگ لوٹیا
ہم تو ایک رام کہ چھوٹیا
[گورو گرنتھ صاحب راگ سوھی روداس ص ۷۹۰]

۹ - ھمرا کہا کرے سنسار
سٹی ذات ھونے دربار
[گورو گرنتھ صاحب راگ گونڈ روداس ص ۸۷۵]

۱۰ - ایسی لال تجھ بن کون کرے
گریب نواج (غریب نواز) گو سائیں میرا ماتھے چھتر دھرے
... ... ...
نیچوں اوچ کرے میرا گوبند کاھو تے نہ ڈرے
[گورو گرنتھ صاحب مارو روداس ص ۱۱۰۴]

۱۱ - پھل کارن پھولی بن رائے
پھل لاگا تب پھول بلائے
[گورو گرنتھ صاحب راگ بھیروں روداس ص ۱۱۶۷]

۱۲ - کہ روداس بھیؤ جب لیکھو
جوئی جوئی کینو سوئی سوئی دیکھو
[گورو گرنتھ صاحب راگ بلاول روداس ص ۱۲۹۳]

۱۳ - پنڈت سور چھتر پت راجہ
بھگت برابر اور نہ کوئے
[گورو گرنتھ صاحب راگ بلاول روداس ص ۸۵۸]

ذیل میں ہم گورو نانک جی کے کلام سے بعض ایسے شبد پیش کیے دیتے ہیں جن میں ہندی ، عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں - اسے اس زمانہ کی ریختہ کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے - راگ تلنگ میں آپ کا یہ شبد درج ہے :

یک ارج (عرض) گپھتم (گفتم) پیس تو (پیش تو)
در گوس (گوش) کن کرتار
ہکا (حقا) کبیر کریم تو بے ایب (بے عیب) پروردگار (پروردگار)
دنیا مکام بیانی (مقام فانی) تہکیک (تحقیق) دل دانی
مم سر موئے اجرائیل (عزرائیل) گرپہتہ (گرفتہ) دل ہیچم نہ دانی
جن (زن) پسر پدر برادراں کس نیس دستگیر (دستگیر)
آخر بیپھتم (بیفتم) کس نہ دارد چوں سود (شود) تکبیر
سب روج (شب روز) گستم (گشتم) در ہوا
کردیم بدی کیھیال (خیال)
گاہے نہ نیکی کار کردم مم ایں چنی اہوال (احوال)
بد بکھت (بد بخت) ہم چوں بکھیل گاپھل (بخیل غافل)
بے نجر (بے نظر) بے باک
نانک بگوید جن ترا تیرے چاکراں پا کھاک (خاک)
[گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ محلہ - ۱ ۲۱]

گورو نانک جی نے اس شبد میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں - مشہور سکھ سکالر پروفیسر تیجا سنگھ جی نے بیان کیا ہے کہ گورو نانک جی کے اس شبد کی زبان ہندی اور اردو کی درمیانی کڑی (ریختہ) ہے -

گورو نانک جی کے کلام میں اور بھی متعدد ایسے شبد ہیں جن میں آپ نے ہندی ، عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کیے ہیں -

---

۱ - عبرت نامہ ص ۱۶۱ -

ذیل میں ہم چند اور نمونے پیش کیے دیتے ہیں :

۱ - جو تدھ بھاوے سائی بھلی کار
تو سدا سلامت نرنکار
[ گورو گرنتھ صاحب ص ۴ ]

۲ - بابا اللہ اگم اپار
پاکی نائیں پاک تھائیں سچا پرودگار ( پروردگار )
...... ...... ......
پیر پیکامبر ( پیغمبر ) سالک سادک ( صادق )
سہدے (شہدے) اور سہید ( شہید )
سیکھ مسائک ( شیخ مشائخ ) کاجی ( قاضی ) ملاں
در درویس رسید ( درویش رشید )
برکت تن کو اگلی پڑھدے رھن درود
[ گورو گرنتھ صاحب ص ۵۳ ]

۳ - مکام ( مقام ) کر گھر بیسنا نت چلنے کی دھوکھ
مکام ( مقام ) تاں پر جانیٔے جاں رہے نہچل لوک
دنیا کیس مکامے ( مقامے )
کر سدک ( صدق ) کرنی کھرچ ( خرچ ) باندھو لاگ رھو نامے
جوگی تاں آسن کر بہے ملاں بہے مکام ( مقام )
پنڈت وکھانے پوتھیاں سدھ بہن دیو ستھان
سر سدھ گن گندھرب منی جن سیکھ ( شیخ ) پیر سالار
در کوچ کوچا کر گئے اور بھی چلن ہار
سلتان کھان (سلطان خان) ملوک امرے (امرا) گئے کر کر کوچ
گھڑی مہت کہ چلنا دل سمجھ توں بھی پہوچ
...... ...... ...... ......
اللہ الکھ اگم کادر ( قادر ) کرن ہار کریم
سب دنی آون جاونی مکام ( مقام ) ایک رھیم ( رحیم )

مکام ( مقام ) تس لوں آ کہیئے جس مس نہ هووی لیکھ
آسمان دھرتی چلسی مکام ( مقام ) اوھی ایک
دن رو چلے نس مس چلے تارکا لکھ پلوئے
مکام ( مقام ) اوھی ایک ہے نانکا سچ بگوئے
[ گورو گرنتھ صاحب سری راگ محلہ ۱ ص ۶۴ ]

۴ - مہر مسیت سدک مسلا ( صدق مصلے )
هک هلال ( حق حلال ) کران ( قران )
سرم ( شرم ) سنت سیل روجه ( روزه ) هوهو مسلمان
کرنی کابا ( کعبه ) سچ پیر کلما ( کلمه ) کرم نواج ( نماز )
تسبیه ( تسبیح ) ساتس بهاوسی نانک رکھے لاج
[ گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ ۱ ص ۱۴۰ ]

۵ - مسلمان کہاون مسکل ( مشکل ) جاں هوئے تاں مسلمان کہاوے
اول اول دین کر مٹھا مسکل ( مشکل ) مانا مال مساوے
هوئے مسلم دین مہانے مرن جیون کا بهرم چکاوے
رب کی رجائے ( رضائے ) منے سر اوپر کرتا منے آپ گواوے
تو نانک سرب جیاں میں مہرمت هوئے تاں مسلمان کہاوے
[ گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ ۱ ص ۱۴۱ ]

۶ - راجے رئیت ( رعیت ) سکدار ( شکدار ) کوئے نہ رهسی او
هٹ پٹن باجار ( بازار ) هکمی ( حکمی ) ڈھسی او
پکے بنک دوار مور کنہ جانے آپنے
درب بھرے بھنڈار ریتے اک کھنے
تاجی ( تازی ) رکھ تکھار ( تخار ) هاتھی پا کھرے ( پاخرے )
باگ ( باغ ) ملکھ ( ملک ) گھر ہار کتھے سے آپنے
تمبو پلنگ نوار سرائچے لالتی
نانک سچ داتار سنا کھت ( شناخت ) کدرتی ( قدرتی )

[ گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ ۱ ص ۱۳۰ ]

۷ - ھک ( حق ) پرایا نانکا اس سؤر اس گانے
گور پیر ھامہ ( حامہ ) تاں بھرے جاں مردار نہ کھانے
گیں بھست ( بہشت ) نہ جانیے چھوٹے سچ کانے
مارن پاہ ھرام ( حرام ) میں ھوئے ھلال ( حلال ) نہ جانے

نانک گلیں کوڑی‌ئی کوڑ ہلے پائے
پنج نماجاں وکھت ( نمازاں وقت ) پنج پنجے پنجاں ناؤں
پہلا سچ ھلال ( حلال ) دوئے تیجی کھیر کھدائے (خیر خدائے)
چوتھی نیت راس من پنجویں سپھت سنائے ( صفت ثنائے )
کرنی کلما (کلمہ) آکھ کے تاں مسلمان سدائے
[ گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ ۱ ص ۱۴۱ ]

۸ - بدپھیلی گیبانا کھسم ( بدفعلی غائبانہ خصم ) نہ جانئی
سو کہیے دیوانہ آپ نہ پچھانئی
کلہے بری سنسار وادے کھپیئے
بن ناویں ویکار بھرمے پچیئے
راہ دوویں اک جانے سوئی سجھسی
کبھو ( کفر ) گوکھرانے ( کفرانے ) پیا دجھسی
سب دنیا سبحان ( سبحان ) سچ سمائیے
سجھیے در دیوان آپ گوائیے
[ گوروگرنتھ صاحب وار ماجھ ص ۱۳۲ ]

۹ - ہیچے کی سرکار جگ جگ جانیئے
ھکم ( حکم ) منے سردار در دربانیئے
پھرمانی ( فرمانی ) ھے کار کھسم ( خصم ) پٹھایا
تبل باج ( طبل باز ) بیچار سبد ( شبد ) سنایا
اک ھوئے اسوار اکناں ساکھتی ( ساختی )

اکناں بدھے بھار اکناں تا کھتی ( تاختی )

[ گوروگرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ۱ ص ۱۴۲ ]

۱۰ ۔ ع جیر جمیں ( زیر زمیں ) دنیا پیرا مسائکا ( مشائخا ) رائیا
مے روند بادساہ ( بادشاہ ) ابھجوں کھدائے ( افزوں خدائے )
ایک توھی ایک توھی
نہ دیو دانوا نرا
نہ سدھ سادھکا دھرا
است ایک دگر کوئی
ایک توئی ایک توئی
دادے دھند آدمی
نہ سپت جیر جمیں ( زیر زمیں )
است ایک دگر کوئی
ایک توئی ایک توئی

...... ......

نہ رجک ( رزق ) دست آں کسے
ھما را ( ہمہ را ) ایک آس وسے
است ایک دگر کوئی
ایک توئی ایک توئی
پرندۂ نہ گرہ جر ( زر )
درکہت ( درخت ) آب آس کر
دھند سوئی
ایک توئی ایک توئی

[ گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ۱ ص ۱۴۴ ]

۱۱ ۔ سچا تیرا ھکم ( حکم ) گور موکھی جانیا
گورمتی آپ گوائے سچ پچھالیا

سچ تیرا دربار سبد ( شبد ) نیسانیا ( نشانیاں )
سچا سبد ( شبد ) ویچار سچ سمانیا
من مکھ سدا کوڑیار بھرم بھولانیا
وسٹا اندر واس ساد نہ جانیا
ون ناویں دکھ پائے آون جانیا
نانک پارکھ آپ جن کھوٹا کھرا پچھانیا
سیہاں ( شیہاں ) باجاں ( بازاں ) چرگں کوھیاں ایناں کھوالے گھاہ
گھاھو کہان تناں ماس کھوالے ایہ چلائے راہ
ندیاں وچ ٹبے دیکھالے تھلیں کرے اسگاہ
کیڑا تھاپ دیے پاتساھی ( پاتشاھی ) لسکر ( لشکر ) کرے سواہ
جینے جی جیوھے لے ساھا جیوالے تا کہ اساہ
[ گورو گرنتھ صاحب راگ ماجھ کی دار ص ۱۴۴ ]

چوھدری راجے نہیں کسے مکام ( مقام )
ساہ ( شاہ ) مریں سنجے مایا دام
میں دھن دیہیے ھر امرت نام
ریت (رعیت) مہر مکدم (مقدم) سکدارے (شکدارے)
نہچل کوئے نہ دسے سنسارے
اپھربو کال کوڑ سو مارے
نہچل ایک سچا سچ سوئی
جنی کر ساجی تنہے سب گوئی
اوہ گورمو کھ جاپے تاں پت ھوئی
کاجی (قاضی) سیکھ (شیخ) بھیکھ پکھیرا (فقیرا)
وڈے کہاوے ھومیں تن پیرا
کال نہ چھوڈے بن ست گور کی دھیرا
[ گورو گرنتھ صاحب راگ گوڑی محلہ ۱ ص ۲۲۷ ]

- سالس مورت نانک نام
کرنی کتا در بھرمان (فرمان)
گور پرسادی جانے مہان
تاں کچھ پاوے درگہ مان

[ گورو گرنتھ صاحب راگ آسا ص ۳۵۰ ]

۱۴ - جے کو درگہ بہتا بولے ناؤں بولے باجاری ( بازاری )
ستریخ باجی ( شطرنج بازی ) بکے ناہیں کچی آوے ساری
[ گورو گرنتھ صاحب راگ آسا محله ۱ ص ۳۵۹ ]

۱۵ - ہکم رجائی سا کیتی ( حکم رضائی ساختی ) درگہ سچ کبول ( قبول )
ساہب ( صاحب ) لیکہا منگسی دنیا دیکھ نہ بھول
دل دروانی جو کرے درویسی ( درویشی ) دل راس
اسک مہبت ( عشق محبت ) نانکا لیکھا کرتے پاس۔
[ گورو گرنتھ صاحب مارو کی وار محله ۱ ص ۱۰۹۰ ]

۱۶ - کہاں سو کھیل تبیلا (طویلہ) گھوڑے کہاں بھیری سہنائی (شہنائی)
کہاں سو تیگ بند ( تیغ بند ) گاڈیرڑ کہاں سو لال کوائی ( قبائی )
کہاں سو آرسیاں منہ بنکے ایتھے دسے ناہی
ایہ جگ تیرا تو گوسائیں
ایک گھڑی میں تھاپ اتھاپے جر ( زر ) ونڈ دیوے بھائی
کہاں سو گھر در منڈپ مہلا ( محله ) کہاں بنک سرائی
کہاں سو سیج سکھالی کامنی جس ویکھ نیند نہ پائی
کہاں سو پان تنبولی ہرماں ( حرماں ) ہویاں چھائی سائی
اس جر ( زر ) کارن گھنی وگوتی ان جر ( زر ) گھنی کھوائی (خواری)
پاپاں باجھوں ہووے ناہی مویاں ساتھ نہ جائی
جس نوں آپ کھوانے کرتا کھس لیے چنگیائی
کوٹی ہوں پیر ورج رہانے جاں میر سنیا دھایا
تھان مکام ( مقام ) جلے بج مندر مچھ مچھ کونر رلایا

کوئی مغل نہ ھؤا اندھا کنے نہ پرچا لائیا
مغل پٹھاناں بھئی لڑائی رن میں تیگ ( تیغ ) وگائی
اونی تپک تان چلائی اونی ھست چڑھائی
جن کی چیری درگہ پاٹی تناں مرنا بھائی
اک ھندوانی اور ترکانی بھٹیانی ٹھکرانی
اکناں پیرن ( پیراھن ) سر کھرپاٹے اکناں واس مسانی
جن کے بنکے گھریں نہ آیا تن کیوں رین وھانی
آپے کرے کرائے کرتا کس نو آکھ سنائیے
دکھ سکھ تیرے بھانے ھووے کستھے جائے رو آئیے
ھکمی ( حکمی ) ھکم ( حکم ) چلائے وگسے نانک لکھیا چائیے
[ گورو گرنتھ صاحب آسا محلہ ۱ ص ۱۸ - ۴۱۷ ]

۱۷ - نانک دنیا کیسی ھوئی
سالک مت نہ رھیو کوئی
بھائی بندھی ھیت چکایا
دنیا کارن دین گوایا
[ گورو گرنتھ صاحب واراں تے دوھیک ص ۱۴۳۰ ]

۱۸ - نانک آکھیے رے منا سنیئے سکھ سہی
لیکھا رب منگیسیا بیٹھا کڈھ وھی
تلباں ( طلباں ) ہوسن آکیاں باکی ( عاقیاں باقی ) جنہاں رھی
اجرائیل پھریستہ ( عزرائیل فرشتہ ) ھوسی آئے تہی
آون جان نہ سوجھئی بھیڑی گلی پھہی
کوڑ نکھوٹے نانکا اوڑک سچ رھی
[ گورو گرنتھ صاحب راگ رام کلی وار محلہ ۱ ص ۹۵۳ ]

سوئی جند چڑھے سے تارے سوئی دنیار تپت رہے
سا دھرتی سو پون جھلارے جگ جی کھیلے تھاو کیسے
جیون تلب ( طلب ) نوار

هووے پروانا کرے دھنگانا کل لکھوں وچار
کتے دیس نہ آئیا منیئے تیرتھ پاس نہ بیٹھا
داتا دلن کرے تا ناھیں مہل ( محل ) اسار نہ بیٹھا
جے کوست کرے سو چھیجے تپ گھر تپ نہ ھوئی
جے کو ناؤں لئے بدناوی ( بدنامی ) کل کے لکھن ایئی
جس سکداری تسہے کنھواری ( خواری ) چاکر کیہے ڈرنا
جاں سکدارے ہوے جنجیری ( زنجیری ) تاں چاکر ھتھوں مرنا
آکھ گنا کل آئیے
نہ جگ کیرا رھیا تپاوس ( تفحص ) جے گن دے تاں پائیے
کل کل والی سرا ( شرع ) نبیڑی کاجی ( قاضی ) کرسنا ( کرشنا ) ھوا
بانی برھما بید اتھرن کرنی کیرت لہیا
پت ون پوجا ست ون سنجم جت ون کاہے جنیؤ
ناؤھو دھوھو تلک چڑھاوھو سچ ون سوچ نہ ھوئی
کل پروان کتیب کران ( قران )
پوتھی پنڈت رہے پوران
نانک ناؤں بھیا رھمان ( رحمان )
کر کرتا تو ایکو جان
نانک نام ملے وڈیائی ایدوں اوپر کرم ہی
جے گھر ھوندے منگن جائے پھیر اولاسہ ملے تہی
[ گوروگرنتھ صاحب رام کلی محلہ ، ص ۔۔۔۹۰۲ ]

۱۸ - کاجی سودیں توٹا آوے
گور مکھ وچ کرے پرتھ بھاوے
بوبھی سابت ( ثابت ) راس سلامت چوکا جم کا بھاعاعے
... ... ... ...
اوڑ نہ کتھنے سپھت ( صفت ) سجائی
جیوں تدھ بھاوے رہیں وجائی ( رضائی )

درگاہ پیدھے جان سوعبلے ھکم (حکم) سچے پاتساھا ھے (پاتشاہا ہے)

[ گورو گرنتھ صاحب مارو محلہ ۱ ص ۱۰۲۳-۳۳ ]

۱۹ - چلمل بسیار دنیا پہانی ( فانی )

کالو بے اکل ( قالو بے عقل ) من گور نہ مانی

من کمین کترین تو دریاؤ کھدایا ( خدایا )

ایک چیج (چیز) مجھے دے اور جہر ( زہر ) چیج (چیز) نہ بھایا

پراب (پورآب) درکہام (خام) کوجے ( کوزے)

ھکمت کہدایا (حکمت خدایا)

من توانا توں کدرتیں ( قدرتیں ) آیا

سگ نانک دیبان مستانہ نت چڑھے سوایا

آتس ( آتش ) دنیا کہنک ( خنک ) نام کہدایا ( خدایا )

[ گورو گرنتھ صاحب وار ملہار شلوک محلہ ۱ ص ۱۲۹۱ ]

۷ - نانک چنتا مت کرو چنتا تس ہی ھوئے

جل میں جنت اپائین تناں بھی روجی ( روزی ) دے

اوتھے ھٹ نہ چلئی نہ کو کرس کرے

سودا سول نہ ھوؤنی نہ کو لے نہ دے

[ گورو گرنتھ صاحب رام کلی کی وار شلوک محلہ ۲ ص ۹۵۵ ]

۸ - تس سیوں کیسا بولنا جے آپے جانے جان

چیری جاں کی نہ پھرے ساھب ( صاحب ) سو پروان

چیری جسکی چلنا میر ملک سلار

جو تس بھاوے نانکا سائی بھلی کار

... ... ... ...

سبہت ( صفت ) جنیاں کو بکھسیئے ( بخشیئے ، سبّی ہونے دار

کنجی جن کو دتیا تنہاں ملے بھنڈار

[ گورو گرنتھ صاحب وار سارنگ شلوک محلہ ۲ ص ۱۲۳۹ ]

۹ - جیسا کرے کہاوے ایسا ایسی بنی جروّرت ( ضرورت )

هووے لنگ جھنگ نہ هووے ایسی کہیے سورت ( صورت )
جے اوس اچھے سو بھل پائے تاں نانک کہیے سورت
[ گورو گرنتھ صاحب وارسا رنگ شلوک محلہ۲ ص ۱۲۴۵ ]

گورو انگد جی نے اپنے پیش رو گورو نانک جی کی تتبع میں اپنے کلام میں هندی کے ساتھ عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ کا بھی استعمال کیا ھے جس سے یہ امر واضح ھے کہ اردو کے وجود میں آنے سے قبل هندی الفاظ کے ساتھ عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کرنے کا عام رواج هو چکا تھا اور یہ رواج هی بڑھتے بڑھتے اردو زبان وجود میں لانے کا باعث بنا ۔

گورو انگد جی کے چند شلوک ذیل میں درج کیے جاتے ھیں ۔

۱ ۔ جو سر سائیں نہ نویں سو سر دیجیے ڈار
نانک جس پنجر میں برھا نہیں سو پنجر لے جار
[ گورو گرنتھ صاحب وار سری راگ محلہ۱ ص ۸۹ ]

۲ ۔ سیئی پورے ساہ ( شاہ ) جنی پورا پایا
اٹھیں وے پرواہ ( بے پرواہ ) رھن اکتے رنگ
درسن ( درشن ) روپ اتھاہ ورلے پائیے
کرمی پورے پورا گورو پورا جاں کا بول
نانک پورا جو کرے گھٹے ناھیں تول
[ گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ شلوک محلہ۲ ص ۱۴۹ ]

۳ ۔ چوتھے پہرے سبھ ( صبح ) کے سرتیا اپجے چاؤ
تناں دریاواں سیوں دوستی من مکھی سچا ناؤ
اوتھے امرت ونڈیئے کرمی ھوئے پساؤ
کنچن کائیاں کسیئے ونی چڑھے چڑھاؤ
جے ھووے ندر سرابۃ (نظر صراف) کی بہڑ نہ پائی تاؤ
ستیں پہریں ست بھلا بہیے پڑھیاں پاس

اوتھے پاپ بن وچارئیے کوڑے گھتے راس
اوتھے کھوٹے سٹئیے کھرے کیجے ساباس (شاباش)
بولن بھادل (فاضل) نانکا دکھ سکھ کھسمے (خصمے) پاس
[ گورو گرنتھ صاحب راگ ماجھ کی وار شلوک محلہ ۲ - ۱۴۰ ]

۴ - ایہ کنیہی آسکی (عاشقی) دوجے لگے جائے
نانک آسک (عاشق) کانڈھیے سدھی رہے سمائے
چنگے چنگا کر منے مندے مندا ھوئے
آسک (عاشق) ایہ نہ آکھیئے جے لیکھے ورتے سوئے
[ گورو گرنتھ صاحب وار آسا شلوک محلہ ۲ - ۴۷۴ ]

۵ - سلام جواب دووِیں کرے منڈھو گھتیا جائے
نانک دووِیں کوڑیاں تھائے نہ کئی پائے
[ گورو گرنتھ صاحب وار آسا شلوک محلہ ۲ ۴ ۷۴۷ ]

۶ - چاکر لگے چاکری نالے گارب واد
گلاں کرے گھنیریاں کھسم (خصم) نہ پائے ساد
آپ گوائیے سیوا کرے تاں کچھ پاوے مان
نانک جس نوں لگا تس ملے لگا سو پروان
[ گورو گرنتھ صاحب وار آسا شلوک محلہ ۲ ۵ ۴۷۴ ]

۱۰ - ناؤں بھکیرے پاتساہ (فقیرے پاتشاہ) مورکھ پنڈت ناؤں
اندھے کا ناؤں پارکھو ایوے کرے گواؤ
الت (علت) کا ناؤں چوھدری کوڑی پورے تھاؤں
نانک گورسکھ جانیے کل کا ایہ نیاؤں
( گورو گرنتھ صاحب وار ملہار شلوک محلہ ۲ ۵ ۱۲۸۸ ]

گورو انگد جی پنجابی تھے اور ان کی تمام زندگی پنجاب میں ہی بسر ھوئی - اس لیے ان کے کلام میں پنجابیت غالب ھے - تاھم انہوں نے اپنے ان شلوکوں میں عربی اور فارسی الفاظ بھی استعمال

کیے ہیں جیسا کہ پنجر، شاہ، بے پرواہ، صبح، دریا، نظر، صراف، شاباش، خصم، عاشق، سلام، جواب، چاکر، چاکری، روزی، سودہ، صاحب، ملک، سالار، کار، صفت، بوتے دار، ضرورت، صورت، فقیر اور پاتشاہ وغیرہ۔

گورو ارجن جی کے نام سے جو بانیاں گورو گرنتھ صاحب میں درج ہیں ان میں بھی بعض ایسے شبد ہیں جن میں ہندی، عربی اور فارسی الفاظ پائے جاتے ہیں، مگر چونکہ گورو ارجن جی پنجابی تھے اور ان کی تمام عمر پنجاب ہی میں گزری تھی اس لیے ان کے شبدوں سے بھی پنجابیت ظاہر ہو رہی ہے۔ ذیل میں ہم گورو جی کے بعض شبد پیش کرتے ہیں :

نکٹ جیاں کے سدھی سنگا
کدرت (قدرت) ورتے روپ ار رنگا
کرمے نہ جھرے نہ من رووں ہارا
اوناسی اوکت اگوچر سدا سلامت کھسم (خصم) ہمارا
تیرے داسرے کو کس کی کان
جس کی میرا راکھیے ان
جو لوڈا (لونڈا) پربھ کیا اجات
تس لوڈے (لونڈے) کو کس کی تات
وے مہتاجا (بے محتاجا) وے پرواہ (بے پرواہ)
نانک داس کہو گور واہ

[گورو گرنتھ صاحب آسا محلہ ۵ ص ۳۷۶]

کیتا ک (خاک) نور کردنگ (کردم) آلم (عالم) دنیائے
آسمان جمین (زمین) درکہت (درخت) آب پیدائس کھدائے (پیدائش خدائے)
دنیا مردار کھردنی گابھل (خوردنی غافل) ہوائے
گیبان ہیوان ہرام کستنی (غائبان حیوان حرام کشتنی)
مردار بکھورائے (بخورائے)

دل کبج کبجہ کادرو دوجک سجائے
( دل قبض قبضہ قاردو دوزخ سزائے )
ولی نیامت ( ولی نعمت ) برادرا دربار ملک پھنائے (فنائے )
جب اجرائیل ( عزرائیل ) بستنی تب چہ کارے بدائے
ھوال ملوم ( حوال معلوم ) کردنگ ( کردم) پا ک اللہ
بگو نانک ارداس بیس درویس ( بیش درویش ) بندہ
[ گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ محلہ ۵ ص ۷۲۳ ]

گورو ارجن جی کا اس قسم کا ایک اور شبد ہے جو اس طرح ہے کہ :

سہروان ( مہربان ) ساھب ( صاحب ) مہروان ( مہربان )
ساھب ( صاحب ) میرا سہروان ( مہربان )
جیاں سگل کو دئے دان
تو کاھے ڈولے پرانیا تدہ راکھیے گا سرجن ھار
جن پیدائس ( پیدائش ) تو کیا سوئی دے آدھار
جن اپائی میدنی سوئی کردا سار
گھٹ گھٹ مالک دلاں کا سچا پرودگار ( پروردگار )
کدرت کیم ( قدرت قیم ) نہ جانیے وڈا وے پرواہ ( بے پرواہ )
کر بندے تو بندگی جچر گھٹ میں ساہ
تو سمرتھ اکتھ اگوچر جیؤ پنڈ تیری راس
رہم ( رحم ) تری سکھ پایا سدا نانک کی ارداس
[ گورو گرنتھ صاحب تلنگ محلہ ۵ ص ۷۲۴ ]

راگ تلنگ میں گورو ارجن جی کے بعض اور شبدوں میں بھی ھندی ، عربی اور فارسی کے الفاظ پائے جاتے ھیں ، جیسا کہ :

۱ ۔ کورتے کدرتی مستاک ( قدرتی مشتاق )
دین دنیا ایک تو ھی سب کھلک ( خلق ) ھی تے پاک

کنہن میں تباب اتہابدا اچرج تیرے روپ
کون جانے چلت تیرے اندھیارے میں دیپ
کہود کہسم کہلک ( خود خصم خالق ) جم
اللہ مہربان کہدانے ( خدانے )
دنس ودن جنے تدھے آرادھے سے کیوں دوجک ( دوزخ ) جانے
اجرائیل ( عزرائیل ) یار بندے جس تیرا آدھار
گناہ اس کے سگل آبہو ( عفو ) تیرے جن دیکھے دیدار
دنیا چیج بہل ہال ( چیز فی الحال ) سگے سچ سکھ تیرا ناؤں
گور مل نانک بوجھیا سدا ایکس گاؤں
[ گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ محلہ ۵ صہ ۷۲۴ ]

۲ - میراں داناں دل سوچ
مہبتے ( محبتے ) من تن بسے سچ ساہ ( شاہ ) بندی موچ
دیدنے دیدار ساہب ( صاحب ) کچھ ناہیں اس کا مول
پاک پرودگار (پروردگار) تو کہود کہسم ( خود خصم ) وڈا اتول
دستگیری دیہ دلاور توھی توھی ایک
کرتار کدرت (قدرت) کرن کھالک (خالق) نانک تیری ٹیک
[ گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ محلہ ۵ ص ۷۲۴ ]

گورو ارجن جی چونکہ پنجاب میں پیدا ہوئے اور انہیں اپنی زندگی میں پنجاب سے باہر جانے کا اتفاق نہیں ہؤا اس لیے ان کے شبدوں میں جہاں عربی اور فارسی کے الفاظ ملتے ھیں وھاں ان سے پنجابیت بھی ٹپک رھی ہے -

گورو صاحب کے اور بھی شبد ھیں جن میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت موجود ھیں چنانچہ راگ مارو میں ان کا ایک شبد یوں ہے :

الله اگم کہدائی ( خدائی ) بندے
چھوڑ کہیال ( خیال ) دنیا کے دھندے
ہوئے پا کپاک ( پاخاک ) بھکیر مسابھر ( فقیر مسافر )
ایہ درویس کبول ( درویش قبول ) درا
سچ نواج یکین مسلا ( نماز یقین مصلے )
منسا مار نوارھو آسا
دیہ سسیت من مولانا کلم ( کلمہ ) کھدائی ( خدائی ) پاک کہرا
سرا سرئیت ( شرع شریعت ) لے کاوھو
تریکت ( طریقت ) ترک کھوج ٹولاوھو
ماربپت ( معرفت ) من مارھو ابدالا
ملہو ھکیکت ( حقیقت )جت پھر نہ مرا
کران ( قران ) کتیب دل ماھیں کاھی
دس اورات ( عورات ) رکھھو بدراھی
پنچ مرد سدک ( صدق ) لے باندھو
کہیر صبوری کبول ( خیر صبوری قبول ) پرا
مکا ( مکہ ) مہر روجہ بے کہا کہ ( روزہ بے خاکہ )
بھست ( بہشت ) پیر لپھج ( لفظ ) کائے انداجا ( اندازہ )
ہور ( حور ) نور مسک ( مشک ) کہدایا ( خدایا )
بندگی الله آلا ( اعلیٰ ) ھجرا ( حجرہ )
سچ کاوے سوئی کاجی ( قاضی )
جو دل سودھے سوئی ھاجی ( حاجی )
سو ملاں ملئن ( ملعون ) نوارے سو درویس ( درویش )
جس سبھت ( صفت ) دھرا
سبھ ( سب ) وکہت ( وقت ) سبنے کر ویلا
کیالک ( خالق ) یاد دلے میں سولا
تسبی ( تسبیح ) یاد کرھو دس مردن سنت سیل بندھان برا
دل میں جانبو سب پہل عالہ ( فی الحالہ )

کنیل کہانہ ( خیل خانہ ) برادر ھموں جنجالہ
میر سلک امرے بھانابا (فنابا) ایک مکام کہدانے (مقام خدائے) درا
اول سیپت ( صفت ) دوجی سابوری ( صابوری )
تیجے هلیمی ( حلیمی ) چوتھے کنہیری ( خیری )
پنجویں پنجے اکت مکامے ( مقامے )
ایہ پنج وکپت ( وقت ) تیرے اپرا
سگلی جان کرو مودبھیہ ( موضیفہ )
بد اسل ( عمل ) چھوڈ کرو هتھ کوجا ( کوزہ )
کہدائے ( خدائے ) ایک بوجھ دیوھو بانگاں
برکو برکھردار ( برخودار ) کھرا
هک هلال بکھورو ( حق حلال بخورو ) کھانا
دل دریاء دھوھو میلانا
پیر پچھانے بھستی ( بہشتی ) سوئی
اجرائیل ( عزرائیل ) نہ دوج ( دوزخ ) ٹھرا
کائیاں کردار اورت یکیناں ( عورت یقیناں )
رنگ تماسے ( تماشے ) مان هکینا ( حقیناں )
ناپاک پاک هدور هدیسا ( حضور حدیثا )
سابت سورت ( ثابت صورت ) دستار سرا
مسلمان موم دل هووے
انتر کی مل دل تے دھووے
دنیا رنگ نہ آوے نیڑے جیوں کسم پاٹ گھیو پاک هرا
جاں کو مہر مہر مہروانا ( مہربان )
سوئی مرد مرد مردانا
سوئی سیکھ مسائک هاجی ( شیخ مشائخ حاجی )
سو بندہ جس نجر ( نظر ) نرا
کدرت کادر ( قدرت قادر ) کرن کریماں
سپت سپبت ( صفت محبت ) اتھاہ رھیماں ( رحیماں )

هک ہکم ( حق حکم ) سچ کہدایا ( خدایا )
بوجھ نانک بند کہلاس ( خلاص ) ترا
[ گورو گرنتھ صاحب راگ مارو ص ۱۰۸۳-۸۴ ]

ایک مقام پر گورو ارجن جی کا یہ شبد درج ہے :

کارن کرن کریم
سرب پرتپال رہیم ( رحیم )
اللہ الکھ اپار
کہود کہدائے ( خود خدائے ) وڈ بے سمار ( بے شمار )
اَمو بھگونت گوسائیں
کہالک ( خالق ) رو رہیا سرب ٹھائیں

...... ...... ......

مہروان ( مہربان ) مولا توھی ایک
پیر پیکامبر سیکھ ( شیخ )
دلاں کا مالک کرے ہاک ( حاق )
کران ( قران ) کتیب تے پاک
...... ...... ......

مہر دیا کر کرنے ہار
بھگت بندگی دیہ سرجن ہار
کہ نانک گور کہوئے بھرم
ایکو اللہ پار برہم
[ گورو گرنتھ صاحب راگ رام کلی محلہ ۵ ص ۸۹۷ ]

۲ - دھرتی اکاس ( اکاش ) پاتال ہے چند سور بناسی
بادساہ ساہ ( بادشاہ شاہ ) امراء کہان ( خان ) ڈھائے ڈیرے جاسی
رنگ تنگ گریب ( غریب ) مست سب لوک سدھاسی
کاجی ( قاضی ) سیکھ مسائکاں ( شیخ مشائخاں ) سبھے اٹھ جاسی

پیر پیکامبر ( پیغمبر ) اولیاء کو تیہرنہ رہاسی
روجہ ( روزہ ) بانگ نواج ( نماز ) کیتب ان بوجھیے سب جاسی
لکھ چوراسی میدنی سب آوے جاسی
نہچل سچ کہدائے ( خدائے ) ایک کہدائے ( خدائے ) بندہ اپناسی
[ گورو گرنتھ صاحب راگ مارو کی وار محلہ ۵ ص ۱۱۰۰ ]

۳ - ورت نہ رہوں نہ ماہ رمدانا ( رمضانا )
تس سیوی جو رکھیے ندانا
ایک گوسائیں اللہ میرا
ہندو ترک دوہاں نے بیرا
ہج کابے ( حج کعبے ) جاؤں نہ تیرتھ پوجا
ایکو سیوی اور نہ دوجا
پوجا کروں نہ نواج گجاروں ( نماز گزاروں )
ایک نرنکار لے ردے نمسکاروں
نہ ہم ہندو نہ مسلمان
اللہ رام کے پنڈ پران
کہ کبیر ایہ کیا وکھانا
گور پیر مل کھود کھسم ( خود خصم ) پچھانا(۱)
[ گورو گرنتھ صاحب راگ بھیروں محلہ ۵ ص ۱۱۳۶ ]

۴ - انگیکار کیا پربھ اپنے بیری سگلے مادھے
جن بیری ہے ایہ جگ لوٹیا تے بیری لے بادھے

۱ - گورو گرنتھ صاحب میں یہ شبد گورو ارجن جی اور کبیر جی کے نام پر درج ہے - اس کے اوپر محلہ ۵ کا عنوان دیا گیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ یہ گورو ارجن جی کا بیان کردہ ہے اور آخر میں بطور تخلص نانک کی بجائے کبیر کا لفظ ہے ، جس سے یہ واضح ہے کہ یہ شبد کبیر جی کا بیان کردہ ہے -

ست گور پرمیسر میرا
انک راج بھوگ رس مانی ناؤں جپی بھروسا تیرا
چت نہ آوس دوجی باتا سر اوپر رکھوارا
بے پرواہ رہت سوامی اک نام کے آدھارا
پورن ہوئے ملیؤ سکھدانی اون نہ کائی باتا
تت سار پرم پد پایا چھوڈ نہ کتہوں جاتا
برن نہ سا کون جیسا تو ہے سچے الکھ اپارا
اتل اتھاہ اڈول سوامی نانک خصم ھمارا

[ گورو گرنتھ صاحب رام کلی محلہ ۵ ص ۸۸۳ ]

۵ - تو دانا تو ابچل توھی جات میری پاتی
تو اڈول کدے ڈولے ناھی تاھ کیسی تاتی
ایکے ایکے ایک توھی
ایکے ایکے تو رائیا
تو کرپا تے سکھ پایا
تو ساگر ھم ھنس تمہارے ھم میں مانک لالا
تم دیوھو تل سنک نہ مانوں ھم بھنچہ سدا نہالا
ھم بارک تم پتا ھمارے تم مکھ دیوھو کھیرا
ھم کھیلیں سب لاڈ لڈاوھو تم سد گنی گہیرا
تم پورن پور رہے سمپورن ھم سنگ اگھائے
ملت ملت مل رھیا نانک کہن نہ جائے

[ گورو گرنتھ صاحب رام کلی محلہ ۵ ص ۸۸۵ ]

۶ - کوئی بولے رام رام کوئی کھدائے ( خدائے )
کوئی سیوے گوسائیاں کوئی اللہ
کارن کرن کریم
کرپا دھار رھیم ( رحیم )

کوئی نہاوے تیرتھ کوئی ھج ( حج ) جائے
کوئی کرے پوجا کوئی سر نوائے
کوئی پڑھے بید کوئی کتیب
کوئی اوڈھے لیل کوئی سپید
کوئی کہیے ترک کوئی کہیے ھندو
کوئی باچھے بھست ( بہشت ) کوئی سر گندو
کہ نانک جن ھکم ( حکم ) پچھاتا
پربھ ساھب ( صاحب ) کا تن بہید جاتا

[گورو گرنتھ صاحب رام کلی محلہ ۵ ص ۸۸۵]

۷ - پونے میں پون سمانیا
جوتی میں جوت رل جانیا
ماٹی ماٹی ھوئی ایک
رووَن ھارے کی کون ٹیک
کون موا رے کون موآ
برھم گیانی مل کرو بیچارا ایہ تو چلت بھیا
اگلی کچھ کھبر (خبر ) نہ پائی
رووَن ھار بھی اوٹھ سدھائی
بھرم موہ کے باندھے بندھ
سوپن بھیا بھکھلائے اندھ
ایہ تو رچن رچیا کرتار
آوت جاوَت ھکم ( حکم ) اپار
نہ کو موآ نہ مرنے جوگ
نہ بنسے اناسی ھوگ
جوا ایہ جانو سو ایہ ناہ
جانن ھارے کو بل جاؤں
کہ نانک گور بھرم چکانیا

نہ کوئی مرے نہ آوے جائیا

[ گورو گرنتھ صاحب رام کلی محلہ۵ ص ۸۸۵ ]

۸ - کرن کراون سوئی
آن نہ دیسے کوئی
ٹھاکر میرا سگھڑ سجانا
گور مکھ ملیا رنگ مانا
ایسو رے ہر رس میٹھا
گور مکھ کنے ور لے ڈیٹھا
نرمل جوت امرت ہر نام
پیوت امر بھئے نہکام
تن من سیتل اگن نواری
آنند روپ پرگٹے سنساری
کیا دیوں جا سب کچھ تیرا
سد بلہاری جاؤں لکھ بیرا
تن من جیو پنڈ دے ساجیا
گور کرپا تے نیچ نواجیا ( نوازا )
کھول کوارا سہل ( محل ) بلایا
جیسا ما تیسا دکھلایا
کہ نانک سب پڑدہ توٹا
ھوں تیرا تو میں ین وونٹھا

[ گورو گرنتھ صاحب رام کلی محلہ۵ ص ۸۸۲ ]

۹ - سینت ( صنت ) سلاہن بھگت وڈلے دتاں
سوئے جس بھنڈار بھر بوجھ نہ لبتیاں
جسنوں لگا رنگ سے رنگ رتیا
اونہاں اکو نام ادھار اکا ان بھتیا
اونہاں پچھے جگ بھنچے بھوگئی

اوہاں ہیارا رب اوہاں جوگنی
جس ملیا گور آنے تن ہرینے جانیا
ھوں بلہاری تن جے کیہسمے ( خصمے ) پہانیا

[ گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی محلہ ۵ ص ۹۵۸ ]

۱۰ - جورتے دیدار سینی سچ ھا ک ( حاق )
جنی جاتا کیہسم ( خصم ) کیوں لبنیے تناں کہا ک ( خاک )
من میلا و یکار ہووے سنگ پاک
وسے سچا مہل ( محل ) کہلے بھرم تاک ( طاق )
جسہے دکہالے مہل ( محل ) تس نہ ملے دھاک
من تن ہونے نہال بندک ندر جھاک
نو ندھ نام ندھان گور کے سبد ( شبد ) لاگ
تسہے ملے سنت کہاک ( خاک ) مستک جسے بھاگ

[ گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی محلہ ۵ ص ۹۵۹ ]

۱۱ - وڈا تیرا دربار سچا تدھ تکھت ( تخت )
سر ساھاں ( شاھاں ) پاتساہ ( پاتشاہ ) نہچل چور چہت
جو بہاوے پار برہم سوئی سچ نیاؤں
جے بھاوے پار برہم نتہاوے ملے تہاؤں
جو کینی کرتار سائی بھلی گل
جنی پہچاتا کیہسم ( خصم ) سے درگاہ مل
سہی ( صحیح ) تیرا پہرمان ( فرمان ) کنے نہ پہیرے
کارن کرن کریم کدرت ( قدرت ) تیرے

[ گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی محلہ ۵ ص ۹۶۰ ]

۱۲ - جاں پر اندر تاں دھن باھر
جاں پر باھر تاں دھن ماھر
بن ناویں بہ بہیر بہراھر

ست گور سنگ دکھایا جاہر ( ظاہر )
جن نانک سمجے سج سماہر

[ گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی سلوک محلہ ۵ ص ۹۶۶ ]

۱۳ ۔ آہر سب کردا پھرے آہر اک نہ ہوئے
نانک جت آہر جگ ادھرے ورلا بوجھے کوئے

[ گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی سلوک محلہ ۵ ص ۹۶۵ ]

۱۴ ۔ وڈی ہوں وڈا اپار تیرا مرتبا ( مرتبہ )
رنگ پرنگ انیک نہ جاہن کرتبا ( کرتبہ )
جیاں اندر جیؤ سب کچھ جان لا
سب کچھ تیرے وس تیرا گھر بھلا
تیرے گھر آنند ودھائی تدھ گھر
مان مہتا تیج آپنا آپ جر
سرب کلا بھرپور وسے جت کتا
نانک داسن داس تدھ اگے بنوتا

[ گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی محلہ ۵ ص ۹۶۶ ]

گورو ارجن جی کے بیان کردہ مندرجہ بالا شبدوں میں ہندی کے ساتھ عربی اور فارسی الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں تاہم ان پر پنجابیت کا بہت اثر ہے ۔

گورو گرنتھ صاحب کے راگ رام کلی میں ایک " وار " رائے بلونڈ اور ستا ڈوم کے نام سے درج ہے ۔

رائے بلونڈ اور ستا ڈوم کی بیان کردہ وار کا نمونہ درج ذیل ہے :

ناؤں کرتا کادر ( قادر ) کرے کیوں بول ہووے جو کھیوندے
...... ...... ...... ...... ......

لہنے دھربون چھتر سر کر سپھتی ( صفتی ) امرت پیوندے

...... ...... ...... ...... ......

گور چیلے رھراس کیتی نانک سلامت تھیوندے
مہ ( شہ ) ٹکہ دتوس جیولدے

...... ...... ...... ...... ......

جھولے سو چھت لرنجنی مل تکھت ( تخت ) بیٹھا گور ھٹیے
کرے جے گور پھرمایا ( فرمایا ) سل جوگ الونی چٹیے
لنگر چلے گور سبد ( شبد ) ھر توٹ نہ آوی کھٹیے
کھرچے ( خرچے ) دتی کھسم ( خصم )
دی آپ کھہدی کھیر ( خیر ) دبٹیے
ہووے سپھت (صفت) کھسم (خصم) دی
لور ارسوں (عرشوں) کرسوں جھٹیے

...... ...... ...... ...... ......

سچ جے گور پھرمایا ( فرمایا ) کیوں ایدوں بولوں ھٹیے
پتربں کول ( قول ) نہ پالیؤ کر پیروں کن مڑتیے
دل کھوٹے آکی ( عاقی ) پھرن بنہ بھار اچائن چھٹیے

...... ...... ...... ...... ......

جن کیتی سو منّنا کوسال جیواہے سالی
دھرم رانے ہے دیوتا سے گلاں کرے دلالی
ست گور آکھے سچا کرے سا بات ہووے درھالی ( درحالی )
گور انگد دی دوھی پھری سچ کرتے بندھ بہالی
نانک کئیاں پلٹ کر مل تکھت ( تخت ) بیٹھا سے ڈالی
درسبوے است کھڑی مسکلے ( مصقلے ) ھونے جنگلی ( زنگالی )
در درویس کھسم ( درویش خصم ) دے نانے سچے بانی لالی
بلونڈ کیہوی نیک جن جس بہتی چھاؤ پترالی

لنگر دولت ونڈیئے رس امرت کھیر گھیالی

...... ...... ...... ......

بنے کبول کھسم ( قبول خصم ) نال جاں گھال مردی گھالی،

...... ...... ...... ......

پھیر وسایا پھیرَوآن ست گور کھاڈور
جپ تپ سنجم نال تدہ ہور موچ گرور ( غرور )
لب و ناھے مانسا جیون پانی بور
ورھیے درگاہ گورو کی کدرتی ( قدرتی ) نور
جت سو ھاتھ نہ لھبئی تون اوہ ٹھرور
نو ندہ نام ندھان ھے تدہ وچے بھرپور
نندہ تیری جو کرے سو ونجے چور
نیڑے وسے مات لوک تدہ سوجھے دور
پھیر وسایا پھیروآن ست گور کھاڈور
سوٹکا سو پنہا سوی دیبان
پیو دادے جیوہا ہوتا پروان
جن باسک نیترے گھتیا کر بنہی تان
جن سمند وِرولیا کر میر مدھان
چودہ رتن نکالیئن کیتون چانان
گھوڑا کیتو سہج دا جت کیؤ پلان
دھنکھ چڑھائیو ست دا جس ھندا بان
کل وچ دھو اندھار سا چڑھیا رے بھان
ستہو کھیت جمائیو ستہو چھاوان
نت رسوئی تیرے گیو میدا کھان
چارے کونڈاں سوجھیوس من میں سبد (شبد) پروان
آواگون نواریو کر ندر نیسان (نشان)

...... ...... ...... ......

نانک هندا چیتر سر است هیران (حیران)

...... ...... ...... ......

دهن سو تیرا تیان هے سچ تیرا پیس کاربا (پیش کاربا)
نانک تو لہنا تو هے گور امر تو ویچاریا
گور ڈٹها تاں من سادهاریا

...... ...... ...... ......

آپے بٹی کلم ( قلم ) آپ آپ لکهن‌هارا هوآ
سب است آون آون جاونی آپے هی نواں نروآ
تکهیت ( تخت ) بیٹها ارجن گورو ست گور کا کهوے چندوآ

...... ...... ...... ......

دونی چونی کرامات سچے کا سچا ڈهوآ
[ گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی ستہ بلونڈ ص ۹۶۶-۹۶۷-۹۶۸ ]

# اورنگ زیب

ہند عہد اورنگ زیب میں

مرزا سمیع اللہ بیگ



جسٹس حمیداللہ بیگ اور جسٹس نصراللہ بیگ کے والد مرحوم
جسٹس سمیع اللہ بیگ کا ۱۹۲۴ء کا کارنامہ پیش خدمت ہے۔ اسکے
واقعی مخاطب تو ہندی داں عزیزانِ وطن ہوں گے جن کے لیے اسے
الگ سے ہندی میں پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن اردو والے بھی اپنی
میراث سے بے خبر نہ رہیں اس لیے اردو اصل بھی!

—— ادارہ

ہندعہد اورنگ زیب میں

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

# ہند عہد اورنگ زیب میں

از

مرزا یار جنگ سمیع اللہ بیگ

چیف جسٹس حیدرآباد دکن سابق ایڈووکیٹ لکھنؤ

جمادی الاول سنہ ۴۳ دسمبر ۱۹۲۴ء

# فہرست مضامین



| باب | مضمون | صفحہ |
|---|---|---|
| باب اوّل | تمہید | ۱ تا |
| باب دوم | تعلیمی حالت | ۵ تا |
| باب سوم | مذہبی رواداری | ۷ تا |
| باب چہارم | تجارت و تمول و فارغ البالی | ۲۰ تا |
| باب پنجم | اضافۂ امن و امان | ۲۶ تا |
| باب ششم | صنعت و حرفت | ۳۷ تا |
| باب ہفتم | مہمان نوازی | ۴۶ تا |
| باب ہشتم | یوروپین تجار سے اورنگ زیب کا برتاؤ | ۵۲ تا |
| باب نہم | یوروپین تجار کی پالیسی و اخلاق | ۷۲ تا |

## باب اوّل

# تمہید

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن تا بماند نامِ نیکت برقرار

"زمانہ" کے مارچ و اپریل ۱۹۲۳ء کے پرچہ میں مسٹر جے۔ آر۔ راصاحب نے ایک مضمون لکھا تھا۔ جس کا عنوان یہ تھا "ہندوستان عہدِ مغلیہ میں" مضمون مذکور میں چند واقعات بیان کرکے اُن سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ عہدِ مغلیہ میں رشوت کا بازار بے حد گرم تھا۔ رعایا مفلوک الحال تھی اور بہت افلاس و تنگدستی میں بسر کرتی تھی عوام کی اقتصادی و تمدنی حالت سنوارنے کی کوشش نہیں کیجاتی تھی وزرائے سلطنت نیک نفس، مردم شناس و منتظم نہ تھے۔ تجارت پر ایسی تباہ کن قیود عائد تھیں کہ جن سے اوس کی ترقی دشوار تھی۔ صداقت نابود تھی، فرامینِ شاہی کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار ہوگیا تھا۔ سمندر میں بحری قزاقوں کے بیڑے پھرا کرتے تھے۔ اندرون ملک راہزنوں کا بڑا زور تھا۔ مغلوں کا لشکر ایک بے قاعدہ فوج کا مجمع تھا۔ بڑا حصہ زمین کا ویران اور غیر آباد تھا۔ کالج اور تعلیم گاہوں کا قائم کرنا دشوار تھا۔

مسٹر راے صاحب نے اپنے مضمون کی تائید میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتوں کے اُن خطوط کا حوالہ دیا ہے جو کہ مختلف اوقات اور سنین میں انہوں نے ولایت کو اپنے آقاؤں کو اطلاع

دینے کی غرض سے لکھے تھے اور ایک فرانسیسی سیاح کی تحریر سے بھی استدلال کیا ہے
مسٹر جے۔ آر۔ رائے جبکہ اِس مضمون نے پہلے مجھ کو صرف یہ خیال دلایا تھا کہ
"ہند بعہد اورنگ زیب" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جائے۔ لیکن ہندو
مسلمانوں کے آجکل کے نزاعوں سے اس اندیشہ نے کہ کہیں ایسے مضامین سے
جن میں صحیح واقعات کا اظہار نہ ہو غلط فہمی بڑھ کر ملک کے حالات بد سے بدتر نہ
ہو جائیں۔ میرے خیال کو مصمم ارادہ کر دیا۔ صحیح ہے کہ یہ مضمون تاریخ کی
وقعت نہیں رکھتا ہے اور نہ اس میں مورخ کی حیثیت سے عہد اورنگ زیب کے تمام
واقعات پر گہری تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ اسمیں زیادہ تر عہد اورنگ زیب
کے وہ چند واقعات پیش کئے گئے ہیں جنکو عہد مغلیہ اورنگ زیب کے متعلق اصحاب
رائے عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان واقعات کا انتخاب کپتان الگزنڈر ہملٹن کے
سفرنامے سے کیا گیا ہے۔ الگزنڈر ہملٹن ایک انگریز سیاح و سوداگر تھا۔ یہ شخص علمی
حیثیت سے بھی معمولی شخص نہ تہا۔ یونیورسٹی میں تعلیم پا چکا تہا تقریباً ۱۶۸۰ء میں
جو اورنگ زیب کا زمانہ تھا یہ شخص بہت سا سوداگری مال و اسباب لیکر معہ چند
توپوں اور تھوڑے سے فوجی سپاہیوں کے ولایت سے روانہ ہوا ہے اور تمام ساحل
افریقیہ و عرب و ایران پر تجارت کرتا ہوا بالآخر ہندوستان کے ساحل پر پہنچتا ہے
تخمیناً ۲۵ برس تک ہندوستان اور اس کے گرد و نواح میں اپنی زندگی بسر کی ہے
اس شخص نے اپنا ایک سفرنامہ لکھا ہے جسکی دوسری طبع ۱۷۳۹ء کی ہے۔ یہ سفرنامہ
دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اسوقت "کتب خانہ آصفیہ" حیدرآباد دکن میں موجود ہے
یہ کتاب پرانی انگریزی میں لکھی گئی ہے لیکن بہت دلچسپ ہے۔ چونکہ یہ سوداگر

ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا۔ لہٰذا اکثر اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے
ڈائرکٹرس اور اُن کے ملازمین کی پولیٹیکل حرکات و رچالوں پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے
غالباً اسوقت کپتان صاحب کو اسکا خیال بھی نہ ہوگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی
وہ چالبازیاں جن کو انہوں نے اپنے سفرنامے میں نظرِ حقارت سے دیکھا ہے، بالآخر
اُن کی قوم کی حکومت اس ملک میں قائم کر دیں گی۔ یہ اورنگ زیب کا زمانہ ہے
جس کو ہمارے بعض مورخ ہونے کے مدعی سب سے زیادہ متعصب مسلمان مغل بادشاہ
ظاہر کرتے ہیں۔ ساحلِ ہندوستان پر کوئی ایسا بڑا شہر نہ تھا کہ جہاں یہ مصنف گیا ہو
علاوہ بریں سورت، احمد آباد، دہلی، آگرہ، کلکتہ وغیرہ کی بھی اس نے سیر کی ہے
ایک موقع پر اورنگ زیب کے روبرو بھی پیش کئے جانے کی عزت اس کو حاصل
ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس شخص کا علم ذاتی ہے اور اس کے بیانات بادی النظر میں
بے غرض اور بے لوث معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے مضمون میں کپتانِ موصوف
کی اسی عینی شہادت پر استدلال کیا ہے اور جو شہادت میں پیش کرتا ہوں اگر وہ
صحیح ہے تو اُن واقعات کی بہت کچھ تکذیب ہوتی ہے جن پر مسٹر جج۔ آر۔ اے۔ راجے صاحب
نے اپنی رائے قائم کرنے میں استدلال کیا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ ایسٹ انڈیا کمپنی
کے گماشتے یا ڈائرکٹرس غلط واقعات کیوں لکھتے اس کے متعلق ناظرین اولاً اس
مضمون کے باب ( ۹ ) کو ملاحظہ کریں اس کے بعد وجوہ خود ذہن میں آجائیں گے
فرانسیسی سیاح کی بابت جس کی کتاب کا حوالہ مسٹر جج۔ آر۔ راجے صاحب نے دیا ہے۔ میں
اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ یہ امر قابلِ غور ہوگا کہ اُس سیاح کے ذرائع علم
کیا تھے۔ اُس نے کس زمانہ میں اور کتنے روز تک اس ملک کو دیکھا۔ بالآخر ناظرین سے

یہ میں التجا کروں گا۔ کہ اگر اس مضمون کی کوئی عبارت خلافِ مزاج ہو تو معاف فرمائیں کسی کا دل دکھانا میرا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ اس مضمون کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اگر گذشتہ صحیح تاریخی واقعات سے لاعلمی یا غلط فہمی نے ہندو مسلمانوں کے دلوں پر ایک دوسرے کے مقابل کوئی غبار پیدا کر دیا ہے تو اسکے دھونے کی کوشش کروں اور اگر اس مضمون سے انکی باہمی محبت و ارتباط کی زنجیر کو کچھ بھی تقویت حاصل ہو سکے تو میرا اصلی مطلب حاصل ہو جائے گا اور خدا کرے ایسا ہی ہو۔ آمین !!

باب دوم

# تعلیمی حالت

مسٹر جے۔ آر۔ رائے صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ عہد مغلیہ میں کالج اور درسگاہوں کا قائم کرنا دشوار تھا تقریباً ۱۶۹۰ء میں کپتان ہملٹن خلیج فارس سے آتے ہوتے ہوئے ساحل ہندوستان پر آئے ہیں سب سے پہلے انہوں نے اس حصہ ہندوستان کو دیکھا ہے جو سندھ کے نام سے موسوم ہے۔ سندھ میں ایک شہر تھا جس کا نام "ٹھٹہ" تھا۔ ہندوستان کا یہ پہلا شہر تھا جو اُن کو پہلے پہل نظر آیا وہ لکھتے ہیں۔

"ٹھٹہ شہر علوم فقہ و فلسفہ و سیاسیات کیلئے مشہور ہے ان علوم میں لڑکوں کو تعلیم دینے کے لئے تقریباً چار سو کالج یہاں ہیں"۔ جلد اول ص ۱۲۷

اگر ایک سندھ کے ساحل کی یہ حالت تھی تو اس زمانہ میں پایۂ تخت کے قریب قریب شہروں کی تعلیمی نظر سے کیا حالت ہوگی۔ اُسکا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں تعلیم کا نقطہ نظر ہی زمانہ موجودہ سے علیحدہ تھا۔ اور اس کے طریقے جدا تھے۔ پڑھانا ایک ایسا نیک کام خیال کیا جاتا تھا کہ اُس کا معاوضہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اُستاد کا درجہ والدین سے کم نہ تھا۔ پڑھانا ایک معزز پیشہ تھا۔ بہت سے لوگ اس کو باعث عزت سمجھتے تھے۔ اور اس کام کو خوشی سے انجام دیتے تھے اور آجتک اُسی کا یہ اثر ہے کہ جب ہم لفظ "مولوی" کسی کے نام ساتھ سنتے ہیں تو دل میں وقار و عزت کے خیالات آجاتے ہیں علاوہ بریں ہر رئیس محلہ کے لئے اپنے دروازے پر ایک

مکتب کا قایم کرنا ویسا ہی اُنکی ریاست کے لوازمات میں سے تہا جیسا کہ گھوڑے ہاتھی کا پالنا یا دیگر مذہبی رسم و رواج کی پابندی کرنا۔ اس مکتب میں صرف اس رئیس ہی کے بچے پڑہتے تھے بلکہ تمام غریب اہل محلہ کے بچے مولوی صاحب کے پاس پڑہنے کے لئے بٹہائے جاتے تھے۔ نقد کی صورت میں مولوی صاحب کو گو بہت کم ملتا تھا۔ مگر اسطرح بہت سے لڑکے پڑھ جایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب نہ صرف پڑہاتے تھے بلکہ آداب بھی سکہاتے تھے۔ اگر لڑکے نے ذراسی بدتہذیبی کی تو ماں باپ بھی مولوی صاحب کے حوالہ سے بچہ کو ڈراتے تھے۔ لڑکے کے کیرکٹر درست کرنے میں انکو بہت دخل تھا۔ ہم اس زمانہ کے اسکول اور کالجوں کے خلاف نہیں ہیں لیکن ہماری رائے میں اس ملک کے واسطے ابتدائی تعلیم گاہوں کا مکتب کی صورت میں ہونا بہترین طریقہ تھا۔ افسوس کہ رفتارِ زمانہ نے اس قسم کے مولویوں اور مدرسین کا طبقہ ہی نیست و نابود کردیا۔ مکتبوں کے تعداد کی جو حالت بچشم خود میں نے بچپن میں اپنے چھوٹے سے قصبہ امیٹھی میں دیکھی ہے اس سے میں قیاس کرسکتا ہوں کہ ملک میں انکی مجموعی تعداد موجودہ پرائمری اسکولوں سے کم نہ ہوگی۔ اس قصبہ امیٹھی میں ایک ویرانہ سنسان مقام ہے جہاں کچھ عرصہ ہوا چند بلا سقف صرف دیواریں کھڑی ہوئی تھیں اور اب تو شاید صرف بنیاد کے نشان باقی رہگئے ہیں۔ پرانے لوگ اسی کو وہ مقام بتلاتے ہیں جہاں طلباء دور و دراز فاصلہ سے آکر قیام کرتے تھے اور ملا جیون مرحوم جن کو ایک زمانہ تک اورنگ زیب کے اُستاد ہونے کا بھی شرف حاصل ہوا تھا درس دیا کرتے تھے یہ اس قصبہ کے ان کہنڈروں میں سے ہے جسکو ہم لوگ اہل قصبہ حسرت کی نگاہ سے

سے دیکھا کرتے ہیں۔ ہم اس کو اپنے قصبہ کا پرانا کالج سمجھتے ہیں! اسی قسم کے مکتبوں اور کالجوں میں ہندو مسلمان لڑکے یکجا پڑھا کرتے تھے۔ یہیں پر ان دونوں مذاہب کے بچوں میں دوستی کے وہ استوار رشتے قائم ہوتے تھے جن کو آئندہ توڑنا دشوار ہوتا تھا۔ ان مکتبوں کے علاوہ جہاں عام تعلیم دیجاتی تھی مذہبی درسگاہیں بھی تھیں۔ مثلاً ہندو پاٹ شالہ یا کسی پیر طریقت یا حافظ جی کا قیام گاہ۔ کپتان ہملٹن نے اپنے سفرنامہ میں صرف ایک مقام "ٹھٹھہ" میں جو چار سو کالجوں کا ذکر کیا ہے غالباً وہ ایسے ہی مکتب، مدرسے اور کالج ہونگے۔ جن کا ذکر میں نے کیا ہے۔ اور جب کہ مدرسوں اور کالجوں کی کثرت کی یہ حالت ہو تو مسٹر جے۔ آر۔ راجے اچاریا کا یہ دعوی کہ اس عہد مغلیہ میں درسگاہوں اور کالجوں کا قائم کرنا دشوار تھا۔ یا تعلیم کے ذرائع اُس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے موجود نہ تھے۔ میری رائے میں محض بلاثبوت معلوم ہوتا ہے۔

باب سوم

# مذہبی رواداری

مذہبی رواداری کے معاملہ میں کپتان ہملٹن کی رائے کا پورا اندازہ کرنے کے لئے ہم کو پہلے یورپ کی سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کی حالت پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہئے۔ کپتان ہملٹن اُس ملک کے باشندے تھے جہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی خانہ جنگیوں نے ہزاروں نہیں بلکہ

لاکھوں بنی نوع کا خون بہا دیا تھا۔ جہاں اُس زمانہ کی رعایا اگر گورنمنٹ وحکومت کے مذہب سے اختلاف کرتی تھی تو رعایا کے واسطے بہت مہلک نتائج پیدا ہُوا کرتے تھے۔ مثلاً ۲۴۔ اگست ۱۵۷۲ء میں بادشاہ فرانس نے یہ حکم دیدیا تھا کہ پیرس میں تمام پروٹسٹنٹ مذہب کی رعایا کا قتل عام کردیا جائے اس عام فرمانِ قضا میں بچے، بوڑھے، مرد و عورت کا کچھ استثناء اور امتیاز نہ تھا۔ بادشاہ نے کٹی ہوئی گردنوں سے خون کے فوارے نکلنے کا نظارہ اپنے مکان سے بیٹھ کر تماشے کے طور پر دیکھا۔ اسی طرح سے جب ولایت میں شاہزادی "میری" Mary جو کہ رومن کیتھولک تھیں تخت نشین ہوئیں تو تو ایک نوجوان شاہزادی کی ننھی سی خوبصورت گردن پتھر پر رکھوا کر اس بنیاد پر کٹوادی کہ وہ پروٹسٹنٹ ہونے کا علانیہ دعویٰ کرتی تھی۔ راجرس Rodgers کے دس بچوں اور بیوی پر رحم نہ کیا گیا۔ بلکہ اسی مذہبی اختلاف کی وجہ سے اُن کو زندہ جلا دیا گیا۔ یورپ میں اُس وقت مذہبی رواداری کی یہی حالت تھی۔ لہذا کپتان ہملٹن کو عہد اورنگ زیب کی مذہبی رواداری دیکھ کر عجیب و غریب سماں معلوم ہوا۔ بہت بڑی بات جو کہ اُن کو متحیر کرتی تھی وہ یہ تھی کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں مگر ایک دوسرے سے اس طرح مل جل کر بسر کر رہے ہیں اور وہ مذہبی تعصبات سے اس قدر بری ہیں کہ اُن میں سوائے پوشاک کے کوئی چیز ایسی نہیں نظر آتی تھی جس سے اُن کا امتیاز ہو سکے کہ اُن کا مذہب کیا ہے۔ ہملٹن اپنے سفرنامہ میں ایک مقام پر شہر ٹھٹہ کے حالات بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے

"ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے۔ لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے۔
"ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پوری طور سے برتی جاتی ہے وہ اپنے برت رکھتے ہیں"
"اور تہواروں کو اسی طرح سے مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانہ میں کرتے تھے جبکہ بادشاہت خود"
"ہندوؤں کی تھی۔ وہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں لیکن انکی بیویوں کو اجازت نہیں ہے"
"کہ شوہروں کے مُردے کے ساتھ ستی ہوں" (جلد اول صفحہ ۱۲۰، ۱۲۸۰)

ایک دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"صرف بنیوں میں ذات فرقے ہیں اور گو ایک دوسرے کے ساتھ ملکر کھانا نہیں کھاتے ہیں"
"لیکن آپس میں میل جول کر رہتے ہیں۔ برہمن ہمیشہ لوگوں کو اسکی ترغیب دیا کرتے ہیں"
"کہ دیوتاؤں کے واسطے بڑی بڑی جائدادیں وقف کیجائیں"۔

"پارسی بھی ہیں اور وہ اپنے رسوم مذہب زردشت کے بموجب ادا کرتے ہیں عیسائیوں کو"
"پوری اجازت ہے کہ اپنے گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں اور بعض مرتبہ"
"وہ اسمیں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ عیسائی ہوجاتے ہیں ان کے اخلاق"
"اس شہر کے تمام لوگوں کے اخلاق سے عموماً بدترین ہوتے ہیں۔ (جلد اول ۱۵۹، ۱۶۲)

یہ سیاح و تاجر جب سورت میں پہنچتا ہے تو وہاں کی مذہبی حالت حسب ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

"اس شہر میں تخمیناً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن انمیں کبھی کوئی سخت جھگڑے"
"ان کے اعتقادات وطریقہ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے۔ ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح"
"چاہے اپنے طریقہ سے اپنے معبود کی پرستش کرے۔ صرف اختلاف مذہب کی بنیاد پر کسی کو"
"تکلیف دینا اور آزار پہنچانا ان لوگوں میں بالکل مفقود ہے"۔ جلد اول صفحہ ۱۶۲

ہم اُن مورخین سے جن کی کتابیں ہم کو اسکول میں پڑھائی گئی تھیں یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ اخلاقی جرم نہ تھا کہ انہوں نے اس قسم کے واقعات اپنی تاریخ میں نہیں درج کئے۔ کیا وہ لاعلم تھے۔ یا اُن کی سیاسی اغراض اسکی متقاضی تھیں کہ وہ تمام ہندو مسلمان بچوں کے دل میں یہ خیال قایم کریں کہ اورنگ زیب ایک متعصب مسلمان تھا جس نے ہمیشہ ہندوؤں کا گلا کاٹا۔ یہ وہی خیالات ہیں جو بعض اوقات ہمارے بعض تعلیم یافتہ ہندو برادران وطن کے دلوں میں آتش عداوت کو مشتعل کردیتے ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ اورنگ زیب کی طبیعت مذہبی واقع ہوئی تھی اور وہ جن لوگوں کو لامذہبی کے راستہ پر جاتا دیکھتا تھا ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتا تھا مثلاً جب کبھی وہ کسی مسلمان کو خلاف شرع کوئی فعل کرتا دیکھتا تو وہ اُس کو خود اُسی کی شرع کے مطابق سزا دینا فرض سمجھتا تھا۔ ملک دکھن میں اورنگ آباد کے قریب ایک مقام دولت آباد ہے۔ وہاں کی روایت ہے کہ اس عظیم الشان جلیل القدر فقیر منش بادشاہ نے اپنے ہاتھوں سے کلام مجید لکھکر اور ہدیہ سے جو رقم وصول ہوتی تھی اُس کے سرمایہ سے چند گز زمین اُسی مزار کے قدموں کے قریب خریدی تھی جس سے اُس کو روحانی بیعت تھی اور یہ وصیت کی تھی کہ اُسی زمین کو اسکی نعش پہونچادیجائے اُسپر نہ عمارت ہو نہ مقبرہ ہو۔ سبز گھاس کافی ہے۔ اور قبر ایسی بنائی جائے کہ اس کے پیر طریقت کے مزار ہونے سے جو پانی بہے وہ اس بادشاہ کی قبر پر سے گذرے اُس کے پاس ایک مدرسہ ہو جسمیں بچوں کو کلام مجید کی تعلیم دیجائے۔ میں نے اس مقام کو دو مرتبہ دیکھا ہے۔ دیکھکر یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آجتک اُس وصیت کی پابندی ہو رہی ہے۔ حال میں اعلیحضرت حضور نظام دکھن نے ایک سنگ مرمر کا کٹہرہ

اس قبر کے گرد بنوا دیا ہے۔ اس سے اورنگ زیب کی مذہبی طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مگر جس مذہب کا رنگ اُس کی طبیعت پر چڑھا ہوا تھا وہی مذہب اسکو مذہبی رواداری کی تعلیم دیتا تھا یہی مذہب یہ پکار پکار اُس سے کہتا تھا۔

# لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن

(کلام مجید پارہ سوم)

(مذہب کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں)

دولت آباد کے جس دامن کوہ پر اورنگ زیب نے اپنی زندگی کے کچھ دن بسر کئے اسی کے نیچے چند قدموں کے فاصلہ پر وہ غارہائے ایلورہ واقع ہیں جہاں بدھ اور ہندو زمانہ کے مذہبی مندروں اور بتوں کی سنگ تراشی دیکھنے کے لئے آج بھی یورپ اور امریکہ کے لوگ آتے ہیں۔ اُسی ضلع میں اجنٹہ کے وہ مذہبی غار ہیں جن کی نقاشی دیکھکر اس زمانہ میں بھی ایک فرانسیسی ماہر فن گویا سکتہ میں آگیا۔ اگر اورنگ زیب کا تعصب اس قسم کا ہوتا کہ وہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو نہیں دیکھ سکتا تھا تو اسوقت اُس کے لئے ان آثار کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا کچھ دشوار نہ تھا لیکن سوائے ذہنی خیال کے اسکا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ خود اورنگ زیب ہی نے یا اُن کے حکم سے کسی نے اُن میں ہاتھ لگایا۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں اورنگ زیب کی طبیعت مذہبی واقع ہوئی تھی مگر اُس کے یہ معنی نہ تھے کہ دوسرے مذہب کی رواداری نہ تھی ہر ہندو اپنے مذہب کے مطابق عمل کر سکتا تھا۔ ہر شخص آزاد تھا۔ ہر شخص جو مذہب چاہتا تھا اختیار کر لیتا تھا۔ جب میں ملک دکھن کے قلعہ گولکنڈہ و قلعہ کریم نگر کو دیکھنے گیا تو ایک منظر ایسا دکھائی دیا جس کا اثر میرے دل پر بہت خوشگوار تھا۔ قلعہ گولکنڈہ و کریم نگر

ہندو زمانہ کے ہیں اُنکی چوٹیوں پر اب تک ہندو پرستش گاہیں موجود ہیں مسلمانوں نے ان قلعوں کو فتح کرنے کے بعد ہندوؤں کی اِن عبادت گاہوں کو نیست و نابود نہیں کیا۔ ہندو وہاں تیرتھ کیلئے آج بھی جاتے ہیں یہ دیکھکر مجھ کو مسلمانوں کی مذہبی رواداری پر فخر ہوا ایک ہی اللہ کے بندے ایک ہی خدا کی پرستش اس عالم میں کس کس طریقہ سے کر رہے ہیں اگر مسلمان اہل ہنود کو اسکی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں کہ خدا تک پہنچنے کیلئے کسی پتھر کو واسطہ قرار دینے کی ضرورت نہیں تو اس زمانہ میں مقصد اِن کا پتھروں کی توڑ پھوڑ سے ہرگز نہ حاصل ہوگا اگر مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن بنا کر رہنا چاہتے ہیں اگر مسلمان ہند کو اپنی مادرِ مشفقہ سمجھتے ہیں تو اس زمین میں جتنے بچے پیدا ہوئے ہیں ان کا تعلق اور مذہبی رواداری کا ہونا انکے قیام زندگی کیلئے لازمی ہے۔

یہ تاریخی واقعہ ہے کہ عہد مغلیہ میں تبلیغ اسلام کبھی نہ گورنمنٹ و حکومت کی شاخ قرار دیگئی نہ مغلیہ بادشاہوں نے تبلیغ اسلام کبھی اپنا فریضہ سمجھا البتہ یہ اور بات ہے کہ مولویوں کے اثرات اور بعض خدا پرست مسلمانوں کے طرز زندگی سے عوام الناس کے دل متاثر ہوئے اور مذہب اسلام کی سادگی اور اس کی یہ تعلیم کہ خالق کی نظر میں سب انسان برابر ہیں ہندوستان کے باشندوں کے اُس حصہ کو جو ذات پات کی زنجیروں میں گرفتار تھے ایک خوشگوار منظر معلوم ہوا اور خود بادشاہ کا مذہب بھی ایک خاص وقعت رکھتا ہے ان وجوہ سے مسلمانوں کی تعداد میں کسیقدر اضافہ ہوا مگر ہندوستان میں تبلیغ اسلام کبھی اُس باقاعدہ و باضابطہ طریقہ سے نہیں کیگئی جیسے کہ اسوقت مذہب عیسوی کی تبلیغ مشنریز کرتے ہیں۔ مسلمان بادشاہوں نے کبھی اس کا بیڑا نہیں اُٹھایا۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ عہد اورنگ زیب میں مذہبی رواداری کی بابتہ

رائے قائم کرنے کی غرض سے اپنے موجودہ تمدن کو ذرا گہری نظر سے دیکھئے
اور ہندوستان کے اُن حصص میں جو مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا مرکز تھے
کسی پُرانے شہر کے پُرانے محلے میں قدم رکھیئے خواہ دہلی ہو آگرہ ہو یا لکھنؤ۔ یا
کسی قصبے میں جائیے۔ خواہ امیٹھی ہو' کاکوری ہو' یا جگوا۔ تو کیا نظر آئیگا
کہ ایک ہی دیوار کے سایہ میں ان دونوں مذاہب کے لوگ امن وامان سے
پشتہا پشت زندگی بسر کر چکے ہیں اور اسی کا اب بھی یہ اثر ہے کہ ایک ہی
بنیا۔ بزاز۔ حجام۔ مالی۔ لوہار۔ سنار۔ دونوں کی روزانہ ضروریات
پوری کر رہا ہے۔ مسلمانوں نے علیحدہ ہٹ کر کوئی سول لائنس نہیں قائم کیں۔ ابھی
میں خاص میرے محلہ کے ہندو بچے میرے والد کو اسی طرح سے چچا یا دادا
کہکر خطاب کرتے تھے۔ جیسے کہ میرا فرض تھا کہ اپنے والد سے ملنے والے
ہندو احباب کو خطاب کروں۔ اگر قدیم سے مذہبی رواداری نہ ہوتی تو اس
تمدن کے بڑے بڑے یہ آثار اس طرح سے آج کیونکر باقی رہتے۔ اس میں شک
نہیں کہ یہ تمدن اب سُرعت سے مٹتا چلا جا رہا ہے۔ جس کے اسباب پر غور کرنے
کا یہ موقع نہیں مگر اب بھی جا بجا اُن لوگوں کی مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے اس
مذہبی رواداری کی آب وہوا میں پوری نشوونما پائی ہے مجھ کو امید ہے کہ
میرے معظم و مکرم راجہ راجایان سر کشن پرشاد مہاراجہ بہادر یمین السلطنۃ۔ جی
سی۔ آئی۔ ای مجھ کو معاف فرمائیں گے۔ اگر ان کی ایک خانگی تحریر کا ذکر
کردوں ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۴ء میں عید الضحیٰ کے موقع پر اپنے اہل اسلام احباب
کو مہاراجہ جنابِ ممدوح نے ایک مبارکباد لکھی تھی چنانچہ مجھ کو بھی کمال عنایت سے

یاد فرمایا تھا اس تحریر کی نقل کرتا ہوں۔

## ہُوالکل مُعِیْن

خدا کہیے یہ کہتے ہیں نہیں پرما تما کہیے
اگر پرماتما کہتا ہوں کہتے ہیں خدا کہیے

مری وحدت پرستی پر گئی اشا ضغطے میں
نہیں کچھ کہتے بنتا ہے اگر کہیے تو کیا کہیے

یہ جھگڑے تو چلے ہی جائے تشا آپ آؤ
محبوب ہے نوید آمد عید الضحیٰ کہیے

میں اپنے جوابی شکریہ کے خط کے چند جملے نقل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

"اگر ہندو مسلمان ہندوستان کے دو دریا ہیں تو آپ ان کے سنگم ہیں۔ اگر ہندو "
"مسلمان ایک جسم کی دو آنکھیں ہیں تو آپ اُن کا فوکس اور وہ نقطہ ہیں جہاں"
"دو نوں کی روشنی مل جاتی ہے۔ افسوس! ہندوستان میں ایسے نفوس کم ہوتے جا رہے ہیں"

المختصر مہاراجہ صاحب اس ملک کے قدیم تمدن کے عظیم الشان نمونہ ہیں کیا اختلاف مذہب ہندو مسلمان میں گہری دوستی قائم ہونے کا کبھی مانع ہوا؟

میرا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ کبھی مانع نہیں ہوا۔

بابو شیو سہائے مرحوم لکھنؤ کے ایک محلہ "عیش باغ" میں رہتے تھے۔ طالب علمی کی حالت میں انہوں نے ایک کلب قائم کیا تھا۔ جس میں بحیثیت طالب علم میں بھی شریک ہوا۔ ہماری دوستی کے پینگ اتنے بڑھے کہ ایک ساتھ خورونوش میں عار نہ رہا۔ جب جون ۱۸۹۲ء میں معلوم ہوا کہ میں امتحان بی اے میں کامیاب

ہوگیا۔ اُس وقت تک بابو شیو سہائے ایل۔ ایل۔ بی پاس کر چکے تھے مثل ایک بڑے بھائی کے انہوں نے مجھ کو حکم دیا کہ اُسی سال نومبر کے مہینہ میں مجھ کو ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان میں شریک ہونا پڑیگا۔ میرا دلی رجحان طبابت و ڈاکٹری کی طرف تھا لیکن انہوں نے قانون کیلئے مجبور کیا۔ اُس زمانہ کے قواعد کے بموجب لا لکچرس ایف۔ اے کے ساتھ ساتھ میں نے پورے کرلئے تھے پھر بھی زمانہ بہت کم تھا علاوہ بریں ایم۔ اے میں بھی شریک تھا۔ طبیعت ہچکچاتی تھی۔ میں تو کاندھا ڈالے دیتا تھا۔ بابو شیو سہائے نے کہا نہیں۔ تم کو اسی سال شریک ہونا پڑے گا۔ میں اپنے اس ہندو دوست کی شفقت کو کبھی نہیں بھولونگا۔ دن دن بھر میرے لئے قانون کی کتابوں کے خلاصے بناتے تھے مجھے رات کو آکر پڑھاتے تھے۔ ہالینڈ جورسپروڈنس کا مشہور بابو شیو سہائے کا خلاصہ جو بعد کو انہوں نے طبع کرایا اور جس سے سینکڑوں ایل۔ ایل۔ بی کے طلباء فیضیاب ہوئے اُن کی اسی زمانہ کی تصنیف ہے۔ ۱۰ جولائی ۱۸۹۴ء کو میں نے قانون پڑھنا شروع کیا۔ ۲۶ نومبر ۱۸۹۴ء کو امتحان ایل۔ ایل۔ بی شروع ہوا جب جنوری ۱۸۹۵ء میں میرے پرنسپل مسٹر وھائیٹ نے الہ آباد یونیورسٹی کے قانونی امتحان کے اشاعت نتیجہ کی کمیٹی سے واپس آکر مجھ کو قبل سے قبل یہ خبر پہنچائی کہ میں اول درجہ (فرسٹ ڈویژن) میں کامیاب ہوا۔ جب یہ خبر بابو شیو سہائے کے کانوں تک گئی تو ان کی مسرت کا اندازہ سوائے میرے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ بابو شیو سہائے مرحوم ہندو تھے۔ مسلمان نہ تھے لیکن کیا یہ اختلاف بھی دوستی کا مانع ہوا؟ اِن باتوں کے لکھنے سے میرا یہ مقصود

نہیں ہے کہ ہندوستان میں آج کے قبل ہندو مسلمانوں میں مذہبی جھگڑے کبھی نہیں ہوئے بلکہ میرا مقصد صرف سقدر ہے کہ اس ملک کی عام حالت ہندو مسلمانوں میں مذہبی رواداری کی رہی ہے۔ عام طور سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ امن وامان کے ساتھ رہتے بستے رہے ہیں۔ یہ ہمارا اصلی تمدن اورنگ زیب کے زمانہ میں تھا اور اب بھی بہت کچھ باقی ہے جس کی نظر سے موجودہ زمانہ کے حالات مجھ کو مجبور کرتے ہیں کہ اصل مضمون سے کسیقدر ہٹ کر عام مذہبی رواداری کے متعلق اظہار رائے کروں۔ اور پہلے میں اُن اہل اسلام سے پوچھتا ہوں جو کہ اپنی زندگی میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں مندروں کے پاس سے ہو کر گزرے ہیں کہ کیا ان مندروں کو دیکھ کر کبھی بھی کوئی جوش اُن کے دل میں اس قسم کا پیدا ہوا کہ وہ مندر مسمار کر دئے جائیں یا اُن کی صورت اُن کی آنکھوں کو ناگوار معلوم ہوئی اور اگر ایسا ہوا تو لاکھوں میں سے کتنے کے دلوں میں اور اسی طرح اُن اہل ہنود سے بھی پوچھتا ہوں جو ہزاروں مسجدوں کے پاس سے ہو کر روزانہ گذرے ہیں کہ کیا صرف اُن مسجدوں کو دیکھ کر کوئی مذہبی ولولہ اُن کے دل میں پیدا ہوا اور اگر ہوا تو لاکھوں میں سے کتنے کے دلوں میں؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہماری پنج وقتہ اذان اہل ہنود کے لئے ایک معمولی صدا ہو گئی ہے اسی طرح عام اہل اسلام کو ناقوس صرف ایک ایسی شئے معلوم ہوتی ہے جس میں سے سانس اور ہوا کے زور سے ایک بلند آواز نکلتی ہے اس میں اور عیسائیوں کے کلیسے کے گھنٹوں میں کیا فرق ہے؟

مسلمانوں کو نہ مندر کی عمارت سے کوئی خاص دشمنی ہے اور نہ ناقوس کی آواز سے کوئی خاص نفرت ہے۔ جو کچھ فرق ہے وہ خدا کے تصور میں ہے پتھر اور مٹی کی

کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ آخر مسجد و مندر و ناقوس کے جھگڑے بعض اوقات ہیبت ناک صورت میں جا بجا کیوں پیش آجاتے ہیں اور اُن سے وہ ناگوار اور تکلیف دہ نتائج کہ جن کا خیال کرنا بھی ہر امن پسند صُلح جو دِل کو رُوح فرسا ہوتا ہے۔ نمودار ہوتے ہیں۔ میری دانست میں اس قسم کے تنازعات کی ابتدا میں اصلی مذہبی جوش کو اسقدر دخل نہیں ہوتا جسقدر اغراضِ ذاتی اور نفسانیت کو ہوتا ہے جن کی جڑ جہالت و انسانی کمزوریاں ہیں مثلاً بعض اوقات کسی مقام کے چند سربراوردہ اشخاص میں کوئی خصومت قبل سے چلی آتی ہے محض اسکی بنا پر وہ کسی مذہبی رسم کی انجام دہی کے موقع پر مذہب کی آڑ میں اس طرح کچھ امور پیش کر دیتے ہیں کہ لوگوں کو برانگیختگی ہوتی ہے اور اس کے بعد عام مسلمان اور ہندوؤں کی شرکت اور پارٹی بندی خودداری کے اصول پر شروع ہوتی ہے اور اُسوقت کسی ذاتی خصومت، غرور و خودداری سے وہ نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کو ہم صرف مذہبی جوش پر محمول کرتے ہیں بعض اوقات ہمارے اوہام بھی ایسے تنازعات کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر اہل ہنود نے عشرۂ محرم میں مسجد کے قریب باجا بجا دیا یا ناقوس پھونک دیا تو یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ اُس سے غرض ہماری توہین تھی خواہ در اصل یہ غرض ہو یا نہ ہو شریر النفس لوگ جا گزیں یہی کراتے ہیں کہ توہین کرنا مقصود تھا۔ پھر خودداری کا مادہ مثل باد تند کے اس شعلہ کو بھڑکا دیتا ہے بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ جب ایک مقام پر ایک ہی وقت دونوں فرقے اپنے مذہبی مراسم ادا کرنے میں مشغول ہوتے ہیں تب چند لوگ ایسے بھی نمودار ہو جاتے ہیں جو جھگڑا

مذہبی حس تو کچھ نہیں ہوتا لیکن لاٹھی، تلوار، اور چھروں کی زور آزمائی میں لطف آتا ہے۔ یہ تو عام صورتیں ہیں کہیں کہیں شاذ و نادر مذہبی جوش کو بھی دخل ہو جایا کرتا ہے۔ مگر یہ عام صورتیں ایسی نہیں ہیں کہ اس ملک میں مذہبی رواداری قائم رکھنے کے لئے ایک غیر ہندوستانی قوم کا دائمی تسلط لازمی ہو۔ یہ عام صورتیں انسانی خلقت اور کمزوریوں کے وہ شعلے اور چنگاریاں ہیں جو ہر ملک میں ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں نکلا کرتی ہیں اور جب تک انسان باقی ہے نکلا کریں گی ان کا انسداد بہت کچھ حکومت کی انتظامی قابلیت پر منحصر ہے اور ان کو مذہب سے اسقدر تعلق نہیں ہے جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے۔ آج ایسا کون ملک ہے جہاں انسانوں کے جذبات سے بعض اوقات خونریزی کے نتائج نہیں پیدا ہو جاتے اگر ہندوستان میں کبھی کبھی مذہبی جھگڑے ان کے باعث ہوا کرتے ہیں تو یورپ کے ممالک میں آئے دن کی ہڑتال اور سیاسی امور میں اختلاف رائے اسی قسم کے فسادات کے موجب ہو جاتے ہیں ایسے ممالک جیسے جرمنی، یونان، اٹلی فرانس، آئرلینڈ، و انگلستان میں بھی وقتاً فوقتاً اِن جذبات کے اظہار میں ایک دوسرے کا سر توڑنے پر لوگ آمادہ ہو جاتے ہیں جس ملک کی آبادی تخمیناً ۳۲ کروڑ ہو اس میں کبھی کبھی کہیں کہیں جھگڑوں کا پیش آنا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

جیسا کہ مہاتما گاندھی نے بھی فرمایا ہے۔ اِس کا خوف نہ کرنا چاہیئے کہ برٹش انڈیا میں بحالت خود مختاری ہندو مسلمانوں کو ہضم کر جائیں گے یا مسلمان ہندوؤں کے مذاہب کو نیست و نابود کر دیں گے۔ جب کئی سو برس کی اسلامی حکومت

یہ نہ کر سکی تو پھر اس صدی کے مسلمان کیا کریں گے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس قسم کے تنازعات کو مذہب سے زیادہ تعلق نہیں ہے اور ان کا انسداد کافی انتظام سے ہو سکتا ہے۔

اے بھائیو! گزشتہ صدیوں میں اپنی انتظامی قابلیت سے تم اس قسم کے تنازعات کا سد باب کرتے رہے اور آئندہ بھی کر سکو گے۔

اگر مجموعی حیثیت پر غور کیا جاوے تو ہندوستان کی بڑی بڑی دیسی ریاستوں میں مذہبی رواداری برٹش انڈیا سے کم نہیں ہے اور اس قسم کے تنازعات کو رفع کرنے میں اُن کی انتظامی قابلیت کسی طرح برٹش انڈیا کے حکم رانوں سے کم نہیں ہے۔

اے برادرانِ وطن! مایوس نہ ہو۔ مجموعی حیثیت سے تم میں مذہبی رواداری کا کافی مادہ اب بھی موجود ہے

باب چہاردہ

# تجارت وتموّل وفارغ البالی

اورنگ زیب کے زمانہ میں ہند کی تجارت وتمول وفارغ البالی کی جو حالت تھی اُس کا حال پڑھکر ہم کو اپنے موجودہ افلاس پر افسوس معلوم ہوتا ہے جبکہ کروڑوں بنی نوع انسان کو سوائے ایک وقت کے دوسرے وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا ہے اورنگ زیب کے زمانہ میں تجارت سے دوطرفہ تمول بڑھتا تھا۔ باہمی تجارت کرنے والے دونوں ملک دولت سے مالامال ہوتے تھے۔ ہندوستان کا بیشما مال ولایت، پرتگال، ہالینڈ اور فرانس کو جایا کرتا تھا اور اسی طرح سے اُن ممالک کے لوگ ہندوستان کو مال بھیجتے تھے۔ اس باہمی مساوات سے اس ملک کے تجار کی یہ حالت تھی کہ کپتان ہملٹن ایک مقام پر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ عبدالغفور نامی ایک سوداگر سورت میں رہتا ہے جس کا سرمایہ تجارتی "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی کل تجارت و سرمایہ کے برابر ہے۔

"میں نے دیکھا ہے کہ ایک سال میں مال کے تقریباً (۲۰) جہاز بھر کر وہ بھیجتا ہے ہر ایک جہاز ۳۰۰ سے لیکر ۸۰۰ ٹن کا تھا۔ اور ہر ایک میں صرف اُس کا مال دس ہزار پونڈ اور بعضوں میں ۲۵۰۰۰ پونڈ کا تھا۔ اور جب یہ مال باہر روانہ ہو چکتا تھا تب بھی اُس سے زیادہ مال اُسکے پاس آئندہ کے لئے باقی رہتا تھا"

جلد اول صفحہ ۱۴۰-۱۴۸

ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ ہندوستانیوں کے پاس بڑے بڑے عمدہ جہاز ہیں جو

ہندوستانی انگریز ملاحوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیکر بہ حیثیت کپتان اور میٹ ملازم رکھتے ہیں۔ (جلد اول صفحہ ۲۲۳)

ملابار کے کنارے پر ایک قوم آباد تھی جو غالباً اب "ماپلا" کے نام سے مشہور ہے انکی نسبت لکھا ہے کہ یہ لوگ یورپ کے براعظم کو مچھلیاں بھیجتے ہیں عام طور سے لوگ ہندوستان سے لوہا قیمتی جواہرات وچوبینہ بھیجا کرتے تھے ایک قسم کا رنگ بھی بھیجا جاتا تھا جس سے چھینٹ ایسی خوبصورت چھپتی تھی کہ بقول ہملٹن دنیا میں کہیں کا رنگ اس کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ میں نے خود بھی میسور کے عجائب خانہ میں ہندوستان کی پرانی چھینٹ دیکھی ہے جو ہین اس ملک سے جایا کرتا تھا انکی نسبت بھی کپتان صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ یورپ میں اس سے بہتر ذائقہ کا ہین دستیاب ہونا دشوار تھا۔

ہندوستان کا کپڑا ایسا عمدہ ہوتا تھا کہ اسکی مانگ نہ صرف ولایت میں تھی بلکہ ایسے مقامات پر بھی تھی جیسے پیگو وسماٹرا وغیرہ

(جلد اول صفحہ ۲۹۶ - ۳۵۰)

جنوبی ہند کے بڑے بڑے ہندو راجہ تجارت کیا کرتے تھے۔ ساحل ہندوستان کے جنوبی حصہ سے جب کپتان صاحب کا جہاز گذرا تو اُن کو ایک مقام پر خفیف سا ٹیکس راجہ صاحب کو ادا کرنا پڑا جب کپتان صاحب راجہ صاحب سے ملاقات کرنے گئے اور غالباً ٹیکس کی شکایت کی تو راجہ نے کہا کہ یہ تو بہت معمولی بات ہے فرض کرو کہ غیر اقوام کے لوگ ولایت بغرض تجارت جائیں تو اُن سے بھی وہاں ٹیکس لیا جائے گا۔ علاوہ بریں ہم لوگ تمہاری جان ومال کی حفاظت کے

ذمہ دار ہیں لہٰذا ایسا خفیف سا ٹیکس لینا ایک واجبی بات ہے۔

(جلد اول صفحہ ۲۹۹)

شاہی ٹیکس جو تجار کو دینا پڑتا تھا وہ بھی بہت کم تھا۔ تجارتی مال پر مسلمانوں سے (۲) فیصدی ٹیکس لیا جاتا تھا۔ اور عیسائیوں سے (۴) یا (۱/۲ ۴) فیصدی لیکن مسلمانوں کو ایک اور دوسرا ٹیکس بھی اپنے مال پر دینا پڑتا تھا جو دو فیصدی تھا۔ کپتان ہملٹن صاحب نے اسکو "پال ٹیکس" لکھا ہے۔ یہ پال ٹیکس عیسائیوں سے نہیں لیا جاتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے ٹیکس کے معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص رعایت نہیں کیجاتی تھی۔ مزید براں انگلستان کے تجار پر ابتداءً اسقدر اعتبار کیا جاتا تھا کہ جب وہ مال ساحل ہندوستان پر اتارتے تھے تو فوراً کوئی محصول اُن سے نہیں لیا جاتا تھا۔ بلکہ آخر سال میں جسقدر مال واقعی فروخت ہوتا تھا۔ اُس پر انہیں کے خیالی عمل پر اعتبار کرکے محصول لیا جاتا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس معاملہ میں زیادہ دیانت سے کام نہیں لیا جسکی وجہ سے وہ طریقہ اختیار کرنا پڑا جو اسوقت رائج ہے یعنے جوں ہی مال سرزمین ہندوستان پر اتارا جاتا تھا اس پر محصول کا حساب لگا لیا جاتا تھا۔ ہم ایک دوسرے موقع پر اُس خط و کتابت کی نقل کریں گے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین اور گورنمنٹ مغلیہ کے سورت کے گورنر کے مابین ٹیکس کے معاملہ میں ہوئی ہے اُسی سلسلہ میں ہم یہ بھی دکھلائیں گے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں گورنمنٹ نے تجار کے مال کی حفاظت کی ذمہ داری اسقدر اپنے ذمہ لے لی تھی کہ اگر اُن کا مال چوری جاتا تو گورنمنٹ خزانہ شاہی سے نقصان کی تلافی کردیتی تھی۔

اسمیں شک نہیں کہ اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان کی تجارت کا مقابلہ یورپ کے بڑے بڑے ممالک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی تجارت و مال کی بدآمد وبرآمد کا یہ نتیجہ تھا کہ صرف شہر سورت میں چنگی کی آمدنی تیرہ لاکھ روپیہ سالانہ ہوتی تھی اور احمدآباد میں ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ سالانہ چنگی کی آمدنی تھی ملاحظہ ہو (جلد اول صفحہ ۱۴۸)

بنگال میں صرف دریائے ہوگلی سے (۵۰ یا ۶۰) جہاز مال سے بھرے ہوئے سالانہ تجارت کے لئے بیرون ہندوستان بھیجے جاتے تھے ایک ایک ہزار میل کے فاصلہ سے یہ مال کشتیوں پر لایا جاتا تھا۔ اس میں زیادہ تر افیون، پچ، سونٹھ تمباکو اور کپڑا ہوتا تھا۔ (جلد دوم صفحہ ۲۱)

کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ تمام ساحلِ ہند پر ہندوستانیوں کے بڑے بڑے جہاز تجارتی مال سے لدے ہوئے چلتے پھرتے نظر آرہے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۴۵)

آج وہ ہمارے تجارتی جہاز کہاں چلے گئے۔ آج جب کونسل میں یہ تجویز پیش کیجاتی ہے کہ ہندوستانیوں کو جہازی بیڑہ تیار کرنے کی اجازت ہو اور یہ کہ ان کو جہازرانی سکھلانا چاہیے تو وہی زبان میں انکو ناقابل کہا جاتا ہے لیکن افسوس ہے ہماری گزشتہ تواریخ پر نظر نہیں ڈالی جاتی ہم صرف بھولا ہوا سبق یاد کرنا چاہتے ہیں اگر ہم سبق بھولنے کے وجوہ بیان کرنے بیٹھیں گے تو یہ کام بہت رنج دہ و ملال انگیز ہوگا۔

یہاں تک تو اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان کی تجارت اور تمول کا بیان

کیا گیا ہے اب اہل ہند کی فارغ البالی کا حال سنئے اگر اشیاء احتیاج کی ارزانی او
لوگوں کی خوش حالی و فارغ البالی کسی حکومت کی کامیابی کا ثبوت قرار دیجاتی
ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ہندوستانی رعایا بہت
فارغ البال و خوشحال تھی۔

کپتان ہملٹن صاحب لکھتے ہیں کہ بیف (گائے کا گوشت) تین فارد نگ
یعنے کچھ کوڑیوں کو نصف سیر ملتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۱۶۱)

ایک ٹن یعنے کئی من نمک ایک کراؤن میں فروخت ہوتا تھا۔ جو کہ غالبًا
دو یا ڈھائی روپیہ کے برابر ہوتا تھا (جلد اول صفحہ ۲۵۵)

ساحل کارومنڈل کے کنارے ساڑھے تین آنہ میں ۲۰ پونڈ مچھلی جو کہ
ذائقہ میں ٹراؤٹ اور سامن کے برابر ہوتی تھی ملتی تھی۔

(جلد اول صفحہ ۳۷۹)

شہر کٹک میں مکھن ایک آنہ میں ایک پونڈ یعنے نصف سیر ملا کرتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۳۹۲)

دو آنہ میں ایک سو مچھلیاں فروخت ہوتی ہیں جو کہ اتنی اتنی بڑی ہوتی تھیں
کہ ان میں کی صرف دو مچھلیاں ایک آدمی کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہوتی تھیں
شہر ڈھاکہ میں اشیاء احتیاج اس کثرت سے اور اس قدر ارزاں و سستیاب ہوتی تھیں
کہ اسوقت اس کا یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے اور ملک ہمیہ آباد تھا"

(جلد دوم صفحہ ۲۴)

میں نے ایک ایسے قابلِ اعتبار شخص سے سنا ہے۔ جس نے کہ موسمِ سرما میں وہاں زندگی بسر کی ہے کہ پانچ سو اسی (۵۸۰) پونڈ چاول ایک روپیہ میں ملتا ہے"

(جلد دوم صفحہ ۲۵)

ہرن، بارہ سنگھے، مور، اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ لوگوں کے گھروں میں بلا خوف و خطر آجاتے ہیں۔ (جلد اول صفحہ ۱۲۴)

احمد آباد۔ دولت۔ ثروت اور عظمت میں یورپ کے بڑے بڑے شہروں سے کچھ ہی کم ہوگا۔ صرف شہر سورت کی آمدنی ایک لاکھ باسٹھ ہزار پانچ سو (۱۶۲۵۰۰) پاؤنڈ ہے اور احمد آباد کی آمدنی اس سے دس گنی ہے۔ کپتان ہملٹن عہد اورنگ زیب کی بابتہ اپنی عینی شہادت دیتے ہیں کہ ہند میں یہ ترقی و ثروت تھی۔

(جلد اول صفحہ ۲۶۶)

*

کیا آج تمام یورپ کے بڑے بڑے مدبر اس میں متفق الرائے نہیں ہیں کہ ہر گورنمنٹ کی کامیابی کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ جو خدا کے بندے اسکے زیر حکومت ہوں وہ ننگے اور بھوکے نہ رہیں اسکی زیر حکومت ہر متنفس کو اگر پیٹ بھر کھانا پہننے کو کپڑا اور سر چھپانے کو مکان مل جائے تو گورنمنٹ کی اصلی غرض حاصل ہوجاتی ہے۔ آج اگر تہذیب و تمدن کی صرف سطح ظاہر پر نظر ڈالی جائے تو وہ کچھ ایسا عظیم الشان اور درخشاں نظر آئیگا کہ دیکھنے والے کی نظر خیرگی کرتی اور ایسا دلفریب و خوبصورت دکھائی دیگا کہ دل لہلوٹ ہوجائے گا۔ مگر جب بہ نظر تحقیق اس کی تہ کو دیکھا جائے تو یہ پتہ ملیگا کہ ہر یوروپین سلطنت اپنی رعایا کی صرف خورونوش کے انتظام میں منہمک ہے۔ ولایت میں لیبر گورنمنٹ اس مسئلے

# [illegible] (جلد اول صفحہ ۲۷۰)

کوحل کر رہی ہے۔ مجھ کو تو سنہ ۱۹۲۴ء کے یورپ کے سفر میں یہ محسوس ہوا کہ اس وقت یورپ کے باشندے روپیہ پیدا کرنیکی دھن میں ہیں نہ حق و ناحق کی پروا ہے نہ واجب و ناواجب کا کچھ لحاظ خصوصاً وہ جب کسی اجنبی سے معاملہ کرتے ہیں۔ خیر سفر میں میری یہ نظر تو سرسری تھی مگر کپتان ہملٹن کا سفرنامہ پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں ہند کے باشندے اپنی زیست کے اسباب فراہم کرنے میں اسقدر حیران و پریشان نہ تھے جیسا کہ آج نظر آرہے ہیں بلکہ دنیا کے اسوقت کے حالات کے اعتبار سے ان کی تجارت، دولت، ثروت اور فارغ البالی یورپ کے ممالک سے اس زمانہ میں اگر بڑھی چڑھی نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔ موجودہ افلاس کو عہد اورنگ زیب کی خوشحالی سے مقابلہ کیجئے اور پھر لوگوں کی فارغ البالی کا فیصلہ کرئے۔

## بابِ پنجم

# انصاف، امن و امان

ہر حکومت کا دار و مدار انصاف پر ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے ہادیٔ برحق رسولِ خدا کا آب زر سے لکھنے کے قابل یہ ارشاد ہے کہ انصاف و کفر کے ساتھ سلطنت کی بقا ممکن ہے مگر ظلم و اسلام کے ساتھ وہ ہرگز باقی نہ رہیگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اسلامی سلطنت اپنی رعایا کے ساتھ عام اس سے کہ وہ مسلمان یا غیر مسلمان کوئی ہو یکساں انصاف کرنا بقائے سلطنت کا موجب سمجھتی آئی ہے اور شرع اسلام نے قضا کو حکم

کہ مابین مسلم و غیر مسلم ہی وہی فیصلہ کریں جو مقتضائے نصفت و عدالت ہو۔ انصاف وہ مقدس عمل بلکہ عبادت ہے کہ جس کی بجا آوری میں ذات پات اور مذہب کو کچھ دخل نہ ہونا چاہیئے۔ انصاف صرف سلاطین اور قضاۃ ہی کا فرض نہیں ہے بلکہ ہر شخص پر واجب ہے کہ ایک دوسرے انصاف کرے اور انصاف چاہے اور جب تک انصاف نہ ہو انسانوں کا ایک ساتھ مل جلکر رہنا غیر ممکن ہے انصاف ہر سوسائٹی کی جان ہے۔ اگر کسی تمدن میں انسانوں کے دل سے ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری و حفاظت کا خیال نکال ڈالا جاوے تو وہ تمدن ایک دم سے درہم برہم ہو جائے گا یوں تو انصاف رواداری اور حسن سلوک کی ہر ملک اور قوم کو ضرورت ہے لیکن ہر تمدن میں انسانوں کے باہمی حقوق کا تخیل و تصور مقامی عادات و رسم و رواج کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ انصاف کا تصور بھی مختلف ہوتا ہے اور جب ہر قوم کے خیال کے مطابق انصاف ہوتا ہے تو وہ اسکو انصاف سمجھتے ہیں ورنہ ظلم۔ چاہے عامل نے اپنی سمجھ میں کیسا ہی واجب اور درست عمل کیا ہو۔ مثلاً دیکھئے کہ دو ہزار برس قبل ہندو زمانہ کا ایک خاص نوع کا تمدن تھا اس زمانہ کے حالات کے اعتبار سے اہل ہند کی خاص ضرورتیں اسوقت کے خیالات کے تعلق سے تھیں انھوں نے پیشوں کی تقسیم کردی تھی اور شادی و غمی و معاشرت حتیٰ کہ خور و نوش کے معاملہ میں ذات برادری کی آہنی دیواروں سے انسانوں کی تقسیم مختلف طبقات میں اسطرح کردی تھی کہ اگر ہندو زمانہ کے کسی منصف سے یہ کہا جاتا کہ معاملات کے فیصل کرنے میں اس خاص تمدن کے تصور کو ذہن سے مثلاً ایسے امر میں نکال ڈالے کہ اگر کوئی نائر یا چھوت والے شودر نے

کسی برہمن کو چھو لیا ہے تو وہ کسی جرم کا مرتکب نہیں ہوا تو غالباً وہ منصف انصاف کے اس تصور پر تمسخر کی نگاہ سے دیکھے گا یہ ہندوؤں کی کیفیت اُن کے ابتدائی تمدن میں تھی اس کے بعد جب مسلمانوں کا تمدن آیا اس نے ہند کے تمدن میں کچھ نئے عنصر داخل کئے جن کی وجہ سے انسانوں کے خیالات اور ضرورتیں بدل گئیں اور ہند کے باشندوں میں وہ خلط ملط شروع ہو گیا جو کہ تمام انسانوں کو ایک سطح پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔

اس نئے تمدن نے انصاف کے تصور و تخیل کو بھی بدل دیا لہٰذا جب ہم کسی ملک کے انصاف رسانی کے طریقوں پر واجبیت یا ناواجبیت کا فتوے دینے بیٹھیں تو انصاف یہی ہے کہ ہم اُس زمانہ کے تمدن و ضرورتوں کو پیش نظر رکھیں اس لئے جو انصاف عہد اورنگ زیب میں تھا اس کے متعلق فتویٰ دیتے وقت ہم کو بھی اصول پیش نظر رکھنا چاہئے۔ یعنے وہ تمدن کونسا تھا اور اُس زمانہ کی ضرورتیں کیا تھیں۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں گو کہ ڈاک کا انتظام اس حد تک کر دیا گیا تھا کہ ہندوستان کے دُور دُور مقام سے دہلی تک خطوط پہنچنے میں صرف آٹھ یوم صرف ہوتے تھے۔ اور ہر پانچ میل کے فاصلہ پر ہرکارے بدل دیئے جاتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۱۴۹)

پھر بھی ریل نہ تھی، تار نہ تھا، سڑکیں اس حالت میں نہ تھیں جیسی کہ آج ہیں انسان اُس حد تک خلط ملط نہیں ہوئے تھے جیسے کہ آج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کپتان ہملٹن نے اکثر مقامات پر جو تصویر اُن سزاؤں کی کھینچی ہے جو کہ قانوں یا

ڈاکوؤں کو دی جاتی تھیں وہ آج ہم کو ہیبت ناک معلوم ہو رہی ہیں مگر اس زمانہ کے حالات اور ضرورتوں کے لحاظ سے وہ کچھ بھی ناواجبی نہیں تھیں۔ کپتان ہملٹن نے اس زمانہ کی عدالتوں کا پورا دستور العمل یا تنظیم ہم کو نہیں بتلائی۔ البتہ سورت کے قاضی کی بابت یہ لکھا ہے کہ وہ راشی تھا اور اکثر ڈگری میں (صہ) فیصدی اپنا حصہ لیتا تھا اور امیر و دولتمند غربا کے مقابلہ میں اکثر بازی لے جاتے تھے ممکن ہے کہ سورت کے قاضی کی یہی حالت ہو جس سے آج بھی دنیا خالی نہیں ہے۔ مگر ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ مجموعی حیثیت سے انصاف کی کیا حالت تھی انصاف رسانی کا پورا انتظام تھا یا نہ تھا۔ اس کا بہترین معیار یہ ہوگا کہ ملک کی اندرونی حالت پر نظر ڈالی جائے۔ کیا وہ نشانات و اثرات بخوبی نمودار تھے جو انصاف سے عموماً پیدا ہوا کرتے ہیں۔ کیا اہل ہند دنیا کے کاروبار کو باطمینان تمام چلاتے تھے اگر مذہبی رواداری اس قسم کی تھی جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اگر ملک میں اچھی تجارت و تمول و فارغ البالی و صنعت و حرفت ویسی ہی پائی جاتی تھی جیسا بیان ہوا تو پھر یہ کہنا دشوار ہے کہ عہد اورنگ زیب میں انصاف نہ تھا۔ یہ ثمرات اور نتائج بلا امن و امان و عدل و انصاف کبھی کسی ملک کو میسر نہیں ہوتے بس عہد اورنگ زیب کی یہ جو کچھ حالات لکھی گئی ہے یقیناً اس عہد کے امن و امان اور عدل و انصاف کے ہی بدولت تھی۔ کیا ایک درخت میں سیب کا پھل لگا ہوا دیکھ کر پھر بھی یہ کہنا کہ یہ درخت سیب کا نہیں ہے انصاف ہوگا؟

کپتان ہملٹن نے اپنے سفرنامے کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں انصاف کا چشمہ سکون کے ساتھ جاری ہے اور گو کہ اس چشمہ کے صاف و شفاف

دھارے کو بعض اوقات رشوت کے خس وخاشاک مکدر اور گدلا کر دیتے ہیں مگر اُس عہد کی مجموعی حالت انصاف کا فیصلہ اس نقاد سیاح نے پرمعنی فقرے سے کیا ہے۔

"لیکن سیاہ فام ہندوستانیوں میں رشوت ستانی اس سے زیادہ نہیں ہے جتنی کہ گورے چمڑے والوں میں ہے" (جلد اول صفحہ ۱۰ دیباچہ)

اس موقع پر گورے چمڑے والوں کی رشوت ستانی و مظالم کے کچھ حالات بیان کئے بغیر شاید عہد اورنگ زیب کے زمانہ کی قدر اور اُس عہد کے انصاف کا پورا اندازہ ناظرین کو نہ ہو سکے۔ لہٰذا کپتان ہملٹن کے سفرنامے سے چند اقتباسات کرتا ہوں:۔

ایک شخص مسٹر ولڈن Mr. Weldon نامی ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات طے کرنے کے لئے انگلستان سے ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ اس کے چال چلن کے متعلق کپتان ہملٹن صاحب لکھتے ہیں:۔

"اس کا زمانہ گورنری بہت مختصر سا تھا۔ لیکن اُس میں بھی اس نے لوگوں کو تنگ کر کے اپنا خزانہ بھرنے میں کچھ کوتاہی نہیں کی۔ اُس کے مظالم کی ایک خاص مثال یہ ہے کہ"

"ایک غریب ملاح کی ایک خوبصورت بیوی تھی جو اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں کبھی کبھی کچھ بدعنوانیاں بھی کر گذرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس عورت نے دو آدمیوں کو اپنے یہاں بلایا۔ اُن میں اس عورت کے تعلق سے رقابت ہو گئی۔ شدہ شدہ اُسکی خبر گورنر کے کان تک پہنچی۔ اس نے پہلے تو اُن دونوں کو طلب کر کے کچھ"

"سرزنش کی لیکن جب اُن میں سے ایک نے گورنر کے ہاتھ میں پانچ سو روپیہ رکھدئے تو اُس کو بلا شرکتِ غیرے اس عورت کا مالک بنا دیا اور وہ اس کو لیکر ہوگلی چل دیا۔ یہ شخص علانیہ کہتا پھرتا تھا کہ اس سودے میں اسکو کیا خرچ کرنا پڑا اور وہ اُس گورنر کا بڑا مداح تھا۔ جب اس عورت کا بے چارہ شوہر واپس آیا تو اس کو بیوی کی فرقت پر مجبوراً صبر کرنا پڑا باایں ہمہ معلوم یہ ہوتا تھا کہ گویا اس گورنر کو رشوت لینے میں کچھ شرم دامنگیر تھی یا اندیشہ مانع ہوتا تھا اسلئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جو لوگ اس قسم کے معاملہ کے واسطے اُسکے پاس آیا کرتے تھے اُن سے کہدیا کرتا تھا کہ میم صاحب اور بابا لوگ سے بات کرو اور اسکی بیوی اور اسکی لڑکی نہایت عمدگی کے ساتھ بڑی بڑی رقمیں ٹھہرالیتی تھیں اور روپیہ انہیں کے ہاتھوں سے پہنچتا۔ میں یہاں اور ہندوستان کے دوسرے مقامات پر اس قسم کی جبریہ رشوت ستانی کی بہت سی مثالیں پیش کرسکتا ہوں مگر پرانے زخموں کی پوست کنی نہیں چاہتا۔"

(جلد دوم صفحہ ۱۰)

یہ عہدہ داران ایسٹ انڈیا کمپنی کے انصاف کا عالم تھا۔ یہ مشتے از خروارے ہے اس قسم کے بہت سے واقعات کپتان ہملٹن نے اپنے سفرنامہ میں لکھے ہیں۔ اب اورنگ زیب کا جو انتظام امن و امان و انصاف کے متعلق تھا اس کی بابت کپتان ہملٹن صاحب کی رائے کو ملاحظہ فرمائیے وہ لکھتے ہیں کہ:-

"اس ملک کی رعایا فرامین کی اسقدر پابندی کرتی ہے کہ ڈاکہ و قتل کی خبریں بہت کم سنی جاتی ہیں۔ ایک غیر ملک کا باشندہ اس ملک میں کہیں چلا جائے۔ کوئی یہ بھی نہیں پوچھتا کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ اور کیوں جاتا ہے" (جلد اول صفحہ ۲۰۹)

پھر بھی کہا جاتا ہے کہ فرامین شاہی کی کوئی پرواہ نہ کرتا تھا اس امن و امان کا مقابلہ اُس بدامنی وظلم وستم سے کیجئے جوکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدداروں نے ہندوستان کے اُس خطۂ زمین پر پھیلا رکھی تھی جس کو بغرض تجارت شاہان مغلیہ نے اُن کو سپرد کر رکھا تھا۔ جس کا مفصل بیان باب نہم (۹) میں کیا جائے گا۔

مسٹر جے۔ آر۔ رائے صاحب لکھتے ہیں کہ سمندر پر قزاقوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ اسکی ذمہ داری عہد مغلیہ کے انتظام پر عائد کیجائے ذرا یہ تو دیکھ لیا جاتا کہ یہ قزاق کون تھے۔ اور کیونکر اُن کو قزاقی کا موقع ملتا تھا حقیقت یہ ہے کہ قزاق مخصوص ہندوستان کے ساحل کے نہ تھے بلکہ اُس زمانہ میں ولایت سے لیکر ہندوستان تک و نیز دیگر مقامات کے سمندر پر چند لوگوں نے غارت گری کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا انہیں کو "پائی ریٹس" (Pirates) کہتے تھے۔ کپتان ہملٹن نے ان کا ذکر بھی اپنے سفرنامہ میں کیا ہے اسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہازوں کے افسر بھی بعض اوقات راہ میں قزاق بن جایا کرتے تھے۔ اور جو کوئی تجارتی مال راستہ میں مل جاتا لوٹ لیتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۲۳۶)

ایک انگریز مسمی کپتان گرین "Captain Green" یہ ڈینگ مارا کرتا تھا کہ جسقدر مختصر سامان لیکر وہ انگلستان سے روانہ ہوا تھا اُس بے سروسامانی سے یہاں آنے کی شاید کسی شخص کی بھی ہمت نہ ہوئی ہوگی وہ بحری قزاقوں سے تجارت کیا کرتا تھا اور راستہ میں جو جہاز اسکو مل جاتا تھا اس کو لوٹ کر وہیں ڈوبا بھی دیتا تھا۔ اور اسی طرح سے اپنی بسر اوقات کرتا تھا۔ (جلد اول صفحہ ۳۱۰-۳۱۸)

میں نے تجارت کے باب چہارم کے سلسلہ میں دکھلایا ہے کہ اُس وقت اہل ہند یورپ تک تجارت کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ قزاق بعض وقت راستے میں دو ایک دیگر جہاز لوٹ لیتے ہوں جیسا کہ ہملٹن کے سفرنامہ کی جلد اول صفحہ ۲۱۵ سے معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اورنگ زیب اس غارتگری کے انسداد کا انتظام نہیں کرتا تھا۔ اول تو اسکا انسداد اُس زمانہ کے حالات کی نظر سے صرف ہند کے سمندر پر انتظام سے ناممکن تھا۔ پھر بھی بادشاہ کے فوجی جہازوں کا بیڑہ ”ڈنڈا راجا پور“ میں رہتا تھا۔ اس کا کمانڈر سیدی خاں تھا جس کے قبضہ میں (۳۰) یا (۴۰) ہزار آدمیوں کی فوج کا دستہ رہتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۲۴۰)

اسلئے یہ کہنا کہ سلطنت ہند کی طرف سے انسداد قزاقی میں بے پروائی کیجاتی تھی انصاف نہ ہوگا۔ رہی کامیابی وناکامیابی وہ کہاں تک تھی اس کا فیصلہ اس زمانہ کے حالات کی نظر سے کرنا چاہیئے خصوصاً جبکہ انسداد قزاقی کی غرض سے اُس کمانڈر کے پاس توپیں بھی تھیں ایک مرتبہ جب ضرورت پڑگئی تو اسی کمانڈر نے ”آناً فاناً“ میں چار بڑی توپیں کروڑگیری کی اس عمارت پر چڑھادیں تھیں جو کہ بمبئی کے قلعہ سے صرف ۲۰۰ قدم کے فاصلہ پر تھی الغرض رعایا کی پوری طرح سے حفاظت کیجاتی تھی۔ کپتان جان نے مس پرچیش پارس کی سیاحت میں صرف ایک موقع کا ذکر اپنے سفرنامہ میں یہ لکھا ہے کہ اُنہیں سرزمین ہند پر ڈاکوؤں سے اُن کا مقابلہ ہوگیا تھا ایک قافلہ کے ساتھ شہر سورت کیطرف کپتان صاحب موصوف اور اُن کے ہمراہی ملازمین جا رہے تھے کہ چند قزاقوں کے گروہ نے جو کہ سرحد ہندوستان

کے باہر بلوچیان سے عموماً آیا کرتے تھے قافلہ کو روکنا چاہا۔ کپتان صاحب اور اُن کے ملازمین نے بڑی بہادری سے مقابلہ کرکے اُن کو بھگا دیا۔ قافلہ پر اس عجیب بچاؤ کا بڑا اثر ہوا۔ یہ خبر اُڑتی اُڑتی شہر سورت میں پہنچی کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ جب اُن کا قافلہ سورت کے قریب پہونچا تو اہالیانِ شہر نے مٹھائیوں اور تحفوں کے ساتھ اُن کا استقبال کیا اور جب کپتان صاحب نے گورنر سورت سے ملاقات کرنے کی خواہش کی تو اس نے چند گھوڑے زیور سے آراستہ و پیراستہ اور ایک باڈی گارڈ استقبال کے لئے روانہ کیا اور جب وہ قریب آئے تو انکی یہ آؤ بھگت کی کہ خلاف معمول و دستور کپتان صاحب کی سواری کو اپنے خیمے تک آنیکی اجازت دی انکے تمام مال و اسباب کا محصول معاف کردیا اور بہ نفس نفیس خود فوج کا ایک دستہ لیکر اُن قزاقوں کو سزا دینے کے لئے روانہ ہوا۔

(جلد اول صفحہ ۱۱۹)

اسقدر خاطر و مدارات کی غالباً یہ وجہ تھی کہ بقول کپتان صاحب بادشاہ وقت اورنگ زیب کو حفظ امن کا بیحد خیال تھا اور جب کبھی کسی مقام پر اس قسم کے واقعات ہوتے تھے تو اُن کی تمام ذمہ داری صوبہ کے گورنر کے سر ہوتی تھی ایک مرتبہ جب اورنگ زیب کو اطلاع ہوئی کہ سورت میں ڈاکہ پڑا تو بادشاہ کا حکم بدین مضمون شرف صدور لایا کہ فوراً شہر کے گرد چار دیواری بنادی جائے۔

(جلد اول صفحہ ۱۴۵)

ایسے واقعات کا یہاں کبھی کبھی پیش آنا تعجب خیز نہ تھا اور کس زمانہ میں اور کس ملک میں ایسے واقعات نہیں پیش آتے رہتے ہیں اور یہ زمانہ کب اُن سے خالی ہے

دیکھنا یہ چاہیئے کہ اُس زمانہ میں ملک میں امن وامان کی حالت یہ تھی کہ یہی تاجر
تاجر مال و اسباب لیکر سترہ (۱۷) کہاروں کی پالکی میں سوار ساحل و وسط ہند
میں برسوں پھرتا رہا مگر سوائے ان دو واقعات کے ہندوستان میں کوئی اور
ایسا واقعہ اس کو پیش نہیں آیا جس کو وہ اپنے سفرنامہ میں درج کرتا ملک کی اس امن وامان کی
حالت سے عہد اورنگ زیب میں انصاف وامن وامان کے متعلق رائے قائم کیجا سکتی ہے
میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ عہد اورنگ زیب میں تمام عہدہ داروں کا دامن رشوت ستانی
کے دھبوں سے پاک وصاف تھا یا کبھی ڈاکہ نہیں پڑتا تھا انصاف کے معاملہ میں
جب کبھی دولت و غربت کا مقابلہ ہوجاتا ہے تو یہ حضرتِ زر مختلف صورتوں میں آج
بھی بڑے بڑے کرشمے دکھلاتے ہیں۔ جو لوگ کہ موجودہ مقدمہ بازیوں کی اندرونی
حالت سے واقف ہیں وہی اسکا کچھ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی روپیہ
جھوٹی شہادت کے مہیا کرنے میں اور قانون کی امداد حاصل کرنے میں ایک دولتمند
فریق کو کہاں تک مدد دیکر قوی بنا دیتا ہے اور مفلس فریق مخالف کو کیسی کچھ لاچاری
اور مجبوری کا سامنا ہوتا ہے اور اسطرح سے یہ حضرت زر آئے دن کیا کچھ انصاف
کا خون نہیں کرتے رہتے ہیں۔ رشوت ستانی و ڈاکہ اور چوری اب بھی بند نہیں ہے
ہمارے بچوں کو جو تاریخیں مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہیں اُنہیں ٹھگی کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے
اور کہا جاتا ہے کہ ٹھگی کا انسداد ایسٹ انڈیا کمپنی کی عہد حکومت میں انیسویں
صدی میں کیا گیا تھا اور اس کا فخر کمپنی مذکور کو دیا جاتا ہے مگر ان تاریخوں میں
ملک کے اُس امن وامان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا جو کہ قبل کمپنی کی حکومت کے تھا
اور جس کا تذکرہ کپتان ہملٹن نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے اصلیت یہ ہے کہ اس

ملک میں ٹھگی اُسوقت آئی جب کہ حکومت مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا جب اس ملک کے باشندوں نے اپنے انگریز حکمرانوں سے یہ کہا کہ عنانِ حکومت پھر اُن کے ہاتھ میں دیدیجائے تو بڑی کشمکش کے بعد اُن کو "ڈائی آرکی" (Diarchy) دیگئی جس کے بموجب ملکی انتظام کا ایک جزو انتخاب شدہ منسٹر یا وزیر کے سپرد ہوا اور دوسرا جزو گورنمنٹ کے سپرد رہا۔ اس طرح سے حکومت کی تقسیم ہوئی اس تقسیم کے دو ہی برس میں چل پکار مچ گئی دونوں حصوں میں اختلاف شروع ہو گیا۔ دو ہی برس میں بدامنی و بے اطمینانی کے آثار نمودار ہو گئے۔ "ڈائی آرکی" ناکام ثابت ہوئی اور ہر دور اندیش شخص کہنے لگا کہ "ڈائی آرکی" حکومت کرنے کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ اب اس "ڈائی آرکی" پر غور کیجئے جب ہندوستان کی حکومت شاہ مغلیہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں میں تقسیم ہوئی تھی ملک کی اسوقت کیا حالت ہو گی جبکہ حکومت کا شعبۂ دیوانی کمپنی کے عہدہ داروں کے قبضہ میں آگیا اور دوسرا شعبہ مالگزاری شاہ مغلیہ کے سپرد رہا ایسے دو متضاد عنصر کا جمع رہنا محال تھا۔ پھر بھی سارا ملک اندازِ نصف صدی اُس عجیب و غریب "ڈائی آرکی" Diarchy کے تہلکہ میں گرفتار رہا۔ ان حالات میں ڈکیتی نہ ہوتی تو کیا ہوتا جو کچھ نہ ہوتا تھوڑا تھا۔ لیکن جب عنانِ حکومت کلیتاً اس ملک کے باشندوں کے ہاتھ میں تھی تب ایسی بدامنی یا ٹھگی نہ تھی اس وقت انصاف تھا اور امن و امان تھا۔

بہ حیثیت قانون پیشہ اودھ کے بہت سے دیہات و تعلقہ جات کی واجب العرض پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا جن میں گاؤں یا تعلقہ کی گذشتہ تاریخ بھی بندوبست اول میں درج کیجاتی تھی۔ مجھ کو اکثر یہ دیکھکر استعجاب ہوا کہ ایک گاؤں یا تعلقہ

پشتہا پشت تک ایک ہی خاندان کی ملکیت وقبضہ میں برقرار رہا یہی دیکھنے میں آیا کہ جس شخص نے تین سو یا چار سو برس قبل جنگل کاٹکر آباد کیا تھا اسکی اولاد کے قبضہ میں وہ گاؤں ۱۸۵۷ء کے غدر میں بھی پایا گیا۔ اگر گزشتہ زمانہ میں انصاف و امن وآمان نہ تھا تو کسی گاؤں کی مسلسل تاریخ اسطرح سے کبھی نہ ہوتی ان وجوہ سے جیسے موجودہ زمانہ کی بابتہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجموعی حیثیت سے انصاف نہیں ہے یا امن وامان قائم رکھنے کی کوشش نہیں کیجاتی ہے اسی طرح سے عہد اورنگ زیب کی بابت یہ کہنا کہ انصاف نہ تھا یا امن وامان قائم رکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی انصاف نہ ہوگا۔ یہ عہد اورنگ زیب کے انصاف وامن وامان کے نتائج تھے جو کہ ملک کی تجارت وتمول وفارغ البالی کے سلسلہ بیان میں ظاہر کئے جاچکے ہیں

## باب ششم

# صنعت وحرفت

تاریخ اس کی شاہد ہے کہ جب کسی ملک میں انصاف ہوتا ہے تو امن وآمان ہوتا ہے اور جب لوگ فارغ البال وخوشحال ہوتے ہیں اور جب تلاش معاش سے کسیقدر بے فکری ہوتی ہے تب ہی انسانی دماغ صنعت وحرفت کی جانب رجوع ہوتا ہے مفلس قوم دین ودنیا دونوں میں روسیاہ رہتی ہے۔ "الفقر سواد الوجہہ فی الدارین" میں کوئی شک نہیں جسطرح ہے

"پراگندہ روزی پراگندہ دل" کی مثل ایک متنفس پر صادق آتی ہے اسی طرح سے قوم پر بھی صادق آتی ہے اب آپ دیکھئے کہ عہد اورنگ زیب میں ہندوستان کی صنعت وحرفت کی کیا حالت تھی اُس سے اس ملک کی خوشحالی کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔

کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں عمدہ سے عمدہ کپڑا اور بکثرت ایسا ملتا تھا جسکی مثال یورپ میں ملنی دشوار تھی پھر فرماتے ہیں کہ یہاں روئی کا ایک ایسا کپڑا بنا جاتا ہے جو بہت باریک اور ملائم ہوتا ہے اور اسقدر پائدار کہ ویسا انہوں نے کبھی اپنی زندگی میں استعمال نہیں کیا۔

(جلد اول صفحہ ۱۲۵)

غالباً یہ ڈھاکہ کی مشہور ململ ہوگی۔ اس کے علاوہ کمخواب چھینٹ اور سادے کپڑے بنانے والے اس کثرت سے پائے جاتے تھے کہ صرف ایک شہر بیجاپور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے (۵۰۰۰) پچاس ہزار کپڑا بننے والے جلاہے ملازم رکھ چھوڑے تھے لوگ پوچھیں گے کہ پھر یہ صنعت کہاں غائب ہوگئی۔

جن لوگوں کو اسکی جستجو ہو وہ رمیش چندر دت آئی۔ سی۔ ایس۔ سی آئی۔ ای مرحوم کی کتاب "ہند کی ایکانومک ہسٹری" ملاحظہ فرمائیں۔ یہ قابل فخر ہندوستانی ایک زمانہ میں اڑیسہ میں بعہدہ کمشنر ممتاز تھے اور پھر لندن کی یونیورسٹی کالج میں تاریخ ہند پر لکچرار مقرر ہوئے۔ انہوں نے ان سرکاری کاغذات کی مدد سے جو انکی نظر سے گزرے تھے یہ دکھلایا ہے کہ انگلستان کی صنعت وحرفت کو ترقی دینے کے لئے اور اس خوف سے کہ شاید ہندوستان کا کپڑا انگلستان کی منڈیوں تک

قبضہ نہ کرلیوے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ دار ہندوستان کے نداف اور اُس کی
صنعت کو نیست نابود کرنے کی غرض سے مختلف اقسام کی تدابیر استعمال کرتے تھے
پہلے کچھ رقم پیشگی دیکر اُن کو ملازم رکھ لیتے تھے اور جو چاہتے تھے وہ کام اُن سے
لیتے تھے اگر کسی نے کچھ بھی خلاف معاہدہ کیا تو ٹکٹکی میں باندھ کر بیدوں کی سزا
دیتے اور انکی انگلیوں کو مختلف اقسام کی ایذا پہنچاتے تھے ۔ ۱۷ مارچ سنہ ۶۹ء
کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو عام ہدایتیں اپنے عہدہ داروں کے لئے جاری کی تھیں
ان کا پڑھنا بھی تکلیف دہ ہے ۔ ہاؤس آف کامنس کمیٹی کے روبرو سنہ ۱۸۱۳ء میں جو
شہادت ٹامس منرو نے دی تھی اُس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کمپنی کے عہدہ داران
نداوں کو بھیڑیوں کی طرح سے ایک مقام پر جمع کرکے کھڑا کرتے تھے اور اُن پر
پہرہ مقرر کردیا جاتا تھا کہ جب تک وہ نداف حسب دلخواہ کمپنی معاہدہ پر دستخط نہ کردیں
اپنی جگہ سے ہٹنے نہ پاویں مسٹر کاکس نے شہادت دی تھی کہ اس طریقہ سے معاہدہ
کے پابند جولاہوں کی تعداد صرف انکے ایک کارخانہ میں پندرہ سو (۱۵۰۰) ہے
کمپنی نے جو قانون سنہ ۱۷۹۳ء میں نافذ کیا تھا اور جو ریگولیشن ایکٹ سنہ ۱۷۹۳ء کے نام سے
موسوم ہے اسکو ملاحظہ کیجئے اس قانون کے بموجب جس پارچہ باف نے کمپنی سے پیشگی
رقم لے لی پھر اس کو یہ حق نہ تھا کہ کسی دوسرے کا کام بنا دے اور اگر کوئی پارچہ باف
ایک سے زیادہ کارگاہ اپنے گھر میں رکھے گا تو بڑا تاوان دینا پڑے گا ۔ فوجداری میں
مقدمہ چلایا جاویگا ۔ عہدہ داران کمپنی کو اُن کے مکانوں میں بخلاف مرضی داخل
ہوجانے کا بھی اختیار دیدیا گیا تھا ۔ ان کارروائیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ جب سنہ ۱۷۹۴ء میں
صرف (۱۵۶) پونڈ کا مالیتی کپڑا سالانہ ولایت سے ہندوستان کو آیا تو سنہ ۱۸۰۲ء میں

یعنے صرف دس برس کے بعد (۲۷۸۵۶) ستائیس ہزار آٹھ سو چھپن پونڈ کا نالیتی کپڑا سالانہ ہندوستان کی تن پوشی کے لئے ولایت سے لایا گیا اور ۱۸۳۰ء میں یعنے تیس برس کے بعد ایک لاکھ آٹھ ہزار آٹھ سو چوبیس (۱۰۸۸۲۴) پونڈ کا کپڑا سالانہ لایا گیا۔ پھر وہ پارچہ باف یا ان کی صنعت جو عہد اورنگ زیب میں تھی اب کیسے دکھلائی دے۔ یہ تمام مواد رمیش چندر دت مرحوم کا جمع کیا ہوا ہے یہ وہ زمانہ ہے جب سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور عملاً کمپنی کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔

عہد اورنگ زیب میں اس ملک کی صنعت پارچہ بافی کو اسقدر عروج تھا کہ ہم نہ صرف اپنی پوری ضروریات کو ملک ہی کے کپڑے سے پورا کرتے تھے بلکہ غیر ممالک کے ہاتھ فروخت کر کے اپنی دولت میں اضافہ کیا کرتے تھے۔ یہ تو صرف پارچہ بافی کا ذکر ہوا عہد اورنگ زیب میں کپتان صاحب ملتان کو بھی گئے تھے تو وہاں ان کو بہترین تیر و کمان بنانے والے ملے۔ لوہا بکثرت پایا جاتا کہ جہازوں کے واسطے لوہے کے لنگر بھی ڈھالے جاتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۳۹۲)

کپتان صاحب نے گولکنڈے کے ہیروں کا بھی ذکر کیا ہے قاعدہ کلیہ ہے کہ جب کسی ملک کے تمدن کو عروج ہوتا ہے تو اس کا عکس اس ملک کی عمارات و مکانات پر بھی اسی طرح پڑتا ہے جیسا کہ ملبوسات پر عیش و عشرت کے یہی سامان ہیں جنھیں انسان کی طباعی و ذہانت اکثر نمودار ہوا کرتی ہے۔ فن انجنیری کے متعلق تو صرف اس قدر کہدینا ہی کافی ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اہل ہند آگرہ، و دہلی و لاہور کی وہ خوشنما

عمارتیں مکمل کر چکے تھے جن میں ایک عمارت "تاج بی بی" کا روضہ ہے جو اسوقت بھی عجائبات دنیا میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے عمارات بنانے والے عہد اورنگ زیب میں موجود تھے اور ان کے دماغوں کی جھلک دکھن تک پہنچی تھی۔ دکھن میں جہاں اورنگ زیب کا قیام کچھ عرصہ تک رہا ہے اس کے قرب وجوار کی عمارتیں ملاحظہ ہوں۔ اورنگ آباد میں اورنگ زیب کی بیٹی کا مقبرہ۔ قلعہ دولت آباد کے نیچے کی وہ مسجد وہ کھنڈر اور وہ منارے ملاحظہ ہوں جہاں اب بورچہ کے شکار کے لئے لوگ جاتے ہیں اور جن کو دیکھکر یہ شعر یاد آتا ہے:۔

از نقش و نگارِ درو دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

خود میرے قصبہ امیٹھی میں ایک مقبرہ ہے جس کے گنبد پر جن میں دور سے چند ٹائیلس اس نمونے کے چمکتے ہوئے دیکھا کرتا تھا جیسے کہ اب یورپ سے منقش ٹائیلس آتے ہیں اور جو وہاں کی صناعی کے نمونے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ چیز ہے کہ جسے ہم نے بہت زمانہ ہوا ایجاد کر کے رائج کر دیا تھا۔

اگر اورنگ زیب کے زمانہ کے فن انجینیری کے دوسرے شعبہ کا اندازہ کرنا مقصود ہے تو دکھن میں اورنگ آباد کے قدیم واٹر ورکس کو دیکھئے۔ آج تک لوگ حیران ہیں کہ وہ کونسا چشمہ ہے اور وہ کونسی ترکیب ہے جس کے ذریعہ سے تہ زمین میں بڑے بڑے نالے بنا کر میٹھے پانی کی گویا ندی بہادی ہے جس نے اورنگ آباد کی آبادی کو صرف سیراب ہی نہیں کر دیا تھا بلکہ باغوں، نہروں، حوضوں اور فواروں سے بہشت کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ مجھ سے خود اسٹون رج صاحب نے جو سلطنت حیدرآباد دکھن

کے واٹر ورکس کے انجنیر تھے۔ یہ بیان کیا کہ اگر آج ہم اس سے بہتر پانی کا لیول نکالنا چاہیں تو مشکل ہے وہ مقر تھے کہ اورنگ آباد کے لئے اس سے بہتر واٹر ورکس کا انتظام کرنا اس زمانہ میں بھی دشوار ہے۔ اُن کو افسوس تھا کہ فن انجنیری جن نے ایسے واٹر ورکس بنائے تھے ہندوستان سے اب معدوم ہے۔ ........

...... کیفیت اس خزانۂ آب کی یہ ہے کہ ایک مقام پر صرف ایک بہت عمیق کنواں ہے جس میں جھانکنے سے ایک چشمہ کا چھرایا سوتا سا نظر آتا ہے۔ یہیں سے ایک گہرا پختہ نالہ بہنا شروع ہوا ہے۔ جوں جوں شہر کیطرف یہ نالہ بڑھتا گیا ہے اُسمیں الغاروں پانی نمودار ہوتا جاتا ہے۔ شہر کے قریب جاکر اس میں سے پختہ نالیاں نکالی گئی ہیں۔ ڈھائی سو برس کے بعد آج بھی انہیں نالیوں سے شہر کو پانی ملتا ہے لیکن اسکی مرمت و صفائی کرنے میں اس زمانہ کے انجنیر بہت دشواری محسوس کرتے ہیں۔ اس قسم کے محیر العقول واٹر ورکس نہ صرف اورنگ آباد میں تھے بلکہ ہمنے اس کے آثار بڑو بیدر جیسے دور دراز مقامات پر بھی دیکھے ہیں گو کہ وہاں آب وہ اسطرح سے کار آمد نہیں ہیں جیسے کہ اورنگ آباد میں ہیں۔

کپتان ہملٹن صاحب لکھتے ہیں کہ سندھ کا شہر "ٹھٹہ" دریائے انڈس سے دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ دریا سے بذریعۂ کینالس اور نہروں کے شہر و باغات میں آب رسانی کا انتظام کیا گیا ہے۔

(جلد اول صفحہ ۱۳۱)

کیا یہ تمام واقعات اس کا ثبوت بیّن نہیں ہیں کہ اورنگ زیب کے عہد میں صنعت و حرفت اور دوسرے فنون پورے عروج پر تھے۔ کہ اسوقت غالباً یورپ کو

ہندوستان سے وہی رشک تھا جو کہ صنعت و حرفت کے مقابلہ میں آج ہندوستان کو یورپ سے ہے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں دولتِ برطانیہ کی صنعت و حرفت کی بڑی نمائش جو لندن میں ہوئی اسکی ایک عمارت میں ہندوستانی صنعت و حرفت کے نمونے بھی دکھلائے گئے مجھ سے جب کسی انگریز نے اُن نمونوں کی تعریف کی تو میں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اس نمائش کے ہندوستانی سیکشن میں وہ کونسی چیز ہے جس کو ہمارا ہند سو برس قبل نہیں بنا سکتا تھا۔ ہم کو یہ دکھلاؤ کہ صنعت و حرفت کے میدان میں ہندوستانی دماغوں نے گذشتہ صدی میں پہلے سے زیادہ کیا ترقی کی ہے۔ ......

...... لکھنؤ کی چکن۔ فرخ آباد کے پردے، دہلی و آگرہ کا سنگِ مرمر کا کام، مُرادآباد کے برتن، کشمیر کی شالیں، یہ سب چیزیں جو اسوقت ہم نمائش میں دیکھ رہے ہیں وہ کچھ ان سے بہتر نہیں ہیں جو ہم سابقہ صدیوں میں بنا سکتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے کشمیر میں اُن سے بھی بہتر پرانی شالوں کے نمونے دیکھے ہیں جن کے فوٹو آج ولایت کے اخبارات میں نمائش کی شہرت دینے کی غرض سے پیش کئے جا رہے ہیں۔

دیگر ممالک مثل کینڈا اور آسٹریلیا وغیرہ کا جو سیکشن دولتِ برطانیہ کی اس نمائش میں ہے اُسمیں اور ہندوستان کے سیکشن میں بڑا فرق یہ ہے کہ ان نوآبادیوں کی اگزبیشن میں کوئی چیز ایسی نہیں نظر آتی جس کو وہ ایسی خوبی اور مقدار میں اب سے پچاس برس قبل بنا سکتے تھے۔ برخلاف اس کے ہندوستان کے سیکشن میں کوئی ایسی اگزبیٹ نہیں معلوم ہوتی جس کو ہندوستانی دماغ نے حال میں سیکھا ہو اور وہ

سو برس قبل نہ بنا سکتا ہو۔ اصلیت یہ ہے کہ ہم تو بہت سی صنعتیں بھول گئے یا ہم اُن کے بھول جانے پر مجبور کئے گئے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں جو ململ ڈھاکہ میں بنتی تھی آج وہ کہاں ہے؟

وہ فولاد کہاں ہے جو ہندوستان کے نام سے لندن کے بازار میں بکا کرتا تھا وہ چھینٹ کہاں ہے جس کا ذکر کپتان ہملٹن نے کیا ہے۔ وہ زربفت کہاں ہے جس کا خلعت کمپنی کو گورنر سورت نے اورنگ زیب کا فرمانِ شاہی پڑھتے وقت حسبِ رواج ملک عطا کیا تھا اور جس کا ذکر دوسرے موقع پر کرونگا۔

ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ موجودہ گورنمنٹ سے ہم کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا کسی قوم سے جو فوائد پہنچتے ہیں اُن کو نظر انداز کرنا بڑا اخلاقی جرم ہے لہذا ہم آخری باب میں اُن فوائد کا اعتراف کریں گے جو موجودہ گورنمنٹ سے ہم کو پہونچے ہیں لیکن اس موقع پر ہم کو عہد اورنگ زیب کی صنعت و حرفت کا بتلانا منظور ہے اور اس سلسلہ میں مقابلہ کرنا ضروری تھا۔

بعض لوگ شاید یہ خیال کریں کہ ہندوستان میں آج ریلیں چل رہی ہیں موٹریں دوڑ رہی ہیں۔ جا بجا ہوائی جہاز بھی اُڑتے نظر آرہے ہیں۔ یہ سب عہد اورنگ زیب میں کہاں تھا۔ کاش یہ چیزیں ہمارے دماغ کی ترقی کا ثبوت ہوتیں ہم تو ایسی ذری سی چیزوں کے آج محتاج ہیں جیسے دیا سلائی، بوٹ کا پالش ہماری اصلی حالت اب یہ ہے کہ مختلف اقسام کے فنون و صنعت و حرفت سیکھنے کے لئے دوسری قوموں کا منہ تک رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ فرانس جاؤ۔ کوئی کہتا ہے کہ جرمنی جاؤ۔ وہاں کے لوگ سکھانے میں دریغ نہیں کرتے۔ کوئی کہتا ہے کہ

شاید جاپان کو ایشیائی ہمدردی ہو، کوئی کہتا ہے کہ یہ روزی کا معاملہ ہے۔ صنعت و حرفت تم کو کوئی نہیں سکھائیگا تم خود اپنا بھولا ہوا سبق یاد کرو اور چرخہ کی الف۔ بے سے پھر شروع کرو۔ انگلستان کے ہم مشکور ہیں کہ چند زبانوں کے سکھانے کے واسطے اسنے اپنی بڑی بڑی یونیورسٹیز کے دروازے ہی ہمارے بچوں کی ایک محدود تعداد کے لئے کھولدئے ہیں مگر ساتھہ ہی ساتھہ ہم یہ کہنے کے لئے مجبور ہیں کہ ہمارے ملک کے طالب علموں کو اسکی تمام شکایت ہے کہ انگلستان انکو اس صنعت و حرفت کے سکھانے میں پس و پیش کر رہا ہے جس سے ملک کی وہ دولت و تمول عود کرے جو عہد اورنگ زیب میں پائی جاتی تھی جب کہ صرف ایک ہندوستانی تاجر کا سرمایۂ تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی کے کل سرمایۂ تجارت کے برابر تھا جیسا کہ کپتان ہملٹن صاحب کے سفرنامہ سے معلوم ہوتا ہے اور جس کا ذکر باب چہارم میں کیا جا چکا ہے۔

---

## باب ہفتم

# مہمان نوازی

کپتان ہملٹن کا سفرنامہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں مہمان نوازی کا ایشیائی شعار بہت کچھ موجود تھا۔ جہاں جہاں اُنہوں نے سفر کیا ہندوستانیوں کی مہمان نوازی نے انکے دل پر ایک خاص اثر پیدا کیا۔ مثلاً صوبہ بنگال میں کسی رئیس کی سرحد سے جب اُنکی پالکی گذری اُسوقت وہ رئیس تو شکار کو گئے ہوئے تھے مگر مقام شکار ہی سے دعوت کا رقعہ بھیجدیا۔ چنانچہ کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"جب میں وہاں پہنچا وہ رئیس صاحب شکار کو گئے ہوئے تھے۔ مجھکو سلام کہلا بھیجا" "اور یہ پیغام بھیجا کہ وہ مجھسے ملاقات کے متمنی ہیں۔ میں نے یہ بہانہ کردیا کہ مجھے" "نقرس کی شکایت ہے۔ میرے اس عذر کو انہوں نے بلا تامل قبول کرلیا۔ اور" "میرے کھانے کے واسطے چڑیوں کا مرغن سالن بھیجا۔ اور دوسرے روز شہر کے" "اکثر معززین مجھ سے ملنے آئے اور یہ خواہش کی کہ جب تک وہاں کے رئیس شکار سے" "واپس آئیں میں وہاں قیام کروں۔ لیکن مجھے ضروری کام تھا اسلئے مناسب الفاظ" "میں انکا شکریہ ادا کرکے میں وہاں سے رخصت ہوا"

(جلد اول صفحہ ۳۸۷)

مغربی تمدن کے لحاظ سے بغیر اس کے کہ کوئی شناسا تعریف یعنے انٹروڈکشن کرے

بات کرنا تک معیوب ہے۔ تواضع و مدارات تو در کنار۔ ایک دوسرے مقام پر کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ جب وہ کنانور کی سرحد میں داخل ہوئے تو صرف بہ خیال مہان نوازی وہاں کے رئیس کی بیوی نے جو شاہزادی تھی اپنے ہاتھ سے پان اور شربت دیا۔

(جلد اول صفحہ ۲۹۵)

ایک دوسرے رئیس کو جب کپتان صاحب نے کچھ کپڑا، قالین، اور دو تفنگچے بطور سوغات بھیجے تو وہ اسقدر خوش ہوا کہ اسنے فوراً اپنی کلائی سے ایک زیور جو جواہرات سے مرصع تھا اُتار کر کپتان صاحب کو پہنا دیا اور یہ اجازت دی کہ اُنکی ریاست کے حدود میں کپتان صاحب ہر جگہ بے تکلف سفر کر سکتے ہیں

(جلد اول صفحہ ۳۰۲ و ۳۰۳)

انصاف و امن و امان کے باب میں ہم یہ لکھہ چکے ہیں کہ جب کپتان صاحب ایک قافلہ کے ساتھہ سورت کے قریب پہنچے تو کسطرح لوگوں نے انکی خاطر تواضع کی اور جب وہ گورنر سورت سے ملنے گئے تو کس کشادہ پیشانی سے اُسنے انکا استقبال کیا اور انکی دعوت کے لئے ایک گائے، پانچ بھیڑیں، پانچ بکریاں، بیس مرغیاں، پچاس کبوتر اور بہت سی مٹھائی اور پھل بھیجے۔

(جلد اول صفحہ ۱۱۰ و ۱۲۰ و ۱۹۰)

کپتان صاحب پھر لکھتے ہیں کہ اہل ہند انگریزوں کی فیکٹری کے افسروں کی بہت عزت کرتے ہیں اور بسا اوقات جب کبھی یہ انگریز شکار کھیلنے جاتے ہیں تو وہاں کے معزز ہندوستانی اپنے ملازمین و اسلحہ اور باجے گاجے کے ساتھہ انکے ہمراہ جاتے ہیں

(جلد اول صفحہ ۲۶۳)

یہ مہمان نوازی ایشیائی خلقت میں داخل ہے اور غالباً قدیم زمانہ میں خطۂ عرب دوسرے تمام ایشیائی ممالک سے بھی سبقت لیگیا تھا۔

## أَكْرِمُوا ضَيْفَكُمْ وَلَوْ كَانَ كَافِرًا أَوْ أَجْنَبِيًّا

(اپنے مہمان کا اکرام کرو چاہے وہ کافر ہو یا اجنبی کوئی ہو)

عربوں کا دستور العمل رہا ہے۔ مجھے ایک واقعہ ساحل عرب کا بہت پر لطف معلوم ہوا جسکا ذکر کپتان صاحب نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ ساحل عرب کے کسی مقام پر جہاز میں پانی آنے لگا۔ مجبوراً کپتان صاحب کو لنگر ڈالنا پڑا دیکھا کہ ریگستان میں کچھ جنگلی عرب خیمے ڈالے پڑے ہوئے ہیں گویا وہ اس جہاز کے منتظر تھے۔ یہ عرب مدد کیواسطے فوراً پہونچگئے انہوں نے پہلے یہ طے کرنا چاہا کہ انکو کیا اُجرت ملیگی۔ کام یہ تھا کہ جہاز سے کل مال نکالکر ساحل پر جمع کردیں تاکہ جہاز ہلکا ہوجائے اور جہاز کی مرمت کے بعد اسباب پھر لاد دیں۔ اور اس اثناء میں مال کی پوری حفاظت بھی کریں۔ کپتان صاحب اول تو ڈرے کہ یہ لوگ جہاز کا مال کہیں لوٹ نہ لیں مگر صاحب بہادر لنگر ڈالنے پر مجبور تھے ورنہ جہاز ہی ڈوبا جارہا تھا۔ بالآخر تصفیہ یہ ہوا کہ کل مال دو حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصہ اجرت میں دیا جائے جب یہ طے ہوگیا تو عربوں نے کہا کہ مزدوری کی حد تک تو معاملہ ختم ہوگیا مگر اب آئندہ سے تم لوگ ہمارے مہمان ہو۔ کپتان صاحب کو ان جنگلی عربوں کی مہمان نوازی پر تعجب معلوم ہوتا تھا۔ یہ ایشیائی مہمان نوازی کی روایات ہیں۔ کپتان صاحب کو اسپر بھی حیرت ہوئی کہ وہ اس ریگستان میں پہلے سے خیمے ڈالے کیوں پڑے تھے۔ اُن سے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ

ان عربوں کے پہنچنے سے پیشتر سے اسکی اطلاع دیدی تھی کہ فلاں مقام پر ایک جہاز کے مسافر مصیبت میں گرفتار ہونگے تم انکی مدد کرنا اور بد معاملگی نہ کرنا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کے انگریزوں کا اعتقاد جادو پر تھا۔ کپتان صاحب نے اپنے سفر نامہ میں ان عربوں کی پیش بندی جادو پر محمول کی ہے خاص ہندوستان کے متعلق جو حالات کپتان ہملٹن صاحب نے عہد اورنگ زیب کے لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسوقت اہل ہند بھی مہمان نوازی و مسافر نوازی میں اپنے کسی پڑوسی ایشیائی ملک سے پیچھے نہ تھے یورپ کا موجودہ تمدن جہاں کچھ اچھی باتیں ہم کو سکھا رہا ہے وہاں اُسکے ساتھ ساتھ ہمارے قدیم تمدن کی بعض اچھی باتیں ہم کو بھلا بھی رہا ہے منجملہ ان چیزوں کے جو اہل ہند بھولتے جا رہے ہیں مہمان نوازی کی عادات ہیں ہم یہ نہیں کہتے کہ یورپ میں مہمان نوازی نہیں ہے لیکن ایشیا و یورپ کی مہمان نوازی میں فرق ہے۔ یورپ میں کنبے اور خاندان کی نسبت تصور۔ افراد خاندان کے باہمی فرائض اور ذمہ داریوں کا تخیل۔ ذاتی آسائش و عیش و عشرت کو حتی الامکان ترجیح دینا۔ روزانہ کی ضروریات۔ طرز معاشرت۔ مکان میں کمروں کی تقسیم۔ ہوٹلوں میں رہنے کی عادت۔ زمین کی قلت۔ آبادی کی کثرت۔ مادی ترقی میں بے حد انہماک۔ روحانیت کی جانب بے توجہی۔ یہ تمام وہ چیزیں ہیں جنکے اعتبار سے ایشیا و یورپ کے طرز معاشرت و تمدن میں زمین آسمان کا فرق ہے گویا ایشیا اور یورپ ایک دوسرے سے بالکل ہی علیحدہ دو عالم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایشیا و یورپ کی مہمان نوازی میں جو فرق تھا اور ہے وہ اسی قسم کی مغائرت و فرق کیوجہ سے تھا جنکی طرف

میں نے اشارہ کیا اگر جوں جوں ان باتوں میں فرق کم ہوتا جائیگا اُتنی مناسبت ہے
دونوں ملکوں کی عادتوں میں مشابہت ہوتی جائیگی اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے
کہ اہل یورپ میں انسانی ہمدردی کم ہے یا اُن میں نیکی کرنے کا مادہ کم ہے خلق اللہ
کو آرام پہنچانے اور انکی تکالیف کو کم کرنے کے لئے یورپ میں جو انسٹی ٹیوشنس
شفاخانوں اور دیگر امدادی جماعتوں کی صورت میں آج بکثرت موجود ہیں وہ
اسکی دلیل ہیں کہ دنیا میں اسوقت اہل یورپ ہی نوع انسان کو مدد دینے میں
بڑا حصہ لے رہے ہیں اہل یورپ کی تحقیر کرنا ہم ایک اخلاقی جرم سمجھتے ہیں پھر بھی
مہمان نوازی کے متعلق ہمارے اور اہل یورپ کے تمدن میں ہمیشہ فرق رہا ہے
مثلاً لندن کی حالت یہ ہے کہ اگر کسی کے مکان میں ایک کمرہ بھی خالی ہو گیا تو اسکو
دوبھر ہو جاتا ہے فوراً "پے انگ گسٹ" یعنے خرچہ ادا کرنیوالے مہمان کی گنجائش
کے عنوان سے روزانہ اخبار میں اشتہار دیدیا جاتا ہے۔ وہاں ہزاروں آدمی اس
قسم کے مہمانوں کی امداد پر زندگی بسر کر رہے ہیں ایسی صورت میں اگر باپ کے ہاں
اُسکا کماؤ لڑکا بھی اچانک آجائے تو گھر میں جگہ ملنا دشوار ہو جاتا ہے اور اسکو
کسی دوسرے شخص کا "پے انگ گیسٹ" (خرچہ ادا کرنے والا مہمان) بنایا جاتا ہے اس سے
یہ قیاس نہ کرنا چاہیئے کہ وہاں باپ بیٹے میں محبت نہیں ہوتی۔ محبت بہت ہوتی ہے
مگر انکا تمدن، انکی روزانہ ضرورتیں اور انکی زندگی کی کشمکش اس طرز معاشرت
کے لئے انکو مجبور کرتی ہے۔ ایشیا کا تمدن ہمیشہ اسکے خلاف رہا ہے یہاں مہمان نوازی
کو ایک قسم کے مذہبی فرض کی وقعت دیدی گئی ہے۔ ہماری سوسائٹی میں دو ایک
قصے مشہور ہیں جنکو لوگ کبھی کبھی بڑے تمسخر سے بیان کرتے ہیں ایک ہندوستانی

جج ہائیکورٹ تھے جنکی پوری تعلیم ولایت میں ہوئی تھی اُنکے باپ نے اطلاع دی کہ وہ آرہے ہیں۔ جج صاحب نے فوراً تار دیا کہ مکان میں گنجائش نہیں ہے ذرا تامل کیجیئے۔ جب انتظام ہوجائے تشریف لائیے گا۔ یا ایک ہندوستانی بیرسٹر جب ولایت سے تازہ وارد ہوئے۔ باپ اسٹیشن پر لینے گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بیرسٹر صاحب ہوٹل کے قیام میں زیادہ سہولت سمجھکر اسٹیشن سے سیدھے ہوٹل تشریف لے گئے اور اسباب وغیرہ وہاں رکھکر پھر ماں سے ملنے گھر گئے۔ ممکن ہے کہ ان واقعات میں کچھ مبالغہ ہو اور لوگوں نے حاشیہ چڑھایا ہو مگر ان دونوں مثالوں سے میرا مقصود صرف یہ دکھانا تھا کہ تمدن بدلنے سے کسی ملک کے باشندوں کی جبلی عادات و اخلاق میں عظیم الشان فرق ہوجانا ممکن ہے کیا خوب ہوتا اگر ہم اپنے قدیم تمدن کی اچھی باتیں ہاتھ سے نہ جانے دیتے قوموں کی عادتیں سنوارنے میں بہت دیر لگتی ہے بگڑنے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہی قانونِ قدرت ہے۔

## باب ہشتم

# یورپین تجار سے اورنگ زیب کا برتاؤ

کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا؟ اس سوال کا جواب مسٹر جے آر ایرے صاحب نے اثبات میں دیا ہے۔ اپنی رائے کی تائید میں جہاں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے تواعد فعل پر انہوں نے استدلال کیا ہے اسکی نسبت ہم چند واقعات بیان کرنا چاہتے ہیں انسانوں کے صدق و کذب پر فتویٰ دینے کے لئے ان کی نیت کا معلوم کرنا ایک اہم امر ہوا کرتا ہے اسی نیت کی بنیاد پر بعض وقت ایک ظاہرہ قاتل بے گناہ ٹھہرایا جاتا ہے اور ظاہرہ بیگناہ شخص قتل کا مجرم قرار پاتا ہے۔ لہذا اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو مراسلت ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے آقا ڈائرکٹرس میں ہوا کرتی تھی اس سے گماشتوں کی کیا نیت تھی کیا غرض اور کیا پالیسی مضمر تھی تو سارا عقدہ کھل جائیگا اور راز فاش ہو جائے گا سر دست تو جب کوئی ہندوستانی رومیش چندر دت کی وہ کتاب پڑھتا ہے جسمیں انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کی مراسلت سے استدلال کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اس ملک کی صنعت کو کس کس طریقے سے کاریگروں کو ایذا دے دیکر تباہ کیا گیا تھا تو اسکو حیرت ہوتی ہے لیکن اگر آج وہ تمام رازکی خط و کتابت جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں اور ان۔ کے

آقا ڈائرکٹروں کے درمیان ہوا کرتی تھی پیش کر دئیے جاتو قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اہل وطن دنگ ہو جائیں گے ہم کو اس راز کی کچھ جھلک کپتان ہملٹن کے سفرنامے سے بھی ملتی ہے یہ منجملہ انہیں واقعات کے ایک واقعہ ہے جس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کے صدق و کذب کا پتہ چلتا ہے اور اُس سے انکی نیت معلوم ہوتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ انکے اقوال و افعال کیا تھے اور نیت کیا تھی۔ جس کے بعد وہ تمام شہادت مشتبہ ہو جاتی ہے جو عہد مغلیہ کے نظم و نسق کے خلاف وہ گڑھا کرتے تھے۔ کپتان صاحب ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ انہوں نے اُس خط کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خود پڑھا ہے جو ولایت سے ڈائرکٹروں نے بطور ہدایت نامہ یا دستور العمل اپنے ملازمین و عہدہ داران ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھیجا تھا۔ اُس خط میں حکومتِ مغلیہ سے چھیڑ چھاڑ قائم کرنے کی ایک تدبیر بتلائی تھی وہ یہ تھی کہ تم ہندی تجار و متمول اشخاص سے روپیہ قرض لو اور جب رقم کثیر ہو جائے تو کوئی ایسی لڑائی جھگڑے کی بات پیش کر دو جسکی وجہ سے قرضہ کا مسئلہ تو پیچھے پڑ جائے اور وہ نزاع سامنے آجائے۔ اسطریقہ سے قرضہ بھی ہضم ہو جائے گا اور حکومت کے خلاف لڑائی کا بہانہ ہاتھ آجائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ایک جانب تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے لوگوں نے شاہی فوج کے غلہ و رسد سے بھرے ہوئے جہاز بمبئی کے قریب سمندر میں پکڑ لئے اور دوسری جانب اُسی کمپنی کے گورنر و ایجنٹ مسٹر چالڈ نے ایک لمبی چوڑی شکایتی درخواست حکومت مغلیہ کے گورنر مقیم سورت کے پاس بھیجی جسمیں (۳۵) شکایتیں درج تھیں اُس پوری درخواست کی نقل کپتان جبتک نے

اپنے سفرنامے میں کردی ہے۔ اگر میں بھی اسکی پوری نقل کرنے بیٹھوں تو کئی صفحے اس کی نذر ہو جائینگے اور ناظرین کا وقت ضائع ہو گا تاہم اسکا اندازہ کرنے کے لئے کہ باوجود تصنع اور بناوٹ کی سخت کوشش کے کس نوعیت کی بیجا شکایتیں کی گئیں اس درخواست کا مختصر خلاصہ پیش کرتا ہوں یہی وہ سنگین ترین شکایتیں تھیں جو عہد اورنگ زیب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کر سکی معلوم ہوتا ہے کہ کوشش کرنے پر بھی اس سے زیادہ مواد و شہادت دستیاب نہ ہو سکی۔ ان شکایتوں کی صداقت کا تصفیہ کرتے وقت ناظرین اسکو کبھی نہ بھولیں کہ یہ محض سازشی درخواست تھی اور اس سے اصل مقصود لڑائی کا بہانہ ڈھونڈھنا تھا جس کو دوسرے الفاظ میں کشتی میں خاک اڑانا کہنا چاہئے۔ اس درخواست کے فقرات ۱ و ۲ و ۳ میں ایک ہندوستانی سوداگر مولا عبد الغفار کی یہ شکایت ہے کہ اس نے کمپنی کی نسبت غلط افواہیں اڑائیں جس سے کمپنی کا نام بدنام ہو گیا اور اعتبار بھی بمقابلہ سابق کے جاتا رہا۔ یہ وہی عبد الغفار تاجر ہے جس کا ذکر میں باب (تجارت) میں کر چکا ہوں اور جس کے متعلق کپتان ہملٹن کی یہ رائے تھی کہ صرف اس ایک متنفس ہندوستانی کا سرمایہ تجارتی کمپنی کے تمام تجارتی سرمایہ کے برابر تھا غالباً یہ عبد الغفار تجارت میں کمپنی کا مقابلہ کر رہا تھا!

چوتھی دفعہ میں دو انگریز ایک مسٹر پٹیٹ ( Pitit ) اور دوسرے مسٹر باوچر ( Boucher ) کی شکایت عجیب و غریب الفاظ میں کیگئی ہے اس امر کے لکھنے کے بعد کہ وہ کمپنی کے روپیہ کا حساب کتاب نہیں سمجھاتے اور بابِ شاہی حکومت کی پناہ میں بمقام سورت محفوظ بیٹھے ہوئے ہیں جو مطالبہ کمپنی کی جانب سے

اِن انگریزوں کی بابتہ کیا گیا تھا اُسکا ترجمہ یہ ہے:-

"مسٹر ہیٹ تو مر گیا اور جہنم واصل ہوا لیکن مسٹر بابُوچر سورت میں بیٹھے ہوئے ہیں"
"میرا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اور اسکی بیوی بچے اور اُس کے تمام متعلقین انگریز معہ"
"اُنکے مال و اسباب کے میرے حوالہ کئے جائیں تاکہ وہ سورت سے فرار نہ ہوسکے"

(یہاں تو میں اسی اقتباس پر اکتفا کرتا ہوں لیکن میں دوسرے باب میں دکھلاؤنگا
کہ عہدہ دارانِ کمپنی لوگوں کی بیوی بچوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا کرتے تھے)

دفعات ۵ و ۶ و ۷ میں یہ شکایت تھی کہ حال میں بعض اشیاء پر خفیف
محصول بڑھا دیا گیا ہے وہ واپس دلایا جائے (اول تو ٹیکس ہی کیا ہوتا تھا
جب کپتان صاحبان ٹریہ پہنچے ہیں تو کل ٹیکس جو اُن سے وصول کیا گیا (۳)
شلنگ تھا جسمیں ملازمین اور کہاروں کی مزدوری بھی شامل تھی۔ (ملاحظہ ہو جلد
اول صفحہ ۳۳۸) میں پوچھتا ہوں کہ آج وہ کون دعویدار تمدن ہے جو یہ کہہ سکتا
ہے کہ کسی خود مختار سلطنت کو محصول میں ردوبدل کرنے کا اختیار نہیں ہے)

دفعہ (۸) قابلِ غور ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ بہ پابندی فرامینِ شاہی
اس ملک کا ہمیشہ سے یہ دستور تھا کہ جب کبھی کمپنی کا کچھ مال سرقہ جاتا تھا تو
اسکی تلافی خزانہ شاہی سے کر دی جاتی تھی مگر سورت کے گورنر نے اب یہ طریقہ
بند کر دیا ہے۔

(اِس کے متعلق میرا یہ سوال ہے کہ مجھے بتلایا جائے کہ دُنیا بھر میں آج وہ
کونسی حکومت ہے جو مال و اسباب کی حفاظت کی ذمہ داری اس حد تک
قبول کرتی ہے)

دفعہ (۹) میں کچھ ہندوستانی قرضداروں کی نادہندی کی شکایت ہے

دفعہ (۱۰) میں یہ شکایت ہے کہ شاہی دارالضرب میں روپیہ جلد جلد مسکوک نہیں ہوتا۔

دفعات (۱۱ و ۱۲) ونازیادہ قابل غور ہیں اور وہ یہ ہیں کہ کمپنی کی حسابی کتابوں پر ہمیشہ اعتبار کیا جاتا تھا اور آخر سال پر اسکے بہی کہاتے دیکھکر محصول لیا جاتا تھا لیکن اب یہ قاعدہ جاری ہوا ہے کہ جونہی مال سرزمین ہندوستان پر اتارا جاتا ہے محصول وصول کر لیا جاتا ہے (میں کہتا ہوں کہ اگر ایسا ہوتا تھا تو وہ کیا بیجا تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا اور تمام یورپ یہی کر رہا ہے۔)

دفعہ (۱۳) میں یہ شکایت ہے کہ گورنر نے سرکاری قلعہ کی دیوار سیدہی کرنے کے لئے کمپنی کی کچھ اراضی حاصل کر لی ہے جسکا معاوضہ ابھی تک نہیں ملا۔

دفعات ۱۴ و ۱۵ و ۱۶ میں محکمہ کروڑگیری یعنے محکمۂ وصول محصول کی جزوی شکایتیں ہیں۔

دفعہ ۱۷ میں یہ شکایت ہے کہ قرضداروں سے روپیہ وصول نہیں ہوتا اور انکی نسبت دادرسی نہیں ہوتی اور استدعا تھی کہ گورنر اسکی تلافی خزانۂ شاہی سے کر دے۔

(میں پوچھتا ہوں کہ اگر آج کوئی تاجر کسی حکومت سے ایسا مطالبہ کرے تو اسکو کیا جواب ملیگا)

دفعہ (۱۸) میں یہ شکایت ہے کہ اُن کے کارندوں کو گورنر کے روبرو حاضری کا موقع اسوقت تک نہیں ملتا جب تک کہ نوکروں کو بخشش نہیں دیجاتی۔

دفعہ (۱۹) بدیں مضمون ہے کہ تجارتی گھوڑے جو ایران اور بصرہ سے آتے ہیں انکی گردنوں پر مُہر کر دیجاتی ہے اور بغیر محصول ادا کئے ہوئے نہ وہ فروخت کئے جا سکتے ہیں نہ اپنی سواری کی اجازت ہوتی ہے دفعہ ۲۰ میں عہدہ داروں سے قیمت وصول نہ ہونیکی شکایت ہے۔

دفعات ۲۱ و ۲۲ میں محکمہ کروڑگیری کی تعویق و دیگر جزوی شکایتیں ہیں دفعہ ۲۳ میں لکھا ہے کہ جب کمپنی اپنے انگریز ملازمین کو ہندوستان کے دور و دراز شہروں میں بھیجتی ہے تو وہ شاہی گورنر کی حفاظت میں اسطرح آجاتے ہیں کہ پھر اُن سے مطالبہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے اور اس موقعہ پر بھی وہی مسٹر پیٹیٹ Mr. Pitet اور مسٹر باؤچر Mr. Boucheer کی مثال پیش کیگئی ہے جن کا ذکر دفعہ ۱۴ میں آچکا ہے۔

دفعہ ۲۴ میں ایک قطعہ اراضی کی بابتہ شکایت اور نیز جدید اراضی کے وصول کی درخواست ہے۔

دفعہ ۲۵ کا مضمون یہ ہے کہ حسب دستور سابق محصول وصول کرتے وقت اُن کا مال کھولکر نہ دیکھا جائے اور یہ کہ اُن کے اعتبار پر عمل ہو (مگر یہ ایک عجیب و غریب شکایت تھی۔ آج بھی یورپ کے ممالک میں اسباب کھولکر دیکھا جاتا ہے)

دفعہ ۲۶ میں بھی عہدہ داروں سے قیمت وصول نہ ہونیکی شکایت ہے

دفعہ ۲۷ میں مکرر اضافہ محصول کی شکایت ہے۔

دفعہ ۲۸ میں سہ بارہ اسی مسٹر باؤچر Mr. Boucheer کا قضیہ پیش کیا گیا ہے جس کا ذکر دفعات ۲۲ و ۲۳ میں کیا جا چکا ہے دفعہ (۲۹) میں سہ بارہ

پھر اضافہ محصول کی شکایت ہے۔

دفعہ (۳۰) میں کسی ناظم کی شکایت ہے۔

دفعہ (۳۱) میں لکھا ہے کہ اُن کا لوہے کا ایک لنگر دریا میں گم ہوگیا تھا وہ مرزا معظم کے لڑکے کو ملا ہے وہ واپس دلایا جائے اور اس کے ڈھونڈھنے میں جو خرچ ہوا ہے وہ لے لیا جائے (ذرا اس جزوی شکایت کی نوعیت پر غور کیا جائے)

دفعہ (۳۲) کی شکایت کا مفہوم یہ ہے کہ جب اُن کا جہاز ساحلِ ہندوستان پر پہنچتا ہے تو کروڑگیری پر اُن کے آدمیوں کی روک ٹوک بہت کیجاتی ہے۔ اس میں تعویق ہوتی ہے دفعہ ۳۳ بھی قابلِ غور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنگال میں کمپنی کے لوگوں نے کچھ شاہی جہاز پکڑ کر اُن میں آگ لگادی تھی اسکی بابتہ مسٹر چائلڈ بطور پیش از مرگ واویلا تحریر فرماتے ہیں کہ اُنکا کچھ بھی لگاؤ اس فعل سے نہیں ہے پھر اس کے متعلق مسٹر چائلڈ درخواست دہندہ سے بازپرس نہ کی جائے۔ (اس شکایت کو جو کوئی پڑھے گا ہم نہیں جانتے کہ بجز چور کی ڈاڑھی میں تنکا اور کیا کہیگا۔ اب کپتان ہملٹن کی تحریر سے معلوم ہوا کہ خود اُن حضرت کو بھی اس قسم کے افعال کرنے کی ہدایت ولایت سے ہوئی تھی) اور اس شکایتی درخواست کا دینا اور سرکاری غلہ کے جہازوں کو پکڑنا سب اسی ہدایت کے بموجب تھا۔

دفعہ (۳۴) میں دو ہندوستانی قاتلوں کی تحویل کا مطالبہ ہے۔ اور آخری دفعہ (۳۵) بدیں مضمون ہے کہ شام کو شہر کا دروازہ قبل از وقت بند کر دیا جاتا ہے اور جب وہ شہر کے باہر سے سیر کر کے واپس آتے ہیں تو بغیر بخشش و انعام دیئے اندر داخل ہونا دشوار ہوتا ہے۔

بس اب درخواست کا مضمون ختم ہو گیا قبل اس کے کہ ان شکایتوں کے متعلق کچھ لکھوں ذرا مسٹر چائلڈ صاحب گورنر ایسٹ انڈیا کمپنی کے کیرکٹر پر نظر ڈالئے جنہوں نے یہ شکایتی درخواست مرتب کرکے شاہ مغلیہ کے گورنر سورت کے پاس بھیجی تھی۔ کپتان ہملٹن اپنے سفر نامہ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ جب مسٹر چائلڈ ایک مرتبہ کپتان تھاربرن سے ناراض ہو گئے تو ان کی جائداد ضبط کرنے اور ان کو جیل خانہ بھیجنے کی غرض سے مسٹر چائلڈ نے جعلی دستاویزات بنائیں۔ (جلد اول صفحہ ۱۹۵)

مسٹر چائلڈ جب ایک مرتبہ مسٹر بوچر (Mr. Boucher) سے ناراض ہو گئے تو مسٹر بوچر کو زہر خورانی کے جو انتظامات مسٹر چائلڈ نے کئے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ (جلد اول صفحہ ۱۹۶ - ۱۹۷)

مسٹر چائلڈ ایک مرتبہ مسٹر پٹیٹ سے ناراض ہو گئے اور جب مسٹر پٹیٹ سمندر کے قزاقوں کے ہاتھ پکڑ لئے گئے تو مسٹر چائلڈ نے قزاقوں سے کہلا بھیجا کہ مسٹر پٹیٹ بڑا مالدار ہے اس سے خوب وصول کرنا۔ (جلد اول صفحہ ۱۹۸)

یہ تو مسٹر چائلڈ کا کیرکٹر تھا۔ یہ واقعات زیادہ تفصیل سے باب نہم میں بیان کئے جائیں گے۔

جہاں تک شکایتی درخواست کا تعلق ہے۔ ناظرین خود سمجھ لیں گے کہ ان شکایتوں کی کیا نوعیت و اصلیت تھی۔ اگر کسی غیر ملک کا تاجر آج بمبئی کے گورنر کے روبرو ایسی درخواست پیش کرکے ویسا ہی مطالبہ کرے جو اس درخواست میں کیا گیا ہے۔ تو اس کا حشر کیا ہوگا۔ علی الخصوص جبکہ یہ معلوم

ہوجائے کہ وہ درخواست خوامخواہ لڑائی کی چھیڑ چھاڑ کی غرض سے پیش ہوئی ہے۔
اب دیکھنا یہ ہے کہ عہد اورنگ زیب میں اسکا نتیجہ کیا ہوا جب یہ درخواست
گورنر سورت کے پاس پہنچی تو شیدی یعقوب کمانڈر افواج شاہی نے ایسٹ انڈیا
کمپنی کے گورنر کو اولاً مہذبانہ طریقہ سے ایک خط لکھا جس میں کمپنی کے طرز عمل
پر اعتراض کیا لیکن جب کمپنی کی جانب سے متمردانہ جواب آئے تو صوبہ دار نے
بالآخر یہ تحریر کردیا کہ اگر گرفتار شدہ شاہی جہاز ۱۱ر فروری تک نہ چھوڑ دیے
جائینگے تو ۱۴ر فروری کو فلاں وقت شاہی فوج بمبئی میں داخل ہوکر ہر چیز پر
قبضہ کرلیگی۔ مجھ کو اس ہندوستانی فوجی افسر کی یہ سپاہیانہ ادا بہت پسند
آئی کہ اُس نے دشمن کو پہلے سے اپنی آمد کے وقت تک کی بھی اطلاع دیدی کہ
اگر متنبہ ہوکر سنبھل جائے تو بہتر ورنہ مقابلہ کے لئے تیار رہے یہ نہ کہا جائے کہ
کہ ہماری غفلت سے فائدہ اٹھایا گرمسٹر چائلڈ پر تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں
کی حمایت کا نشہ سوار تھا۔ اُس زمانہ میں یہ لوگ بغیر فوجی مدد کے سمندر میں سفر
نہیں کرسکتے تھے ولایت کے راستے بحری قزاقوں کی دست برد سے محفوظ
نہ تھے علاوہ ازیں وہ یہ عہد نہ تھا کہ کسی قوم کے ہتھیار لیکر اسکو نامرد بنایا جائے
ہر شخص مسلح رہا کرتا تھا۔ لہٰذا کمپنی کے پاس بھی فوج تھی، توپیں تھیں، خزانہ تھا
اور غالباً اسی غرے پر انکو جنگ چھیڑنے کی جرأت ہوئی تھی۔ کپتان ہملٹن لکھتے
ہیں کہ جو کچھ شیدی یعقوب شاہی فوج کے کمانڈر نے پیشتر لکھا تھا بالکل اسی
کے مطابق اس نے عمل کیا اور جو وقت اُس نے مقرر کیا تھا ٹھیک اُسی وقت معہ
فوج کے پہنچا۔ (جلد اول صفحہ ۲۱۰) آخر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور جب

معرکہ میں شیدی کی فوج تلواریں ہاتھ میں لیکر یلغار کرتی ہوئی انگریزی فوج پر جا پڑی۔

"تو کمپنی کا کپتان میدان سے بھاگ نکلا اور بھاگنے والوں میں یہی سب سے آگے تھا۔ پرتگیزوں کے گرجے میں پہونچکر جب ذرا اس کے حواس درست ہوئے تو اُس نے پیچھے پھر کر اپنے آدمیوں کو دیکھا کہ اُنکا کیا حشر ہوا۔"

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۲۲۰)

کپتان صاحب پر یہ سب سرگزشت بیتی تھی وہ خود اسی بھنور میں گرفتار تھے اور ہر معاملہ کو بچشم خود دیکھ رہے تھے۔ از بسکہ انکی حیثیت کمپنی کے ملازم کی نہ تھی وہ ایک آزاد خود مختار تاجر تھے مگر مثل دوسرے انگریزوں کے وہ بھی کمپنی کی حفاظت میں رہتے تھے وہ کمپنی کی اس رذیل حرکت پر بہت مشتعل ہوئے اور اپنے سفر نامہ میں انہوں نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اگر راوی کا بیان راوی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا تو بہتر تھا۔ مگر وہ انگریزی میں ہے اس لئے ابتداء سے جو واقعات انہوں نے بیان کئے ہیں اُن کا ترجمہ کرتا ہوں وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"کمپنی کے پاس یوں تو بہت سے بڑے بڑے جہاز تھے جن کو ملک سے باہر بھیجنے کے لئے وہ مجبور تھی لیکن اُن کو کام میں لانے کے لئے چونکہ کمپنی کے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا اس لئے اس نے اپنے جنرل کو اور نیز اپنے ان کارخانوں کے عہدہ داروں کو جو ہندوستان میں تھے حکم دیدیا تھا کہ وہ اپنے جہازات و ظن نے تہا سکے لئے ہندوستانی تاجروں سے جسقدر رقم قرض حاصل کر سکتے ہوں کمپنی"

"کی ذمہ داری پڑے ہیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور جو جہاز وہ اپنے
وطن کو نہ لے جا سکے انکو کرایہ پر ہندوستان میں چلایا میں نے کمپنی کے گورنر کا"
"ایک خط انگلستان میں دیکھا جسمیں یہ لکھا تھا کہ جب وہ مغل شہنشاہ کی رعایا سے"
"جسقدر روپیہ حاصل کر سکتے ہوں لے لیں تو قرضخواہوں سے جھگڑا اسکے یکلخت انکے"
"ساتھ لین دین موقوف کر دیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ کیونکہ ۱۶۸۸ء و ۱۶۹۰ء"
"میں سورت کے ہندوستانی تاجروں نے سمندر کے راستے سے مغرب میں بہت بڑی"
"تجارت مخا۔ ایران اور بصرہ سے قائم کر لی تھی اور مشرق میں بنگال وچین اور"
"سیام سے بیوپار کرتے تھے وہ جنرل سب لوگوں کو انکی استدعا پر پروانہ راہداری"
"دیا کرتا تھا پھر اس کے بعد ۱۶۹۸ء کے آخر میں ایک شکایت صوبہ دار سورت"
"کے روبرو پیش کی اور انصاف و اطمینان کا طالب ہوا۔ اس شکایت کی ایک"
"مطبوعہ کاپی میں نے خود دیکھی ہے۔ وہ حسب ذیل (۳۵) فقرات پر مشتمل تھی"

(جلد اول صفحہ ۱۹۹)

سفر نامے میں اس جگہ پوری درخواست نقل کر دی گئی ہے جسکا خلاصہ بیان کیا جا چکا ہے۔ انگریزی کیرکٹر کا ایک رخ ہمیشہ ایسا رہا ہے جسکی تعریف و مدح کرنا ہر منصف مزاج کا فرض ہے۔ جب کبھی وہ ڈپلومیسی و سیاسی اغراض سے بلند پروازی کر جاتا ہے تب انکی آزادانہ رائے میں ایک ایسی دلکش و دلفریب خوبی پیدا ہو جاتی ہے جس سے دوسری قوم والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ اس موقع پر کپتان ہملٹن نے بھی اسی انگریزی کیرکٹر کا ثبوت دیا ہے۔ آخر تمام بنی نوع انسان ایک ہی آفتاب کی شعاعیں ہیں اور نیکی و

وبدی کی حرکات سے ہر انسان کا دل یکساں متاثر ہوا کرتا ہے۔ ان شکایتوں کی نسبت کپتان ہملٹن نے جو رائے قائم کی تھی وہ انسان کی اعلیٰ خلقی صداقت پسندی کا نمونہ ہے۔ درخواست کی نقل کرنے کے بعد کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ

"یہی وہ شکائتیں ہیں جن کی بنیاد پر جنرل چائلڈ نے سلطنت مغلیہ کے ساتھ ایک جنگ کی عمارت قائم کی اور اپنی شکایات بادشاہ تک پہنچانے اور منشائے شاہی معلوم کرنے کے بغیر اعلان جنگ کر دیا۔ جہاں کہیں بادشاہی رعایا کے جہاز ملے انکو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ جہاز خود انہیں کے عطا کردہ پروانہ جات راہداری پاس رکھتے تھے شکایت مذکورہ کا فقرہ (۴) ایسا ہے کہ گو وہ ایک عیسائی کے قلم سے نکلا ہے لیکن ہر مسلمان اور بت پرست بھی اُسکو نفرت کی نظر سے دیکھے گا۔ فقرات نمبر ۱۷ و ۲۳ و ۲۸ خلاف انصاف ہیں اور فقرات نمبر (۳۰ و ۳۱) اُس شکایت اور جنگ کے لئے بہت ہی کمزور وجوہ ہیں جسکی وجہ سے مسٹر چائلڈ کے آقا اور مالکوں کے زائد از چار لاکھ پونڈ اختتام جنگ سے قبل ہی خرچ ہو گئے علاوہ ازیں بادشاہ اور اسکی رعایا کے نزدیک ان لوگوں کا اعتبار اسقدر اُٹھ گیا جاتا رہا جو آجتک پوری طرح جیسا کہ چاہیے قائم نہیں ہوا ہے۔ وہ کون قاعدہ اور پالیسی تھی جسکے بموجب یہ توقع کیجا سکتی تھی کہ باوجود اس کے کہ بادشاہ مغلیہ کے ایک حصہ حکومت میں تو مسٹر چائلڈ یا سر جوزیا (Sir Josiah Child) بادشاہی رعایا کو قتل وغارت کریں اور بادشاہ موصوف اپنے دوسرے حصہ حکومت میں کمپنی کو امن وامان کیساتھ تجارت کرنے کی اجازت دیں۔ نہیں معلوم یہ لوگ کسطرح اسکی امید کر سکتے تھے کہ ایسے موقعہ پر بادشاہ غیر جانبداری کی صورت اختیار کریگا۔"

اس سوال کا جواب تو وہ مدبرین دیں گے جن کو پالٹیکس میں دخل ہے۔ میں تو صرف اصلی واقعات بیان کرتا چلا جارہا ہوں"

(جلد اول صفحہ ۲۱۳)

معلوم ہوتا ہے کہ سرجوزیا (Sir Josiah Child) وہی حضرت ہیں جو بنگال میں ایسے افعال کے مرتکب ہوچکے تھے کہ جنکی وجہ سے مسٹر چاپلیڈ کو بھی اپنی درخواست کی دفعہ ۲۳ میں پیش بندی کرنی پڑی۔ بہرحال جب خود ایک بےغرض اور بےلوث انگریز نے اس طرح اپنی رائے ظاہر کردی تو اس میں اور کچھہ اضافہ کرنا غیر ضروری ہے البتہ اس سے چند نتائج ضرور اخذ کئے جاسکتے ہیں اول یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھہ سلطنت مغلیہ کی طرف سے پہلے بہت رعایت کیجاتی تھی مگر کمپنی مذکور بجائے اس کے کہ وہ سلطنت موصوفہ کی شکور ہوتی اور خوش کرداری سے اپنے متعلق مزید مراعات شاہی کا مستحق بناتی اس نے کچھہ ایسے اعمال کئے کہ اس کے اعتبار میں فرق آگیا۔ دوسرے یہ کہ عہد اورنگ زیب میں محصول کے متعلق زیادہ جانچ پڑتال شروع ہوئی جو کمپنی کو برا معلوم ہوا عجب نہیں کہ اسکی ضرورت بھی خود کمپنی ہی کے اعمال کی وجہ سے سلطنت کو ہوئی ہو۔ تیسرے یہ کہ اس زمانہ کی گورنمنٹ کو غیر ممالک کے تجار کی جان و مال کی حفاظت کا اسقدر خیال تھا کہ اگر انکا کوئی مال سرقہ جاتا تو خزانہ شاہی سے اسکی تلافی کیجاتی تھی اور اس ذمہ داری کی وجہ سے غالبًا جانچ پڑتال میں جدوجہد کی کامل ضرورت ہوتی تھی اور یہ صحیح نہیں ہے کہ محض وصول محصول کے لئے ایسا کیا جاتا تھا۔ محصول وصول کرنے میں جو جانچ پڑتال

کی سختی کی جاتی تھی اس کی نسبت ایک امر کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ جن لوگوں نے یورپ کا سفر کیا ہوا انکی نگاہ سے وہ سماں گزرا ہوگا جب کہ ایک فرانسیسی کسی انگریز یا جرمن مسافر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال ڈالکر بعض وقت صرف اس خیال سے کہ محصولی مال چھپا رکھا ہوا ہو طرح طرح ٹٹولتا ہے کہ گویا وہ مسافر چور ہے۔ غالباً احتیاط بھی اسی کی مقتضی ہے کیونکہ مجھ سے خود ایک یوروپین نے کہا کہ ایک مرتبہ انکی لیڈی صاحبہ بہت سے سگرٹ اپنے انڈرویر یعنے اندر پہننے کے کپڑوں میں چھپا کر فرانس لے گئی تھیں گزشتہ سفر میں مجھ سے ایک صاحب نے کہا کہ پیرس میں ایک جنٹلمین صاحب اپنا اسباب گورنس کے سپرد کر کے چلدئے اور جب محصول لینے والا آیا اور دریافت کیا تو گورنس صاحبہ محصولی مال کے ہونے سے صاف انکار کر گئیں مگر جب ایک بکس بطور نمونے کے کھولا گیا تو اس میں سے محصولی مال برآمد ہوا پھر تو ہر بکس کھولا گیا جس سے سارا اسٹیشن ایک اچھا خاصہ مینا بازار بن گیا خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا جو موجودہ زمانہ کے حالات اور واقعات سے متعلق تھا۔ یہاں دراصل عہد اورنگ زیب کا ذکر ہے لیکن موجودہ واقعات کے تعلق سے ہم یہ پوچھتے ہیں کہ عہد موصوفہ میں محصولی اسباب کی جانچ پڑتال میں کد و کاوش یا شرح محصول کی رد و بدل میں حکومت نے کیا جرم کیا تھا وہ لوگ جن کو بادشاہ نے اپنے ملک میں تجارت کی اجازت دی تھی۔ زمینیں عطا کی تھیں۔ جو بادشاہ کے سایہ عاطفت میں باطمینان صرف بسر ہی نہیں کرتے تھے بلکہ تجارت کی بدولت وہ ہندوستان کی دولت سے بھی مستفید ہو رہے تھے

انہیں لوگوں نے ایسی ناشکری اور کمینہ پن کی حرکت کی جس سے خود اُن ہی کی قوم کا ایک فرد متنفر تھا اسوقت اورنگ زیب کی قوت مسلمہ تھی اُس کو انگریزی تجار کا خوف نہ تھا اس کے قلم کی ایک گردش ان کی تجارت کا خاتمہ کر سکتی تھی عہد اورنگ زیب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حالت ایک شیرخوار بچہ کی تھی چنانچہ وہی لوگ جنہوں نے یہ شکایتی درخواست اس زور و شور سے بھیجی تھی اور جنگ کی تھی اُن کو اپنی ناعاقبت اندیشی کے خمیازہ میں اورنگ زیب کے حضور میں حاضر ہونے اور معافی حاصل کرنیکی تدبیر کرنی پڑی۔ ایک وفد تیار کیا گیا جس میں کپتان ہملٹن بھی شریک تھے اور جس ذلت آمیز طریقے سے یہ وفد شاہجہاں آباد میں اورنگ زیب کے حضور میں پیش کیا گیا اس سے کپتان صاحب کو کسقدر تکلیف ہوئی کیونکہ وہ اُنکی قومی خودداری کے بہت ہی خلاف تھا۔ کپتان صاحب لکھتے ہیں:—

"دربار میں انکی رسائی تو ہو گئی لیکن اورنگ زیب کے حضور میں وہ اس ذلت کے ساتھ پیش کئے گئے جو کسی ملک کے سفیروں کے لئے زیبا نہ تھی۔ سامنے کے دونوں ہاتھ ایک پٹکے سے باندھ دئے گئے تھے الغرض اس حالت سے بادشاہ کے روبرو خمیدہ پشت زمیں بوس ہیئت میں پیش کئے گئے"

(جلد اول صفحہ ۲۲۴)

یہاں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کی کیفیت تھی اور اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ بالآخر اورنگ زیب نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا۔ اورنگ زیب کا اصلی کیرکٹر جانچنے کا یہ بہت نازک وقت تھا۔ یہی وہ مواقع ہوا کرتے ہیں جن پر

ایک بادشاہ کا اصلی کیرکٹر معلوم ہوتا ہے جب بمرور زمانہ سے انسانی جذبات کا بادل چھٹ جاتا ہے اور مورخ کے سامنے صرف سچائی اور اصلیت کا صاف مطلع باقی رہ جاتا ہے تب ایسے ہی وقت کے افعال پیش نظر ہوتے ہیں۔ آج سوا دو سو برس کے بعد ہم اس امر کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں کہ کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا؟

میری رائے میں اورنگ زیب نے جو طرز عمل ایسے موقع پر اختیار کیا اُسی سے اس امر کا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ کیا اس بادشاہ کا یہ مقصود تھا کہ اہل یورپ ہندوستان میں تجارت نہ کرنے پائیں؟

درخت کی ایک پتی کی حرکت سے نہیں بلکہ بعض وقت ایک تنکے کی حرکت سے سینکڑوں میل کی ہوا کا رُخ معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح بعض وقت انسان کے ایک فعل سے ہی اُسکے تمام کیرکٹر کا پتہ چل جایا کرتا ہے۔ اس موقع پر مغلوب غالب کے پاس جاتا ہے۔ عاجز قادر کے روبرو حاضر ہوتا ہے دیکھنا یہ ہے کہ غالب وقادر کیا کرتا ہے۔ کپتان ہملٹن لکھتے ہیں کہ جب یہ وفد اورنگ زیب کے روبرو پیش ہوا تو بادشاہ پہلے تو بہت غیظ و غضب میں پایا معلوم ہوتا تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ غصہ اُتر گیا تب بادشاہ نے دریافت کیا کہ تمہاری کیا درخواست ہے وفد نے پہلے قصور کی معافی مانگی اور بعدہٗ دوبارہ تجارت کرنے کی اجازت چاہی اوسوقت اورنگ زیب نے اپنے اصلی کیرکٹر کا اظہار کیا اور الطاف شاہی سے یہ دونوں درخواستیں منظور کر لیں۔ وفد کو حکم ہوا کہ وہ بمبئی واپس جا بعدہٗ فرمان مبارک

بھیجا جائیگا چنانچہ کچھ روز بعد فرمانِ شاہی اُن تمام لوازمات کے ساتھ
شرفِ صدور لایا جو ایسے موقعوں پر بطورِ اعزاز و اکرام مبذول فرمائے
جاتے ہیں۔ کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ سورت میں ایک بڑا دربار
منعقد کیا گیا۔ اس دربار میں وہ فرمان شاہی پڑھا گیا جس کا ترجمہ کپتان صاحب
نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے اور جس کا اب اردو ترجمہ میں پیش کرتا ہوں
لوازمات فرمانِ شاہی یہ تھے کہ فرمان کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ گھوڑا
و بیش قیمت اطلس یا زربفت کا خلعت بھی جس پر کارچوبی سنہری، روپہلی گل
بوٹے کاڑھے گئے تھے عطا ہوا۔ یہی فرمان وہ چارٹر (Charter)
و منشور خسروی تھا۔ جو اورنگ زیب کے پیشگاہ سے کمپنی کو عطا ہوا تھا اور
جس کی سند پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے پھر ہندوستان میں تجارت شروع
کی تھی۔

## ترجمۂ فرمانِ شاہی

## اورنگ زیب بنامِ ایسٹ انڈیا کمپنی

"تمہاری عرض داشت بدین مضمون بادولت و اقبال کے ملاحظہ میں آئی"
"کہ جس قدر فتنہ و فساد پیدا ہوا اسکے قصوروار تم ہو۔ تم نے صوبہ داران سابق"
"کے خلاف متعدد شکایتیں کی ہیں جن کا ذکر بادولت نے اپنے امرائے دربار سے"
"سنا۔ تم کو شکایت تھی کہ صوبہ داروں یا ماتحت عہدہ داروں نے تمہارے ساتھ"

بدسلوکی کی تم کو لازم تھا کہ شورش برپا کرنے سے قبل ان سب باتوں کی اطلاع تم
مجھ کو دیتے۔ لیکن اب چونکہ تم اپنی خطا کے معترف اور خواستگار معافی ہو لہذا
واقعات گزشتہ کو معاف کرکے صرف تمہاری درخواست ہی منظور نہیں کی جاتی
بلکہ تمہارے حسب منشا تم کو ایک فرمان بھی عطا کیا جاتا ہے اور اسد خاں
کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ بعد از تمام تفصیلات جنکی اطلاع وہ تم کو دیگا فرمان مذکور
صوبہ دار سورت کے پاس روانہ کردے جس وقت یہ فرمان نافذ ہو تم اس کو
تعظیم و احترام کیساتھ وصول کرو اور اسکی عزت و شرف کا اقبال و اعتراف کرو
جو فرمان مذکور صادر کرکے تم کو بخشا گیا ہے۔ جیسے تم پیشتر تجارت کیا کرتے تھے
اب بھی اسی طرح حسب معمول تجارت کرنیکی تم کو اجازت دی جاتی ہے۔ جن تاجروں
کی تم شکایت کر رہے ہو تم پر واجب ہے کہ ان کے جہازات معہ سامان ان کے
حوالہ کردو اور آئندہ سے اس قسم کی غلطی کبھی نہ کرنا جس کے تم اس مرتبہ مرتکب ہوئے
ہمیشہ مابدولت کی خوشنودی و رضاجوئی کے امیدوار رہو۔ اور اسکو کبھی نظرانداز
نہ کرو۔ اگر تم کو میرے صوبہ داروں عہدہ داروں یا میری رعایا سے کسی قسم کی
اذیت پہنچے تو اسکی اطلاع دینے میں کبھی فروگزاشت نہ کرو۔ مابدولت نے
اسد خاں کو حکم دیدیا ہے کہ وہ اسی کے مطابق تحریر کرے۔ بسمی باؤ جی کی
پناہ دہی کے متعلق تم نے شکایت کی ہے کہ سابقہ صوبہ داروں نے اسکو اپنی
پناہ میں لے لیا ہے اور نامبردہ پر تمہاری کئی رقوم واجب الادا ہیں اور اس لیے
تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے سپرد کردیا جائے۔ اس بارے میں حکم دیا جاتا ہے کہ تم اپنا دعوی
(عدالت میں) بر روئے قانون ثابت کرو اسوقت جو مقتضائے انصاف ہوگا عمل میں آئیگا

"۱۲ سنہ جلوس اورنگ زیب"

(جلداول صفحہ ۲۲۷)

یہ فرمان اورنگ زیب کے کیرکٹر کی کنجی ہے۔ اس فرمان سے اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا؟ ایسٹ انڈیا کمپنی کے رویہ کا مقابلہ اورنگ زیب کے الطاف و کرم سے کیجئے۔ وہ مورخ جسکو اصلی واقعات نہیں معلوم جو چاہے کہے یا لکھے مگر ۱۷۰۰ء میں اس انگریز کے دل پر جو اس وفد میں شریک تھا۔ اورنگ زیب کے رحم و کرم شاہانہ کا جو اثر ہوا وہ یوں ظاہر کرتا ہے:۔

"یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ انکی اس بدسلوکی سے جو اسکی رعایا کے ساتھ کی گئی تھی" "لاعلم نہ تھا۔ بایں ہمہ وہ جرائم اور خطاؤں کے پاداش میں کچھ سخت سزا نہیں" "دینا چاہتا تھا اس لیے اُسنے ایک رحمل بادشاہ کی طرح ان لوگوں کو ان کے قصور" "سے آگاہ کر دیا اور ان کو دانشمندانہ نصیحت کی کہ آئندہ ایسی غلطی کے پھر مرتکب" "ہوں۔ شاہانہ طریق سے انکو سمجھا دیا کہ وہ عنایات و عطوفات شاہی کو منظر" "شکر و سپاس دیکھیں اور پابندی قانون کو اپنا مسلک قرار دیں غرض کہ اس بادشاہ" "نے تمام اقوال و افعال میں پوری طرح سچی تحمل سے کام لیا"

(جلداول صفحہ ۲۲۹)

آج کلکتہ میں جس مقام پر فورٹ ولیم قلعہ بنا ہے وہ زمین کس نے اور کس کو دی تھی؟

• کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین اورنگ زیب

کی رعایا پر قتل و غارتگری کیا کرتے تھے۔ اور ڈاکے مارا کرتے تھے لیکن ایک موقعہ پر اورنگ زیب نے ان خونریزیوں کو معاف کرکے کمپنی کے ایجنٹ و نمائندہ مسٹر جوزف چناک کو یہ حکم دیا کہ وہ بنگال میں کوئی زمین اپنے قیام گاہ و مال و اسباب کی منڈی قائم کرنے کے لئے خود منتخب کرلیں تب اس ایجنٹ نے سنہ ۱۶۹۰ء میں وہ زمین دریائے ہگلی کے کنارے انتخاب کی جس پر آج قلعہ فورٹ ولیم نظر آرہا ہے۔

(جلد دوم صفحہ ۳)

اِن واقعات کے بعد یہ کہنا کہ اورنگ زیب تجارت کا حامی و مددگار نہ تھا سخت بے انصافی ہوگی۔ یہاں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی حرکات کا ذکر تھا مگر ہندوستان صرف انگریزوں کا بازی گاہ نہ تھا بلکہ دوسری یوروپین قومیں بھی یہاں شکار کھیل رہی تھیں اور اُن میں قابل ذکر ڈچ ہیں جنکا ذکر باب نہم میں کیا جائیگا۔ یہ جو چند واقعات یہاں لکھے گئے ہیں یہ از ہزار و مشتے از خروارے ہیں تاہم انہیں واقعات سے اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کردیا تھا؟ جو واقعات اس مضمون میں درج ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریزوں اور ڈچوں نے اورنگ زیب کی حکومت میں کس طرح کی دشواریاں پیدا کرنی چاہیں مگر اورنگ زیب نے اپنے الطاف شاہانہ سے انکی خطاؤں سے چشم پوشی کی اور تجارت میں ہمیشہ ان کو مدد دی جس کی وجہ سے اُن کو اور اُن کے ملک کو وہ تمول نصیب ہوا جس کا ذکر تجارت

تجارت کے باب میں کیا جا چکا ہے - آج اِن سب باتوں کو بھول جانا سخت ناشکری ہے -

باب ہشتم

# یوروپین تجار کی پالیسی و اخلاق

اِس باب میں ایک کامیاب ڈپلومسی اور بدترین اخلاقِ انسانی کے عجیب و غریب اجتماع کا ذکر کیا جائیگا اور یہ دکھلایا جائیگا کہ باوجودیکہ اِس ڈپلومسی کے عاملوں کی اخلاقی حالت کیسی کچھ متبذل اور دیانت سے دُور تھی مگر اُس نے کیونکر ایک ہندوستانی سلطنت کو مٹا کر اپنا منشاء پورا کر دکھایا یہ قدرت کا کرشمہ ہے جس سے ایسے عظیم الشان تغیرات ظہور پذیر ہو جایا کرتے ہیں۔ جیسے ایک سلطنت کا صفحۂ ہستی سے مٹنا اور دوسری کا قائم ہو جانا۔ چونکہ اِس ڈپلومسی کی ابتداء عہد اورنگ زیب میں ہوئی لہٰذا اس کتاب میں اسکا ذکر کرنا ضروری تھا۔ شاید یہ ہی غلطی اورنگ زیب کی دور اندیشی کے خلاف تھی کہ بادشاہ موصوف نے اپنی تمام قوت کل ہندوستان کو ایک متحدہ بڑی ایمپائر Empire یعنے عظیم الشان سلطنت کی صورت میں مبدل کر دینے میں صرف کر دی اور ان کیڑوں کو نہ دیکھا جو کہ نظر سے دُور رہ کر مِثل اُس بڑی سلطنت کی عمارت کی بنیاد کو کھود کھود کر کمزور کر رہے تھے

جس کو یہ بادشاہ اس شان و شوکت کے ساتھ بنانے کی کوشش کر رہا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ جب اورنگ زیب نے اس دارِ فانی سے رحلت کی بظاہر عظیم الشان عمارت تو بنکر تیار ہو گئی لیکن چونکہ بنیاد تو کمزور ہو گئی تھی ایک تند ہوا کے جھونکے نے اسکو گرا دیا جس تدبیر سے یہ بنیاد کمزور کی گئی وہ ایسی موثر ڈپلومیسی ہے جس کا نشانہ اس ملک میں کبھی خالی نہیں گیا ہندوستان کے اس حصۂ تاریخ سے جو سبق ملتا ہے وہ کسی قوم و ملت کو نہ بھولنا چاہیئے بلکہ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ جو انسان اپنے گزشتہ تجربہ سے آئندہ کے لئے سبق نہیں حاصل کرتا وہ اس دنیا میں ذلیل و خوار و ناکامیاب رہتا ہے اسی طرح سے جو قوم اپنی قومی سوانح عمری اور تاریخ سے سبق نہیں لیتی وہ ہمیشہ معرض خطر میں رہتی ہے بلکہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

جس ڈپلومیسی کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں اور جس سے سبق حاصل کرنا چاہئے وہ یہی تھی کہ دو قوتوں کو لڑا کر ایک قوت کا ہمدرد بننا اور اس سے سلطنت و حکومت میں کچھ حقوق حاصل کرنا پھر جب حاصل شدہ حقوق مستحکم ہو گئے تو اسی ڈپلومیسی سے آگے قدم بڑھانا اور نئے حقوق حاصل کرنا اسی طرح سے رفتہ رفتہ دونوں قوتوں کو مٹا کر خود بلا شرکت غیرے ملک کا بادشاہ بن جانا۔ انسانوں کے کسی طبقہ کے عیوب بیان کرنا کوئی خوش کن کام نہیں ہے لیکن فلسفۂ تاریخ سمجھنے کے لئے اور سبق حاصل کرنے کے لئے بعض وقت ایسے واقعات کا بیان کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

بادی النظر میں سب سے پہلے اس ڈپلومیسی کی ابتدا، ہندوستان میں جو ڈپنے

کی تھی۔ ہندوستان میں ڈچوں کی پالیسی کی بابت کپتان صاحب نے ۱۷۲۷ء میں جو خیال ظاہر کیا تھا وہ حسب ذیل ہے:۔

"اس ایماندار کمپنی نے ہمیشہ سے یہ قاعدہ مقرر کر لیا تھا کہ اول تو وہ ہندوستانی "رئیسوں اور حکمرانوں میں لڑائی کرا دیتی اور پھر بڑے اظہار دیانت داری کیساتھ "ان کے جھگڑے قضیے چکانے کے لئے خود ثالث اور پنچ بن جاتی اور ہمیشہ میزان عدالت "کا پلہ اس کے حق میں بھاری کر دیتی جس کے ملک کی پیداوار یا جس کے ہاں کا مال "کمپنی کے لئے سب سے زیادہ کارآمد ہوتا تھا۔ اور ہمیشہ اسی رئیس کو اسلحہ جنگ "سے مدد دیتی تھی جسکو مدد دینا کمپنی کے مفید ہوتا اور جنگ ختم ہونے پر وہ "غریب مفتوح کی گردن پر ان تمام مصارف کا بوجھ ڈالتے تھے جو فاتح کی مدد "دینے میں عائد ہوتے تھے۔ جب یہ سب کچھ ہو جاتا اور عہد نامہ پر دستخط کرنے کا "وقت آتا تو کمپنی جو کہ دوستی کا دعوے کرتی تھی اپنے دوست کا بہترین بندرگاہ "معاوضہ میں لے لیتی۔ اس پر قلعہ بندی کرتی اور پھر سوائے ڈچوں کے دوسروں "کو اس بندرگاہ پر تجارت کی اجازت نہ دیتی اور اگر اس کے خلاف کچھ ہوتا تو "کمپنی کی فوج بشرکت کسی دوسرے دشمن کے اس کے مقابلہ پر تیار کی جاتی"

(جلد اول صفحہ ۳۳۵)

کپتان ہملٹن کی رائے میں یہ طرز عمل ڈچوں کا اس ملک میں تھا لیکن میری رائے میں صرف ڈچوں کو اس غیر مستحسن پالیسی کا الزام نہیں دیا جا سکتا ممکن ہے کہ اسکی بنیاد ڈچوں ہی نے ڈالی ہو مگر رفتہ رفتہ تمام یوروپین قومیں اسی پالیسی پر عمل کرنے لگیں۔ من حیث الانسانیت

ان پر کوئی بڑا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ دوسروں پر سیادت و فوقیت حاصل کرنے کا خیال جیسا کہ دو سو برس پہلے تھا ویسا ہی اب بھی موجود ہے ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ اُن کے حصول کے طریقہ بدل گئے ہوں مگر خیالات و جذبات حرص و ہوا اور انسانی فطرت کا تقاضا آج بھی وہی ہے اسکو مذہب و قومیت سے بھی تعلق نہیں ہے مسلمان و عیسائی۔ انگریز و فرانسیسی سب اس انسانی کمزوری کے شکار بن چکے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اسٹیٹسمین یعنے مدبرین و اہل سیاست کا اخلاقی دستور العمل ہر زمانہ میں ممبر پر بیٹھکر وعظ کرنے والوں سے بالکل جداگانہ ہوا کرتا ہے۔

سنہ ۱۶۸۰ء کے قریب جو خط ولایت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدداروں کے پاس بدیں مضمون آیا تہا کہ ہندوستانیوں سے بڑی بڑی رقمیں قرض لیکر جہاز ولایت کو بہیج دو اور پھر حکومت اورنگ زیب کسی نہ کسی طرح سے جنگ کے وجوہ پیدا کرکے روپیہ ہضم کر لو اُس کا تذکرہ "باب ہشتم" میں کیا جا چکا ہے جس سے ثابت ہوا کہ خود ایسٹ انڈیا کمپنی کا وہ طرز عمل بھی اُسی پالیسی پر مبنی تھا جس کا اتہام کپتان صاحب نے ڈچوں پر امن وقت لگایا تھا۔

ایک مقام پر کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۷۱۴ء میں:—

"زومرن کے راجہ نے ڈچ کمپنی سے جنگ کی جس میں انگریزی فیکٹری کے افسر اعلےٰ نے جو راجہ زومرن کا مشیر خاص تہا۔ آتش جنگ بھڑکانے میں بہت کچھ حصہ لیا" "اُس وقت تو ڈچوں کا قلعہ" فتح کر لیا گیا۔ لیکن پہر انگریز مشیر نے اپنا ہی جہنڈا

اُس قلعہ پر نصب کرادیا اور بالآخر نتیجہ میں اس بازی میں فرانسیسی ہی کی ہار ہوئی"

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۳۱۴)

اسی طرح سے سیام میں جب انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو یہ معلوم ہوا کہ کمپنی پر قرضہ بہت ہوگیا ہے تو انہوں نے دفعتہً کارخانہ کو محض اس لئے آگ لگادی کہ شاہ سیام کی رعایا پر اس حرکت کا الزام لگا کر شاہ سے تاوان وصول کریں اور انکار کرنے پر جنگ چھیڑ دیں۔

(جلد اول صفحہ ۱۰۰)

اس قسم کے واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی میں اور ڈچوں کی پالیسی میں کچھ فرق نہ تھا اسی طرح سے عہد اورنگ زیب کے بعد ڈوپلے فرانسیسی گورنر اور کلایو انگریزی گورنر کی سرگرمی اور روز روز کی آزمائش کی فتح اور شکست ہندوستان میں بس اسی غرض و غایت سے تھی کہ اس دوڑ میں کون سبقت لیجاتا ہے اور بالآخر اس پالیسی میں ایسٹ انڈیا کمپنی گوئے سبقت لے گئی اور نتیجتاً انگریز اس ملک کے حکمران ہو گئے اس موقعہ پر مجھے خیال آتا ہے کہ تمدن ہند کے فرنچ مصنف نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ملک گیری انگلستان سے سیکھنا چاہیے اس نے ہندوستان کی مثال پیش کرکے لکھا ہے کہ انگریزوں نے یہ ملک ہندوستانیوں ہی کے خون اور روپیہ کی مدد سے فتح کرلیا اس ملک کے فتح کرنے میں جتنی بڑی بڑی لڑائیاں انگریز لڑے ان میں زیادہ تر ہندوستانی سپاہیوں کا خون بہا تھا اور

اخراجات جنگ اسی ملک کے روپیہ سے ادا کئے گئے تھے نہ انگریزوں کا ایسا خون بہا جو بیان کے قابل ہو اور نہ انکے ملک کا روپیہ صرف ہوا۔ اسمیں شک نہیں کہ اگر کسی ملک گیر کو ملک گیری کا مقصد اس طرح سے حاصل ہو سکتا تھا تو سیاسی حیثیت سے کوئی دوسرا طرز عمل اختیار کرنا اس کی بڑی حماقت ہوتی۔ ہندوستانیوں نے اگر اس کا مقابلہ عقل سے نہ کیا تو یہ ان ہی کا قصور تھا اور اب بھی اگر ہندوستانی اس سبق سے کر عقل سے کام لیں تو انکو کوئی منع نہیں کرتا۔

یہاں تک تو کامیاب ڈپلومیسی کی نوعیت بیان کی گئی اب ان حضرات کی اخلاقی حالت کو ملاحظہ فرمائیے جو اس ڈپلومیسی کی مدد سے ہندوستانی سلطنت کی بیخ کنی کر رہے تھے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ اس ملک سے ہندوستانی سلطنت اس وجہ سے نہیں گئی کہ اس کے دشمنوں میں کوئی خاص انصاف کا مادہ یا انسانی اخلاقی خوبیاں تھیں جنکے اثرات نے اس سلطنت کو معرض زوال میں ڈالدیا تھا۔ کپتان ہملٹن کا تمام سفرنامہ میرے اس خیال کا شاہد ہے۔ اس زمانہ میں جو پورچگیز ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آتے تھے ان کی بابت کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ جو شخص ان پر بھروسہ کرتا تھا اُس کو دہوکہ دینے میں وہ کبھی نہیں چوکتے تھے

(جلد دویم صفحہ ،،)

شاہ عالم نے ایک پرتگیز کو اپنی فوج کا جنرل مقرر کیا تھا وہ استقدر مغرور اور گستاخ ہو گیا تھا کہ ایک دن جب وہ ہاتھی پر سوار کسی دولہن کے مکان

اس کے والدین کو مبارکباد دینے کے لئے گیا۔ دولہن کو دیکھکر ایسا مفتون اور از خود رفتہ ہو گیا کہ وہ اُس ایک دن کی بیاہی عروس کو زبردستی پکڑ کر اپنے گھر لے گیا۔

(جلد دویم صفحہ ۳۸)

سمندر کے راستوں پر لوٹ مار کرنا اُن کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

(جلد اول صفحہ ۱۶۴)

انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے دو اصل سنٹر یعنے مرکز تھے صوبہ بنگال میں کلکتہ اور صوبہ سورت میں بمبئی۔ بنگال میں مسٹر جوزف چناک ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایجنٹ تھا اس کو شہنشاہ اورنگ زیب نے اجازت دیدی تھی کہ وہ اپنی تجارت کی منڈی کے لئے کوئی جگہ خود منتخب کرلے چنانچہ سنہ ۱۶۹۰ء میں اس نے اس مقام کو منتخب کیا جہاں کہ اب فورٹ ولیم کا قلعہ واقع ہے کپتان ہملٹن نے اس مسٹر چناک کے بڑے کرتوت اپنے سفر نامہ میں تحریر کئے ہیں۔ ایک مقام پر لکھا ہے کہ:۔

"مسٹر چناک نے اپنی بستی بسانے کے لئے یہ موجودہ زمین لے لی تھی اور یہاں وہ ایک والی ملک سے بھی بڑھکر خود مختاری سے بادشاہت کرتا تھا البتہ فرق اتنا تھا کہ سلاطین میں ہمدردی و انسانیت ہوتی ہے اور وہ اُسمیں مفقود تھی۔ جب کبھی کوئی غریب ناواقف ہندوستانی اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا تو لزوماً اسکو سخت سزائے بید دیجاتی اور اس کے اس حکم کی تعمیل عموماً اُس وقت کی جاتی تھی جب وہ کھانے پر ہوتا تھا۔ کھانے کے کمرے کے پاس اس مجرم کی گریہ وزاری میں اسکو خوشگوار سرود کا مزا آتا تھا۔ اس جگہ کے آس پاس جب پرتگیز

"آباد ہیں اور اُن میں مُردہ شوہر کے ساتھ بیوہ کا ستی ہوجانا مروج ہے مغلوں کی جنگ سے پہلے ایک مرتبہ مسٹر چناک نے اپنے معمولی باڈی گارڈ کے ساتھ ایک جوان بیوہ کو ستی ہونے کی دردناک رسم ادا کرتے ہوئے دیکھا جس کے حُسن وجمال پر وہ ایسا فریفتہ ہوگیا کہ اُسنے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان جلادوں سے اس عورت کو زبردستی چھین لاؤ جس کی تعمیل میں وہ حسینہ و جمیلہ زبردستی اسکے بنگلہ میں پہنچائی گئی جہاں وہ دونوں بہت برسوں تک محبت کیساتھ رہے اور اس عورت سے کئی بچے بھی ہوئے۔ آخر کار مسٹر چناک کے کلکتہ میں سکونت پذیر ہونے کے بعد وہ مرگئی۔ اس کے متعلق ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ عورت عیسائی ہوجاتی اُس عورت نے خود مسٹر چناک کو شدھی کر لیا جس کے بعد مسٹر چناک میں صرف اس قدر بات تو مسیحی عقیدے کے موافق دیکھنے میں آئی کہ اُس نے اپنی بیوی کو اچھی طرح دفن کرکے اسکی قبر پر ایک گنبد تعمیر کرادیا اور جب تک زندہ رہا بت پرستوں کے دستور کے مطابق سال بسال ایک مرغ اس عورت کی قبر پر ذبح کرکے اسکی برسی کرتا تھا۔ یہ واقعہ عام طور پر مشہور ہے اور مجھے معتبر ذرائع سے اطلاع ملی ہے۔ ہندو اور عیسائی جو بمقام کلکتہ چناک کے قلعہ میں آباد تھے اُن سب کا بیان تھا کہ یہ واقعہ بالکل سچ ہے۔"

(جلد دوم صفحہ ۸ و ۹)

بنگال میں ہوگلی کے قریب جو کالونی یا نوآبادی انگریزوں کی تھی اُن لوگوں کی بابتہ کپتان صاحب بیان کرتے ہیں کہ:-

"اگرچہ کہ اس نوآبادی کے جلسہ انتظامی کے ممبر بہت سے معاملات میں آپس میں اختلاف

"کیا کرتے تھے مگر ان غیر شخصوں کے ستانے میں جو ان کے قابو میں آ جاتے ہیں سب متفق" "اور یکدل ہو جاتے ہیں اُن کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ جہاں چاہیں" "حسب مرضی منافع کے ساتھ مال کی خرید و فروخت کریں بلکہ وہ مجبور ہیں کہ گورنر یا اجلاس" "کونسل اپنی مرضی اور صوابدید سے جو قیمت مقرر کر دیں اسی پر بیع و شرا کریں بیع کے طور پر بیوپاری" "اگرچہ مشتری سے خرید و فروخت کی اجازت گورنر سے حاصل کر لیتے ہیں مگر یہ ایک ناقابل معافی جرم قرار" "دیا گیا ہے کہ وہ ہوگلی جا کر مال کا نرخ بھی دریافت کریں"

(جلد دوم صفحہ ۱۲ و ۱۳)

اگر کبھی کوئی مال فروخت کرتا یا روپیہ قرض دیتا اور پھر چاہتا کہ تقاضہ کرے تو بغیر دھتکار و پھٹکار کے اسکی جان بری نہیں ہوتی۔

(جلد اول صفحہ ۲۴۸)

اور یہ تو ایک بالکل معمولی بات تھی کہ فرنگی سیاح ہندوستانیوں کے رقص و سرود کے جلسہ میں جب مدعو کئے جاتے تھے تو وہ وہاں جا کر تہذیب اور شرم و حیا کو خیرباد کہکر طوائف سے ہوسناکی کی خواہشات کی تکمیل آزادی سے کرتے

(جلد اول صفحہ ۲۶۴)

یہاں تک بنگال کے انگریزی تجار کی اخلاقی حالت بیان کی گئی اب بمبئی کا حال سنیئے۔ بمبئی کے مجلس انتظامی کا صدر نشین مسٹر چائلڈ Mr. child نامی ایک شخص تھا جس سے اور ایک شخص مسمی کپتان تھار برن Cuptan Tharburon سے بگاڑ تھی۔ صدر نشین مذکور نے اس کے خلاف جھوٹے دستاویزات اور جعلی کاغذات بنا کر اسکی سب جائداد ضبط کر لی اور اس کو جیل خانہ بھیجدیا۔ اس کپتان کی بیوی پیسے پیسے کو محتاج ہو گئی بعض

دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی اسی قسم کی جعلسازیاں کی گئیں۔

(جلد اول صفحہ ۱۹۵)

یہ مسٹر چائلڈ جو کمپنی کا جنرل سمجھا جاتا تھا ایک شخص مسمی بوچر Mr. Boucher سے ناراض ہو گیا اور اس نے ایک بنئے کو اسپر متعین کیا کہ کسی طرح سے مسٹر بوچر کو زہر دیا جائے۔ یہ بنیا مسٹر بوچر کے ہندوستانی باورچی سے ملا اور مسٹر چائلڈ کا مطلب حاصل کرنے کے لئے اس کو روپیہ کا لالچ دیا۔ ہندوستانی باورچی نے بنئے سے تو وعدہ کر لیا مگر سفید سنکھیا اور روپیوں کی تھیلی جو اس بنئے نے اسکو دی تھی وہ اس نے اپنے مالک مسٹر بوچر کے سامنے لیجا کر رکھدی۔

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۱۹۶ و ۱۹۷)

ایک شخص مسمی مسٹر پٹیٹ ( Mr. Petit ) کو بحری قزاقوں نے گرفتار کر لیا تھا اور اس کا فدیہ یعنے زر مخلصی پانچ ہزار پونڈ قرار دیا تھا۔ مسٹر پٹیٹ نے سورت میں اپنے دوستوں کو روپیہ ادا کرنے کے لئے لکھا لیکن مسٹر چائلڈ نے کسی بنئے کے زبانی قزاقوں کو کہلا بھیجا کہ مسٹر پٹیٹ بہت مالدار آسامی ہے اس سے پچیس ہزار پونڈ لئے بغیر مت چھوڑنا اس پر قزاقوں نے زر مخلصی کی مقدار میں اضافہ کر دیا۔ یہ رقم مسٹر پٹیٹ ادا نہ کر سکا اور چھ مہینے میں یہ بیچارہ قزاقوں کی قید میں مر گیا۔ یہ قزاق مسٹر چائلڈ کو گالیاں دیتے تھے کہ انہوں نے ان کو ایسی بری صلاح دی کہ انکے پانچہزار پونڈ بھی گئے۔

(جلد اول صفحہ ۱۹۸)

یہ حضرت وہی مسٹر چائلڈ ہیں جنکا تذکرہ باب ہشتم میں کیا جا چکا ہے

اور جن کو ڈائرکٹر نے یہ ہدایت بھیجی تھی کہ ہندوستانی تاجروں سے خوب روپیہ
اینٹھ کر جہاز ولایت کو روانہ کرو اور جنگ کی چھیڑ چھاڑ کرو۔ انہیں حضرات نے
(۳۵) دفعات کی شکایتی درخواست گورنر سورت کے پاس بھیجی تھی جس کا
نتیجہ بھی باب ہشتم میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اب دوسرے گورنر صاحب کے حالات
جس زمانہ میں سر جان گیر (Sir John Gayer) بمبئی میں ایسٹ
انڈیا کمپنی کی طرف سے گورنر تھے اُن دنوں ایک شخص اپنی چہاردہ سالہ
بیوی کو بمبئی میں چھوڑ کر کسی کام کے لئے چین گیا ہوا تھا۔ گورنر نے اُس عورت
کی شادی اپنے لڑکے سے کر دی اور سابقہ شادی محض اس بناء پر کالعدم قرار
دیدی کہ بمبئی میں وہاں کے قانونِ نافذہ کی رُو سے شادی کی توثیق کے لئے
گورنر کی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے جو اس شادی میں حسب قاعدہ نہیں
حاصل کی گئی۔

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۲۳۵)

کپتان ہملٹن کو اس گورنر کی نسبت یہ شبہ تھا کہ ایک مرتبہ اُس نے اپنے
کو اور اپنی بیوی کو عمداً کسی نہ کسی طرح سے گورنر سورت کا قیدی بنایا اور
اس میں اُس کی یہ مصلحت تھی کہ سورت میں قیام کرنے کا اس کو موقع ملے
پھر وہاں وہ اپنا ذاتی سرمایہ کسی تجارت میں اچھی طرح لگا سکے۔

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۲۳۶)

سر جان کے بعد سر نکولس ویٹ صاحب (Sir Nicholas Waite)
گورنر مقرر ہوئے۔ یہ ایسا بد رویہ شخص تھا کہ خود کمپنی کے ملازموں نے اُس کو پکڑ کر

بحیثیت ایک قیدی کے انگلستان روانہ کر دیا۔

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۲۳۶)

یہ حالت تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کی سرزمین ہند پر تھی سمندر کی بابت کپتان جناب تحریر فرماتے ہیں کہ یہی یورپین تاجر بعض اوقات دریائی ڈاکو بھی بنجایا کرتے تھے اور بڑے بڑے ستم ڈھایا کرتے تھے سورت کے حالات تحریر کرتے ہوئے کپتان موصوف لکھتے ہیں :-

"۱۶۹۵ء میں کپتان اویوری ایک بحری قزاق نے اس شہر کی تجارت وامن"
"میں خلل ڈالا اور چار چھوٹے جہازوں سے حملہ کر کے دولت مغلیہ کا ایک جہاز لوٹ"
"لیا جس سے بہت سارا سونا چاندی اور ایک مسلمان خاتون لوٹ میں آگئی تھی"
"آئی جیسا کہ میں بسلسلہ بیان تجارت بحر احمر و مینڈا گاسکر تحریر کر چکا ہوں اس وقت سے"
"اس شہر کی تجارت کو بہت صدمے پہونچے ہیں"

(جلد اول صفحہ ۱۴۶)

عہدہ داران ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام حالات کی بابتہ کپتان جناب تحریر فرماتے ہیں کہ اس کمپنی کے عمال کے ہاتھوں اسقدر ظلم و ستم ہوتا تھا کہ نہ کسی آسمانی کتاب میں اور نہ کسی انسانی قانون میں اتنی طاقت تھی کہ وہ ان لوگوں کو ان زیادتیوں سے باز رکھتا۔

(جلد دوم صفحہ ۱۸)

جب کبھی رعایائے مغلیہ انگریزوں کو بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم رکھتی تو کمپنی کے عہدہ دار یہ کہکر کہ تمہاری تنخواہیں بہت زیادہ ہیں جبرا اُن کی ماہوار میں

آدھا ساجھا کر لیتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۲۳۴)

یہاں تک تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجار کی عام اخلاقی حالت بیان کیگئی اگر معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اخلاقی حیثیت سے پورا آوا کا آوا بگڑا ہوا تھا۔ جو لوگ کہ ان تاجروں کی اخلاقی حالت درست کرسکتے تھے یا جنکا کچھ اثر تھا وہ پادری صاحبان کا طبقہ ہو سکتا تھا لیکن کپتان ہملٹن صاحب کی رائے اس طبقہ کی بابت یہ تھی کہ جہاں کہیں انکے قدم پہونچتے تھے وہاں شراب خانے اور عیاشی کے اطوار بھی ساتھ ساتھ چلتے تھے اور وہ لوگ جو ابھی تک ان باتوں سے پرہیز کیا کرتے تھے انکو بھی ان بدعات سے بچنا بہت دشوار ہو جاتا تھا۔

(جلد دوم صفحہ ۸۵ و ۸۶)

بصرہ کی تو یہ حالت تھی کہ علانیہ گرجوں میں شراب فروخت کرتے تھے اور جو رعایت گورنمنٹ انکے ساتھ مرعی رکھتی تھی اس سے یہ بدترین اور ذلیل ترین فائدے اٹھاتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۸۴)

گوا کے مشنریز کی یہ حالت تھی کہ اگر کوئی شخص ایک نئی راسی چیز مثلاً مچھلی وغیرہ بازار سے خریدے اور پادری صاحب کو دینے سے انکار کردے۔ تو وہ اس کو مرتد قرار دیکر ذات سے باہر کر دیتے تھے۔ اور پھر بغیر سات پونڈ لئے شریک نہ کرتے۔

(جلد اول صفحہ ۲۵۲)

لوگوں کو طرح طرح کی بازیگری و افسوں گری کے کرتب دکھا کر اپنا معتقد بنا لیتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۲۵۲)

اگر کوئی شخص گناہوں سے نجات حاصل کرنا چاہے تو وہ اسکو بہت آسانی سے خرید سکتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۳۲۴)

منگلوریں بعضے ایسے بے حیا تھے کہ اگر کچھ روپیہ ملتا ہو تو مسافروں کے واسطے عورتیں مہیا کرنے میں بھی ان کو کچھ عار نہ تھا۔ اور ان کا خیال یہ ہے کہ اگر کچھ فائدہ ہوتا ہو تو چوری۔ قتل۔ یا زنا کوئی گناہ نہیں۔

(جلد اول صفحہ ۲۸۲)

انہیں کی بابت کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ دنیا کے ریاکاروں کے طبقہ سے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۲۴۷ - ۲۴۷)

ہم کو ان واقعات کے بیان کرنے میں تکلیف معلوم ہو رہی ہے، لیکن ہم اس تفصیل کیساتھ مثالیں پیش کرنے کے لئے اس لئے مجبور تھے کہ اگر صرف دو ایک واقعات بیان نہ کئے جاتے تو ناظرین کو شاید یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ بداخلاقی کی مثالیں ہر قوم اور ہر زمانہ میں پائی جاتی ہیں لیکن جب حالت وہ تھی کہ جس کا بیان کیا گیا تو پھر اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ جو ڈیلومیسی اس ملک کے فتح کرنے میں بالآخر کامیاب ثابت ہوئی اس میں اصل

انصاف یا عمدہ اخلاقِ انسانی کو ابتدا میں کوئی دخل نہ تھا۔ یہ ڈپلومیسی بغیر ان اوصاف کی امداد کے کامیاب ہوئی۔ میں نے لفظ "ابتدا" عمداً استعمال کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ ان واقعات کو انگلستان کے اُن پاک نفوس سے کوئی تعلق نہیں ہے جنہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظلم و تعدی کا مسئلہ پارلیمنٹ اور اپنی قوم کے روبرو خود ہی پیش کر دیا یا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور کے بعد جب ہندوستانی سلطنت مٹ چکی تھی اور انگریزی حکومت مستحکم ہو گئی تھی۔ ہندوستان کو بغرض حکومت بھیجے گئے اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ظلم و تعدی کے رفع کرنے میں اور انصاف کے قائم کرنے میں کوشش کی۔ میں ظلم و تعدی کے ان واقعات کی نقل نہ کرتا لیکن کسی ملک کی تاریخ میں ایسے بڑے بڑے واقعات جن کا ذکر کیا گیا لکھنے کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ قوموں اور اُن کی سلطنت کی زندگی و موت کے متعلق جو اصول قانونِ قدرت نے بنائے ہیں وہ صحیح طور سے اخذ کئے جا سکیں یا یوں کہئے کہ صحیح فلسفۂ تاریخ تیار کیا جا سکے اور یہ ثابت کیا جا سکے کہ کس طرح سے بدترین اخلاقِ انسانی بھی بعض صورتوں میں کامیاب ہوتے ہیں گو کہ اُنکا انجام کچھ ہی ہو۔

۱۸۵۶ء کی ایک معاصر شہادت

حدیقۂ شہدا

## ہم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھالا تم کو
## تم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھلنے نہ دیا

بابری مسجد رام جنم بھومی کا مسئلہ۔

جس رخ سے چھیڑا گیا اور جس طرح دونوں طرف سے غلط جذبات کو بھڑکا کے علوی مقصد حاصل کرنے کی مضحکہ خیز کوششیں کی جاتی رہی ہیں زندہ قومیں اس طور سے اپنے مسائل حل نہیں کیا کرتیں۔

یہ ایک گھرانے کا، ایک خاندان کا، ایک قوم کا اندرونی جھگڑا ہے جس میں ایک بڑا بھائی ہے ایک چھوٹا بھائی۔ بڑے بھائی کو چھوٹا پن نہیں دکھانا چاہیئے اور چھوٹے بھائی کو بڑا بننے کی ہوس نہیں کرنی چاہیئے۔

مسجد مندر مسئلہ کوئی مسئلہ تھا نہیں، اسے مسئلہ بنا دیا گیا۔ بڑا بھائی کیسے برتاؤ کرتا ہے اس کی ایک مثال غدر سے ٹھیک دو سال پہلے اودھ کی بادشاہت میں ہمیں ملتی ہے جب اجودھیا ہی کی مقدس سرزمین پر ایک اور مسجد مندر کا جھگڑا اٹھا تھا۔ اس وقت کا حاکم واجد علی شاہ اور اس وقت کا وزیر دونوں مسلمان تھے اور مندر کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا بیراگیوں اور جوگیوں کا مطالبہ تھا کہ جس جگہ پر ان کا قبضہ ہے پچاس سال قبضہ کے بعد مسلمانوں کا مطالبہ کہ قبلاً یہ مسجد تھی اس لیے پھر ان کے حوالے کی جائے، نامناسب ہے۔ بات سنگھ کی گفت و شنید ہفتوں پھر مہینوں چلتی رہی ــــ اور پھر ایک دن گھمسان کا رن پڑا۔ مسلمان مجاہدین اس متنازعہ جگہ پر قبضہ کے لیے ہتھیاروں سے لیس مارچ کرنے لگے ادھر مستقل یہ تاثر دیا جاتا رہا کہ مسجد بنے گی اور مندر ٹوٹ کے رہے گا لیکن واقعتاً مندر توڑنے کے احکام لے جانے والے دراصل توپ خانے سے لیس، امیر المجاہدین اور ان کے سینکڑوں ساتھیوں پر توپ اور بندوق سے حملہ آور ہونے جا رہے تھے ادھر توپ خانہ نصب کر دیا گیا ادھر مجاہدین آراستہ ہونے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں ادھر سے آگ اگلنے لگی۔ اور مجاہدین میں سے ایک سانس لینے والا بھی باقی نہ بچا!

اودھ کی سلطنت میں جو مسجد پچاس سال سے مندر بن چکی تھی، سلطنت کی آخری سانس تک وہ مندر ہی رہی، آج بھی مندر ہے ــــ بڑا بھائی اس طرح نظیر قائم کرتا ہے۔

بڑا بھائی ہونا کیسے فخر و امتیاز کا نشان ہے!

لیکن ــ کیسی بڑی آزمائش ہوتی ہے!!، بہت بڑا دل کرنا پڑتا ہے بڑے بھائی کو! ایسا کہ کبھی کبھی تو دل بیٹھنے لگتا ہے!

لیکن پھر چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی میں کچھ تو فرق ہوتا ہی ہے!

بڑے بھائی کو چھوٹا پن نہیں دکھانا چاہیئے،

لیکن

پھر

چھوٹے بھائی کو بھی تو بڑا بھائی بننے کی ہوس چھوڑ دینا چاہیئے۔

اصل کتاب موجود ہے لیکن سہولت کے لیے ہم نے رئیس احمد جعفری کی تلخیص لے لی ہے۔

ـــــــ ادارہ

مرزا جان

۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء

# حدیقۂ شہداء

کتاب کے مصنف ایک صاحب مرزا جان ہیں۔ سید امیر المجاہدین کے رفقاء میں تھے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذاتی معلومات و مشاہدہ پر مبنی ہے۔ لہذا اس کے صحیح اور مستند ہونے میں کلام نہیں۔ ہم عصر مورخین کے بیانات یوں بھی قابل توجہ اور لائق اعتناء ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہ ایسا مورخ جو خود شریک کارزار رہا ہو۔ لہذا اس کی صحت اور درستی میں کسی طرح کا شک ہو ہی نہیں سکتا۔ اصل کتاب ۷۰ صفحات کی ہے۔ پریس کا نام نہیں۔

- ساری کتاب میں کوئی پیراگراف نہیں ہے، میں نے حسب ضرورت پیرے قائم کر دیے ہیں۔
- ضمنی اور ذیلی سرخیاں میری قائم کی ہوئی ہیں۔
- جی تو یہ چاہتا تھا کہ ضمیمہ کے طور پر پوری کتاب شامل تاریخ کر دوں اب یہ چیزیں کہاں ملیں گی؟ لیکن ایجاز و اختصار نے دامن پکڑا۔ لہذا میں نے تلخیص سے کلام چلایا ہے۔ لیکن تلخیص ایسی کہ بڑھایا کچھ نہیں، غیر ضروری عبارت حذف کر دی ہے۔ کتاب کا مفہوم پورا آ گیا ہے، اس میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔
- یہ حادثہ ۱۲۷۲ھ میں پیش آیا، اسی سال یہ کتاب لکھی گئی اور ۱۲۷۲ھ میں شائع ہوئی، اتنی قریب العمر تاریخ بجائے خود ایک نادر تحفہ ہے۔ (ر۔ا۔ج)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

**حمد** | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد سراپا عصیان مرزا جان کی یہ عرض ہے کہ شکر پروردگار کا ہر فرد بشر پر فرض ہے جس نے کعبۂ دل کو اپنا گذرگاہ بنایا اور کنشت کو نقشۂ امتحان کے واسطے کھینچ کے دکھایا ہر چند دیر و حرم دونوں میں کار سنگ و خشت ہے کہیں اس کی پرستش میں دوزخ کہیں اس کی زیارت کے صلہ میں بہشت ہے۔

**نعت** | نعت اور نعت رسول امام الثقلین محمد بن عبداللہ نور من نور اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر انسان کو مناسب ہے نام کے ساتھ درود پڑھنا واجب ہے کہ باعث ایجاد کونین ہیں صاحب مشہد اجد و حنین ہیں وما ارسلنک الا رحمۃ العالمین کی مصداق ہیں برگزیدہ آفاق راکب براق طی کنندۂ قصر نیلی رواق ہیں۔

**سبب تحریر** | جب مولوی امیر الدین علی قدس سرہ العلی نے جہاد کا قصد کیا یہاں کے علما سے مشورہ لیا۔ سب صاحبوں نے بیعت کی۔ اس جلسے میں سراپا گناہ الراجی الی رحمۃ اللہ بھی شریک تھا۔ ہنگام نہضت ہر چند ہمراہی کا اصرار کیا لیکن حضرت نے انکار کیا اور فرمایا کہ تمہارا یہیں رہنا مناسب بلکہ واجب ہے کہ اکثر خطوط ہمارے یہاں کے عمائد کو آئیں گے تمہارے سبب سے جواب باصواب مل جائیں گے۔ علاوہ اس کے وہ کام انصرام ہوں گے جو باعث تقویت مجاہدین نیک فرجام ہوں گے پس عاصی نے ناچار اس خادم رسول کی اطاعت قبول کی پھر کچھ نہ کہا یہیں رہا اس دن سے جو مولوی صاحب نے بذریعہ نامہ ارشاد فرمایا بسر و چشم بجالایا اور کیفیت کو قلمدان میں بھرتا گیا جب امیر المجاہدین رئیس المسلمین نے شربت شہادت پیا میں نے بھی افسردہ ہو کے قلم کو روک لیا اور اس کا نام "حدیقۂ شہداء" رکھ دیا۔

**مسجد ہنومان گڑھی کی تاریخ** | اب طرفہ ماجرا سنیے جس سے دل دو نیم ہوتا ہے قطع نظر اور مسجدوں کے اودھ میں ایک ٹیلہ تھا کافروں کی پرستش کا حیلہ تھا راجہ رام چندر نے اس مقام پر ہنومان اپنے رفیق کو بٹھایا تھا بعد فتح لنکا اس کی بزرگی کا وسیلہ تھا۔ اس لیے ہنومان پرست اس کو ہنومان بیٹھک کہتے تھے۔ بالفعل اسی کا نام ہنومان گڑھی ہے حسب دستور وہاں بھی اورنگ زیب

عالمگیر بادشاہ غازی نے ایک مسجد قناتی بنوا دی تھی۔ ہندوؤں کو اس مسجد کے مٹانے میں اصرار رہا۔ بعد چندے مسلمانوں کو غافل پا کے چاہا کہ پھر ٹھا کر دروازہ بنا کے پُوجا کا رنگ جمائیں اور جس پر مورت ہنومان کی ہے یہاں وہی سنگ جمائے لیکن قاضی محمد عاقل نے جرأت کی اس مسجد کی مرمت کی اور انہی کی اجازت سے پاتی شاہ فقیر مسلمان اس میں رہتا تھا نماز پڑھتا اذان کہتا تھا جب شجاع الدولہ بہادر بکسر کو گئے متصل مسجد کے چھپر ڈال لیا اور ہنومان کی مورت کو اس میں قائم کیا مگر حاصل میں فقیر کا بھی حصّہ رہا۔ جب فقیر کو تسخیر کر لیا رفتہ رفتہ مکان معقول تعمیر کر لیا تو آمد بھی زیادہ ہوئی ساری قوم پوجا پر آمادہ ہوئی۔ اس عرصہ میں فقیر مذکور نے انتقال کیا۔ اس کے وارثوں نے مال تال لیا اور علیحدہ مسجد سے عقب اس ٹیکری کے کھیر دیا تالاب پر تکیہ جما لیا لیکن اتیت مراعات کیے جاتے تھے جتوق فقیر دیے جاتے تھے۔ بعد چندے بیراگیوں نے اتیتوں کو نکالا اپنا عمل کر کے مسجد کی منبر کو توڑ ڈالا۔ اس بات پر قاضی حبیب اللہ نے بلوا کیا اور اقرار نامہ عدم تعرض مسجد لکھوا کے اور کسی فقیر مسلمان کو اذان کے واسطے مقرر کر دیا۔

## بیراگیوں کی شرارت

جب بچھرا اٹھہ کر ناظم درشن سنگھ برہمن ہوا مسلمانوں کا سخت دشمن ہوا۔ اس پاس اس ٹیلہ کے احاطہ کھچوایا۔ لڑائی کے قابل قلعہ بنوایا۔ پھر تو کیا مثل مشہور ہے کہ ایک تو کریلا دوسرا نیم چڑھا۔ اس کے سبب روز بروز بیراگی زور پکڑتے گئے۔ مسجد کے آثار بگڑتے گئے۔ ہندوؤں کی نظامتیں ہونے لگیں۔ مسلمانوں کو ان کے مقابلہ کی طاقت نہ رہی۔ حکام کو خیرہ شر کی لیاقت نہ رہی گرد اس مسجد کی حصار قائم کر کے ہنومان گڑھی اس کا نام رکھا۔ پرستش کا شغل صبح و شام رکھا۔ اس مسلمان فقیر کو پیٹے تو کچھ دیتے رہے۔ بجبر و اکراہ اس کی خبر لیتے رہے۔ جب وہ درویش مسلمان مسجد کا جنت کو سدھارا بیراگیوں نے میدان مارا اس خانۂ خدا کو اپنا گھر سمجھ کے ہنومان گڑھی میں تو داخل کر ہی چکے تھے اب کچھ نشان باقی نہ رکھا طاق و محراب و منبر کو برابر کر کے مسجد کا گمان باقی نہ رکھا۔ جب انتہا کو درسن کی حکومت پہنچی تو پھر تو اودھ میں یہ نوبت پہنچی کہ کئی برس تک اذان اور گاؤکشی موقوف رہی۔ اطلاع اس کی اہل دربار کو ہوئی لیکن مفصل خبر نہ سرکار کو ہوئی۔

# نظم حسب حال زمانہ حال

حکام کافروں کی خوشامد سے کہتے ہیں
کیا خوش نما شوالہ یہ بندہ نواز ہے

کس طرح سے اودھ میں ہو بانگِ اذاں بلند
حاکم کو بت پرستوں سے راز و نیاز ہے

اختر نگر میں گاؤکشی کیوں نہ بند ہو
گوسالہ پوجتا ہے جو پیش نماز ہے

سب کو تلاش زر ہے جو ہیں اہل کاریاں
چاندی کی جوتی کھاتے ہیں یہ حرص و آز ہے

ہندو کھلے خزانہ تعلیٰ کے لیتے ہیں
حاصل بہ زورِ زر یہ انھیں امتیاز ہے

واں کربلا میں خیمہ جلا کر کیا غرور
یاں اب کلام حق کے جلانے پہ ناز ہے

اسلام کی تمیز ہو کیا کافروں کو ہائے
علما کو مسئلے میں نہیں امتیاز ہے

خاطر سے اون کی شرع کے گھوڑے کی پھر گئی
ہر فعل کا درست یہ حکم جواز ہے

فتویٰ سے ان کے غازیوں کا خوں ہوا حلال
اس پر بھی ان کو اپنی فضیلت پہ ناز ہے

اے خامہ ابتدا کر اب اس داستان سے
جس میں تمام سوز سراپا گداز ہے

## شاہ غلام حسین کا عزم جہاد

الغرض جب یہاں تک ہنگاموں کی نوبت آئی فلک بے پیر نے نئی صورت دکھائی کہ کافروں نے صحن مسجد میں بت خانہ بنا لیا اور مہرگ‌ دواری کی مسجد خس و خاشاک ناپاک سے پٹ گئی۔ اسلام کی قدر و منزلت گھٹ گئی تب ۱۲۷۱ھ میں کہ عہد دولت مہد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کا ہے شاہ غلام حسین صاحب کہ مرد باخدا حقیقت آشنا تھے۔ خدا کی راہ میں جان دینی فرض عین جانتے تھے اور صاحب ان کے مولوی محمد صالح اسم بامسمیٰ صلاح و تقویٰ میں درست راہِ خدا میں بہت چالاک و چست عالم باعمل حق پرستوں میں بے بدل دونوں صاحبوں نے باہم مشورہ کر کے راہِ خدا میں سر دینے کو قدم گاڑا۔ ڈھال تلوار اٹھائی مشرکوں کی قتل پر نیت درست باندھی اور مسجد آباد اور بت خانے برباد کرنے پر مستعد ہوئے کمر ہمت چست باندھی بغرض جہاد حیدرآباد میں کہ گومتی کے پار ہے محمدی جھنڈا قائم کیا۔ سامان عفو جرائم کیا اگر سچ پوچھئے تو یہ۔ سید احمد صاحب مرحوم سے بڑے

ہیں۔ کس واسطے کہ ان کو سب سامان میسّر تھا یہ مفلسی میں اس عزم پر کھڑے ہوئے۔ احسان علی خاں رسالدار حسن علی خاں بانکے کے بیٹے ان کے معین و مددگار ہوئے بلکہ رستم علی خاں اور بہادر علی خاں دونوں بھائی شریک ہو کے مستعد کارزار ہوئے اس زمانے کے مسلمانوں کا حال ظاہر ہے کہ بات بات پر ایمان بدلتے ہیں کیچڑ سے زیادہ ایک رکابی پر پھسلتے ہیں۔ — تعمیر مسجد یا امام باڑہ یا سبیل کی تو کوئی سبیل نہیں کرتے کنوئیں مہمان سرا بنوائیں گے۔

**مُسلمان جہاد سے کتراتے تھے** وہ لوگ جن پر جہاد فرض تھا یعنی مال و زر رکھتے تھے۔ اتر نیاں پر کھتے تھے۔ گھر رکھتے تھے نہ کسی کا قرض تھا صاف نکل گئے رنڈیوں کی طرح مچل گئے۔ محمدی جھنڈے کو طمعِ دنیا سے محول کیا۔ جہاد میں حجتیں نکالنے لگے۔ جا مانہ قبول کیا مولویوں کی خدمت میں آ مسئلہ پوچھتے تھے کہ جہاد کیا چیز ہے؟ جان بہت عزیز ہے اگر کسی نے کہا جہاد فرض کفایہ ہے۔ بمصدق اس کا ہدایہ ہے خوش ہو گئے اور تعریفیں کرنے لگے کہ آپ بڑے عالم ہیں خوب آفت سے بچایا جیسا آپ کو سنتے تھے ویسا ہی پایا اور معاذ اللہ اگر کسی نے کہا جہاد فرض عین ہے۔ اس میں سعادت دارین ہے۔ سنتے ہی جان نکل گئی رنگت بدل گئی جیتے جی مر گئے۔ ہزار حیلے نکالے کہ ہمارے گھر میں سوا ہمارے کوئی اور نہیں جانے کا طور نہیں کوئی کہتا تھا جورو کو کس پر چھوڑیں کیونکر رشتۂ الفت توڑیں کوئی کہتا تھا کہ جلیل ہیں کوئی کہتا تھا ہندوؤں کی کثرت ہے ہم قلیل ہیں یہ بزدل تر بوں بی کا کھچڑی پکایا کیے۔

**اسلام کے مجاہد۔ مساکین** اگر بعض مساکین کہ بالفعل کچھ اسلام اگر ہے تو ان میں باقی ہے شریک حال اس درویش دل ریش ملک خصائل کے ہوئے اور حسب ارشاد روانہ اودھ فیض آباد ہوئے شاہ صاحب کچھ شاد ہوئے رونا ہی تک پہنچے تھے کہ لکھنؤ کا رستہ لیا اور جو جو فیض آباد میں پہنچ گئے تھے ان کو نثار حسین نائب کوتوال اور کپتان الگزنڈر آہید خصال نے نکال دیا بہانے سے ٹال دیا۔ سبحان اللہ و بحمدہ آرتو انگریز تھا اس کو مسلمانوں سے عار بجا ہے لیکن نائب کوتوال کے ایمان کو دیکھئے کہ بیراگیوں کے چیلے بنے کافروں کے جانب دار ہوئے۔

## مسجد بابری میں قیام

بعد چندے فیض آباد سے پرچہ اخبار کا ہندو مسلمانوں کی تکرار کا بارگاہ جم جاہ میں گذرا ملاحظہ کے بعد ناظم اور کوتوال کے نام پر دستخط ہوا کہ مسجد کی تحقیقات کرو اس بات کو اثبات کرو اس سہارے پر شاہ صاحب نے پھر چند مسلمان بسرکردگی قاضی نور علی ساکن مضافات اعظم گڑھ اودھ کو بھیجا وہ مردانِ خدا مسجد بابری میں مقیم بے خوف و بیم ہوئے۔ خدا کی شان نظر آتی ہے یہاں انسان کیا فرشتے کی عقل جاتی ہے کہ پڑھے لکھے مالدار جہاد سے کنارا کریں اور جاہل مفلس مرنے کو گوارا کریں۔ تھوڑے دنوں کے بعد شاہ صاحب بھی بنفس نفیس توکلت علی اللہ تعالیٰ کہہ کے وارد مسجد مذکور ہوئے اور مولوی محمد صالح ان کے پاس سے دم بھر نہ دور ہوئے۔ شب و روز اسی تصور اور خیال میں رہتے تھے۔ یہ تصور تھا کہ کوئی ایسا سامان یزداں کردے کہ مسجد بیراگیوں کے تصرف سے باہر آئے۔ اودھ کا کفرستان مٹ جائے۔ ترقی اسلام ہو۔ مومنوں کا بیڑا پار ہو۔

## جہاد کی دعوت قبول کرنے سے مسلمانوں کا گریز

اسی خیال میں دو تین مہینے گزر گئے۔ شاہ صاحب شراکت کی جستجو میں ادھر اُدھر گئے مگر کسی نے ساتھ نہ دیا ادھر رخ نہ کیا بلکہ بعضے مسلمان اس امر سے منع کرکے مانع بلخیر مسجد و دیر میں مشہور ہوئے بانی فتنہ ہوئے تفصیل اس کی لکھنا مناسب نہیں۔ میں قاضی نہیں محاسب نہیں مگر شاہ عبدالحق ردولی کے عرس میں جو بزرگوار گئے تھے علی آباد میں ان سے اور مولوی محمد صالح سے سلسلہ جہاد میں تقریر ہوئی وہ گوش زد برنا و پیر ہوئی منصفوں کی نظر میں حق و باطل کی تمیز کھل گئی۔ خلاصہ یہ کہ مولوی محمد صالح درپئے ثبوت جہاد تھے اور دوسرے صاحب ایسی باتیں کرتے تھے کہ (ان کے) وعظ و پند سے کسی بندۂ خدا نے ارادہ جہاد کا نہ کیا رخ اودھ فیض آباد کا نہ کیا۔ سچ ہے خدا کی راہ میں جان و مال دینا بہت ٹیڑھی کھیر ہے۔

کفن بردوش مجاہد اور بیراگیوں کے حامی اور مددگار مان سنگھ اور کشن دت پانڈے چکلہ دار اور زمیندار اس قرب وجوار کے ہوئے یہاں تک کہ دس بارہ ہزار گنوار اور بیراگی نابکار اس گڑھی میں جمع ہوئے۔ مستعد کارزار کے ہوئے۔ گھاگرہ کے گھاٹ روک لیے کہ شاید کوئی مسلمان جاہل قصد بھی کرے اترنے نہ پائے۔ اسی پار مر پٹک کر مر جائے اور مولوی صاحب اور شاہ صاحب کے ساتھ سو آدمی ہوں گے۔ ان کی یہ کیفیت تھی

کہ اگر کچھ ملا تو روزی نہیں تو روزہ۔ لیکن فاقہ کو افاقہ عریانی تن کو عین خدا کی مہربانی سمجھ کے وہاں اڑے رہے خدا کے گھر میں ڈیرے ڈالے پڑے رہے کہ شاید کچھ مسلمان بحرارت و حمیت ایمان بہ نیت جہاد شریک معرکہ فیض آباد ہو کے کافروں کو تہ تیغ کریں اس امر خیر میں جان و مال سے نہ دریغ کریں کسی نے خبر نہ لی آخرش ۱۲ تاریخ ذیقعدہ الحرام ۱۲۷۱ھ جمعہ کے دن دو تین سو مسلمان بہ ارادۂ نماز اسی مسجد میں یکجا ہوئے شاہ صاحب سب کے پیشوا ہوئے۔ یہ خبر بیراگیوں کو پہنچی فرصت کو غنیمت جانا دل میں کچھ اور ہی ٹھانا۔ سرکاری لوگوں کی طرف سے تو ہر گونہ اطمینان تھا ان میں سے کاہے کو کوئی مسلمان تھا اور بعض جو مومن پاک تھے کافروں سے زیادہ سفاک تھے بے خوف و خطر خانۂ خدا کو گھیر لیا۔ مسلمانوں نے جو دیکھا کہ خواہ مخواہ گھیرے میں مرتے ہیں بیکار جان سے گذرتے ہیں ہم بھی کچھ کام کریں۔ اس میدان میں نام کریں مستعد اور آمادہ سب مجاہدین پا پیادہ ہوئے۔ واللہ علم کیا سمجھ کے کوتوال کے پیادوں اور انگز ندر آر کے سواروں نے متوسط ہو کے رفع شر کیا۔

## مجاہد کی شان

دوسرے روز شنبہ ۱۳ تاریخ اسی مہینہ کی، کہ اس کو ماتم میں عشرۂ محرم سے کم نہ جانئے جان ہرسی انگریز بھی لکھنؤ سے داخل فیض آباد ہوا بیراگیوں کا گروہ زیادہ شاد ہوا پہلے تنہا انگز ندر آر۔ تھا مدد اس کا تھانہ مددگار تھا اب دوسرا ہرسی نالکہ ر آیا۔ دونوں صاحب تثلیث نے مشورہ کیا خانہ خدا کا رستہ لیا شاہ صاحب کی خدمت بابرکت میں بکمال خیر خواہی یہ فقرہ عرض کیا کہ مسجد کے دروازے میں کواڑ نہیں کسی طرح کی آڑ نہیں مناسب ہے بلکہ واجب ہے کہ ایک جوڑی کواڑ کی قائم ہو جائے مخالف دفعتاً آنے نہ پائے۔ شاہ صاحب غافل مکر و فریب سے جھٹ پٹ دو مجاہدوں کو کواڑ لانے کے واسطے بیگم پورہ کے ایک محلہ اودہ میں بھیجا کسی مرد مسلمان نے ایک جوڑی کواڑ کی بہت اچھی گاڑی پر لدوا کے دونوں مجاہدوں کے ساتھ روانہ کی۔ گاڑی کچھ آگے بڑھی تھی کہ بیراگیوں نے خبر پائی خدا جانے اس میں افسران فوج کا اشارہ تھا یا کوئی ہرکارا تھا کہ دفعتہً کافروں کی بھیڑ آئی ان کو گھیر لیا مار ڈالنے کا قصد کیا قریب تھا کہ ان دونوں کو باب جنت تک پہنچائیں۔ یکایک مسجد والوں کو خبر ہوئی رستم علی خاں اور بہادر علی خاں دونوں بھائی اور میاں فقیر بخش نائی اور بہادر خاں اور ایک مجاہد پھرتواللہ دے اور بندے کہاں وہ سینکڑوں کہاں یہ فقط

سات جرار بیّن خدا کی شان ساتوں نے تلوار کھینچ کے اسی دم وہ جرأت اور سینہ سپر ہو کے وہ بہادری کی کو ساتوں طبقے زمین کے نظر آنے لگے۔

**کربلا کا نمونہ** جس پر ایک بار تلوار پڑتی تھی دو ہوتا گویا برق شرربار پڑتی تھی کافروں سے جہنم بھر گیا۔ میدان خالی ہوا جو شہید ہوا اس کا مرتبہ عالی ہوا جو کوئی دیکھتا تھا معرکہ کربلا یاد آتا تھا۔ ہر ایک جوان شجاعت مرمیدان دکھاتا تھا جب اللہ اللہ کہہ کے تلوار لگاتے تھے۔ کافروں کے غول پیچھے ہٹ جاتے تھے بید کی طرح تھراتے تھے وہ جو ہنومان گڑھی کا پشتہ تھا وہاں کشتہ پر کشتہ تھا کسی نے نیزہ مارا کسی نے تلوار لگائی کسی نے چقماق خالی کرا کسی نے تپنچہ کو آگ بتائی کوئی بھاگنے والے کو للکارتا تھا جھپٹ کے تلوار مارتا تھا یہ ساتوں سبعہ سیارہ کی طرح بڑھے چلے جاتے تھے کسی کو خیال میں نہ لاتے تھے در در پڑتے چلے جاتے تھے جو کافر جہنم واصل ہوا مردود تھا۔ اسی طرح لڑتے ہوئے گڑھی کے دروازے تک پہنچے مجاہدوں کے نعرے تا بہ فلک پہنچے وہاں بھی بڑا گھمسان کا رن پڑا بڑی بڑی نمود کا بیراگی نابود ہوا۔ ان تھوڑوں نے بہت کام کیا سینکڑوں کو تہ تیغ خون آشام کیا آخر جام شہادت پیا سید تھا رتبہ جنت کا لیا لطف حیات جاودانی کا پایا۔ رستم علی خاں اور بہادر علی خاں دونوں بھائی حقیقت میں رستم تھے اور میاں فقیر بخش گو ناٹے تھے مگر جرأت اور دانائی میں کسی سے کم نہ تھے۔ ساتوں کا شش جہت میں نام رہے گا پنج تن اور چار یار حامی ہیں گے۔ گڑھی کے متصل یہ ہنگامہ ہوا مسجد کے مجاہدوں کو خبر ہوئی ہتھیار باندھ کے ادھر بڑھے۔ مان سنگھ کے لوگ سد راہ ہو کے ان کے منہ چڑھے یہاں بھی ایسی تلوار چلی اور اس طرح سے لڑائی پر دین دار آمادہ ہوئے کہ فیصلہ کے بعد مقتولوں کا جو حساب ہوا تو مسلمانوں سے ہندو بہت زیادہ مقتول ہوئے۔ کافروں کو بھاگنے کی راہ نہ ملی مجاہد وہاں ایسے کچھ اڑ گئے زمین میں پاؤں گڑ گئے۔ مان سنگھ کے لوگ لوہا مان گئے مسلمانوں کی تلوار سے دوزخ کو بے ایمان گئے۔ شہیدوں پر باران رحمت برسا زخمی کافر ایک بوند کو ترسا۔

**غداری** پھر ملی خوب بھر آئی شاہ صاحب کی جماعت پھر مسجد میں پھر آئی اسی وقت ایک طرہ فروش جھے محبت سے مدہوش معتقد خاص مرید با اختصاص تھوڑا سا کھانا مجاہدوں کے واسطے لایا یہ دو دن سے خدا کے مہمان تھے۔ منتظر ہر آن تھے۔ دسترخوان بچھایا کھانے کا لگا لگایا۔ دونوں انگریزوں نے بھی

غازیوں سے کہلا بھیجا تھا کہ اب کمریں کھول کے بخاطر جمع اپنی مسجد میں رہو تم سے کوئی نہ بولے گا جب تک فیصلہ نہ ہولے گا۔ وہ ان کے قول پر اعتماد کر کے مشغول طعام ہوئے ہنوز نوبت سیر ہونے کی نہ آئی تھی کہ دونوں انگریز اعلیٰ علی اور نثار حسن نائب کوتوال باہم کچھ قیل و قال کر کے اپنے ہمراہیوں کو نامرد سپاہیوں کو لے کے مع چند ضرب توپ مسجد سے دور جا کے ٹھہرے۔ خدا ہی کو خبر ہے کہ اس میں کیا اشارہ تھا کہ فوج سرکاری کے الگ ہوتے ہی ہزار دو ہزار بیراگی لاکھوں گنوار ہاتھوں میں تلوار مور و ملخ کی طرح خانۂ خدا کو گھیر لیا۔ یہ جو فوج شاہی اور کوتوال بد اعمال کے ہمراہی تھے انھوں نے اسلام سے منہ پھیر لیا پھر تو کافروں نے رجب علی شاہ کے کوٹھے پر چڑھ کے جو لوگ خدا کی راہ میں مسجد کے سپر میں تھے جسم زاران کا گولیوں سے غربال کیا مسجد کی حرمت کا کچھ خیال نہ کیا صحن مسجد لالہ گوں ہوا۔ غازیوں نے بھی گولی برسنے کو باران رحمت الٰہی جان کے اور بجائے سپر چھاتیاں تان کے ہتھیار نکلے ہاتھ پاؤں نکالے حتی الوسع جرأت کی داد دی۔ جب یہاں صفائی ہو گئی موقوف لڑائی ہو گئی۔

## مجاہد اس طرح ذبح کیے گئے جیسے قصائی گائے کو ذبح کرتا ہے

تب دو تین سو گنوار بیراگیوں کے مددگار
بم مہادیو اور ہر ہر کرتے مسجد کے اندر بے خوف و خطر آئے اور جیسے قصائی گائے کو ذبح کرتا ہے ۶۹
غازیوں کو جو اس وقت تک زندہ تھے شہید کیا جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ریزہ ریزہ کیا۔ پانی کی طرح مسجد کے موری سے خون بہتا تھا اور ہر غازی دم بازپسیں اللہ اکبر کہتا تھا، مولوی محمد صالح بھی اسی وقت شہید ہوئے خلد سے نزدیک دنیا سے بعید ہوئے لیکن عین شورش ہنگامہ جدال و قتال میں اسی ضرب و حرب کے حال میں غازیوں نے شاہ صاحب سے گذارش کی کہ ہم ایسے طوفان میں گھرے ہیں کہ نکلنا معلوم اور ایسے دریائے ناپیدا کنار میں گرے ہیں کہ اچھلنا معلوم۔ خدانخواستہ آپ کی زندگی میں اگر خلل آئے گا تو اس بیڑے کا تھل بیڑا نہ ہوگا۔ نام و نشان ڈوب جائے گا کوئی ہمارا نام نہ لے گا لے گناہوں کا انتقام نہ لے گا۔ آپ کے جینے میں فاتحہ کا سہارا ہے جہاد کی امید دوبارہ ہے اس دم چلے جانا مناسب ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب بہ مجبوری حسب صوابدید ان کے کسی سمت کو چلے گئے اور مجاہد ستم دیدہ آسیائے

تلمہ سے دبے گئے جب کمزوروں نے مجاہدوں کا کام تمام کیا پھر یہ سرانجام کیا کیا کہ قرآنوں کو یعنی سیپاروں کو ہزار بارا کیا دو ایک کو جلا دیا یہ بلا دیکھیے کس پر پڑتی ہے آج تک کہ ایک مہینہ ساون کا اور نو روز بھادوں کے گذرے پانی نہیں برسا ہے یہ قہر نازل ہوا ہے چاروں طرف شور عطش ہے گرمی کی شدت سے ہر شخص کو غش ہے اور وبا کی وہ شدت ہے کہ ہزاروں آدمی ہیضہ سے مرتے ہیں۔

## مسجد توڑی، لاشیں کچل دیں

اور صحن مسجد میں کھڑا تو تغیر تغلق ستیا کی رسوئی اور خدا کی مسجد کے واسطے حد تھا اس کو توڑا بندوق کی گولیوں سے مسجد کے ستونوں کو ثابت نہ چھوڑا پھر مسجد سے نکل کے لاشیں کچل کے گنواروں نے گھر کی راہ لی۔ مہنتوں نے گڑھی میں پناہ لی، لاشیں شہیدوں کی بے گور و کفن چادر نہ پیرہن عریاں پڑی رہیں پلٹنیں دیکھا کیں کھڑی رہیں کوئی ایسا بھی نہ تھا کہ ان کی خبر لیتا دو گز کفن دے کے دفن کر دیتا۔ دوسرے روز نثار حسین نائب کوتوال بدافعال نے اسی مسجد کے دروازے پر گڑھا کھدوا کے توپ دیا۔ کسی نے تاریخ ان مظلوموں کی کہی تھی مصرع تاریخ۔ بلغ العلی بکمالہ۔

۱۲۷۱ھ

## مقابر شہدا کی بے حرمتی

یہاں تو حاکم ہندو ہیں سردار ہیں مسلمان مجرم گنہگار بر سردار ہیں ایسی زیادتی ہندوؤں کی مسلمان دیکھیں جلے ہوئے اوراق قرآن دیکھیں اور پھر حمایت کفار ہو ایسی رعایت پر خدا کی مار ہو جائے عبرت ہے مقام حیرت ہے نہ کسی کو شرم ہے نہ غیرت ہے ظاہر میں تو مسلمانی کے ٹھاٹ ہیں باطن میں یزید علیہ اللعن کے بھاٹ ہیں بعد اس حرکت کے بیراگیوں نے صحن مسجد میں آ کے ہوم کیا سنکھ بجایا وہیں موہن بھوگ کھایا کہتے تھے ہنومان جی نے کرپا کی ملیچھوں سے پاک کیا۔ غرض کوئی بے ادبی اٹھا نہ رکھی۔ اسلام کی توقیر ذرا نہ رکھی اس کی تفصیل لکھنے سے کچھ حاصل نہیں لکھنے کے قابل نہیں۔ متصل اسی مسجد کے ایک ٹیلہ تھا۔ مسلمانوں کی دعا کا وسیلہ تھا خواجہ مٹی اس کا نام تھا مقابر شہدا کا مقام تھا قبروں کو کھود کے نیست و نابود کر لیا اور ایک بت وہاں بھی دھر دیا العبض کہتے ہیں کہ بیراگیوں کی کیا عقیقت تھی یہ جو افعال صادر ہوئے سب مان سنگھ کے لوگوں سے سرزد ہوئے مگر ہم دم بخود

ہیں زبان ہلا نہیں سکتے۔ ان کا نام لب پر لا نہیں سکتے۔ کس واسطے کہ وہ سرکار کے زعم میں خیر اندیش ہیں، سب سے زیادہ وفا کیش ہیں۔

## بیگم پورہ میں مسلمانوں کی درگت

اب حال بیگم پورہ والوں کا سنیئے اعلی علی شقی کے حکم سے منادی نے ندا کی جو مسلمان اس کا شریک ہوگا جان سے مارا جائے گا۔ گھر لٹے گا سر اتارا جائے گا یہ سُن کے وہ بیچارے ڈر کے مارے شاہ صاحب کے شریک نہ ہوئے اس پر ناکردہ گناہ آفت میں پھنسے بعد فراغت کے قتل مسلمانوں سے بیراگیوں نے چار حملے ان کے مکانوں پر کیے۔ بہت زور دکھایا مگر خدا کے فضل سے دخل نہ پایا چنانچہ افضل بیگ نامی ایک شخص وہاں کا رہنے والا ان کے ہاتھ سے زخمی ہو کے اب تک صاحب فراش ہے۔ مدرحمت شاباش ہے جب ان بچاروں نے دیکھا کہ وہ بہت ہیں اور ہم تھوڑے ہیں ناچار گھر چھوڑے فیض آباد میں آ رہے۔

## واجد علی شاہ کا حکم

دو چار دن پیشتر اس معرکہ کے حکام سرکار سے جب کچھ نہ بن آئی تب یہ بات ٹھہرائی کہ مولوی نہال الدین صاحب اودھ میں جا کر بصلاح و صوابدید مولوی حفیظ اللہ صاحب داروغہ عدالت العالیہ دیوانی اس باب خاص میں ساکنان اودھ اور فیض آباد سے استفسار کریں بلکہ قلم بند اظہار کریں بعد تحقیقات بینفی بے رد و رعایت کیفیت واقعی بارگاہ ظل اللہ میں حاضر کریں۔ اور اگر نشان مسجد کو دیکھیں مشاہدہ اپنا ظاہر کریں چنانچہ ۱۶ ذیقعدہ الحرام ۱۲۷۱ھ قدسی کو یہاں سے روانہ ہوئے دو منزل پہنچے کہ سنا فیصلہ ہو گیا مگر امتثالاً للامر وہاں پہنچے ہنگام تحقیقات اور تحریر اظہارات رو برو مولوی صاحبین محمد وحین اور میر سید علی صاحب مجتہد فیض آباد اکثر رئیسوں نے دیکھنا مسجد کا اور بعضوں نے اس میں نماز پڑھنا ظاہر کیا اور قاضی یار علی نبیرہ قاضی حبیب اللہ نے کئی محضر سابق کے دکھائے کہ ان سے صاف مسجد ثابت تھی اور طرفہ یہ کہ کئی ہندوؤں نے بھی مسجد پر گواہی دی منکروں کو روسیاہی دی۔ چنانچہ ان دو تین صاحبوں نے کیفیت راست براست بے کم و کاست کہ بعینہٖ مضمون اس کا موافق تحریر عاصی کے ہے بارگاہ شاہی بندہ پناہی میں ارسال کی حسب ضرورت تفصیل مہر و گواہی مندرجہ کیفیت ہذا لکھی جاتی ہے۔

## تحقیقاتی رپورٹ کا خلاصہ

منقول مہر و گواہی مندرجہ کیفیت مرسلہ مولوی حفیظ اللہ صاحب و مولوی نہال الدین صاحب مرقوم ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ

| ابراہیم بیگ | سید بخش علی جعفری | حسین علی | مرزا جان |
|---|---|---|---|
| ساکن خلدہ آباد فیض آباد | زمیندار محلہ میراں پور متعلقات | زمیندار محلہ تفضیانہ یکے از اولاد | علاقہ دار خاص محل مسجد |
| سطور المتن واقعی است | اودھ بیان واقع است | سمے لطف اللہ مسجد بچشم خود دیدہ ام | ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام |

| سید باقی علی | عبدہ سید حسین مرزا | آغا علی | علی مرزا |
|---|---|---|---|
| مسجد بچشم خود دیدہ ام | لاریب فیہ | لاریب فیہ | بیان واقعی است در بودن مسجد بر گڑھی شک نیست |

گواہ شد چھیدی ابن تورم بتولی اظہار خود نویسانده است کہ بارہا مسجد را بچشم خود دیدہ ام

گواہ شد

محمد روشن خاں ساکن اودھ مسجد واقع ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام و ہیأت آں بخوبی ذہن نشین دارم فقط

گواہ شد۔ محمد علی خاں ساکن اودھ خاص بعمر یکصد و چہار سال مسجد واقع گڑھی بچشم خود دیدہ ام فقط

| | |
|---|---|
| احمد علی | ساکن فیض آباد سوز خوان مسجد بر ٹیلہ ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام و ہیأت و مقام و سمت آں بخوبی یاد دارم و بر محراب آں اسم یا اللہ نقش بودہ است۔ |
| سید محمد علی | مرثیہ خوان ساکن فیض آباد مسجد قناتی کہ بر ٹیلہ ہنومان گڑھی بودہ بچشم خود دیدہ ام فقط |
| مرزا علی | ساکن اودھ مسجد واقع ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام و ہیأت آں بخوبی یاد دارم فقط |

اظہار دہنی سنگہ چپراسی عدالت فیض آباد برائے قرقی حسب الحکم سرکار در عہد نیابت منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں بہادر بر ہنومان گڑھی رفتہ بودم مسجد واقع ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام فقط

## خدا فراموش، ناحق کوش

جب یہ کیفیت بارگاہ ہندوستان پناہ میں آئی اور چھوٹے درباریوں نے ملاحظہ فرمائی۔ نواب کے پاس آکر عرض کرنے لگے کہ حضور عالم یہ کیفیت جو دونوں مولویوں کی دو حرفی ہے اس کا کیا اعتبار یک طرفی ہے اس پر تعمیر مسجد کا حکم لگانا اور اپنی رعایا کو ستانا ضعف مداری ہے بلکہ رعیت آزاری ہے آپ نائب سلطان ہیں آپ کے نزدیک برابر ہندو اور مسلمان ہیں۔ انصاف

یہ چاہتا ہے کہ راجہ مان سنگھ اور آغا علی خاں ناظم کو ارشاد ہو وہ جا کے دیکھیں اس امر کو خوب چھانیں گو راجہ صاحب مدعی علیہ ہیں لیکن یہ ایمان کا مقدمہ ہے۔ نواب صاحب کو خود یہ منظور تھا نیت میں فتور تھا کیفیت کی جانب خیال نہ کیا ٹال دیا مگر مان سنگھ بے ایمان اور آغائی ننگ خاندان کو روانہ کیا۔ وہ دونوں خدا فراموش ناحق کوش جس وقت اودھ میں پہنچے مسلمانوں کو دھمکایا ہندوؤں کو سر چڑھایا کہ مسلمان بیچارے بقول شخصے قہر درویش بجان درویش صلح پر راضی ہوئے آخر آغائی اور مان سنگھ نے ایک اقرار نامہ اور صلح نامہ مہنتوں سے لکھوا کے سرکار میں بھیج دیا کہ اب کسی طرح کا یہاں فساد ہندو اور مسلمانوں میں باقی نہیں ہے۔

## لکھنؤ کے مسلمانوں میں اضطراب

جب اقرار نامہ اور صلح نامہ نواب نے ملاحظہ کیا مارے خوشی کے ہنس دیا اور کہا الحمد للہ جو ہونا تھا سو ہوا مگر اب فساد مٹ گیا غرض ایسی کچھ صورت ہوئی کہ نواب کے نزدیک جو خون مسلمانوں کا ہوا تھا اس کے انتقام کی نہ ضرورت ہوئی تب بعض علماء لکھنؤ کے کان کھڑے ہوئے ان کے ساتھ کچھ مسلمان کھڑے ہوئے ہمہ دیگر یہ کلام کیا کہ یہاں کے حکام نے اسلام کو سلام کیا آج ہندوؤں نے ہنومان گڑھی کی مسجد کھودی ہے اگر ایسے ہی مسلمان بودے ہیں تو کل لکھنؤ میں عمل کریں گے ہر خانۂ خدا میں ایک ایک بت دھریں گے۔

## مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی و مولانا سید امیر علی

آخر ش ارباب فرنگی محل سے مولوی عبدالرزاق صاحب کہ طفلی سے ہم ان کو ورع اور پرہیز میں کامل جانتے ہیں عبادت میں طاق ریاضت میں مشتاق شب بیدار تہجد گذار اور مولوی امیر الدین علی صاحب ساکن قصبہ امیٹھی کہ امور مذکور میں بمراتب بڑھے ہوئے ہیں نہ دن کو آسودہ ہو کے کھاتے ہیں نہ رات کو آرام سے پاؤں پھیلا کے سوتے ہیں دونوں صاحب بعزم جہاد مستعد ہوئے اور مولوی تراب علی اور مولوی برہان الحق اور مولوی حیدر علی مدظلہ سے مشورہ ہوا۔ سب نے فرضیت جہاد کا اقرار کیا اور کہا کہ جب تک ہنود سے مقابلہ نہ ہوا تھا اور مسجد بابری میں مقاتلہ نہ ہوا تھا تب تک فرض کفایہ تھا اب بے شبہ فرض عین ہے، ہمارے نزدیک اب ہنگام نفیر عام ہے۔

## سیّد امیر علی کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت

الغرض جب یہ پانچوں رکن رکین دین متین تابع شرع مبین خادم پنجتن وارث مسند رسول ذوالمنین ایک دل اور ایک زبان ہوئے۔ تب یہ خیال آیا کہ انھیں پانچوں میں ایک کو امام ٹھہرائیے اس کے حکم کو بجا لائیے آخرش باوجود انکار سب صاحبوں نے مولوی امیرالدین علی صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اپنا امام کیا اور کہا کہ بالفعل آپ اور مولوی عبدالرزاق صاحب روانہ ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ سامان سفر کرکے ہم بھی دو ہی چار دن میں حاضر خدمت شریک رنج و راحت ہوتے ہیں پس سلطان المجاہدین اور مولوی عبدالرزاق صاحب نے حسب تجویز ان سب صاحبوں کے یہ بات ٹھہرائی پنجشنبہ کو یہاں سے کوچ کرکے ایک دو مقام ایٹھی میں کیجیے اور بعد اجتماع اور سامان جہاد فیض آباد میں چل کے انتقام لیجیے۔

## فرنگی محل میں ہلچل

ادھر یہ مشورہ ہوا اُدھر چہار شنبہ ہی کو شیطان کے کان بہرے کہیں سن بھاگا اور ان صاحب کو خبر پہنچائی جن کے نزدیک شہید کرنا مسلمانوں کا اور جلانا قرآن کا کچھ اصل نہ رکھتا تھا۔ انھوں نے طرفہ حرکت کی شام ہے یہ شہرت کی کہ عزم مولوی عبدالرزاق کا چھپا نہیں ظاہر ہے ہر کس و ناکس اس سے ماہر ہے کوتوال نے سنا ہی ہوگا کسی نہ کسی نے کہا ہی ہوگا ظن غالب بلکہ یقین ہے کہ دو گھڑی میں دوڑ آئی اور سارا فرنگی محل بے جرم و گناہ اسیر دام بلا ہو جائے ایسی لغو حرکت کرنا اپنے ساتھ سب کو فضیحت کرنا ہے ایسی ایسی باتیں کہیں کہ سارے فرنگی محل میں ہل چل کیا کہیں بل پڑ گئے آرام کی صورت بگڑ گئی ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہو کیا ہوگا انجام اس کا بُرا ہوگا یا بھلا ہوگا؟ اصیلیں لونڈی باندیاں کہتی تھیں دیکھیے کیا پیش آئے گا حاکم زیر و زبر کرے گا بُرے دن دکھائے گا۔

## مولانا عبدالرزاق فرنگی محل کا عزم مردانہ

غرض ایسا کچھ منتر پڑھا کہ انھیں کا طوطی بولنے لگا۔ چھوٹا بڑا مولوی عبدالرزاق صاحب پر زبان طعن کھولنے لگا یہاں تک شور و غوغائے محشر برپا ہوا کہ یہ خدا دوست فرمانے لگے کہ یہ سب سامان فقط میرے روکنے کے واسطے ہوا ہے وہ ممکن نہیں میں خواہ مخواہ جاؤں گا۔ کافروں کو جہنم میں پہنچاؤں گا میرے نزدیک اودھ دارالحرب ہے فرض عین حرب و ضرب ہے۔ ہاں صبح تک اگر میں نے قیام کیا پھر جانا دشوار ہوگا محلہ بجبر روکنے کو تیار

ہوگا یہ سوچ کر کیب بینی و دوگوش فقط ایک تیر بردوش لگی کندھے پر عصائے پیری ہاتھ میں رمضان خدمتگار ساتھ میں محلہ نرہی کو روانہ ہوئے امیر المجاہدین وہاں اترے تھے آدھی رات گذری ان کے پاس پہنچے وہ تو ان سے زیادہ چلنے کے لئے آمادہ تھے گو سواری نہ تھی پیادہ تھے جس دم اریکہ آرائے سپہر جیوں ان بزرگوں کا دیکھنے مشرق سے نکل آیا یہاں یکرمبندی ہونے لگی خدا کی راہ میں قدم بڑھایا۔ ان علماء کی سواری کا بیان قلم کی طاقت زبان کی قدرت سے باہر ہے۔

**قافلۂ مجاہدین کی روانگی** بیچ میں دونوں خورشید و ماہ خدا کے پیارے ایک ہنس پر سوار دوسرے کی ران تلے راہوار نمازیوں کی قطار خدا کی قدرت نظر آتی تھی کفار کی ہیبت سے جان جاتی تھی سب کہتے تھے اس فوج محمدی کی ایسی شان ہے کہ عقل حیران ہے ایک ایک ان میں ہزار پر بھاری ہے۔ چہروں پر نور برستا ہے جو ان سے لڑے گا وہ ناری ہے۔ اسی شان و شوکت خاص جہاد کی نیت سے بحر مواج کی طرح لہراتے ہوئے روبہ منزل اٹھی مبارک میں داخل ہوئے سبحان اللہ وبحمدہ خدا اگر ایمان دے تو ان لوگوں کے قدموں پر انسان جان دے حکم کی یہ منادی کہ کوئی فیض آباد اور اودھ کا حرم نہ کرے بے فائدہ رزم نہ کرے مگر ان اللہ والوں کو نہ کسی فسادی سے غرض نہ دوڑ دھوپ ہے کام فقط خدا اور رسول کی خوشنودی سے طبیعت کو چین دل کو آرام تھا۔

**محمدی جھنڈا** ایک طرف محمدی جھنڈا کھڑا ایک جانب لشکر قلیل بارعب وجلال پڑا، نقارہ پر جس دم چوب پڑتی تھی ہیبت سے برہمن کی لڑکی کلمہ پڑھتی تھی۔ غازیوں کا جماؤ سپہ گری کا بناؤ کوئی نیزہ تانتا تھا کوئی رستم کو پیرزال جانتا تھا۔

**یہ تھے مجاہد اسلام** خلاصہ یہ کہ اس جلسہ میں کیسا کیسا نوجوان اور کیا کیا شیخ زادہ باشوکت و شان تھا مولوی عبدالرزاق صاحب کہ افسر غازیان نامدار تھے سب کے سردار تھے ہم صفت موصوف دیار وجوار میں معروف ہیں ہمراہ ان کے محمد خورشید حسین مجاہد ان بدر وحنین کے ہم پہلو بہادر ذی شعور دوسرے حسام الحق مولوی نور الحق صاحب مرحوم ومغفور کے پوتے ہیں نام سے جلادری عیاں ہے۔ تیسرے لمعان الحق مولوی برہان الحق کے فرزند دلبند جن کی پیشانی سے شجاعت کا نور چمکتا ہے ہر دم ہیرا

شیر امام کا منہ تکتا ہے کہ اجازت پاؤں اور ہوا کی طرح اودھ کو جاؤں۔ چوتھے محمد شیخ سرفراز احمد کی چراغ عالی دماغ کاکوری کے رہنے والے جفائیں سہنے والے، پانچویں عبدالغفار مولوی عبدالجامع کے نور الابصار سلیقہ شعار خوش کردار جوان صالح، جرار اور ماسوا ان کے اسی طرح کے کتنے ہی جوان نادر روزگار باوقار تھے۔

### علی نقی خاں کی برہمی

اب یہاں کا حال سنیے۔ ادھر جناب امیر المجاہدین اور مولوی عبدالرزاق کا جانا ادھر سارے لکھنؤ میں قیامت کا آنا ہر مسلمان نے جہاد پر کمر باندھی کافر کشی پر تیغ دسپر باندھی جس کو دیکھیے راہی ہے عازم نور اہی ہے جب یہ خبر نواب علی نقی خاں کو پہنچی کہ علماء فرنگی محل بھی جہاد پر آمادہ ہوئے یہ سنتے ہی پریشان حد سے زیادہ ہوئے اور مولوی مفتی محمد یوسف کو بلوا کے استفسار کیا کہ فرنگی محل میں کن کن صاحب نے یہ فساد اٹھایا ہے؟ ہم تو اس خاندان کو بہت مانتے ہیں۔ برائے خدا اور رسول جلد جائیے فتنہ خوابیدہ نہ چونکایئے ہنگامہ کو مٹایئے نشیب و فراز دکھا کے امیٹھی سے پھیر لائیے وہ جو فرنگی محل میں آئے اور غیظ و غضب نواب کی خبر لائے پھر تو گویا مولوی عبدالرزاق کے گھر پر قیامت کبریٰ تھی نصیحت اور ملامت کیا کیا تھی مفتی صاحب نے بھی زبانی کوئی بات اٹھا نہ رکھی ایمان کی حمیت اور حیا ذرا نہ رکھی۔ وہ تو ادھیڑ بن کر کے اپنے گھر سوت ہٹی کو تشریف لے گئے۔

### نفسا نفسی کا عالم

اب دوسرے صاحب کا عمل ہوا گویا دشمنوں کے دماغ میں خلل ہوا آدھی رات تک دوڑ کی خبر گرم رہی۔ دروازے کی طرف سب کی نظر رہی اور مولوی عبدالحق کے اہل و عیال کو گنہگاروں کی طرح چھپا کے اپنے گھر لے گئے مکان میں قفل دے گئے۔ ہر شخص ہمت ہارا تھا جیسی مولوی عبدالرزاق نے ڈاکہ مارا تھا اور احباب کا عجب حال تھا اٹھنا محال تھا آدھا گھر پہنچا تو نصف راہ میں رہا اور کہیں چھپانے کا قصد کرتے تھے تو لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے، کہتے تھے ہمارے گھر میں نہ لانا ہمیں اس آفت سے بچانا کیا ہمارا گھر بھی لٹوا دو گے کوئی طعنہ سے کہتا تھا کیا تم بھی جہاد کو جاؤ گے؟ قصہ کوتاہ اسی حیص بیص خوف و رجا میں اوقات گذر گئی چار پہر رات گذر گئی نہ سوار آئے نہ پیادے نظر آئے۔

### شاہی پیامبر

نور کے تڑکے حسب الحکم نواب نقیر اللہ رفیق شرف الدولہ غلام رضا ہندی الاصل بلا فصل اور میر صفدر علی چکلہ دار حید رگڑھ امیٹھی کو روانہ ہوئے مطعون زمانہ ہوئے دیکھنے والے کہتے

تھے کہ مجاہدین کو پھیرنے جاتے ہیں دیکھئے کس طرح لاتے ہیں لیکن اتنی خیر گذری کہ دونوں صاحبوں نے کچھ اپنی رائے کو دخل نہ دیا بکمال نرمی فقط ابلاغ حکم سرکار کیا کہا حضور عالم کا ارشاد یوں ہے کہ تم کو اضطراب کیوں ہے؟ پہلے تدارک اس کا ہم پر واجب ہے اگر خدانخواستہ ہم اس امر دینی میں کچھ پہلو تہی کریں اس وقت تم کو مناسب ہے امیر المجاہدین نے بھی بکمال لطف ان سے خطاب کیا مناسب وقت کے جواب دیا آخر کوئی امر طے نہ ہوا گو انھوں نے بہت التیام کیا ناچار فوج محمدی سے علیحدہ کسی باغ میں قیام کیا۔

## کار ملا فی سبیل اللہ فساد

اب پھر چند فقرے یہاں کے سننا چاہیئے دادِ سخن دیا چاہیئے کہ بعض مولویوں نے میدان خالی پا کے نواب کے پاس جا کے سارے عالم کو برا اور آپ کو بھلا بنا کے صاف کہہ دیا کہ جہاد فرض کفایہ ہے کتب فقہ میں یوں ہی آیا ہے جو فرض عین کہتا ہے خطا پر ہے شاید قتل بندگان خدا ناحق مدِ نظر ہے بلکہ یہ معرکہ جو اودھ میں گذرا ہے مطلق جہاد نہیں وہاں تو لڑنا بھی ناروا ہے وہاں تو جہاد کی شرط نہیں پائی جاتی وہ دار الحراب کب ہے۔ بیراگی منو ہان گڑھی کے مطیع الاسلام ہیں جس کا جی چاہے ہم سے گفتگو کرلے مناظرہ آپ کے روبرو کرلے آپ اتنا تردد ناحق فرماتے ہیں کیوں غصہ کھاتے ہیں اگر سرکار ہم کو خلعت اور زاد راہ دے کے فیض آباد کو روانہ کرے ابھی علی آباد میں جا کے رہتے ہیں ایسا وعظ کہتے ہیں کہ بجوا ہٹ جاتا ہے ایک شخص وہاں نظر نہیں آتا ہے۔ غرض ایسا کچھ تڑاق پڑاق باتوں سے سبز باغ دکھایا کہ نواب نے دوشالہ اور رومال کوٹی میں پچیس روپیہ کا منگا کے اسی وقت اڑھایا اور سو روپیہ نقد چلنے کی زبانی نہ لوا دی۔ یہ تو خلعت پہن کر ایسے خوش ہوئے گویا سلطنت ملی بڑی دولت ملی۔

## اصحاب فیل

اپنا قلم تھراتا ہے کاغذ کا سینہ پھٹا جاتا ہے کیفیت لکھنا دشوار ہے ان کا دربار سے نکلنا ادھر گھر کی طرف چلنا دم بھر میں سارے شہر میں خبر منتشر ہوئی دنیا زیر و زبر ہوئی۔ انگشت نمائی ہونے لگی۔ اشعار ہجو برملا ہونے لگے جو جس کے دل میں آتا تھا بے تکلف زبان پر لاتا تھا الغرض سامانِ سفر ہوا اس تھرے جانا عزیزوں کا مدِ نظر ہوا ہاتھی تعینات ہوا اصحاب فیل بنے عقل پہ پتھر پڑے طمطراق ابابیل بنے۔ دنیا بیلوں سے صحبت ہوئی باقید کے اجازت ہوئی۔ ہر روز یہ ہاتھی پر چڑھ کے جانے لگے۔

## مولانا عبدالرزاق فرنگی محل کی واپسی

وہاں امیٹھی میں بعد قیل و قال ایک دو روز میر صفدر علی اور پڑھے نہ لکھے نام مولوی محمد فاضل نے یہ نوشتہ لکھ دیا اور زبانی بھی بحلف اقرار کیا کہ اگر مسجد ثابت ہو گئی نواب صاحب بہادر اسی وقت بنوا دیں گے اور بیراگیوں سے بے ادبیوں کا انتقام بھی لیں گے اور اگر ثابت نہ ہوئی مجبوری ہے بیراگیوں کی بے قصوری ہے شکایت نہ کیجئے گا جہاد کا نام پھر نہ لیجئے گا اس عہد پر وثوق کر کے مولوی عبدالرزاق مع اعوان و انصار اپنے گھر کو آئے مگر امیر المجاہدین تشریف نہ لائے۔ مولوی عبدالرزاق نے حسب الطلب نواب صاحب سے ملاقات کی اور بہنگام استفسار حرف و حکایات کی لیکن وہی تیور وہی جہاد فرض عین زبان پر رہا ایسی تقریر دل پذیر کی کہ خروج واجب ہر مسلمان پر رہا۔

## مولانا عبدالرزاق کا شاہی خلعت قبول کرنے سے انکار

خلاصہ یہ ہے کہ خلعت دینے میں نواب نے بہت اصرار کیا مولوی صاحب نے انکار کیا رخصت ہو کے مکان پر آئے کلمات حسرت و افسوس زبان پر رہ گئے وہ ایک بار اور دربار گئے مجبوری ناچار گئے جب نواب تعمیر مسجد میں چناں چنیں کرنے لگے تب اپنے آنے پر خود نفرین کرنے لگے جی چاہا کہ پھر عزم کریں سامان رزم کریں لیکن مروت شہر سے نکلنا دشوار تھا کہ لوہے کے پل اور ناکجات پر بندوبست سرکار تھا۔

## امیر المجاہدین سے واجد علی شاہ کی ملاقات

جب مولوی عبدالرزاق کے پھر آنے پر بھی اہلکاران سرکاری کا اطمینان نہ ہوا تو منشی امیر حیدر بشیر الدولہ بہادر خواجہ سرا کو روانہ کیا کہ ایسا کچھ نشیب و فراز دکھاؤ کہ مولوی امیر الدین علی صاحب کو پھیر لاؤ چنانچہ حسب الحکم امیر حیدر نے امیٹھی میں جا کے جناب ممدوح سے عہد و پیمان کیا۔ مولوی صاحب نے بھی اصرار نہ زیادہ کیا لکھنؤ کا ارادہ کیا خلاصہ یہ کہ دو تین دن کے بعد امیر المجاہدین منشی امیر حیدر کے ساتھ ناکے تک پہنچے اور وہاں سے بشیر الدولہ بہادر کے ساتھ کہ وہ استقبال کو گئے تھے تشریف لائے اسی آن بان سے مع سپر و شمشیر اپنے مجاہدین کو ساتھ لیے ہوئے نواب صاحب کے پاس آئے۔ نواب صاحب کی مروت اور اخلاق چھپا نہیں ہے وہ خاطر داری کی کہ جتنے حضار مجلس تھے دنگ ہو گئے سب کے زرد رنگ ہو گئے۔

امیر المجاہدین کا بھی وہ رعب چھایا کہ سارا دربار تھرآیا۔

## امیر المجاہدین اور واجد علی شاہ کی گفتگو

پہلے کشتی خلعت کی منگائی اور اس کے ساتھ پانسو روپے کی تھیلی آئی در گفتگو باز ہوا قصہ دنیا سازی بلکہ دم بازی کا آغاز ہوا۔ نواب نے فرمایا سرکار تمھارے عزم بالجزم سے کہ ہمہ تن خدا کی راہ میں جان دینے کو موجود ہو۔ بہت رضامند ہے نہایت خرسند ہے کار مردانہ کرنے ہو خدا کی راہ میں قدم دھرتے ہو خلعت پہنیے، روپیہ لیجئے چندے بسر کیجئے انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب بشرطِ ثبوت تعمیر خانہ خدا ہوجائے گی جنھنوں کو سزا مل جائے گی امیر المجاہدین نے کہا ہم لوگ خدا کی راہ میں جان پر کھیلے ہوئے ہیں مصیبتیں جھیلے ہوئے ہیں ہمیں خلعت اور انعام سے کیا کام ہے۔ اس خلعت کا بد انجام ہے کہیں کے عامل نہیں چکلہ دار نہیں مصاحب نہیں سپہ سالار انھیں خلعت لے کے کیا کریں آپ کو اوروں کی طرح کیوں رسوا کریں یہ خلعت اور انعام نہیں ایماں فروشی ہے دنیا کے لیے دین سے چشم پوشی ہے ہمارا خلعت یہ ہے کہ رخصتِ جہاد ہو۔ اجازتِ سفر فیض آباد ہو کہ بیراگیوں سے انتقام خون ہر فردِ مسلمان اور بے ادبی ہائے قرآن لیں۔ نواب نے جیسا بعض علماء سے سنا تھا فرمایا کہ یہ جہاد نہیں۔

## دربار واجد علی شاہ میں امیر المجاہدین سے مناظرہ

تھوڑی رد و قدح ہوئی تھی کہ ناگہاں وہی صاحب کہ اسی بات کا خلعت پہنے ہوئے بیٹھے تھے، باشارہ حضور دور سے نزدیک آئے اور تائید کلام حضور زبان پر لائے کہ واقعی فرض عین ہونا جہاد کا کتب فقہ میں دیکھا نہیں خصوصاً ہندوؤں کی زیادتی کا کچھ لکھا نہیں۔ مولوی صاحب نے کہا۔ سبحان اللہ آپ کو عبارت شرح وقایہ کی بھی دخو نس علین ان ھجمو فتخرج المراۃ والعبد بلا اذن یاد نہیں کس طرح کہتے ہیں کہ جہاد نہیں۔ اس میں کلام چند در چند ہوئے آخر کو بند ہوئے اور کہنے لگے کہ بالفرض اگر فرض بھی ہو تو شرط امامت ہے کہ اولی الامر منکم قرآن کی آیت ہے۔ امیر المجاہدین نے پھر خطاب کیا اور یوں انھیں لاجواب کیا کہ ہمارا امیر کوئی نہیں کس واسطے کہ یہاں شرطیں امارت کی مفقود ہیں چھوٹی سی یہ بات ہے کہ بڑے صاحب موجود ہیں۔ یہ سنتے ہی دونوں صاحب کے باختہ ہوش ہوئے۔ امیر المجاہدین خاموش نہ

ہوئے بعض کہتے ہیں کہ مولوی خادم احمد صاحب نے یہ کہا کہ فرضیت جہاد سے ہم کو انکار نہیں بلکہ ہم نے ہی تو آپ سے بیعت کی تھی۔ بندہ بھی عازم ہے مگر بجا آوری حکم حاکم کی لازم ہے تھوڑے دن دیکھیے اگر بآسانی تعمیر خانۂ خدا ہوگی۔ مشرکین کو سزا ہوگی تو پاؤں پھیلا کے گھر میں سوئیے۔

نواب نے بھی ارشاد کیا کہ آپ اتنی جلدی ـــــ کیوں کرتے ہیں ہم کو آپ سے زیادہ خیال ہے واللہ کفار کی زیادتیوں کا بڑا ملال ہے مگر کیا کریں قابو نہیں "صاحب کلاں" سے مجال گفتگو نہیں۔ جب سے کلام اللہ کے جلنے کو سنا ہے دل کباب ہو گیا ہے کلیجہ بھنتا ہے لیکن آپ کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا کلام یاد نہیں دیر آید درست آید۔ آپ تھوڑے ہی دن تامل کریں روانگی میں تساہل کریں ہم حکمت عملی سے مسجد بھی بنوا دیں گے اور انتقام بھی بے ادبیوں کا لے لیں گے۔ اس بات پر امیر المجاہدین باوجود اصرار خلعت وغیرہ سے انکار کر کے نواب کو سلام کر کے معہ مجاہدین مسجد مقبرہ امجد علی شاہ میں بانتظار حکم نواب ٹھہرے۔

## امیر المجاہدین کا جوشِ جہاد

لیکن امیر المجاہدین کو عجب طرح کا جوش تھا اور ہر مجاہد بھی مئے اشتیاق جہاد سے مدہوش تھا ہر دم یہی چاہتے تھے کہ جس طرح ہو آپ کو فیض آباد اودھ میں پہنچائیں اور خدا کی راہ میں جو ہر شجاعت و جوانمردی دکھائیں۔

## شیعہ بھی امیر المجاہدین کے ساتھ تھے

حاجی بشیر الدولہ بہادر باایں ہمہ کہ مذہب اثنا عشری رکھتے تھے دن بھر میں دس گیارہ مرتبہ مزاج کی خبر منگواتے تھے۔ آٹھ پہر انہی کی خاطر داری میں رہتے تھے اور اکثر یہ کہتے تھے کہ خدا اسلام کی آبرو اور دین کی دھوم چار سو رکھے۔ اس خدا دوست کی عزت پر حرف نہ آوے۔ جو اس خستہ بجا نہیں حامی خدا کے سوا دوسرا نہیں گو اکیلا ہوں مگر اس بزرگ کے واسطے جان پر کھیلا ہوں اکثر خود تشریف لاتے تھے اور مولوی صاحب کی تسکین فرماتے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ ہاتھ میں ہاتھ دیا جائے اس امر دینی میں ساتھ دیجیے مگر چار و ناچار مسجد سے اٹھ جاتے تھے۔ ایسا ملال تھا کہ کچھ پیتے تھے نہ کھاتے تھے دنیا کے کام سے منہ پھیرا تھا۔ اس ملال سے آنکھوں میں اندھیرا تھا دو دو پہر اسی کا چرچا رہتا تھا۔ سلطان عالم سے بھی موقع پر ذکر آجاتا تھا لیکن نواب کے خوف سے

زبان دباجاتا تھاجیسا یہ ایک ہے اگر دو چار بھی اور ہوتے تو کاہے کو مسلمان مسجد کو روتے۔

## عبرت انگیز واقعہ

دہم ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ قدسی کو سرِشام مولوی خادم احمد صاحب کی آنت اتری عالم تہ وبالا ہُوا بہ نام رومال اور دوشالہ ہُوا۔ دم بدم مرض بڑھتا تھا دم چڑھتا تھا رگ رگ میں نیش غم تھا۔ آشنا خویش و اقربا نے دوڑ دھوپ میں کیا کیا نہیں لیکن مرض الموت کی دوا نہیں نہ نواب کام آئے نہ روپیہ پیسہ کام آیا جو کچھ کیا تھا سامنے وہ کام آیا ۱۲ تاریخ ظہر کے وقت بیک اجل کو لبیک کہہ کے سب کے سامنے کلمہ پڑھتے ہوئے سیدھے جنت الماوا کی راہ لی مورد رحمت الٰہی ہوئے گنہگار ہیں بے گناہ ہی ہوئے سب بکھیڑا پڑا رہ گیا حیرت کے عالم میں کوئی بیٹھا کوئی کھڑا رہ گیا۔ اس مرگ ناگہانی سے سب کو حیرانی ہوئی۔ عبرت کی نشانی ہوئی آخر جنازہ لے کے چلے۔ سینکڑوں آدم ماتم کرتا ہُوا ساتھ تھا کوئی نالہ و آہ کرتا تھا کسی کی زبان پر ہیہات ہیہات تھا ہندو مسلمان روتا تھا لیکن وہ بھی ذکر ہوتا تھا۔ ناچار نماز پڑھ کے پیوند زمیں کیا۔

## امیر المجاہدین کی دوبارہ روانگی

جب امیر المجاہدین کو مسجد میں بہت دن بسر ہوئے تعمیر مسجد کیسی نواب کو کبھی جھوٹ بھی دھیان نہ آیا کہ کسی کو ٹھہرایا ہے کیا وعدہ فرمایا ہے اور مجاہدین کا تقاضا شدید ہُوا جماعت قدیم کے سوا اور بھی بہت اہل اسلام بہ نیت جہاد آئے کہنے لگے ہم ایسے جھوٹے وعدوں سے بہت گھبرائے اب مناسب ہے کہ چلیے اس منحوس شہر سے نکلئے۔ ناچار مولوی صاحب نے رخصت کے باب میں اصرار کیا۔ اب یہاں ٹھہرنا بے سود ہے۔ دینداری کارگزاروں سے مفقود ہے مسجد کے نہ ہونے کا اب تک گمان ہے کیفیت اور مختصر مسلہ مولوی نہال الدین و مولوی حفیظ اللہ خاں ہے۔ بشیر الدولہ نے بھی کہا تعمیر مسجد ان لوگوں کے ہاتھ سے دشوار ہے حیلہ انگریزی ان کا شعار ہے چلیے انشاءاللہ تعالےٰ ہم بھی آتے ہیں بلکہ دیانت الدولہ بہادر کو ساتھ لاتے ہیں۔ گھڑی بھر میں گڑھی کو تاخت و تاراج کریں گے۔

## مولوی مسیح الزماں کا ایثار

قصہ مختصر نوزدہم ذیحجہ سن مذکور کو مولوی امیر الدین علی صاحب نے اسی شان و شوکت جاہ و حشمت سے نصر من اللہ فتح القریب پڑھ کر کوچ

کیا اور مولوی مسیح الزماں صاحب ایمان صاحب اپنا کارخانہ بنا بنایا بگاڑ کے دنیا سے دوں سے منہ موڑ کے بہ نیتِ خاص جہاد کان پور سے آئے تھے وہ بھی مولوی صاحب سے بیعت کر کے ہمراہ ہوئے۔ ان کی خوش بیانی اور شیریں زبانی سے گروہ مسلماں کا موج در موج آنے لگا لشکرِ اسلام دریا کی طرح لہرانے لگا۔ بائیں ترنگ یا اختتام قریب شام امیٹھی شریف میں داخل ہوئے وہاں سے بھی بہت مسلمان لشکر میں شامل ہوئے شب کے شب آرام کر کے بفضل خداوند کریم بخط مستقیم فیض آباد کو راہی ہوئے۔

**حکم امتناعی**

۱۲ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ تھی کہ اہلکاران سرکاری کو اجازت ملی کہ جاؤ اور مولوی امیر الدین علی صاحب کو لاؤ آگے بڑھنے نہ پائیں ہنومان گڑھی پر چڑھنے نہ پائیں کسی طریق سے راہ بیں روکو چنانچہ میر صفدر علی اور رمضان علی ان کی نائب اور درسن کا بیٹا نصرت جنگ نواب کا مصاحب اور محمد تہور خاں بہادر رسالدار اور میر محمد حسین کلکٹر سحر گفتار اور شیخ حسین علی کارندہ نواب علی خاں محمود آباد اس عہدے پر معمور ہوئے۔

**ناحق چوٹ جولاہا کھائے**

سرکاری لوگوں پر لشکر اسلام کا ایسا رعب چھایا مارے ڈر کے کوئی فوج محمدی کے گرد نہ آیا سب ٹھٹک کر رہ گئے۔ محمد حسین کلکٹر اور تہور خان اور شیخ حسین علی وغیرہ بڑے بڑے تھے نہ جا سکے۔ لشکرِ اسلام سے دور مقام کیا کسی اور کی معرفت پیغام سلام کیا۔ اگر اجازت ہو تو ہمیں بھی آپ کی زیارت سے سعادت ہو یہ لوگ تو اسی نگر میں ہے وہ جو مثل ہے ناحق کی چوٹ جولاہا کھائے کر گہ چھوڑ تماشے جائے صادق ہوئی۔ رمضان علی اور عامل نواب گنج کہ وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہو گئے تھے۔ یہ دونوں آگے بڑھے غازیوں کے منہ چڑھے چاہا کہ امیر مجاہدین سے ملاقات کریں۔ لوگوں نے آنے نہ دیا آگے قدم بڑھانے نہ دیا۔ جب امام المجاہدین سے اجازت ملی ہتھیار سب کے لے لیے۔ یہ سب نہتے روبرو پہنچے جس دم مولوی صاحب سے گفتگو روبرو ہونے لگی دم تقریر کڑے کلمے زبان پر لائے کہ سبحان اللہ آپ دو تین سو جولاہے لے کے گڑھے کھودنے چلے ہیں۔ خوب حوصلے ہیں وہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ الّوؤں کی طرح جان دے دو گے اور کیا ہوگا اسلام کا ضعف عیاں ہوگا بُرا ہوگا اتنا کہنا تھا کہ آفت آئی بعض کہتے ہیں کہ سوائے ہشت و مشت کے زد و کوب کی نوبت

آئی۔ آخر کو ذلیل و خوار ہوئے دونوں آدمی گرفتار ہوئے۔

## نئی چال، نیا جال

القصہ بانی فتور جب مجبور ہوئے تو عذر کرنے لگے دل میں بغاوت ظاہر میں رفاقت کا دم بھرنے لگے کہ ہم لوگ ملازم سرکار ہیں لیکن ایمان سے آپ کے تابعدار ہیں، سرکار فیض آثار کو منظور ہے کہ آپ، ایک مہینہ اور تامل فرمائیے۔ اگر اس مدت میں مسجد تعمیر ہو گئی فہو المراد ورنہ بے تکلف فیض آباد کو جائیے اور ایام موعودہ تک آپ جماعت کے ساتھ سہالی یا نیچ پور میں بسر کریں۔ جو کچھ کھانے پینے میں آپ کے صرف ہوگا وہ سرکار سے ملے گا اور ہم بھی عہد کرتے ہیں، بلکہ قرآن مجید پر ہاتھ دھرتے ہیں کہ اگر اس میعاد کے اندر مسجد نہ بنوائی تو انشاء اللہ ہم بھی آپ کے شریک حال شامل جدال وقتال ہوں گے۔ جب ان سب نے کئی دن تک بہت باتیں کیں اور ایسی غلط قسمیں کھائیں تب سلطان المجاہدین بھی سمجھے کہ حاکم سے لڑائی ضرور نہیں اور مہینہ کچھ دور نہیں بعد جینے کے سمجھیں گے پھر ایاں سرکار کیا کہیں گے یہ سوچ کے حسین علی کے ساتھ سہالی میں کہ ملا قطب الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ کا مدفن ہے رونق افروز ہوئے مشغول عبادت خدا شب و روز ہوئے اور مولوی مسیح الزماں صاحب تہور خاں کے ساتھ لکھنؤ میں تشریف لائے اور انھیں کے ساتھ دو چار بار نواب کی خدمت میں گئے آئے۔ نواب نے تعمیر مسجد کے باب میں ایسے کچھ ڈھے کیے کہ مجھے تقریر سابق تو فقط چرب زبانی جھوٹی کہانی تھی آخر مولوی تراب علی صاحب اور مولوی حسین احمد صاحب اور مولوی عبدالرزاق صاحب سے ملاقات کر کے چلنے پر سب کو آمادہ کیا آپ سہالی کا ارادہ کیا۔

## راجہ مان سنگھ کے جاسوس

سہالی میں ایک روز تین فقیر بھیک مانگتے ہوئے دستہ فوج اسلام کی طرف سے گذرے۔ غازیوں نے قرائن سے دریافت کیا کہ یہ زنار دار ہوتے ہیں دشمن ہمارے ہیں غازی کا جامہ پہنے ہیں۔ اس گمان سے ان بت پرستوں کو تنگ پکڑا اور تازیانہ کی مار مار ناشرو ع کیا، مار سے بھوت بھاگتا ہے اور لکڑی کے بل بندر ناچتا ہے جب خون کے فوارے بدن سے نکلنے لگے تب ہاتھ باندھ کے کہنے لگے ہم راجہ مان سنگھ کے نوکر ہیں خفیہ اخبار پر مقرر ہیں جیسا کیا تھا ویسا بھر پایا اب اگر آپ سے مخلصی پائیں گے ترقی جماعت کی دعا مانگتے چلے جائیں گے۔ اس کی خبر امیر المجاہدین کے گوش زد ہوئی فرمایا کہ کان مروڑ دو اور چھوڑ دو ہمارا خدا مددگار ہے راجہ مہاراجہ کیا نابکار ہے۔

**مسیح الزماں کی بے وفائی**

اب کی بار مولوی مسیح الزماں بعد ملاقات اہالیان سرکار جب سہالی بن گئے خدمت فیض درجت میں کچھ عجب حالت اور کیفیت میں پہنچے۔ ظاہر میں تو باطن میں خلاف ہونے لگے۔ مجاہدین کو بہکانے لگے۔ نفاق کی باتیں کرنے لگے۔ اپنا گروہ الگ جمایا لیکن وہ لوگ سیدھے سادے مسلمان جلد ہوشیار ہو گئے۔ آخر جب ان کو بالکل بہکا ہوا پایا تب یہ مشورہ ٹھہرا کہ لشکر اسلام سے خارج کرو۔ پھر ان کا نام نکلوا اپنا سامنہ لیے چلے آئے۔ سبحان اللہ وبحمدہ مسیح الزماں کا وہ آغاز تھا کہ مدار المہام لشکر اسلام مشہور ہوئے۔ انجام یہ ہوا کہ لوگ نفرین کرنے لگے یہ بھی نمک حرام مشہور ہوئے۔

**مولوی تراب علی و مولوی عبدالرزاق**

جب مسیح الزماں کی بگڑی کی خبر مولوی تراب علی صاحب اور مولوی عبدالرزاق صاحب کو پہنچی کہ وہ اسی نیت سے سندیلہ کو تشریف لے گئے تھے۔ گو ابھی تک سامان درست نہ ہوا تھا لیکن سیدھے سہالی کو روانہ ہوئے پھر تو مجاہدین کو بڑی تقویت ہوئی بہت قوت ہوئی اور اکثر مسلمان ان صاحبوں کے باعث شریک لشکر اسلام ہوئے۔ جو کوئی سنتا تھا کہ ہمارے پیشواؤں نے حکم نفیر عام دیا ہے اور بقصد اودھ سہالی میں مقام کیا ہے چلنے کا سامان کرتا تھا اور جو کوئی جانے سے معذور تھا مگر زردار صاحب مقدور تھا وہ سلاح وغیرہ اسباب حرب حاضر کرتا تھا یوں تسکین خاطر کرتا تھا جس وقت ایام موعودہ میں دو ہی ایک دن کا باقی زمانہ رہ گیا۔ امیر المجاہدین نے مولوی تراب علی اور مولوی برہان الحق وغیرہم سے کہا کہو اہالیان سرکار کو اب کیا عذر باقی رہا وہ ٹالتے ہیں خواہ مخواہ بیسے نکالتے ہیں۔ آمد سرما ہے ٹھنڈی ہوا ہے۔ صاحبو ہم تو بسم اللہ کرتے ہیں ان لوگوں کو عذر تھا تابعدار تھے سب کے سب کہنے کے ساتھ ہی تیار تھے۔ تاریخ روانگی مقرر ہوئی تیاری لشکر ظفر پیکر ہوئی۔

**طفل تسلیاں**

جب خبر کوچ مشہور ہوئی پھر یہاں کے حکام کو اضطرار ہوا امیر المجاہدین کے توقف میں اصرار ہوا پہلے اودھ مان سنگھ کو فیض آباد اودھ کی طرف روانہ کیا کہ جلد جائے مسجد بنواؤ اور اگر کچھ مسجد کی اثبات میں شبہ ہو تو مہنتوں کو در دولت پر روبکاری کے واسطے لاؤ۔ غرضیکہ زبانی جھوٹ موٹ تہدید کی اور دھمکایا اور ایک دوشالہ رومال بیت بھاری منگا کے اوڑھایا اس نے بھی جی میں کہا بلو مفت میں گھاگرہ اشنان کرو حضور عالم کی مہربانی ہے، لطف زندگانی ہے اب کی اگر آؤں گا تو ایک دو مہنت کو بھی ساتھ لیتا

آؤں گا کیا نقصان ہے میرا حامی ہنومان ہے۔ ایسی احمق سرکار کہاں ملے گی عین غصہ میں تو دوشالہ رومال عنایت ہوا ہے ہنگام سرفرازی شاید حکومت ہندوستان مٹے گی اور ادھر افسران فوج کو حکم ہوا کہ پھر مولوی امیر الدین علی صاحب کی خدمت میں جاؤ اور بکمال تملق و چاپلوسی سمجھاؤ جس طرح بن پڑے متوقف کر دو یہاں تک کہ سر بھی ان کے قدموں پر دھر دو کہو کہ اب عزاداری محرم سے فراغت ہوئی ہے ماتم امام علیہ السلام سے فرصت ہوئی ہے تعمیر مسجد میں خوب اہتمام ہوگا ایک دم نہ آرام ہوگا بعض افسروں نے بلطائف الحیل جانے سے انکار کیا۔

## امیر المجاہدین کی مصالحت پسندی

اگر بعض افسر سپاہی کو پہنچے معاذ اللہ گویا غازیوں کی گوشمالی کو پہنچے لیکن اجازت حضوری امیر المجاہدین امام الانام حاصل نہ ہوئی بکمال عرض و معروض محمد منور خاں بہادر رسالدار اور مرزا قدرت اللہ بیگ چکلہ دار اور میر محمد حسین کلکٹر اور شیخ حسین علی کا زمرہ نواب علی خاں کو روبرو بلوایا اور کہا اب کیا ہے جواب دیا کہ اگرچہ مقتضائے حمیت نہ تھا کہ آپ کی خدمت میں آتے اور پھر منہ دکھلاتے لیکن کیا کریں تابعدار ہیں حاکم کے فرمانبردار ہیں کیا مشکل ہے اگر آتے ہیں تو آپ سے شرماتے ہیں ورنہ روزگار سے جاتے ہیں اب پھر نواب صاحب بہادر نے آپ کو پیغام دیا ہے اور یہ عذر پیش کیا ہے کہ یہ مہینہ ماہ ماتم فرزند رسول مقبول تھا ہم عزاداری محرم میں مشغول تھے انشاء اللہ تعالیٰ اب تھوڑے توقف میں بہت کام بن جائے گا بے تامل خانہ خدائے ذوالجلال والاکرام بن جائے گا چنانچہ مان سنگھ کو سوئے اودھ بھیجا ہے اگر وہ مسجد بنواتا ہے تو بہتر نہیں تو ہم ہنمنتوں کو دلاتا ہے کما ینبغی روبکاری ہوگی بہر حال مسجد کی تیاری ہوگی اب ہرگز تامل نہ ہوگا اس امر میں کسی طرح سے تغافل نہ ہوگا۔ آپ کو بھی مناسب ہے کہ مولوی برہان الحق صاحب اور مولوی عبدالرزاق صاحب اور مولوی تراب علی صاحب کو بطور رسالت و سفارت روانہ فرمائیے۔ اب کہیں نہ جائیے ان کے سامنے بخوبی روبکاری ہوگی عیاں کیفیت ساری ہوگی۔ غرض ایسی کچھ باتیں بنائیں نشیب و فراز کی صورتیں دکھائیں کہ امیر المجاہدین نے ان کی گفتگو بظاہر مصلحت آمیز و بباطن فتنہ انگیز سن کے توقف کیا اور تینوں مولویوں کو فقط پانچ دن کے وعدے پر مع عرض کے روانگی کا حکم دیا۔

## چار ثالثوں کا واجد علی شاہ کی طرف سے تقرر

۲۷ تاریخ محرم الحرام ۱۲۷۱ھ [illegible] لشکر اسلام سے مقام لکھنؤ میں داخل ہوئے دربار لول

میں شامل ہوئے دیا ایک مہنت بھی حسب الطلب آئے اور نواب نے احمد علی خاں اور مولوی غلام بیلانی اور مولوی غلام امام شہید اور مولوی فضل حق خیرآبادی چار ثالث مقرر فرمائے۔

**مہنتوں کے ساتھ شاہی سلوک**

لیکن عجب یہ ہے کہ ایک دن بھی دکلائے اسلام اور مہنتوں کی اروبکاری پر مواجہ نہ ہوا۔ نواب صاحب نے کچھ بھی خیال نہ کیا کہ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں کس کا پیغام لائے ہیں بلکہ مہنتوں کی توقدر بھی ہوئی صوبہ سنگھ کپتان کی لین میں جگہ رہنے کے لیے ملی۔ انھیں کے تلنگے حفاظت کے واسطے مقرر ہوئے۔

**پھر حرپہ کاریا**

ظاہرا یہ پنچایت وغیرہ ٹھہرنا فقط ایام گذاری تھی مسجد بنوانا کسی طرح منظور نہ تھا چاہتے تھے کہ یہاں تک مولوی صاحب کو روکیے کہ جماعت ٹوٹ جائے۔ مسیح الزماں کو دوں چھڑالیا علماء کو وکالت کے بہانے سے بلالیا اب کیونکر جماعت کم نہ ہوگی۔ الغرض دروغ گو را حافظہ نباشد نہ پنچایت ہوئی نہ مسلمانوں کی حمایت ہوئی دلائے لشکر اسلام بھی نواب کی عدم توجہی دیکھ کے تھک کر بیٹھ رہے۔ پانچ دن کا وعدہ کر کے آئے تھے کئی ہفتے گذر گئے مگر یہ نہ سوئے لشکر ظفر پیکر گئے، حاکم کے خوف سے دل کچ ہوئے بعض اشخاص برملا کہتے تھے کہ یہ لوگ اس بہانے آئے ہیں ان کا جانا دشوار ہے۔ یہیں سے بہ عذر کے گھوڑے دوڑائے گئے نامہ و پیام سے امیر المجاہدین تسکین فرمانے لگے۔ شنبہ کو لشکر اسلام نے سہالی سے کوچ کیا۔ زمین تھراتی تھی ہاتھی پر لشکر کا نشان ہم پہلوئے آسمان شان و شکوہ کوئی پیادہ کوئی سوار مگر بے شمار کوئی اپنا گھوڑا کو داتا تھا کوئی پیادہ پوئی ہیں مارے جرأت کے اکڑا جاتا تھا اطلب گاہ میں سلطان المجاہدین کی پالکی نشانی اقبال کی آگے آگے کے دلایتوں کے غول بطور نقیب قصائد مدح رسول الثقلین امام القبلتین پڑھتے چلے جاتے تھے کس ملاحظہ اور ادب سے قدم بڑھاتے تھے۔

**مجاہدین کی دہشت**

اجب شان و شوکت لشکر اسلام کی خبر یہاں عام ہوئی گھر گھر بھنبھی کشتی لکھنؤ کی اطلاع دانی ہوئی۔ ہندوؤں کے ہوش باختہ ہوئے بدحواس سب الو کی دم فاختہ ہوئے بغلیں جھانکنے لگے۔ حاکم سے رعایا تک ہر بشر دردمند ہوا ایسا اندھیرا ہوا کہ پہروں سے مراقبہ ہو کوتوال پر تہدید ہوئی تاکید شدید ہوئی کہ شہر سے خبردار رہنا اپنے کام سے ہشیار رہنا لٹ جانے کا ڈر ہے

**بادشاہ کا اضطراب**

اگر صبح کو خبر آئی کہ ہزار مجاہد جرار ہیں تو شام کو پرچہ لگا کہ دو ہزار ہیں تب تو نواب کو کمال اضطراب ہوا کہنے لگے کہ یہ گھر خراب ہوا اب یہ انبوہ کب رکے گا۔ صفائی ہو جائے گی۔

**بادشاہ کی مجتہدوں سے گفتگو**

آخر اسی اضطراب میں طرفہ تدبیر عقل میں آئی یا کسی استاد نے سمجھائی کہ مسئلہ جہادیہ میں اختلاف ہے۔ آپ یوں بکھیڑا مول لیتے ہیں عالموں کو کیوں نہیں حکم دیتے ہیں وہ ابھی چلے جائیں سب کو پھیر لائیں۔ یہ سنتے ہی نواب بحال ہو گئے دور سب ملال ہو گئے۔ پہلے نواب نے سلطان العلماء سید محمد اور سید العلماء میرن صاحب دونوں مجتہدوں کو بلوایا اور فرمایا کہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ باعث فروغ مذہب اثنا عشری خاندان ابوالمنصور خان مرحوم ہے نیز اجتہاد اسی خاندان سے چمکا ہے یہی خاندان سبب تمہاری جاہ و حشم کا ہے خصوصاً سعادت علی خاں کی اولاد نے تمہیں مرجع بنایا ہے۔ امجد علی شاہ نے تمہارا رتبہ بڑھایا ہے اگر یہ گھر نہ ہوگا تو آپ کو یہ رتبہ میسر نہ ہوگا آپ اس گھر کو مٹاتے ہیں مولوی امیر الدین علی صاحب کو رغبت جہاد دلاتے ہیں۔ لوگ آپ کی تحریض اور ترغیب سے چلے جاتے ہیں اب آپ کو مناسب ہے کہ جائیے اور مولوی امیر الدین علی صاحب کو پھیر لائیے مجتہد نے تخلیہ کر کے جواب دیا کہ لاحول ولا آپ کا کیا خیال کدھر ہے شاید کلام عوام پر نظر ہے ہمارے نزدیک ہنود اگرچہ بت پرست ہیں لیکن ذمی مطیع الاسلام ہیں۔ خروج ان پر روا نہیں مذہب امامیہ میں بدوں امام جہاد جائز نہیں۔ لیکن اگر ہم منع کرنے جائیں کلمات افہام و تفہیم زبان پر لائیں گمان کیا ظن غالب ہے کہ مبادا مضمون دستخط سے آگاہ ہو جائیں اور ہمیں کو ہدف تیر جہاد بنائیں۔ اس صورت میں آپ بدنام ہوں گے مطعون خاص و عام ہوں گے مناسب ہے کہ علمائے سنت و جماعت کو افہام کے واسطے روانہ کیجئے۔

**علماء آلۂ کار بنائے گئے**

غرض نواب کو ایسا معقول کیا کہ انھوں نے بلا عذر قبول کیا اور اسی وقت سب عالموں کو حکم پہنچا کہ جلد جاؤ اور جس صورت سے ممکن ہو اس فتنہ کو مٹاؤ تمہارے واسطے بہت فروغ ہوگا۔

یہ حکم سنتے ہی ان لوگوں کے دل کی کلی پھول گئی۔ علماء کو خدا کی کتاب پیغمبر اسلام کی حدیث بھول گئی کتابیں کھلیں روایات ضعیفہ کے لیے، ورق الٹنے لگے، جناب مولوی سعد اللہ صاحب اور جناب مفتی محمد یوسف صاحب مدظلہما نمک خوار سرکار تھے جیلۂ شرعی بھی بھولے حکم کے ساتھ تیار تھے مگر ان لوگوں کو دیکھیئے جن کو کسی طرح کا تعلق سرکار سے نہ تھا زیادہ ان سے اصرار نہ تھا۔ سلطان المجاہدین سے ملاقات کا پیغام کیا حسب الطلب دونوں مفتی صاحبین اور مولوی حسین احمد صاحب اور مولوی ابوالحسن صاحب بھی لشکر اسلام میں رونق افروز ہوئے اور ملازمت امیر المجاہدین کو نذر دی اور زبان ثنا و صفت میں کھولی کہ سچ تو یہ ہے کہ آپ نے اس زمانہ آخر میں اسلام رکھ لیا دین محمدی کا نام رکھ لیا۔ ایسا صاحب ہمت اولوالعزم کہاں ہے۔ ایسی دو چار باتیں سنا کے خلق خدا کو رام کیا اپنا کام کیا کہ ہم کو آنے کی غایت نہ تھی مطلق حاکم کی رعایت نہ تھی لیکن بقول شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است

اگر خاموش بنشینم گناہ است

حاکم سد راہ ہے نرغہ کیے سرکار کی سپاہ ہے اور یہ بھی عیاں ہے کہ فوج حاکم آپ سے زیادہ ہے ادھر پچاس ساٹھ ضرب توپ تیار گولنداز مستعد ہوشیار آپ کی طرف ٹوٹی پھوٹی دو چار بندوقیں جو کبھی نہیں۔ اس وقت میں واجب بلکہ فرض ہے کہ اوس کو نہ جانے ہیں عزیمت فرمائیے اور اگر خواہ مخواہ تصد کوچ کا کریں گے اور غازی فوج سرکاری سے لڑ کے مریں گے۔ اس صورت میں ثواب کہاں ہے۔ اگر آپ کو اس کا خیال ہو کہ ہم اور مولوی محمد یوسف ملازم سرکاری ہیں پابند دنیاداری ہیں تو مولوی ابوالحسن صاحب اور مولوی حسین احمد صاحب کسی طرح کا سرکار سے سروکار نہیں رکھتے ہیں۔ دولت دنیا پر مدار نہیں رکھتے ہیں۔ دنیا سے ناراض ہیں دونوں صاحب مرتاض ہیں ان سے احقاق حق کیجیے پھر نہ انکار مطلق کیجیے وہ دونوں صاحب بھی مصدق کلام ہوئے۔ امیر المجاہدین نے بھی مناسب وقت کے جواب دیا۔ اس گفتگو کے بعد صحبت برخاست ہوئی۔

**عوام میں ہلچل** اس وقت لشکر اسلام میں کچھ صورت اور ہوئی ہلچل فی الفور ہوئی بلکہ کچھ غازی لشکر اسلام سے اٹھ کے عالموں کے پاس آئے علماء کی خلاف آسمان تک غل گیا۔ عقیدوں کی دینداری کا پردہ

صاف کھل گیا اس پر بھی مفسدوں کو قرار نہ آیا زیادہ فتور بڑھا یا مسلمانوں کو تعمیل فتوے دستخط علماء پر راضی کیا۔

## فتوے پر علماء کے دستخط

زور ہے علماء پر ایسا کیا گیا کہ سب دستخط پر آمادہ ہو گئے مفسدوں کی بن آئی جب یہ مضمون حسب دل خواہ بندھ گیا تب ان منافقوں نے جو سرکار سے محض فتنہ انگیزی اور تفرقہ پردازی کو جمع ہو کے مامور ہوئے تھے بظاہر جبہ خرقہ عبا اور قبا اوڑھے اسلام کے لیے ایک مسودہ فریب آمیز گانٹھ کے استفتا کیا۔ مفتیوں نے بے تکلف صاف صاف ازراہ خلاف دستخط کر دئے۔

## استفتا اور فتویٰ

بادشاہ باعث فساد حاکم بالادست مجبور شدہ براہ مصلحت چند ایام منع روانگی مے فرماید دریں حال اگر مولوی امیر الدین علی صاحب کوچ سازند و مقاتلہ و مجادلہ از مجاہدان و افواج سلطان اسلام بوقوع آید پس مرگ مسلمانان طرفین چگونہ خواہد بود؟ **جواب**

دریں حال جماعت مولوی امیر الدین علی را ہرگز قتل روا نیست بل در نہی قولہ تعالیٰ

داخل شدنست کذا فی العالمگیر و کتبہ محمد سعد اللہ عفی عنہ فی الواقع فسخ عزیمت ببایدو در شہادت وغدغہ است۔ کتبہ محمد یوسف صح الجواب حررہ حسین احمد صح الجواب کتبہ بخطہ عبید اللہ۔ اگر از حاکم بالا دست انتزاع سلطنت و اجرائے کلمۃ النصاریٰ بظن قوی متصور متیقن باشد بحکم آنکہ من ابتلی ببلیتین فاللازم علیہ ان یختار اہونہما وما کان تحت الامر ماجور و مثاب واللہ اعلم بالصواب وعلیہ التکلان حررہ انقر العباد ابوالحسن عفاعنہ۔ سب علماء کی عبارت اسی قسم کی ہے کہ خوف حاکم سے معمہ کر دیا ہے۔

## نہایت دلچسپ مادۂ تاریخ

انھیں عالموں کی شان میں تاریخ ہے کہ لاتشتروا بآیات اللہ ثمناً قلیلا اس ترکیب سے کہ تشتروا کے تحت لا ہیں واقع ہے بحکم لا مادہ تاریخ سے خارج ہوا اور لاشریک اعداد تاریخ ہوا۔

## ایک اور دلچسپ مادۂ تاریخ

کسی نے مفتی اور مولوی برہان الحق صاحب اور مولوی تراب علی صاحب اور مولوی عبد الوالی صاحب کی بھی شان میں کہ ہر چند نواب نے شل اور علماء کے بلوایا اور کہا بھیجے کہ مولوی امیر الدین علی صاحب کے پاس جا کے افہام و تفہیم کرو مگر اپنی حق پرستی

سے نہ گئے تاریخ کہی ہے کہ لاتشتروا بآیات اللہ ثمناً قلیلا اسی ترکیب کہ یشترون کہ تحت لائیں واقع ہے۔ وہ تاریخ سے خارج ہوا اور لاترکیب اعداد ہو اور لطیفہ اس میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ صیغہ نصائح کا فرماتا ہے کہ یہ لوگ۔ وہ ہیں کہ نہیں لیتے ہیں میری آیتوں کی قیمت بصیغہ مضارع کا حق پرستی پر دلالت کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ بکمال خوشی سے ان کی منت کی حکایت کرتا ہے بخلاف صیغہ نہی کے۔

**فوج شاہی در غلانے میں آگئی**

شور و غوغا پڑ گیا چاروں طرف ایک تہلکہ پڑ گیا کہ شہادت نہیں دغا ہے یار اس لڑائی میں دغا ہے ناحق ناروا جان دینی گوارا نہیں کیا قول علماء سے چارا نہیں۔ شہادت کے لیے جان و مال نوکری چاکری سے ہاتھ اٹھایا تھا خوب موقع ہاتھ آیا تھا اگر اس معرکہ میں شہادت نہیں تو ہمیں لڑائی کی حاجت نہیں ہم عالموں سے اپنی تسکین کر چکے ہیں۔ ان کے کہنے پر یقین کر چکے ہیں قصہ کوتاہ فوج شاہی صاف امیر المجاہدین سے پھر گئی جہاد کی عظمت دراشک کی طرح نظروں سے گر گئی۔ علماء نے بھی وہاں سے آ کے اپنے اپنے گھر کو آباد کیا حضور عالم بہادر کے دل کو شاد کیا۔

**عوام پر علماء کی غلط کاری کا ردِ عمل**

یہاں عجب طرح کا معاملہ علماء کے پیش آیا۔ کسی نے زبان طعن اور تشنیع کھولی کسی نے قصیدہ ہجویہ میں کہہ کے اکبری دروازہ میں لٹکا دیا۔ اب یہ حال ہے کہ جدھر نکلیے ہجو علماء کی نظر آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عالموں کی پتھر کی چھاتی سنتے ہیں اور خاموش ہیں۔ دوسرا ہوتا زہر کھا کے مرجاتا۔

**جوشِ جہاد پر کوئی اثر نہیں پڑا**

مگر شکر خدائے عز و جل کہ تفرقہ جماعت کی بڑی بڑی تدبیریں ہوئیں کیا کیا تحریریں اور تقریریں ہوئیں اگر ایک بہکانے سے لشکر اسلام سے اٹھ جاتا ہے تو دوسرا آتا ہے جماعتِ مجاہدین بدستور ہے اور ہر دم زبان پر یہ مذکور ہے کہ اودھ کا چلنا ضروری ہے۔ وہی کثرت جماعت ہے وہی شان و شوکت ہے نامرد جان کے خوف سے چلے جاتے ہیں۔ کھٹکا اتنا ہے کہ فوج شاہی گھیرے ہے۔ لشکر اسلام کی طرف توپیں پھیرے ہے لیکن ان جوانمردوں کو کچھ خیال نہیں جینے کی خواہش

مرنے کا ملال نہیں ہر روز تیاری ہے اور لب پر یہ کلمہ جاری ہے کہ جب اس لشکر نے سیلاب دار کوچ کیا فوج شاہی کائی کی طرح ہٹ جائے گی۔ ایک کنارے ہٹ جائے گی۔ لشکر اسلام موجیں مارتا لہراتا چلا جائے گا ڈنکے کی چوٹ پر بر ملا جائے گا اور اگر فوج شاہی لڑے گی تو آفت میں پڑے گی۔ غرض جو مشیت ایزدی میں ہوگا وقوع میں آئے گا بے کم و کاست لکھا جائے گا۔

ان اللہ قریب من المحسنین۔

**کوچ کا فیصلہ** ۲۰ صفر المظفر ۱۲۷۲ھ روز پنجشنبہ معلوم ہوا کہ شب کو مولوی امیر الدین علی صاحب نے فرمایا کہ علی الصباح بعد نماز فجر جانب ردولی کوچ ہے۔

لشکر اسلام میں تیاری ہونے لگی۔ تدبیر بار برداری ہونے لگی۔ یہ خبر جو افسران شاہی کو پہنچی گھبرا گئے۔ امیر المجاہدین کی خدمت میں حاضر ہو کے عذر کیا کہ ابھی کوچ واجب نہیں خلاف رائے حاکم مناسب نہیں چندے اور تامل کیجیے تھوڑا اور تساہل کیجیے۔ مخدوم الانام نے فرمایا یہی حکم سنتے سنتے کئی مہینے گذر گئے۔ اب ہم رکنے کے نہیں۔ تم بھی اگر ایمان رکھتے ہو تو ہمارے ہاتھ میں ہاتھ دو کامرانی ہے ہمارا ساتھ دو ہمارے تمھارے درمیان بھی عہد و پیمان تھا بلکہ قرآن درمیان تھا اگر تم بھی اپنے عہد پر مستقیم نہیں تو جو حکم تمھارے حاکم کا ہو بجا لاؤ توپیں سر کرو بندوقیں سر کرو لشکر اسلام کی خوں ریزی پر شوق سے آمادہ ہو۔

**امیر المجاہدین کا نعرہ** جب صبح نمودار ہوئی اور فوج محمدی چلنے کو تیار ہوئی امیر المجاہدین نے بعد فراغت نماز فجر کمال تاسف سے ایک نعرہ اللہ اکبر کا کیا آگاہ سب اہل لشکر کو کیا پھر تو یہ حال تھا کہ تمام لشکر کہتا تھا کہ یا اللہ تجھ سے فریاد کرتے ہیں ہم برسر حق ہیں ہم پر یہ ناحق بیداد کرتے ہیں۔

**امیر المجاہدین کی شرائط صلح** آخر لشکر اسلام روانہ ہوا۔ افسران سلطانی نے بہزار منت اور عذر خواہی دو تین دن کی رخصت چاہی۔ خصوصاً تہور خان بہادر نے خدمت سراپا افادت میں عرض کیا کہ حکام کو بہر حال قتل لشکر اسلام منظور

ہے اور آپ کو اُدھر جانا ضرور ہے کوئی صورت ایسی فرمائیے کہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔
کسی طرح جان عذاب سے چھوٹے۔ مخدوم الانام نے کہا کہ آپ ہی تصور کیجئے کہ میرا بے جا سوال نہیں ہیں طالب ملک، و مال نہیں اتنا چاہتا ہوں کہ ایک آدمی نواب کا اور ایک اس خادم رسالت مآب کا ہمراہ گڑھی تا ہیں چلا جائے۔ مسجد قدیم پر فقط ایک مسجد کا خط کھینچ کر اذان کہہ کے نماز پڑھ آئے پھر شیخ کو دعوی نہ رہے گا۔ بہ مجمع اصلاح رہے گا اور اگر نواب کو یہ بھی نامنظور ہو تو وہ جب تک کہیں کے ہم یہاں رہیں گے مگر امداد مصارف وغیرہ ہو اس امر میں نہ کوتاہی ہو اور اگر یہ بھی خلاف ہو تو کہنا کہ ہم اپنے لشکر کے ساتھ عیش باغ میں مقام رہیں گے دو مہینہ اور خاطر داری لشکر اسلام کریں گے۔ اس مدت میں ایسی تدبیر ہو کہ مسجد تعمیر ہو جب مسجد بن جائے گی ہم جدھر چاہیں گے چلے جائیں گے۔ ان کے ملک میں بھی نہ آئیں گے۔

**بادشاہ کی بے پروائی**

تہور خاں مولوی صاحب کے کلام نیک انجام سن کے بہت خوش ہوئے۔ ابھی جاتا ہوں اور نواب کو سمجھاتا ہوں۔ غرض دو تین دن کا وعدہ کر کے یہاں آئے۔ ہر چند چاہا کہ نواب صاحب متوجہ ہو کے حال سنیں اور کوئی صورت نکالیں انھیں خون ناحق سے مطلب تھا ایسی باتوں کا خیال کب تھا۔ وہ بیچارے دو دو پہر امین تیل و قال میں رہے نواب صاحب مست اپنے حال میں رہے۔ نوبت ملاقات کی بھی نہ آئی اور اگر اچانک ملاقات ہو گئی نواب صاحب نے توجہ نہ فرمائی۔ آخر وہ بھی خون جگر پی کے خاموش ہوئے۔ ندامت سے روپوش ہوئے۔ اسی ہنگام میں اور افسروں نے وزیر اعظم کو عرضداشت کی کہ امیدوار ہیں کہ حکم قطعی لکھا جائے کہ ہر فدوی بجا لائے۔

**حکومت کی چال**

پہلے یہ حکمت کی کہ فوج شاہی میں جو اہل اسلام تھے مثل پلٹن علی خواں اور پلٹن عسکری وغیرہ انھیں برخواست کر لیا فقط کفار کو قتل کے واسطے چھوڑ دیا کہ مبادا مسلمانوں کو حرارت آجائے۔ مگر وہ مسلمان جو ہندؤں سے بدتر تھے خواہ پیادے تھے خواہ افسر تھے انھیں بدستور رکھا چنانچہ شیخ حسین علی جو بالفعل اس فوج ستم کے کمکر تھے اور

ظالموں کے رہبر تھے اور رجب خان شمر کا نشان گلابی پلٹن کے زرد رو سالار عمر سعد کی نجس یادگار اور فرزند علی امام علی داروغہ توپ خانہ کے خونخوار زمانے کے وہیں رہے اور بارلو انگریز کو یہاں سے مامور کیا۔ خوفِ خدا دل سے دور کیا۔

**وزیر اعظم کا حکم نامہ** جب یہ سب انتظام ہو گیا قتل کا سرانجام ہو گیا تب بجواب عرضی افسران یہاں سے وہ حکمنامہ جاری کیا جس کے مضمون قتل شبخون نے عالم کو مشغول گریہ وزاری کیا کہ مولوی صاحب نے باوجود فہمایش ہمارا کہنا نہ مانا فساد کو مصلحت جانا خون ریزی پر تیغ و سپر باندھی۔ اب جس وقت کوچ کا قصد کریں ایک بھی قدم آگے دھریں، تو بے تکلف توپ سے اڑا دینا۔ اس خیر خواہی کے عوض انعام اور خلعت ملے گا۔

**بے وفائی مردماں ہمراہی امیر المجاہدین** جب اس طرح کا حکم قطعی آیا بے غیرتوں نے شرم کا پردہ اٹھایا افسران فوج شاہی کمال دلیر ہوئے خصوصاً بارلو انگریز اور شیخ حسین علی گرگ باران دیدہ اس خون بے گناہ پر نہایت شیر ہوئے لیکن ہیبت لشکر اسلام دیکھ کے فوج کو قلیل پایا۔ تب ان مکاروں کے دل میں خیال آیا کہ تفریق جماعت کی تدبیر کیجیے۔ اپنے ساتھ مولوی محبوب علی اور مولوی محمد شاہ کو لیا ان ظالموں نے سب سے بڑھ کر ظلم کیا ایسا دام مکر بچھایا۔ دانا دانا مجاہدین کو بہکا دیا کہ لوگ اس بھیڑ سے چھٹنے لگے معرکہ سے قدم پلٹنے لگے جس کو مفلس پایا روپیہ کا لالچ دے کے سرکایا جس کی حیثیت ظاہری درست پائی طمع پر طبیعت سست پائی اس پر زن و فرزند کی گرفتاری، قہر و عتاب سرکاری کا زور ڈالا اور جس پر یہ دونوں زور نہ چلے اس پر یہ توڑ جوڑ ہے کہ جھوٹا نسبت بنا کے قدم رسول کی قسمیں کھا کے کسی سے کہہ دیا کہ فلاں شخص تمہاری غیبت کرتا تھا بلکہ لعنت ملامت کرتا تھا۔ سننے والوں کو غصہ آیا بگڑنے لگے۔ یہاں تک نفرت بڑھی کہ آپس میں لڑنے لگے۔ آخر اسی غصہ و غضب میں لشکر اسلام سے چل نکلے کسی کو یوں اپنا کیا کہ نوکر رکھ لیا۔ سب مصارف اس کا اپنے سر پر رکھ لیا۔ چنانچہ حاجی مرتضیٰ مجاہد قدیم ہمراہی سید احمد صاحب مرحوم بحیلۂ تیاری سرمائی اخراجات ننگر میں داخل ہوئے۔ ہمراہی

ان کے اپنے اپنے گھر میں داخل ہوئے اور میر عباس صاحب تھانہ دار کوتوال لشکر دیندار انھیں فسادوں کے جہت ڈیڑھ سو مجاہدوں کو لے کے علٰحدہ سرا میں مقیم ہوئے گو نیت میں فساد نہ تھا عزم عدم اشتراک جہاد نہ تھا لیکن بالفعل باعث قلت لشکر عظیم ہوئے۔ اسی طرح بہت لوگ اپنے قول و اقرار سے نکل گئے۔ جب وقت جان دینے کا آیا بدل گئے۔

**میدانِ کربلا کا سماں** ان افسروں نے دوسری یہ تدبیر کی اطراف کے ہندو زمینداروں کو یہ بات تحریر کی کہ عنقریب ہم لشکر اسلام کو لیا چاہتے ہیں بے گناہوں کو قتل کیا چاہتے ہیں تم بھی ہوشیار رہنا توپ کی آواز سے خبردار رہنا آواز کے ساتھ ہی تیر کی طرح آنا گولیاں لگانا جب سب طرف سے نشانہ ہو جائیں گے پھر مردم لشکر اسلام ایک دم میں عدم کو روانہ ہو جائیں گے۔

غرض جب دیکھا کہ جماعت میں یہی خلل ہے اور ایک دل میں بھی بل ہے۔ ۲۵ صفر المظفر سہ شنبہ کی صبح سے بالکل رسد بند کر دی چاروں طرف آواز بلند کر دی کہ کہیں سے رسد پہنچنے نہ پائے۔ پانی تک لشکر اسلام میں نہ آئے جو کوئی اس امر میں کوشش کرے گی گنہگار ہوگا۔ سزا کا سزاوار ہوگا کافروں نے اس مقام کو میدان کربلا بنا دیا سب وہی سامان دکھا دیا۔ اہل اسلام کو تمام رات اور دن بے دانہ و آب رکھا اور اس پر یہ طرہ ہوا کہ افسروں کے اشارے سے گنوار ملعون کئی بار بعزم شبخون آئے۔ غازیوں نے للکار لیا نعرہ بڑھنے نہ پائے۔ لشکر اسلام تک گذر نہ ہوا بدخواہوں نے جو چاہا تھا اس کا اثر نہ ہوا۔ شبدیز قلم جولانی پر ہے۔ طبیعت بحر مواج کی صورت طغیانی پر ہے۔ ہر چند بزور روکتا ہوں نہیں رکتا ہے۔ بیساختہ قلم کی زبان سے نکلتا ہے کہ یزید بد انجام نہیں اور حسین علیہ السلام نہیں باقی سب سامان وہی ہے۔ مظلوم کشی وہی میدان وہی ہے وہی انسداد آب و دانہ ہے جور و جفا کا کارخانہ۔ وہی لوگوں کی بے وفائی ہے وہی دین کی لڑائی ہے وہی فوج کی چڑھائی ہے۔ وہی سر وہی ظلم ہے وہی جور ہے وہی ستم ہے جو حسین علیہ السلام پر گذرا تھا وہی ستم عیاں ہے قدم بقدم یہ قافلہ رواں ہے فرق اتنا ہے کہ وہ امام تھے یہ غلام امام ہیں وہ پیشوائے دین تھے۔ یہ اسلام میں یہ سرنام ہیں۔

## شدائد و مصائب و شہادت امیر المجاہدین

۲۶ صفر المظفر ۱۲۷۲ھ روز چہار شنبہ کو رایات ظفر آیات لشکر اسلام نے کوچ کیا منزل مقصود کا رستہ لیا لیکن امیر المجاہدین نے ہنگام روانگی یوں لشکر آراستہ کیا کہ مجاہدوں کے چار غول کیے ایک غول کو آگے بڑھنے کی اجازت دی ایک فرسخ کے فرق سے دوسرے کو رخصت دی تیسرے غول کو لے کے آپ تشریف فرما ہوئے۔ طریق خدا میں گام فرسا ہوئے۔ چوتھے غول کو ارشاد کیا کہ جب ہم ایک فرسخ کے انداز پر نکل جائیں تم چلنا اس سے پہلے نہ نکلنا۔ وقت نہفت زباں فیض ترجمان سے بے ساختہ یہ مصرعہ جس کو الہام غیبی یا القائے لاریبی کہیئے کہ نکلا کہ مصرع

سر میدان کفن بردوش دارم

اب یہاں قدرت خدا دیکھئے اسکی مشیت کا ماجرا سنیے کہ فوج شاہی کو باوجود ہوشیاری نوم غفلت سے ایسی شکست ہوئی کہ مطلق نہ خبر ہوئی۔ جب امیر المجاہدین کا غول کچھ دور پہنچا بارلو خواب غفلت سے چونکا۔ کوچ کی خبر سنتے ہی ہوش جاتے رہے۔ حواس باختہ ہوا اور دانہ بے ساختہ ہوا اور شیخ حسین علی سے کہا یہی وقت عیاری اور کارگزاری کا ہے۔ غافل کیوں ہو ہنگام ہوشیاری کا ہے۔ اگر یہ لشکر محمد پور پہنچا تو سمجھ لو کہ بہت دور پہنچا پھر اگر ممالک محروسہ کی فوج جمع کر دگے تو بھی ان لوگوں کا قلع قمع نہ کر سکو گے۔ برائے خدا سے اترو گھوڑے پر چڑھو لیکن جلد آگے بڑھو حکمت عملی سے فقط مولوی صاحب کے غول کو مقام زد پر ٹھہراؤ۔ ان کو باتوں میں لگاؤ پھر ہم سمجھ لیں گے۔ ایک دم کی فرصت آگے بڑھنے کی مہلت نہ دیں گے جب سردار کو مار لیا کسی کا قدم میدان میں نہ جمے گا۔ سب کے سب بھاگ نکلیں گے کوئی نہ تھمے گا تمھارے اوپر مولوی صاحب کو اعتماد ہے یہ کام تمھیں سے بن پڑے گا۔ شیخ بھی اس وقت بڑی جرأت کر کے باد صرصر سے زیادہ سرعت کر کے چشم زدن میں گھوڑا دوڑا کر آ پہنچا اور شجاع گنج کے اس پار امیر المجاہدین کے غول کو ٹھہرایا۔ ساتھ ہی بارلو بھی معہ آتش خانہ آیا۔ حسین علی امیر المجاہدین سے باتیں بنانے لگا اور ادھر بارلو کا ہر گولہ انداز موقع سے توپیں جمانے لگا

## علی حسین کی مکاری و عیاری

ادھر شیخ نے مخدوم الانام کے آگے ہاتھ باندھے قدموں پر ٹوپی رکھ منہ بنا کے عرض کیا کہ اگر آپ ایک بار اور

ہمارا کہنا مانیں اور ردولی میں تشریف فرما کے دو تین دن مقام کریں تو بے جنگ وجدال مسجد بن جائے گی اور بندگانِ خدا پر آنچ نہ آئے گی۔ یہ بکھیڑا بے کار ہے۔ بندہ ذمہ دار ہے۔ خدا کو مانیے مجھ کو جھوٹا نہ جانیے۔ کیسی نرم نرم ملائم ملائم باتیں کہیں کہ مولوی صاحب کے دل میں اثر کر گئیں۔

ادھر انگریز نے اسی راہ پر ایک اونچا ٹیکرا دیکھ کر توپیں لگا دیں تلنگوں کی صفیں جما دیں۔

ادھر سلطان المجاہدین تاج العارفین اس دغاباز کی چرب زبانی سے رضامند ہو کے ردولی کو روانہ ہوئے اور ادھر شیخ صاحب اپنا کام تمام کر چکے تھے موضع بھیلر کو چل دئے فقط اس واسطے ناپدید ہوئے کہ جائے انکار باقی رہے کہ بندہ جا چکا تھا تب لوگ شہید ہوئے راہ لگانا اس واسطے تھا کہ نمک حرامی نہ ہو اور چلا جانا اس واسطے تھا کہ بدنامی نہ ہو لیکن اس کی خبر نہ تھی کہ جس نے یہ کلام سنا ہوگا کہ چلتے دم مت انگریز سے کہہ گئے کہ میں اپنا کام تمام کر چکا تم کو اختیار ہے۔

قضائے کار لشکرِ اسلام ہمراہ امام حسب رہنمائی حسین علی اس ٹیکرے کے برابر پہنچا وہیں قابض روح کو حکم خالق اکبر پہنچا کہ مسلمانوں کو گلستانِ ارم دکھاؤ۔ رضوان اور مالک دونوں ہشیار ہوئے۔ اپنے عہدے سے خبردار ہوئے۔ موت کی گرم بازاری ہونے لگی۔ جان کا لین دین ٹھہرا سر کی سر دست خریداری ہونے لگی وہ دن روزِ رستاخیز سے کیا کم تھا۔ زمین و آسمان درہم برہم تھا ساکنِ آسمان الامان کہتے تھے بیگناہوں کو ذبح ہوتے دیکھ کر فرشتے "کُل یوم ھو فی شان" کہتے تھے وحش وطیر اس میدان کی قیامت کا گمان کرتے تھے۔ "اقترب للناس حسابھم وھم فی غفلۃ معرضون" کا دھیان کرتے تھے۔ اشجار کو بارِ غم سے زندگی بار تھی جس دم حسرت سے فرماتے تھے زبان پر یہ مصرعہ لاتے تھے۔ سر میدان کفن بردوش دارم

عرش سے آواز آتی تھی۔

بیا مظلوم اکنوں در کنارم

یعنی ذفتِ شہادت بد

••

# تقسیم کی طرف

آخری دہائی کی دستاویزات ـــــ

خطبۂ استقبالیہ ـــــــــــ شیخ محمد جان



تقسیم ہند ——————

ہندستانی مسلمانوں کے لیے ایک ناسور۔

یہ تقسیم جسے نہ ہم پسند کرتے تھے اور نہ آپ، صرف چند مفاد پرست لیڈران کے مفاد کی خاطر یہ سیکولر ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔

تقسیم ہمیں پسند نہ تھی اس کا ثبوت پیش خدمت ہے۔ ایسی دستاویزات آگے بھی پیش کی جاتی رہیں گی۔ پیش نظر خطبۂ استقبالیہ کے لیے ہم مہر الٰہی صاحب (ایم۔ ندیم) علیگڑھ کے ممنون ہیں۔

—— ادارہ

# تقسیم کی طرف

آخری دہائی کی دستاویزات

(۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء)

مرے طائرِ نفس کو نہیں باغباں سے رنجش
ملے گھر میں آب و دانہ تو یہ دام تک نہ پہنچے

۱۹۳۶ء میں جب مسٹر جناح نے بنگال میں آل انڈیا مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم کی ہے میں نے بلا پس و پیش، اُن کے ساتھ اشتراک عمل کیا۔ اور تمام ممکن ذرائع سے بنگال میں مسلم لیگ کی امداد کی اور اس کے موافق زبردست رائے عامّہ پیدا کرنے کیلئے جو کام کیا گیا۔ اس میں مینے اپنا پورا حصّہ ادا کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے دوسرے تمام مخلص خیر خواہوں کی طرح ایمانداری کے ساتھ میرا عقیدہ ہندو مسلم اتحاد پر بھی راسخ ہے۔ اور میں نے اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے انتہائی دشواریوں کے باوجود حتی الامکان زیادہ سے زیادہ سعی کی ہے میری رائے یہ ہے کہ اگر ہم ہندوؤں کے ساتھ جہاں کہیں وہ اقلیت میں ہیں، مجالس مقننہ کی چند نشستوں کے متعلق مراعات کردیں بشرطیکہ اس سے ہماری اکثریت اقلیت میں تبدیل نہ ہو جائے تو اس طریقہ سے ہم اکثریت والی قوم کا اعتماد اور دوستی حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ اہم معاملات جن سے ہمارا خاص مفاد وابستہ ہے اسی صورت میں لطریق احسن محفوظ رہ سکتے ہیں کہ جہاں کہیں ممکن ہو ہم ایک دوسرے کے ساتھ مراعات کی اسپرٹ پیدا کریں اور اسے ترقی دیں۔ اگر ہم ایسی فضا میں کام کریں جو ایک دوسرے کیساتھ دوستانہ مراعات کی اسپرٹ سے پیدا ہوتی ہے تو ہم ایسے بہت سے مسائل حل کر سکتے ہیں جن کا نتیجہ آج تک سوائے غیر ضروری تیزی و تندی اور تباہ کن نفرت و مخالفت کے اور کچھ نہیں نکلا اور جن سے ملک کی ترقی کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں۔ وہ ترقی جس میں ہمارا حصّہ بھی ہماری ضروریات کے مطابق یقیناً شامل ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ جداگانہ انتخاب کا طریقہ ہمیشہ کے لئے ختم کردیا جائے کیونکہ یہی وہ معیوب طریقہ ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کشیدہ کرا دیئے ہیں۔ اس طریقہ سے مسلمانوں نے ماضی میں خواہ کتنا ہی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

## برادران اسلام!

اپنی اور مجلس استقبالیہ کی جانب سے میں اُن تمام دوستوں کا پرجوش خیر مقدم کرتا ہوں جو ہندوستان کے مختلف گوشوں سے دور و دراز کا سفر کرکے یہاں جمع ہوئے ہیں اور جن کا مقصد اجتماع یہ ہے کہ وہ ٹھنڈے دل سے سکون و اطمینان اور حزم و احتیاط کے ساتھ اُس بین الاقوامی صورت حالات پر غور کریں جس سے نہایت دور رس نتائج و اثرات برآمد ہونے والے ہیں۔ بالخصوص مسلمانان ہند کے مختلف نقطہ ہائے نگاہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس امر کا فیصلہ کیا جائے کہ اقوام عالم کی مجلس میں ہندوستان کے لئے ایک باوقار جگہ حاصل کرنے اور مادر وطن کی ترقی میں مسلمانان ہند کو واجب حصّہ دلانیکے لئے ہمیں اسوقت کیا عمل کرنا ہے۔

میں آل انڈیا مسلم لیگ کا بحیثیت ایک جماعت کے زبردست حامی رہ چکا ہوں کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ بہت سے صوبوں اور مرکز میں مسلمانوں کی اقلیت کے باعث اس امر کی ضرورت ہے کہ ان کا ایک مضبوط سیاسی نظام ہو جو عظیم الشان اسلامی کلچر اور دیرینہ اسلامی روایات کے بقا و قیام کا نگراں رہے میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کا وجود بحیثیت ایک ممتاز ملت کے باقی نہ رہے اور وہ اکثریت والی قوم کے ساتھ مدغم ہو کر اپنی جداگانہ حیثیت کو ضائع کردیں جو ایک عظیم مذہب کے پیرو ہونے کی صورت میں اُنہیں حاصل ہے

۱۹۳۶ء میں جب مسٹر جناح نے بنگال میں آل انڈیا مسلم لیگ کی از سرِ نو
تنظیم کی ہے میں نے بلا پس و پیش، اُن کے ساتھ اشتراک عمل کیا۔ اور تمام
ممکن ذرائع سے بنگال میں مسلم لیگ کی امداد کی اور اس کے موافق زبردست رائے
عامّہ پیدا کرنے کیلئے جو کام کیا گیا۔ اس میں مینے اپنا پورا حصّہ ادا کیا۔ اسی کے
ساتھ ساتھ مسلمانوں کے دوسرے تمام مخلص خیر خواہوں کی طرح ایمانداری کے
ساتھ میرا عقیدہ ہندو مسلم اتحاد پر بھی راسخ ہے۔ اور میں نے اس مقصد کو حاصل
کرنے کیلئے انتہائی دشواریوں کے باوجود حتی الامکان زیادہ سے زیادہ سعی کی ہے
میری رائے یہ ہے کہ اگر ہم ہندوؤں کے ساتھ جہاں کہیں وہ اقلیت میں ہیں،
مجالس مقننہ کی چند نشستوں کے متعلق مراعات کردیں بشرطیکہ اس سے ہماری
اکثریت اقلیت میں تبدیل نہ ہو جائے تو اس طریقہ سے ہم اکثریت والی قوم کا
اعتماد اور دوستی حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ اہم معاملات جن سے ہمارا خاص مفاد
وابستہ ہے اسی صورت میں بطریق احسن محفوظ رہ سکتے ہیں کہ جہاں کہیں ممکن ہو
ہم ایک دوسرے کے ساتھ مراعات کی اسپرٹ پیدا کریں اور اسے ترقی دیں۔ اگر ہم
ایسی فضا میں کام کریں جو ایک دوسرے کیساتھ دوستانہ مراعات کی اسپرٹ سے
پیدا ہوتی ہے تو ہم ایسے بہت سے مسائل حل کر سکتے ہیں جن کا نتیجہ آج تک
سوائے غیر ضروری تیزی و تندی اور تباہ کن نفرت و مخالفت کے اور کچھ نہیں
نکلا اور جن سے ملک کی ترقی کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں۔ وہ ترقی
جس میں ہمارا حصّہ بھی ہماری ضروریات کے مطابق یقیناً شامل ہے۔ میری خواہش
یہ ہے کہ جداگانہ انتخاب کا طریقہ ہمیشہ کے لئے ختم کردیا جائے کیونکہ یہی وہ معیوب
طریقہ ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے
تعلقات کشیدہ کرا دیئے ہیں۔ اس طریقہ سے مسلمانوں نے ماضی میں خواہ کتنا ہی

بڑا فائدہ کیوں نہ حاصل کیا ہو، یہ حقیقت ہے کہ آج اس طریق انتخاب کا مفید پہلو بالکل ختم ہو چکا ہے اور وہ کسی طرح مناسب حال نہیں ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے ہمارے بہت سے مخلص رہنماؤں کے اخلاق پست کر دئے ہیں اور ان میں کم ہمتی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ جداگانہ انتخاب ہی کا کرشمہ ہے کہ انتخابات کے وقت اور دوسرے ایسے ہی مواقع پر ہندو اور مسلمان ایکدوسرے کو خوب دل بھر کر گالیاں دیتے ہیں اور جس قدر ایک امیدوار گالیاں زیادہ دیتا ہے اسی قدر اسکو میونسپلیٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، صوبجاتی مجالس مقننہ اور مرکزی مجلس مقننہ کے لئے منتخب ہونے کا موقع زیادہ ملتا ہے۔ خدانخواستہ اگر کسی وقت دونوں قومیں صرف اُن ہی امیدواروں کو منتخب کرانے میں کامیاب ہو جائیں جن کی انتخابی بنیاد باہمی نفرت اور سب وشتم پر قایم ہو تو اُسوقت ہمارے لئے ہر لمحہ خانہ جنگی کا خطرہ یقینی ہو جائے گا اور یہ ایسی صورت حالات ہے جس کا تصور مخلص ہندو اور مخلص مسلمان کسی طرح بھی سکون قلب کے ساتھ نہیں کر سکتے۔

دسمبر ۱۹۳۷ء میں جبکہ مسٹر جناح کلکتہ ہی میں تشریف رکھتے تھے میں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر اُن سے یہ کہا کہ وہ ہر خیال اور ہر طبقہ کے مسلمانوں کی ایک نمایندہ کانفرنس طلب کریں اور جہاں تک ممکن ہو معقول اور متفقہ مطالبات مسلمانان ہند کی طرف سے مرتب کر کے اُن کی بنیاد پر کانگریس سے سمجھوتہ کی گفت و شنید کریں اور ان مطالبات کو ہندوستان کے آیندہ دستور اساسی میں داخل کرائیں مگر اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ ابھی اس قسم کی کانفرنس کا وقت نہیں آیا ہے اور جب وقت آئے گا تو میں ضرور ایسا ہی کروں گا۔ بدقسمتی سے گذشتہ دو سال کے دوران میں مسٹر جناح نے بہت سے مخلص اور ذمہ دار مسلمانوں کی انتہائی سعی کے باوجود اس کو مناسب خیال نہیں کیا کہ وہ کسی دوسرے مختلف الخیال مسلمان سے خواہ

وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کسی قسم کا شورہ کریں یا اسے اپنے اعتماد کا اہل سمجھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اُن تمام مخلص مسلم کارکنوں کو جو اُن کے ساتھ متفق الرائے نہیں ہیں قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔ اور نہ اُنہوں نے کبھی اسکی وضاحت کی ہے کہ مسلمانوں کے لئے تصفیہ حقوق کی کون سی تعمیری اسکیم سب سے بہتر ہے اور وہ کون سی ٹھوس شرائط ایسی ہیں جو اُن کو مطمئن کر دیں گی اور جن سے مسلمانوں کے حقوق محفوظ ہو جائیں گے۔ اسلئے ایک طویل و شدید انتظار کے بعد دوسرے خیر خواہان اسلام اور آل انڈیا مسلم جماعتوں نے جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کانفرنس طلب کی ہے اور اب آپ حضرات ہی کا یہ کام ہے کہ آپ فیصلے کریں اور بتائیں کہ ملکی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے اور مشترکہ مادر وطن کے باعزت فرزند ہونے کی حیثیت سے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کی غرض سے مسلمانان ہند کو کیا کرنا چاہیے۔

مجھے مجبوراً یہ عرض کرنا پڑتا ہے کہ گذشتہ تیس سال کے عرصہ میں تعلیمی دائرے کے اندر بالخصوص ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں مسلمانوں نے خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اقتصادی حیثیت میں ہم نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا ہے اور ہماری قوم کی مالی حالت اُس سطح سے بہت زیادہ پست ہو گئی ہے جس پر ہم ایک نسل پہلے کھڑے ہوئے تھے۔ بہت سی جائدادیں اور وسیع زمینداریاں جو کسی زمانہ میں ہماری مملوکہ تھیں آج ہمارے ہاتھوں سے نکل چکی ہیں۔ ہم ابھی تک اپنے افلاس کے اسباب معلوم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ان اسباب میں سب سے نمایاں سبب میری حقیر رائے میں یہ ہے کہ ہماری معاشرت کا معیار بہت بلند ہے اور ہم بہت زیادہ اسراف میں مبتلا ہیں۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہماری زندگی کا معیار ہندوستان کی اُن دوسری قوموں کے مقابلہ میں بہت زیادہ بلند ہے۔ جو ہم سے زیادہ متمول ہیں

اور جنہیں ملک کی تجارت کا بڑا حصہ ملا ہوا ہے۔ ہم میں بہت سے ایسے غریب ہیں جو کھدر سے صرف اسلئے نفرت کرتے ہیں کہ کانگریس نے اُسے اختیار کر لیا ہے حالانکہ اُن کی اقتصادی حالت اُنہیں ہرگز اسکی اجازت نہیں دیتی کہ وہ ایک دن کے لئے بھی کھدر کے سوا کوئی کپڑا استعمال کریں۔ بعض مسلم رہنماؤں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ہندوؤں کے خلاف نفرت و حقارت کے شعلے اس طرح بھڑکائے ہیں کہ محض معمولی واقعات کو جو روزانہ کی زندگی میں بہترین احول کے اندر بھی پیش آتے رہتے ہیں مبالغہ کے ساتھ خوفناک بنا کر سات صوبوں میں کانگریس کے مظالم کی فرضی داستانیں وضع کر لی ہیں اور انہیں شہرت دے رہے ہیں جس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ قوم کی تمام تعمیری سرگرمیوں میں ہمارا حصہ صفر کی برابر ہے اور ہم سب سے زیادہ نقصان برداشت کر رہے ہیں۔ ذاکر حسین کمیٹی کی تعلیمی اسکیم کو اُن ہی لوگوں نے رد کر دیا ہے جو سب سے زیادہ اس کے ضرورتمند ہیں اور وجہ یہ قرار دی ہے کہ اسمیں مذہبی تعلیم کا بندوبست نہیں ہے حالانکہ اس اسکیم کے اندر عمداً یہ صورت رکھی گئی ہے کہ ہر شخص اپنی مذہبی تعلیم کے لئے خود آزاد رہے اور اس میں حکومت دخل نہ دے۔ ہم "ہندوستانی" کے متعلق نہایت زور شور کی بحثیں سنتے رہے ہیں کیونکہ ہندوستان کے بعض صوبوں میں جہاں اُردو بولی نہیں جاتی، ہندی کے الفاظ کا غلبہ ہے بعض رجحانات مسلمہ طور پر تکلیف دہ اور پریشان کن ہیں مگر ان کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ آپس میں فساد انگیز جھگڑے شروع کر دئے جائیں۔ ہم نے دیہاتی اصلاح کے کام میں محض اس لئے حصہ نہیں لیا ہے کہ اس سے کانگریس کا پرسٹیج بڑھے گا۔ جس کا مقابلہ کرنا ہمارا فرض اولین ہے۔ مکمل نشہ بندی کی تجویز محدود رقبوں میں بھی ہمیں گوارا نہیں ہے کیونکہ مسلم لیگ کے ایک بہت بڑے لیڈر کے قول کے مطابق یہ تجویز ابھی قبل از وقت ہے اور ملک کے اقتصادی حالات اسکی اجازت نہیں دیتے

یہ صحیح ہے کہ بہت سے مسلمان فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل میں کانگریس کی "لیت ولعل" والی پالیسی سے پریشان ہوگئے ہیں اور اس اہم اور مشکل ترین مسئلہ کو پوری توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ ہاتھ میں لینے سے کانگریس کے سربرآوردہ رہنماؤں کی پہلو تہی نے بے اطمینانی پیدا کردی ہے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ گذشتہ دو سال کے عرصہ میں گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی طرف سے ہندو مسلم تعلقات کو خوشگوار بنانے اور دونوں قوموں کو ایک مشترک سطح پر لانے کیلئے سنجیدگی اور اخلاصمندی کے ساتھ مسلسل کوششیں کی گئی ہیں جن کی نظیر پہلے کبھی نہیں ملتی۔ اس مقصد کے لئے ان اصحاب نے مسٹر جناح سے براہ راست خط وکتابت بھی کی ہے اور خود اُن ہی کی شرائط پر اُن سے خود جاکر ملے بھی ہیں۔ اگر مسٹر جناح نے اِن پُرخلوص اقدامات کا جواب صحیح اسپرٹ میں دیا ہوتا تو آج سے بہت قبل ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دوش بدوش منزل آزادی کی طرف گامزن ہو چکے ہوتے، اور مکمل درجۂ نوآبادیات آج ہم سے بہت قریب تر ہوتا اور اسکی حیثیت محض ایک آرزو کی نہ ہوتی جس کی تکمیل کے لئے مستقبل کا کوئی زمانہ متعین ہی نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا ہم ہندوؤں کے ساتھ اپنے اختلافات کو باعزت طریقہ پر ختم کرنے کیلئے اِس سنہری موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں جبکہ خوش قسمتی سے کانگریس کو ہندوؤں کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہے اور گاندھی جی جو عملاً کانگریس کے ڈکٹیٹر ہیں اس مسئلہ کو ہمیشہ کیلئے حل کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں یا ہم نظر فریب الفاظ اور خالی خولی جملوں کے طلسم میں مبتلا ہو کر نہ صرف اپنے ملک کی ترقی کو روکنا بلکہ خود اپنے آپ کو انتہائی نقصان پہونچانا چاہتے ہیں۔ ہم آئندہ نسلوں کو یہ کہنے کا موقع دینا نہیں چاہتے کہ "اگر ہمارے آباؤ اجداد نے غیر دانشمندی سے کام نہ لیا ہوتا تو آج سے بہت قبل ہندوستان آزاد ہو چکا ہوتا۔ اور

ہندوستانی مسلمانوں کو آزاد ہندوستان میں باوقار جگہ حاصل ہوگی۔

مجھے یقین کامل ہے کہ مستقبل قریب میں ہو تیاگ کے اندر بہت انقلابات برپا ہونے والے ہیں جن سے ہندوستان بھی ضرور متاثر ہوگا۔ آجکل کا ہندوستان ایک جامد ملک بن کر نہیں رہے گا۔ وہ اپنی محکومیت پر قانع نہیں رہ سکتا۔ کیا مسلمانوں کو آنیوالے انقلاب میں اپنا واجب حصہ نہیں لینا چاہیئے۔؟ کیا اُن کے لئے یہ طرز عمل باعزت ہوگا کہ وہ اسوقت تو کچھ نکریں اور جب دوسرے جنگ لڑکر فتحیاب ہو جائیں تو وہ مال غنیمت میں برابر کا حصہ بٹانیکے لئے مستعد ہوں؟ مجھے اُمید ہے کہ یہ کانفرنس نہ صرف مسلمانان ہند کے جائز حقوق و مطالبات کا تحفظ کرنیکے لئے ایک مشترک فارمولا تلاش کریگی بلکہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسا لائحہ عمل بھی تیار کریگی جس کے ماتحت وہ اپنے ملک کو آزاد کرانے کیلئے اپنی عظیم الشان قومی خصوصیات کے لائق قربانیاں پیش کرسکیں۔

میں صرف ایک بات اور کہوں گا اور اس کے بعد ختم کردوں گا۔ ہندوستان کو ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا میں تقسیم کرنے یا جداگانہ ہندو اور مسلم ریاستیں قایم کرنے کی تمام گفتگو نہ صرف نامعقول بلکہ ناقابل عمل بھی ہے کیونکہ ان اسکیموں میں سے کوئی اسکیم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی اور کروڑوں مسلمان اور ہندو دور ودراز کے صوبوں سے ہجرت کرکے ہندو یا مسلم آزاد علاقوں میں نہیں جاسکتے۔ ان تجاویز کو صرف وہی دماغ پیدا کرسکتا ہے جو غصہ کی وجہ سے ماؤف ہوچکا ہو۔

جہاں تک کہ اس اُمید موہوم کا تعلق ہے کہ مسلم اکثریت والے صوبوں کے جداگانہ فیڈرل مسلم حکومت کے ماتحت آجانے سے ہندوستان میں امن و امان قایم ہوجائے گا۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ خیال بالکل غلط ہے بلکہ اسکے برعکس دو فیڈرل حکومتوں کے درمیان جن کی سرحدوں کو صرف نفرت و حقارت

اور مذہبی اجتماعات کے جذبات ایکدوسرے سے جدا کریں گے۔ سخت جنگ و جدال کا آغاز ہو جائے گا۔ ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ جب وہ اکثریت والے صوبوں میں مسلم لیگ "اسلام" کے نام پر اور "اسلام خطرہ میں ہے" کا نعرہ لگا کر انتھک پروپگنڈہ کرنے کے بعد بھی لیگی حکومتیں قائم نہ کر سکی تو ان "اسلامی" اور "آزاد" حکومتوں کی حقیقت جنہیں لیگ پیدا کرنا چاہتی ہے سوائے پانی کے خالی بلبلوں کے اور کیا ہو سکتی ہے۔ میری حقیر رائے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہمیشہ ہندوستان میں ساتھ رہنا ہے اور انہیں ایک ایسی نئی تہذیب کے بنانے میں اپنا اپنا بہترین حصہ ادا کرنا ہے جو ترقی کریگی اور پھلے پھولے گی۔ اور شاید ایک دن تمام دنیا کی رہنمائی کرے گی۔

اس سے قبل کہ میں ختم کروں آپ حضرات سے اُن کوتاہیوں کیلئے معافی چاہتا ہوں جو مجلس استقبالیہ کے انتظامات میں آپ کو محسوس ہوئی ہوں اور اس کے لئے میرے پاس صرف ایک ہی عذر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ انتظامات جس مدت میں کئے گئے ہیں وہ چند یوم سے زائد کی مدت نہیں تھی۔

میں ایک مرتبہ پھر اس شہر میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں جو قدیم عمارات کے اُن شاندار کھنڈروں سے بھرا ہوا ہے جن کا سلسلہ ہمیں زمانہ ہائے ماقبل تاریخ تک لے جاتا ہے۔ اور دوبارہ امید کرتا ہوں کہ آپ نہایت فیاضی کے ساتھ ہماری کوتاہیوں کو معاف کر دیں گے۔

(خان بہادر شیخ) محمد جان

(ایم۔ ایل سی بنگال)

ماہر القادری مرحوم کا

ماہنامہ

# فاران

جو

تقریباً پچھلے پچاس برسوں سے علمی، ادبی اور مذہبی مضامین

کے ذریعہ

اردو کی خدمات انجام دے رہا ہے

اب

## اسماعیل احمد مینائی

کی ادارت میں ہر ماہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے

پتہ: ماہنامہ فاران، ڈی ۳۵، بلاک نمبر ۸، گلشن اقبال کراچی نمبر ۴۸

# مشرقی کتاب خانے

- ترکی کا ایک غیر معروف کتبخانہ ـــــ پروفیسر احمد آتش
- استنبول کے کتبخانے ـــــ ڈاکٹر محمد غوث
- بروصہ کے کتبخانے کے چند فارسی مخطوطات ـــــ ڈاکٹر سید نعیم الدین



مشرقی کتب خانوں کے تعارف کا یہ سلسلہ ہم مخطوطات میں مشرق کے سب سے زیادہ ثروتمند ملک سے شروع کر رہے ہیں۔ ترکی عالم اسلامیہ کا حاکمانہ مرکز ہونے کے سبب اور کئی صدی تک علمی قلب ہونے کے باعث کتابوں اور خطی نسخوں کے لیے بھی مرکز کا کام کرتا رہا۔ سارے عالم اسلام کا قیمتی ذخیرہ کھنچ کھنچ کے سلطنت عثمانیہ کے قدموں میں ڈھیر ہوتا رہتا تھا، بچا کھچا ادھر ادھر نکل جاتا تھا۔

ترکی ذخیروں کا یہ تعارف امید ہے اس سلسلہ کو آغاز کرتے ہوئے مناسب خیال کیا جائے گا ————————• ادارہ

پروفیسر احمد آتش

مترجمہ ڈاکٹر اکمل ایوبی

# ترکی کا ایک غیر معروف کتبخانہ

قسطمونی اناطولیہ کے ان شہروں میں سے ہے جو زمانۂ قدیم سے اہم تمدنی مرکز رہے ہیں۔ یہاں مدرسوں اور خانقاہوں سے متعلق بہت سے کتب خانے تھے۔ ان مقامات کے بند ہوجانے کے بعد ان کی کتابیں ایک عرصہ تک مختلف جگہوں پر پڑی رہیں اور آخر میں قسطمونی کے کتب خانۂ عمومیہ کی عمارت میں محفوظ کردی گئیں۔ کتابوں کا موجودہ ذخیرہ تین خانقاہوں خالدیہ، مولوی خانہ اور شعبان ولی، بارہ مدرسوں اور ایک ارمنی گرجا کے کتب خانوں سے حاصل شدہ کتابوں پر مشتمل ہے یہاں مخطوطات کی مجموعی تعداد تقریباً چار ہزار ہے یہ کتابیں موضوع کے اعتبار سے زیادہ تر ان علوم سے متعلق ہیں جنکی تعلیم عام طور پر مدارس میں دی جاتی تھی۔ ان میں ادبیات سے متعلق بہت کم کتابیں ہیں اور جو ہیں وہ زیادہ تر غیر اہم۔ ذیل کی سطور میں بعض منتخب کتابوں کا ذکر کیا جائے گا جو قدیم، نادر اور بے مثال ہیں۔ کتابوں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے ان کو موضوع کے لحاظ سے الگ الگ تقسیم کرنے سے کوئی فائدہ نہ تھا اس لیے ان کی فہرست مصنفین کی تاریخ وفات کے لحاظ سے ترتیب دی گئی ہے۔

(۱) مجموعہ۔

اوراق ۲۷۰، سطور فی صفحہ ۱۷، خط نسخ، مکتوبہ یونس بن عبداللہ تاریخ کتابت: ۲۵ شعبان ۶۱۵ ہجری۔ [قسطمونی: ۲۷۱۳]

(i) کتاب الخلوه والتنقل فی العباده و درجات العابدین
(ورق ۱ ـ ۵۷) مصنفهٔ ابو عبداللہ الحارث بن أسد المحاسبی[1] (م ۲۴۳ / ۸۳۷)
اس کتاب کا ذکر *GAL* میں نہیں ملتا ہے

آغاز: بسمله. الحمد لله وسلام علی عباده الذین اصطفی. باب الإجتهاد و الخلوة و قصر الأمل و غیر ذلک.

قال الإمام أبو عبدالله الحارث بن أسد المحاسبی رضی الله عنه. إعلم رحمک الله أن أهل طاعة الله قدموا بین یدی الأعمال ...

اختتام: ... قال احفظ لسانک ولا تقولن إلا حقاً و اسکت فانك إذا فعلت ذلک أدخلك فی أصناف الخیر و الحمد لله وحده وصلی ...

ترقیمہ میں: بلغ مقابلة بحمد الله.

(ii) کتاب الصفات (ورق ۵۷-۶۲) مؤلفہ ابو سعید أحمد بن عیسی الخرّاز[2] (م ۲۸۶ / ۸۹۹). اس کتاب کا ذکر *GAL* میں نہیں ہے.

آغاز: قال أبو سعید الخرّاز رحمة الله

الحمد لله الذی خلق الخلق حین أراد کما أراد فأحسن خلقهم و نعت مشیئة فیهم ثم دعاهم إلی انفهم ... فآثر أقوام الدنیا ... فحجب الله قلوبهم عن الأخرة ...

اختتام: ... ان هذا العلم هوف (؟) لأن کثیراً من العارفین یحبون الله لأنفسهم ویذکرونه بأنفسهم و یریدونه لأنفسهم.

(iii) کتاب الضیاء (ورق ۶۲ ـ ۶۴) یہ تصنیف بھی الخرّاز سے منسوب ہے. اس کتاب کا کوئی دوسرا نسخہ اب تک معلوم نہیں ہوسکا ہے.

آغاز: الحمد لله المحتجب من الأوهام بعلوه المنفرد عن الأفهام بعزته ... یعلم ما تکنه الصدور ...

---

۱ـ دیکھیے Carl Brockelmann, *Geschichte der Arabischen Litteratur* I, 213; Suppl. I, 351

۲ـ دیکھیے *GAL* I, 214; Suppl. I, 354.

(iv) کتاب الکشف والبیان (ورق ٦٤ - ٧٠) یه رساله بهی الخرّاز سے منسوب ہے جس کے کسی دوسرے نسخے کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ہے۔ علما میں جو طویل بحثیں ہوئی تھیں کہ انساء کا مقام بلند ہے یا اولیاء کا اسی مسئلہ پر یہ رساله تصنیف کیا گیا ہے۔

آغاز: بسمله. رب یسر قال أبوسعید... الخالق البرّ الصادق ... وآثار المنامح ... بالأنبیاء الذین اصطفا ... أما بعد فان قوماً من أهل التصوف غلطوا فی التمیز بین مقام الأنبیاء والأولیاء فجعلوا مقام الأولیاء أرفع من مقام الأنبیاء وانما ذلك سبب حجابهم عن الحقیقة ...

(v) کتاب الفراغ (ورق ۷۱ - ۷۸) یه نادر نسخه ہے۔

آغاز: قال الشیخ أبوسعید ... إعلم أن الخلق لواشتغلوا بانفسهم فی ذکرالمولیٰ لتفرغوا عمن دونهم ولوجدوا فی ذکر ربهم غنیة عن ذکرمادونه ...

اختتام: ... فان لم یقدر ان یخرج من عیوبها فلا یعجز عن معرفة عیوبها متأسفا وبالله التوفیق والعون.

(vi) کتاب الحقائق (ورق ۷۸ - ۸۷) الخرّاز نے اس رسالے میں جو ایک نادر تصنیف ہے بعض مستعمل تعبیروں کی وضاحت صوفیوں کے نقطۂ نظر سے کی ہے عقل، خشیت، تواضع، عدل، طاعت وغیرہ جیسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے اور صوفیوں کے نقطۂ نظر سے ان کے معانی سمجھائے ہیں نسخے کے اختتام پر وضاحت شدہ الفاظ کی ایک فہرست بھی مندرج ہے۔

آغاز: قال أبوسعید ... الحمدلله حمد منقلب بقلبه فی ریاض منته ومتنزّه بروحه تحت أشجار کرمه ... أمابعد قد جمعت فی کتابی هذا مسائل عن طریق الحکمة علی بیان الشریعة بلسان أهل المعرفة علی الایجاز والاختصار ... وافتتحت ذلك بباب العقل ... قال نور فی القلب یهدی النفس الی اصول العمل ...

(vii) **کتاب معیار التصوف وماهیته** (ورق ۸۸ـ ۱۳۳) مصنفه ابوسعید الخراز وابو یعقوب (؟) وسہل بن عبداللہ التستری[۳] (م ۲۷۳ ۸۸۶ یا ۲۸۳ / ۸۹۶؟)

آغاز: بسمله۔ ذکر ماهیة التصوف، قوله عزوجل انا اخلصناهم بخالصة ذکری الدار ... وقیل هم أهل الصفوة وارباب الصفا قال جعفر الصادق الصافی هو محمد بن عبدالله والصوفی ابوبکر الصدیق لقوله من کان یعبد محمدا فان محمدا قدمات

(viii) **کتاب معرفة الأسرار** (ورق ۱۳۳ـ۱۴۹ اور ۲۰۹ـ۲۲۰) مؤلفه ابوعبدالله محمد بن علی الحکیم الترمذی[۴] (م ۲۵۵/۸۶۸) اس کتاب کے کسی دوسرے ... کے وجود کی اطلاع نہیں.

آغاز الحمدُ للهِ الذی تفرد فی ازلیته وتوحّد فی دیموته ثم انا شرحنا الاحوال والاسماء التی قد خفی علی بعض الناس ... ان سعی الناظر فیه علی طریق الصفا ویدل علی اخلاق المکارم والوفا ... فصل. فی صفة أسرارالله ... فی طبقات اهل الارادة ... فی صفة ... المرید المتحقق ... فصل. فاما تمزیق الثیاب فی السماع ..

اختتام: ... کذلك کونه یکون فانیاً و علم الله باقیاً وبالله التوفیق تم کتاب معرفة الأسرار ... من کلام الشیخ ... أبی عبدالله الترمذی.

(ix) **کتاب شکایة أهل السنه بحکایة مانالهم من المحنه** (ورق ۱۶۵ـ ۱۷۹) مؤلفه ابوالقاسم عبدالکریم بن هوازن القشیری[۵] (۳۷۶ ـ ۴۶۵ ۹۸۶ـ ۱۰۷۲) دولت سلجوقیه کی تشکیل کے ابتدائی دور میں وزیر عمیدالملک الکندری کی خلل اندازی اور القشیری، امام الحرمین

---

۳. دیکھیے GAL I, 204; Suppl. I, 333

۴. دیکھیے GAL I, 216; Suppl. I, 355; H. Ritter, Philogika xiii, *Oriens* I, p. 32; اور ترجمۂ قصات: ۱۶۹ (استنبول، ۱۲۸۹)

۵. دیکھیے GAL I, 556; Suppl. I, 770; H. Ritter, *Oriens* III, p. 36.

اور انکی طرح کے دوسرے لوگوں کی ادبی بحثیں معلوم ہیں جو اصولی طور پر اشعری تھے اور جو علمائے اہل سنت کی وجہ سے مکہ ہجرت کرگئے تھے[۶]. القشیری کے اس شکایت نامے کو جو قیام مکہ کے دوران میں لکھا گیا تھا، سبکی نے اپنی کتاب «طبقات الشافعیة الکبری» میں شامل کرلیا ہے[۷].

آغاز : بسملہ. قال الأستاذ القشیری الحمدلله المجمل فی بلائه . . .

(x) تفسیر فاتحة الکتاب العزیز (ورق ۱۸۰ - ۲۰۸) کتاب کے اوپر کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف ابو محمد عبدالجلیل بن موسیٰ الأنصاری[۸] ہیں جن کے حالات کا صحیح طور پر علم نہیں ہے صرف ایک کتاب میں ان کے متعلق سنہ ۶۰۵ ۱۲۰۵ سے قبل زندہ رہنا بتایا گیا ہے : یہ کتاب سورۃ فاتحہ کی مختصر سی تفسیر ہے .

آغاز : بسملہ. اعلم ان الله تبارک و تعالیٰ یتنزل باسمه الرحمن الرحیم الی عباده لیجذبهم إلیه برسله و کتبه . . .

اختتام : و تبری من العون بالمخلوقات فانهم فهمنا الله وایا کم بمنه . . .

(ix) صفة القلوب (ورق ۲۲۰ - ۲۲۶) یہ حکیم ترمذی کی ایک مختصر کتاب ہے جسکا کوئی دوسرا نسخہ اب تک معلوم نہیں ہوسکا ہے. اس میں الفرق بین الصدر والقلب والفؤاد واللب[۹] کی وضاحت کی گئی ہے

آغاز : بسملہ. کتاب صفة القلوب قال الشیخ ابو عبدالله الترمذی رحمه الله الفؤاد اول مدینة من مدائن النور والنور سبع مدائن اولها الفؤاد ثم الضمیر ثم الغلاف ثم القلب ثم الشغاف ثم الحبة ثم اللباب . . .

۶ دیکھیے M. Sherefeddin, *Selchuklular devrinde mezahib*, Turkiyat Mejmuasi I, (Istanbul 1925) p. 101 ff.

۷- السبکی : طبقات الشافعیة (۲: ۲۷۶-۲۸۸)

۸- دیکھیے *GAL* Suppl 1,607

۹- دیکھیے *GAL* I, 215, no. 20

(xii) کتاب السماع (ورق ۲۲۶ - ۲۳۲) مصنفه القشیری . نسخه منحصر به فرد . اس رسالے میں سماع اور اسکے احکام وغیرہ کا ذکر ہے.

آغاز :. الحمدلله خالق الأرواح لكشف ... هذه فصول يخبر عن حقيقة السماع و أحكامه و امارات صحته و اعلامه ذكرنا على حد الاختصار . . .

(xiii) کتاب أدب المريد (ورق ۲۳۲ - ۲۷۰) مصنفه ابو القاسم الحسين بن جعفر بن محمد الواعظ الوزّان جو پانچویں/نویں صدی کے صوفیوں میں سے ایک تھے[۱۰]. اس تصنیف کا ایک نسخه استنبول میں ایا صوفیه کے کتب خانے میں موجود ہے .

آغاز : قال الحمدلله الذى خلقنا فاكمل خلقنا و أدبنا فاحسن تأديبنا . . .

(۲) کتاب الهيئة مصنفه ابوعلى الحسن بن الحسن بن الهيثم[۱۱] (م ۴۳۰/۱۰۳۸) اس کتاب کا ایک نسخه انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہے[۱۲] لیکن وہ ظاهرا ناقص ہے . ترکی کا یہ نسخه یہی نہیں که قدیم ہے بلکه مکمل بھی ہے .

ترقیمه : تم القول و الحمدلله ... وكتب هذا الكتاب من النسخة التى نسخ (!) من نسخة الشيخ أبى القاسم السمياطى بخطه ذكر انه نقلها من نسخة بخط مصنف الكتاب الشيخ أبى على الحسن بن الحسن بن الهيثم و قابل عليها من أولها إلى آخرها فى رجب من سنة ست و سبعين وأربعماية .

سرورق پر : والنسخة المكتوب منه هذه النسخة عورض بهذه النسخة الأصل المذكور وهو بخط الشيخ أبى على بن الهيثم و صحح والحمدلله وكتب فى رجب من السنة المذكورة .

آغاز : بسمله ... قول الشيخ الفاضل أبى على ... إبن الهيثم فى هيئة العالم لم يزل كثير من أصحاب التعاليم ممن أنعم النظر فى علم الهيئة ... يجردون

---

۱۰- دیکھیے GAL I, 357

۱۱- دیکھیے GAL I, 617; Suppl. I, 851

۱۲- دیکھیے O. Loth, *A Catalogue of Arabic Manuscripts in the India Office*, (London, 1877), p. 213.

قولاً مرسلاً ... فنحن قائلون فی هيئة العالم قولاً يشتمل فيما نظن على كليات المعانی التی إليها انتهى ادراک الباحثين على حقايق العلوم التعليمية .

اوراق ٤٤ ، سطور ١٧ ، خط نسخ جلی [قسطمونی : ٢٢٩٨]

(٣) کتاب الفرائد و القلائد عام طور سے یہ ادبی کتاب[١٣] ابوالحسین محمد بن الحسین (یا حسن) الأهوازی سے منسوب کی جاتی ہے جو چوتھی / دسویں صدی میں زندہ تھے . بعض حضرات اس کو الثعالبی سے اور بعض رشید الدین وطواط سے بھی منسوب کرتے ہیں . موجودہ نسخہ مصنف کے بیٹے ابوالحسین أحمد بن محمد بن الحسن الأهوازی کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے .

آغاز : الحمد لله العلى الكبير القوى القدير العليم الخبير السميع البصير ...

مکتوبہ علی بن جعفر بن أسد بن علی الجوهری الکاتب . دمشق رجب سنہ ٥٦٤ ھ

اوراق ٧٨ ، سطور ١٠ ، خط نسخ مشکول [قسطمونی : ٧٧٤]

(٤) کتاب أسماء الله و صفاته مصنفہ ابوبکر أحمد بن الحسین البیهقی[١٤] (م ٤٥٨ ١٠٦٦). یہ کتاب قرآن ، حدیث اور اجماع امت کو مد نظر رکھتے ہوئے ، الله کے اسماء حسنہ اور صفات کے بارے میں لکھی گئی ہے. اس کتاب کے نسخے کمیاب ہیں. یہ کتاب سنہ ١٣١٣ھ میں الہ آباد سے اور سنہ ١٣٥٨ھ میں قاہرہ سے محمد زاهد الکوثری کے مقدمہ اور مختصر حواشی کے ساتھ شائع ہوچکی ہے.

موجودہ نسخہ سنہ ٥٥٦ ھ میں لکھا گیا ہے کتاب کے سرورق پر جو سماع کی تحریر ثبت ہے اس کے بموجب یہ نسخہ الحافظ ابوالقاسم علی بن الحسن بن هبة الله الشافعی یعنی مشہور مؤرخ و محدث کی روایت کے مطابق خود ان کا پڑھا ہوا ہونا چاہیے کیونکہ ان کی وفات ١١٧٦/٥٧١

---

١٣- دیکھیے GAL I, 91; Suppl. I, 133

١٤- دیکھیے GAL I, 446; Suppl. I, 566.

میں ہوئی تھی[۱۵]. اس کتاب کا ایک تنقیدی ایڈیشن شائع ہونا چاہیے اور اس نسخے سے خاص طور پر مدد لینی چاہیے.

آغاز: حد ثنا الشیخ الامام الثقة الحافظ ابوالقاسم علی بن الحسن هبة الله الشافعی قال قرأت علی الشیخ ابی الحسن عبیدالله بن ابی عبدالله محمد بن ابی بکر أحمد بن الحسین بن علی البیهقی یبغداد فاقر به قلت اخبرکم جدک الامام ابو بکر أحمد بن الحسین البیهقی قراءة علیه واقر به ثم اخبرنا الشیخ . . . ابو عبد الله محمد بن الفضل بن أحمد بن محمد الفراوی الواعظ الفقیه قراءة علیه بنیسابور قال اخبرنا الشیخ الامام الحافظ ابو بکر أحمد بن الحسین بن علی البیهقی رحمة الله علیه قراءة علیه فی شعبان سنة تسع وأربعین وأربع مایة.

قال کتاب أسماء الله . . . باب إثبات أسماء الله تعالی ذکره بدلالة الکتاب والسنة وإجماع الأمة . . .

اوراق ۳۹۱، سطور ۱۷، خط نسخ خفی [قسطمونی: ۲۱۰]

## (٥) مجموعه

اوراق ۱٤۳، سطور ۱۹، خط نسخ غیر مشکول [قسطمونی: ۱۲۷]

(i) کتاب الجواهر (ورق ۱—۷) مصنفه ابو حامد محمد بن محمد الغزالی[۱٦] (م ٥٠٥ / ۱ ۱۱۱).

(ii) کتاب الأربعین فی أصول الدین (ورق ۸—۷۰) مصنفه غزالی. مکتوبه ٤ محرم سنه ٥٤٤ﻫ مدرسه نظامیه نیشاپور.

(iii) کتاب قواشم الباطنیة (ورق ۷۱—۷۸) یه بھی غزالی کی تصنیف ہے. ان کی اهل سنت کے علاوه تمام دیگر مذاهب سے دشمنی اور اسی طرح باطنیوں کے خلاف ان کا کھلا ہوا سخت فکری مجادله

۱۵. دیکھیے GAL I, 403; Suppl. I, 506

۱٦. دیکھیے GAL I, 538.

معلوم ہے[17]. ابھی تک اس سلسلے کی تصانیف میں صرف «کتاب المستظہری» کا ہی علم تھا جسے گولڈسیہر نے شائع کیا ہے اور جس کے متن کا دارومدار ایک ناقص نسخے پر رکھا تھا۔

«قواشم الباطنیہ» ایک مختصر رسالہ ہے جو سات اوراق پر مشتمل ہے... یہ «المستظہری» کا خلاصہ ہے۔ ابتدا میں مؤلف کہتا ہے

وابتدأت بتوفیق الله لاسعافک إلی ما تمسه من کلمات و جیزة جالیة بقصم ظہور الباطنیة ویستأصل دابر أباطیلهم... یستغنی ایجازها عما... طوّلناه به النفس فی الکتاب الملقب بالمستظہری.

اس مختصر مقدمہ کے بعد وہ اصولوں کو بیان کرتا ہے اور باطنیوں کے خیالات کو چار عنوانات میں جمع کرکے یکے بعد دیگرے سب پر بحث کرتا ہے اور ان کو منطقی دلیلوں سے غلط ثابت کرتا ہے۔

آغاز: استوفق الله الذی لم یلذ بیابه مخلص إلاّ عصمه ولم یتمرد عن عبودیته جبار إلاّ قصمه... وابتدأت.

اختتام: ... فان جاز لک أن تعرف بنظر العقل صدقه وإن کان ذلک مخالف جاز لی أیضاً أن أعرف هذه المسائل نور معلم وإن کان لی فیہا خلاف

(iv) المنقذ عن الضلال (ورق ٧٩—٩٦) مصنفه الغزالی[18].

مکتوبه سلخ ذی‌القعده سنه ٥٤٣ ھ درمدرسۂ مذکور

(v) القسطاس المستقیم (ورق ٩٧—١٢٥) مصنفه الغزالی[19]

مکتوبه یوم الأحد ٢٦ محرم سنه ٥٤٤ ھ درمدرسۂ مذکور

(vi) کتاب الجام العوام عن علم الکلام (ورق ١٢٦—١٤٣) یہ بھی الغزالی کی تصنیف ہے[20]

١٧. دیکھیے Islam Ansiklopedisi, Batiniye maddesi; I. Goldziher; *Streitschrift des Gazali gegen die Batinijja-Sekte*, Veroffentlichungen der De Gorje-Stifting, Leiden, 1916, Introduction.

١٨. دیکھیے *GAL* I, 544

١٩. دیکھیے *GAL* I, 540

٢٠. دیکھیے *GAL* I, 538

٦) کتاب التمهید فی معرفت التجوید اس تصنیف کے مؤلف ابوالعلا الحسن بن أحمد بن الحسن بن أحمد بن محمد العطار الهمذانی[۲۱] (م ٥٦٩/١١٧٣) ہیں جو عراق میں اپنے وقت کے تجوید کے عالموں میں سب سے بڑے خیال کیے جاتے تھے. ابن الجزری کے بقول[۲۲] العطار الہمذانی کا مرتبہ اہل مشرق کے لیے وہی ہے جو کہ مغرب والوں کے لیے علم تجوید کے میدان میں الدانی کا ہے. اس نادر نسخے پر مصنف کے ہاتھ کی تحریر کردہ ایک سند موجود ہے. اس کتاب کا ذکر ابن الجزری نے «التجوید» کے نام سے کیا ہے[۲۳]. اس سے ابتدائی عہد کے کچھ قراء کے متعلق اہم معلومات حاصل ہوتے ہیں.

ترقیمه : آخر کتاب التمهید ... و فرغ من انتساخه من أصل مصنفه المکتوب بخطه محمد بن إبراهیم بن الحسین بن محمد داد الجرباذقانی یوم الإثنین ١٧ رمضان من شهور سنة ٥٣٧ حامداً لله ...

اس کے نیچے ایک سماع کی عبارت ثبت ہے جس پر کسی نے سیاہ روشنائی پھیردی ہے : بلغ من أول هذا الکتاب سماعاً بقرأته علی صاحبه الشیخ ... کتبه الحسن بن أحمد بن أحمد [بن أحمد بن] بن الحسین ... العطار فی شهر الله الأصم رجب من سنة اثنین و خمسین [وخمس مائة].

آغاز : الحمد لله ... أما بعد فانک سألتنی اسعدک الله بطاعته أن أذکر لک جملاً فی تحقیق القرأة وترتیلها و تجوید التلاوة وترسیلها علی ماورد عن النبی ... و صحابته .. والتابعین ... فسألتک علی ما أنا علیه من تقسیم الفکر لترادف الغموم ... جاریاً علی المألوف من توخی رضاک ... وسلکت فی النهوض بعبئه ...

اوراق ٨٨، سطور ٢٠، خط نسخ [قسطمونی : ١٥٢٥]

۲۱- دیکھیے GAL Suppl. I, 724

۲۲- غایة النهایه فی طبقات القراء : ۲۰٤ (رقم ٩٣٢٠، ١٩٣٣)

۲۳- ایضاً : ۲۰٤

(۷) عوارف المعارف مصنفه شهاب الدین ابو حفص عمر بن محمد السهروردی (م ۶۳۲ / ۱۲۳۴). اس کتب خانے میں «عوارف» کے تین نسخے موجود ہیں:

(i) مکتوبه: ابوالفتح سعید بن سعید الاصفهانی، ضحوة یوم الخمیس ۱۵ رمضان ۶۲۷ ھ، مکه.

سرورق پر دوسری روشنائی اور غالباً دوسرے قلم سے: استکتبه الفقیر... کحلی (؟) بن بکمش القطبی أحد أصحاب الأمیر... شمس الدین...

«عوارف» کے قدیم نسخوں[24] میں اس نسخے کا بھی شمار ہو سکتا ہے.

اوراق ۱۶۳، سطور ۲۱، خط معمولی نسخ [قسطمونی: ۱۵۶۳]

(ii) مکتوبه: ۶۱۵ ھ (یا ۷۱۵ ھ؟)

اوراق ۳۰۳، سطور ۱۹، خط نسخ جلی [قسطمونی: ۹۰۴]

(iii) مکتوبه: محمد بن امام، ۱۵ صفر ۷۴۸ ھ، خانقاه السمیساطیه، دمشق

اوراق ۳۰۲، سطور ۱۹، خط نسخ مشکول [قسطمونی: ۱۶۴۱]

(۸) مجموعه

اوراق ۱۷۵، سطور ۱۹، خط نسخ خفی [قسطمونی: ۶۰۴]

(i) مقدمة عوارف المعارف (ورق ۱—۳)

(ii) تفسیر خطبة عوارف المعارف (ورق ۴—۱۶) کتاب پر مصنف کا نام یعقوبی دیا ہوا ہے.

آغاز: قوله الحمد لله ای الثناء لله والشکر له. قوله العظیم شأنه العظیم الزیادة.

(iii) اعلام الهدیٰ و عقیدة أرباب التقی[25] (ورق ۱۷—۳۵)

مکتوبه: علی بن محمد بن ابی بکر الساوی المعروف بالتبریزی. یوم الثلاثاء ۲۳ محرم ۷۰۷ ھ. دمشق.

۲۴- دیکھیے: GAL I, 569; Suppl. I, 788; H. Ritter, Philologika IX: Der Islam, XXV, 1938, p. 36

۲۵- دیکھیے H. Ritter, no. 51 and GAL, no. 3

آغاز: الحمد لله الذی رفع غشاوة الغمة عن بصایر أهل الوداد...

(vi) اللوامع الغیبیه (ورق ۳۵—۳۶) مصنفه سہروردی. روح کے متعلق ایک مختصر رسالہ[۲۶]

(v) (ورق ۳۷—۴۱) سہروردی کے مختلف اقوال پر مشتمل ایک رسالہ. ہر قول لفظ «فتوح» سے شروع ہوتا ہے.

(vi) (ورق ۴۱—۴۴) خراسان کے بعض صوفیوں سے استفسارات کے جواب میں[۲۷] سہروردی کا رسالہ.

آغاز: وقد سألت رحمك الله وايانا هذه الأسئلة و أنا ... أجيب عن بعضها...

(vii) ورق (۴۴—۴۵) روح حیوانی کے متعلق سہروردی کے کچھ اقوال[۲۸]

آغاز: قال الروح الحيوانی المجنّس المسمّی نفسا حيث تجنس بورود الروح العلوی...

(viii) رسالة السیر و الطیر (ورق ۴۵—۴۷) یہ بھی سہروردی کی تصنیف[۲۹] ہے.

آغاز: قال رسول الله ... سیروا سبق المفردون قيل من المفردون...

(ix) وصیت و مختصر اقوال (ورق ۴۷—۷۱)

مکتوبہ: ۲۶ صفر ۷۰۷ ہجری

(x) ذکر ألفاظ تدور بين الطائف الصوفية (ورق ۷۲—۷۶) تصوف کی بعض اصطلاحات کا مختصر ذکر.

(۹) اس مجموعہ کا خاص حصہ مشہور فخرالدین رازی (م۶۰۶/۱۲۰۹) کی «نهاية الايجاز فی دراية الإعجاز» نامی تصنیف پر مشتمل ہے[۳۰]

مکتوبہ: محمد بن ابی بکر، ۱۴ محرم ۷۰۷ ہجری

---

۲۶. دیکھیے GAL no. 29

۲۷. دیکھیے GAL I, 570, no. 11

۲۸. دیکھیے GAL S I, 790, no 28.

۲۹. دیکھیے F. Ritter, no. 52; GAL, no. 29.

۳۰. دیکھیے GAL Suppl. I, 924, no. 32.

**(١٠) الدرة الفريدة فى شرح القصيدة** مصنفه منتجب الدين بن ابی العز بن رشید الهمذانی[٣١] (م ٦٤٣ ١٢٤٥). علم قراءت سے متعلق الدانی کی «التیسیر» کو شاطبی (م ٥٩٠/١١٩٤) نے نظم کا جامہ پہنایا تھا جس کا نام «الشاطبیہ» تھا[٣٢]. پیش نظر کتاب جس کے کسی دوسرے نسخے کا اب تک علم نہیں ہو ہے، اسی منظوم کتاب کی شرح ہے اور یہ غالباً وہی کتاب ہے جس کا ذکر ابن الجزری نے کیا ہے[٣٣].

اس نسخے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسے محمد بن أحمد بن ابی الفضل نے جو اناطولیہ میں سلجوقیوں کے دور کے مشہور خاندان ابوالفضل التفلیسی سے تعلق رکھتے تھے، شام میں سنہ ٦٥٢ھ میں خریدا تھا. اس نسخے پر ان کی حسب ذیل تحریر ہے:

إنتقل بحكم الشرى إلى أضعف خلق الله ... محمد بن أحمد بن ابی الفضل الحافظ التفليسي بمحروسة دمشق فی سنة اثنی و خمسين و ستماية ...

اس پر ابو عمرو عثمان بن موسیٰ الضریر المصری القرشی کی دی ہوئی ایک سند سماع بھی موجود ہے کہ سنہ ٦٥٣ھ میں شہر سیواس میں شمس الدین محمد بن حمید (؟) بن ابی الفضل التفلیسی اور ابو یزید بن إبراهیم نے مندرجہ بالا کتاب کی جلد دوم کے کچھ حصے پڑھے.

اوراق ٢٤٧، سطور ١٧، خط نسخ مشکول [قسطمونی: ٧]

**(١١) كتاب معرفة أنواع علم الحديث** مصنفہ ابو عمر عثمان بن عبدالرحمن بن عثمان ابن الصلاح. یہ ساتویں صدی کے مشہور محدث تھے. ان کی پیدایش ٥٧٧/١١٨٢ میں بمقام شہرزور ہوئی تھی. تعلیم موصل میں شروع ہوئی اور اس زمانے کے مختلف علم کے مرکزوں کی سیر کرتے ہوئے خراسان پہنچے اور وہیں ان کی تعلیم مکمل ہوئی. کچھ عرصہ بعد شام گئے جہاں انہوں نے سکونت اختیار کرلی اور جہاں وہ

---

٣١. دیکھیے G.AL I, 526; Suppl. I, 7?6. اور ابن الجزری: غاية النهاية (٢ : ٣١٠)
٣٢. دیکھیے G.AL I, 3?0
٣٣. دیکھیے G.AL II, 310

مدرسۂ اشرفیہ میں حدیث کے شیخ ہوگئے. ان کی وفات سنہ ۱۲۴۳،۶۴۲ میں شام میں ہوئی[۳۴].

اس کتاب کا ایک بہت خوبصورت قلمی نسخہ استنبول میں موجود ہے[۳۵]. پیش نظر نسخہ مصنف کی زندگی میں ان کے پڑھے ہوئے ایک نسخے سے محمد بن سلیمان المقدسی نے نقل کیا ہے.

ترقیمہ: فرغ من نسخه من أصل مصحح متقن مضبوط مسموع على شيخنا الإمام ... صدر الحفاظ مفتى الشام تقى الدين أبى عمرو عثمان بن عبدالرحمن بن عثمان المعروف بابن الصلاح ... فى عشرين من شهر المحرم سنة احدى و أربعين و ستماية و كتب العبد... محمد بن سليمان المقدسى

اوراق ۱۰٤، خط ترکی نسخ [قسطمونی: ۲۰]

(۱۲) شرح الوافیہ مؤلفہ ابوالفداء[۳۶] (م ۷۳۲ / ۱۳۳۱) کتاب الکافیہ مصنفۂ ابن حاجب[۳۷] (م ٦٤٦ / ١٢٤٩) فن نحو کی مشہور کتاب ہے، طلبا کی آسانی کے لیے اسے نظم کا جامہ پہنایا گیا تاکہ نحوی مسائل حفظ کرنے میں انہیں آسانی ہو. اس کا نام «وافیہ» رکھا گیا. اس کا ایک نسخہ اسکوریال کے کتب خانے میں محفوظ ہے[۳۸]. پیش نظر نسخہ اسی کتاب کی شرح ہے.

آغاز: الحمد لله الذى علم بالقلم ... و بعد فانى لما وجدت منظومة الشيخ... جمال الدين أبى عمرو بن الحاجب فى النحو المسماة بالوافية من أفضل أراجيز نظماً ولم أجد لها شرحاً توافق غرضى آثرت أن أعلق عليه شرحاً لطيفاً

ترقیمہ: كان فراغ مؤلفه العبد الفقير ... اسمعيل بن على بن محمود

---

۳۴ دیکھیے GAL 1, 440; Suppl. , 610

۳۵. دیکھیے M. Weisweiler, İstanbuler Handschriften zur arabischen Traditionsliteratur, Bibliotheca Islamica, X, (Istanbul, 1937), no. 6.

۳۶. دیکھیے GAL II; 55; Islam Ansiklopedisi, Ebu'l-Fida maddesi

۳۷. دیکھیے GAL 1, 367; Suppl. 1, 531

۳۸. دیکھیے Escurial, no. 146; GAL 1, 370

بن محمد بن عمر ابن شہنشاہ بن ایوب من تعلیقه فی یوم الأحد سابع عشر شعبان المکرم سنة ۷۲۳ ..... حامداً لله .....

مکتوبہ بخط مصنف

اوراق ۱۴۳ ، سطور ۲۱ ، خط نسخ [قسطمونی : ۲۸۹۲]

(۱۳) کتاب الفصول مصنفہ بقراط. یہ کتاب حنین بن إسحاق کی کتاب کا ترجمہ ہے[۳۹].

مکتوبہ ۷۰۳ ہجری [قسطمونی : ۱۰۴۵]

(۱۴) المنتقیٰ فی الأحکام عن خیرالأنام مصنفہ عبدالسلام بن عبداللہ بن تیمیة الحرّانی[۴۰] (م ۶۵۲ / ۱۲۵۴).

مکتوبہ ۶۵۱ ہجری [قسطمونی : ۸۸۰]

(۱۵) معانی الاخبار مصنفہ محمد بن إسحاق الکلاباذی[۴۱] (م ۳۸۰، ۹۹۰)

مکتوبہ ۷۸۵ ہجری [قسطمونی : ۱۳۹۸]

(۱۶) شرح الصدور بشرح حال الموتیٰ فی القبور مصنفہ جلال الدین السیوطی[۴۲].

مکتوبہ بخط مصنف ۱۵ جمادی الآخر ۸۸۳ ھ [قسطمونی : ۱۱۴۴]

(۱۷) کتاب التوحید مصنفہ ابو بکر محمد بن إسحاق بن خزیمة النیسابوری[۴۳] (م ۳۱۱، ۹۲۳). [قسطمونی : ۳۰۲۵]

(۱۸) تاریخ مصر مصنفہ علی بن أحمد السخاوی. یہ مصر کی مختصر تاریخ ہے جو سنہ ۸۰۹ھ سے سنہ ۸۸۷ ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے.

---

۳۹. دیکھیے GAL 1, 226

۴۰. دیکھیے GAL 1, 504

۴۱. دیکھیے GAL 1 217; Suppl. 1, 360

۴۲. دیکھیے GAL 11, 180, no. 30

۴۳. دیکھیے GAL 1, 206

آغاز : ذکر سلطنة الملك الناصر فرج ابن برقوق الثانية لما جلس الملک الناصر فرج على تخت الملک ثانی مرّة أستقار أمره. واحتوى بأمور المملكة... الحوادث فى سنة ٨٠٩

اختتام : ... وقع الفراغ من جمعه على يد كاتبه على بن أحمد السخاوى نسباً الحنفى مذهباً في ليلة يسفر صباحها عن يوم الجمعة الثامن عشر من المحرم سنة سبع ثمانين ثمانماية يتلوه إن شاء الله أول سلطنة الأشرف قايتباى.

مکتوبه بخط مصنف

اوراق ٦٧٠ سطور ١٩، مصري نسخ† [قسطمونی : ١٢٩]

[* ]

† International Society for Oriental Research کی ششماہی رسالہ Oriens جلد ٥ صفحات ٢٨—٤٦ کی ایک ترکی مضمون سے ترجمہ کیا گیا.

ڈاکٹر محمد غوث، ایم اے، پی ایچ ڈی

# استنبول کے کتب خانے

گزشتہ ستمبر مین استنبول مین مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس کا بائیسوان اجلاس منعقد ہوا، اس مین شرکت کے سلسلہ مین شرق وسطیٰ مین چار مہینون کے سفر کا موقع حاصل ہوا، کانگرس ختم ہونے کے بعد ترکی کے شہرون اور قصبون مین کتب خانون عجائب خانون اور کتابون کی نمائشون کو دیکھنے کے لیے تین مہینون کا دورہ کیا گیا، اور بروسہ، بالکی سر، قیصاریہ، افیون قرہ حصار، کونیہ، اسکی شہر، ازنیہ اور انقرہ مین قلمی اور مطبوعہ کتابون کے متعدد سرکاری اور غیر سرکاری ذخیرے دیکھے، ترکی سے واپس ہوتے ہوئے حلب، بیروت، دمشق، بیت المقدس اور بغداد مین مخطوطون،

یونی ورسٹیون اور علمی اداروں کے کتب خانوں اور عجائب خانوں کو بھی دیکھنے کا موقع ملا، ہر جگہ کتب فروشوں کی چھوٹی بڑی دکانیں بھی دیکھیں

ترکی اور دوسرے مقاموں کے ذمہ داروں نے کتابوں کی تنظیم، فہرستوں کی ترتیب اور دوسرے نظم ونسق کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کا بڑی کشادہ دلی اور اخلاق کے ساتھ انتظام کیا،

اس سفر میں جو معلومات حاصل ہوئے، ان میں دوسرے ذوق آشناؤں کو بھی شریک کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، اور ان کو مضمون کی شکل میں ناظرین معارف کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، اس مضمون میں صرف استنبول کے کتبخانوں کا ذکر کیا جائے گا، اور انشاء اللہ دوسرے مقامات کے کتبخانوں اور دوسرے علمی و تعلیمی حالات کو دوسرے مضمون میں قلم بند کیا جائے گا، واللہ الموفق،

استنبول کے کتب خانے زمانۂ قدیم سے مشہور ہیں، اور دور دور تک اُن کی شہرت ہے، یہ کتبخانے ترکوں کے اعلیٰ علمی ذوق اور خدمتِ علم کی ایسی شہادت ہیں، جس کی تردید ممکن نہیں،

ترکی کے شہروں اور قصبوں میں جہاں جائیے ہر جگہ ترکوں کی تعمیری نابیت اور تنظیمی قوت کا مظاہرہ ہوتا ہے، ترکوں کی قوم عملی قوم ہے، کچھ کرکے دکھانے کا شوق اس کی قومی خصوصیت ہے، یہ خصوصیت کتبخانوں کے دیکھنے سے بھی ظاہر ہوتی ہے،

صدیوں قبل سے استنبول کو چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں تک کے لوگ کتابیں جمع کرنے اور اُن کی حفاظت کے انتظامات کے شائق رہے ہیں، اور اب جب کہ ان کتابوں کو قومی امانت قرار دیا جارہا ہے، اُن کی اہمیت اور قیمت سے واقف ہوتے جاتے ہیں، اور خوشی خوشی اپنے بزرگوں کی جمع اور نادر کتابیں سرکاری کتب خانوں میں محفوظ کراتے چلے جارہے ہیں، اور کتابوں کا ایسا بیش قیمت ذخیرہ بہترین انتظامات کے ساتھ عام استفادہ کے لئے مہیا ہوتا جارہا ہے جس کے اثرات علمی دنیا میں بہت گہرے ہوں گے،

استنبول مین اولاً مسجدون اور دوسری مذہبی عمارتون مین کتابون کی فراہمی شروع ہوئی تھی پھر اُن کے احاطون مین مخصوص حجرے تعمیر کرکے ان مین کتابون کو جمع کرنا شروع کیا گیا تھا، پھر بعد مین کتب خانون کے لئے مستقل عمارتین تعمیر ہوئین،

پہلی دو قسمون کے کتب خانون کے لئے کتابون کی فراہمی سلطان محمد فاتح نے شروع کی تھی، اور مسجد ایوب مین اس کی ابتدا ہوئی، گویا ۸۵۷ھ؁ ۱۴۵۳ء؁ مین استنبول کے فتح ہوتے ہی مسجد ایوب مین کتابین بھی فراہم ہونے لگین،

مسجدون سے الگ سب سے پہلا مستقل کتب خانہ استنبول مین قائم ہوا جو کوپرو لو کا کتب خانہ کہلاتا ہے، ۱۰۷۲ھ؁ ۱۶۶۱ء؁ مین یہ کتب خانہ قائم ہوا، اس کتب خانہ کی بلند و بالا نفیس اور شاندار عمارت کے ساتھ اس کی کتابین بھی مشہور عالم ہین،

یون تو ہر عالم کے ہان کار آمد اور ضروری کتابون کا ذخیرہ ہوتا ہی تھا، لیکن آگے چل کر کتابون کو عام استفادہ کے لئے وقف کرنے کا رواج شوق کی حد تک پہنچ گیا، چنانچہ کتب خانون کے متم دوست بانیون نے جو خود بھی بڑے عالم و فاضل ہوتے تھے، نہ صرف کتابین وقف کین، بلکہ اُن کے رکھ رکھاؤ، اور اعلیٰ درجہ کے انتظام و اہتمام کے لئے بڑی بڑی جائدادین بھی وقف کین،

وقف نامون مین کتب خانہ کے ملازمین کے تقرر وغیرہ کے علاوہ کتب خانہ کے روزانہ کھلنے اور بند ہونے کے اوقات تک کی صراحت ہوتی تھی،

ترکی کے طول و عرض مین جو بے شمار کتب خانے قائم ہوئے، اُن کی عمارتون اور کتابون کے ذخیرون کو آگ اور زلزلون سے بھی بہت نقصان پہنچا، ایسے اوقاف جو سلطنت عثمانیہ کے ماتحت ملکون اور علاقون مین قائم کئے گئے تھے، پہلی جنگ عظیم کے بعد اُن سے ہاتھ دھونا پڑا،

اس لئے اس جنگ کے بعد یہ کوشش شروع کی گئی کہ کتابین مزید حفاظتی انتظامات کیساتھ

موزون عمارتون مین جمع کی جائین، اور کتب خانون کی خاص خاص خصوصیتین بھی برقرار رکھی جائین، اور ناظرین وشائقین کو بھی زیادہ سے زیادہ سہولت وآسانی حاصل ہو

چنانچہ اس وقت سارے استنبول کے (۱۰۵) کتب خانون کو (۱۱) کتب خانون مین ضم کردیا گیا ہے۔

استنبول اور مملکتِ ترکیہ مین جو کتب خانے موجود ہین، اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) ایسے کتب خانے جن کے اخراجات سررشتۂ تعلیمات کی وساطت سے مرکزی حکومت برداشت کرتی ہے، ترکی حکومت مین ۹۴ ہین جن مین ۳۰ شہر استنبول مین ہین،

ان کتب خانون مین وہ کتب خانے شامل نہین ہین جن کے اخراجات گو حکومت ہی بالواسطہ یا بلاواسطہ برداشت کرتی ہے، لیکن جو یونیورسٹیون یا دوسرے سرکاری ادارون سے متعلق ہین، عجائب خانون سے ملحق کتب خانے بھی جدا ہین،

(۲) وہ کتب خانے جن کے اخراجات اضلاع کی حکومت برداشت کرتی ہے، اور وہ سررشتۂ تعلیمات کی عام نگرانی مین ہین،

(۳) وہ کتب خانے اور دارالمطالعہ جو پبلک کے خرچ سے اور اُن کے انتظام کے تحت چلائے جاتے ہین، (۲۰۰) ہین،

(۴) ایسے کتب خانے جو خانگی انجمنون یا علم دوست افراد نے قائم کئے ہین، ملک بھر مین پھیلے ہوئے ہین، چنانچہ ازمیر (سمرنا) کا قومی کتب خانہ اسی نوعیت کا ہے،

(۵) علمی ادارون کے کتب خانے جن کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے، مثلاً لسانی ادارہ اور انجمن تاریخ کے کتب خانے،

اس وقت استنبول مین جو کتب خانے موجود ہین، ان کے نام یہ ہین،

۱- عجائب خانۂ آثار قدیمہ کا کتب خانہ ، ۲- کتب خانۂ عاطف آفندی ،

۳- کتب خانۂ ایا صوفیا ، ۴- کتب خانۂ بلدیہ ،

۵- کتب خانۂ عمومی بایزید ، ۶- کتب خانۂ مسجد فاتح ،

۷- کتب خانۂ خسرو پاشا ، ۸- کتب خانۂ کوپرولو ،

۹- نت کتب خانہ ، ۱۰- کتب خانۂ مراد ملا ،

۱۱- نور عثمانیہ کتب خانہ ، ۱۲- کتب خانۂ رعب پاشا ،

۱۳- کتب خانۂ سلیم آغا ، ۱۴- کتب خانۂ عام سلیمانیہ ،

۱۵- کتب خانۂ توپ قپو سرائے ، ۱۶- کتب خانۂ انجمن ترکیات ،

۱۷- کتب خانۂ استنبول یونیورسٹی ، ۱۸- کتب خانۂ ولی الدین آفندی ،

ان مین سے بعض کتب خانے روزانہ صبح کے ۹ بجے سے شام کے ۵ بجے تک کھلے رہتے ہین ، بعض کتب خانون مین مہینہ مین ایک مرتبہ سہ شنبہ کو باری باری سے صفائی کے لئے تعطیل ہوتی ہے ،

عموماً سب کتب خانون مین داخلہ کی عام اجازت ہے لیکن عجائب خانۂ آثار قدیمہ کے کتبخانہ، کتب خانۂ بلدیہ ، توپ قپو سرائے کے کتب خانہ اور یونیورسٹی لائبریری مین داخلہ خاص اجازت سے ہوتا ہے ، ان کتب خانون کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات سرکاری دفترون کے اوقات کے مطابق ہین ،

اوپر جن کتب خانون کا تذکرہ کیا گیا ہے ، ان مین سے بعض کی کتابین کل کی کل مطبوعہ ہین ، مثلاً عجائب خانۂ آثار قدیمہ کا کتب خانہ ، اس مین بیس ہزار کتابین ہین جو سب مطبوعہ ہین ، اسی طرح ادارۂ ترکیات کے کتب خانہ مین (۱۲۰۰۰) کتابین موجود ہین ، لیکن یہ بھی تمام کی تمام مطبوعہ ہین ،

انہین سے بعض کتب خانون کو مطبوعہ کتابون کے ذخیرہ ہی کی وجہ سے امتیاز حاصل ہے لیکن ان میں

قلمی کتابین بھی کچھ نہ کچھ موجود ہین، جیسے بلدیہ کا کتب خانہ، اس کتب خانہ مین (۵۲۲۶۶) کتابین جمع ہین لیکن قلمی کتابین صرف (۱۰۳۲) ہین،

بعض کتب خانون مین اصلی ذخیرہ قلمی کتابون کا ہے لیکن مطبوعہ کتابین بھی موجود ہین، مثلاً کتب خانہ ایا صوفیا مین (۴۹۰۸) مخطوطات کا ذخیرہ ہے لیکن مطبوعہ کتابون کی کل تعداد صرف (۴۴) ہے،

بعض کتب خانون مین مطبوعہ اور مخطوطہ دونون قسم کی کتابون کا بڑا وافر ذخیرہ ہے مثلاً بایزید عمومی کتب خانہ مین (۴۷۹۰) مخطوطات اور (۷،۱۲۱۹) مطبوعہ کتابین ہین، اسی طرح یونیورسٹی کے کتبخانہ مین (۱۳۵۰۶) مطبوعہ کتابین، اور (۴۰۷۷۷) مخطوطات ہین،

غرض استنبول کے موجودہ کتب خانون مین (۴،۱۲۳۳،۳) مخطوطات استفادہ عام کے لئے ہر صاحب علم کی دست رس مین ہیں، اور ابھی نجی کتب خانون اور کتابون کو حکومت، یا کتب خانون کے سپرد کردینے کا سلسلہ جاری ہے،

ملت لائبریری مین جو کتب خانے شامل کئے گئے ہین، اُن مین سب کو علحدہ علحدہ کمرون مین رکھا گیا ہے،

ان تمام کتب خانون مین حسب ضرورت فرنیچر، دوسرے ضروری سامان اور خوش اخلاق و مستعد عملہ موجود ہے، سامان ایسا ہے جس سے شان و شوکت کا بھی اظہار ہوتا ہے، صفائی اور پاکیزگی تو ایک عام بات ہے، جس کا مشاہدہ ہر جگہ ہوتا ہے،

ہر کتب خانہ مین کارڈ کیٹلاگ کو رواج دیا جارہا ہے، قلمی کتابون کی فہرستین رجسٹرون مین بھی ہین،

صرف ایک شہر مین ایک لاکھ سے زیادہ قلمی کتابون کا بہترین انتظامات کے ساتھ استفادۂ عام

کے لئے مہیا ہونا علمی دنیا کے لئے ایک غیر معمولی بات ہے،

یہ ساری قلمی کتابیں عربی ترکی اور فارسی کی ہیں، مگر زیادہ تعداد عربی کتابوں کی ہے،

یورپ اور دوسرے ملکوں کے بڑے بڑے کتب خانوں میں صرف چند ہزار عربی اور فارسی اور ترکی قلمی کتابیں ہیں[1] لیکن چونکہ اُن کی تفصیلی فہرستیں بڑی محنت و قابلیت اور بڑی جانکاہی سے مرتب کی گئی ہیں، بڑے اہتمام سے چھاپی گئی ہیں، اور آسانی سے حاصل ہو جاتی ہیں، اس لئے اُن کی عام شہرت ہو گئی، لیکن استنبول کے اس عظیم الشان ذخیرہ پر جب کچھ اصحاب علم اپنی عمریں صرف کر دیں گے، اس وقت اس کی اہمیت اور ندرت کا عام اندازہ ہو سکے گا، خوشی کی بات ہے کہ اس کا اہتمام ہو رہا ہے، چنانچہ وزارت تعلیمات کے تحت کتب خانوں کے ڈائرکٹر کی نگرانی میں ایک خاص کمیشن استنبول کے کتب خانوں کی فہرستیں مرتب کرنے کے لئے مامور ہوا ہے،

اس مضمون میں ہر کتب خانہ کے الگ الگ حالات اور خصوصیات بیان کرنے کی گنجایش دشوار ہے، اس لئے صرف استنبول یونی ورسٹی لائبریری کے متعلق کچھ وضاحت یہاں کی جاتی ہے،

اس کتب خانہ کا آغاز ۱۹۲۴ء میں ہوا، اس کی تین منزلہ عمارت یونیورسٹی کی مرکزی عمارت سے علٰحدہ لیکن اُسی کے قریب واقع ہے، استنبول کی موجودہ یونیورسٹی کے قیام سے پہلے جو دار الفنون قائم تھا، اس کے

---

[1] مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند کتب خانوں کی کتابوں کے اعداد کا بیان ذکر کر دیا جائے، اس کی تفصیل کے لئے خود ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے،

پورے استناد کے ساتھ اعداد بیان کرنا مشکل ہے، اس لئے کہ اس وقت تک اس کا مستند مواد بہت کم فراہم ہو سکا ہے، جو اعداد معلوم ہیں، وہ ۱۰۰، ۹ سال بلکہ ۵۰، ۶۰ سال قبل کے ہیں، تاہم عمومی اندازہ کے لئے کافی حد تک یہ اعداد کافی ہیں،

برٹش میوزیم میں مخطوطات فارسی کی تعداد ۰۱۰ ۲۹ ہے،

شعبہ ہائے ادبیات، سائنس، دینیات اور قانون کی کتابین اس کتب خانہ کے لئے دے دی گئی تھین، پھر دوسرے خانگی کتب خانے بھی اس مین شامل کر دیئے گئے، حکومت نے سلطان عبدالحمید خان ثانی کا کتبخانہ بھی اس کو دے دیا، اس طرح کتب خانہ کے قیام کے بعد سے کتابون کے اضافہ کا سلسلہ برابر جاری ہے؛

۱۹۳۳ء مین جب یونیورسٹی کی جدید تنظیم ہوئی، اور مختلف شعبون (فکلیٹیز) نے اپنے لئے علحدہ علحدہ کتب خانون کا قیام ضروری سمجھا، اُس وقت سے یونیورسٹی لائبریری مین جو کتابین فراہم کی جاتی ہین، اُن کی نوعیت یہ ہے،

۱- ایسی کتابین جو انسائیکلوپیڈیا یا ببلوگرافی کی نوعیت کی ہون،

---

(بقیہ حاشیہ ص۹۰۳) ڈاکٹر ریو نے فارسی کیٹلاگ کے دیباچہ مین لکھا ہے، کہ برٹش میوزیم مین عربی مخطوطات کی تعداد ۵۰۰۰ تک نہین پہنچی ہے، اور دوسری مشرقی زبانون کی قلمی کتابین اور بھی کم ہین، انڈیا آفس مین فارسی مخطوطات کی تعداد = ۲۰،۷۶ ہے،

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال مین فارسی مخطوطات کی تعداد کرزن کلکشن کو ملا کر کل ۲۵۴۳، ہے، بمبئی یونیورسٹی مین عربی فارسی اور اردو مخطوطات = ۱۶۷۲- مدراس کے مشرقی مخطوطات کے کتب خانہ مین عربی فارسی اور اردو مخطوطات ۹۲۵۰، نیشنل لائبریری کلکتہ کی بوہار کتب خانہ مین عربی فارسی قلمی کتابین کل ۹۴۴ ہین، بانکی پور کی خدا بخش لائبریری میں ۱۵۲۳ فارسی کے اور (۲۶۴۲) عربی کے مخطوطات ہین، حیدرآباد دکن کے کتب خانہ آصفیہ مین غیر سرکاری اطلاع کے بموجب جو مجلہ نوائے ادب بمبئی مین شائع ہوئی، عربی فارسی اور اردو مخطوطات کی تعداد (۱۴۰۰۰) ہے، حیدرآباد کے کتب خانہ سعیدیہ مین قلمی کتابون کی تعداد ۲۱۵۱ یا اس سے کچھ زیادہ، علیگڈھ مسلم یونیورسٹی مین قلمی کتابین (۴۰۰۰) ہین، یہ اعداد محض اندازہ کے لئے بیان کئے گئے، ورنہ صحیح اعداد اور دوسری تفصیلات معلوم کرنے کے لئے کافی وقت کی ضرورت ہے؛

۲۔ وہ کتابین جن کا تعلق عام ادب سے ہے،

۳۔ وہ کتابین جو قدیم ترکی رسم الخط (عربی رسم الخط) مین لکھی گئی ہون،

۴۔ ۱۹۳۳ء مین یہ قانون منظور ہوا کہ مملکتِ ترکیہ مین جو بھی کتاب، رسالہ یا اخبار طبع و شائع ہو اس کا ایک نسخہ اس یونیورسٹی لائبریری مین محفوظ کیا جائے،

۵۔ تبادلہ مین بعض یوروپین یونیورسٹیون سے سائنٹفک مطبوعات حاصل کیجاتی ہین،

اس کتب خانہ کا ذخیرہ کتب مطبوعات اور مخطوطات دونون پر مشتمل ہے، مطبوعہ کتابون کے بڑے حصہ کا موضوع یا مشرق ہے، یا ترکی مملکت، ترکی مطبوعات کے لئے یہ کتب خانہ ساری دنیا مین خصوصی حیثیت کا حامل ہے،

اس یونیورسٹی لائبریری کے مخطوطات جو کم و بیش بیس ہزار ہین، ترکی، عربی اور فارسی زبانون کے ہین، اور ان مین بے شمار ایسے نسخے بھی شامل ہین، جو خطاطی، مصوری، نقاشی، اور جلد سازی کے بے مثل نمونہ ہین، وہ ایک ایک نسخہ صناعی اور مہارتِ فن کا گویا ایک شاہکار ہے، جس کے دیکھنے سے آنکھون کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے،

قرآن شریف کے نسخون مین، رق پر لکھے ہوئے نمونے بھی جو ابتدائی صدیون کی یادگار ہین، موجود ہین، اور عرب اور ایران، ترکستان، ہندوستان، افغانستان، اور عثمانی ترکون کی سلطنت کے مختلف علاقون کے مشہور خطاطون، عالمون اور حافظون کے لکھے ہوئے، مصاحف، ابتدائی کوفی خط سے لیکر اعلیٰ درجہ کے نسخ و نستعلیق تک مین یہان موجود اور باصرہ نواز ہین، ان مصحفون مین سادہ اوراق سے لے کر فن کاری کے اعلیٰ ترین دیدہ زیب اور دل نواز نمونے ع:-

"دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار"

کے مصداق ہین۔[1]

---

اس کتب خانہ کے معتبر نسخون کی فہرست جو ناظم کتب خانہ فہمی ادہم نے مرتب کی ہے، بڑے اہتمام سے پیرس میں ۱۹۳۳ء مین شائع ہوئی ہے،

ترکی زبان کے رسالے اور مجلے جو اس کتب خانہ مین آتے ہین، اُن کی تعداد (۳۴۰) اور اخبارات کی (۲۰۰) ہے[1]

چونکہ کتب خانہ کی عمارت تنگ ہے، اس لئے اس سے استفادہ بھی محدود رکھا گیا ہے، اور صرف اساتذہ اور اعلیٰ جماعتون کے طلبہ کو استفادہ کی اجازت ہے، البتہ کتب خانہ مین ایک ایسا کمرہ بھی ہے جہان طلبہ خود اپنی ذاتی کتابون کا مطالعہ کر سکتے ہین، یہ دار المطالعہ روزانہ صبح کے سات بجے سے رات کے دس بجے تک کھلا رہتا ہے،

مطالعہ اور تحقیقی کام کرنے والون کو خاص اجازت سے استفادہ کی سہولت حاصل ہو جاتی ہے، اس کتب خانہ کے لئے ایک نئی موزون عمارت کی تعمیر زیر تجویز ہے، اس کی تعمیر کے بعد کتب خانہ سے استفادہ کا دائرہ بھی وسیع ہو جائے گا،

اس لائبریری مین دو قسم کی عام فہرستین ہین، ایک ڈکشنری سسٹم پر، دوسرے اعشاری طریقہ کی تقسیم علوم والی فہرست، عربی اور فارسی مطبوعہ کتابون کی فہرستین اُن کے رسم الخط مین علحدہ علحدہ مرتب اور مہیا ہین قلمی کتابون کی فہرست علحدہ ہے،

اس کتب خانہ کی مختلف نشریات کی تعداد ۱۹۵۱ء تک (۴۹) تک پہنچ چکی ہے، ان مین سے دو مطبوعہ فہرستین تحفہ کے طور پر راقم کو بھی حاصل ہوئین، ان مین ایک کتب خانہ کی فارسی مطبوعہ کتابون کی فہرست ہے، جو ۱۹۴۹ء مین طبع ہوئی ہے، اس کے مرتب فہمی ادہم ہین، یہ فہرست علوم اور مولفون کے نام کے لحاظ

(بقیہ حاشیہ ص ۹۰۵) علحدہ درج ہوئی ہین جن کو دیکھتے دیکھتے آدمی تھک جائے، اور کتابین ختم نہ ہون۔

[1] ان اعداد سے ترکی کی عام تعلیمی اور علمی ترقی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

سے حروفِ تہجی کی ترتیب پر مرتب کی گئی ہے، اور استنبول مین نہایت خوبصورت طبع ہوئی ہے، ایران اور ایرانیات پر دوسری زبانون کی جو کتابین کتب خانہ مین محفوظ ہین، وہ بھی اس فہرست مین شامل کر دی گئی ہین،

دوسری فہرست عربی کی قلمی کتابون کی ہے، اس کے مرتب بھی تہمی اوہم ہین، یہ نشریہ عربی مخطوطات کی فہرست کی پہلی جلد کا پہلا حصہ ہے، اس حصہ مین قرآن مجید اور اس سے متعلقہ علوم کے (۳۳۲) مخطوطات کا تذکرہ ہے، ان مین سے (۲۵۰) قرآن مجید ہین اور باقی تجوید وغیرہ فنون کے قلمی نسخے، دس تصویرین بھی اس نشریہ مین ہین، آٹھ تصویرین قرآن شریف کے مختلف نسخون کے ایک ایک صفحہ کی اور دو تصویرین جلد بندی کے نمونون کی ہین،

یہ فہرست گو تفصیلی فہرست نگاری کے جادہ طریقہ پر مرتب کی گئی ہے، لیکن اختصار پیش نظر رکھا گیا ہے تاہم کوئی ضروری بات چھوٹنے نہین پائی ہے، اس فہرست مین مختلف اشاریے اور کارآمد جدولین بھی ہین، ہر کتاب کا نام اور ابتدائی عبارت عربی رسم الخط مین تحریر ہے،

یہ تو ان کتب خانون کے ظاہری حالات ہین، ان کی کتابون اور مخطوطات پر مختصر تبصرہ کے لئے بھی استنبول مین کافی قیام کی فرصت بلکہ ساری عمر درکار ہے، دس بارہ روز مین کوئی کیا دیکھ سکتا ہے اور حسرت و افسوس کے ساتھ واپس ہونا پڑتا ہے،

اس موقع پر بے محل نہ ہوگا، اگر استنبول کی ان نمایشون کا تذکرہ کیا جائے جو کانگریس کے سلسلہ مین قلمی کتابون کی نمایش کے لئے منعقد کی گئی تھیں،[1]

---

[1] مخطوطات اور مطبوعہ کتابون کی نمایشون کے علاوہ اور دوسری جو نمایشین ہوئی تھین، وہ یہ ہین،

۱- ترکی کی یادگار عمارتون کے نقشون کی نمایش، استنبول کی ٹکنکل یونیورسٹی مین،

۲- ٹرکش انسٹی ٹیوٹ فار گرس نے نور بانی کی نمایش کی تھی،

مندرجہ ذیل ۵ مقامون مین قلمی کتابون کی نمایشوں کا انتظام کیا گیا تھا ،

۱۔ استنبول یونیورسٹی کے کتب خانہ مین ،

۲۔ ملت لائبریری مین ،

۳۔ کتب خانہ راغب پاشا مین ،

۴۔ توپ قپو سراے کی میوزیم کے کتب خانہ مین ،

۵۔ خود استنبول یونیورسٹی کی مرکزی عمارت مین ،

مخطوطات کی ان نمایشون کے علاوہ ، یونی ورسٹی کی عمارت ہی مین مطبوعہ کتابون کی بھی نمایش ہوئی تھی ،

مطبوعہ کتابون مین زیادہ تر جدید ترکی مطبوعات تھین اور کچھ قدیم رسم الخط کی کتابین بھی تھین ، بیرونی اداروں کی کتابین بھی نمایان کی گئی تھین ، ان مین حیدرآباد کے دائرۃ المعارف[1] کی مطبوعات بھی تھین ، مگر معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی ناشرون نے اس نمایش کے ذریعہ اپنی نشریات کو مشہور کرنے کی اہمیت کم محسوس کی ، حالیہ ترکی مطبوعات کا موضوع ایک علحدہ مضمون کا متقاضی ہے ،

یہ تمام نمایشین بڑی خوش انتظامی اور حسن اہتمام سے منعقد ہوئی تھین ،

---

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۵) ۳۔ قدیم سرکاری دفاتر کے اہم کاغذات کی نمایش ، حکومت کے کاغذات قدیم کے دفتر مین ،

۴۔ مصوری اور بت تراشی کی گیلری ،

۵۔ عصری ترکی پینٹنگ کی نمایش ، یہ بھی یونیورسٹی کی عمارت مین تھی ،

۶۔ ترکی عورتون کے لباس کی نمایش ،

۷۔ قصاویر کتبون اور قطعون یا خطی ، اور دوسری اشیاے فنون لطیفہ کی نمایش ، اس نمایش کا مختصر تذکرہ مضمون مین کیا گیا ہے ،

[1] حیدرآباد دکن کے اس ادارہ نے خاموشی کے ساتھ علم کی جو خدمت کی ہے اسکا بیرونی علمی دنیا مین بڑا چرچا ہے ،

استنبول یونیورسٹی کی عمارت مین مخطوطات کی جو نمایش ہوئی تھی، اس کے لئے خاص طور سے بڑا اہتمام کیا گیا تھا، ایک وسیع مربع ہال مین جس کی وسعت ہندوستانی یونیورسٹیون کی عمارتون مین کم دیکھنے مین آتی ہے، شیشہ کے صندوقون مین یا میزون پر رکھی کتابین سارے ہال مین قرینہ سے ترتیب دی گئی تھین، ہر کتاب پر اس کا مختصر حال علٰحدہ علٰحدہ کارڈ پر لکھا ہوا تھا، یہ نمایش گیارہ دن صبح کے ۹ بجے سے شام کے چھ بجے تک مسلسل رہی،

اس نمایش مین استنبول کے تمام کتب خانون سے کتابین فراہم کی گئی تھین، جن کتابون کی نمایش کی گئی، اُن کی ایک فہرست بھی چھاپ کر تقسیم کی گئی تھی، اس فہرست کے مطابق (۸۹۹) عربی فارسی اور ترکی زبانون کی قلمی کتابین اس نمایش مین موجود تھین، سب سے زیادہ کوپرلو کے کتب خانہ کی کتابین (۱۶۰) کی تعداد مین تھین،

نمایش مین رکھی جانے والی کتابون کی جو فہرست چھاپ کر تقسیم کی گئی تھی، اس مین ہر کتاب کے متعلق مندرجۂ ذیل باتین تحریر تھین،

۱- نام کتاب (۲) سنہ کتابت یا سنہ تالیف (۳) مؤلف کا نام (۴) مؤلف کا سنہ وفات (۵) فن (۶) زبان (عربی، فارسی یا ترکی) (۷) کتب خانہ کا نمبر،

فراہمی معلومات کے دو دفتر نمایش مین قائم کئے گئے تھے، ایک ان کتابون کے متعلق جو نمایش مین رکھی گئی تھین، دوسرے استنبول کے کتب خانون کے متعلق، اور یہ انتظام کیا گیا تھا کہ ترکی جرمن، عربی اور فارسی چار زبانون مین یہ معلومات بہم پہنچائی جائین، دوسرے فنی معلومات بہم پہنچانے کا بھی انتظام تھا، اس نوعیت کے معلومات بھی چار زبانون، ترکی، انگریزی، عربی اور فارسی مین

(بقیہ حاشیہ ۱) جس صاحب علم سے ملاقات ہوتی تھی، وہ بنزد اس ادارہ کا حال دریافت کرتا تھا، وطن مین اس ادارہ اور اس کے ٹھوس کام کی اہمیت کا اندازہ نہین ہو سکتا،

فراہم کئے جاسکتے تھے،

چونکہ نمایش کے بڑے ہال مین کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی ممانعت تھی، اس لئے نمایش مین ہی ایک دار المطالعہ بھی قائم کر دیا گیا تھا، تاکہ اگر کوئی چاہے تو جن کتابون کی نمایش کی گئی تھی، ان مین سے کوئی کتاب تھوڑی دیر کے لئے لیکر ضروری معلومات حاصل کر سکے، جو لوگ اپنے اخراجات سے تصویر یا فلم لینا چاہتے تھے، ان کے لئے بھی معقول انتظامات کئے گئے تھے،

دل چاہتا ہے کہ نمایش مین جو کتابین دیکھی تھین، ان کا مفصل تذکرہ کیا جائے، لیکن بحالات موجودہ یہ ممکن نہین، اس لئے صرف چند کتابون کا تذکرہ مختصر طور سے کیا جاتا ہے۔

۱۔ اختلافات الائمہ: شمس الدین الاوزجندی (المتوفی ۶۴۲ھ) کی تالیف، عاطف آفندی کے کتب خانہ سے آئی تھی، زبان عربی، نمبر ۳۰۳[ل]، جہان تک علم ہے یہ کتاب ابھی طبع نہین ہوئی ہے،

۲۔ التذکرۃ الہرویہ فی حیل الحربیہ { فنون حرب مین علی بن ابوبکر الہروی (المتوفی ۶۱۱ھ) کی تالیف، کتب خانہ کا یہ نسخہ مؤلف کی زندگی مین ۶۰۲ھ مین لکھا گیا تھا، تا حال غیر مطبوع ہے، عاطف آفندی کے کتب خانہ سے یہ نسخہ آیا تھا، نمبر (۲۰۱۸) زبان عربی غالباً شمس الدین الاوزجندی، اور علی بن ابوبکر الہروی کی کوئی دوسری کتاب بھی ابھی طبع و شائع نہین ہوئی ہے،

۳۔ المُصنّف: فن صرف مین ابوالفتح ابن جنی (المتوفی ۳۹۲ھ) کی تالیف ۵۱۰ھ مین لکھا ہوا نسخہ، زبان عربی، عاطف آفندی کے کتب خانہ کی نمبر ۲۹۳۹، ابن جنی کی دوسری کتابین طبع ہوئی ہین، لیکن اس کتاب کی طباعت کا حال معلوم نہین،

۴۔ مقدمہ ابن خلدون (المتوفی ۸۰۸ھ) یہ مقدمہ ۷۷۹ھ مین تالیف ہوا، یہ

---

ل یہان اس بات کی صراحت کر دی جاتی ہے، کہ نمبر سے کتب خانہ متعلقہ کا نمبر مراد ہے،

نسخہ اسی سال کا مکتوبہ ہے، عاطف آفندی کے کتب خانہ کا نسخہ نمبر ۱۹۳۶،

۵- ادلۃ الرسمیۃ فی ..... الحربیۃ :- فنون حرب پر عربی زبان میں محمود بن شخلی کی تالیف، ۵۵۰ھ میں یہ کتاب تالیف ہوئی، غالباً یہ نسخہ اسی سنہ کا مولف کے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے، ایاصوفیہ کے کتب خانہ سے یہ کتاب نمایش میں آئی تھی، نمبر ۲۸۳۹- کتاب کی طباعت کا کوئی حال معلوم نہیں ہے،

۶- اربعین فی ارشاد السالکین : ابوالفتح محمد الطائی کی تالیف، ۵۰۲ھ کا لکھا ہوا نسخہ، عربی زبان میں حدیث اور سلوک کے موضوع پر مختصر رسالہ ہے، ایاصوفیا کے کتب خانہ کا نمبر ۵۱۲، اس کتاب کے چھپنے کے حال سے کوئی آگاہی نہیں ہے،

۷- اغراض السیاسۃ فی علم الریاسۃ : الخلیب السمرقندی کی فارسی زبان میں تالیف ایاصوفیا کے کتب خانہ کا نسخہ، کتاب کا نمبر ۲۸۰۴، کتاب غالباً تا حال غیر مطبوعہ ہے،

۸- کتاب الاقالیم الارضیہ علی الممالک الاسلامیہ ابواسحٰق الاصطخری المتوفی (۳۴۰ھ) کی تالیف، عربی زبان میں جغرافیہ کے موضوع پر، اصطخری کی دوسری دو کتابیں صور الاقالیم اور مسالک الممالک چھپ چکی ہیں، لیکن یہ تالیف غالباً ابھی چھپی نہیں، ایاصوفیا کے کتب خانہ کا نسخہ نمبر ۲۹۷۱،

۹- اعیان العصر و آوان النصر - عربی زبان میں اپنے ہم عصر مشاہیر پر خلیل الصفدی (المتوفی ۷۶۴ھ) کی تالیف، غالباً مؤلف کا خود اپنا لکھا ہوا نسخہ ہے، (ایاصوفیہ نمبر ۲۹۶۲) حال طباعت نامعلوم،

۱۰- اظہار ضعۃ الحی القیوم فی ترتیب بلاد الفیوم فخرالدین ابن انابلسی کی تالیف عربی زبان میں حال طباعت نامعلوم (ایاصوفیا نمبر ۲۹۶۰)

۱۱- الاشراف علیٰ معرفۃ الاطراف: ابن عساکر (المتوفی ۵۷۱ھ) کی عربی زبان میں حدیث کے موضوع پر تالیف، غالباً کوئی انڈکس ہے، حال طباعت غیر معلوم، نسخہ ایا صوفیا نمبر ۴۵۰، یہ نسخہ کتاب کی دوسری جلد پر مشتمل ہے،

۱۲- سیر ابن اسحاق کا فارسی ترجمہ، ۷۴۳ھ میں لکھا ہوا نسخہ (ایا صوفیا نمبر ۳۳۲۵) یہ امر متحقق نہ ہو سکا کہ یہ کتاب ابن ہشام کی ترتیب دی ہوئی سیرت ابن اسحٰق کا ترجمہ ہے، یا اصل کتاب کا، اگر اصل کتاب کا ترجمہ ہے تو علمی دنیا کے لئے ایک نایاب تحفہ ہے،

۱۳- جغرافیہ کی کتاب العجائب کا ترکی ترجمہ: مترجم مصطفیٰ سروری (المتوفی ۹۶۹ھ)، نسخہ ایا صوفیا نمبر ۳۱۵۹)

۱۴- المسالک والممالک: کا فارسی میں ترجمہ مترجم کا نام ابو زید احمد البلخی ہے، نسخہ ایا صوفیا نمبر ۳۱۵۶)

المسالک والممالک کے نام سے عربی زبان میں ایک سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں، مثلاً ابن خرداذبہ (المتوفی فی حدود ۳۰۰ھ) کی تالیف، الاصطخری (بعد ۳۴۰ھ) کی تالیف اور ابن حوقل (المتوفی بعد ۳۶۷ھ) کی تالیف، یہ تینوں کتابیں دی خویہ وغیرہ مستشرقین نے لیڈن سے طبع و شائع کی ہیں، اس بات کی تحقیق نہ ہو سکی کہ ایا صوفیا کے کتب خانہ میں محفوظ المسالک والممالک کا ترجمہ فارسی کس متن کا ترجمہ ہے،

۱۵- التکملہ لوفیات النقلۃ، دوسری تا دسویں جلد، الترغیب والترہیب کے مؤلف ذکی الدین المنذری (المتوفی ۶۵۶ھ) کی تالیف، عربی زبان میں تاریخ و تذکرہ کے موضوع پر ۶۵۶ھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے، اور غالباً تاحال غیر مطبوع، نسخہ ایا صوفیا نمبر ۳۱۶۳)

۱۶- تلخیص المخروطات:- یہ کتاب عربی زبان میں فن ہندسہ کے موضوع پر ہے، مؤلف کا نام محمود بن قاسم الاصفہانی ہے، ۵۲۳ھ کا لکھا ہوا نسخہ، طباعت کا حال معلوم نہیں

نہ ہو سکا، نسخہ ایا صوفیا، نمبر ۳۲۲۷)

۱۷۔ تاریخ اسلام و طبقات المشاہیر والاعلام: شمس الدین الذہبی (المتوفی ۷۴۸ھ) [illegible] نسخہ ایا صوفیا نمبر ۳۰۰۵)

۱۸۔ تاریخ المجروحین من المحدثین: ابو حاتم البستی المتوفی (۳۵۴ھ) کی تالیف عربی زبان میں، ابو حاتم البستی کی ایک دوسری تالیف روضۃ العقلاء ونزہۃ الفضلاء طبع ہو چکی ہے لیکن اس کتاب کے طبع ہونے یا نہ ہونے کا کوئی علم نہ ہو سکا، (نسخہ ایا صوفیہ ۴۹۶)

۱۹۔ روضات اولی الالباب فی تواریخ الاکابر والانساب: فخر الدین بناکتی (المتوفی ۷۳۰ھ) کی تالیف فارسی زبان میں ۸۴۲ھ میں اس نسخہ کی کتابت ہوئی ہو (نسخہ ایا صوفیا نمبر ۳۰۲۲)

۲۰۔ شرح اشکال التاسیس: مولانا قاضی زادہ رومی (المتوفی ۸۰۹ھ) فن ہندسہ کے موضوع پر عربی زبان میں ۸۱۵ھ میں غالباً یہ کتاب تالیف ہوئی ہے، (نسخہ ایا صوفیا نمبر ۲۷۴۳)

۲۱۔ ظفر نامہ: امیر خسرو دہلوی (المتوفی ۷۲۵ھ) کی تالیف ترکی زبان میں، یہ نسخہ ۹۳۵ھ میں نقل ہوا ہے، (نسخہ ایا صوفیا نمبر ۱۳۳۰)

۲۲۔ کتاب المسافات والولایات: عربی زبان میں ابو عبداللہ القدسی (نبع ۳۷۵ھ) کی تالیف، یہ نسخہ ۸۸۸ھ میں نقل کیا گیا ہے، القدسی کی ایک دوسری تالیف احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم کے بعض اجزاء طبع و شائع ہو چکے ہیں، کتاب المسافات غالباً ابھی طبع نہیں ہوئی ہو (نسخہ ایا صوفیا ۲۹۷۱)

۲۳۔ معادن النوادر فی معرفت الجواہر: کوئی بیہقی اس کے مولف ہیں، کتاب عربی زبان میں ہے، جواہرات اس کا موضوع ہے، ۹۱۵ھ کی تالیف ہے، اس موضوع پر مسلمان علماء نے بہت توجہ کی ہے، ترکی کے دوسرے کتب خانوں میں اس موضوع پر جو تالیفین دیکھنے میں آئیں ان کا آئندہ تذکرہ کیا جائے گا، ان شاء اللہ (نسخہ ایا صوفیا نمبر ۳۶۰۴)

۲۴- معرفۃ انواع علم الحدیث : یہ رسالہ مقدمہ ابن صلاح کے نام سے مشہور ہے، مؤلف کی وفات ۶۴۳ھ میں ہوئی، اور یہ نسخہ ۶۳۰ھ کا لکھا ہوا ہے، (نسخہ اباصوفیا نمبر ۴۵۴)

۲۵- معرفۃ اصول الحدیث : محدث حاکم نیشاپوری (المتوفی ۴۰۵ھ) کی تالیف، ۵۰۵ھ میں لکھا ہوا نسخہ (اباصوفیا نمبر ۴۴۹)

یہ چند کتابیں جو مشتے نمونہ از خروارے کی مصداق ہیں، ورنہ ایک ایک کتاب کے لئے کئی کئی صفحے درکار ہیں، اور کوئی دس بیس کتابیں نہیں ہیں، بلکہ ہزاروں نایاب اور نادر نسخے ہیں، جن کا نام شمار کرانا بھی دشوار ہے،

کانگرس کے ضمن میں جو دوسری مختلف نمائشیں ہوئی تھیں، ان سب کا تذکرہ باعث طوالت ہوگا، صرف خطاطی کی نمائش کے متعلق سرسری اشارہ کیا جاتا ہے،

خطاطی کی نمائش فنون لطیفہ کے شعبہ کا جزو تھی، پوری نمائش میں موجودہ عہد کے نمونے رکھے گئے تھے، اس ہال میں جو چیز سب پر چھائی ہوئی تھی، وہ نجم الدین خطاط کے لکھے ہوئے قطعے تھے، ان قطعوں کو دیکھ کر خطاطی میں نجم الدین کے کمال پر نمائش میں ہر شخص کی زبان سے بے اختیار ستائش اور تحسین کا اظہار ہوتا تھا، نجم الدین اپنے پیشرو باکمال ترک استادان خطاطی کے قابل فخر جانشین ہیں،

خطاطی کا یہ کمال نئے رومن رسم الخط میں پیدا نہیں ہو سکتا تھا، یہ تو عربی رسم الخط میں لکھے ہوئے قطعے تھے، پھر انقلاب کے بیس پچیس سال قبل کے لکھے ہوئے نہیں، بلکہ ۱۳۶۹ھ کے لکھے ہوئے یعنی نمائش سے صرف کچھ عرصہ قبل تحریر کئے ہوئے تازہ بتازہ نو بہ نو کے مصداق، پھر ان قطعوں کے مضامین رندانہ یا اس سے کم درجہ کے شاعرانہ نہیں، بلکہ خالص اسلامیاتی یعنی آیات قرآنی، حدیثیں یا تاریخ العقیدہ علماء کے اقوال وغیرہ

قدیم مشرقی امور اور اسلامی روایات و شعار سے ترکوں کی یہ شیفتگی، اور والہانہ عقیدت شہر بہ شہر قریہ بہ قریہ اور مکان بہ مکان نظر آتی ہے، یہ تجربے اور مشاہدے ایک علیحدہ مضمون ہی میں تفصیل کے

ساتھ سما سکتے ہین،

اس مضمون کے آخر مین قدیم کتابون کی ایک ترکی خدمت کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا گیارہوین صدی ہجری کے ایک ترک اہل علم و اہل قلم حاجی خلیفہ (المتوفی ۱۰۶۷ھ) نے اپنی مشہور عالم تالیف کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون سے علوم اسلامیہ کی جو خدمت انجام دی ہے، اس کے احسان سے عالم و متعلم کبھی عہدہ برآ نہین ہو سکتے، یہ کتاب لنڈن، قاہرہ اور آستانہ مین طبع ہوئی تھی لیکن ہر جگہ نادر و نایاب تھی، اور اگر اس کا کوئی نسخہ مل جاتا تھا، تو منہ مانگی قیمت دے کر لینا پڑتا تھا، اب استنبول مین اس کا نسخہ سرکاری اہتمام سے چھپ رہا ہے، اس کی پہلی جلد جو حرف ح تک ہے، ۱۹۴۱ء مین سررشتہ تعلیمات کے مطبع مین چھپی ہے، دو عالمون نے اس کو ایڈٹ کیا ہے، ایک شرف الدین بالطقایا اور دوسرے رفعت بیگہ انگلیسی، پہلے صاحب استنبول یونیورسٹی مین پروفیسر ہین، اس نسخہ کی ابتدا مین عربی زبان مین تمہید و مقدمہ لکھا گیا ہے، حاجی خلیفہ کے حالات بھی بیان کئے گئے ہین، جدید ترکی رسم الخط مین بھی ایک پیش لفظ لکھا گیا ہے، اس نسخہ مین حاجی خلیفہ کی قبر کے فوٹو کے علاوہ کتاب کے اصل مسودہ اور مبیضہ کے ایک ایک صفحہ کا عکس بھی شامل ہے، پیش لفظ وزیر تعلیم حسن علی نے لکھا ہے، اور کتاب عصمت اونو کے نام پر منسوب کی گئی ہے،

اصل کتاب کی ایک جلد چھپنے کے بعد غالباً مناسب یہ معلوم ہوا کہ اس کا ایک ذیل پہلے چھاپ دیا جائے، چنانچہ اسماعیل پاشا بغدادی کی تالیف موسوم بہ ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون کی دو جلدین چھپ چکی ہین، یہ بھی سررشتہ تعلیم کے مطبع مین طبع ہوئی ہین، پہلی جلد ۱۹۴۵ء مین طبع و شائع ہوئی اور دوسری جلد ۱۹۴۷ء مین، طباعت کے اخراجات سررشتہ تعلیم نے برداشت کئے تھے[۱]،

---

[۱] اس مضمون کی ترتیب مین جن معلومات کا حوالہ نفس مضمون مین ہے ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل نشریون سے جو

اقبال مرحوم نے عربی اور فارسی زبانوں کی نادر و نایاب کتابوں کو مشرقی مدارس کے طاق و ایوانوں سے نکل کر مغربی کتب خانوں اور جامعات کے رواقوں کی زینت بنی ہوئی دیکھ کر کس حسرت افسوس سے نوحہ خوانی کی تھی کہ

گمر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

انھوں نے اپنے دل کی قاش فروشی غنی کشمیری کے اس شعر کو نقل کرکے بھی نمایاں کی تھی کہ

غنی روز سیاہ پیر کنعان را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

لیکن بحمد اللہ بحول و قوتہ اب اس یاس و اندوہ کی ضرورت نہیں، ہر طرف امید کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں درا ب تو اس زمزمہ کا وقت آگیا کہ

صبح امید کہ بد معتکف پردۂ غیب
گو برون آئے کہ کار شب تار آخر شد

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۱۵) انگریزی میں بھی مدد لی گئی ہے (۱) رہبر کتب خانہ ہائے استنبول، تیسرا اڈیشن ہاتیف مظفر گوک خان (۲) کیٹلاگ (کیلنڈر) استنبول یونیورسٹی (۳) ایجوکیشن ان ٹرکی،

ڈاکٹر سید نعیم الدین

# بروصہ کے کتبخانوں کے چند فارسی مخطوطات

پروفیسر مجتبیٰ مینوی نے اپنے ایک مقالے میں استنبول کو "شہر کتب خانہ ہا" کہا ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ ترکیا کے بعض دیگر شہر بھی "کتب خانوں کے شہر" قرار دیے جا سکتے ہیں۔ قونیہ، مانیسہ، قیصریہ اور بروصہ بھی اپنے کتب خانوں کیلئے مشہور ہیں۔ بروصہ میں، جو مردم شماری کے لحاظ سے پانچواں بڑا شہر ہے، تقریباً چھ کتب خانے موجود ہیں۔ یہ کچھ صدیوں تک ترکی کا پایہ تخت بھی رہا ہے اور آج بھی فطری مناظر، حمام، مساجد اور درگاہوں کے لیے مشہور ہے۔ قدیم زمانے میں یہ شہر علم و ادب اور خاص کر صوفی طریقتوں کا بڑا مرکز رہا ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں یہاں سہروردی اور رفاعی طریقتوں کے لوگوں نے کئی خانقاہیں اور زاویے بنوائے تھے۔ غرض قدیم زمانے سے یہاں مذہب و علم کا چرچا رہا ہے اور اسی لیے یہاں کے کتب خانوں میں عربی، فارسی اور ترکی مخطوطات کا بڑا عمدہ ذخیرہ ملتا ہے۔ مجھے اپنی سیاحت کے دوران میں وہاں جو اہم فارسی مخطوطات نظر آئے وہ میں نے اس وقت نوٹ کر لیے تھے اور اب قارئین مجلہ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

**دیوان انوری** خراجی اوغلی لائبریری، نمبر ۹۲۵ • ابعاد ۱۵×۲۴ (۸×۱۷) سنٹی میٹر، اوراق ۳۲۰، سطور ۱۹، • خط تعلیق، عنوان "مذہّب حاشیہ زریں۔

آغاز: مقدری انہ بآلت القدرت مطلق کند زجرم بخاری چو گنبا زرق

اختتام: باقی بوجود تست از پانصد سال ہم گوہر مصطفیٰ و ہم تخم علی

ترقیمہ: تم الکتاب بعون اللہ الملک الوہاب فی غرۃ محرم الحرام سنۃ ثمان و ثلاثین و سبعمایۃ علی ید الفقیر روح اللہ علی بجال

قصاید: ورق ۱ - ۱۶۳ ب، مقطعات: ۱۶۳ ب - ۲۳۳ الف، غزلیات: ۲۳۳ ب - ۲۸۰ ب، فی الہجا: ۲۸۰ ب - ۲۹۸ ب، رباعیات: ۲۹۹ ب - ۳۲۰۔

"دیوان انوری" کے مرتب پروفیسر سعید نفیسی کو قرن ہفتم کے صرف دو ہی نسخے ملے ہیں از زیادہ تر قرن نہم

دہم و یازدہم کے نسخے ان کے پیش نظر رہے ہیں۔ تقابلی ایڈیشن کے لیے قرن ہشتم کے لکھے ہوئے اس نسخے کی خاص اہمیت ہے۔

منطق الطیر عطار:- پبلک لائبریری نمبر ۲-۱۱۰ ابعاد ۱۶×۲۲٫۷ (۱۲٫۵×۱۹) اوراق ۱۴۱ سطور ۱۵، خط نسخ۔

ابتدائی صفحے پر "وقف تکیۂ اشرف زادہ" کی مہر ہے۔ "دال" "ذال" کی شکل میں لکھی ہے۔ کاغذ کی کہنگی بھی گواہی دیتی ہے کہ یہ نسخہ غالباً تیرہویں یا چودھویں صدی عیسوی میں نقل ہوا ہے۔ آخر میں کچھ اوراق کم ہیں۔

آغاز: آفرین جان آفرین پاک را

اختتام: یاری او کردم و یارش شدم

"منطق الطیر" کے قدیم ترین نسخے سنہ ۶۸۰ھ اور ۶۹۲ھ کے لکھے ہوئے قونیہ میوزیم میں موجود ہیں۔[1] "منطق الطیر" کے تنقیدی اڈیشن کے لیے قونیہ کے علاوہ بروصہ کا متذکرہ بالا نسخہ بھی بیحد مفید ہوگا۔

منطق الطیر عطار:- ارغان جامعی لائبریری، نمبر ۵۸۷، ابعاد ۱۵٫۵×۲۰٫۳ (۱۲٫۵×۵) اوراق ۱۶۵، سطور ۱۵، خط تعلیق، مکتوبہ ۱۴ر شعبان المعظم سنہ ۹۴۰ھ۔

عنوانات سرخ روشنائی میں ہیں۔ ابتدائی دس ابیات بعد میں لکھی گئی ہیں۔ نسخے کی ابتدا اس بیت سے ہوتی ہے:-

کوہ را ہم تیغ داد و ہم کمر    تا بسر ہنگی او افراخت سر

اختتام: شوخی و بی خرمی ما در گذار    شوخی ما پیش چشم ما میار

بوستان سعدی:- پبلک لائبریری، نمبر ۲۲۳۴، ابعاد ۱۰٫۵×۱۷٫۲ (۷٫۵×۱۱٫۲) اوراق ۱۹۲، سطور ۱۱۔

عنوان سرخ روشنائی میں لکھے گئے ہیں۔ ابتدائی دو اوراق کے حاشیے طلائی ہیں۔

آغاز: بنام خدائی کہ جان آفرید    سخن گفتن اندر زبان آفرید

اختتام: بضاعت نیاوردم الا امید    خدایا ز عفوم مکن نا امید

ترقیمہ: تمام شد ... فی تاریخ خمس و خمسین و ستمایہ نقل من خط الکرم روح اللہ روحہ و غفر اللہ لہ ولکاتبہ ولقاریہ سنہ ۶۶۰ھ۔

---

[1] ڈاکٹر فلر احمد آتش، "قونیہ کے کتب خانوں میں محفوظ بعض اہم مخطوطے"، بلیتن جلد ۱۶، شمارہ ۶۱ (انقرہ ۱۹۵۲)

خود مولف کے نسخہ سے پانچ سال بعد کا نقل کیا ہوا نسخہ ہے اس لحاظ سے اہم اور نادر ہے۔

**دیوان جلال الدین رومی:-** پبلک لائبریری، نمبر ۹۳۹۰، ابعاد ۲۵×۱۸(۱۳×۲۱)،
اوراق ۴۰۱، سطور ۲۳، عمدہ خوش خط تعلیق۔

یہ نسخہ محمد افندی ابن المرحوم ابی بکر افندی الشہیر بخفیف زادہ کا وقف کیا ہوا ہے۔ پہلے دو ورق مذہب ہیں۔

ابتدا: ای دل چہ اندیشیدہ دو عذر این تقصیر ما

اختتام: فتنہ رخ بنمود از آن زہاد را — زیور افسر شدہ خلخال پامی

غزلیات: ۱ — ۳۶۸ الف

ترجیعات: (رباعیات در حاشیہ): ۳۶۸ الف — ۲۹۷ الف

رباعیات: ا ـ ی تک حاشیے میں ترتیب وار: ۲۶۸ الف — ۳۹۱ ب

مزید رباعیات: ۳۹۱ ب — ۳۹۷ الف، معمیات: ۳۹۷ ب — ۴۰۱ الف

ترقیمہ: (ترجیعات کے آخر میں) تم الکتاب۔۔۔ بید العبد حسن بن سلغز بن حسن۔۔۔ فی یوم الاحد من
شہر جمادی الثانی سنۃ اربع وثلاثین وثمان مایۃ الہجریۃ۔

PROF. HELLMUT RITTER نے "دیوان رومی" کے قدیم نسخوں کی فہرست DEAR ISLAM
میں شائع کر دی ہے۔ پروفیسر بدیع الزماں فروزان فر آجکل اس کا تنقیدی اڈیشن ترتیب دے رہے ہیں۔

**دیوان خسرو:** خواجہ چی اوغلی لائبریری، نمبر ۹۷۸، ابعاد ۲۲×۱۵ (۱۵×۸)، اوراق ۱۶۱،
سطور ۱۹، خط تعلیق۔

پہلا ورق مذہب ہے، ورق ۲ (الف) پر "زاویہ نقشبندیہ" کی مہر ہے۔ حاشیوں میں حسن دہلوی کا دیوان
لکھا ہے۔ "دیوان خسرو" کی ابتدا اس بیت سے ہوتی ہے:

وقت گلست نوش کن بادہ چون گلاب را — بلبل نغمہ ساز کن بلبلہ شراب را

اختتام: گفتم کہ مگوی کفر گفتا چہ کنم — زنار شد است رشتہ بہر اندام

سنہ ۸۲۲ھ کا لکھا ہوا بہت ہی قابل قدر نسخہ ہے۔

**مجموعۂ رسائل:** پبلک لائبریری، نمبر ۴۷۷۱۲، ابعاد ۱۸×۱۲ (۷×۱۱)، اوراق ۲۸۱، سطور ۱۹،
خط نسخ۔ یہ مجموعہ ہر تین رسائل نقد النصوص، اشعۃ اللمعات، شرح قصیدۂ میمیہ خمریہ فارضیہ پر مشتمل ہے۔

نقد النصوص ورق ۴ب ـــــ ۱۴۵ الف (تاریخ تالیف ۸۶۳ھ)

اشعۃ اللمعات ۱۵۰ب ـــــ ۲۴۲ الف (تاریخ تالیف ۸۸۶ھ)

شرح قصیدۂ میمیہ ۲۴۳ ـــــ ۲۸۱ب (تاریخ تالیف ۸۷۵ھ)

ترقیمہ : تمت فی خامس شہر ربیع الآخر سنۃ تسعۃ وثمانین وثمانمایۃ علی ید الفقیر احمد بن محمد الحرآبادی (۹)۔

نسخے میں کہیں کہیں "منہ مدظلہ العالی" اور "صح" لکھا ہوا ہے۔ جامی کی وفات (۸۹۸ھ) سے نو سال پہلے ۸۸۹ھ میں لکھے ہوئے اس نسخے کی بڑی اہمیت ہے

**دیوان جامی:** پبلک لائبریری، نمبر ۲۵، ابعاد ۱۳×۲۰ (۲۸۸)، اوراق ۲۰۸، سطور ۱۷، خط تعلیق، تاریخ کتابت ۱۴۹۱ھ۔

مثنویات، غزلیات، سب اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ اس نسخے میں جامی کے اپنے دواوین پر لکھے ہوئے مقدمات بھی موجود ہیں۔

پژمان نے اپنے مرتب کیے ہوئے "دیوان جامی" کے مقدمے میں واضح کیا ہے کہ ان کے پیش نظر دیوان کا بہترین ثانی ایڈیشن رہا ہے۔ انھوں نے اپنے دیوان کو "از نسخ مزبور از حیث غزل کامل تر" بتایا ہے، لیکن کن نسخوں سے استفادہ کیا ہے اس کی تفصیل نہیں دی ہے اور نہ اختلاف قراءت پیش کیا ہے۔ اس لیے "دیوان جامی" کے تنقیدی وتقابلی ایڈیشن کی آج بھی ضرورت باقی ہے۔ خوش قسمتی سے لینن گراڈ، استنبول اور قونیہ میں جامی کے خودنوشت یا زمانۂ حیات کے لکھے ہوئے نسخے مل جاتے ہیں۔

"دیوان جامی" کا ایک نسخہ مکتوبہ ۸۶۵ھ قونیہ میں ہے۔ شاعر کے زمانۂ حیات کا لکھا ہوا یہ پہلا نسخہ ہے جو اب تک معلوم ہو سکا ہے۔ اس کی وضاحت پروفیسر احمد آتش نے "بلیتن" کے اس مضمون میں کر دی ہے جس کا ذکر ابھی گذرا۔

کتابخانۂ خدا بخش

خدا بخش فہرست مخطوطات فارسی مرآۃ العلوم کے تسامحات

ڈاکٹر افتخار احمد عدنی ______



خدابخش لائبریری کے فارسی مخطوطات کی تین یک سطری بیان کی مختصر فہرستیں "مرآۃ العلوم" کے نام سے یکے بعد دیگرے ۱۹۲۵ء، ۱۹۴۲ء اور ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئیں۔ یہ ہینڈ لسٹ (۱، ۲، ۳) کہلاتی ہیں۔ ڈاکٹر مدنی باقیماندہ فارسی مخطوطات پر مشتمل چوتھی فہرست بھی تیار کر چکے ہیں لیکن ساتھ ساتھ پچھلی تینوں فہرستوں کے مسامحات پر بھی نظر ڈالی جاتی رہتی ہے اور ان میں جو کمیاں نظر آتی ہیں ان کے سامنے مختصراً اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ اس بار کی قسط میں ہینڈ لسٹ کے ساتھ ساتھ توضیحی فہرست کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔ جرنل کے پچھلے شماروں میں شاہ عطاء الرحمٰن صاحب، محبوب حسین صاحب اور خود مدنی صاحب کی تحریریں اس سلسلہ میں چھپ چکی ہیں۔ امید ہے یہ تازہ قسط بھی بہت سی غلطیاں دور کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

——— ادارہ

# تصحیح و اضافہ

# خدا بخش فہرست مخطوطات فارسی مرآۃ العلوم کے تسامحات

## تاریخ و تذکرہ

یہ خدا بخش کے فارسی مخطوطات کی ہینڈ لسٹ "مرآۃ العلوم" کے تصحیح و اضافہ کی دوسری قسط ہے جو تاریخ و تذکرہ کے مخطوطات کا احاطہ کرتی ہے۔ تصوف کے مخطوطات کی تصحیح جو جرنل ۱۵۔۲۰ میں شائع ہو چکی ہے میں صرف ہینڈ لسٹ کو ہی سامنے رکھا گیا تھا۔ اب لائبریری کے مخطوطات کی توضیحی فہرست کو بھی، جو ۳۳ جلدوں تک انگریزی میں شائع ہو چکی ہے، سامنے رکھا گیا ہے اور ہینڈ لسٹ کی جن کمیوں کو توضیحی کیٹلاگ میں دور کر دیا گیا ہے اُن کی، اور جو نہ کی جا سکی ہیں اُن کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ امید ہے یہ اضافے فائدے سے خالی نہ ہوں گے۔

ڈاکٹر افتخار احمد مدنی
خدا بخش لائبریری پٹنہ

## جلد اوّل : تاریخ

HL.2 No.452 **تاریخ بناکتی :** نسخہ کے دیباچہ میں اس کا پورا نام "روضۃ اولی الالباب فی معرفت التواریخ والانساب" ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں اس کا نام "روضۃ اولی الالباب فی تواریخ الاکابر والانساب" دیا گیا ہے۔ اور یہی نام خدا بخش لائبریری کے توضیحی کیٹلاگ میں بھی ہے اوراق ۲۹۳ تا ۲۹۵۔

HL.4 No.449 **تاریخ طبری :** اس کا عنوان ترجمہ تاریخ طبری ہوگا کیوں کہ یہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری کی عربی تصنیف "تاریخ الرسل والملوک" کا فارسی ترجمہ ہے۔ اوراق ۳۴۳ تا ۳۴۵۔

HL.5 No.450 **تاریخ طبری :** نام کے سلسلے میں مذکورہ بالا نمبر کے تحت تفصیل موجود ہے اوراق ۱۷۰ تا ۱۷۵۔

HL.6 No.453 **تاریخ گزیدہ :** ناقص الآخر۔

HL.8 No.479 **تحفۃ الکرام :** اوراق ۴۹۹ تا ۴۹۷ توضیحی کیٹلاگ میں ۴۹۸ مذکور ہے۔

HL.9 No.478 **جنات الفردوس :** ہینڈ لسٹ میں کاتب کا نام محمد اسمٰعیل ابن حاجی محمد باقر شیرازی مذکور ہے نسخہ اور توضیحی کیٹلاگ میں کاتب کا نام مذکور نہیں۔

HL.10 No.464 **حبیب السیر :** کتاب کا پورا نام "حبیب السیر فی اخبار افراد البشر" ہے توضیحی کیٹلاگ میں یہ نام مذکور ہے لیکن ہینڈ لسٹ میں نہیں۔

HL.11 No.466 **حبیب السیر :** اوراق ۳۸۲ + ۸ تا ۳۷۸ نسخہ میں مذکور فہرست ۱۱۴۱ھ میں عبداللہ نے لکھی۔

HL.12 No.467 **حبیب السیر :** اوراق ۲۱۰ تا ۳۰۸۔

HL.14 No.480 **حدیقۃ الصفا :** اوراق ۲۵۱ تا ۲۵۲۔

HL.15 No.463 **خلاصۃ الاخبار :** کتاب کا پورا نام "خلاصۃ الاخبار فی بیان الاحوال الاخیار" نسخہ اور توضیحی کیٹلاگ میں بھی مذکور ہے۔

HL.16 No.456 **روضۃ الصفا :** کتاب کا پورا نام "روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیا والملوک والخلفا" نسخہ کے دیباچہ میں مذکور ہے توضیحی کیٹلاگ میں بھی پورا نام آگیا ہے۔ اس کے کاتب احمد بن مسعود ہیں تعداد سطور ۳۳-۳۴ تا ۳۳ نسخہ کے پہلے ورق پر قالمخان خانہ زاد بادشاہ عالمگیر اور لطف اللہ خاں بہادر کی مہر کے علاوہ

عبدالحق اور دیگر لوگوں کی تحریریں بھی نہیں۔

HL.19/No.457 روضۃ الصفا: ۳۴۶+۳ اوراق نہ کہ ۳۴۷۔

HL.20/No.458 روضۃ الصفا: نسخہ میں مختلف مقامات پر کتب خانہ سید ولایت علی خاں اور خورشید نواب کی مہر ثبت ہے اوراق ۴۳۸ نہ کہ ۴۶۰۔

HL.23/No.472 صبح صادق: اوراق ۵۳۹ نہ کہ ۵۳۸۔ توضیحی کیٹلاگ میں تعداد اوراق صحیح مذکور ہے

HL.24/No.473 صبح صادق: اوراق ۵۳۸ نہ کہ ۵۴۳۔ توضیحی کیٹلاگ کے مطابق ۵۴۴ جلد دوم نہ کہ سوم ناقص الاخر۔

HL.26/No.475 صبح صادق: یہ صبح صادق کے دو جلدوں کی فہرست ہے جبکہ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے ہینڈلسٹ میں کیفیت میں یہ تو مذکور ہے کہ یہ فہرست ہے لیکن یہ نہیں کہ یہ صرف دو جلدوں کی فہرست ہے توضیحی کیٹلاگ میں بھی مذکور ہے کہ یہ صبح صادق کے چاروں حصوں کا انڈکس ہے حالانکہ اس کے بعد اس نے ترقیمہ کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں واضح ہے کہ یہ صرف دو جلدوں کی فہرست ہے۔

HL.27/No.451 طبقات ناصری: ہینڈلسٹ میں نسخہ میں مذکور مصنف کا پورا نام لکھا جانا چاہیے یعنی ابوعمر بن عثمان بن محمد المنہاج الجوزجانی نہ کہ منہاج بن سراج نسخے کے ورق ۳، ۴، ۱۴، تا ۶۰ کے حاشیہ پر حسین واعظ کاشفی کی کتاب "روضۃ الشہدا" ہے جس کا ذکر ہینڈلسٹ میں نہیں توضیحی کیٹلاگ میں مصنف کا پورا نام دیا گیا ہے البتہ حاشیہ کی کتاب کے سلسلے میں یہ مذکور ہے۔

"ON THE MARGINS OF FOLL 3b 4b AND 14a- 60a SOME CONFUSED ACCOUNTS OF THE BATTLE OF KARBALA ARE GIVEN."

HL.30/No.481 مرآۃ آفتاب نما: کتاب کے خاتمہ پر محمد علی مذکور ہے قیاس یہ ہے کہ یہی کاتب ہیں۔

HL.31/No.477 مرآۃ العالم: نسخہ کے دیباچہ میں اس کے مصنف کا نام بختاور خاں مذکور ہے جبکہ ہینڈلسٹ میں اسے محمد بقا سہارنپوری کی تصنیف بتایا گیا ہے ایسا کیوں ہے اس کی وضاحت توضیحی کیٹلاگ سے تو ہو جاتی ہے کہ اسے بقا نے بختاور خاں کے لیے لکھا ہینڈلسٹ میں بھی اس قسم کی وضاحت ہونی چاہیے۔

HL.33/No.470 نگارستان: اوراق ۲۷۵ نہ کہ ۲۶۵۔

HL.34/No.482 تاج القصص: مصنف کا نام نسخہ میں ابونصر کنیت احمد بن احمد بخاری مذکور ہے۔ ہینڈلسٹ اور توضیحی کیٹلاگ میں بھی یہی نام دیا گیا ہے یعنی (احمد بن احمد) خدابخش لائبریری میں مصنف کی ایک اور

کتاب "انیس المریدین وروضة المحبین" کے نام سے موجود ہے جو تاج القصص کا ہی ایک حصہ ہے۔ قیاس ہے کہ مصنف نے "انیس المریدین وروضة المحبین" کو پہلے لکھا اور بعد میں اسے "تاج القصص" میں شامل کر دیا
اس نسخہ میں مصنف کا نام احمد بن محمد بن نصر بخاری مذکور ہے اور یہی نام صحیح معلوم ہوتا ہے۔

HL.36 / No.484 **ترجمۂ مولود النبی**: اس کا نام "ترجمۂ مولود مصطفٰی" ہوگا توضیحی کیٹلاگ میں بھی اصل عربی تصنیف کے سلسلے میں وضاحت کے باوجود اس کا نام "ترجمۂ مولود النبی" ہی دیا گیا ہے۔

HL.37 / No.485 **درج الدرر**: کتاب کا پورا نام نسخہ میں "درج الدرر و درج الغرر فی بیان میلاد سید البشر" ہے اوراق ۲۷۲+۸ نہ کہ ۲۷۳، تعداد سطور ۲۳ نہ کہ ۱۰، توضیحی کیٹلاگ میں تعداد سطور صحیح مذکور ہے اور کتاب کا پورا نام بھی دیا گیا ہے۔

HL.39 / No.490 **معارج النبوت**: کتاب کا نام "مدارج نبوت" ہے توضیحی کیٹلاگ میں کتاب کا نام صحیح مذکور ہے اوراق ۶۳۰+۱۰ نہ کہ ۶۲۰۔

HL.40 / No.491 **مدینة العلم**: کاتب کا نام نسخہ میں اور توضیحی کیٹلاگ میں بھی مذکور نہیں جبکہ ہینڈ لسٹ میں اس کا نام سلطان محمد ولد آغا عبدالکریم درج ہے۔

HL.41 / No.492 **مدینة العلم**: اس کے کاتب غلام سعید ہیں۔

HL.42 / No.486 **معارج نبوت**: کتاب کا پورا نام "معارج نبوت فی مدارج الفتوة" ہے توضیحی کیٹلاگ میں اس نام کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

HL.43 / No.487 **معارج نبوت**: اوراق ۲۰۴+۷ نہ کہ ۲۲۴۔

HL.45 / No.496 **روضة الاحباب**: کتاب کا پورا نام "روضة الاحباب فی سیر النبی والآل والاصحاب" ہے مصنف کے نام میں بھی الملقب بجمال حسینی کا اضافہ کر دیا جائے تو بہتر ہوگا توضیحی کیٹلاگ میں کتاب اور اس کے مصنف کے سلسلے میں تفصیل دیدی گئی ہے۔

HL.46 / No.497 **روضة الاحباب**: اوراق ۳۵۷+۷ نہ کہ ۳۵۳۔

HL.47 / No.493 **فتوح ابن اعثم**: اس کا عنوان "ترجمہ فتوح ابن اعثم" ہوگا کیونکہ یہ کتاب ابن اعثم کی عربی تصنیف "فتوح" کا ترجمہ ہے۔

HL.49 / No.495 **مناقب مرتضوی**: اس کے کاتب سید محمد ضیا ولد سید محمد اشرف حسینی ہیں اوراق ۳۵۴ نہ کہ ۳۵۵۔

HL.52 / No.509 **ترجمہ کشف الغمہ**: یہ کتاب "ترجمة المناقب" کے نام سے بھی جانی جاتی ہے اور اس کے مصنف کا پورا نام ابو الحسن علی بن حسن زواری اصفہانی ہے لائبریری کے توضیحی کیٹلاگ میں مذکورہ باتوں کی تفصیل موجود ہے۔

HL.54 / No.501 **حیات القلوب**: یہ جلد اول ہی ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت میں "غالباً جلد اول" لکھا گیا ہے اس کے کاتب عبدالکافی بن محمد باقر خابدی ہیں ہینڈ لسٹ اور توضیحی کیٹلاگ میں کاتب کا نام صرف ابن باقر خابدی مذکور ہے۔

HL.55/No.498 روضۃ الشہدا: اس کے کاتب خواجگی المنشی ہیں اور یہ نہ صرف اہل بیت کے حالات پر ہے بلکہ اس میں بعض انبیاء اور خود حضور صلعم کے حالات بھی درج ہیں اس کے مصنف کا پورا نام کمال الدین حسین کاشفی ہے توضیحی کیٹلاگ میں کتاب کے مندرجات اور مصنف کے نام کے سلسلے میں تفصیل موجود ہے۔

HL.56/No.499 روضۃ الشہدا: اوراق ۳۰۸ نہ کہ ۳۴۸ روضۃ الشہدا کے خاتمہ کے بعد ایک دوسری کتاب "روایات مصائب سید شہدا" بھی ہے یہ ۳۲ اوراق پر ناقص الآخر ہے اس کے علاوہ دو ورق پر حضرت علی کے بارے میں بتایا گیا ہے اور آخری دو ورق پر قصیدہ انوری ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں ۲۴۷ اوراق مذکور ہے کتاب کے مندرجات کی تفصیل بھی موجود ہے۔ لیکن اس میں قصیدہ انوری کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

HL.57/No.503 ریاض الشہادۃ: کتاب کا پورا نام "ریاض الشہادۃ فی ذکر مصائب السادۃ" ہے اور یہ کتاب کا جلد دوم ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

HL.58/No.508 غایۃ الہمم فی ذکر الصحابۃ والائمہ: اوراق ۵۴۴ نہ کہ ۵۶۴ نیز اس میں ایک دوسرا رسالہ "البصارۃ فی احادیث الاشارہ" مصنف محمد علیم بجیائی الہ آبادی بھی ہے جو ۹ اوراق پر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب مصنف کے پاس رہی ہے اس رسالے کے خاتمہ کے بعد ایک ورق پر مصنف نے اپنے قلم سے اوراد لکھے ہیں اور اوراد کے خاتمہ پر اپنا نام بھی ان کی تفصیلات توضیحی کیٹلاگ میں موجود ہیں۔

HL.62/No.510 تاریخِ وصاف: کتاب کا اصل نام بھی جو "تجزیۃ الامصار وتزجیۃ الاعصار" ہے کیفیت کے خانے کے بجائے نام کے خانے میں دیا جانا چاہیے۔

HL.64/No.512 ظفر نامہ: تعداد سطور ۱۹ نہ کہ ۲۱ نسخہ کے آخری ۲۰ اوراق پر ۲۱ سطریں ہیں۔

HL.65/No.513 مطلع السعدین: کتاب کا پورا نام "مطلع السعدین ومجمع بحرین" ہے۔

HL.67/No.515 ملفوظات تیمور: یہ کتاب "توزک تیموری" ہے۔

HL.68/No.516 ملفوظات تیمور: یہ "توزک تیموری" ہے اور اس میں صرف سات سطریں کم ہیں نسخہ کے آخر میں کاتب نے لکھا ہے کہ جس نسخہ سے یہ نقل کیا گیا ہے اس کے خراب ہونے کی وجہ سے اس حصہ کو نقل نہ کیا جا سکا ہینڈ لسٹ میں ناقص الآخر لکھنے کے ساتھ اس بات کی بھی وضاحت کر دی جاتی تو اچھا ہوتا۔

HL.69/No.517 کتاب المعجم فی آثار ملوک العجم: یہ ناقص الاول ہے توضیحی کیٹلاگ میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

HL.71/No.523 تاریخ طاہر وحید: کتاب کے نام کا اس کے دیباچہ میں ذکر نہیں کیا گیا ہے البتہ کتاب کے پہلے ورق پر

"ریاض الشعراء" تاریخ طاہر وحید" مذکور ہے جو کاتب کا ہی لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

HL.71 / No.520 **تاریخ عالم آرای عباسی:** نسخہ میں درمیان کے دو اوراق سادہ اور غیر ضروری ہیں اس لیے اسے گنتی میں شامل نہیں کیا جائے گا اور اس طرح کتاب کے ۲۶۴ اوراق ہی ہوں گے نہ کہ ۲۶۶۔

HL.75 / No.522 **تاریخ عالم آرای عباسی:** ۳۶۳ اوراق نہ کہ ۳۵۳

HL.76 / No.524 **تاریخ جہانگشای:** سنہ کتابت ۱۲۲۱ نہ کہ ۱۲۳۰ خط شکستہ نہ کہ نستعلیق خط شکستہ ہونے کا ذکر توضیحی کیٹلاگ میں بھی موجود ہے۔

HL.77 / No.525 **تاریخ زندیہ:** کتاب کا یہ نام نسخہ میں نہیں دیا گیا ہے اس کے ابتدائی ۸ اوراق کا خط نستعلیق ہے اور اس کے بعد کے اوراق شکستہ خط میں ہیں۔

HL.79 / No.526 **تاریخ محمدی:** مصنف کے نام کی ترتیب اسی طرح ہونی چاہیے محمد فتح اللہ ابن محمد تقی الساروی ہینڈ لسٹ میں ابن محمد تقی الساروی محمد فتح اللہ ہے اور توضیحی کیٹلاگ میں ابن محمد تقی الساروی محمد مذکور ہے۔

HL.80 / No.528 **مآثر سلطانیہ:** مصنف کے نام کی ترتیب عبدالرزاق ابن نجف قلی ہوگی نہ کہ ابن نجف قلی عبدالرزاق۔

HL.81 / No.531 **امیر نامہ:** مصنف کا نام بساون لعل متخلص شادان بن نین سکھ رائے ہوگا نہ کہ نینکہ رائے کیٹلاگ میں نین سکھ رای مذکور ہے اس کے کاتب عطا اللہ نو مسلم (عطا اللہ) ہیں اور سنہ کتابت ۱۲۵۰ھ۔

HL.82 / No.529 **تاریخ خانجہان و مخزن افغانی:** اوراق ۵۵۲ نہ کہ ۵۵۴ اس کے کاتب دو بجنید (دو بے چند) ہیں نہ کہ دو بجند۔

HL.84 / No.532 **ہشت بہشت:** کتاب کا ایک دوسرا عربی نام بھی ہے یعنی "الصفات الثمانیہ فی اخبار القیاصرۃ العثمانیہ"۔

HL.85 / No.533 **ہشت بہشت:** اوراق ۱۸۲ نہ کہ ۱۸۱۔

HL.86 / No.534 **ہشت بہشت:** اوراق ۳۱۸ نہ کہ ۳۱۷۔

HL.87 / No.544 **بحر المواج:** اوراق ۳۳۲+۶ نہ کہ ۳۳۶۔

HL.88 / No.545 **بحر المواج:** اوراق ۱۲۸+۳ نہ کہ ۱۲۸۔

HL.90 / No.538 **تاریخ فرشتہ:** کتاب کا اصل نام "گلشن ابراہیمی" ہے۔

HL.91 / No.539 **تاریخ فرشتہ:** اوراق ۴۱۲ نہ کہ ۴۱۰۔

HL.92 / No.542 **چہار گلشن:** اس کے مرتب چندر بھان برہمن ہیں۔ ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مرتب کے نام کا ذکر بھی ضروری ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں مرتب کا ذکر کیا گیا ہے۔

HL.93 / No.543 **حقیقتہای ہندستان**: اوراق ۲۸۹ نہ کہ ۲۸۷ تعداد سطور ۱۲-۱۴ نہ کہ ۱۲۔

HL.94 / No.540 **خلاصۃ التواریخ**: تعداد سطور ۱۷-۱۸ نہ کہ ۱۷۔

HL.95 / No.535 **طبقات اکبری**: اس کتاب کا نام دیباچہ میں "طبقات اکبر شاہی" مذکور ہے البتہ یہ "طبقات اکبری" کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں یہ بات کہی گئی ہے البتہ عنوان "طبقات اکبری" کا دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ "طبقات اکبر شاہی" اور "تاریخ نظامی" کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ اس کے کاتب محمد بخش ہیں اور سنہ کتابت ۱۲۸۰ھ۔ اوراق ۵۳۹+۵ نہ کہ ۵۲۹۔

HL.100 / No.548 **تاریخ داؤدی**: اوراق ۲۲۴ نہ کہ ۲۳۳

HL.102 / No.550 **تذکرۃ الواقعات**: اس کے کاتب سید فرزند احمد صفی (صفیر) بلگرامی ہیں توضیحی کیٹلاگ میں کاتب کا نام موجود ہے۔

HL.105 / No.554 **آئین اکبری**: اوراق ۵۹۰+۵ نہ کہ ۵۹۰ تعداد سطور ۱۹-۲۱ نہ کہ ۱۹-۲۰۔

HL.109 / No.559 **اقبال نامہ جہانگیری**: ناقص الاوّل توضیحی کیٹلاگ میں بھی وضاحت نہیں کی گئی ہے صرف SLIGHTLY DEFECTIVE مذکور ہے۔

HL.111 / No.561 **اقبال نامۂ جہانگیری**: اوراق ۳۳۱ نہ کہ ۲۹۰۔

HL.113 / No.557 **جہانگیر نامہ**: بغور دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنہ کتابت ۱۰۲۱ھ ہے نہ کہ ۱۰۲۰ھ۔

HL.121 / No.570 **عمل صالح**: اوراق ۳۷۷ نہ کہ ۳۷۶ توضیحی کیٹلاگ میں صحیح تعداد ۳۷۷ مذکور ہے ناقص الآخر۔

HL.123 / No.568 **ملخص**: نسخہ میں مصنف کا نام اس طرح مذکور ہے محمد طاہر متخلص بہ آشنا المخاطب بہ عنایت خاں بن ظفر خاں بن خواجہ ابوالحسن ہینڈ لسٹ میں نام عنایت خان سے شروع کیا گیا ہے توضیحی کیٹلاگ میں پورا نام مذکور ہے۔

HL.124 / No.572 **تاریخ شجاعی**: نسخہ میں مصنف کا نام محمد معصوم بن حسن بن صالح مذکور ہے۔ ہینڈ لسٹ اور توضیحی کیٹلاگ میں محمد معصوم بن حسن صالح۔

HL.127 / No.573 **فتحیہ عبریہ**: مصنف کا نام نسخہ میں اس طرح ہے ابن محمد ولی احمد الملقب شہاب الدین طالش اس کی ترتیب اس طرح ہو سکتی ہے۔ احمد الملقب بہ شہاب الدین طالش بن محمد ولی یا شہاب الدین احمد تالش بن محمد ولی۔

HL.128 / No.574 **فتحیہ عبریہ**: اوراق ۹۵ نہ کہ ۹۴۔

HL.129 / No.575 **فتحیہ عبریہ**: اوراق ۱۱۴ نہ کہ ۱۱۳ توضیحی کیٹلاگ میں ۲۲۶ مذکور ہے۔ نسخہ میں مختلف مقامات پر خورشید نواب اور کتب خانہ سید ولایت علی خاں کی مہریں بھی ہیں۔

HL.131 / No.579 **تاریخ ارادت خانی**: مصنف کے نام میں المخاطب بہ ارادت خاں کا اضافہ کر دیا جائے تو بہتر ہے۔

توضیحی کیٹلاگ میں تفصیل موجود ہے۔ کتاب کا نام توضیحی کیٹلاگ میں تاریخ ارادت خاں مذکور ہے
اور یہی صحیح ہے نہ کہ تاریخ ارادت خانی۔

HL.133 / No.581 **تاریخ عالی:** کتاب کا پورا نام "تاریخ عالی فی سلک اللآلی" ہے۔ اوراق ۲۳۷+۲ نہ کہ ۲۴۲ کتاب کا
پورا نام توضیحی کیٹلاگ میں درج کر دیا گیا ہے۔

HL.134 / No.580 **تاریخ محمد شاہ:** کاتب نے ترقیمہ میں کتاب کا نام "تاریخ چغتائی" لکھا ہے۔ جبکہ کسی نے پہلے ورق
پر "وقائع سلطنت محمد شاہؒ" لکھ دیا ہے۔

HL.135 / No.582 **سیرۃ المتاخرین:** ہینڈلسٹ میں کیفیت کے خانے میں درج ہے کہ "مشہور است کہ این نسخہ از قلم
مصنف علیہ الرحمۃ است اما این بپایہ ثبوت نرسیدہ" لیکن یہ نسخہ مصنف کے قلم کا نہیں ہے مصنف
نے اس کتاب کو ۹۵-۱۱۹۴ھ کے درمیان لکھا اور مصنف کی وفات ۱۲۰۸ھ میں ہوئی جبکہ
اس نسخہ پر سنہ کتابت ۱۲۳۰ھ مذکور ہے۔

HL.139 / NO.588 **عبرت نامہ:** تعداد سطور ۱۳-۱۲ نہ کہ ۱۳ توضیحی کیٹلاگ میں تعداد سطور صحیح مذکور ہے۔ سنہ کتابت ۱۸۸۷ء نہ کہ ۱۸۷۸ء۔

HL.140 / No.589 **عبرت نامہ:** اوراق ۲۸۵ نہ کہ ۲۸۱۔

HL.141 / No.585 **ملخص التواریخ:** اوراق ۲۲۲ نہ کہ ۲۲۱۔

HL.143 / No.593 **تاریخ مظفری:** اوراق ۵۱۶+۷ سات اوراق پر "تتمہ تاریخ مظفری اور تصحیح نامہ" ہے نہ کہ ۴۹۲ ورق ۴۹۳
اور اسکے بعد کے کاتب فیض الحق امرتسری ہیں جنھوں نے یہ حصہ مسٹر قاسم حسن صاحب بہادر سکریٹری
خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کے حکم سے ۱۳۶۲ھ میں لکھا۔ اس لیے اب یہ کتاب
ناقص الآخر (جیسا کہ ہینڈلسٹ اور توضیحی کیٹلاگ میں لکھا گیا ہے) نہیں رہی۔

HL.144 / No.591 **تذکرہ سلاطین چغتا:** تعداد سطور ۲۱-۲۳ نہ کہ ۲۱۔

HL.146 / No.595 **جام جم:** اس کے کاتب سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ہیں اور سنہ کتابت ۱۲۷۶ھ توضیحی کیٹلاگ میں ۱۲۶۶ھ مذکور ہے۔

Hl.147 / No.594 **خلاصۃ التواریخ:** اوراق ۲۲۶ نہ کہ ۲۲۷۔

HL.148 / No.592 **منتخب اللباب:** مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں اپنا نام اس طرح لکھا ہے "محمد ہاشم مخاطب ہاشم
علی خاں کہ آخر مخاطب خافیخاں نظام الملکی" ہینڈلسٹ میں محمد ہاشم المخاطب بہ خافی خاں مذکور ہے۔ توضیحی
کیٹلاگ میں پورے نام کی وضاحت موجود ہے البتہ خافی خاں کو خوافی خان لکھا گیا ہے۔

HL.149 No.598 **بیگ لارنامہ:** نسخہ میں اس کے مصنف کا نام موجود نہیں اور نہ ہی ہینڈ لسٹ اور توضیحی کیٹلاگ میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ فہرست مشترک میں اس کے مصنف کا نام اور اکی میگلاری دیا گیا ہے اوراق ۱۳۳ نہ کہ ۱۳۲۔ اس کے کاتب شیخ راجی محمد ہیں نہ کہ محمد خلیل اور سنہ کتابت ۱۲۷۲ھ ہے نہ کہ ۱۲۳۳ھ۔

HL.150 No.599 **تاریخ سند:** یہ کتاب "تاریخ معصومی" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ مصنف کا تخلص نامی ہے اسی لئے کتاب کے دیباچہ میں اپنا نام اس طرح لکھا ہے "محمد معصوم المتخلص نامی" اس لیے ہینڈ لسٹ میں بھی نام کے ساتھ اس کے تخلص کا اضافہ مناسب ہوگا توضیحی کیٹلاگ میں یہ موجود ہے۔

HL.151 No.597 **چچ نامہ:** اس کے مصنف علی بن حامد بن ابی بکر کوفی ہیں نہ کہ علی بن ابی بکر فی توضیحی کیٹلاگ میں صحیح نام مذکور ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ تلخیص چچ نامہ ہے جس کے ملخص محمد خلیل ولد مرحوم قاضی محمد ہیں جنھوں نے مراد علی خاں کے حکم سے یہ تلخیص ۱۲۳۳ھ میں کی نہ کہ چچ نامہ۔ اوراق ۱۰۷ نہ کہ ۱۰۶۔

HL.152 No.600 **تاریخ طاہر وحید:** اس کے کاتب راجے محمد ولد شیخ میراں ہیں نہ کہ محمد خلیل ولد مرحوم قاضی محمد اور سنہ کتابت ۱۲۷۲ھ ہے نہ کہ ۱۲۲۳ھ محمد خلیل اس نسخہ کے کاتب ہیں جس سے راجے محمد نے نقل کیا ہے کتاب کا نام ہینڈ لسٹ میں "تاریخ طاہر وحید" مذکور ہے جبکہ نسخہ کے ترقیمہ میں "تاریخ طاہری" اس کا نام "تاریخ طاہری" ہی ہوگا توضیحی کیٹلاگ میں بھی یہی مذکور ہے۔

HL.153 No.601 **واقعات کشمیر:** یہ کتاب "تاریخ اعظمی" کے نام سے بھی مشہور ہے اس لیے کتاب کے نام کے بعد المعروف بہ "تاریخ اعظمی" کا اضافہ مناسب ہوگا۔

HL.154 No.602 **تاریخ بھرت پور:** اوراق ۴۰ نہ کہ ۴۲، تعداد سطور ۱۲۔۱۵ نہ کہ ۱۳۔۱۸ صرف آخری ورق پر پہلی طرف ۱۶ اور دوسری طرف ۱۸ سطریں ہیں۔ یہ وقائع ہے مصنف نے بھی اس کے لیے وقائع کا لفظ ہی استعمال کیا ہے اس لیے اسے "تاریخ بھرت پور" کے بجائے "وقائع بھرت پور" کا نام دیا جانا چاہیے۔ تعداد اوراق توضیحی کیٹلاگ میں صحیح مذکور ہے۔

HL.155 No.603 **گل رحمت:** یہ کتاب محمد مستجاب خاں کی تصنیف "گلستان رحمت" سے انتخاب ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں یہ اضافہ ضروری ہے توضیحی کیٹلاگ میں موجود ہے۔

HL.156 No.605 **تاریخ محتشم:** یہ کتاب دو طبقوں میں ہے اور یہ طبقہ اول ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانہ میں یہ درج ہونا چاہیے توضیحی کیٹلاگ میں موجود ہے سنہ کتابت ۱۲۱۷ نہ کہ ۱۲۱۷۔

HL.159 / No.608 **تاریخ بنارس**: اوراق ۲۱۸ تا ۲۲۰۔ ناقص الآخر۔ نسخہ کے ابتدائی دو اوراق پر مصنف کے نواسے سبحان علی ابن حسن علی خاں کا لکھا ہوا تعارف ہے کتاب کا نام "تاریخ بنارس" نسخہ میں کہیں بھی مذکور نہیں یہ نام فہرست نگار کا دیا ہوا معلوم ہوتا ہے توضیحی کیٹلاگ میں بھی کتاب کا نام نہیں دیا گیا ہے اس کتاب میں بنارس کے راجاؤں / زمینداروں کے حالات میں اس لیے اسے "تاریخ راجگان و زمینداران بنارس" کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔

HL.160 / No.607 **تحفہ تازہ**: یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور یہ کتاب کی پہلی جلد ہے توضیحی کیٹلاگ میں اس کا ذکر کردیا گیا ہے۔ اوراق ۱۵۸ تا ۱۵۷۔

HL.161 / No.609 **مظفر نامہ**: تعداد سطور ۱۴ - ۱۵ تا ۱۴۔

HL.164 / No.612 **بساطین السلاطین**: اس کے کاتب میر حیدر علی ہیں مصنف کے نام محمد ابراہیم الزبیری ہیں الموفب صاحب حضرت کا اضافہ مناسب ہوگا ترقیمہ میں بھی مصنف کو اسی نام سے یاد کیا گیا ہے توضیحی کیٹلاگ میں نام کے ساتھ صاحب حضرت بھی مذکور ہے۔

HL.165 / No.613 **تاریخ محمد قطب شاہ**: کتاب کا نام اس کے دیباچہ میں "تاریخ سلطان محمد قطب شاہی" مذکور ہے توضیحی کیٹلاگ میں بھی یہ نام دیا گیا ہے۔

HL.171 / No.619 **تاریخ حمید خاں**: کتاب کا یہ نام نسخہ میں کہیں بھی مذکور نہیں البتہ یہ حمید خاں کا لکھا ہوا وقائع ہے۔

HL.174 / No.620 **روزنامچہ شاہ عالم**: ناقص الآخر۔

## جلد دوم

HL.1742 / No.1744 **تاریخ طبری**: اس کا عنوان ترجمہ تاریخ طبری ہوگا۔

HL.1745 / No.1752 **جام جہاں نما**: ہینڈلسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے کہ یہ کتاب مصنف کی اپنی تحریر میں ہے۔ لیکن ترقیمہ کی عبارت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی دوسرے شخص کی تحریر کردہ ہے ترقیمہ کی عبارت یہ ہے "کتاب مسمّیٰ بجام جہاں نما من تصنیف افضل المتاخرین محمد مظفر حسین"۔ نسخہ کے پہلے ورق پر ظفر علی خاں کی مہر ہے ظفر علی خاں مصنف کا پوتا ہے

HL.1755 / No.1756 **ہدیۃ الشائقین**: ہینڈلسٹ میں کیفیت کے خانے میں درج ہے کہ یہ کتاب خلفای راشدین کے حالات پر مشتمل ہے جبکہ ایسا نہیں ہے اس میں مناقب یا فضائل خلفای راشدین ہیں اس لیے اسے تاریخ

کی کتابوں میں رکھنا مناسب نہیں بلکہ تذکرہ میں رکھا جاسکتا ہے۔

HL.1758/No.1759 **مجالس الائمہ** : اس کا سنہ کتابت ۱۲۶۷ھ ہے نہ کہ ۱۲۶۸ھ مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں اسکا نام
کہیں "مجالس الائمہ علیہم الصلوٰۃ والسلام" لکھا ہے اور کہیں "مجلس الائمہ" اوراق ۱۹۴ نہ کہ ۱۹۳ ۔

HL.1761/No.1762 **خلاصۃ التواریخ** : نسخہ میں کہیں بھی مصنف کا نام مذکور نہیں مرتب ہینڈ لسٹ نے مصنف کا نام
سجان رائے لکھا ہے جبکہ کیٹلاگ جلد ۲ میں مختلف حوالوں سے تین نام دیے گئے ہیں اور اس
میں سُجان کو صحیح مانا گیا ہے فہرست مشترک میں مصنف کا پورا نام سُجان رای سنگھ بٹالوی مذکور ہے۔

HL.1765/No.1766 **اقبالنامۂ جہاں گیری** : مذکورہ نمبر کے تحت جلد سوم ہے نہ کہ دوم توضیحی کیٹلاگ جلد ۱ (S)
میں بھی جلد سوم مذکور ہے اوراق ۲۹۲ ہیں نہ کہ ۲۹۱ ۔

HL.1767/NO.1769 **(مقدمہ) سیر المتاخرین** : یہ صرف مقدمہ نہیں بلکہ سیر المتاخرین کا جلد اول بھی ہے ۔

HL.1774/No.1775 **نشان حیدری** : اس نسخہ کے کاتب غلام نبی نہیں بلکہ میر سرفراز علی خلف میر غلام علی خاں ہیں غلام نبی اس
نسخہ کے کاتب ہیں جس نسخہ سے سرفراز علی نے نقل کیا ہینڈ لسٹ و توضیحی کیٹلاگ میں مذکور سنہ کتابت
بھی غلام نبی والے نسخہ کی ہے سرفراز علی نے سنہ کتابت نہیں دی ہے اوراق ۲۰۳ نہ کہ ۱۹۷ ۔

HL.1754/No.203 **شواہد نبوت** : کتاب کا پورا نام دیباچہ میں یہ مذکور ہے "شواہد نبوت لتقویت یقین اہل فتوت" توضیحی
کیٹلاگ میں اس نمبر کے تحت کتاب کا پورا نام مذکور نہیں البتہ وہاں توضیحی کیٹلاگ نمبر ۱۸۰ کا حوالہ
دیا گیا ہے۔ لیکن توضیحی کیٹلاگ نمبر ۱۸۰ پر اس نام کا کوئی رسالہ نہیں البتہ نمبر ۱۸۱ کے تحت چوتھے
نمبر پر یہ رسالہ ہے اور یہاں رسالے کا پورا نام مذکور ہے ۔

HL.1757/No.1758 **جلاء العیون** : اوراق ۴۵۴ نہ کہ ۱۵۴ تعداد سطور ۲۱ نہ کہ ۲۵ ۔

HL.1759/No.1760 **قصۂ ابومسلم** : اوراق ۱۹۱ نہ کہ ۱۹۰ ۔

HL.1764/No.1765 **اقبال نامۂ جہان گیری** : اوراق ۲۰۲ نہ کہ ۲۰۴ ۔

HL.1766/No.1767 **ماثر عالمگیری** : اوراق ۱۳۲ نہ کہ ۱۵۵ ۔

HL.1768/No.1770 **سیر المتاخرین** : اوراق ۴۸۸ نہ کہ ۴۸۷ اس نسخہ میں صرف جلد اول و دوم ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت
کے خانے میں اس کا ذکر ہونا چاہیے ناقص الآخر توضیحی کیٹلاگ میں جلد اول و دوم ہونے کا ذکر کر دیا گیا ہے ۔

HL.1770/No.1772 **تاریخ تیموریان** : نسخہ میں کہیں بھی کتاب کا نام مذکور نہیں ہینڈ لسٹ و توضیحی کیٹلاگ میں جو نام دیا گیا ہے

اس کے آخر میں اگر ہند کا اضافہ کر دیا جائے تو مناسب ہوگا یعنی "تاریخ تیموریانِ ہند"۔

HL.1775 / No.1776 **وقائع مہابت جنگ:** ہینڈ لسٹ میں توضیحی کیٹلاگ کی طرح کیفیت کے خلنے میں اگر درج ذیل عبارت کا اضافہ کر دیا جائے تو مناسب ہوگا "کہ از عدد ہر فقرہ او سال حال بر می آید"۔

HL.1756 / No.1757 **روضۃ الشہدا:** مصنف کا نام ہینڈ لسٹ میں حسین بن علی کاشفی مذکور ہے مناسب ہوگا اگر حسین کا پورا نام یعنی کمال الدین حسین لکھا جائے۔

## جلد سوم:

HL.2630 **بہجۃ التواریخ:** ناقص الآخر مصنف کا نام شہاب الدین احمد ہو سکتا ہے۔

HL.2772 **تاریخ ایران:** نسخہ میں سنہ کتابت ۱۱۴۰ھ مذکور ہے جو بعد کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے خود مصنف نے کتاب میں ۱۱۵۴ھ تک کے حالات بیان کیے ہیں ہینڈ لسٹ میں بھی سن کتابت ۱۱۴۰ھ مذکور ہے۔

HL.2817 **تاریخ خانجہانی مخزن افغانی:** کتاب کے نام میں خانجہانی کے بعد اور مخزن افغانی سے قبل "و" کا اضافہ کیا جائے اس کے مصنف نعمت اللہ سامانی بن حبیب اللہ ہروی ہیں اوراق ۳۲۲ نہ کہ ۳۱۹۔

HL.3790 **تاریخ رشید:** اس کے مصنف مرزا محمد حیدر دوغلت گورگانی بن محمد حسین ہیں۔ ۹۵۲ھ سنہ تصنیف ہے اگر اسے سنہ کتابت بھی مان لیا جائے تو یقیناً یہ بہت اہم اور مصنف کی خود نوشت تحریر ہو سکتی ہے۔

HL.2898 **تاریخ طبری:** "یہ ترجمہ تاریخ طبری" ہے ناقص الآخر و کرم خوردہ اوراق ۳۵۱ نہ کہ ۳۵۰۔

HL.3854 **تاریخ عالم آرای عباسی:** کتاب کے نام میں لفظ تاریخ کا اضافہ غیر ضروری ہے یہ کتاب تین جلدوں میں ہے مذکورہ نسخہ صرف جلد دوم ہے اوراق ۲۸۶ نہ کہ ۲۳۸۔

HL.3092 **تاریخ عرب قدیم مع سیرت عنترہ بن شداد:** ناقص الاول اوراق ۱۶۶ نہ کہ ۱۶۸۔

HL.4028 **تاریخ مجمل مفصل:** اوراق ۱۴۵ نہ کہ ۱۴۶ اس کے کاتب درج ذیل شعر کے مطابق عنایت ہو سکتے ہیں

نوشتہ بماند بخط غریب — نصر من اللہ فتح قریب

ای عنایت تو دست کن کوتاہ — مژدہ یابی ز رحمت اللہ

HL.3322 **تاریخ وصاف:** کتاب کا نام اس کے دیباچہ میں "تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار" درج ہے اوراق ۲۸۰ نہ کہ ۲۷۸ یہ تاریخ پانچ جلدوں میں ہے جبکہ مذکورہ نسخہ جلد اوّل و دوم ہے۔

HL.2525 **تزک تیمور:** یہ توزک تیموری ہے اوراق ۲۳۸ نہ کہ ۲۳۷ قدرے کرم خوردہ۔

HL.2565 **حبیب السیر:** کتاب کا پورا نام "حبیب السیر فی اخبار افراد البشر" ہے یہ نسخہ جلد دوم کے جزو دوم تک
ہی ہے، مکمل نہیں اوراق ۴۱۹ نہ کہ ۴۲۸ کرم خوردہ ہینڈ لسٹ میں کاتب کے خانہ میں سید اسمٰعیل
درج ہے جو غلط ہے کاتب کا نام نسخہ میں جو لکھا تھا قیاس یہ ہے کہ اسے مٹا کر اس کی جگہ سید اسمٰعیل
نے اپنی حق ملکیت کا ذکر کیا ہے نسخہ کے آخری ورق پر سید اسمٰعیل علی خاں کی مہر بھی ثبت ہے ۔

HL.3289 **حملۂ سکندری:** مصنف کے نام کے آخر میں عظیم آبادی کا اضافہ مناسب ہوگا "حملۂ سکندری"
دراصل نظامی گنجوی کے "سکندر نامہ" کا ترجمہ ہے . جو ۱۲۸۰ھ میں کیا گیا ۔

HL.2796 **روضۃ الصفا:** کتاب کا پورا نام "روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخلفاء" ہے مصنف کا
پورا نام سید محمد بن برہان الدین خاوند شاہ بن کمال الدین محمود معروف بہ میر خواند ہے ۔ اوراق
۶۲۷ نہ کہ ۶۱۹ ابتدائی اور آخری ورق بعد کے لکھے ہوئے ہیں یہ کتاب سات جلدوں میں
ہے جبکہ زیر نظر نسخہ صرف جلد اول ہے ۔

HL.3639 **روضۃ الصفا:** کتاب اور مصنف کے نام کے لیے ہینڈ لسٹ نمبر ۲۷۹۶ دیکھیں اس کے کاتب شاہ محمد
بخاری ہیں کرم خوردہ اوراق ۲۳۴ نہ کہ ۲۳۱ ۔

HL.3769 **سارستان چہار چمن:** اوراق ۶۵۸ نہ کہ ۵۵۸ اس میں ورق کے ایک طرف ہی تحریر ہے ۔
دوسرا حصہ سادہ ہے تعداد سطور ۱۵ ۔ ۲۵ نہ کہ ۱۵-۱۲ ۔

HL.4087 **کتاب (مجہول الاسم)** مصنف کا نام نسخہ کے ورق ۵ ب پر محمد جلیل مذکور ہے اور کتاب کا نام ورق ۲۴
الف پر آئین امیر الامراء ... مذکور ہے یہ کتاب امیر الامرا بہادر فیروز جنگ کے حالات پر ہے تعداد سطور ۱۴-۷ نہ کہ ۱۴

HL.3778 **مرآۃ العالم:** ناقص الاول نہ کہ ناقص الطرفین یہ مرآۃ العالم کے نمائش پنجم اور اس کے بعد کے حصے ہیں اس
سے پہلے کا حصہ نہیں نیز یہ کتاب آرائش نہم تک ہے فہرست مشترک میں احمد منزوی نے لکھا ہے کہ
یہ کتاب سات آرائش میں ہے آٹھویں اور نویں آرائش درج ذیل ہے ۔

آرائش ہشتم : "در ذکر طایفہ از وزرای ازمنہ سابقہ و عہد سعادت مہد پادشاہ دین پرور و علمای عہد
کرامت بہر خدیو عدالت گستر محتوی بر دو پیرایش" ۔

آرائش نہم : "در ذکر مخترع صنعت کتابت و احوال طایفہ خوش نویسان و برخی از بدائع و غرائب
جہاں مشتمل بر دو پیرایش" نیز ساتویں آرائش کے لیے احمد منزوی نے لکھا ہے کہ یہ تین پیرایش میں

ہے جبکہ مذکورہ نسخہ میں یہ پانچ پیرائش میں ہے۔

HL.3482 **مہدی نامہ**: اوراق ۱۸۴ نہ کہ ۱۸۵۔

HL.2574 **نگارستان**: اوراق ۱۹۰ نہ کہ ۱۷۸۔

HL.3712/1 **ہیئت الافلاک**: ایک ورق نہ کہ ۲ ناقص الآخر۔

HL.4092 **ترجمۃ الاسرار**: اس کے مصنف کا نام کمال اللہ ابن محمد یہ صدیقی ہے نہ کہ کمال الدین اوراق ۲۶۴ نہ کہ ۲۶۱۔ قدرے کرم خوردہ۔

HL.3856 **حیات القلوب**: کاتب کا نام مرزا محمد رضا ولد مرزا افضل علی ہے نہ کہ افضل علی، اوراق ۲۷۴ نہ کہ ۲۷۵۔

HL.3093-94 **درج الدرر الغرر فی بیان میلاد سید البشر**: کرم خوردہ ہینڈ لسٹ میں ہینڈ لسٹ نمبر ۳۰۹۳ کے تحت جلد اول اور ہینڈ لسٹ نمبر ۳۰۹۴ کے تحت جلد دوم مذکور ہے در حقیقت کتاب کی ضخامت کی وجہ سے لائبریری نے اسے دو جلدوں میں مجلد کر دیا ہے۔ ہینڈ لسٹ میں تعداد اوراق دونوں نمبروں کے لیے تقریباً دو سو (۲۰۰) مذکور ہے جبکہ جلد اول میں ۱۶۶ اور جلد دوم میں ۱۶۹ اوراق ہیں اس طرح کتاب کے کل اوراق ۳۳۵ ہوتے ہیں۔

HL.3395 **رسالہ علی شیر شیرازی یعنی مناقب محمدی**: رسالہ کا نام "شمس مناقب محمدی" ہے اور یہ سیدنا محمد ابن سید درویش ابو محمد شمس الدین قادری جیلانی کے حالات پر مشتمل ہے تعداد سطور ۱۱-۱۸ نہ کہ ۱۴۔

HL.2942 **روضۃ الاحباب**: مصنف کے نام کے آگے الملقب بہ جمال الحسینی کا اضافہ سمجھا جائے کرم خوردہ اوراق ۱۹۷ نہ کہ ۱۹۶۔

HL.2701 **مطلع الانوار فی سیرۃ النبی المختار**: کتاب کا نام "مطلع الانوار فی ترجمۃ الآثار" ہوگا۔ سنہ کتابت ۱۲۳۸ فصلی ہے نہ کہ ۱۲۳۸ اوراق ۱۵۹ نہ کہ ۱۶۰۔

HL.2955 **مطلع الانوار فی ترجمۃ الآثار**: اس کے مصنف عفیف نور کاشانی ہیں۔

HL.2471 **معارج النبوۃ**: یہ کتاب "قصص موسیٰ" ہے جو "اعجاز موسوی" کے نام سے بھی جانی جاتی ہے اور یہ کتاب تفسیر کے موضوع پر ہے نہ کہ تاریخ۔ اس کے کاتب عبدالرحمٰن شکارپوری ہیں۔

HL.2900 **معارج النبوۃ**: کتاب کا پورا نام "معارج النبوہ فی مدارج الفتوۃ" ہے اور یہ کتاب کا رکن اول و دوم ہے نہ کہ جلد اول اس کے مصنف معین المسکین ہیں نہ کہ عبدالحق بن سیف الدین دہلوی۔ یہ کتاب دو خط

میں ہے ابتدائی ۱۶۲ اوراق کے کاتب محمد درویش بن حاجی کرم علی ہیں بقیہ اوراق کے کاتب کا نام مذکور نہیں۔

HL.2901 **معارج النبوة**: کتاب کا پورا نام "معارج النبوہ فی مدارج الفتوة" ہے اور یہ کتاب کا رکن سوم و چہارم ہے یہ جلد دوم ———— اوراق ۳۱۲ نہ کہ ۳۱۱ در اصل ہینڈ لسٹ نمبر ۲۹۰۰ اور ۲۹۰۱ ایک ہی کتاب ہے جس کو دو جلدوں میں مجلد کر دیا گیا ہے کل اوراق ۵۴۸ ہیں جس میں ۲۱۵ اوراق کے کاتب کا نام معلوم نہیں اس کے بعد کے اوراق کے کاتب محمد درویش بن حاجی کرم علی ہیں۔ کرم خوردہ نسخہ کے آخری ورق پر تین مہریں ہیں ایک عبداللہ خانہ زاد بادشاہ عالمگیر کی اور دو مہریں کن ہیں اسے کرم خوردگی کی وجہ سے پڑھنا مشکل ہے۔

HL.2915 **معارج النبوة**: کتاب کا پورا نام "معارج النبوہ فی مدارج الفتوة" ہے اور اس کے مصنف معین مسکین ہیں نہ کہ عبدالحق بن سیف الدین دہلوی اوراق ۳۶۲ نہ کہ ۶۳۲۔ اس میں صرف رکن اول و دوم ہے۔

HL.4016 **نسخہ تولد حضرت محمد صلعم**: یہ "تولد نامہ حضرت رسالت پناہ صلعم" ہے

HL.2790 **تحریر الشہادتین**: اس کے مصنف شاہ عبدالعزیز دہلوی نہیں بلکہ یہ شاہ عبدالعزیز دہلوی کی عربی تالیف سر الشہادتین کا فارسی ترجمہ ہے جسے سلامت اللہ نے "تحریر الشہادتین" کے نام سے کیا اوراق ۹۲ نہ کہ ۸۷۔

HL.4017 **جنگ نامہ امیر المومنین**: اس کے مصنف ابوبکر بن احمد بن محمد علی الملقب بہ بدر ہیں اور یہ رسالہ روز عاشورہ کی فضیلت اور آخر کا حصہ حضرت حسن و حسین کی شہادت کے ذکر پر مشتمل ہے کتاب کے ترقیمہ میں کاتب نے کتاب کا نام "جنگ نامہ امیر المومنین حسن و حسین" لکھا ہے جبکہ مصنف نے خود اس کا کوئی نام نہیں دیا ہے لیکن دیباچہ میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ روز عاشورہ کی فضیلت اور حضرت حسن و حسین کے شہادت کے ذکر پر ہے اس لیے کتاب کا نام جنگ نامہ امیر المومنین مناسب نہیں بلکہ "رسالہ در فضیلت روز عاشورہ" زیادہ مناسب ہوگا۔ اس میں سن کتابت مذکور نہیں اس کی جگہ "در عہد اورنگ زیب غازی" مذکور ہے۔

HL.2781 **روضة الشہدا**: اس کا سن کتابت ۱۲۱۷ھ ہے نہ کہ ۱۲۲۷ھ۔

HL.3032 **روضة الشہدا**: کاتب کا نام نسخہ میں عنایت مذکور ہے نہ کہ عنایت اللہ از ابتدا کرم خوردہ۔

HL.2459 **اکبر نامہ**: دیباچہ میں نہ تو کتاب کا نام ہے اور نہ ہی اسکے مصنف کا البتہ ترقیمہ میں "انتخاب اکبر نامہ" مذکور ہے۔ اوراق ۱۳۷ نہ کہ ۱۳۸۔

HL.2652 **اکبرنامہ**: اوراق ۳۴۶ نہ کہ ۳۴۴ تعداد سطور ۱۴ نہ کہ ۱۳۔

HL.3036 **اکبرنامہ**: اوراق ۲۲۲ نہ کہ ۲۲۱ ورق ۱۰۱ تک تعداد سطور ۱۵ ہے اور اس کے بعد ۲۱-۲۲ نہ کہ ۱۵ اور یہ اکبرنامہ کا صرف جلد اوّل ہے۔

HL.2740 **اکبرنامہ**: اوراق ۲۶۹ نہ کہ ۲۶۶ سنہ کتابت ۱۲۲۹ھ یہ بھی کتاب جلد اول ہی ہے۔

HL.3313 **اکبرنامہ**: اوراق ۲۹۴ نہ کہ ۲۹۸ ناقص الآخر تعداد سطور ۱۶-۱۷ نہ کہ ۱۷، یہ جلد دوم ہے۔

HL.1720 **آئین اکبری**: اسے HL ۱۷۲۰ نہیں بلکہ ۲۷۲۰ سمجھا جائے۔ کرم خوردہ۔

HL.2722 **آئین اکبری**: اوراق ۱۵۷ نہ کہ ۱۵۶۔

HL.2713 **آئین اکبری**: اسے HL ۲۷۱۳ نہیں بلکہ ۲۷۲۳ سمجھا جائے۔

HL.2725 **آئین اکبری**: از ابتدا کرم خوردہ تعداد سطور ۱۸-۱۹ نہ کہ ۱۹۔

HL.2794 **بادشاہ نامہ**: اوراق ۳۲۰ نہ کہ ۳۲۱ کرم خوردہ۔

HL.3571 **تاریخ انگریز**: یہ دراصل بل صاحب کی انگریزی کتاب کے باب نہم و دہم کا ترجمہ ہے اور اس کے مترجم محمد انور ہیں اوراق ۹۴ نہ کہ ۹۲۔

HL.3020 **تواریخ جہانگیر موسوم بہ اقبال نامہ جہانگیری**: اس کا عنوان صرف "اقبال نامۂ جہانگیری" ہوگا اور یہ کتاب کا صرف جلد سوم ہے۔

HL.3291 **تاریخ شاہجہان**: کتاب کا نام اس کے دیباچہ میں "عمل صالح" مذکور ہے۔ اوراق ۳۲۳ نہ کہ ۳۲۹ ناقص الآخر و قدرے کرم خوردہ۔

HL.2604 **تاریخ عالمگیر ثانی**: اوراق ۱۱۰+۶ نہ کہ ۱۱۸۔

HL.2614 **تاریخ عالمگیر ثانی المعروف بہ تذکرہ عماد الملک**: اوراق ۱۹۸+۲ نہ کہ ۱۹۸، ناقص الطرفین۔

HL.2778 **تاریخ فرشتہ**: نسخہ کے دیباچہ میں اس کا نام "نورس نامہ" مذکور ہے (۲ب) دراصل اس کتاب کا نام گلشن ابراہیمی ہے نورس نامہ کے لیے احمد منزوی نے لکھا ہے کہ "نگارندہ پس از پایان کار خود بخش تاریخ عمومی آں را گزیدہ نورس نامہ نامیدہ است"۔ اوراق ۶۳۹ + ۱۲ نہ کہ ۶۴۹۔

HL.2700 **تاریخ منتخب نامۂ ہندیہ**: کتاب کے نام میں لفظ "تاریخ" کا اضافہ غلط ہے صرف "منتخب نامۂ ہندیہ" اس کا نام ہے اس میں ہندستان کے مختلف صوبوں کے بارے میں اور ابتدا سے عالمگیر ثانی تک

کے بادشاہوں کے حالات مذکور ہیں۔ ناقص الآخر۔

HL.3779 تلخیص تاریخ مظفری: اوراق ۲۷۷ نہ کہ ۱۷۵۔

HL.3080 جنگ نامۂ بہادر شاہ: یہ کتاب جنگ نامہ کے نام سے ہی جانی جاتی ہے کتاب کے ترقیمہ میں "جنگ نامہ بہادر شاہ اعظم شاہ" مذکور ہے اس کے کاتب مقصود علی ہیں اور یہ خط نیم شکستہ میں ہے نہ کہ نستعلیق۔ کرم خوردہ۔

HL.2374 جنگ نامۂ بہادر شاہ: اسے بھی جنگ نامہ ہی پڑھا جائے اس میں بھی اختتام پر نقل جنگ نامہ محمد اعظم شاہ و بہادر شاہ" مذکور ہے۔

HL.2999 خلاصۃ الاحوال بادشاہان و راجگان سلف ہند: اس کا نام صرف "خلاصۃ الاحوال" ہے اور اس کے مصنف آسارام ذوق ہیں پاکستان میں بھی اس کا نسخہ موجود ہے فہرست مشترک میں احمد منزوی نے اس کے مصنف کے لیے ناشناختہ لکھا ہے۔ یہ ہندستان کی تاریخ ہے جس میں ابتدا سے لے کر ۱۱۳۸ھ تک کے حالات مذکور ہیں۔ ناقص الآخر۔

HL.2908 خلاصۃ التواریخ: اس کا سنہ کتابت ۱۲۲۳ھ ہے نہ کہ ۱۲۲۲ھ اوراق ۲۲۴ نہ کہ ۲۱۷۔

HL.3290 خلاصۃ التواریخ: یہ کتاب کا صرف حصہ اول ہے ناقص الآخر اوراق ۹۸ نہ کہ ۹۶۔

HL.4080 خلاصۃ التواریخ: ناقص الاول اوراق ۳۰۹ نہ کہ ۳۰۸۔

HL.2475 سوانح اکبری جلد اول: یہاں جلد اول لکھنے کی ضرورت نہیں چونکہ جلد بندی میں سہولت کے لیے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس کے کاتب محمد مستحسن زمان بہاری ہیں نہ کہ محسن زمان بہاری۔ اوراق ۱۳۵ نہ کہ ۱۳۲۔

HL.2476 سوانح اکبری جلد دوم: یہ ہینڈ لسٹ نمبر ۲۴۷۵ کا بقیہ حصہ ہے اس لیے یہاں بھی جلد دوم نہیں ہوگا۔ اس نسخہ کے خاتمہ پر مذکور ہے "تمام شد جلد اول سوانح اکبری" اس کے کاتب بھی مستحسن زماں بہاری ہیں۔

HL.2995 سوانح دکن: اس کے مصنف منعم خاں الہمدانی الاورنگ آبادی ہیں اوراق ۲۷۷ نہ کہ ۲۴۶ ناقص و کرم خوردہ۔

HL.3669 سوانح دکن: اوراق ۱۵۲+۶ نہ کہ ۱۵۵۔

HL.3771 سیر المتاخرین: کاتب کے نام میں معروف بہ محمد بساون کا اضافہ سمجھا جائے اوراق ۴۳۶ نہ کہ ۴۳۲۔

HL.4085 سیر المتاخرین: یہ کتاب تین جلدوں میں ہے اور مذکورہ نسخہ صرف جلد دوم ہے تعداد سطور ۱۶-۱۸ نہ کہ ۱۷

آخری ۳۴ اوراق پر "انتخاب لفظیات سیر المتاخرین" ہے۔

HL.3009 **شاہنامہ منور کلام**: اس کے مصنف شیو داس لکھنوی ہیں نہ کہ منور کلام۔ اوراق ۷۶ نہ کہ ۱۵۱۔

HL.2612 **عبرت العالم**: ناقص الآخر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتابت ہی مکمل نہ ہو سکی۔

HL.2615 **عبرت مقال مع عبرت نامہ**: اوراق ۱۳۱ + ۳ نہ کہ ۱۳۲۔ ابتدائی دو اوراق پر فہرست مضامین ہے اور تیسرے ورق پر کاتب کا نوٹ "بہ تشریح تسطیر مجلد ہذا"۔

HL.3095 **فیاض القوانین**: اس نمبر کے تحت فیاض الانشا ہے جس کے مصنف محمود بن شیخ محمد گیلانی ہیں یہ کتاب علم انشا اور اس کے قواعد و ضوابط پر ہے۔ ناقص الآخر۔

HL.2798 **مرآت سکندری**: اوراق ۱۸۶ نہ کہ ۱۸۵ ناقص الاول ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں دوسرے نسخہ کے لیے شمارہ نمبر ۶۳ دیا گیا ہے جو غلط ہے اس نمبر کے تحت شجرۃ الاتراک ہے جو چنگیز خاں اور اس کے آبا و اجداد کے حالات میں ہے دوسرے نسخہ کا شمارہ ۱۶۳ ہے۔

HL.3573 **منتخب التواریخ**: اوراق ۲۳۰ نہ کہ ۲۶۱ قدرے آب و کرم خوردہ۔

HL.3690 **نسخۂ دلکشا**: ۱۴۲ اوراق اگر ابتدائی ایک ورق جو سرورق ہے اسے بھی شامل کر لیا جائے تو ۱۴۳ ہونگے نہ کہ ۲۸۳۔

HL.3840 **واقعات کشمیر**: اوراق ۱۰۸ نہ کہ ۱۰۶۔

HL.2880 **واقعات جنگ شاہ عالم بادشاہ ثانی**: اس کے مصنف چھکن لال ہیں (ورق ۴۲-۴۶) اس میں ۱۱۹۴ھ سے ۱۲۰۰ھ تک کے مختلف واقعات مذکور ہیں جس میں واقعات جنگ عالم شاہ بھی ہے اوراق ۵۸ نہ کہ ۵۹ ناقص الطرفین۔ خط نستعلیق نہ کہ شکستہ۔

(۲) "تحولات نوازش شاہی" یہ در اصل "منشات مادھو رام" ہے اور اسکے مصنف مادھو رام منشی ہیں یہ کتاب دو فصل میں ہے۔ موجودہ نسخہ فصل دوم ہے یہ فن انشا کے تحت ہوگا نہ کہ فن تاریخ۔ ناقص الآخر اوراق ۵۰ نہ کہ ۲۸ تعداد سطور ۱۲ نہ کہ ۹-۸ خط نیم شکستہ۔

HL.2869/2 **واقعات عالمگیری**: اس کے مصنف عاقل خان متخلص بہ راضی ہیں اور خط نستعلیق و قدرے شکستہ ہے نہ کہ شکستہ۔

## تذکرہ

### جلد اوّل :

HL.176 / No.650 مرآۃ القدس : اس کے مصنف کا نام پادری ژیرو و ہملو شوئر ہے نہ کہ ژیرو نیمو شویر۔ سنہ کتابت ۱۰۱۳ھ ہے۔ کتاب مکمل ہے نہ کہ ناقص الآخر۔ اوراق ۲۹ نہ کہ ۳۸۔ خدا بخش لائبریری کے توضیحی کیٹلاگ جلد ۸ میں سنہ کتابت مذکور ہے۔

HL.178 / No.652 بستان المحدثین : یہ صرف کتاب کا جز اول ہے۔

HL.180 / No.654 آثار الوزرا : اوراق ۲۲۸ نہ کہ ۲۲۷۔

HL.181 تذکرۂ صوبہ داران اودھ : اوراق ۱۸۴ نہ کہ ۱۳۴۔

HL.182 / No.655 مآثر الامرا : اوراق ۳۰۲ نہ کہ ۳۰۱۔

HL.183-84 مآثر الامرا : مصنف کا نام عبدالرزاق الحسینی ہے جو شاہ نواز خان کا اصل نام ہے نہ کہ عبدالحئی۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اسے ترتیب دیا ہے اور مصنف کے حالات لکھے ہیں۔

HL.185 / No.666 اخبار الاخیار : کتاب کا پورا نام "اخبار الاخیار فی اسرار الابرار" ہے اوراق ۲۱۱ نہ کہ ۲۱۰۔ توضیحی کیٹلاگ میں پورا نام دیا گیا ہے۔

HL.186 / No.667 اخبار الاخیار : کتاب کا پورا نام "اخبار الاخیار فی اسرار الابرار" ہے۔ کتاب کے خاتمہ پر کاتب کے نام کی جگہ تمام شد بقلم قادری المشرب مذکور ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں اس کتاب کا پورا نام دے دیا گیا ہے۔

HL.19 / No.67 تاریخ قادریہ : اوراق ۸۳+۲=۸۵ نہ کہ ۸۳، دو اوراق پر فہرست ہے اس کے کاتب محمد منیر قادری انصاری کرانوی ہیں۔ کاتب کا نام توضیحی کیٹلاگ میں مذکور ہے۔

HL.19 / No.66 تذکرۃ الاولیا : اوراق ۳۷۰ نہ کہ ۳۶۰۔ کاتب بختی شاہ بن ملتان شاہ ہیں نہ کہ بخشی شاہ بن ملتانی شاہ توضیحی کیٹلاگ میں کاتب کا نام صحیح مذکور ہے۔

HL.19 / No.67 (ترجمہ) خلاصۃ المفاخر : اوراق ۱۴۷ نہ کہ ۱۴۵۔ کتاب کے خاتمہ کے بعد ۷ اوراق پر مکتوبات شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی ہے۔ جس کی تفصیل توضیحی کیٹلاگ میں آچکی ہے ہینڈلسٹ میں نہیں۔

HL.1 / No.6 توضیح الرشحات : کتاب کا یہی نام مصنف نے دیباچہ میں دیا ہے۔ اسلیے اسے قوسین کے اندر لکھنے کی ضرورت نہیں توضیحی کیٹلاگ میں بغیر قوسین کے نام مذکور ہے۔

HL.199 / No.674 **سفینۃ الاولیا** : اوراق ۱۹۱ نہ کہ ۹۰ . سنہ کتابت نسخہ میں ۳۹ عالمگیری مذکور ہے فہرست نگار نے ہینڈ لسٹ میں اسے ۱۱۰۸ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں عالمگیر کا سن جلوس ۱۰۶۸ھ ہے ایسی صورت میں ۳۹ سن جلوس ۱۱۰۶ھ / ۱۱۰۷ھ ہوگا نہ کہ ۱۱۰۸ھ۔

HL.201 / No.562 **صفوۃ الصفا** : کتاب کا نام دیباچہ میں "مواہب السنیۃ فی مناقب الصفویہ" ہے۔ اوراق ۴۴۴ نہ کہ ۴۴۲۔ توضیحی کیٹلاگ میں کتاب کے نام کی تفصیل موجود ہے۔

HL.202 / No.671 **کلمات الصادقین** : ناقص الاول۔ اوراق ۱۱۶ نہ کہ ۱۱۷۔ توضیحی کیٹلاگ میں اس کے ناقص الاول ہونے کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

HL.204 / No.673 **مرآۃ الاسرار** : اوراق ۴۹۶+۵، نہ کہ ۷ ۴۶۴-، ۷ اوراق پر فہرست ہے اس کے کاتب شیخ رحمت اللہ ہیں۔

HL.207 / No.703 **انیس الاحبا** : اوراق ۴۷+۳ نہ کہ ۱۸۲، ۳ اوراق پر فہرست ہے۔

HL.209-10 / No.682-83 **تحفۂ سامی** : مصنف نے کتاب میں اپنا نام یہ لکھا ہے "فقیر حقیر سام ابن اسمٰعیل الحسنی سام" کیٹلاگ میں صرف سام مرزا مذکور ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔

HL.212 **تذکرۃ الشعرا** : اس کے کاتب رحمت اللہ ابن عبداللہ ہیں۔

HL.214 / No.711 **تذکرۂ فارسی** : کتاب کا نام دیباچہ میں "ریاض الفصحا" مذکور ہے جو اس کا تاریخی نام بھی ہے مصنف نے اسے ۱۲۳۶ھ میں مکمل کیا اور یہ اس کے ایک سال بعد یعنی ۱۲۳۷ھ کا مکتوبہ ہے اوراق ۱۳۱+۱ نہ کہ ۱۳۱۔

HL.215 / No.687 **تذکرۂ طاہر نصیر آبادی** : اوراق ۳۳۰ نہ کہ ۳۳۹ ۔ اس کے کاتب محمد مقیم ابن حاجی کمال اصفہانی ہیں۔ توضیحی کیٹلاگ میں ۳۲۹ اوراق ہیں اور کاتب کے نام کی صراحت موجود ہے۔

HL.217 / No.700 **خزانۂ عامرہ** : اوراق ۳۴۸+۵ نہ کہ ۳۴۹۔ کتاب کے خاتمہ کے بعد ½ ورق پر نقل رقعہ احسن متخلص بہ تحسین ہے۔

HL.218 / No.684 **خلاصۃ الاشعار** : کتاب کا پورا نام "خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار" ہے اور اس کے مصنف کا نام بھی مکمل شکل میں تقی الدین محمد ابن شرف الدین علی لکھا جائے تو بہتر ہے۔ اوراق ۳۹۱ نہ کہ ۳۹۵۔ توضیحی کیٹلاگ میں کتاب کا پورا نام آگیا ہے۔

HL.219 / No.712 **خلاصۃ الافکار** : اس کے مصنف کا نام دیباچہ میں اس طرح مذکور ہے "ابوطالب ابن مغفور (مرحوم) حاجی محمد بیگ خاں تبریزی الاصفہانی" جبکہ ہینڈ لسٹ میں ابن کے بعد صرف محمد اصفہانی ہے۔ اوراق ۲۴۹ نہ کہ ۲۵۷ کتاب میں مختلف مقامات پر کمی و اضافہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب مصنف کی خود نوشت تحریر ہے۔ اس کے علاوہ درج ذیل رسائل بھی اس میں شامل ہیں۔

• رسالہ در علم اخلاق ۲ ورق، • رسالہ در مصطلحات موسیقی ۲ ورق، • اشعار فارسی آمیز عربی ا ورق اس کے بعد ۴ اوراق پر بیاض ہے جس میں رسالہ بھید نایکا از عبدالرحیم خانخاناں و مومن لکھنوی کے بھاکا کے اشعار ہیں مومن کی کتاب برہا ولیلا کا انتخاب بھی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور عنوان "در ذکر شعرای ہندی الاحباب بزبان بھاکا سخن گویند وغیرہ" ہے مذکورہ بالا رسالہ یعنی "اشعار فارسی آمیز عربی" کے بعد کے بقیہ رسالوں کا ذکر توضیحی کیٹلاگ میں نہیں ہے بلکہ صرف Some Hindi verses مذکور ہے۔

HL.222 / No.706 (منتخب) **خلاصۃ الکلام**: اوراق ۸۰ نا کہ ۷۹۔

HL.223 / No.693 **ریاض الشعراء**: اوراق ۴۸۷+۲۲ نا کہ ۴۸۸۔ آخری ایک ورق پر تھوڑے حصے میں چند سطریں تذکرہ "خزانہ عامرہ" سے نقل از خدیجہ سلطان دختر حسن علی خاں" ہے۔

HL.225 / No.690 **سفینۂ خوشگو**: اوراق ۲۱۵+۴ نا کہ ۲۱۶۔ آزاد بلگرامی نے اس نسخہ سے استفادہ کیا ہے۔ ابتدائی ورق پر "فقیر آزاد" کی مہر کے علاوہ یہ تحریر بھی موجود ہے "فقیر آزاد بلگرامی استکساب نمود ۱۱۸۲ھ" اوراق کے علاوہ بقیہ باتوں کا ذکر توضیحی کیٹلاگ میں کر دیا گیا ہے۔

HL.228 / No.708 **صحف ابراہیم**: اوراق ۶۵۲+۱۱ نا کہ ۶۵۶، ۱۱ اوراق پر جو فہرست ہے وہ کتاب کے کاتب کی تحریر نہیں بلکہ بعد کا اضافہ معلوم ہوتا ہے۔

HL.229 / No.685 **عرفات العاشقین**: کتاب کا پورا نام اس کے دیباچہ میں اس طرح مذکور ہے "عرفات عرفاء عاشقین و عرصات و عارضات عارفین" اور اس کے مصنف کا نام تقی بن معین الدین محمد بن سعد الدین محمد ہے۔ ہینڈ لسٹ میں "معین الدین محمد" کا "محمد" لکھنے سے رہ گیا ہے، اوراق ۴۳۰+۱ نا کہ ۴۳۱۔

HL.23 / No.70? **عقد ثریا**: اس کے کاتب کا نام لمودہر پنڈت عرف نکو ہے۔

HL.232 / No.688 **کلمات شعراء**: کتاب کا نام "کلمات الشعرا" ہے توضیحی کیٹلاگ میں نام صحیح مذکور ہے۔

H1.233 / No.692 **گلدستہ**: اس کے مصنف عبدالوہاب عالمگیری ولد سید منصور خاں ہیں نہ کہ تقی بن معین الدین الحسینی الاوحدی اور یہ میر تقی الدین حسینی کی کتاب "عرفات العارفین" کے انتخاب "کعبۂ عرفان" سے انتخاب ہے اوراق ۲۷۲ نا کہ ۲۴۷ کتاب کے خاتمہ کے بعد ۱۹ اوراق پر رباعیات عمر خیام ہے اس کے بعد ۶۷ اوراق پر مختلف عنوانات کے تحت حروف تہجی کے اعتبار سے اشعار کا انتخاب ہے جس کے اوراق بے ترتیب ہیں اور یہ ناقص الاول بھی ہے توضیحی کیٹلاگ میں کتاب

اور اس کے مصنف کے نام کی تفصیل موجود ہے البتہ رباعیات عمر خیام اور اس کے بعد کے حصے کا سرسری ذکر ہے۔

HL.234 / No.701 **گلِ رعنا:** اس کا سنہ کتابت ۱۲۰۴ فصلی ہے نہ کہ ہجری۔ کتاب کے اختتام پر سبحان علی کا ایک نوٹ ہے جس میں اس کے کاتب کا نام درج کیا گیا ہے۔ نوٹ درج ذیل ہے جو کتاب کی تحریر سے مختلف ہے۔
"بندہ سبحان علی این نسخہ گل رعنا بحسب فرمائش راؤ صاحب والا قدر راؤ خوشحال سنگھ صاحب دام شفا در مقام آرہ بخط صاحبان عزیزان کہ اسم ہر یک صاحب تحریر می آید آں تحریر اختتام یافت میر افتخار علی، میر طفیل علی، میر بہادر علی، میر کرم علی، میر غلام حیدر و میر علی و لالہ بھوگے لال کاتھ سکسینہ واقع تاریخ پنجم جمادی الآخر ۱۲۰۴ فصلی" اوراق ۲۸۳ نہ کہ ۲۸۶۔ اوراق کے علاوہ بقیہ تفصیلات توضیحی کیٹلاگ میں آگئی ہیں۔

HL.235 / No.707 **گلزار ابراہیم:** اوراق ۳۳۶ نہ کہ ۳۴۶، اس کے علاوہ ابتدائی دس اوراق پر مجہول الاسم و مؤلف ایک واقعاتی مثنوی ہے جو اردو زبان میں ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں اس مثنوی کا ذکر آ گیا ہے۔

HL.237 / No.695 **مجمع النفائس:** اوراق ۲۸۰+۱۰ نہ کہ ۲۸۰ کاتب با لمخلص نے دیباچہ میں فہرست کے سلسلے میں لکھا ہے:
"فہرست اسامی شعرای کہ احوال و اشعار آنہا داخل این تذکرہ است در تذکرہ دستخط جناب سراج الدین علی خاں آرزو کہ این نسخہ ازاں نقل کردہ شد مرقوم بود لیکن این نسخہ بسبب اختصار کتابت نوشتہ نشد"۔ لیکن بعد میں کسی شخص نے اسے لکھ کر شامل کر دیا ہے۔

HL.238 / No.696 **مجمع النفائس:** اوراق ۲۷۲+۱۰ نہ کہ ۲۷۲۔

HL.239 / No.713 **مخزن الغرائب:** اوراق ۲۲۳+۱۰ نہ کہ ۲۲۲۔

HL.242 / No.717 **نشترِ عشق:** اوراق ۵۰۷ نہ کہ ۵۰۶۔

HL.243 / No.689 **ہمیشہ بہار:** اس کے کاتب سلطان علی بیگ ہیں۔

HL.244 / No.691 **ید بیضا:** ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے "پارہ این نسخہ متبرکہ (ص ۱۶۰ تا ۲۲۲) بخط مصنف علیہ الرحمۃ است" ص ۱۶۰ سے ۲۲۳ تک (نہ کہ ۲۲۲) دوسرا خط ضرور ہے لیکن اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ یہ مصنف کے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا ہے نیز یہ کہ ص ۱۶۰۔۲۲۳ جیسا خط ص ۲۵۴ کا بھی ہے۔

HL.245-46 / No.724-25 **روایح المصطفیٰ:** کتاب کا پورا نام "روایح المصطفیٰ فی من انہار المرتضیٰ" ہے۔ مصنف

کتاب کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں۔

"چوں این کتاب فقط در ذکر احوال اولاد مرتضوی کہ دران بیشتر فرع مصطفوی اند . . . .
لاجرم این کتاب را روایح المصطفیٰ من آثار المرتضیٰ نامیدہ شد" (۸ الف)

ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے "در ذکر ائمہ و علما و مشائخ"۔ کتاب کی عبارت میں کمی و اضافہ جیسے شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب بخط مصنف ہے البتہ دیباچہ میں کتاب کی ابتدا اور اس کے اختتام کے سلسلے میں مصنف یہ کہتا ہے کہ اس نے یہ کتاب ۱۳۰۲ھ میں لکھنی شروع کی اور ۱۳۰۳ھ میں اسے مکمل کرلیا جبکہ کتاب کے اختتام پر مصنف خود ہی یہ لکھتا ہے کہ روز جمعہ ۲۸ صفر ۱۳۰۴ھ کو یہ کتاب اختتام کو پہنچی کتاب کی ابتدا ۳ شعبان ۱۳۰۲ھ (یکہزار دو صد و دو کتابت کی غلطی ہے یکہزار سہ صد و دو ہونا چاہیے) کو ہوئی اور ایک سال چھ ماہ میں یہ کتاب مکمل ہوئی ———— اوراق ۳۰۷ ہیں نہ کہ ۳۱۲ کتاب کے خاتمہ کے بعد ۱۶ اوراق پر شاہی اسناد کی نقول "سند شاہی بابت در بست ایمہ لوہار" ہے اور اس کے بعد کے سات اوراق پر فہرست کتاب "روایح المصطفیٰ من آثار المرتضیٰ"۔ اس کا پورا نام اور کچھ تفصیلات توضیحی کیٹلاگ میں آگئی ہیں۔

**مآثر الکرام:** نسخہ کے دیباچہ میں کتاب کا نام "مآثر الکلام تاریخ بلگرام" مذکور ہے۔ (مآثر الکلام کتابت کی غلطی ہے) صحیح مآثر الکرام ہوگا اور ترقیمہ میں "مآثر الکرام فی احوال بلگرام" اوراق ۱۳۴ نہ کہ ۱۳۴ سنہ کتابت کی جگہ تھوڑا کرم خوردہ ہے البتہ بغور دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۱۹۸ھ ہوسکتا ہے توضیحی کیٹلاگ میں کتاب کا پورا نام مذکور ہے۔ HL.247 / No.723

**مآثر رحیمی:** اوراق ۲۵۹ نہ کہ ۲۵۸۔ ناقص الاول پہلے ورق کا ابتدائی حصہ ضائع ہوچکا ہے۔ ناقص الاول ہونے کا ذکر توضیحی کیٹلاگ میں بھی کیا گیا ہے۔ HL.248 / No.722

**مجالس المومنین:** یہ شیعہ مشاہیر علما، صوفیہ، سلاطین، وزرا اور شعرا کے حالات میں ہے۔ HL.249 / No.720

**مجالس المومنین:** اوراق ۶۰۶ + ۹ نہ کہ ۶۱۶ توضیحی کیٹلاگ میں بھی ۶۱۶ مذکور ہے۔ ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے کہ "نسخہ ہذا از نسخہ بالا نقل شدہ و تاریخ کتابت سنہ ۱۰۴۵ھ کہ در آخر نسخہ درج است نیز از نسخہ بالا نقل است۔" HL.250 / No.721

میرے خیال میں یہ کہنا مشکل ہے کہ کس نسخہ کو کس نسخہ سے نقل کیا گیا ہے، دونوں نسخوں میں مذکور ہے کہ اس کے آٹھ نسخے تیار کیے گئے اور اصل نسخہ سے مقابلہ کیا گیا ممکن ہے یہ نسخہ بھی ان ہی آٹھ نسخوں میں سے ہو اور اس کی تاریخ کتابت بھی ۱۰۴۵ھ ہی ہو۔

HL.251 / No.719 **منظر الانسان**: اوراق ۴۶۵ تا ۴۶۸۔

## جلد دوم:

HL.1777 / No.1778 **اقوال حکما**: اوراق ۴۸ تا ۹۵۔

HL.1779 / No.1779 **خلاصۃ الحیوٰۃ**: اس کا نام "خاصۃ الحیوۃ" ہے۔

HL.1780 / No.1781 **رشحات**: اوراق ۲۴۳ + ۱۸ تا ۲۴۳، ۱۸۔ اوراق پر فہرست ہے جو بعد میں کسی نے شامل کر دیا ہے۔ ناقص الاول نہ کہ ناقص، توضیحی کیٹلاگ جلد اول میں اس کے ناقص الاول ہونے کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

HL.1782 / No.1780 **نفحات الانس**: کتاب کا پورا نام "نفحات الانس من حضرات القدس" ہے اوراق ۴ تا ۲۷۷۔

HL.1784 / No.1789 **تذکرہ شعرائے ہندی**: کتاب کا نام نسخہ میں موجود نہیں البتہ اگر اس کے ساتھ مع تکملہ کا اضافہ کر دیا جائے تو بہتر ہوگا "تذکرہ شعرای ہندی (ریختہ گویان) مع تکملہ" یہ تذکرہ ۲۴۵ اوراق پر مکمل ہو جاتا ہے اس کے بعد کے ۱۲ اوراق پر اس کا "تکملہ" ہے۔

HL.1785 / No.1787 **تذکرہ علی حسین گردیزی**: نسخہ کے دیباچہ میں تذکرہ کا نام مذکور نہیں البتہ خاتمہ پر "نسخہ تذکرہ فتح علی خاں گردیزی تمام شد" مذکور ہے "فہرست نسخہ خطی فارسی انجمن ترقی اردو" میں اس کا نام "تذکرہ ریختہ گویان" مذکور ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰۵۔

HL.1787 / No.1788 **خزانۂ عامرہ**: اوراق ۳۲۷ + ۴ تا ۳۲۶، کرم خوردہ۔

HL.1788 / No.1786 **سفینۂ خوشگو**: تعداد سطور ۱۲ – ۱۷ تا ۷۔

HL.1789 / No.1785 **مراۃ الخیال**: اوراق ۳۰۲ + ۱ تا ۳۰۱ نیز خستہ و کرم خوردہ۔

## جلد سوم

HL.2593 **احوال حضرت ابومسلم**: اس کا سنہ کتابت ۱۲۳۴ھ ہے قدرے کرم خوردہ۔

HL.3903 **اشجار الجمال**: اوراق ۱۰۰ تا ۷، ۹ تعداد سطور ۲۵ چند اوراق پر ۱۶ – ۱۹ تا ۱۹

HL.2648 **اصول المقصود**: اوراق ۱۱۱ تا ۱۱۶۔

HL. 3246 **بستان المحدثین:** ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں درج ہے کہ "براول صفحہ در میان کتاب مہر غلام صادق ۱۱۸۸ھ موجود است" لیکن نسخہ پر ایک بھی مہر موجود نہیں نیز ہینڈ لسٹ کے ہی کیفیت کے خانے میں درج ہے کہ "از زبان عربی ترجمہ شدہ" لیکن میری معلومات کے مطابق یہ کتاب فارسی زبان میں ہی لکھی گئی ہے "الاعلام" میں بھی اس کتاب کا ذکر آگیا ہے ممکن ہے اسی کے ذریعہ فہرست نگار کو یہ معلوم ہوا ہو۔ کیفیت کے خانے میں لائبریری میں موجود اس کے دوسرے نسخہ کا جو حوالہ نمبر دیا گیا ہے وہ بھی غلط ہے ہینڈ لسٹ نمبر ۲۰۵۹ کے تحت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی اصول حدیث/فقہ پر "عجالۂ نافعہ" ہے البتہ "مرآۃ العلوم" جلد اول کے ہینڈ لسٹ نمبر ۸۱۷۱ کے تحت اس کتاب کا دوسرا نسخہ موجود ہے۔ کرم خوردہ۔

HL. 3602 **بحر الانساب:** طائپ اور ترتیب کی غلطی سے کتاب نمبر کی جگہ ۳۶۰ ہی مذکور ہے یہ دراصل ۳۶۰۲ ہے اور سلسلہ وار نمبر ۲۴۴۷ کے بجائے ۲۲۴۷ ہوگیا ہے۔ نسخہ میں مصنف کے نام کی جگہ محمد جعفر حسینی مکی مذکور ہے نہ کہ محمد جعفر حسین مکی۔ ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں یہ اضافہ سمجھا جائے کہ محمد جعفر حسینی مکی نے اپنے والد کی عربی تصنیف بحر الانساب کا فارسی ترجمہ کیا ہے مع متن عربی۔ ہینڈ لسٹ میں سنہ کتابت کی جگہ سن یکم جلوس عالم گیر مذکور ہے اس کی جگہ سن یکم جلوس عز الدین عالمگیر ثانی ہوگا جو ۱۱۶۳ھ ہوتا ہے۔

HL. 3533 **بحر الانساب:** کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں ہینڈ لسٹ نمبر ۳۶۱۲ دیکھیے اس کا سنہ کتابت ۱۱۴۵ھ ہے نہ کہ ۱۱۷۵ھ نسخہ میں جہاں سنہ ہجری مذکور ہے وہ قدرے کرم خوردہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی سن جلوس محمد شاہ بھی مذکور ہے جو ۱۴ ہے ایسی صورت میں اس کا سنہ کتابت ۱۱۴۵ھ یقینی تسلیم کیا جائے۔

HL. 3664 **تاریخ احوال اسلام خاں:** نسخہ کے دیباچہ میں اس کا نام "نسب نامہ مختصر بشجرۂ اثنا عشر" مذکور ہے اور اس کے مصنف سید حیدر حسین خاں بن میر محمد حسین خاں شاہجہاں آبادی ہیں اوراق ۵۴ نہ کہ ۵۹ ابتدائی ۵ اوراق پر ورق کے دونوں طرف لکھا گیا ہے اس کے بعد کے اوراق پر صرف ایک طرف تحریر ہے ہینڈ لسٹ میں عدد سطور کے خانے میں ۱۷ مذکور ہے اسے ۷ پڑھا جائے۔

HL. 3011 **تاریخ حبیبی و تذکرہ مرشد:** اس کے کاتب کا نام محمد تقی الدین نعمانی ہے نہ کہ محمد تقی نعمانی نسخہ میں سنہ کتابت سنہ عیسوی کے ساتھ ساتھ سنہ ہجری بھی مذکور ہے جو ۱۲۴۱ھ ہے تعداد سطور ۲۲ نہ کہ ۱۲۔

HL.2602 **تالیف محمدی:** ناقص الاول نسخہ میں سنہ کتابت عیسوی کے ساتھ سنہ ہجری بھی مذکور ہے جو ١٢٦٥ھ ہے۔

HL.3568 **تبصرہ الناظرین:** اوراق ١١٧ نہ کہ ١١٦ ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں یہ اضافہ فائدے سے خالی نہ ہوگا "سوانح مردم بلگرام وقائع سادات و شرفای آں مقام از تاریخ ولادت طوی وفات"

HL.3370 **تحفہ سامی:** اوراق ١٩٣ نہ کہ ٢٥٦ ناقص الآخر نسخہ کے ابتدائی ١١ اوراق پر ورق کے دونوں طرف تحریر ہے اس کے بعد کے اوراق پر صرف ایک طرف تحریر ہے۔ ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے کہ "بر اول و آخر صفحہ مہر نواب سید ولایت علی خاں و خورشید نواب" لیکن نسخہ میں کسی بھی جگہ یہ مہر موجود نہیں۔

HL.2400-A **تحفۃ الکرام:** اوراق ٢۴٧ نہ کہ ٢۴٦۔

HL.2400-B **تحفۃ الکرام:** اوراق ٢۴٢ نہ کہ ٢۴٨۔

HL.3214 **تذکرۃ الاحوال:** اس کے کاتب کا نام مظہر حسن ہے نہ کہ مظہر حسین نسخہ کے ابتدائی ٨ اوراق کی کتابت کی تحریر کسی دوسرے شخص کی معلوم ہوتی ہے۔

HL.2949 **تذکرۃ الاولیا:** اوراق ١٦٧ نہ کہ ١٦٦ سنہ کتابت ہینڈ لسٹ میں ١٢٢١ مذکور ہے جبکہ نسخہ میں سنہ کتابت والا حصہ کرم خوردہ ہے البتہ ١٢٢١ھ میں اس کا مقابلہ کیا گیا ہے کرم خوردہ ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے "حاشیہ از محمد علی رفعت بن عتیق اللہ خاں الحسینی الواسطی" جبکہ نسخہ کے حاشیہ پر "رسالہ محمد علی رفعت" ہے جو ٢٨ اوراق پر ہے حاشیہ کے کاتب مرزا غلام علی بیگ ہیں سنہ کتابت ١٢٢٢ھ۔ اس کے علاوہ درج ذیل رسائل بھی نسخہ کے حاشیہ پر موجود ہیں۔

• رسالہ۔ اس میں مختصر حکایات ہیں ١٢/١ اوراق • صد پند لقمان' ایک ورق • رسالہ شیخ شرف الدین علی قلندر پانی پتی ١٦/١ اوراق سنہ کتابت ١٢٢٢ھ • رسالہ' ٢/١ اوراق • رسالہ بیان رگہا کہ در وجود آدمی اند۔ خواجہ معین الدین چشتی' ۴/١ اوراق • رسالہ ارشاد الطالبین۔ جلال محمود تھانیسری ١٦/١ اوراق • رسالہ (در تصوف) ٢/١ اوراق • مصیبت نامہ۔ شیخ فرید الدین عطار ۴/١ اوراق

یہ تمام رسائل قدرے کرم خوردہ ہیں اور کہیں کہیں جلد سازی کے وقت حاشیہ کی طرف سے کاٹے گئے کاغذ کے ساتھ کٹ گئے ہیں۔

HL.2979 **تذکرۃ الاولیا:** اوراق ٣٣٢ نہ کہ ٣٣١۔

HL.2993 **تذکرۃ الاولیا و انبیا:** اس تذکرہ کا نام "ریاض الحیات" ہے اور اس کے مصنف درویش خاں

عرف محمد حیات قادری ہیں اوراق ۱۷۱ ۲ نہ کہ ۲۶۰۔

HL.2761 **تذکرۃ الائمہ** : سنہ کتابت ۱۲۵۷ھ ہے نہ کہ ۱۲۵۲۔ اوراق ۱۷۵ نہ کہ ۱۷۴

HL.3535 **تذکرۃ الائمہ** : اوراق ۲۴۰ نہ کہ ۲۲۷۔ اس کے کاتب کا نام بہادر علی ہے ہینڈ لسٹ میں بہادر کے بعد علی واضح نہیں۔

HL.3817 **تذکرۃ الائمہ** : اس نسخہ میں خطبہ مصنف کا نہیں بلکہ نسخہ کے کاتب غلام کوثر عرف درگاہی کا ہے محمد معظم کے خطبہ کو اس نے چھوڑ دیا ہے خود کہتا ہے۔

"ناقل این نسخہ متبرکہ کہ بسبب کم فرصتی خطبہ اصل را گذاشتہ نقل نمودہ.. خطبہ از طرف خود گفتہ نوشت"

اوراق ۱۴۰ نہ کہ ۱۴۳، آخری ۴ اوراق پر عرضی ابن انس یعنی انیس بن خبیس ابن ایلس ½ ورق اور "التماس مرزا عبداللہ اصفہانی بخدمت اہل سنت و جماعت" ہے جو شیعہ عقیدے کے بارے میں ہے۔

HL.2603 **تذکرہ شاکر خاں** : اس میں سنہ کتابت سن عیسوی کے ساتھ سن ہجری بھی مذکور ہے جو ۱۲۶۳ھ ہے۔

HL.3858 **تذکرۂ شیخ علی حزیں** : اوراق ۹۳ نہ کہ ۹۲ تعداد سطور ۱۴-۱۷ نہ کہ ۱۵۔

HL.3320 **تذکرۂ صوفیا** : ناقص الاول وکرم خوردہ۔ اوراق ۱۰۲ نہ کہ ۱۰۴۔ تذکرہ کے خاتمہ کے بعد ۲ اوراق پر تصوف میں ایک رسالہ ہے جس کا نام "مشائخ چہاردہ خانوادہ" دیا جا سکتا ہے اس کے کاتب کے نام کے آخر میں جونپوری کا اضافہ کر دیا جائے تو مناسب ہوگا۔ کتاب کا نام "تذکرہ صوفیا" نسخہ میں مذکور نہیں۔ اس لیے اسے انڈر بریکٹ لکھا جائے۔

HL.3831 **تذکرۂ طاہر نصیر آبادی** : کتاب کا نام "تذکرۂ طاہر نصر آبادی" ہوگا اور مصنف کے نام میں بھی نصر آبادی ہی لکھا جائے گا اوراق ۳۲۷ + ۱۵ نہ کہ ۳۲۷۔ خدا بخش لائبریری میں اس کا مطبوعہ نسخہ بھی موجود ہے جو وحید دستگردی نے مرتب کیا ہے۔ مطبوعہ نسخہ میں تین چار سطریں کم ہیں قلمی نسخہ میں خاتمہ کے بعد ۲ اوراق پر یزد کے بعض شاعروں کا ذکر یعنی از شعرای دار العبادہ یزد" کے عنوان سے ہے اس کے علاوہ چند منظوم تاریخیں بھی ہیں لیکن مطبوعہ نسخہ میں یہ سب چیزیں نہیں!

HL.2965 **تذکرۃ الکرام** : ناقص الطرفین وقدرے کرم خوردہ ۔ اوراق ۲۵۴ نہ کہ ۲۶۰۔ اس کے مصنف مولوی محمد ابو الحیوات ہیں ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں بوسیدہ مذکور ہے اس کی ضرورت نہیں۔

HL.3213 **تذکرۂ معاصرین** : ناقص الآخر۔ اس کا آخری یعنی ۳۳ واں ورق سادہ ہے "یہ مجموعہ رسائل شیخ علی حزیں" ہے اس میں موجود دیگر رسائل کی کتابت ایک ہی شخص مظہر حسن کی ہے اس لیے اس کے کاتب بھی مظہر حسن ہی ہوں گے۔

HL.4089 **تذکرہ:** اوراق ۵۳ تا ۱۰۲ سنہ کتابت ۱۱۸۵ھ ہے تا ۱۱۵۸ھ یہ رسالہ اولیا و عرفا کے نکات کے بیان میں ہے اس لیے اسے تذکرہ میں نہیں رکھا جا سکتا۔ نسخہ میں اس کے علاوہ درج ذیل عنوانات کے تحت بھی رسالے موجود ہیں۔

• در بیان خط و اقسام آن ۲ اوراق • در بیان حروف اعراب الفاظ ½ ورق • آغاز احوال شعرا متقدمین ۴۴½ اوراق ان تینوں رسالوں کی سنہ کتابت بھی ۱۱۸۵ھ ہی ہوگی۔

HL.2596 **چراغ پنجاب:** ناقص الاول و کرم خوردہ کتاب کا نام "چراغ پنجاب" نہیں بلکہ "رسالہ صاحب نما" ہے اور اس کے مصنف کا نام لالہ گنیش داس قانون گوئی گجرات ہے تا لالہ گنیش داس قنوجی اس کے کاتب محی الدین و چراغ الدین نہیں بلکہ چراغ الدین مرید محی الدین ہیں نیز یہ کتاب تذکرہ نہیں بلکہ تاریخ کی ہے۔

HL.2831 **حال مرزا اسعداللہ کرمانشاہی:** کتاب کا یہ نام غلط ہے فہرست نگار کو کتاب کے آخر کی اس عبارت "این کتاب از مال حقیر اسداللہ ولد... حاجی مہدی" سے غلط فہمی ہو گئی ہوگی اور اس نے مال کو حال پڑھ لیا کتاب کا نام نسخہ میں کہیں بھی مذکور نہیں یہ مختلف قسم کے خطوط اور دستاویزات وغیرہ پر مشتمل ہے اس لیے اس کا نام "منشات" دیا جا سکتا ہے اور ایسی صورت میں یہ تذکرہ میں نہیں بلکہ انشا میں شامل ہوگا۔

HL.3353 **حالات حضرت امام حسین و ابوالقاسم:** اس میں درج ذیل رسالے ہیں مذکورہ نام کا کوئی رسالہ نہیں۔

• ذکر بلا کے متعلق چند سوالات اور اس کے جوابات) ۳ اوراق • امام حسین کی شہادت کے بعد یزید کا مدینہ پر حملہ اس کی بے حرمتی اور مختار کی جانشینی کے بعد ان لوگوں کو سزا جو کربلا میں شریک یزید تھے پھر مختار کا انجام ۴۴½ اوراق • مختلف قسم کی دعائیں ½ ورق • تاریخ پیدائش، وفات، مدت عمر، مدفن، نام مادران، تعداد اولاد حضور صلعم، خلفای راشدین حضرت فاطمہ حسن حسین و ۱۱ امان دیگر ۲½ اوراق

• نماز برای طلب حاجات ½ ورق یہ اردو زبان میں ہے • نسب نامہ شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی و خواجہ معین الدین چشتی ½ ورق تعداد سطور ۱۲-۱۵ تا ۱۵۔

HL.2912 **حدیقۃ الشیعہ:** اوراق۔ ۳۸۲ تا ۳۷۸۔

HL.3439 **دوازدہ مجلس:** ہینڈ لسٹ میں کاتب کا نام محمد عسکری حسینی بلگرامی مذکور ہے جبکہ نسخہ میں کاتب کا نام موجود نہیں کتاب کا نام بھی نسخہ میں مذکور نہیں اس کتاب میں صرف گیارہ مجلس ہے ہر مجلس کی ابتدا میں ترکیب بند ملا محتشم کاشی ہے اور اس کے بعد مجلس لیکن بارھویں ترکیب بند کے بعد مجلس کا عنوان

نہ دے کر روایات کا سلسلہ ہے ترقیمہ کی عبارت ہے "تمام شد روایات متعددہ از کتب مختلفہ"
اوراق ۱۱۵ تا ۱۱۷ کتاب کے خاتمہ کے بعد ۱۱۸ ویں ورق پر حضرت علی کی شہادت اور اس
سلسلے کی مختلف روایات کا ذکر ہے۔ کرم خوردہ۔

HL.3541 دہ مجلس : اس میں درج ذیل رسالے ہیں۔

• فاتحہ (نظم) حیدری ۳ ورق یہ اردو زبان میں ہے • رباعیات فارسی برای پیشخوانی مجلس امام علیہ السلام ½ ورق • رباعیات ہندی برای پیشخوانی مجلس امام علیہ السلام ½۲ اوراق • کتاب کا نام موجود نہیں ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے خطبہ ہے پھر ملا محتشم کاشی کا ترکیب بند اور اس کے بعد مجلس لیکن بند یا زدھم و دوازدھم میں نہ تو خطبہ ہے اور نہ ہی مجلس (قیاس یہ ہے کہ اس مجلس کے مصنف بھی حیدری ہیں) اوراق ۳۵ تا ۴۲ • من کلام میر محمد باقر داماد اوراق ۲ یہ عربی زبان میں ہے اور اس میں حضرت امام حسین سے ابتہالات (دعائیہ کلمات) کیے گئے ہیں۔

HL.3746 ذکر حکما : کل ۵۳۴ اوراق میں سے ۱۸۶ اوراق پر فارسی متن ہے اور وہ بھی ورق کے صرف ایک طرف۔

HL.3702 راحت الارواح : اوراق ۸۰ تا ۹۷، ہینڈ لسٹ میں سنہ کتابت ۱۰۸۴ھ مذکور ہے یہ سنہ کتابت نہیں بلکہ سنہ تصنیف ہے۔

HL.3075 رسالہ در احوال پیران وخرقہ خلافت وارشاد : اس رسالے کا نام "احوال خرقہ خلافت وچہار پیر وچہاردہ خانوادہ" ہے اور یہ "مرآۃ الاسرار" تصنیف شیخ عبدالرحمن کے مختلف مقامات سے انتخاب ہے۔ اوراق ۸ تا ۹ کرم خوردہ۔

HL.3304 رسالہ در احوال حضرت عبدالقادر جیلانی : کتاب کا نام "مدائح قادریہ مصطفویہ" ہے نہ کہ "رسالہ در احوال حضرت عبدالقادر جیلانی" (ملاحظہ ہو نسخہ کا ورق ۱۱) اس کے مصنف کا نام حافظ غلام مصطفیٰ ابن محمد اکبر التھانیسری الدہلوی القادری ہے مصنف نے ابتدا میں یہ کتاب عربی زبان میں لکھی لیکن بعد میں لوگوں کی فرمائش پر خود اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تاکہ عام لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں زیر نظر نسخہ میں عربی متن اور پھر ترجمہ کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔
اوراق ۱۳۳ تا ۱۳۱ تعداد سطور ۱۷ تا ۲۷۔

HL.3879 رسالہ ہمیشہ بہار : کتاب کے نام میں بجائے رسالے کے تذکرہ ہو تو مناسب ہوگا یعنی تذکرہ ہمیشہ بہار،

یا پھر "ہمیشہ بہار" ویسے یہ کتاب تذکرہ ہمیشہ بہار ہی کے نام سے جانی جاتی ہے۔

HL.2446 **ریاض الشعرا**: تعداد سطور ۲۵ نذکرہ ۲۴۴۔

HL.2686 **ریاض الشعرا**: اوراق ۴۰۰ نذکرہ ۴۵۹۔ قدرے کرم خوردہ۔

HL.3815 **سفینۂ خوشگو**: ناقص الآخر اوراق ۱۲۵ نذکرہ ۱۲۴۔

HL.4117 **سوانح جہانگیر**: تعداد سطور ۹۔ ۱۱ نذکرہ ۱۱۔

HL.2990 **سوانح مرزا وزیر علی نواب لکھنؤ**: اس کا عنوان "سوانح مرزا وزیر علی خاں بہادر" ہوگا۔

HL.3037 **سیرۃ مشائخین وصحابہ کرام**: کرم خوردہ، ناقص الاول، ناقص الطرفین بھی ہو سکتا ہے کیوں کہ کتاب مکمل نہیں اگر کاتب نے مکمل نہ کی ہو۔ اوراق ۲۲۵ نذکرہ ۲۱۳۔

HL.4060 **شبستان اقامت**: کتاب کا نام "شبستان امامت" ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے شبستان اول تا شبستان چہارم مشتمل برحالات آنحضرت صلعم تا شہادت امام حسن عسکری" اس میں یہ اضافہ سمجھا جائے کہ "وشبستان پانزدہم در حال جناب مہدی دین علیہ السلام و در آخر حال دجال" یعنی پانزدہ شبستان و یک خارستان۔

HL.3532 **شجرۂ طیبہ بلگرام**: کتاب کا نام صرف "شجرۂ طیبہ" ہے ہینڈ لسٹ میں بلگرام کا اضافہ غیر ضروری ہے اس کتاب میں سید رضا نے کتاب کے مصنف سید غلام علی آزاد بلگرامی کے بعد مختلف لوگوں کے نام کا اضافہ کیا ہے اور یہ اضافہ ۱۲۵۲ھ تک کا ہے۔ ۱۱۰ ورق پر کتاب مکمل ہو جاتی ہے ۱۱۱ ویں ورق سے ۱۲۵۲ھ تا ۱۲۵۷ھ کے مختلف لوگوں کی تاریخ پیدائش، وفات، شادی وغیرہ کا ذکر ہے جو ۴ اوراق پر ہے ترقیمہ کی عبارت ورق ۱۱۰ پر یہ ہے۔

"بفضل او تعالیٰ شانہ باتمام رسید از قلم شکستہ رقم بندۂ خدا سید رضا بتاریخ غرہ جماد الاول سنہ یکہزار دوصد و پنجاہ و دو ہجری نبوی صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم"۔

نسخہ کے پہلے ورق پر مہر سید رضا ۱۲۳۰ھ کے علاوہ یہ عبارت بھی درج ہے "ہذا نسخہ شجرۂ طیبہ مصنفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی است کتبہ بندہ فرزند احمد بلگرامی"۔ کتبہ اس عبارت کے ہو سکتے ہیں اور پوری کتاب کے بھی لیکن اندازہ یہ ہے کہ فرزند علی صرف اس عبارت کے ہی کاتب ہیں اصل کتاب کے کاتب سید رضا ہی ہو سکتے ہیں۔ قدرے کرم خوردہ۔

HL.3567 **شجرۂ طیبہ بلگرام**: کتاب کا نام شجرۂ طیبہ ہے اوراق ۱۶۱ نہ کہ ۱۲۰ اس کے کاتب سید خورشید احمد بلگرامی ہیں۔

HL.3576 **شجرۂ طیبہ بلگرام**: اس کا نام بھی شجرہ طیبہ ہی ہے اور یہ ہینڈ لسٹ نمبر ۳۵۳۲ سے نقل کیا گیا ہے سنہ کتابت ۱۲۸۲ھ ہے اور کاتب سید محمد مرتضی ولد سید مصطفےٰ علی بلگرامی اوراق ۵۷ نہ کہ ۴۹ آخر کے ۴ اوراق پر وہ اضافے بھی ہیں جنکا ذکر ہینڈ لسٹ نمبر ۳۵۳۲ کے تحت کیا گیا۔

HL.2687 **صحائف شرائف**: اوراق ۲۱۵ نہ کہ ۲۱۳۔

HL.3935 **طرب القلوب**: تعداد سطور ۱۶ نہ کہ ۱۷۔

HL.3360 **عماد السعادات**: اس کا نام "عماد السعادت" ہے اور اس کے مصنف کا نام دیباچہ میں غلام علی رضوی ابن سید محمد اکمل خاں مذکور ہے نہ کہ غلام علی رضا رضوی سنہ کتابت ۱۲۵۲ھ ہے نہ کہ ۱۲۵۴ھ۔

HL.3425 **فواتح القدس**: ناقص الآخر و کرم خوردہ اوراق ۵۵۳+۵ نہ کہ ۵۵۴۔

HL.3364 **کلمات الشعرا**: کرم خوردہ۔

HL.3380 **گلزار حال**: کتاب کے دیباچہ میں مصنف نے اپنا نام بنوالی اور تخلص ولی لکھا ہے نہ کہ بنواری لعل اوراق ۷۶ نہ کہ ۶۶ قدرے کرم خوردہ یہ ہندی کتاب "پربودیہ چندا ودی نانک" کا فارسی ترجمہ ہے نیز یہ کہ یہ تذکرہ نہیں بلکہ داستان ہے جو صوفیانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔

HL.3894 **گلشن ابرار**: کتاب کا نام "گلشن ابرار" نہیں بلکہ "ریاض العاشقین" ہے۔

HL.3677 **مجالس الاحزان**: اس کے مصنف کا نام دیباچہ میں حکیم علی اصغر خاں مذکور ہے نہ کہ حکیم علی اکبر خاں۔ اوراق ۲۴۵ نہ کہ ۲۴۴۔

HL.3867 **مجمع النفائس**: اوراق ۳۵۰+۳۲ نہ کہ ۳۷۲، ۳۲ اوراق پر فہرست ہے جس میں درمیان کے ۲ اوراق سادہ ہیں۔

HL.3424 **مجموعہ در احوال ولادت وشہادت**: مصنف نے باضابطہ طور پر کتاب کا کوئی نام نہیں دیا ہے البتہ دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"ایں رسالہ ایست در چگونگی احوالات حضرت ائمہ المعصومین ..." اس لیے اس کا نام "رسالہ در احوال ائمہ المعصومین" دیا جاسکتا ہے۔ مجموعہ در احوال ولادت وشہادت کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

HL.3975 **مرآت الابرار**: نسخہ کے دیباچہ میں اس کا نام "مرآت ابرار" مذکور ہے۔ ناقص الآخر و کرم خوردہ اس کے پہلے ورق پر میر غلام احمد خاں بہادر کی مہر ثبت ہے۔

HL.2829 **مرآت النخیال:** اوراق ۲۸۱ + ۳ نہ کہ ۲۷۰۔

HL.3402 **مرآت النخیال:** کرم خوردہ۔

HL.3728 **مرآت النخیال:** اوراق ۳۲۸ نہ کہ ۳۲۴۔

HL.3062 **مرآۃ مداری:** قدرے کرم خوردہ نسخہ کے ترقیمہ میں کتابت جلوس احمد شاہی کے ساتھ سنہ ہجری بھی مذکور ہے جو ۱۱۶۵ھ ہے۔

HL.3886 **مرآت مسعودی:** اوراق ۷۴ نہ کہ ۹۲۔

HL.3701 **مفید المخلصین:** ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں صرف "احوال سید شاہ رحمۃ اللہ مذکور ہے" جس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ سید شاہ کون ہیں اس کی جگہ احوال سید شاہ عزیز اللہ (معروف غریب نواز) ہونا چاہیے

HL.3472 **مقتل نامہ:** کتاب کا پورا نام مقتل نامہ امیر المومنین حسین ؓ ہوگا کیوں کہ کتاب کے خاتمہ پر مذکور ہے "تمام شد ہذا الکتاب مقتل نامہ امیر المومنین حسین رضی اللہ عنہ فی یوم ... ماہ صفر ۱۰۶۱ ... این کتاب را فقیر حقیر عوض بیگ نوشتہ ... در لشکر ظفر اثر اورنگ زیب بادشاہ غازی کہ ... در ملک دکن نزدیک بیجاپور" لیکن کاغذ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۰۶۱ کا نہیں ہو سکتا اوراق ۹۰ نہ کہ ۱۰۸۔ مقتل نامہ کے خاتمہ کے بعد ایک ورق پر عالمگیر (اورنگ زیب) اور صائب کے اشعار ہیں۔ ۱۴½ اوراق پر روز عاشورہ کی فضیلت اور حضرت حسین ؓ کے واقعہ کا ذکر ہے۔ ۲۰½ اوراق پر قصیدہ حضرت غوث الثقلین شاہ محی الدین عبدالقادر جیلانی اور اس کی خاصیت کا بیان ہے قصیدہ کے خاتمہ پر مذکور ہے "این قصیدہ را میر روح اللہ نوشتہ است بتاریخ چہارم شہر ربیع الاول سن ۴۰ جلوس عالمگیر" ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے "مہر اول و ۱۰۵ صفحہ میر غلام صادق ۱۱۹۸ھ موجود است" اسے اس طرح پڑھا جائے "بر ورق اول و صد و شش مہر غلام صادق ۱۱۹۸ھ ثبت است"

HL.2486 **مناقب العارفین:** اوراق ۳۲۸ نہ کہ ۳۲۴۔

HL.3059 **منقول مرآت الاسرار:** کرم خوردہ اوراق ۴۰ نہ کہ ۳۹۔

HL.4101 **وفات نامہ:** اوراق ۲۹ نہ کہ ۴۴ (اس میں حضرت علیؓ، امام حسنؓ، حضرت مسلمؓ، فرزندان حضرت مسلم، حرؓ، امام قاسمؓ حضرت عباس و علی اصغر کی شہادت کا ذکر ہے) اس کے کاتب سید محمد حسن ہیں اس کے بعد ۴½ اوراق پر بند مقتسم (بند دہم تک) ہے پھر فاتحہ اور کربلا کے واقعات پر اشعار ۷۔ اوراق۔

HL.261 **وقائع آنند رام مخلص:** اوراق ۱۹۵ تہ کر ۳۴۸ کاتب ایس نور الحق افضلی اور سنہ کتابت ۱۹۵۱ء
اس نسخہ میں دو یا تین اشخاص کی کتابت معلوم ہوتی ہے قیاس ہے کہ آخری ۱۱ اوراق کے کاتب مذکورہ بالا
شخص ہیں نسخہ کی ابتدا میں تذکرہ وقائع آنند رام مخلص حصہ دوم مذکور ہے اس لیے ہینڈ لسٹ میں
کیفیت کے خانے میں "حصہ دوم" کا اضافہ مناسب ہوگا نیز یہ کہ اسے تذکرہ کے بجائے تاریخ میں رکھا جانا چاہیے۔

HL.3729 **ہفت اقلیم:** اوراق ۴۰۲ تہ کر ۴۰۹ ناقص الاول و ناقص آخر چوتھے اقلیم تک۔ اس کا ابتدائی حصہ
نہیں ہے اس کے بعد کا ہے۔

**ضمیمہ:**

HL.3646/22 **اسامی شہدای کربلا:** اس نام یا اس عنوان سے مطابقت رکھنے والا اس میں کوئی رسالہ نہیں۔

HL.3441/2 **حالات معین الدین چشتی:** اس کے کاتب بھی عبدالستار ہی ہوں گے کیوں کہ مجموعہ میں اس سے قبل
مذکورہ کتاب کے کاتب وہی ہیں دونوں کی تحریر اور سیاہی بھی یکساں ہے۔

HL.3922/6 **شجرہ چشتیہ:** ہینڈ لسٹ میں اس کے کاتب کا نام بشارت حسین مذکور ہے یہ کاتب نہیں ہیں بلکہ یہ بشارت
حسین والے شجرہ سے نقل ہے اس طرح اس کی سنہ کتابت بھی ۱۲۰۷ نہیں ہوگی۔

HL.3979/2 **رسالہ مناقب امام اعظم مع اسمای حسنیٰ:** اس نمبر کے تحت جو نسخہ ہے وہ گنج لایخفی۔ ملفوظات
مولانا حسین نوشہ توحید ہے دوسرا کوئی رسالہ اس میں نہیں۔

HL.3712/2 **گلزار صابری:** ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے" در زبان اردو احوال حضرت
غوث الاعظم " لیکن اس میں غوث الاعظم کے حالات نہیں بلکہ غوث الاعظم کی پیدائش سے چالیس
روز قبل کا ایک واقعہ ہے جو ان کی والدہ کے ساتھ پیش آیا اور یہ واقعہ گلزار صابری کے
صفحہ ۱۰۴ سے منقول ہے۔ اس لیے اسے "منقول از گلزار صابری" کہا جا سکتا ہے۔

HL.3648/5 **نسب نامہ حضرت علی:** اس نام یا اس سے مطابقت رکھنے والا اس میں کوئی رسالہ نہیں۔

HL.3081/1 **دفانامہ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری:** اس کے مصنف زین بدر عربی ہیں۔ کرم خوردہ
اوراق ۱۱ تہ کر ۱۲۔

For this purpose he persecuted the Nurbukhshiya, whom he regarded as heretics, and banned all Sufi orders, because the sufis led immoral lives, ate and drank forbidden things and spent their time interpreting dreams and prostrating themselves before one another. But Mirza Haider's rule did not last long. The Kashmiris rebelled against him on account of his narrow-mindedness and fanaticism and killed him.

Three more names deserve to be mentioned in order to complete the list of those who carried on the struggle on behalf of orthodoxy. These are Shaikh Hamza Makhdum, his disciple, Baba Daud Khaki and Shaikh Yaqub Sarfi. But their definition of un-Islamic beliefs and usages was very wide. They not only regarded Hindu beliefs and practices as un.Islamic, but also the *Shi'ite* beliefs and usages. Thus it came to pass that in opposing *Shi'ism*, which had been lately gaining ground in the Valley, they came into conflict with the chak rulers who were Shi'ites. Therefore, they approached Akbar and requested him to send Mughal troops for the conquest or Kashmir. That appeared to them the only way to restore orthodoxy.

Now, what was the result of struggle which the *Ulema* waged for over two centuries. The result was no doubt a substantial gain for orthodoxy At the same time it should not be forgotten that customs, beliefs and practices were too deeply embedded in the life of the people to be completely uprooted and replaced. The Kashmiris, no doubt, accepted the new values, but they did not forget the old. The result was a synthesis between the two. The legal system was replaced by the *Shari'a*, but the customary law continued to exist side by side Caste and untouchability disappeared but it reappeared in a new garb. Idol worship was abolished, but the Hindu image gave place to the tomb of a Muslim saint, and the old places of worship still retained their sanctity for the Muslims. Thus the Islam which emerged in the Valley was not the same which had been introduced by the followers of the great Sufi orders. It had comprised itself and had thus become considerably transformed.

●

principles. Sayyid Ali was shocked to see these things and advised the Sultan to change his and his peoples' way of life. Qutubuddin accepted some of the saint's suggestions, but ignored others which were likely to antagonise his subjects. Sayyid Ali's son, Mohammad Hamadani, who also visited Kashmir, continued the work of his father, and it was under his influence that Sikandar tried to enforce the *Shari'a*, imposed *Jizya*, introduced prohibition, banned *sati* and the playing of musical instruments. Under Zainul-Abidin a number of Sufi and learned *Ulema* entered the Valley, but although the Sultan respected them he did not give up what they regarded as un-Islamic practices, Zainul-Abidin was inclined to be in favour of a more liberal interpretation of Islam.

During the later Shah Mir period there were two persons who deserve to be mentioned as revivalists. These were Mir Shamsuddin, the founder of the Nurbakhshiya sect, and Mirza Haidar Dughlat. Under Zainul-Abidin and his successors many of the un-Islamic practices, which had been discontinued by the Muslims under Sikandar, came to be revived. Mir Shihabuddin, who had arrived from Iraq in the spring of 1502, was anxious to wean the people away from such practices. He soon won over some influential nobles, among whom was Musa Raina the prime minister of Sultan Mohammad Shah, and under his patronage he began his crusade. Once while the Hindus were celebrating the spring festival on the Koh-i-Maran, Shamsuddin proceeded there and put a stop to these festivities on the ground that Muslims were participating in them and every one, including women, were drinking wine and behaving indecently. Shamsuddin even belaboured some of the persons who opposed him. When the next morning the Hindus complained to Mohammad Shah about Shamsuddin's high handed behaviour he was so angry that he wanted to put him to death, but was dissuaded by his counsellors.

Mirza Haider Dughlat, who ruled Kashmir from 1540 to 1551, was an able ruler. But he was a great fanatic and a champion of Islamic orthodoxy, which he was anxious to revive at all costs.

*Sadhus*. They, in fact, represented a compromise between Hinduism and Islam. The Rishis were Muslims but, like the Hindu ascetics, and unlike the Sufi saints, they preferred a life of retirement, living in caves and jungles, away from human habitations, to pray and meditate. Like the Hindu ascetics they renounced the world, leaving their wife and children, inflicting bodily sufferings upon themselves, and regarding the world as an illusion.

The impact of Hinduism and Islam on each other led eventually to a synthesis. This, of course, does not mean that there had been no difficulties in the way, and that the process had been an easy one. Actually the first resistance that was offered was by the Hindu society itself, which felt itself on the defensive. But its resistance proved to be futile. The statements of Jonaraja and Srivara, already quoted, reveal their agony and suffering at the complete failure of Hindu Society to set up a dam against the advancing tide of Islamic beliefs and practices. But as these defences weakened and Islam began to achieve success, it found that it was itself on the defensive. For the new converts refused to break their links with the past, and carried with them their old beliefs and practices. The result was that from the 14th to 16th centuries there was a constant conflict between those who wanted to keep to their old customs and usages and those who were insistent upon introducing the Perso-Islamic way of life. The champions of the latter were the Turks and Persians, who had settled in the country in large numbers, and the *Ulema* and Sufis, both Kashmiri and foreign.

In the course of his visits to Kashmir at the end of the 14th century, the great Sufi saint Sayyid Ali Hamadani found that there was nothing to distinguish Muslims from non-Muslims in dress, manners and customs. At Alauddinpura, in Srinagar, there was a temple which was visited every morning both by the Sultan and Muslims of the town To avert famine Shihabuddin performed the *Yagna* and distributed gifts to the Brahmans. Moreover, he had two wives, who were sisters, a clear violation of Islamic

Although their religion was opposed to caste system, they continued to observe caste distinctions. Caste names were kept, marriages were arranged on caste basis and caste functions were not given up. The Sultans also, like their Muslim subjects, adopted Hindu practices. They participated in Hindu festivals, visited Hindu temples to beseech the aid of the gods, and in order to avert calamities they performed sacrifices and bestowed grants on the Brahmans. They also performed the *Homa* ceremony at the time of the coronation. The only difference was that instead of a Brahman priest and the chief minister, the *Shaikhul-Islam* applied the *tikka* to the ruler's forehead and made offerings of gold and flowers.

The mutual influences which the Hindus and Muslims exercised on each other was not confined to manners and customs, but also extended to the realm of ideas and religious beliefs. The ideas of Lalla Did, for example, were greatly influenced by Sayyid Ali Hamadani and Nuruddin Rishi. Lalla Did, who lived in the 14th century, was greatly dissatisfied with the Saivite beliefs and practices. Under the influence of Islamic ideas, which she came to know through her contact with these saints, she denounced the caste system and criticised idol worship as silly and useless. She looked upon the world as an illusion, yet she also stated that it was not necessary for a man to become a hermit in order to achieve the absorption of the individual soul into the Supreme, but that even a house-holder could obtain Ultimate Release. In this there is evidence of the influence of Sayyid Ali Hamadani, who believed that in order to be a good Sufi it was not necessary to renounce the world. In fact, he denounced celibacy and asceticism. Lalla also learnt from the Sufis to use words in an esoteric sense. From them also she imbibed the idea of the Divine Love, and like them she employed the word "Beloved" to denote the Godhead.

Just as Lalla Did came under Islamic influence, so did Nuruddin Rishi and his followers accept the ideas of Hinduism. The Rishis of Kashmir stood midway between the Sufis and Hindu

influence. A rigid caste system acts as a strong cohesive force, and thus serves as a powerful defence mechanism against the infiltration of foreign ideas. But in Kashmir, under the Buddhist influence, there had been a relaxation of caste rules and, as a result, the Hindu Society's power of resistance had been undermined. Islam, therefore, did not have to face the same degree of opposition in Kashmir as it did in other parts of this snb-continent where the caste rules continued to be rigid and the society was able to set up barriers against external influences. These facts go to explain why Islam's success in Kashmir was much more rapid and complete than in any other part of this sub continent.

## THE IMPACT OF ISLAM

That the impact of Islam on Kashmir was profound and far-reaching is evident from the statement of Jonaraja who complains that "as the wind destroys the trees and locusts the shali crop, so did the *Yavanas* destroy the usages of Kashmira" and that "the kingdom of Kashmira was polluted by the evil practices of the *mlecchas*." Similarly Srivara, writing in the second half of the 15th century, says that Hindus had adopted blameable practices and given up preference for prescribed ceremonies. Now what were the blameable practices which the Kashmiris began to adopt and the usages which the foreigners began to destroy. These practices were that caste rules became relaxed; foreign dress, manners and costoms began to be adopted; strange dishes began to be relished and what was most shocking was that even beef began to be liked by some Hindus.

It is necessary to point out here that while Kashmir was subject to foreign influences and was assimilating strange practices and usages, she herself was not slow in converting others to her own way of life. Thus many Muslims, while they celebrated their religious festivals, also participated in the Hindu festivals of Gana-chakra Sripanchami and others. They regarded the Hindu places of worship as sacred, and sometimes they even worshiped idols.

successors. The conversion of Kashmiris to Islam, therefore, cannot be limited to any specific period; it was a long-drawn process extending to about 300 years. The only definite thing that can be said about it is that not until the early part of the 16th century were the great bulk of the people converted to Islam.

I have given so far a brief history of the spread of Islam in the Valley but this does not fully explain the problem of how this was accomplished. Actually rulers of Kashmir were, for the most part, indifferent to the missionary activities of Sufis and the *Ulema*. In fact, there is evidence to suggest that they discouraged these activities. The only ruler who actively took interest in them was Sikandar, but much of his work was undone by his son and successor, Zainul-Abidin. Thus it is not the Sultans but the Sufis who were mainly responsible for introducing and spreading Islam. But for this they did not use compulsion, because they were neither capable of employing it, nor did they have the sanction of the State behind them. Their methods were persuation, discussion and discourse. And they won over the hearts of the people on account of their simplicity, sincerity, piety and devotion. But we must remember that despite all these qualities, the Sufis would not have been able to make much headway, had they not been helped by certain objective conditions. Since about the 12th century society in Kashmir was in the process of social, political, and religious disintegration, caste rules had been relaxed, Brahmans had become arrogant, sectarianism was prevalent, the priests were uneducated, true spiritual values were lacking and religion consisted in nothing more than belief in superstitions and the performance of certain prescribed ceremonies. Buddhism also had become decadant and could not offer spritual satisfaction to the people. It was these conditions which had driven Rinchana into the fold of Islam and had provoked Lalla Did to protest against the Saivite beliefs and practices.

I should mention one more cause which helped the spread of Islam. This was the laxity of caste rules resulting from Buddhist

Hindus and Buddhists, and appointed them to positions of responsibility.

The next person who carried on intensive missionary activity was Mir Shamsuddin. As a result of the liberal policies pursued by Zainul-Abidin and his successors, the Hindus had recovered some of their former position and strength. In a communal riot, which took place during the reign of Haider Shah, they caused damage to the *Khanqah-i-Mua'lla*. This provoked a reaction and Shamsuddin, protected and encouraged by some nobles, began his missionry work and achieved considerable success not only in the Kashmir valley but also in Baltistan. Those who played an important part in continuing his work after his death were Shaikh Makhdum Hamza, Baba Daud Khaki and Jamaluddin Bukhari.

Now the question arises as to when did a majority of the inhabitants of Kashmir become Muslim. There is evidence to show that in the time of the chak rulers the dominant religion of the Valley was Islam. But just as it is difficult to say with certainty as to when Islam was first introduced in the Valley, so it is not possible to specify any definite period when the process of conversion was completed. Stein's view that the adoption of Islam by the great mass of the population had become an accomplished fact during the second half of the 14th century is not borne out by facts When Sayyid Ali Hamadani visited the Valley at the end of the 14th century, he found the Muslims in a minority. Sikandar ascended the throne in 1389 and ruled till 1413. It is impossible to believe that in the course of 24 years he could have converted the whole Valley to Islam, particularly, when we remember that in the early years of his reign he was a minor, and power was exercised by his mother, who acted as Regent. Moreover, most of the work of proselytisation accomplished by him was undone by his son and successor, Zainul-Abidin, who completely reversed his religious policy. And from the accounts of Jonaraja and Srivara it is clear that there were still a large number of Hindus in the Valley and they had regained their position under Zainul-Abidin and his

meant to ameliorate the condition of all his subjects. On the other hand, Sikander introduced certain other measures whose object was certainly to secure converts. For example, he imposed the *Jizya* upon non-Muslims, and due to the economic pressure many must have become Muslims. Those who did not want to pay left the Valley. But we must remember that Sikander never compelled any one to become Muslim, if he paid the *Jizya*.

As regards the destruction of temples, Jonaraja accuses Sikander that there was no village or town left where temples were not razed to the ground· There is no doubt that Sikander destroyed temples, but not to the extent mentined by Jonarja or the Persian chroniclers This is clear from the fact that Mirza Haidar, writing after 150 years of Sikandar's death, testified that "first and foremost among the wonders of Kashmir stand her idol temples. In the rest of the world there is not to be seen, or heard of, one building like this. How wonderful that there should be 180 of them." Abul Fazl and Jahangir also mention of the lofty temples in a state of perfect preservation. In reality many of the temples whose destruction has been attributed to Sikandar were destroyed by earthquakes. Some suffered due neglect, and some had already been destroyed during the pre-Sultanate period by the Rajas of Kashmir, namely, Jayapida, Saakaravarman, Adhimanyu II and Harsha.

When Zainul-Abidin ascended the throne he completely reversed his father's religious policy. He allowed every one full freedom of belief and worship. He recalled those Brahmans who had left the country under his father, and permitted others who had embraced Islam to return to their former faith. He banned cow-slaughter, and gave Hindus the right to perform their customs. He allowed them to repair and rebuilt temples and, in some cases, he himself had them rebuilt. He practically abolished the *Jizya* and other taxes which specially fell upon the non-Muslims. He participated in Hindu festivals, enjoyed the society of learned

was the best religion, Rinchana decided to accept the faith of the first person he saw in the morning. And since the first person he saw from his palace was Bulbul Shah, a Muslim, he embraced Islam. But this is too naive an explanation to be believed, for people do not change their religion in such a way. What actually must have happened is that Rinchana, who was spiritually restless and inquisitive and hankered after truth, failed to get any satisfaction either from Buddhism, the faith in which he was born, or from Hinduism, the faith of his subjects. It was at this time that he came into contact with Bulbul Shah who explained to him the teachings of Islam Rinchana was impressed by these teachings, which were simple and free from caste rules, priesthood, superstition and narrow formalism, and, therefore, accepted the Islamic faith. The conversion of Rinchana was a landmark in the history of Islam in Kashmir, because the example set by him was followed by a number of nobles, and according to a tradition by 10000 people. After Rinchana's death a number of sufis visited Kashmir among them Sayyid Ali Hamadani, who belonged to the Kubraviya order of Sufis, was the most prominent. He is said to have made 37,000 converts. These figures should not be taken too literally because both the Sufi accounts and the chronicles have a tendency to exaggerate. What these figures do indicate is simply this, that both Bulbul Shah and Sayyid Ali Hamadani made a number of converts. Sayyid Muhammad Hamadani, the son of Sayyid Ali Hamadani, who also visited Kashmir and stayed there for 12 years, continued the work of his father. But the next large scale conversions that took place were the result of the efforts of Sultan Sikander (1389-1413) and his minister Suhabhatta, who had become a Muslim under the influence of Muhammad Hamadani.

While studying Sultan Sikandar's religious policy, there are two things to be kept in view. First, he tried to introduce a number of social reforms like the abolition of *Sati*, the banning of gambling and the prohibition of wine and other intoxicants. These measures were not intended to persecute any community, but were

It was during the Sultanate period that Islam became the religion of the majority of the people of Kashmir, and since this had profound and far-reaching results, we must try to understand how it was introduced and it spead.

The earliest reference to Muslims in Kashmir is in Kalhana's *Rajatarangini*, where it is mentioned that Lalitaditya's son and successor, Vajraditya, who ruled in the early part of the 8th century, "sold many men to the *mlecchas*, and introduced into the country practices which befitted the *mlecchas*." These *mlecchas* were, probably, Muslims and the men whom they purchased must have been later converted to Islam. These appear to have been the first converts to Islam in the Valley. Later, Harsha employed Turkish soldiers and was influenced by Muslim fashions in dress and ornament. In the early part of the 12th century again we find a Kashmiri ruler employing Muslims in his army. From the travels of Marco Polo, it appears that by the end of the 13th century there was a colony of Muslims in the Valley, for he says that its inhabitants, the Kashmiris, do not kill animals but that if they want to eat meat they buy it from lhe Saracens. These Saracens were, most probably, Kashmiris who had become converts to Islam.

The first specific reference in the chronicles to conversion is that of Rinchana, a Buddhist ruler of Kashmir, which was brought about by the efforts of Sayyid Sharafuddin, commonly known as Bulbul Shah, who was a sufi saint of the Suhrawardiya order The chronicles and the Sufi *Tazkiras* represent this event as the outcome of a miracle. They say that unable to make up his mind as to which

2

# Introduction and spread of Islam in Kashmir

19. Mohibbul Hasan, op. cit., p. 360.

20. Ibid., p. 374.

21. Ibid , p. 276.

22. Ibid., p. 331.

23. Original Records, No. 16, *Tipu to Nizam* (Natiooal Archives of India).

24. Mackenzie, *A Sketch of the war with Tipu Sultan*, vol. ii, pp. 72-3.

25. Mohibbul Hasan, op. cit., Appendices C & D.

## REFERENCES


1. Valentia, *Travels*, xol. i, p 417.
2. Sinha, *Haidar Ali* (2nd ed.), pp. 255-56.
3. Ibid., p. 254.
4. *Mysore Archaeological Report*, 1914 and 1917.
5. Epigraphica Carnatica, vol. ix, p. 27; Khare, Itihas *Sangraha*, vol. viii, No. 3286.
6. Henderson, *The Coins of Haidar Ali & Tipu Sultan*, Mysore and Coorg, vol. i, Appendix.
7. Logan, Malabar, p. 50.
8. Sinha, op. cit. pp. 158-59; p. 254, 256.
9. Ibid., p. 257.
10. Ibid , p. 254.
11. See for details Mohibbul Hasan, *History of Tipu Sultan* (2nd ed.), Calcutta, 1971, pp. 355-55.
12. Ibid., p. 357-58.
13. Khare, op. cit , vol. viii, No. 3286.
14. *Mysore Archaeological Report*, 1916, pp. 10-1, 73-6.
15. Ibid. 1912, pp. 23-40; 1917, p. 58-59; 1940, p. 26. See also *Epigraphica Carnatica*, vol. iii, Sr. 77.
16. Baramhal Records, section xii. p. 9; *Local Records*, vol. iv, p. 280, cited in Report of the *Indian Historical Records Commission*, 1934, p. 417.
17. Mohibbul Hasan, op. cit., p. 373.
18. India office Mss Eur. C. 10, p 206; Beatson, *A view of the origid and Conduct of the war with the Tipu Sultan*, p. 317; also Kirmani, *Nishan-i-Haidari*, p. 391.

officers by admonishing them and sometimes by inflicting upon them deterrent punishments[24]

There is no evidence to suggest that Tipu tried to establish an Islamic State, for like his father, he too knew that such a thing was impossible. However, from some of his actions it appears that he wanted to play the role of a Muslim ruler. Thus, he called his state *Saltanat-i-khudadad* (God-given State) He instituted a new calender called it *Mauludi*, dating it from the spiritual birth of the Prophet instead of from his flight (*Hijrat*). And he named some of the months after the Prophet and 'Ali. The same Islamic bias is evident in the names he gave to the new coins he introduced. The gold and silver coins were called after the Prophet, the first two Caliphs and the twelve *Shi'a Imams*. The copper coins, with the exception of the double paise, which is called after the third Caliph, bear the Arabic and Persian names of stars[25] It seems that Tipu made these innovations as a concession to Muslim orthodoxy and also to satisfy his own conscience. However this did not imply any basic change in and departure from his policy of toleration.



he tried to excite his religious sentiments by dwelling on the atrocities which the English were committing on the Muslims in India. While these religious appeals were ineffective, as in the case of the French, he made appeals to their self-interest, stressing the danger to which they were all exposed by the British designs of aggrandisement. The same appeal he made to the Marathas; but in addition, he tried to arouse their patriotic feelings [20]

There are, however, some instances in which Tipu, persecuted unlike his father, the *Mahdavites*, a Muslim sect founded by Sayyid Muhammad of Jaunpur at the end of the 15th century. Tipu imposed a ban on their religious practices; and when despite this, they ignored his orders, he exiled them from his kingdom.[21] It was a strange contradiction in his character that while he himself held superstitious beliefs and indulged in un-Islamic practices, he refused to countenance the same in some of his Muslim subjects.

It was his religious beliefs and ideals that determined the attitude towards certain social practices and customs and religious ceremonies. For example, he banned many practices during the time of *Muharram* because he regarded them as un-Islamic. He forbade prostitution, and tried to put a stop to polyandry in Malabar and Coorg. In some parts of Malabar women did not cover their bodies above the waist; so Tipu decreed that no woman should go out of her house without being properly dressed. He abolished the custom of human sacrifice which was practised in the temple of Kali Devi near Mysore city. He also banned the use of liquor and other intoxicants in his kingdom [22]

Tipu was anxious to give a moral basis to his government, for he had a high sense of duty to his office, and believed that his subjects constituted a unique trust held for God, the real master.[23] He, therefore, spared no pains to promote the welfare of his people, and was busy from morning till evening with state affairs. He personally supervised every department of the Government, and endeavoured to check the laxity, peculation and oppression of his

Brahmins he gave a black bullock, a milch she-buffalo, a male-buffalo, a black she-goat, a jacket of ccarse black cloth, a cap of the same material, ninety rupees, and an iron pot filled with oil, and previous to the delivery of these articles, he held his head over the pot in order to see the reflection of his face and thereby avert misfortune [18]

To a man who possessed such eclectic beliefs and was so catholic in his outlook, it would be a mistake to attribute either religious fanaticism or even religious motives. If he crushed the Hindu Coorgs and Nayars, he did not spare the Muslim Moplahs His forcible conversion of Coorgs and Nayars to Islam was not due to religious but political motives. He had warned them several times that they should remain peaceful. But they ignored his warnings and repeatedly rebelled. He, therefore, converted them as a punishment However the conversions were on a much smaller scale and not as large as mentioned in some of the accounts. Besides, some of the conversions were voluntary.[19]

In his relations with Indian or foreign powers also, Tipu, like his father, was not influenced by religious considerations. He sent embassies to Persia, Afghanistan and Oman to obtain military help or promote commercial relations. He sent a mission to Constantinople for military and commercial reasons as well as to legalize his position as ruler of Mysore, because he had failed to secure confirmation of the title from the Mughal Emperor due to English intrigues. He made war on the Muslim rulers of Savanur, Kurnool, Adoni, Hyderabad and the Carnatic just as he fought against the Marathas and the Raja of Travancore. However, although religious considerations did not influence his State policy. Tipu, unlike his father, did not hesitate to exploit religion if it served his purpose. In his efforts to win over the Nizam against the English he appealed to his religion, pointing out that for the good of Muslims they should forget their past differences and unite against the common enemy Similarly, to obtain the support of the Ottoman Sultan,

Despite all this, Tipu was very strict in the performance of his obligatory prayers and keeping the *Ramazan* fasts; and throughout the day he carried a rosary in his hand. He had great reverence for 'Ali, the cousin and son-in-law of the Prophet, and inscribed on his weapons the words '*Asadullah al-Ghalib* one of 'Ali's title. He also revered the other Shi'a *Imams* and named many of the coins after them. The manuscripts of his library had the names of Fatima, Hasan and Husain stamped on them. The ambassadors he sent to constantinople were instructed to lay offerings on his behalf at the tombs of 'Ali and Husain at Najaf and Karbala, and they were to ask the Caliph's permission for constructing a canal from the Euphrates to Najaf, where there was a great shortage of water.[17] Tipu was greatly interested in Sufism, and under his patronge a number of books were written on it. Like his father, he revered Muslim saints and conferred grants for the up-keep of their tombs; he also held Hindu *sadhus*, saints and gods in high respect. Further, like his father, he was extremely superstitious, and believed that the performance of certain ceremonies could avert misfortune. Everyday he consulted the astrologers attached to his conrt about his stars. He fed Brahmins and bore the expenses of Hindu religious ceremonies performed to invoke success for his arms. On every Saturday, withont fail, according to the advice of the astrologers, he made an offering to the Seven Stars of seven different kinds of grain, of an iron pot full of sesame oil, of a blue cap and coat and one black sheep and some money. All these articles were distributed among the Brahmins and the poor. On the morning of 4th May, 1799, before Seringapatam was captured by the English, Tipu had been warned by both Hindu and Muslim astrologers that, since it was an inauspicious day for him, he should remain with the army till the evening, and in order to avert disaster he should give alms. After his bath, therefore, he distributed money and cloth among the poor who had gathered there. To the chief priest of Chennapatna, he presented an elephant, a bag of oil seeds and two hundred rupees. To the other

the title of an independent ruler might have created diplomatic problems. It would have had also no meaning unless confirmed by the Mughal Emperor, but this confirmation was not an easy thing to secure.

Tipu Sultan, for the most part, followed in the footsteps of his father. He appointed Hindus to high offices of State.[11] He not only continued the *Inam* grants of the previous reigns to Brahmins and temples but gave fresh grants.[12] In the course of the Third Anglo-Mysore War, when he visited Conjeevaram, he gave 10,000 *Huns* towards the construction of the Gopur temple whose foundations had been laid by his father,[13] and like his father, wrote letters to the Jagatguru of Sringeri Math couched in respectful and polite language. In 1791 some Maratha horsemen plundered the monastery of its valuable property, and displaced the sacred image of the goddess Sarada When Tipu came to know of this he sent the Math money, grain and other articles for the consecration of the goddess.[14] In Nanjundesvara temple at Nanjangud a jadite *linga* was installed by Tipu's orders. Tipu also gave elephants, jewels, silver and gold vessels to various other temples in the kingdom.[15]

Tipu, like his father, allowed the Hindus complete freedom of worship. The magnificent temple of Sri Ranganatha is situated within the fort of Seringapatam, about one hundred yards west of the palace, from where the Sultan heard daily the ringing of temple bells and the hymns chanted by Brahmin priests. Yet he never interfered with these The Narasimha and the Gangadharesvara are the other two big temples inside the fort and near the palace. But neither in these nor in the thousands of other temples scattered throughout his kingdom, did Tipu ever prevent Hindus from offering worship. On the contrary, he often made grants to the Brahmins to perform their religious ceremonies in the temples. He also distributed money for the performance of religious ceremonies among the Muslims.[16]

cising them and recruiting the Nayar boys into his *chela* battalion, which he had formed on the lines of the Janissarries of the Ottoman Empire. He also converted some of his European prisoners from motives which had nothing to do with religion. Since he needed Europeans as artificers, engineers and officers for his army, he hoped to persuade them to enter his service.[9]

Haidar Ali was very much influenced by his Hindu environment This is evident from his belief in the efficacy of certain ceremonies. Thus, he ordered the performance of *Japam* in Hindu temples before setting out on a campaign. Similarly, buffaloes were sacrificed on the occasion in accordance with the Hindu tradition, and he usually marched against the enemy only after the Brahmins had declared that the hour and day were auspicious.[10]

It has been maintained that Haidar did not set aside the Raja of Mysore and himself assume the title of a king in deference to Hindu sentiments, and that is why every year at the annual *Dasahra* festival, he allowed the Raja to come out of his palace and show himself to his people. But the fact is that, if after he had consolidated his position, Haidar had deposed the Raja there would have been no resistance, for, on account of his benevolent rule he was extremely popular both with his Hindu officers and Hindu subjects. Later, when Tipu, his son and successor, did eventually put an end to the rule of the Wodeyars and declared himself Sultan, there was no opposition. It seems, therefore, more probable that the reason why Haidar did not think it necessary to assume the title of an independent king was first, that he possessed in practice full sovereign powers. He struck coins in his own name, received envoys of Indian and foreign powers and sent his own to them and made war and concluded peace. Secondly, he might have been influenced by the examples of the Peshwa, the Nizam, the Nawabs of Oudh, the Carnatic and Bengal, none of whom were *de jure* rulers, although in practice enjoying sovereign powers. That is why Haidar Ali also remained content with the position he occupied and did not desire for any change. Besides, the assumption of

Haidar appointed Hindus to high position in his government. At the time of his death, out of five officers in charge of different departments, three were Hindus, namely, Krishna Rao, Purniya and Shamia. In addition, his revenue officers and diplomatic agents were mostly Hindus.[2] Haidar continued the *Inam* grants of the time of the Rajas to Brahmins and temples.[3] He presented various articles to the temples in Mysore, for example a *Sankh* to the temple in Devanhulli, and some vessels to Sri Ranganatha temple in Seringapatam.[4] Although this was against the *Shari'a*, he did not care In fact, he went much further in violation of it. When the temple of Sri Ranganatha was damaged as the result of fire, he had it rebuilt in one month. He also laid the foundations of Gopur temple in Conjeevaram during his invasion of the Carnatic in 1780, but it could not be completed owing to his war with the English [5]

In the matter of coinage also he followed a policy which though un-Islamic, took into account Hindu sentiments. He allowed the retention of gold coins which had the figure of the Hindu god Siva and his consort on the obverse. Similarly, the half *pagoda* had on the reverse a figure of Vishnu with a discus in the right and a conch in the left hand; and the Ganapati *pagoda* had on its obverse the figure of an elephant with an uplifted tail [6]

Haidar's attitude towards the Christians of Malabar was also very liberal. He granted the Catholic church in Calicut 2,420 *fanams* yearly, and allowed the Catholics complete freedom of worship.[7] Later, however, this grant to the church was cancelled along with the trade privileges which the Portuguese had until then enjoyed in the Mysore kingdom, because, in 1768, when the English attacked Mangalore, the Portuguese gave them help in its conquest [8]

Similarly, Haidar Ali's harsh treatment of Hindus in Malabar was not due to religious but to political considerations. The Nayars had again and again rebelled; so Haidar punished them by circum-

According to Valentia, once a *pirzada* complained to Haider Ali that some Hindus of Seringapatam had beaten up his followers, who had attacked a Hindu procession, and demanded redress from him as head of a Muslim government. Haider Ali replied angrily : "Who told you that this was a Muslim government ?"[1] These words very vividly sum up Haider Ali's concept of government and his attitude to the relationship between religion and politics They show that he regarded religion as a purely personal matter having no connection with public affairs, and believed that in a territory mainly, inhabited by non-Muslims, it would be foolish to think of establishing an Muslim State

Haider's concept of government was the product of several factors. First, there was his family background. His forefathers had been *Sufis* attached to the shrine of Jamal-ud-Din Husaini commonly known as Gisu Daraz. Although himself not a *Sufi*, Haidar revered the *Sufis* and paid visits to their tombs Secondly, he was influenced by the tradition of religious toleration that existed both in the Muslim and Hindu States of the Deccan and South India. Thirdly, as a *pragmatic* and a statesman possessed of great *foresight* he realised that, ruling as he did an overwhelmingly large non-Muslim population, it would be suicidal to think of establishing a Muslim State. Throughout his career, therefore, he did two things. First, he did his best to win over the goodwill of Hindus; and secondly, he kept religion and politics apart, never permitting his personal beliefs to influence the latter.

## KHUDA BAKHSH EXTENSION LECTURES, 1988

**PROF. MOHIBBUL HASAN** was educated at Lucknow and London. Worked as lecturer in Islamic History and Culture in Calcutta University (1943-1956), Reader in History in Aligarh Muslim University, (1956-1963), Professor and Head, Department of History Jamia Millia Islamia, New Delhi ( 963-1970), Senior Professor and Head Department of History in University of Kashmir Srinagar, member of the Executive Committee of the Regional Records Survey Committee, West Bengal (1947-1955), the Archival Legislation Committee (Government of India 1959-60), Vice President of the Iran Society, Calcutta (1952-54). Presided over the Medieval Section of the Indian History Congress in 1957 and 1967.

His well known works include : History of Tipu Sultan, Kashmir under the Sultans, Historians of Medieval India, Babur : Founder of the Mughal empire in India, Readings in Democracy, Messages by Freedom, Introduction and annotation to the Babur Nama (Part III) translated by Bacque-Grammont (Paris, 1981) and Waqai i-Manazil-i-Rumi (Diary of an Indian Embassy to constantinople).

Besides, he contributed a number of articles to various Indian and foreign Journals including the Encyclopaedia of Islam. Presently he is settled at Aligarh.

1

# Religion and Politics under Haider Ali and Tipu Sultan

*By*

**Prof. Mohibbul Hasan**
Aligarh

**Islam & Hinduism**
Some Common Teachings of Islam and Hinduism : Monazir Ahsan Gilani 657

**Sikhism**
Guru Garanth Sahib and Urdu : Ibadullah Giani 675

**Aurangzeb**
India in the days of Aurangzeb : Sa'mi'ullah Beg 737

**Babri Masjid Ram Janam Bhoomi**
Documents of 1856: Hadiqa-i-Shuhada : Mirza Jan 829

**Towards Partition**
A Presidential Address of 1940 : Shaikh Muhammad Jan 867

**Oriental Libraries**
An Unknown Library of Turkey : Prof. Ahmad Atash 881
The Libraries of Istanbul : Dr. Muhammad Ghaus 897
Rare Manuscripts of the Libraries of Burusa : Dr. Syed Nayeemuddin 917

**Khuda Bakhsh Library**
Corrections and addition of the Hand-List of Persian Manuscripts : Dr. Iftikhar Ahmad Madni 923

---

Printer : Liberty Art Press, 1528, Pataudi House, New Delhi.2

Publisher : Mustafa Kamal Hashmi for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone: 50109, Telex: 22-430 KBL IN)

Editor : Dr. A.R. Bedar.

Annual Subscription : Rs. 300/- (Inland) U$ 60 (Asian Countries) U$ 120 (Other Countries). Rs. 25/- Per Copy Price (this issue) Rs. 150/-.

**Daryabadi**
Abdul Majid Daryabadi disowns his book : Prof. Hamdani 370

**Zakir Husain**
Zakir Husain Reminiscences : Zillur Rahman Khan 373

**Qazi Abdul Wadood**
Armaghan-i-Bihar with an Introduction : Ali Haider Nayyer 391

Notes & jottings : Qazi Abdul Wadood 411

**Re-claimed**
The first Short Story of Rajendra Singh Bedi: Farishta (Angel) : Bedi 441

**Middle East: As seen by Indian Travellers**
Iraq, Iran & Turkey : Hasan Askari, (Dy. Collector) 445

**Muslims & Science**
Contribution of Muslims to Islamic Sciences : Fawad Siezgin 529

Contribution of Muslims to Astronomy : Fawad Siezgin 551

Influence of Arab Astronomy on Europe : Fawad Siezgin 569

Contribution of Muslims to the History of Meteorology : Fawad Siezgin 585

**Quranics**
Translations of Quran in India : Dr. Mohammad Ansarullah 605
Chinese words in the Quran : Dr. Mehdi Hasan 613

**Shi'ism**
Greatness of Ali as described by Abu Bakr
**Greatness of Abu Bakr as described by Ali**
: Zamakhshari : Ehteshamul Hasan : Kandhalwi (Tr.) : 621

JOURNAL NO. 57-62

CONTENTS


**Tipu & Haider**

Religion and Politics under Haider Ali and Tipu Sultan : Prof. Mohibbul Hasan 1-12

**Kashmir**

Introduction and spread of Islam in Kashmir : Prof. Mohibbul Hasan 13-24

**Urdu/Persian Section**

Rare Printed Books

Tawarikh Nadirul Asr- A History of Awadh : Munshi Nawal Kishore 1

**Problem Facing Urdu**

Are Muslims alone to struggle for Urdu? : Dr. Saroop Singh 177

**Urdu Literature**

Whither Urdu Literature : Dr. S.M.Aqeel 183

**Intellectual Thinking in Urdu**

Mr. Saiyid Hamid 205

Dr. Mohammad Hasan 211

**Contemporary Intellectual Thinking**

A Poem : Ahmad Nadeem Qasmi 215

A Poem : M akhmoor Sayeedi 216

The Role of Literature in the Contemporary Era : Muzaffar Ali Syed 217

**Intellectual Poets**

Hasan Nayeem 235

Ijtiba Rizvi 252

**Iqbal**

Writings of Iqbal in his own handwriting : Sir Mohammad Iqbal 265

**Abul Kalam Azad**

Azad's letters to Zakariya Bhagalpuri - in Azad's own handwriting : Maulana Azad 271

# Khuda Bakhsh Library

# JOURNAL




## 57——62

JANUARY-JUNE 91





Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA

Khuda Bakhsh Library

# JOURNAL



57—62

JANUARY - JUNE 91

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA